پیرِ سابرمتی

مسٹر اندولال ۔۔ کے ۔ یاجنِک

کی انگریزی تصنیف "گاندھی ایز آئی نو ہِم"

(GANDHI AS I KNOW HIM.)

کا اُردو ترجمہ

از

جنابِ محمد ظفر احمد صاحب انصاری

ام، اے ۔ بی ، اے (آنرز) اِل ، اِل ، بی

ناشِر

"دانش محل" فیض گنج ۔ دِلی

سنہ ۱۹۴۳ء

طبع اوّل یک ہزار (۱۰۰۰)

۴۶

۴۹ الٹیمیٹم

فہرست مضامین

دیباچہ

آزادی کی قومی جدوجہد میں گاندھیت ایک بڑی خلفشار پیدا کرنے والی قوت ثابت ہو چکی ہے۔ اس نے ہندوستان میں مستقل طور پر انتہائی رجعت پسندی کا دور قائم کیا۔ نیز مذہب، توہم پرستی اور اندھی تقلید کو جو خام تعلیم یافتہ ہندوستانی عوام کے مخصوص دماغی رجحانات ہیں، بے حد متاثر کر کے قوم کی سیاسی بیداری کو روحانیت کے دلدل میں لا پھنسایا۔ بہت سے بلوث کارکنوں نے جو برطانوی سرمایہ داری کے اقتدار کے خلاف ایک حقیقی سیاسی جنگ میں قوم کی رہنمائی کرتے، اس رجحان کے زیر اثر کھدر کی پھیری کرنے والوں اور چھوٹے چھوٹے معاملات پر جیل جانے والوں کا روپ دھارن کر لیا۔ اس نے عقل کی آنکھوں پر پردے ڈال دیے، تنقیدی صلاحیت کو کچل دیا اور جدت و ذہانت کے خلاف ایک جہاد شروع کیا۔ گاندھی جی کو اس بات میں بڑا کمال حاصل ہے کہ تمام ایسی تحریکوں کو جو اپنی وسعت میں ملک گیر بن سکتی ہیں مقامی بنا دیں، اور قوم کی متحدہ قوتِ عمل کو ایسی راہوں پر لا ڈالیں جن کا رخ آزادی کی قومی جدوجہد کی وسیع شاہراہوں کے خلاف ہو۔ وہ بڑی ہوشیاری سے اپنے سیاسیانہ مذہبی منطقی دلائل کے ذریعہ معمولی ضمنی باتوں کو بہت اہم بنا کر انہیں عوام کی توجہات کا مرکز بنا دیتے ہیں، اور جب خود ان کا اپنا "سیاسی فرینک اسٹین"۵ ان بندھنوں کو جو انہوں نے اپنی زمانہ سازی سے بنا رکھے ہیں توڑنے کی دھمکی دیتا ہے، تو وہ ایک لمحہ میں نیچے اتر آتے ہیں وہ اپنی تاویلوں سے شکست کو فتح کی شکل میں پیش کر سکتے ہیں اور اپنی شکست اور ناکامیوں کی ذمہ داریوں کو آسانی سے قوم کے سر منڈھ دیتے ہیں۔ کسی تحریک کو شروع کرتے ہوئے ان کے دل میں کتنے ہی پاکیزہ محرکات کیوں نہ ہوں، مگر ان کے اعمال کے نتائج نے ہمیشہ ان لوگوں کی پوزیشن کو اور زیادہ مستحکم بنا دیا۔ جن کو وہ پامال کرنا چاہتے تھے اور ذرہ برابر بھی فائدہ پہنچائے بغیر عوام پر بیشمار مصائب کا بوجھ ڈال دیا۔ مشینوں کی مخالفت، کھادی کا پرچار برطانیہ کی قلب ماہیت کے لیے دعا کی تلقین، اپنے مخصوص دماغی خبط کے ماتحت عوام کی پھیلی ہوئی سیاسی تحریک سے کنارہ کشی، مذہبی اصول کے پردہ میں اپنے ہی پیرووں کو نشانہ ملامت بنانے کا عجیب و غریب طریقہ، گھمسان لڑائی میں پسپائی کا رجحان، قوم کو مشکل میں پھنسا دینے کی مسلمہ عادت اور اپنے برطانوی دوستوں کو اپنی پسند پر ہندوستانیوں کو مطعون و مردود ٹھہرانے کا موقع دینا، یہ سب اُن کی ایسی باتیں ہیں جنہوں نے سامراجیوں کو اپنی پوزیشن اور زیادہ مضبوط کرنے میں مدد پہنچائی۔ اور ایسا کرنے میں۔ انہوں نے لوگوں کی خوش اعتقادی اور مذہبی عقیدت مندی سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اب گاندھیت ایک ایسے مرحلہ پر پہنچ چکی ہے کہ اس کے صحیح مفہوم کا تجزیہ، نیز عوام کے دماغوں پر اس کے ناجائز سحر کارانہ اثر کے فوری بعید نتائج کو بغیر ہچکچاہٹ ظاہر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ کتاب اس قسم کے تجزیہ کی ایک فاضلانہ کوشش ہے۔ اس کا گاندھی جی کے مقلدوں کی اولین صف کے ایک سابق قومی کارکن مسٹر اندولال یاجنک کے قلم سے نکلنا، بزرگ مہاتما کے افکار و اعمال کے مصدقہ ریکارڈ کی حیثیت سے کافی اہمیت رکھتا ہے۔ مسٹر یاجنک نے کسی قسم کے تعصب کے بغیر یکے بعد دیگرے اُن تمام واقعات پر تنقیدی نظر ڈالی ہے، جو ۱۹۲۱ء کی بے نتیجہ ستیاگرہ تحریک کے بعد پیش آئے۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں افریقہ کے ستیاگرہ کے تجربہ کے بعد ہندوستان میں گاندھی جی کی آمد اور عالمگیر جنگ میں برطانیہ کی عملی امداد سے لے کر حال کی سول نافرمانی میں ناکامی کی بنا پر سیاسیات سے اُن کی عارضی کنارہ کشی تک، مسٹر یاجنک نے ایک سچے مبصر کی حیثیت سے گاندھی جی

---

۵ ایک افسانوی کردار جس کی ہوشیاریاں اور چالاکیاں خود اسی کے لیے مصیبت بن گئیں

کے تمام سیاسی مشاغل کا جائزہ لیا ہے اور گاندھیت کے فاسد اثرات کو قابل تعریف اور محققانہ انداز سے بے نقاب کیا ہے۔ الغرض مصنف نے تارکسی (مشہور جرمن فلسفی کارل مارکس کے اصول کے مطابق) روشنی میں گاندھیت کو جانچا اور بڑی خوبی سے اس کے رجعت پسندانہ رجحان کو اُجاگر کیا ہے۔ عام پڑھنے والوں کو جو گاندھیت کے تباہ کن اور رجعت پسند اثرات کے شکار ہیں اس تصنیف سے غالباً ایک بڑا صدمہ پہنچے گا۔ لیکن اس کی حقیقی قدر دس بیس برس بعد اس وقت معلوم ہوگی، جب گاندھیت کی مخربانہ اور غیر عمرانی طاقت اپنے مضرت رساں نتائج سے عوام کی آنکھیں کھول چکی ہوگی۔

سیاسی شعور رکھنے والے ناظرین اور اُن لوگوں کے لیے جنہوں نے دانستہ یا نادانستہ عقل و خرد کا دامن اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے یہ کتاب بہت بڑی کشش کا باعث ہوگی۔ اُمید کی جاتی ہے کہ غور و فکر کرنے والا طبقہ گاندھی جی کی اب تک کی سرگرمیوں کے قابلانہ تجزیہ کے متعلق مسٹر پاجنک کی مزید کوششوں کا بے چینی سے انتظار کرے گا۔ گاندھی جی کی قیادت کا سب سے اہم اور اسی لیے سب سے رجعت پسند دور وہ ہے جس نے ۱۹۲۰ء اور اُس کے بعد قوم کو اپنے شکنجے میں کس لیا (یہ وہ زمانہ ہے کہ جب وہ عوام کی قوت عمل کو ناجائز طور پر استعمال کرنے کے لیے اپنے عارضی گوشۂ عافیت سے باہر نکل آئے تھے)، اور اس وقت سے لیکر ۱۹۳۲ء تک کے ان تمام واقعات کا بھی مفصل بیان ہے جو گاندھی جی کی رہبری میں ہندستان کے سیاسی مطلع پر رونما ہوئے۔

ناشرین (انگریزی)

پہلا باب

گھر میں

ابھی جنگ عظیم کو شروع ہوئے چند مہینے ہوئے تھے کہ ۱۹۱۴ء کے آخر میں گاندھی جی نے ہندوستان میں قدم رکھا۔ لیکن اُن کی شہرت ان کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ جنوبی افریقہ میں اُن کی آخری غیر جارحانہ مقاومت نے ہندوستان میں کافی جوش و خروش پیدا کر دیا تھا چنانچہ سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے مخلص کارکنوں کی تائید و حمایت سے انجہانی مسٹر گوکھلے نے ملک بھر میں اس کا زبردست پروپیگنڈا کیا اور لارڈ ہارڈنگ نے بھی جو اس وقت ہندوستان کے وائسرائے تھے اپنی مدراس والی مشہور تقریر میں تحریک مذکور کی اخلاقی تائید کی۔ ملک کے طول و عرض میں تائیدی جلسے منعقد کیے گئے اور ان ہندوستانیوں اور اُن کے اہل و عیال کے لیے، جنہوں نے جنوبی افریقہ میں صعوبتیں برداشت کی تھیں لاکھوں رُوپیے جمع کیے گئے۔ غرضکہ ملک اس ہستی کے خیر مقدم کے لیے چشم براہ تھا جس نے سول نافرمانی کے عظیم الشان حربے کے ذریعہ ایسے دور دراز خطہ میں نمایاں کامیابی حاصل کی تھی۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اس وقت تک نوجوان نسل پرانے سیاسیئن سے جن میں سر فیروز شاہ مہتا اور سر سریندر ناتھ بنرجی بھی تھے تقریباً مایوس ہو چکی تھی۔ مسٹر گوکھلے جن کی عزت اب بھی بہت کافی تھی۔ پونا میں بیمار پڑے ہوئے تھے۔ لوکمانیہ تلک جو مانڈلے جیل میں ۶ سال کی قید کاٹ کر حال ہی میں رہا ہوئے تھے۔ گیتا کے متعلق اپنی تصنیف میں منہمک تھے۔ لالہ لاجپت رائے امریکہ میں پروپیگنڈے کا کام کر رہے تھے اور آربندو گھوش نے پانڈی چری کا کنج عافیت بسا لیا تھا۔ مسز بیسنٹ ہوم رول کی مہم کا خاکہ تیار کر چکی تھیں لیکن اب تک انہوں نے عمل کی راہ میں قدم نہ رکھا تھا۔ غرضکہ ہندُستان کی سیاسی زندگی کے خاموش سمندر میں تلاطم برپا کرنے کے لیے اس وقت ایک نئے رہنما کے لیے راستہ بالکل صاف تھا۔ چنانچہ گاندھی جی ٹھیک اسی مناسب وقت ملک کے سیاسی فضا پر نمودار ہوئے۔

ہم سب گاندھی جی کے عدیم النظیر حربے سول نافرمانی، آتم شکتی اور اُن کے پر اثر اور نتیجہ خیز امکانات سے آشنا ہو چکے تھے اسی اثنا میں "ہندستان" میں ایک افتتاحی مقالہ لکھتے ہوئے میں نے گاندھی جی کو مادر وطن کی آغوش میں آنے پر مبارکباد دی اور ہر اس مہم کے بارے میں جس کا آغاز وہ ہندستان میں کریں بہترین توقعات کا اظہار کیا۔ یہ صحیح ہے کہ اس وقت ہم اس نئی تحریک کی تفصیلات اور الجھنوں کو اس طرح نہیں سمجھتے تھے۔ جیسا کہ اب ہم انہیں سمجھتے ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ نئی تحریک اپنی روح اور لائحہ عمل کے لحاظ سے کچھ نہ کچھ جنگ جویانہ ضرور ہوگی اگرچہ کسی قسم کے تشدد کا ارتکاب کیے بغیر ہیں...... ...... اس کے لئے تکلیفیں ہی کیوں نہ اٹھانی پڑیں۔ تاہم ہماری توقعات خطرے سے خالی نہ تھیں کیونکہ ہم سن چکے تھے کہ جنگ عظیم کے شروع ہونے کے بعد ہی گاندھی جی نے حکومت برطانیہ کی امداد کے لیے انگلستان میں ایک ہندوستانی ایمبولنس کور قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ کسی نہ کسی پہلو سے یہ خبر ہمارے لیے تشویش انگیز ضرور تھی کیونکہ ہم نوجوانوں کا خیال تھا کہ کسی ایسی جنگ میں جس کا ہندُستان کی آئندہ بہبود سے تعلق نہ ہو، برطانیہ کی امداد ہمارا فرض نہیں۔ پھر بھی ہم نے اسے گاندھی جی کے مدبرانہ اقدام

سے تعبیر کیا کہ غالباً اس سے ان کا یہ مقصد ہو کہ اسی بہانے ہندوستانی نوجوانوں کو فنون حرب کا تجربہ ہو جائے اور ان میں کچھ نہ کچھ وہ مردانہ جنگی روح پیدا ہو جائے جس کا مظاہرہ اس وقت مغربی دنیا میں ہو رہا تھا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ گاندھی جی نے اپنی نئی قائم کی ہوئی ایمبولینس کور کی طرف سے کچھ مطالبات پیش کیے تھے جنھیں حکومت برطانیہ کے ٹھکرا دینے پر انہوں نے جرأت سے کام لیتے ہوئے۔ حکومت کو اپنی ایمبولنس کور کو سرکاری نگرانی سے الگ کر لینے کی دھمکی دی تھی۔

ایک گجراتی کسان کے سادہ لباس میں گاندھی جی ہندوستان کے ساحل پر اترے۔ وہ دھوتی اور گھٹنوں تک لمبا کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ گلے میں انگوچھا سر پر گجراتی وضع کی پگڑی اور پیروں میں چپل تھی۔ ان کا یہ لباس ہندوستانی مل کے موٹے جھوٹے کپڑوں کا تھا۔ اس لباس اور خاکسارانہ وضع پر اخبارات میں خوب چرچے رہے ان کے خیر مقدم کے لیے بندرگاہ پر بہت بڑا مجمع نہ ہوا، لیکن ہندوستانی اخبارات نے ان کی ممتاز خدمات پر جو انہوں نے ہندوستانیوں کے مفاد کی خاطر جنوبی افریقہ میں انجام دی تھیں دلی جوش کے ساتھ تعریفی مضامین لکھے اور ہندوستان کی آزادی کی خاطر مستقبل میں ان کی خدمات کے بارے میں خوشگوار توقعات کا اظہار کیا ـــــــ اگرچہ کم و بیش بیس سال کے وقفے کے بعد وہ ہندوستان واپس ہوئے تھے۔

ہم نے کچھ مبہم سی افواہیں سنیں جن سے اندازہ ہوا کہ کس طرح گاندھی جی کی آمد نے سرکاری حلقوں میں اضطراب و تشویش پیدا کر دی ہم نے اُن کے بہت سے جاسوسوں کے متعلق بھی سنا جو گاندھی جی کے پیچھے لگے ہوئے تھے اور ان کے ساتھ ہی بندرگاہ پر آئے تھے ہم نے لارڈ ولنگڈن سے جو اس وقت بمبئی کے گورنر تھے اُن کی ملاقات کا حال بھی سنا، جس کے متعلق گاندھی جی نے خود ہمیں بتایا کہ کس طرح لارڈ لنگڈن نے خاص طور پر ان سے فرمایا تھا کہ اگر حکومت کے خلاف انہیں کچھ شکایتیں ہوں تو کسی مہم کو آغاز کرنے سے پہلے انہیں وہ ان کی توجہ میں لائیں۔

ان کی آمد سے قدرتی طور پر احاطہ بمبئی خصوصاً گجرات کے علاقہ میں زندگی اور مسرت کی نئی روح دوڑ گئی۔ اس سے پہلے گجرات میں ہندوستان گیر شہرت کا کوئی سیاسی رہبر پیدا نہ ہوا تھا، لیکن اب ہمارے ساتھ رہنے سہنے ہمیں ہماری اپنی زبان میں سیاسیات کا درس دینے ہمارے مصائب کو دور کرنے، حکومت کے خلاف ہماری جد و جہد کی رہنمائی کرنے اور ملک کی سیاسی زندگی میں ہمیں ایک ممتاز درجہ عطا کرنے کے لئے گاندھی جی ہم میں موجود تھے۔

ان تمام امور سے بالاتر انہوں نے نوجوان طبقہ کے دلوں میں ایک نئی آگ بھڑکا دی اور ان کے تخیلات کو روشن کر دیا کیونکہ انہوں نے اپنی ذات میں بیک وقت مذہب اور سیاست کو سمو لیا تھا۔ اسی اصول کے تحت قرون وسطی میں یورپ کے جنگجو درویشوں اور صلیبی مجاہدوں نے بڑا نام پیدا کیا تھا۔ نیز اسی نہج پر لیکن ذرا اس سے مختلف شکل میں رام داس اور گرونانک ایسے دھرم پرچارکوں نے بھی جنگی اصول و قواعد کا درس قرون وسطی کے ہندوؤں کو دیا تھا جو بالآخر مرہٹوں اور سکھوں کے سیاسی عروج و اقتدار کے دور قائم ہونے کا باعث ہوا۔

مذہب اور سیاست کا یہ اجتماع ہم نے مسٹر تلک اور لالہ لاجپت رائے کی شخصیتوں میں دیکھا تھا۔ جو اپنے سیاسی نظریوں کو بلند بنانے کے لیے اپنی مذہبی اور فلسفیانہ علمیت سے بڑا کام لیا کرتے تھے۔ لیکن اب ان دونوں بزرگوں کی شہرت کا آفتاب نصف النہار سے گزر چکا تھا اور گاندھی جی کا نیر اقبال طلوع ہو رہا تھا ـــــــ وہ گاندھی جو بیک وقت درویش بھی تھا اور سیاست داں بھی دیکھنے میں سیدھا سادا اور خاکسارانہ اطوار کا حامل لیکن ایک ایسے عظیم الشان پیغام کا علمبردار جس کے بارے میں ہم سب کا خیال تھا کہ وہ ملک کی سیاسی زندگی میں ایک بہت بڑے انقلاب کا باعث ہوگا۔

دوسرا باب

میں گاندھی جی سے ملنے کے لیے بیتاب تھا جس کا موقع جلد ہی نکل آیا۔ سانتا کروز کے رہنے والوں کی طرف سے بمبئی کے قریب دِلاردِلا کے بنگلہ میں ان کے خیر مقدم کا جلسہ ہونے والا تھا چنانچہ میں نے اپنے سانتا کروز کے دوستوں کے ساتھ جلسہ میں شریک ہونے اور اس مقدس انسان کی زندگی بخش آواز اور پیغام سننے کا فیصلہ کر لیا۔

ہمارے کچھ ہندوستانی بھائی جو تھوڑی بہت انگریزی جانتے تھے اپنے لمبے ہندوستانی انگرکھے انگریزی پتلون اور ہندوستانی ٹوپی کے ساتھ ہماری نیم مشرقی اور نیم مغربی زینت کی عمدگی سے نمائندگی کر رہے تھے مجھے یہاں پہنچنے میں کچھ دیر ہو گئی کیونکہ جونہی میں مکان کی بالائی منزل پر پہنچا، میں نے گاندھی جی کو سینکڑوں آدمیوں کے جھرمٹ میں ایک بڑی چٹائی پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ جلسہ کی کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ تہنیت نامہ کے پڑھے جانے کے بعد گاندھی جی تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے اس وقت میرا جوش اور استعجاب انتہائی نقطۂ عروج پر تھا اور دل کی دھڑکن عجیب کیفیت پیدا کر رہی تھی انہوں نے اپنی تقریر نہایت دھیمی آواز میں شروع کی یہاں تک کہ بڑے ہال میں سب لوگوں کو اس کا سننا بھی غیر ممکن تھا انہوں نے خیر مقدم کرنے والوں کی نوازش اور قدر افزائی کا شکریہ ادا کیا اور پھر ایک مخصوص انداز میں انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کی جس مبالغہ آمیز رنگ میں ان کی تعریف کی گئی ہے وہ اس کے اہل نہیں اور اسکا یقین دلایا کہ جہاں تک ہو سکے گا وہ خود کو اس تحسین کا اہل بنانے کی کوشش کرینگے۔ نیز اس خطرہ کا بھی اظہار کیا کہ اُن کی یہ حد سے بڑھی ہوئی تعریف انہیں بالکل تباہ نہ کر دے ان کی اس تقریر سے میرے دل پر دھکا سا لگا۔ ہندوستان یا جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کی شکایات کے بارے میں ان کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا اور نہ انہوں نے اس کشاکش کے متعلق ایک حرف کہا جو حال ہی میں برطانیہ عظمیٰ کے فوجی حکام اور اُن کے درمیان ہو چکی تھی اور نہ انہوں نے ہندوستان کی سیاسی صورت حال پر ذرہ برابر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مجھے امید تھی کہ وہ اس ملک کے ستائے ہوئے باشندوں کو حکومت کے ظلم وستم کی ڈراونی طاقتوں کے خلاف غیر متشددانہ جنگ کے لیے للکاریں گے۔ میں خیال کرتا تھا کہ وہ مسٹر تلک اور آربندو گھوش کے انداز میں تقریر کریں گے، لیکن وہ صرف چند رسمی جملے کہہ کر بیٹھ گئے۔ یہ امر میرے لیے بے حد مایوس کن ثابت ہوا اور میری وہ ساری توقعات جو ان کی غیر محدود باطنی قوتوں اور بے مثل صلاحیتوں سے وابستہ تھیں منتشر ہو کر رہ گئیں۔ حقیقت میں یہ چیز میری سمجھ سے باہر تھی۔ اس پورے واقعہ سے مجھ پر کچھ ایسی پژمردگی اور مردنی طاری ہوئی کہ میں فوراً جلسے سے نکل اپنے دوستوں کی قیام گاہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرے بعض دوستوں نے جن سے راستہ میں میری ملاقات ہوئی، مجھ سے قبل از وقت خیر مقدم کے جلسے سے چلے آنے کا سبب پوچھا۔ میں انہیں بمشکل کوئی جواب دے سکا۔ میں غم وغصہ سے جھنک رہا تھا، جس کی توجیہ میں خود نہ کر سکتا تھا۔ بہرحال انتہائی عجلت کے ساتھ میں گاندھی جی کے پاس سے جنہوں نے مجھے اس حد تک مایوس کیا تھا چلا آیا۔ تاہم اس ناامیدی کی فضا میں بھی مجھے امید کی کرن نظر آتی تھی۔ اسی اثنا میں گجرات سبھا نے بھی جس کا سکریٹری میں تھا منگل داس ہاؤس میں گاندھی جی کے خیر مقدم کے لیے ایک بہت بڑے جلسہ کا انتظام کیا۔ مسٹر ایم۔ اے جناح نے ازراہ کرم اس جلسہ کی صدارت منظور کر لی تھی۔ چونکہ ہم نے عصرانہ کا بھی انتظام کیا تھا لہٰذا ہمیں یہ جاننا ضروری تھا کہ گاندھی جی کیا کھاتے پیتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ تازہ پھل اور خشک میوے (اخروٹ وغیرہ) پسند کرتے ہیں، چنانچہ ان کے مذاق کے مطابق ہم نے ایک علیحدہ میز سجائی۔

جلسہ اس بڑے مکان کے باغ میں منعقد ہوا۔ حاضرین کی تعداد چند سو سے زیادہ نہ تھی۔ سب سے پہلے مسٹر منشی نے انگریزی میں گاندھی جی کو خوش آمدید کہتے ہوئے انہیں موجودہ گجرات کا سب سے بڑا سپوت قرار دیا۔ مسٹر جناح نے ایک پُرجوش اور عمدہ سیاسی تقریر کی گاندھی جی کی ان عظیم الشان خدمات کو سراہتے ہوئے جو انہوں نے جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کی فلاح وبہبود کے بے انجام دی تھیں، مسٹر جناح نے ہمیں متنبہ کیا کہ ابھی ان ہندوستانیوں کی مشکلات ومصائب کا خاتمہ نہیں ہوا اور ان کے تصفیہ کو طے کرنے کے لیے مزید جدوجہد کی ضرورت

ہوگی۔ اب گاندھی جی تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ اپنی تقریر گجراتی زبان میں شروع کر کے انہوں نے ہم سب کو ایک مسرت آگیں تعجب میں مبتلا کر دیا۔ انہوں نے انگریزی زبان کو قومی اور سیاسی پلیٹ فارم سے جلاوطن کرنے اور اس کی جگہ صوبائی زبانوں یا ہندستانی زبان کو اختیار کرنے کی فوری ضرورت پر خاص طور سے زور دیا، تاکہ عوام تک بھی اثر پہنچ سکے۔ انہوں نے جنوبی افریقہ کے مسئلہ پر جس کے متعلق مسٹر جناح نے اپنی تقریر میں خاص طور پر تذکرہ کیا تھا، کوئی روشنی ڈالنے سے عمداً گریز کیا اور نہ انہوں نے ہندستانی سیاسیات کے بارے میں کچھ کہا ہاں انہوں نے صرف ان باتوں کے لیے جو مسٹر منشی اور مسٹر جناح نے اُن کی تعریف میں کہی تھیں، ہم اراکین انجمن کا شکریہ ادا کیا اور اپنی اس تمنا کا اظہار کیا کہ کاش خود کو وہ ان تعریفوں اور توصیفوں کا اہل بنا سکیں۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی میز سے برائے نام تھوڑی سی اخروٹ کی گری اور کچھ پھل تناول کیا۔ پارٹی شام کو ذرا دیر سے ختم ہوئی۔ اس امر نے پھر مجھے اور میری سبھا کے ساتھیوں کو مایوس کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ بعض لوگوں نے گاندھی جی کی سیدھی سادی وضع، منکسرانہ انداز اور ان کے دیہقانی لباس کا، جس سے وہ ان کی نظروں میں بالکل ہندستانی درزی سے معلوم ہوتے تھے مضحکہ اڑانا شروع کیا۔

ہمیں کئی مہینے تک نہ تو نجی طور پر اور نہ اخبارات کے ذریعہ گاندھی جی کے مشاغل کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکا۔ صرف اتنا پتہ چلا کہ مسٹر گوکھلے کے مشورے سے انہوں نے کم سے کم ایک سال کے لئے ہندستانی سیاسیات سے علحدہ رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور وہ پورے ہندستان کا دورہ کر کے مختلف صوبوں کے سماجی، اقتصادی اور سیاسی حالات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ اسی اثنا میں ہم نے اخبارات میں پڑھا کہ دوران سفر میں جب گاندھی جی مدراس میں تھے تو انہوں نے انگریز مشینریوں کے ایک جلسہ میں شرکت کی اور حکومت برطانیہ کی صحت و سلامتی کی تجویز کی تائید میں تقریر کی۔

غرض کہ گاندھی جی نے عوام کا سیاسی جمود توڑنے اور انہیں ان کے خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش نہ کی اور نہ۔۔۔۔۔۔ انہیں حکومت کی سختیوں سے نجات دلانے کے لیے کسی مہم کا آغاز کیا۔ اس کے خلاف انہوں نے اس حکومت کی وفاداری کا گیت گانا شروع کیا جس کے بوجھ کے نیچے ہم پسے جا رہے تھے۔ اس چیز نے ہمارے ابتدائی شبہات کو اور مضبوط کر دیا اور ہماری ناامیدی اور مایوسی کو آخری حد تک پہنچا دیا۔ اب ہمیں پتہ چلا کہ ہم نے گاندھی جی کو جیسا لیڈر سمجھ رکھا تھا وہ ویسے نہیں۔

۱۹۱۵ء کے آغاز میں گاندھی جی نے احمد آباد کو اپنا مرکز بنانے کی تجویز کی اور چند مالدار دوستوں کی مدد سے سابرمتی ندی کے کنارے اپنے ستیہ آگرہ آشرم کی بنیاد ڈالی۔

تیسرا باب

خوابیدہ آتش فشاں

گاندھی جی نے مسٹر گوکھلے کو اپنا سیاسی گرو مان لیا تھا ان کے دل میں اس اعتدال پسند رہنما کے لیے ہمیشہ احترام و تحسین کا جذبہ موجزن رہا۔ ان کے سماجی اور سیاسی تعلقات جب سے کہ مسٹر گوکھلے نے جنوبی افریقہ کا دورہ کیا تھا اور بھی گہرے اور استوار ہو گئے تھے۔ انگلستان میں بھی گاندھی جی نے نہایت خلوص سے اپنے اس عزم کا اعلان کیا تھا کہ وہ مسٹر گوکھلے کے نقش قدم پر چلیں گے،

چنانچہ ان کے ہندستان واپس آتے ہی مسٹر گوکھلے نے انہیں سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے ابتدائی ممبروں میں شامل کر لیا تھا۔

یہ باتیں ہمارے لیے امید افزا نہ تھیں۔ اگرچہ مسٹر گوکھلے اب بھی ہندستان میں بے حد ہر دل عزیز تھے، لیکن بہر حال وہ محض اعتدال پسند تھے۔ دوسری جانب جیل سے رہا ہونے کے بعد مسٹر تلک نے اپنی اس انتہا پسند جماعت کی از سر نو تنظیم کا اعلان کیا جو سنہ ۱۹۰۷ء سے عملاً ختم ہو چکی تھی۔ اس طرح نوجوان طبقہ کے دل میں اگرچہ اب بھی مسٹر گوکھلے کی بڑی عزت تھی، لیکن اُن کی امیدوں کا مرکز اُسی انتہا پسند رہبر کی ذات تھی جو اپنی طویل اسیری کے بعد پھر سیاسیات میں داخل ہونے والا تھا۔ ہم سمجھتے تھے کہ مسٹر گوکھلے کی جماعت میں شریک ہونے سے پہلے گاندھی جی کچھ سوچ بچار اور توقف کریں گے لیکن انہوں نے بہت جلد اپنی راہ چُن لی اور عملاً اُس انتہا پسند طبقہ کی مخالف صف میں جا کھڑے ہوئے، جس کی قیادت مسٹر تلک کے ہاتھوں میں تھی۔

۱۹ فروری ۱۹۱۵ء کو پونا میں مسٹر گوکھلے کا انتقال ہو گیا۔ گاندھی جی جو اس وقت شانتی نکیتن میں تھے، ان کی کریا کرم میں شریک ہونے کے لیے فوراً پونا تشریف لائے۔ انہیں سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی میں ایک مستقل رکن کی حیثیت سے داخل کر لینے کے سوال پر سوسائٹی کے اراکین میں تبادلۂ خیالات ہوا، لیکن کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو سکا۔

مسٹر گوکھلے کی موت سے پورے ملک پر اداسی چھا گئی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اپنے بہت سے دوستوں کے ساتھ مجھے بھی ان کی موت کا بہت صدمہ ہوا۔ اور اس بڑے اعتدال پسند رہنما کی وفات سے جو خلا پیدا ہو گیا تھا ہم سب نے مل کر اُسے پُر کرنے کا جتن کیا۔ ہم اُن کی کمزوریوں کو نظر انداز کر کے اُن کی موت کا ماتم کرنے لگے، جس کا حملہ اُن پر صرف اس لیے قبل از وقت ہوا کہ اپنی خرابی صحت کے باوجود وہ ملک کے مفاد کی خاطر مسلسل کام کرتے رہے۔ میں نے طے کر لیا کہ مجھے بہت جلد وکالت کو خیر باد کہہ کر سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی میں شریک ہو جانا چاہیے۔ پونا میں سوسائٹی کے کاموں کو دیکھنے اور عملی سیاسیات سے ذاتی واقفیت پیدا کرنے کے خیال سے میں نے بمبئی پروانشیل کانفرنس پونا میں بھی شرکت کا فیصلہ کیا۔

گاندھی جی بھی اس سال کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے تشریف لائے۔ انہوں نے بھی سوسائٹی کے اُسی مکان میں قیام کیا، جس میں سیشن کے دوران میں میرا قیام تھا۔ مہمان خانے میں گاندھی جی کے لیے جو کرسیاں اور میزیں مہیا کی گئی تھیں، انہوں نے وہاں سے ہٹوا دیں اور لوگوں سے ملنے جلنے اور کام کرنے کے لیے ایک دری پر اکتفا کی۔ اس مرتبہ مجھے گاندھی جی سے ملنے جلنے کا زیادہ موقع ملا۔ میں اب بھی انہیں ایک خوابیدہ آتش فشاں سمجھتا تھا، اگرچہ مجھے یہ نہیں یاد پڑتا کہ ان کی طرف سے مجھے کوئی آتشیں جھٹکا محسوس ہوا ہو۔

کانفرنس میں ان کی شخصیت چنداں اہم نہ تھی۔ انہوں نے کانفرنس میں صرف مسٹر گوکھلے کی وفات کے متعلق ایک تجویز پر ایک دو بار تقریر کی۔ مجھے معلوم ہوا کہ انہوں نے کانگریس پارٹی، جو مسٹر گوکھلے کے اعتدال پسند طبقہ کے ہاتھوں میں تھی اور مسٹر تلک کی انتہا پسند جماعت کے مابین سمجھوتہ کرانے کی بہت کوشش کی۔ اس مقصد کے لیے وہ مسٹر تلک کی خدمت میں بھی نیاز مندانہ حاضر ہوئے، لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ میری نظر میں کانفرنس کی وقعت ایک بزدلانہ مظاہرے اور بے جان تماشے سے زیادہ نہ تھی جس میں صرف مسٹر تلک اور ان کی طاقت ور قوم پرست جماعت ہی روح پھونک سکتی تھی۔

پونا سے واپس آنے کے بعد میں نے رسالہ "نوجیون" اور "ستیہ" جاری کیا۔ ۱۹۱۹ء میں یہ دونوں پرچے میں نے گاندھی جی کے حوالے کر دیے۔ جسے وہ اب بھی "ہفتہ وار گجراتی نوجیون" کے نام سے نکال رہے ہیں۔

سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی میں ایک عارضی رکن کی حیثیت سے شامل ہونے کے بعد مجھے گاندھی جی سے ملنے جلنے اور ذاتی طور پر اُن سے راہ و رسم پیدا کرنے کے مواقع بہت زیادہ ملے

میں انہیں احمد آباد کے کنج عافیت سے نکالنے اور وقت کے چند سیاسی مسائل پر اُن کی زبان سے کچھ کہلوانے کے لیے بہت بے چین تھا۔ انہیں دنوں مسٹر مینکل اور مسٹر چمن لال نے جنوبی افریقہ کے ہندستانیوں کی حالت کے متعلق حکومت ہند کے سامنے اپنی رپورٹ

پیش کی تھی۔ میں نے اس رپورٹ پر گاندھی جی کے اظہار خیال کے لیے بمبئی میں ایک جلسہ منعقد کرنے کی تجویز پیش کی اور ان سے بادب گزارش کی کہ وہ اس موضوع پر ضرور تقریر فرمائیں۔ گاندھی جی نے میری درخواست قبول فرمائی۔ وہ جلسہ کے دن بمبئی تشریف لائے۔ اور سوسائٹی کے اسی مکان میں ٹھیرے، جس میں اُن دنوں میرا قیام تھا۔

اس روز شام کو ایک عجیب بات رونما ہوئی۔ گیٹی تھیٹر میں اس بڑے جلسہ کا انتظام تھا جس میں اس قدر منہمک رہا کہ مسٹر گاندھی کو جلسہ میں لے آنا بھول گیا۔ بعد میں مجھے یہ معلوم کو کے بہت رنج ہوا کہ انہیں گرگام ہاوس سے جلسہ گاہ تک پا پیادہ تشریف لانا پڑا! اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُن دنوں ان کی حیثیت کیسی معمولی تھی، نیز یہ کہ وہ کس حد تک منکسر مزاج تھے کہ انہوں نے سواری تک مانگنے کی ضرورت نہ سمجھی۔

تھیٹر ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ساوتھ افریقن ریلیف ایسوسی ایشن کے صدر کی حیثیت سے مسٹر پٹیٹ نے جلسہ کی صدارت کی۔ مسٹر گاندھی نے اپنے اس خاص موضوع پر ایک گھنٹہ کے قریب تقریر کی۔ اب تک میں نے ان کی جتنی تقریریں سنی تھیں یہ اُن میں طویل ترین تھی لیکن ولولہ انگیز نہ تھی یہ ضرور ہے کہ انہوں نے ہندستانی مسائل پر ایک مبصر اور ماہر کی حیثیت سے تقریر کی۔ مسٹر ہیکنل اور مسٹر چمن لال نے اپنی تقریروں میں جن امور کا حوالہ دیا تھا، ان کی بھی انہوں نے اپنی تقریر میں ایک بے اثر اور کم زور پیرایہ میں وضاحت کی۔

میں نے گاندھی جی کو اُس رات، احمد آباد جانے والی ٹرین پر سوار کرانے کے لیے، انہیں تھیٹر سے فلابہ اسٹیشن تک پہنچا دینا ضروری سمجھا چنانچہ میں نے دوار کا داس جمنا داس صاحب سے درخواست کی کہ وہ از راہ کرم گاندھی جی کو اپنی موٹر پر اسٹیشن تک پہنچا دیں۔ موصوف نے میری درخواست بخوشی منظور فرمائی۔ موٹر پر اسٹیشن جاتے ہوئے مجھے پہلی بار گاندھی جی سے دلچسپ گفتگو کا موقع ملا۔ ہم نے ہندستان میں ان کی ہر دل عزیزی کا ذکر چھیڑتے ہوئے ان سے پوچھا کہ جب کبھی مستقبل میں وہ اپنی سول نافرمانی کی مہم شروع کریں تو کیا انہیں امید ہے کہ بہت سے لوگ ان کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جائیں گے؟ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا کہ "مجھے چنداں اس کی فکر نہیں کہ بہت سے لوگوں کو اپنا ہم نوا بناؤں"۔ وقت آنے پر سب کچھ ہو جائے گا۔ ہاں میں یہ ابھی سے کہے دیتا ہوں کہ ایک ایسا وقت بھی آئے گا کہ جب مجھے میرے اصولوں پر سختی سے عمل پیرا دیکھ کر خود میرے پیچھے چلنے والے مجھے دور اٹھا کر پھینک دیں گے ——— اس لیے کہ وہ میری باتیں نہ سمجھ سکیں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ میں سڑکوں پر بھٹکتا ہوا اور در بہ در . . . . روٹی کا ایک ٹکڑا مانگتا ہوا نظر آؤں گا۔ شاید یہ بھی مجھے نہ میسر آسکے"

ان الفاظ کا میرے دماغ پر گہرا اثر پڑا۔ مجھے یہ سن کر تعجب ہوا کہ کس طرح جب وہ چاہیں جادو کی چھڑی ہلا کر اپنے پیرووں کی ایک بڑی تعداد پیدا کر سکتے ہیں۔ مجھے ان زور تخیل پر بھی کچھ کم حیرت نہ ہوئی کہ وہ ابھی سے اُس دن کا خواب دیکھ رہے ہیں کہ جب ان کی قریب ترین پیرو انہیں دور اٹھا کر پھینک دیں گے اور ان کا پتھراو کریں گے۔

اس سے گاندھی جی کے متعلق میرے اولین تاثر کی تصدیق ہو گئی کہ ملک کی تباہی دور کرنے کے لیے اُن کے اندر ایک نہ بجھنے والی آگ ہے، خواہ وہ کتنے ہی خاموش کیوں نہ نظر آئیں۔

تھوڑی دیر میں ہم اسٹیشن پہنچ گئے۔ میں نے مصارف سفر کے لئے اُن کی خدمت میں دس روپیہ کا نوٹ پیش کیا۔ اسے شکریہ کے ساتھ قبول کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ "چونکہ میں ابھی آپ کی سوسائٹی کا ایک امیدوار رکن ہوں اس لیے اس رقم کو قبول کر لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا"۔ میں ان کے ناقابل فہم تبسم کو دیکھ رہا تھا کہ گاڑی پلیٹ فارم سے روانہ ہو گئی۔

چوتھا باب

آخری سرے پر

اِن دنوں مسز بسنیٹ کی ہوم رول کی تحریک شباب پر تھی، اور "نیو انڈیا" میں اُن کے مضامین ہمارے دلوں کو گرما رہے تھے۔ انہیں کچھ تو اس بنا پر کہ برطانیہ کی وجہ سے ہمارے ملک کو جو زبردست نقصانات پہنچے اُن کا ازالہ کیا جا سکے اور کچھ اس وجہ سے کہ پچھلی جنگ میں ہم نے جو قربانیاں کیں ہمیں اس کا ثمرہ ملے، ہندستان کو حکومت خود اختیاری دیے جانے پر خاص اصرار تھا۔ انہوں نے ہندستانیوں کو اپنی تنظیم کرنے اور ملک بھر میں اس تحریک کو پھیلانے کا مشورہ دیا۔ وہ چاہتی تھیں کہ اس تحریک کو کانگریس چلائے، مگر چونکہ اس وقت اس کے کل پرزے ڈھیلے پڑے ہوئے تھے، اس لیے انہوں نے ہوم رول لیگ کے نام سے ایک نئی جماعت بنا کر ہندستان کے لیے حکومت خود اختیاری کی مہم آغاز کرنے کا فیصلہ کیا۔

پونہ میں مسٹر تلک سے ملنے کے بعد مسز بیسنٹ بمبئی تشریف لائیں۔ نوجوان طبقہ قدرتی طور پر اُن کے جوشیلے پروپیگنڈے سے بہت متاثر ہوا۔ انہیں کی ترغیب سے میں نے اپنے دوستوں مسٹر بینکر اور مسٹر جمنا داس دوارکا داس کا ہاتھ ہفتہ وار انگریزی اخبار ینگ انڈیا کے اجرا میں بٹایا، جسے ہم نے ۱۹۱۹ء میں بدستور گاندھی جی کو سپرد کر دیا۔ اور جو آج ان کے زیر ادارت عالمگیر شہرت کا مالک ہے۔

انڈین نیشنل کانگریس کا سالانہ اجلاس بڑے دن کی چھٹیوں میں بمبئی میں منعقد ہونے والا تھا۔ اس کے لیے زور شور سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ وائسرائے کی مجلس انتظامیہ کے سابق رکن لارڈ سنہا جو اس زمانہ میں سر ستندر پرسن سنہا کے نام سے متعارف تھے، اس سیشن کی صدارت کے لیے منتخب کیے گئے تھے اور سر فیروز شاہ مہتا مجلس استقبالیہ کے صدر تھے، لیکن اجلاس شروع ہونے سے پہلے ان کا انتقال ہو گیا، اور اس طرح راستہ اس عظیم المرتبت اعتدال پسند رہنما سے صاف ہو گیا۔ اس موقع پر مسز بیسنٹ نے ہوم رول لیگ کے سنگ بنیاد رکھنے کے سوال پر غور و خوض کرنے کے لیے کچھ پختہ کار اور چند جوشیلے سیاسین کو ایک نجی جلسہ میں مدعو کیا

ہماری سوسائٹی کے صدر مسٹر شاستری مسز بیسنٹ کی تحریک اور ان کی رہنمائی قبول کرنے کی فوری ضرورت کے احساس سے بہت متاثر ہوئے، لیکن سوسائٹی کی باگ ڈور اعتدال پسند لوگوں کے ہاتھوں میں ہونے کے باعث وہ بے بس ہو گئے، پھر بھی نجی طور پر وہ مسز بیسنٹ کی تحریک میں حصہ لیتے رہے۔ چونکہ گاندھی جی کو مسز بیسنٹ کی تحریک سے کسی قسم کی دلچسپی نہ تھی، اس لیے انہیں مذکورہ نجی جلسہ میں مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ اختلافِ آرا کی وجہ سے جلسہ کسی نتیجہ پر پہنچنے سے پہلے ہی درہم برہم ہو گیا۔

اب کانگریس کا اپنا اجلاس شروع ہوا۔ گاندھی جی بھی شریک ہونے کے لیے بمبئی آئے اور انہوں نے مارواڑی ودیالیہ ہال میں جو انہیں دنوں بن کر تیار ہوا تھا قیام کیا۔ وہ اپنے چیلوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کے ساتھ آئے تھے اور ان کا قیام بہت معمولی اور سادہ طریقہ پر رہا۔ کچھ نوجوان طالب علموں اور جوشیلے مذہبی لوگوں کو چھوڑ کر بہت کم لوگوں نے ان سے ملنے کی کوشش کی۔ ان کی قیام گاہ میں عموماً کسی قسم کی چہل پہل نہیں رہتی تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک بار پنڈت مالویہ کچھ مشورہ کرنے کی غرض سے ان کے پاس گئے، مگر ایسے ممتاز

سیاسی رہنما شاذونادر ہی ان سے ملنے آتے تھے۔

مسٹر گاندھی نے کانفرنس میں کوئی نمایاں حصہ نہ لیا۔ انہیں ڈلیسے صدارتی میز کے بالکل آخری کنارے پر بیٹھنے کی جگہ ملی۔ تاہم جنوبی افریقہ کے مسائل پر مجلس مضامین میں ان سے خاص طور سے مشورہ کیا گیا۔ انہوں نے اس موضوع پر کھلے اجلاس میں بھی تقریر فرمائی۔

مجلس مضامین میں ہندستان کی آئینی ترقی کا اہم مسئلہ بھی چھڑا اور قرار پایا کہ اس مقصد کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی جائے جو آل انڈیا مسلم لیگ کی ایک مقرر کردہ کمیٹی کے اشتراک و تعاون سے نئے دستور ہند کا خاکہ مرتب کرے اور پھر اسے ہندستانیوں کے متحدہ مطالبہ کی حیثیت سے حکومت برطانیہ کے سامنے پیش کیا جائے۔ سیشن کے دوران میں کانگریس نے ایک اور اہم فیصلہ بھی کیا۔ اس کمیٹی کے مشورہ سے جو لکھنؤ کے پچھلے سالانہ اجلاس میں مقرر کی گئی تھی، کانگریس کے دستور میں کچھ ایسی تبدیلیاں کر دی گئیں کہ کانگریس میں مسٹر تلک کی انتہا پسند جماعت کے داخلہ میں آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ ہمیں معلوم ہوا کہ اس سمجھوتے کے کرانے میں گاندھی جی نے بھی مدد کی، مگر مجموعی حیثیت سے اس اہم اجلاس کی کارروائیوں میں ان کا حصہ قریب قریب نہ ہونے کے برابر رہا —— اور آج سولہ برس گزر جانے پر گاندھی جی لاکھوں ہندستانیوں کے مالک اور انڈین نیشنل کانگریس کے مختار مطلق ہیں۔ انہوں نے کس طرح ملک میں ہر دلعزیزی حاصل کی اور کیوں کر کانگریس پر اپنا اقتدار قائم کیا، میں آیندہ ابواب میں بیان کروں گا۔

پانچواں باب

رجعت پسندی کے مشورے

سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی میں شریک ہونے سے پہلے ہی مجھ پر انتہا پسند رجحانات کی ترویج و اشاعت کا شبہ کیا جا رہا تھا۔ ۱۹۱۵ء کے آخر میں یہ رجحانات اور بھی اجاگر ہو گئے۔ ہمارے "ینگ انڈیا" اور مسز بیسنٹ کے "نیو انڈیا" میں ہر ہفتے پرانے اعتدال پسند رہنماؤں پر لعن طعن کی بوچھاڑ کی جاتی اور ان سے ہوم رول کی نئی تحریک کی قیادت کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔ میرے احباب کھلم کھلا جلسوں اور مظاہروں کا انتظام کرتے جن میں روزانہ انتہا پسند خیالات کا پرچار زور شور سے کیا جاتا۔ میرے سوسائٹی کے رفقا میرے انتہا پسند پروپیگنڈے سے جو میں اندر باہر ہر جگہ کرتا تھا۔ تنگ آ گئے اور بالآخر انہوں نے مجھے سوسائٹی کی ناگپور والی شاخ میں منتقل کر دینے کا فیصلہ کیا۔ ناگپور ہی میں ۱۹۱۶ء کی سردیوں میں مجھے سوسائٹی کے ایک خفیہ سرکلر سے معلوم ہوا کہ گاندھی جی کو سوسائٹی میں شامل نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔

میں یہ ارادہ کر چکا تھا کہ جوں ہی مجھے کوئی موقع ملا بمبئی جا کر اپنا کام شروع کر دوں گا چنانچہ چند ہفتوں کی چھٹی لے کر میں نے وہاں کا رخ کیا۔ مسز بیسنٹ اس وقت تک ایک "آل انڈیا ہوم رول پروپیگنڈا بورڈ" قائم کر چکی تھیں، جس کے اہتمام میں انتہا پسندانہ خیالات کے کئی رسالے شایع کیے جا چکے تھے۔ مدراس، بمبئی، صوبہ جات متحدہ اور بنگال میں اس پروپیگنڈہ بورڈ کی صوبہ جاتی شاخیں قایم ہو چکی تھیں۔ اپنے ان رفقا کی جو ینگ انڈیا کے بانیوں میں تھے اور جو پروپیگنڈہ بورڈ کی بمبئی والی شاخ میں کام کر رہے تھے گجرات کے قصبات

اور دیہات تک ہوم رول کا حیات بخش پیغام پہنچانے کے لیے میں نے گجراتی زبان میں چند رسالے لکھے۔ یہ لاکھوں کی تعداد میں جلسوں میں تقسیم کیے گئے۔ جلسوں میں لاکھوں آدمیوں کی شرکت اور لوگوں کے جوش و خروش سے جو رسالوں کی اشاعت سے پیدا ہوا، اُس سیاسی بیداری اور سرگرمی کا بآسانی اندازہ کیا جا سکتا تھا۔ جو بمبئی اور اس کے دیہاتی علاقہ میں پھیل رہی تھی۔

انہیں "تاثرات سے تازہ دم میں احمد آباد پہنچا۔ اگرچہ فی الحقیقت میں گجرات کے لیے ایک سیاسی جماعت بنانے کی فکر میں تھا لیکن پہلے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ ایک گجرات پراونشیل کانفرنس کی بنیاد ڈالی جائے۔ اور اس کا اجلاس بمبئی پراونشیل کانفرنس کے اجلاس کے ساتھ جو ۱۹۱۶ء کے آخر میں احمد آباد میں ہونے والا ہے۔ منعقد کیا جائے۔ مقامی اعتدال پسند رہنماؤں کے ہاتھوں کچھ رکاوٹیں پیش آنے کے بعد احمد آباد کی گوکھلے سوسائٹی کی امداد و اعانت سے میں اس قابل ہو گیا کہ آیندہ چند مہینوں کے اندر احمد آباد میں اس ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس منعقد کر سکوں۔ اس سے فراغت پا کر میں گاندھی جی کے درشن کے لیے اُن کے آشرم میں گیا۔ وہ ان دنوں موضع کوچاراب کے قریب سرکھیج روڈ پر ایک چھوٹے سے بنگلہ میں قیام پذیر تھے۔ گاندھی جی اپنے چند چیلوں سمیت جن میں اکثر جسمانی مشقت بھی کرتے تھے، حسب معمول نہایت سادہ طریقہ پر دن گزار رہے تھے۔ ابھی نیشنل اسکول کا آغاز نہ ہوا تھا۔ آشرم کے گرد و پیش کوئی سیاسی ماحول نہ تھا اور ہر چیز ساکن و جامد نظر آتی تھی۔ گاندھی جی اپنا وقت کپڑے سینے، انہیں رفو کرنے کپڑا بُننے اور کبھی بیماروں کی تیمارداری میں کاٹتے ان کتابوں کا جو گاندھی جی اپنے ساتھ جنوبی افریقہ سے لائے تھے ایک چھوٹا سا کتب خانہ بھی تھا لیکن ویران اور سنسان۔ وہ اس علمی فضا اور سیاسی ماحول سے بالکل بے گانہ تھا، جو سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے مرکز احمد آباد کا طرہ امتیاز تھا۔

گاندھی جی کی خدمت میں باریاب ہونے کے بعد میں نے ان سے سیاسیات میں حصہ لینے کی گزارش کی۔ میری کوشش بے نتیجہ رہی انھوں نے اس وقت اپنے کو تمام سیاسی شورشوں سے الگ تھلگ کر رکھا تھا۔ نیز انہیں مسز بیسنٹ پر بھی اعتماد نہ تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ خواہ ہوم رول کی تحریک کسی شر انگیزی پر مبنی نہ بھی ہو، تاہم وہ ہندوستان کے لیے قطعی غیر نفع بخش ہے۔ غرض مجھے اُن سے وہ سیاسی رہنمائی یا پیغام عمل نہ مل سکا جس کی مجھے بہت کچھ توقع تھی۔ اور پھر مجھے مایوسی سے دوچار ہونا پڑا۔ ہاں میں نے آشرم میں بعض ایسی باتیں ضرور سنیں جن سے سیاسیات میں گاندھی جی کی آیندہ سرگرمیوں کے متعلق کچھ توقعات قایم ہوتی تھیں۔ ان دنوں سوامی ستیہ دیو ان کے پاس مقیم تھے۔ یہ ایک آتش نفس سیاسی آدمی تھے جو حقیقی سیاسی روشنی کی تلاش میں آشرم آئے تھے۔ ایک مرتبہ بات چیت کے دوران میں انہوں نے مجھے گاندھی جی کا وہ مخصوص جواب سنایا، جو انہوں نے ان کے (سوامی جی) کے ایک سوال پر دیا تھا۔ امی نے پوچھا تھا کہ کیوں کر اُن (گاندھی جی) کے اہنسا کا فلسفہ ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کو جنگجو پٹھان قبیلوں کے حملوں سے بچا سکتا ہے۔ گاندھی جی کا جواب بہت عجیب تھا۔ انہوں نے فرمایا۔ "ہمیں عدم تشدد پر عامل ایک ایسی فوج تیار کرنی ہوگی، جو رضاکارانہ طور پر پٹھان قبایل کے غیظ و غضب کا نشانہ بننے کے لیے آمادہ رہے اور ہندوستان کی سرزمین میں قدم رکھنے کے لیے ان پٹھانوں کو اُن کی لاشوں پر ہو کر آنا پڑے لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ بہادر لوگ اہنسا پر عامل اور مدافعت نہ کرنے والے ستیہ گرہیوں کو جان سے مارنا اور اُن کی لاشوں کو پامال کرنا پسند نہ کریں گے اور ان کے مضبوط دل سچائی اور پریم کی زبردست طاقت کے سامنے جھک جائیں گے۔ چنانچہ میری رائے کے مطابق جدید ترین اسلحہ اور مشین گنوں سے مسلح فوج کی بہ نسبت یہی ستیہ گرہی زیادہ بہتر طریقہ پر ہندوستان کا بچاؤ کر سکیں گے۔"

ان الفاظ سے مجھے اندازہ ہوا کہ کسی فوجی حملہ کا مقابلہ کرنے کے لیے گاندھی جی کا اہنسا کے اصول پر کیسا غیر متزلزل ایمان ہے۔ اب پھر مجھے یہ محسوس ہوا کہ انھوں نے اپنی طاقت کی باگ صرف اس لیے روک رکھی ہے کہ مناسب موقع ملنے پر اسے اور ڈھیلی کر سکیں مجھے اپنے اس یقین پر یہ معلوم کر کے اور بھی زیادہ اعتماد ہوا کہ عدم تشدد پر تھوریو کی کتاب روزانہ شام کو آشرم میں پڑھی جاتی تھی مجھے ماننا پڑا کہ جوں ہی گاندھی جی کو اس امر کا اطمینان ہو جائے گا کہ لوگوں کی ایک معقول تعداد محبت بھرے دلوں کے ساتھ ان کے پیچھے عدم تشدد کی راہ پر خلوص اور اعتماد کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہے تو وہ اپنی لڑائی چھیڑ دیں گے۔

کچھ دنوں کے بعد میں ناگپور واپس آگیا، ۱۲ جون کو پونا میں ہماری سوسائٹی کے یوم تاسیس کی سالانہ تقریب میں پھر مجھے گاندھی جی سے شرف نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا حقیقت میں یہ سوسائٹی کا بہت اہم جلسہ تھا کیونکہ مسٹر شاستری نے ملک بھر میں ہوم رول کا زبردست پروپیگنڈا کرنے کیلیے پوری سوسائٹی کو تیار کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ممبروں کی بہت بڑی اکثریت اس باب میں ان کی ہم نوا تھی۔ بمبئی اور پونا کے تھوڑے سے بااثر اور ممتاز ممبر جو سوسائٹی کے آغاز سے اس میں کام کر رہے تھے مسٹر شاستری کے خلاف تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس سے سوسائٹی سخت مصیبتوں میں گھر جائے گی اور اس راہ سے بھٹک جائے گی جو اس کے بانی مسٹر گوکھلے کی تجویز کی ہوئی ہے۔

۱۲ جون کی صبح کو ہم حسب معمول سوسائٹی کے بڑے لائبریری ہال میں اکٹھا ہوے۔ سوسائٹی کے ممبروں اور کارکنوں کے علاوہ اس موقع پر کچھ معزز مہمان اور ہمدرد بھی موجود تھے۔ گاندھی جی نے بھی جلسہ میں شرکت کی۔ جلسہ پر ایک غیر معمولی سکون اور تنانت کی فضا چھائی ہوئی تھی۔ جلسہ کی کارروائی مسٹر شاستری نے ایک پرزور، مدلل اور کافی طویل تقریر سے شروع کی۔ انھوں نے قدرے تفصیل کے ساتھ ہندستان کی اس امداد و اعانت کا تذکرہ کیا جو اس نے جنگ عظیم میں روپے اور آدمیوں سے برطانیہ کی کی تھی۔ انھوں نے اراکین کو اس سیاسی جذبہ پر قابو پانے اور اسے کارآمد بنانے کی فوری ضرورت سے آگاہ کیا جس کا مظاہرہ پورے ملک میں ہو رہا تھا۔ انھوں نے یہ بھی ثابت کر دکھایا کہ ان کا لائحہ عمل بالکل انھیں اصولوں کے مطابق ہے، جن پر مسٹر گوکھلے نے سوسائٹی کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اگر اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا گیا تو ہم لوگ ناکامی کے بھنور میں پھنس جائیں گے۔ اور بعد میں ہم بڑی سی بڑی خدمات کیوں نہ انجام دیں، کوئی قابل ذکر صلہ حاصل کرنے سے محروم رہ جائیں گے۔

سوسائٹی کے متعدد مقتدر اراکین نے مسٹر شاستری کی تائید کی۔ بہت کم لوگوں نے مخالفت کی۔ اب گاندھی جی اٹھے اور انھوں نے بے حد رجعت پسندانہ تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ وہ اس بات کے منکر نہیں کہ ہندستان کو حکومت خود اختیاری کا حق حاصل ہے۔ اور وہ برطانیہ کو ایک دشمن طاقت ماننے کے لیے بھی تیار ہیں لیکن وہ دشمن سے بھی فیاضانہ پیش آنا چاہتے ہیں۔ اس وقت یہ دشمن بہت بڑی طاقتوں کے مقابلہ میں ایک عالمگیر جنگ میں مبتلا ہے۔ اگر وہ اسے مدد نہیں دے سکتے تو ایک ایسے وقت میں جب کہ وہ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے، اس کی راہ میں رکاوٹیں اور مشکلات بھی نہیں ڈال سکتے۔ وہ لڑائی ختم ہونے کی راہ دیکھیں گے۔ اور اس وقت ہر ایسی تحریک کو جاری کرنے کے لیے تیار رہیں گے جو ان کی نظر میں باشندگان ملک کو ان کے جائز حقوق دلانے میں کارآمد معلوم ہوگی۔ بہرحال اس تقریر کا چنداں اثر نہ ہوا۔ مسٹر شاستری نے اپنی جوابی تقریر میں یہ بات بآسانی صاف کر دی کہ جب کنیڈا اور اسٹریلیا جیسی خود مختار نوآبادیاں اس امداد کی بنا پر جو انھوں نے اوائل جنگ میں برطانیہ کو دی تھیں۔ دوران جنگ ہی میں تاج برطانیہ کے تحت مزید حقوق کا شد و مد سے مطالبہ کر رہی ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندستان اس زریں موقع کو ہاتھ سے جانے دے اور اپنے حقوق کا مطالبہ نہ کرے غرض کہ بالآخر اس معتدل جماعت نے بھی بعض اراکین کی بوکھلاہٹ اور گاندھی جیسے چند کرم فرماؤں کی مخالفت کے باوجود ہوم رول کی تحریک چلانے کا قریب قریب عملی فیصلہ کر ہی لیا۔

چھٹا باب

پہلی کامیابی

تھوڑے ہی دنوں بعد مسٹر تلک کے تعاون سے مسز بسنٹ نے پونہ میں آل انڈیا ہوم رول آرگنائزیشن کی بنیاد رکھی۔ سارے ہندستان میں عموماً اور مدراس اور بمبئی میں خصوصاً مقامی اور صوبائی شاخیں قایم کی گئیں۔ روزانہ بڑے بڑے جلسے منعقد ہونے لگے۔ ایسے بڑے کہ جن کی نظیریں پہلے بہت کم دیکھنے میں آتی تھیں۔ ان عام جلسوں میں مسٹر تلک مسٹر ہارنیمن اور بعض دوسرے مقامی لیڈر لاکھوں آدمیوں کو سیاست کا درس دینے لگے۔ ہوم رول کی تحریک خطرناک آگ کی طرح چاروں طرف پھیل گئی اس کے متعلق رسالے اشتہارات اور اعلانات وغیرہ بڑی تعداد میں چھاپ کر ہر جگہ تقسیم کیے گیے اور ہوم رولی اخباروں کی اشاعت دن دونی رات چوگنی بڑھنے لگی۔

میرے ینگ انڈیا کے رفیقوں نے ہوم رول لیگ کی بمبئی والی شاخ کی بہت بڑے وسیع پیمانے پر تنظیم شروع کی۔ انہوں نے اُن نئے مقامی لیڈروں کو جو پرانے اعتدال پسند گروہ سے وابستہ نہ تھے اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی اس کے علاوہ گاندھی جی کو بھی اپنے ساتھ گھسیٹنا چاہا لیکن ان کی کوششیں بار آور نہ ہوییں

اس کے کچھ دنوں بعد مسٹر ایم۔ اے جناح کی صدارت میں بمبئی پراونشیل کانفرنس احمد آباد میں منعقد ہوئی۔ میری گجرات ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت سر چمن لال سیتلواد نے کی۔ ان دونوں جلسوں سے گجرات میں جواب تک سیاسی تحریکوں میں بہت پیچھے سمجھا جاتا تھا۔ بہت جوش وخروش پیدا ہوا۔ بہرحال کانفرنس کا یہ اجلاس اس کے پچھلے اجلاس پونہ سے کئی حیثیت سے کامیاب ثابت ہوا۔ گاندھی جی نے دونوں کانفرنسوں میں شرکت کی اور چند رسمی معاملات اور غیر اہم تجویزوں پر تقریریں بھی کیں۔ لیکن انہوں نے شاید ہی کوئی ایسی بات کہی ہو جس کا اثر ان دونوں کانفرنسوں کے فیصلہ پر پڑا ہو۔

انڈین نیشنل کانگریس کے آنے والے اجلاس کے انتظامات میں ہاتھ بٹانے کے لیے جو دسمبر کے آخر ہفتہ میں لکھنؤ میں منعقد ہونے والا تھا عارضی طور پر میرا تبادلہ لکھنؤ کر دیا گیا۔ حکومت خود اختیاری کے فوری مطالبے کے ضمن میں صوبہ جات متحدہ کے جوش وخروش کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ ان دنوں سر تیج بہادر سپرو پورے صوبہ کا دورہ کر رہے تھے۔ اور اس موضوع پر جوش خروش سے لبریز جلسوں میں تقریریں کر رہے تھے۔ انہوں نے پنڈت گوکرن ناتھ مصرا نے امین آباد پارک لکھنؤ کے کئی بڑے جلسوں میں تقریریں کیں اور لوگوں سے ہوم رول کے جھنڈے تلے جمع ہونے اور کانگریس کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے کی اپیل کی۔

کانگریس کا ہفتہ سر پر آپہونچا۔ ملک کے ہر حصہ سے ہزاروں نمایندے اس تاریخی اجلاس میں شریک ہونے آئے۔ پورے نو برس کے بعد مسٹر تلک بھی دکن اور سی پی کے نمایندوں کی ایک اچھی خاصی فوج کے ساتھ کانگریس کے اس اجلاس میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے۔ قدرتی طور پر وہ ایک قومی ہیرو اور کانگریس کی توجہات کا مرکز خاص بنے ہوے تھے۔ ان کی شرکت نتیجہ تھی اس سمجھوتے کا، جو پچھلے سال بمبئی کانفرنس میں انتہا پسندوں اور اعتدال پسندوں کے مابین ہوا تھا۔ جب وہ پلیٹ فارم پر تشریف لائے تو پر زور تالیوں سے اُن کا خیر مقدم کیا گیا۔ ہندستان میں حکومت خود اختیاری کے قیام کے متعلق انہوں نے جو صور یہاں پھونکا اُس پر کانگریس کے

ہزار ہا شرکا اور حاضرین نے پرجوش نعرہائے تحسین بلند کیے۔

ان ہی ایام میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان فرقہ وارانہ سمجھوتے کے لیے بھی جلسے ہوتے رہے۔ اس راہ میں بعض وقت کچھ ایسی مشکلات بھی پیدا ہوئیں کہ سمجھوتے کے توقعات مشتبہ نظر آنے لگے لیکن بالآخر رواداری اور قوم پرستی ہی کے جذبہ کو کامیابی نصیب ہوئی اور دونوں جماعتیں حکومت خود اختیاری کی ایک مشترکہ اسکیم بنانے میں کامیاب ہوگئیں یہ اسکیم جو کانگریس لیگ اسکیم کے نام سے مشہور ہے کانگریس اور مسلم لیگ کے عام اجلاسوں میں بیک وقت منظور کی گئی۔ بے شک یہ تاریخی واقعہ ہے کہ اس فرقہ وارانہ سمجھوتے کی قریب قریب تمام دفعات مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ میں شامل کرلی گئیں اور جو بالآخر ۱۹۱۹ء کی نئی اصلاحات میں بروئے کار آئیں۔

اپنی پرانی عادت کے مطابق گاندھی جی نے اس تاریخی اجلاس میں بھی بہت کم حصہ لیا۔ عام طور پر یہ افواہ گرم تھی کہ انہوں نے بعض کٹر ہندو لیڈروں کو اندر ہی اندر یہ مشورہ دیا کہ وہ فرقہ وارانہ سمجھوتے کے تصفیہ میں مسلم رہنماؤں کے سامنے ذرا اور اکڑے رہیں لیکن جہاں تک مجلس مضامین اور کھلے اجلاس کا تعلق تھا انہوں نے خاموش رہنا ہی مناسب خیال کیا اگرچہ وہ ہر بات کو بڑی توجہ سے سنتے رہے۔

کچھ بھی ہو لیکن گاندھی جی وقت کی آواز سے بے بہرہ نہ تھے۔ اب تک انہوں نے گجرات اور ملک کے دوسرے حصوں میں جو تقریریں کی تھیں ان میں انہوں نے سماجی مسایل کم سنی کی شادی، چھوت چھات اونچی جاتیوں اور مذہبی ٹھیکہ داروں کے مظالم اور نام نہاد مذہبی رسوم پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ ہماری سوسائٹی میں اکثر یہ چرچا ہوا کہ وہ اس وقت دوراہے پر کھڑے ہیں۔ حکومت کے خلاف کسی سیاسی جنگ کے شروع کرنے کے متعلق اُن کے ذاتی خیالات کچھ ہی کیوں نہ رہے ہوں، لیکن انہیں محسوس کرنا پڑا کہ جنگ عظیم کے اثر سے عوام میں جو سیاسی زندگی اور بیداری پیدا ہوئی اُس نے ان کے لئے اس کے سوا اور کوئی راہ نہیں چھوڑی کہ وہ فوراً ہی کسی نتیجہ پر پہنچ جائیں۔ انہیں قطعی طور پر فیصلہ کرنا تھا کیا تو وہ مذہبی اور سماجی اصلاحات کے منزل پر گام زن ہوں جس پر اُن کی کوششوں کو عوام میں بہت کم قبولیت حاصل ہوئی تھی' یا انہیں سیاسی سیلاب کے ساتھ جب کہ وہ پورے جوش پر تھا چلنا چاہئے اور کوئی نہ کوئی سیاسی تحریک شروع کرنی چاہئے خواہ اس کا دائرۂ عمل کتنا ہی محدود اور ہوم رول کی شورش سے جو اُن دنوں زوروں پر تھی بالکل ہی مختلف کیوں نہ ہو۔ مجھے یقین ہے کہ انہوں نے لکھنؤ سیشن کے دوران میں وقت کے تقاضے کو اچھی طرح سمجھ لیا۔ اور غالباً اسی وقت انہوں نے اپنے مخصوص طریقہ پر اس سیاسی جوش وخروش کی رہنمائی کا فیصلہ کیا جو پورے ملک پر چھایا ہوا تھا۔

یہ صحیح ہے کہ لکھنؤ سیشن سے پہلے ہی وہ پابند[ہ] مزدوروں اور ویرگام کے محصول خانوں پر حکومت ہند سے خط وکتابت کر رہے تھے حقیقت میں انہوں نے خواہ کتنے ہی محدود رنگ میں سہی، مگر ملک کی عملی سیاسی زندگی میں شامل ہونے کا یادگار فیصلہ لکھنؤ ہی میں کیا تھا جیسا کہ انہوں نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھا ہے یہیں راج کمار شکلا نامی ایک شخص نے انہیں چمپارن (صوبہ بہار) آنے کی دعوت دی تاکہ وہ ان قابل رحم کسانوں کے مصائب کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں جو وہ انگریز اجارہ داروں کے ہاتھوں اٹھا رہے تھے۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ چمپارن کے ایک وکیل بابو برج کشور پرشاد نے جو بعد میں چمپارن کسان تحریک میں گاندھی جی کے ایک بہت ممتاز نائب ثابت ہوئے کانگریس کے اس اجلاس میں باشندگان چمپارن کی ہمدردی میں ایک تجویز بھی منظور کرائی' تاہم گاندھی جی نے مسٹر شکلا سے کہا کہ جب تک وہ خود اپنی آنکھوں سے سارے حالات کا مشاہدہ نہ کرلیں وہ اپنی رائے ظاہر نہیں کر سکتے۔ انہوں نے اس معاملہ پر غور وخوض کرنے کے لیے مہلت مانگی۔ اور آخر کار انہوں نے وعدہ کیا کہ اپنے آیندہ دورے کے پروگرام میں چمپارن کے

ــہ وہ مزدور جو ٹھیکہ داروں یا سرمایہ داروں سے ایک مقررہ معیاد کے لیے اجرت کا معاملہ طے کرلیتے ہیں۔

لیے بھی ایک دو دن نکالیں گے لیکن فی الحقیقت انہوں نے ۱۹۱۷ء کے شروع میں جب کہ وہ کلکتہ میں تھے، چمپارن کے دورہ کی تاریخ مقرر کی۔ چمپارن پہنچ کر وہ کسانوں کی قابل رحم حالت اور حکومت اور انگریز اجارہ داروں کی بے رحمانہ سختیوں سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ انہیں اس صوبہ میں دو سال سے زیادہ اپنے کام کو جاری رکھنے پر مجبور ہونا پڑا۔

جنوری ۱۹۱۷ء میں جب میں بمبئی واپس آیا تو میں نے گاندھی جی کو گجرات کے ایک چھوٹے سے شہر گودھرا چلنے پر راضی کر لیا جہاں ۱۹ فروری کو مسٹر گوکھلے کی برسی منائی جانے والی تھی۔ میں گودھرا اسٹیشن پر گاندھی جی سے ملا۔ اس چھوٹے سے شہر کی گلیوں میں اُن کا شاندار جلوس نکالا گیا۔ غالباً یہ اُن کی زندگی میں پہلا موقعہ تھا کہ ہندستان میں انہیں یہ اعزاز نصیب ہوا۔ سینکڑوں ہندو مسلمان مرد عورتوں نے اس برگزیدہ مہمان کی خدمت میں اپنی عقیدت اور احترام کا خراج پیش کیا۔ گاندھی جی نے یہاں دو جلسوں میں تقریر کی۔ پہلے جلسہ میں انہوں نے آنجہانی محب وطن (مسٹر گوکھلے) کے کارناموں اور پیغام پر تقریر کی۔ حقیقت میں ان کی یہ تقریر محاربانہ سیاسی جوش و خروش سے خالی تھی اور محض عوام کی ہدایت و تلقین کے لئے کی گئی تھی۔ صرف ذیل کے اس جملہ نے مجھے بہت متاثر کیا:۔

"اس وقت پورے ملک میں سیاسی جوش و خروش کا ایک سیلاب موجزن ہے جو اپنی وسعتوں کے لحاظ سے گنگا کی طغیانی سے کم نہیں لیکن جمہور کے قبضہ قدرت میں نہ ہونے کے باعث یہ سیلاب بیکار اور ضایع جا رہا ہے۔"

اُن کا مطلب یہ تھا کہ اس سیلاب کو روک کر کار آمد راستوں پر ڈالا جائے۔ اس طرح انہوں نے کم و بیش اس انقلابی ہیجان کے وجود کو تسلیم کر لیا تھا جو پورے ملک پر مسلط تھا چنانچہ اب انہوں نے اس جوش و خروش کی رہنمائی کرنے کا تہیہ اس نہج سے کیا کہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کیا جا سکے۔ دوسرے جلسہ نے گاندھی جی کے عملی سیاسیات میں داخل ہونے کی امید کو اور قوی کر دیا۔ انہوں نے پابند مزدوری کے موضوع پر تقریر کی اور بتایا کہ اس کی رو سے ہزاروں ہندستانی مزدور اپنا گھر بار چھوڑ کر جنوبی افریقہ اور دوسرے برطانوی نوآبادیوں میں بالکل غلاموں کی طرح کام کرنے پر مجبور تھے۔ انہوں نے بہت تفصیل سے جنوبی افریقہ میں ان پریشان حال مزدوروں کے مصائب کا نقشہ کھینچتے ہوے حاضرین سے تجویز کی تائید اور اس وحشیانہ طریقہ کے انسداد کی اپیل کی۔

ان کی تجویز معمولی اور نمائشی نہ تھی جس کے ہم اپنے روزمرہ کے جلسوں میں عادی ہو چکے تھے اس تجویز کے ذریعہ انہوں نے حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ ایک خاص قانون کے تحت بہر حال ۳۱ مئی ۱۹۱۷ء سے پہلے اس غلامانہ طریقہ کا خاتمہ کر دیا جائے اس تجویز کی ندرت نے جو عملاً ایک الٹیمیٹم کی حیثیت رکھتی تھی۔ ہمیں بے حد متاثر کیا۔ اور ہمارے اندر ایک ولولہ سا پیدا کر دیا گاندھی جی نے ہم سے کہا۔ "۳۱ مئی کو یاد رکھنا۔ وقت کا تعین بے معنی نہیں۔ اگر مقررہ وقت تک حکومت نے شکایت کا ازالہ نہ کیا تو اس ظلم و جور کی اصلاح کے لیے ہمیں نہ صرف جیل جانے بلکہ مرنے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔"

اگرچہ گاندھی جی نے یہ الفاظ بڑے ٹھنڈے پیرایہ میں کہے، مگر میں اُن کے دل میں سلگنے والی آگ کی گرمی سے بہت متاثر ہوا میں نے دیکھا کہ آخر کار انہیں میدان جنگ میں کودنا ہی پڑا۔ اگر ۳۱ مئی تک حکومت نے اُن کے مطالبات تسلیم نہ کیے تو نہ جانے وہ کس قسم کا اقدام کریں۔ اس کے متعلق ضرور مجھے کچھ تشویش پیدا ہوئی۔

انہوں نے ایک ہی جلسہ میں تجویز منظور کرانے پر اکتفا نہ کی بلکہ امپیریل سٹیزن شپ ایسوسی ایشن بمبئی کو بھی اسی قسم کی تجویز پاس کرنے کا مشورہ دیا۔ انہوں نے مسز پیٹٹ کو بھی صلاح دی کہ وہ خواتین کے ایک وفد کے ذریعہ وائسرائے کے سامنے اس مطالبہ کو پر زور طریقہ پر پیش کریں۔ وہ خود بھی شملہ سے لکھا پڑھی کر رہے تھے۔ غالباً اُن کا خیال تھا کہ اگر مطالبہ ہر گوشے سے پیش کیا گیا تو اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جائے گی

چند ہفتوں کے بعد ہی مجھے اخبار نویسوں کی اس جماعت کے ساتھ عراق جانا پڑا جسے حکومت نے ہندستانی فوج مقیم عراق کی تحقیق حالات کے لیے مقرر کیا تھا۔ میں بصرہ سے ۱۱۵ میل دور عمارہ کے اسپتال میں نمونیا میں مبتلا تھا کہ میں نے ایک ہندستانی پرچہ میں پڑھا کہ حکومت نے اپریل سے ایک خاص قانون کے تحت پابند مزدوروں کی برآمد کو روک دیا ہے۔ درحقیقت ہندستان میں یہ گاندھی جی کی پہلی کامیابی تھی۔ اس کے بعد ہی ایک دوسرے ہندستانی اخبار میں یہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ گاندھی جی ایک نئی آفت میں مبتلا ہو گئے۔ وہ کسانوں کی شکایات کے بارے میں چھان بین کرنے چمپارن گئے ہوے تھے کہ انہیں اس ڈویزن کے کمشنر نے ۲۴ گھنٹے کے اندر چمپارن چھوڑ دینے کا حکم دے دیا۔ گاندھی جی نے اس حکم کی تعمیل نہ کی۔ اب میں اُن کی چمپارن والی مہم کا حال لکھوں گا۔

ساتواں باب

چمپارن میں اصلاحی کام

گاندھی جی اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھتے ہیں کہ چمپارن راجہ جنک کا ملک ہے جس طرح وہاں آم کے باغوں کی کثرت ہے اسی طرح ۱۹۱۷ء تک وہ نیل کے کھیتوں سے بھرا پڑا رہتا تھا چمپارن کا کسان قانوناً اپنی زمین کے ۳/۲۰ حصہ میں اپنے زمیندار کے لیے نیل کی کاشت کرنے پر مجبور تھا۔ اس طریقہ کو "تِن کٹھیا" کہتے تھے۔ اسی زیادتی اور ظلم کا قلع قمع کرنے گاندھی جی وہاں گئے تھے۔

گاندھی جی کے الفاظ چمپارن کی مصیبتوں کو اچھی طرح واضح نہیں کرتے۔ صوبہ بہار کے دوسرے اضلاع کی طرح اس ضلع کی زمینیں بھی بڑے زمینداروں کے قبضہ میں ہیں، جو انھیں خون چوسنے والی شرائط پر غریب کسانوں کو اٹھاتے رہتے ہیں۔ اس میں ۲۸۴۱ دیہات ہیں اور اس کی مجموعی آبادی ۱۹ لاکھ افراد پر مشتمل ہے۔ ان میں بہت بڑی تعداد ان نیم فاقہ کش، ان پڑھ اور مصیبت زدہ کسانوں کی تھی جو زمینداروں کے ظلم وستم سے پسے جا رہے تھے۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ ان میں سے بہت سے زمینداروں نے جو قرضوں کے انبار میں دبے ہوے تھے کچھ آراضی نیل کاشت کرنے والے انگریزوں کو بیچ دیں یا ٹھیکہ پر دے دیں۔ چنانچہ ان انگریز زمینداروں اور اجارہ داروں نے پچھلے پچاس ساٹھ سال میں نیل کی کاشت اور تجارت سے خوب فائدہ اٹھایا تھا، اور ایک ایسا طریقہ جاری کیا تھا، جس کے رو سے وہ کسانوں کو زمین کے ایک مقررہ حصہ پر نیل کی کاشت کرنے پر مجبور کرنے کے مجاز تھے۔ چونکہ نیل کی کاشت کسانوں کے لیے بالکل غیر نفع بخش تھی اس لیے وہ اجارہ داروں کے خلاف صف آرا ہونے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ ۱۸٦٧ء میں نیل کی کاشت کا جبری رقبہ پانچ کٹھے سے گھٹا کر تین کٹھا کر دیا گیا۔ لیکن پھر بھی اجارہ دار کسانوں کو قرض دے دے کر انھیں اپنی مرضی کے مطابق نیل کی کاشت پر مجبور کرتے رہے۔ پہلے یہ لوگ کسانوں کو نیل کی کاشت کے لیے ساڑھے چھ روپیے فی ایکڑ کے حساب سے اجرت دیا کرتے تھے لیکن ۱۸۷٦ء میں حکومت کے دباؤ سے یہ رقم نو روپیے کر دی گئی۔ اس سے بھی کسانوں کی بے چینی کا خاتمہ نہ ہو سکا، جس کا ثبوت اُن کے ان ہنگاموں سے ملتا ہے، جو وقتاً فوقتاً اس اثنا میں برپا ہوتے رہے۔ بالآخر ۱۸۹۷ء میں یہ رقم بارہ روپیے اور ۱۹۰۹ء میں ساڑھے تیرہ روپیے کر دی گئی۔ کسانوں سے یہ وعدہ بھی کیا گیا کہ جس رقبہ میں وہ نیل کی کاشت کریں گے، اس کا پورا لگان معاف کر دیا جائے گا، لیکن یہ وعدہ کبھی شرمندہ وفا نہ ہوا

اس ضلع میں کاشتکاری کے اور کئی طریقے بھی رائج تھے مثلاً پٹنہ ڈویزن کے کمشنر نے ایک خاص قسم کے پٹے کے بارے میں لکھا ہے کہ:۔

"کرتالی پٹہ کاشتکاری کے اس نئے دستور کا نام ہے جو پچھلے چند سالوں سے رائج ہے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے اس کا چلن پھیلا۔ اگرچہ ہم نے بہترین قوانین وضع کرنے کی کوشش کی لیکن پھر بھی کرتالی پٹہ کا یہ طریقہ فروغ ہی پاتا رہا۔ اس کی رو سے بیچارہ کسان اپنی کل جائداد شاید اپنی زندگی سے بھی طویل مدت کے لئے گرو رکھ دیتا ہے۔ یہ رہن صرف اسی صورت میں چھوٹ سکتا ہے جبکہ وہ قرضہ ادا کر دے، دوسرے لفظوں میں جس کا مفہوم یہ ہوا کہ وہ عمر بھر کے لیے اپنے کو بیچ کر قرض خواہ کا بے بس غلام ہو جاتا ہے"

انگریز زمینداروں اور اجارہ داروں کے لیے نیل کی کاشت اس قدر نفع بخش ثابت ہوئی کہ انہوں نے ۱۸۵۲ء سے ۱۸۹۹ء تک کسانوں کو ہر سال پنچانوے ہزار نو سو ستر ایکڑ زمین پر نیل کی کاشت کے لئے مجبور کیا۔ نیل کے کارخانوں میں قریب تینتیس ہزار مزدور کام کرتے تھے۔ اس صدی کے شروع میں جرمنی کی مصنوعی نیل کی ایجاد اور رواج سے نیل کی کاشت کو بہت بڑا دھکا لگا۔ چمپارن کے علاقہ میں بھی جرمنی کی اس مصنوعی نیل کا اثر پہنچا اور نیل کی کاشت کا رقبہ جو ۱۹۰۵ء میں سینتالیس ہزار آٹھ سو ایکڑ پر مشتمل تھا گھٹ کر ۱۹۱۴ء میں صرف سوا ایکڑ رہ گیا لیکن جنگ عظیم کے آغاز اور جرمنی کی نیل کی درآمد رک جانے کی وجہ سے پھر بہار کی قسمت کھل گئی اور پھر نیل کی کاشت کا رقبہ ۱۹۱۶ء میں اکیس ہزار نو سو ایکڑ اور ۱۹۱۷ء میں چھبیس ہزار آٹھ سو اڑتالیس ایکڑ تک بڑھ گیا۔

غرض کہ گاندھی جی کا چمپارن جانا صرف اس مقصد سے تھا کہ نیل کے کاشت کے رقبہ کو جو جنگ سے پہلے نفی کے برابر تھا زیادہ بڑھنے نہ دیا جائے۔ جب نیل کے زمینداروں اور اجارہ داروں نے دیکھا کہ اس صدی کے ابتدائی چودہ سالوں میں ان کا نفع بتدریج کم ہوتا رہا تو انہوں نے کاشتکاروں پر جو برائے نام نیل کی کاشت کرتے تھے ایک عجیب و غریب ٹیکس لگانا شروع کیا۔ جنگ کے اتفاقیہ چھڑ جانے سے نیل کی کاشت ختم ہونے سے بچ گئی لیکن کاشتکاروں سے یہ زائد ٹیکس صرف اس بنا پر وصول کیا جانے لگا کہ اب انہیں اپنی زمینوں میں نیل کے علاوہ دوسرے اجناس کی کاشت کی بھی اجازت دے دی گئی تھی۔ چنانچہ چمپارن میں گاندھی جی کا مشن نیل کی جبری کاشت موقوف کرانے کے علاوہ اس نئے محصول کی تنسیخ پر بھی حاوی تھا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ پچھلے چالیس برس سے اس علاقہ کے کسان انگریز زمینداروں اور اجارہ داروں کے خلاف شورشیں برپا کرتے چلے آرہے تھے۔ اُن کے کارندوں کو زدوکوب کرتے اور کبھی کبھی اُن کی جانیں لینے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ ان کے مکانوں اور کارخانوں کو بھی نذر آتش کرتے۔ عام غیظ و غضب کے اس جوش نے حکومت کو کسانوں کی شکایتوں کی تحقیقات پر مجبور کر دیا اور کئی مرتبہ زمینداروں اور اجارہ داروں کے حقوق میں قطع و برید کرنے کی کوشش کی گئی۔ اب جنگ کے چھڑنے اور نیل کی از سرنو جبری کاشت نے پھر کسانوں کو مشتعل کر دیا جس سے پتہ چلتا تھا کہ اگر ان کی شکایتیں دور کرنے کی طرف فوری توجہ نہ کی گئی تو وہ ہنگامے پیدا کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھیں گے۔

غرض کہ ان حالات میں گاندھی جی میدان میں داخل ہوئے۔ قدرتی طور پر ہزاروں جاہل کسان ان کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ حکومت اور زمیندار دونوں گاندھی جی کی سرگرمیوں اور تحقیقات سے گھبرا سے گئے، اور کمشنر نے انہیں ضلع سے نکال باہر کر دینا ہی مناسب خیال کیا۔ لیکن گاندھی جی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ظاہری آثار و قرائن کے بالکل خلاف ان کی سرگرمیاں یکسر غیر انقلابی تھیں اُن کے پیش نظر زمینداروں اور اجارہ داروں کی اُس دوعملی کا خاتمہ نہ تھا، جس نے عملی طور پر کسانوں کو غلام بنا کر چھوڑ دیا تھا بلکہ وہ محض ان کی بعض بڑی شکایات کی تحقیقات کرنے گئے تھے۔ دوسرے لفظوں میں ان کے جانے کی غرض اس کے سوا کچھ نہ تھی، کہ وہاں کے زمینداری طریقوں میں کم و بیش اسی قسم کی اصلاحات کرائیں، جیسی پہلے خود حکومت نے کسان ہنگاموں کو فرد کرنے کے لیے کی تھیں۔

اگرچہ چمپارن تشریف لے جانے میں گاندھی جی کے سامنے نہایت معتدل مقاصد تھے، تاہم ۱۸ اپریل ۱۹۱۷ء کا دن ہندستان

کی تاریخ میں یادگار حیثیت رکھتا ہے کہ اسی روز گاندھی جی مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیے گئے۔ انھوں نے چمپارن چھوڑنے کے بارے میں مجسٹریٹ کے حکم کی خلاف ورزی کا اعتراف کیا۔ اس موقع پر انہوں نے ایک بہت قابل ذکر بیان دیا۔ ہندستان کے قوم پرست اخباروں نے ان کے بیان کی خوب اشاعت کی اور اس پر نوٹ لکھے۔ انھوں نے اپنے بیان میں اس امر پر خاص طور سے زور دیا کہ ان کا چمپارن آنا انسانی اور قومی خدمات کے پیش نظر اور بشرط امکان حکومت اور زمینداروں کے اشتراک و تعاون سے کسانوں کے حالات معلوم کرنے کے لیے تھا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ "ایک پُرامن اور پابند قانون شہری ہونے کی حیثیت سے مجھے وہ حکم ماننا چاہیے تھا جو مجھ پر عاید کیا گیا لیکن یہ اسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ میں اپنے احساس فرض اور ضمیر کی اس آواز پر دھیان نہ دوں جس کی پکار پر میں یہاں آیا۔" انھوں نے اپنا بیان حسب ذیل الفاظ پر ختم کیا۔

"مجھے اس حقیقت کا پوری طرح احساس ہے کہ ہندستان کی سیاسی اور قومی زندگی میں مجھ جیسی حیثیت والے آدمی کو کسی نئی مثال کے قائم کرنے میں کافی محتاط ہونا چاہیے۔ لیکن اس الجھے ہوئے دستور کو دیکھتے ہوئے جس میں ہم سب اپنے دن کاٹ رہے ہیں میرا یہ بھی کامل یقین ہے کہ اس صورت حال میں کسی باعزت اور خود دار شخص کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں جو میں نے اختیار کیا یعنی احتجاج اور مزاحمت کے بغیر قانون شکنی کی سزا بھگت لینا"

گاندھی جی نے بالکل صحیح فرمایا کہ یہ قانون شکنی کا پہلا عملی سبق تھا جو قوم کو ملا۔ اُن کے عمل اور بیان نے قوم کو درطۂ حیرت میں ڈال دیا عوام اس درویش سیاست داں کی غیر معمولی جرأت اور بہادری سے متاثر ہوئے جس نے بالآخر حکومت برطانیہ کے خلاف اپنی مہم کا آغاز کر ہی دیا۔ انھوں نے گاندھی جی کو ایک بڑا انقلابی رہبر سمجھ لیا۔ اُن کا یہ خیال غلط تھا۔ گاندھی جی انقلابی رہنما نہ تھے بلکہ دل سے اعتدال پسند تھے۔ وہ اپنی تحریک کو بہت محدود حلقہ میں رکھنا چاہتے تھے اور انہوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ کانگریس کے نام پر کوئی کام نہ کیا جائے یہاں تک کہ انھوں نے کسانوں کو کانگریس کے لفظ سے بھی آشنا نہ کیا۔ ان کے کچھ پرجوش پیرووں مثلاً بابو راجندر پرشاد وغیرہ نے لاکھ چاہا کہ ساتھ ہی ساتھ ہوم رول کا پروپاگنڈہ بھی کیا جائے جس کا اثر اس وقت سارے ملک پر چھایا ہوا تھا مگر گاندھی جی نے ایک نہ سُنی اور ان کی کوششیں اکارت گئیں۔ گاندھی جی کے سول نافرمانی کے عظیم الشان کارنامے کی وجہ سے پبلک اور پریس ان کی تحریک سے بڑی دلچسپی لینے لگے۔ پریس والوں نے ان کی سرگرمیاں معلوم کرنے کے لیے ان کی خدمت میں اپنے نمائندے بھی بھیجنے چاہے لیکن انھوں نے یہ کورا جواب دیا کہ ان کی تحقیقات کو پریس کے نمائندوں یا اخبارات کے افتتاحی مقالوں کی تائید کی ضرورت نہیں کیوں کہ اُن کی رائے میں چمپارن کی صورت حال کچھ اس درجہ مشکل اور نازک تھی کہ زیادہ جوشیلی تنقید یا مبالغہ آمیز خبروں سے انکے اس مقصد کو نقصان پہنچنے کا احتمال تھا جسے لے کر وہ کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے پنڈت مالویہ جیسے اعتدال پسند لیڈر کو بھی چمپارن بلانا پسند نہ کیا کیوں کہ وہ (گاندھی جی) اس جدوجہد کو سیاسی رنگ سے بالکل الگ تھلگ رکھنا چاہتے تھے اُن کا خیال تھا کہ خواہ اس تحریک کا انجام سیاسی ہی کیوں نہ ہو مگر چونکہ اس کے اسباب غیر سیاسی تھے اس لئے اُسے سیاسی رنگ دینے سے احتراز کرنا چاہیے تاکہ اُسے نقصان پہنچنے کا خدشہ نہ رہے۔

جو کچھ گاندھی جی چاہتے تھے۔ بہت جلد انہیں مل گیا۔ جوں ہی حکومت اور زمینداروں کو اس کا اطمینان ہو گیا کہ گاندھی جی صوبہ کے رائج الوقت طریقہ ہائے کاشت میں کسی تبدیلی کے طالب نہیں تو انھوں نے گاندھی جی کے متعلق اپنا رویہ فوراً بدل دیا نیز تحقیقات کے سلسلہ میں انھوں نے سچے دل سے گاندھی جی کو اپنی امداد و اعانت کا یقین دلایا۔ ان زمینداروں اور اجارہ داروں نے خود بھی محسوس کیا کہ نیل کی کاشت کے پرانے انتظام اور طریقہ کو تباہی خیز نتائج کے بغیر از سر نو جاری کرنا غیر ممکن ہے چناں چہ حکومت نے کسانوں کی ان شکایات کی تحقیقات کرنے والی کمیٹی میں جس کا تعلق صرف نیل کی کاشت سے تھا گاندھی جی کو نامزد کر دیا۔ چند مہینوں میں کمیٹی نے اپنا کام ختم کر لیا اور متفقہ طور پر سفارش کی کہ زمینداروں اور اجارہ داروں نے ناجائز طور پر جو لگان وصول کر لیا ہے۔

اسکا ایک حصہ انہیں لازمی طور پر کاشت کاروں کو واپس کرنا چاہیے۔ کمیٹی نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ تین کٹھیا طریقہ قانوناً بند ہونا چاہیے۔ چناں چہ بہت جلد مجلس قانون ساز میں ایک زرعی مسودہ قانون پیش کیا گیا اور کمیٹی کی سفارشات کے مطابق منظور کیا گیا۔ جیسا کہ گاندھی جی نے پہلے ہی ظاہر کر دیا تھا وہ کسانوں میں کسی انقلابی نوعیت کی سیاسی بیداری پھیلانے کی بہ نسبت ان کی خدمت محض سماجی اور انسانی ہمدردی کے خیال سے کرنا چاہتے تھے چناں چہ انہوں نے اس ضلع میں اپنے چند مہینوں کے تجربات کو حسب ذیل لفظوں میں بیان کیا ہے۔

"مجھے ماننا پڑتا ہے کہ جب تک دیہات تعلیم سے محروم ہیں وہاں کوئی قابل ذکر کام نہیں ہو سکتا۔ کسانوں کی جہالت قابل رحم ہے وہ اپنے بچوں کو کوچہ گردی کے لیے چھوڑ دیتے ہیں یا انہیں نیل کے کھیتوں میں کام کرنے کے لیے بھیج دیتے ہیں۔ جہاں انہیں چند پیسوں کی خاطر صبح سے شام تک کام کرنا پڑتا ہے۔ ان دنوں مرد کی مزدوری دس پیسے عورت کی چھ پیسے اور لڑکے کی تین پیسے یومیہ سے زیادہ نہ تھی"۔

ان حالات کے تحت ہر شخص یہ خیال کرنے لگتا ہے کہ گاندھی جی نے حکومت، زمینداروں یا اجارہ داروں کو ضلع میں بہت سے مدرسوں کے کھولنے کی ترغیب دی ہوگی مگر انہوں نے اس قسم کی کوئی بات نہ کی۔ انہوں نے ضلع کے دو ہزار آٹھ سو کتالیس دیہاتوں میں سے صرف چھ میں مدرسے قایم کرنے پر اکتفا کی۔ ان مدرسوں کے لیے اکثر اساتذہ انہوں نے ہمارے صوبہ گجرات سے حاصل کیے ان میں کچھ ناخواندہ خواتین بھی تھیں۔ جو خود اپنی مادری زبان میں تعلیم دینے کی اہل نہ تھیں چہ جائے کہ بہار جا کر ہندی پڑھائیں۔ گاندھی جی نے ان عورتوں اور دوسرے استادوں کو یہ سمجھایا کہ بچوں کو۔ الف۔ بے اور قواعد رٹانے کی اتنی ضرورت نہیں۔ جتنی کہ انہیں صفائی اور اچھے سبھاؤ سکھانے کی ہے۔

۱۹۱۷ء کے آخر میں گاندھی جی کے چمپارن سے چلے آنے پر یہ مدرسے اور ان سے متعلق شفاخانے چند ماہ جاری رہے اور پھر یا تو بند ہو گئے یا یوں ہی برائے نام باقی رہے غالباً" گاندھی جی صرف اس بات سے مطمئن تھے کہ کسانوں کو زمینداروں کے مظالم سے بچانے کے لیے جو کچھ اُن کے امکان میں تھا کر چکے تھے۔ انہیں چمپارن اور صوبہ بہار کے دوسرے علاقوں کے کسانوں کی طرف توجہ مبذول کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی جو ۱۹۱۷ء کے بعد بھی زمینداروں اور اجارہ داروں کے مظالم کا نشانہ بنے رہے۔

بابو راجندر پرشاد نے بھی اپنی کتاب میں جسکا نام گاندھی چمپارن میں ہے مذکورہ بالا بیان کی صداقت کا اعتراف کیا ہے۔ سنہ ۱۹۲۱ء کے ایک بہت بڑے دورے کے سلسلہ میں گاندھی جی کو چمپارن میں سرسری طور پر آنے کا اتفاق ہوا اور یہاں انہوں نے خود اپنی آنکھوں وہ جنت دیکھ لی جو وہ کسانوں کے لیے بنا کر گئے تھے۔ انہوں نے کسانوں کو ویسا ہی فاقہ کش اور مظلوم پایا جیسا کہ وہ انہیں پہلے دیکھ چکے تھے۔

اس سے اور کچھ نہ سہی تو یہی کیا کم فائدہ ہوا کہ ہندستان کی سیاسی زندگی میں گاندھی جی نے اپنے لیے ایک خاص جگہ بنالی اور کسانوں کے انقلابی جوش و خروش کو اپنے قابو میں کر کے اُسے بالکل پُرامن اور دستوری راستوں پر ڈال دیا۔ حقیقت میں گاندھی جی نے چمپارن کو آیندہ کئی سالوں کے لیے حکومت اور زمینداروں کے لیے بہت محفوظ پُرسکون اور آرام دہ مقام بنا دیا۔

———— ✲ ————

آٹھواں باب

گجرات کانفرنس

روبہ صحت ہونے پر جب میں عراق سے ہندستان لوٹا تو میں ان باتوں کو نہ سمجھ سکا جو پچھلے باب میں بیان کی گئی ہیں۔ میں بہت جلد اپنے دوست مسٹر بینکر کے جوش و خروش سے متاثر ہو گیا جن کے ساتھ میں ان کے چوپاٹی والے بنگلہ میں ٹھہرا ہوا تھا وہ اس امید پر پھولے نہ سماتے تھے کہ ہندستانی سیاسیات میں عنقریب گاندھی جی ایک معجزنما انقلاب برپا کرنے والے ہیں۔ وہ گاندھی جی سے خط و کتابت کر رہے تھے، جنہوں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ اگر انہوں نے سول نافرمانی کی مہم جاری کی مناسب بھی تو وہ ان کو (مسٹر بینکر کو) ضرور چمپارن طلب کریں گے۔

ہماری طرف بھی حالات نے تیزی سے پلٹا کھانا شروع کیا۔ مسز بسنٹ کے ہوم رول کے زبردست پروپاگنڈہ سے چڑھکر لارڈ پینٹ لینڈ گورنر مدراس نے ایک تقریر کی جس میں انہوں نے کہا کہ ہوم رول تو درکنار ہندستانیوں کو اس کا خواب تک نہ دیکھنا چاہیے۔ ان الفاظ نے پورے ملک میں غیظ و غضب کی لہر دوڑا دی اور ہوم رول کی مہم کو بڑی تقویت پہنچائی۔ اس انتہائی رجعت پسندانہ اعلان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لیے مدراس، بمبئی اور ہندستان کے دوسرے بڑے شہروں میں بہت بڑے بڑے پبلک جلسے منعقد کیے گئے اور حکومت سے اس مسئلہ پر غیر مبہم اور قطعی اعلان کا مطالبہ کیا گیا۔ یہ شورش اور بھی زیادہ بڑھ گئی جب کہ مدراس کی حکومت نے مسز بسنٹ اور ان کے دو ساتھیوں مسٹر جارج ارنڈیل اور مسٹر بی۔ پی واڈیا کو اوٹاکمنڈ کی میونسپل حدود میں نظر بند کر دیا۔ اب ہوم رول کی تحریک پورے عروج پر تھی، بڑے بڑے بیرسٹر اور ایڈوکیٹ اور بڑی حیثیت والے دوکاندار ساہوکار سب ہی پبلک جوش کی لپیٹ میں آ گئے۔ جلسوں میں جو بڑی آزادی سے منعقد کئے جاتے زیادہ سے زیادہ لوگ شریک ہونے لگے۔ ان ہزاروں پبلک جلسوں سے سیاسی جوش و خروش کا ایک ایسا طوفان اٹھا جو چار جانب چھا گیا۔ یہاں تک کہ چھوٹے چھوٹے قصبہ اور گاؤں بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے۔

میرے بمبئی کے احباب بھی ان دو مقاصد کو لے کر اٹھے۔ وہ ہوم رول کی تحریک کو ایک بڑے وسیع پیمانے پر منظم کر کے اس کے دباؤ سے حکومت کو مسز بیسنٹ کی رہائی پر مجبور کرنا چاہتے تھے۔ مسز بیسنٹ ہی کی آزادی کے لیے وہ حتی الامکان گاندھی جی کو بھی سول نافرمانی کی کسی ملک گیر مہم کے شروع کرنے پر مائل کرنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے ملک کی سیاسی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوگا۔

انہیں اپنے پہلے مقصد میں آسانی سے کامیابی حاصل ہو گئی، لیکن دوسرے مقصد کا حصول ذرا مشکل تھا۔ خوش قسمتی سے نہیں دنوں گاندھی جی بمبئی تشریف لے آئے۔ ان کی رہنمائی اور مشورے کے لیے میرے احباب ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مجھے وہ مختصر گفتگو یاد ہے جو مسٹر جمناداس دوارکاداس نے اس موضوع پر گاندھی جی سے کی تھی گورنر مدراس نے بعض مکانوں سے ہوم رول کی

جھنڈیاں زبردستی اتروا دی تھیں۔اس سے ہوم رول لیڈران کے خلاف صف آرائی پر تلے بیٹھے تھے۔مدراس کے بہت بڑے قانون داں سرسی۔پی راما سوامی آئر نے جو ان دنوں مسز بیسنٹ کے ایک پکے مقلد تھے۔ہوم رولیوں کو گورنر مدراس کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کی رائے دی تھی۔گاندھی جی کے سامنے بھی یہ معاملہ رکھا گیا۔ان کا جواب ذیل میں درج ہے:۔

"تم نے سرسی۔پی راما سوامی آئر جیسے بڑے قانون داں سے مشورہ کرنے کی زحمت کیوں اٹھائی۔تم حکومت کے خلاف اسی کی عدالتوں میں چارہ جوئی کرکے زیر باری اور تھکا دینے والی مقدمہ بازی میں الجھنا چاہتے ہو۔یہ معاملہ تو بڑی آسانی سے طے ہو سکتا ہے تمہیں صرف یہ کرنا ہوگا کہ ہوم رول کی ہزاروں چھوٹی جھنڈیاں تیار کرکے انہیں مدراس کے ہزاروں مکانوں پر لگا دو۔ان جھنڈیوں کو نکالنے کے لیے، حکومت اپنے پولیس افسروں کو نہیں بھیج سکتی۔اس طرح تمھیں حکومت کے مقابلہ میں ایک یقینی اخلاقی جیت حاصل ہو جائے گی"

میرے احباب اس نادر مشورے سے بہت متاثر ہوئے۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مسز بیسنٹ کو رہائی دلانے کے سلسلے میں گاندھی جی کے ذرایع بہت وسیع ہیں۔سول نافرمانی کے مسئلے پر انھوں نے حسب ذیل الفاظ میں اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"مسز بیسنٹ کو صرف یہ کرنا ہوگا کہ متعلقہ حکام کو پہلے سے باقاعدہ اطلاع دیکر اوٹا کمنڈ میونسپل حدود سے باہر نکل جائیں اور اگر حکومت پھر بھی اپنی ضد پر اڑی رہے تو اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کردیں"

ان احباب کو، جو بمبئی اور دوسرے مقامات پر تھے، گاندھی جی نے ان کی مقصد براری کے لیے دوسرا مشورہ دیا۔ان تمام لوگوں کے لئے جو اس مسئلہ پر خلوص اور سچائی سے قانون شکنی کے حق میں تھے۔انھوں نے ستیاگرہ کا عہد نامہ مرتب کیا تاکہ اس پر ان کے دستخط حاصل کیے جائیں۔یہ اس مسئلہ پر بڑھتے ہوئے جوش کی ایک کسوٹی تھی۔مناسب تعداد میں دستخطیں ملنے پر ستیاگرہ کے ان مجاہدوں کو بمبئی سے اوٹا کمنڈ تک قریب ایک ہزار میل کا فاصلہ پاپیادہ طے کرنا تھا۔اور وہاں مسز بیسنٹ کی رہبری میں حکومت کے خلاف قانون شکنی کرنی تھی۔میرے دوستوں نے اس مشورے کو بڑے جوش وخروش سے قبول کیا۔اور گاندھی جی کے مرتب کیے ہوئے عہد نامہ پر مقررہ تعداد میں دستخطیں حاصل کرنے میں لگ گیے۔گاندھی جی نے ان لوگوں سے کہا کہ انھیں (گاندھی جی کو) اس تحریک کے متعلق چمپارن میں تمام ضروری اطلاعات برابر بھیجی جائیں۔انھوں نے یہ بھی وعدہ فرمایا کہ اگر مسز بیسنٹ نے ان کی تجویز سے اتفاق کیا اور ستیاگرہیوں کی مقررہ تعداد فراہم ہوگئی تو وہ خود تحریک کی قیادت کریں گے۔

میرے سارے دوستوں نے عہد نامہ پر دستخط کردیے اس کے بعد وہ دوسروں کے دستخط حاصل کرنے میں مشغول ہوگیے۔روزانہ دستخطوں پر دستخط حاصل کیے جانے لگے بیماری سے اٹھنے کے بعد اگرچہ ابھی میری کمزوری دور نہ ہوئی تھی پھر بھی میں محسوس کرنے لگا کہ کام کا وقت آپہونچا۔میں ہوم رول کے اس بڑھتے ہوئے طوفان سے بہت متاثر تھا جو میرے اردگرد سارے ملک میں اٹھ رہا تھا۔اور اب گاندھی جی کے لائحہ عمل کے مطابق سول نافرمانی کی تحریک میں میرے حصہ لینے کے عظیم الشان خواب کی تعبیر نکل رہی تھی میں اس وقت بڑی کشمکش میں مبتلا تھا، میں نے زندگی بھر کے لیے سوسائٹی کی وفاداری کا حلف اٹھایا تھا جس کی رو سے ہوم رول لیگ کی تحریک یا گاندھی جی کی قانون شکنی کی مہم میں میری شرکت غیر ممکن تھی۔کچھ عرصہ تک میرے دل ودماغ میں کشمکش ہوتی رہی۔آخرکار میں نے سوسائٹی سے قطع تعلق کرکے ہوم رول لیگ میں شامل ہوئے، ور مسز بیسنٹ کی رہائی کی خاطر ستیاگرہ کے عہد نامہ پر دستخط کرنے کا فیصلہ کرلیا اگرچہ قانون شکنی کے مسئلہ پر میرے احباب گاندھی جی سے خط وکتابت کر رہے تھے۔لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا کیونکہ خود مسز بیسنٹ اس چیز کو پسند نہ فرماتی تھیں۔

تاہم ہم نے کسی نہ کسی طرح ستیاگرہ کے اصول کا ڈانڈا ہوم رول کی تحریک سے جو اس وقت گجرات کے گاؤں گاؤں میں پھیلی ہوئی تھی، ملاہی دیا۔ہم نے اپنے جلسوں میں جس میں ہزاروں دیہاتی اور کچھ پولیس کے مخبر بھی شرکت کیا کرتے تھے کھلم کھلا اعلان کردیا کہ اگر حکومت نے ہمارے جلسوں اور مظاہروں پر پابندی عائد کرنے کی کوشش کی تو ہم اس کی خلاف ورزی کردیں گے

اس طرح ایک طرف تو ہم ہوم رول کا پراپگنڈا کرتے جسے گاندھی جی خاص طور پر ناپسند فرماتے تھے۔ دوسری جانب ستیاگرہ کے روحانی پیغام کی اشاعت کرتے جس سے مسز بسنٹ کو نفرت تھی۔ حقیقت تا میں ہم مسز بسنٹ اور گاندھی جی کے سیاسی طریق کار کو اپنے طور پر باہم ملا دینے کے فکر میں تھے۔ ہم سمجھتے تھے کہ ہزاروں جلسوں میں چیخ پکار مچانے سے ہم ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر رہے ہیں۔ ان ہی دنوں ۱۹۱۷ء کے آخر میں دو کانفرنسیں ---- پہلی گجرات ایجوکیشنل کانفرنس بھروچ میں اور دوسری گجرات پولیٹیکل کانفرنس گودھرا میں منعقد ہونے والی تھی۔ چونکہ میں خود ہی ان دونوں کانفرنسوں کا منتظم تھا اس لیے میں نے کانفرنسوں کی استقبالیہ مجلسوں کو اس پر بہ آسانی راضی کر لیا کہ گاندھی جی کو دونوں کانفرنسوں کا صدر منتخب کیا جائے۔

میرے دوست مسٹر بینکر نے گاندھی جی کو جب کہ وہ چمپارن سے کچھ عرصہ کے لیے آئے ہوئے تھے، ہوم رول لیگ میں شریک کرنے کی ایک اور آخری کوشش کی۔ مجھے گاندھی جی کے پرانے آشرم کی پہلی منزل کا وہ غیر آراستہ مختصر کمرہ یاد ہے جس میں مسٹر بینکر اور میں نے اُن سے ہوم رول کی تحریک پر دو گھنٹے کے قریب تبادلہ خیال کیا تھا۔ مسٹر بینکر نے ایک بہت عمدہ اور پُرزور انداز میں گاندھی جی کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ صرف انھیں کی ایک ہستی ہے جو دلیری سے ساتھ اس تحریک کی رہنمائی کر سکتی ہے، مگر گاندھی جی ٹس سے مس نہ ہوئے۔ حقیقت میں وہ یہ سمجھتے تھے کہ ابھی جنگ کی وجہ سے اس قسم کی سیاسی تحریکات میں حصہ لینے کا موقع نہیں آیا۔ لیکن معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ گاندھی جی نے فرمایا کہ تحریک میں حصہ لینے سے پہلے انھیں مسز بسنٹ سے بات چیت کرنی ضروری ہے۔ انھوں نے ہمیں یہ پرانی ہندستانی کہاوت بھی یاد دلائی کہ دو تلواریں ایک میان میں نہیں رہ سکتیں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا یہ مطلب تھا کہ گاندھی جی اور مسز بسنٹ بہ یک وقت ہوم رول لیگ کی رہنمائی نہ کر سکتے تھے۔ بات چیت کے دوران میں ان کا لب و لہجہ تلطف آمیز اور مشفقانہ تھا۔ انھوں نے بمبئی کے ان جلسوں کی صدارت بھی منظور کر لی جو مسز بسنٹ کی مسلسل نظر بندی پر احتجاج کرنے کے لیے منعقد ہونے والے تھے۔ انھوں نے اس کا بھی اعتراف کیا کہ عوام کو سیاسیات سے آگاہ کرنے اور ان میں سیاسی بیداری پیدا کرنے میں ہوم رول کی تحریک کا بہت بڑا حصہ ہے۔ پہلے کبھی انھوں نے یہ اعتراف نہ کیا تھا۔ بعد میں انھوں نے بمبئی کے ایک عظیم الشان جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے ہوم رول کی سرگرمیوں کو نہایت خوبصورت پیرایہ میں سراہا بھی مگر یہ ان کی آخری حد تھی وہ اس سے ایک انچ بھی آگے بڑھنا نہ چاہتے تھے۔ گجرات ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت کرنے کے لئے گاندھی جی ٹھیک وقت پر بھروچ آگئے۔ وہ اپنی منتخب ٹولی کے ساتھ بدستور نہایت سادگی سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں عوام اور عورتوں کی تعلیم پر خاص زور دیا، اور ملکی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی پرزور اپیل کی۔ ان کی تقریر صاف اور سلجھی ہوئی تھی، لیکن بالکل پھیکی اور ولولے سے خالی۔ وہی تجویزیں جو پچھلی کانفرنس میں پاس ہوئی تھیں۔ اب بھی منظور کی گئیں اور اسی قسم کی تقریریں کی گئیں جو اس کے پچھلے سیشن میں ہو چکی تھیں۔ کانفرنس کے اختتام پر ایک سیاسی مظاہرہ بھی ہوا، لیکن گاندھی جی نے اس میں تقریباً کوئی حصہ نہ لیا۔

ان تمام باتوں کے باوجود گاندھی جی کے بارے میں ہم نوجوانوں کا یہ پختہ خیال تھا کہ وہ ایک ایسے خاموش آتش فشاں ہیں جو اندر ہی اندر سلگ رہا ہے اور جس کے شعلے جلد ہی بلند ہونے والے ہیں۔ اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے انھوں نے ایک ایسا جملہ کہا جس سے ہمارے اس خیال کو اور بھی تقویت ہوئی۔ کانفرنس کی صدارت قبول کرنے پر جیسا کہ دستور ہے، مجلس استقبالیہ کی طرف سے گاندھی جی کی خدمت میں شکریہ پیش کیا گیا۔ جواب میں گاندھی جی نے فرمایا کہ جو لوگ مادر وطن کی خدمت کی راہ میں اپنی جان کی بازی لگانا چاہتے ہیں، وہ اسی وقت اپنے آپ کو اپنے کرم فرماؤں کی تعریف کا اہل سمجھ سکیں گے۔ جب کہ وہ بڑی سے بڑی قربانی کے لیے تیار ہوں گے۔

بھروچ سے ہم لوگ پولیٹیکل کانفرنس کا انتظام کرنے کے لیے فوراً گودھرا روانہ ہو گئے۔ یہ مظاہرہ بے شک بڑا اچھا تھا۔ ساری فضا سیاسی جوش و خروش سے لبریز تھی۔ ایک حادثہ کی وجہ سے کانفرنس مقررہ وقت سے ۴۵ منٹ بعد شروع ہوئی

گاندھی جی نے جو بالکل ٹھیک وقت پر پہنچے تھے یہ کہتے ہوئے ہمیں ایک گونہ تعجب میں مبتلا کر دیا۔

"وقت کی پابندی ہمارے لیے ضروری ہے۔ ہمیں وقت کی پابندی کا سبق اہل مغرب سے سیکھنا چاہیے۔ ہم یہاں حکومت خود اختیاری لیے جمع ہوئے ہیں لیکن یاد رکھئے کہ ہم اپنی کارروائی ۴۵ منٹ دیر سے شروع کر رہے ہیں۔ اس لئے حکومت خود اختیاری بھی ہمیں ۴۵ منٹ کی تاخیر سے ملے گی۔" انھوں نے غالباً پہلی مرتبہ اس کانفرنس میں ہندستان کے سیاسی مسئلہ پر زبان کھولی۔ لیکن ان کے کام میں اس معاہدہ سے بڑی آسانی ہوئی جو دسمبر ۱۹۱۶ء میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بمقام لکھنؤ ہوا تھا۔ چنانچہ انھیں باشندگان ہند کے متحدہ مطالبہ پر حکومت برطانیہ کی توجہ مبذول کرانے میں کوئی مشکل نہ پیش آئی۔ انھوں نے مسز بسنٹ کی شان میں بھی کچھ تعریفی کلمے کہے لیکن مجھے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انھوں نے جو کچھ کہا اس سے کہیں زیادہ انھیں کہنا چاہیے تھا۔ اپنی بقیہ تقریر میں انھوں نے چند مقامی سیاسی شکایات اور بعض سماجی اور اقتصادی مسائل سے بحث کی۔ اگرچہ مجموعی حیثیت سے اُن کی تقریر مایوس کن نہ تھی تاہم یقیناً اس سے ہم میں کسی قسم کا سیاسی جوش وخروش نہ پیدا ہو سکا۔

بہرحال مجھے یہ اعتراف ضرور ہے کہ گاندھی جی نے صدارت کے فرائض بڑی خوبی سے انجام دے اور مجلس مضامین اور کانفرنس کے کھلے اجلاس دونوں کی کارروائیوں کی رہبری بڑی عمدگی سے کی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے مجلس مضامین میں مجوزہ قراردادوں پر دو دو بجے رات تک بحث کی اگرچہ کانفرنس کا اجلاس صبح ہی سے شروع ہوا کرتا تھا۔ گاندھی جی ہر بات کو بڑی توجہ اور سکون سے سنتے۔ اُن قراردادوں کو جو مختلف مقامی شکایتوں پر مبنی تھیں سمجھنے کی کوشش کرتے ان قراردادوں میں مناسب ترمیمیں اور تبدیلیاں پیدا کرنے کے ضمن میں انھوں نے بلیغ نکات بھی سجھائے۔

کانفرنس کے دوسرے دن انھوں نے ہمیں ایک اور بہت بڑے تعجب میں مبتلا کر دیا۔ ویرگام کے نفرت انگیز چنگی گھروں کے ہٹائے جانے کے بارے میں مجلس مضامین نے بہت زوردار تجویزیں منظور کی تھیں لیکن کارروائی کے آغاز ہی میں گاندھی جی نے پُرزور تالیوں کے درمیان یہ اعلان کیا کہ انہیں ابھی ابھی حکومت کی طرف سے یہ اطلاع ملی ہے کہ ویرگام کے چنگی گھروں کے ہٹائے جانے کے احکام نافذ کر دئے گئے ہیں۔ انہیں نے بتایا کہ وہ اس مسئلہ پر پچھلے کچھ دنوں سے حکومت ہند سے خط و کتابت کر رہے تھے اور یہ کہ انھوں نے حکومت پر واضح کر دیا تھا کہ اگر انھیں حکومت کی طرف سے کوئی اطمینان بخش جواب نہ ملا تو وہ اس کانفرنس میں ایک سیاسی مہم کا آغاز کر دیں گے۔ یہ تو ہم سب سمجھتے تھے کہ اگر اس قابل نفرت شکایت کا بر وقت ازالہ نہ کیا گیا تو جلد یا بدیر گاندھی جی اپنا ایجی ٹیشن شروع کر دیں گے۔ خوش قسمتی سے حکومت کو ہوش آگیا۔ اور اس نے اس مسئلہ پر گاندھی جی اور کانفرنس کو کسی قسم کا اقدام کرنے سے بچا لیا اس طرح ہمارے خیال کے مطابق گاندھی جی کو حکومت کے مقابلہ میں تیسری کامیابی نصیب ہوئی ان کی پہلی دو کامیابیوں کا تعلق پابند مزدوری کے مسئلے اور چمپارن کی جد و جہد سے ہے۔

نواں باب

احمد آباد کے کارخانوں میں ہڑتال

حکومت کے مقابلہ میں تین کامیابیاں حاصل کرنے اور گجرات کی دو کانفرنسوں کی صدارت کرنے کے بعد گاندھی جی ہمارے صوبہ کی سیاسی بیچینیوں کے رہنما بننے میں کامیاب ہو گئے۔

اس اثنا میں گاندھی جی نے احمد آباد کی گجرات سبھا کی جو برائے نام احمد آباد اور پورے گجرات کی جان بلب سیاسی انجمن تھی، لیڈری حاصل کر کے، احمد آباد کی پبلک زندگی میں، جو صوبہ کا صدر مقام اور پورے صوبہ کی تحریکات کا مرکز تھا، اپنا کافی اثر جما لیا۔ سبھا نے ان کی تحریک سے مسٹر مانٹگو وزیر ہند کے نام ایک عرض داشت بھیجنے کا فیصلہ کیا جو ان دنوں ہندستان آئے ہوئے تھے اور وائسرائے کے مشورہ سے اس جدید دستور ہند کی رپورٹ مرتب کر رہے تھے، جس کا خاکہ کانگریس اور مسلم لیگ نے ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں تیار کیا تھا۔ اس عرض داشت پر دستخط حاصل کرنے کے لئے صوبہ بھر میں نمائندے بھیجے گئے۔

عرض داشت کے مرتب ہونیکے بعد ہی احمد آباد میں جو ہندستان میں صنعتِ پارچہ بانی کا دوسرا سب سے بڑا مرکز ہے مزدوروں کا جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا۔

احمد آباد کے کارخانوں میں ستر ہزار مزدور دم کرتے تھے۔ آج بھی اُن کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی زندگی اور ان کی خستہ حالی گجرات کے اوتار گاندھی جی کے محبوب ترین شہر کے لیے شرم و عار کا باعث ہے۔ یہاں تک کہ بے حس وہٹلے کمیشن کے ممبر بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور مزدوروں کی تنگ و تاریک روح فرسا زمین دوز جھونپڑیوں کی بابت اُن کے بیانات اور انکشافات کو چند ماہ پہلے لندن کے اخباروں میں نقل کیا گیا۔

اگرچہ احمد آباد کے کارخانہ داروں نے جنگ کے دوران میں مزدوروں کی سستی اجرت سے بہت بڑا فائدہ اٹھایا تھا تاہم ۱۹۱۸ء کے آغاز میں انھوں نے مزدوروں کی اس برائے نام اُجرت میں بھی ایک بڑی تخفیف کرنے کا فیصلہ کیا اس وقت تک شری متی انسویا بہن نے مزدوروں کے بچوں کی تعلیم کا کام شروع کر دیا تھا اور کارخانہ داروں کی اخلاق سوز بدعنوانیوں کی تحقیقات میں مصروف تھیں۔ ان تمام باتوں میں کارخانہ داروں کے لیڈر اور سرگروہ خود ان کے بھائی مسٹر انبالال سارا بھائی تھے کپڑا بننے والے مزدوروں کی اُجرت میں مجوزہ تخفیف کا حال معلوم کر کے شری متی انسویا بہن نے گاندھی جی سے اس معاملہ پر توجہ مبذول کرنے کی درخواست کی۔

گاندھی جی اپنی خود نوشت سوانحعمری میں لکھتے ہیں کہ چوں کہ اُن کے تعلقات کارخانہ داروں سے خوش گوار تھے اس لئے انھیں ان سے جنگ کرنا مشکل معلوم ہوتا تھا۔ کارخانہ داروں سے گفت و شنید کرنے کے بعد انھوں نے ان سے یہ التجا کی تھی کہ معاملہ کو کسی ثالث کے سپرد کر دیا جائے، لیکن کارخانہ داروں نے ثالثی کے اصول کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لیے انھوں نے گاندھی جی نے مزدوروں کو ہڑتال کر دینے کا مشورہ دیا۔ ہڑتال کی رہنمائی قبول کرنے سے پیشتر گاندھی جی نے بے بس مزدوروں کے سامنے حسب ذیل شرائط پیش کیں جن کی پابندی ان کے لیے ضروری تھی۔

۱- تشدد سے احتراز کیا جائے۔

۲- ہڑتال میں شریک نہ ہونے والے مزدوروں کی بے عزتی نہ کی جائے۔

۳- خیرات کسی حالت میں قبول نہ کی جائے۔

۴- خواہ ہڑتال کتنی ہی مدت کے لیے کیوں نہ جاری رہے، مزدور اپنی جگہ پر اڑے رہیں۔

۵- ہڑتال کے دوران میں ایماندارانہ طریقہ پر روٹی کمائی جائے۔

ہڑتال کے لیڈروں نے یہ شرطیں مان لیں اور مزدوروں نے ایک بہت بڑے جلسہ میں یہ عہد کیا کہ جب تک ان کے مطالبات تسلیم نہ کئے جائیں گے، وہ ہرگز کام نہ شروع کریں گے۔ مطالبات یہ تھے۔ مزدوری کا وہی اسکیل رکھا جائے جو پہلے تھا، یا کارخانہ دار معاملہ کو ثالثی کے سپرد کر دینے پر راضی ہو جائیں۔

گاندھی جی نے ہڑتال کے لئے جو شرطیں رکھیں، مجھے یقین تھا کہ انہیں معلوم کر کے پست سے پست مزدور سبھائیں اور ان کے ادنی سے ادنی لیڈر بھی انگشت بدنداں رہ جاتے، کیونکہ ایسی حالت میں ہڑتال شروع ہونے کے چند روز بعد ہی مزدوروں کی محدود پونجی کا ختم ہو جانا لازمی تھا۔ گویا گاندھی جی یہ چاہتے تھے کہ یا تو مزدور اپنی ہڑتال بھوکے پیاسے جاری رکھیں یا جسم و روح کا رشتہ قایم رکھنے کے لیے تانبے کے چند سکوں کے عوض دن بھر ذلیل مشقت کریں۔ انہوں نے مزدوروں کو نہ تو امدادی رقم قبول کرنے کی اجازت دی تھی اور نہ انھیں غیر ہڑتالی مزدوروں کو کارخانہ میں جانے سے روکنے کا اختیار دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ کارخانہ داروں کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی نوبت آئے۔ ثالثی کی شق نکال کر گاندھی جی نے بڑی ہوشیاری سے بھاگ جانے کا ایک راستہ بنا لیا تھا کیونکہ یہ امر غیر متوقع نہ تھا کہ اونچے طبقہ سے کسی ایسے ثالث کے مقرر کیے جانے پر کارخانہ دار راضی ہو جائیں گے جو اپنے تجربہ کی روشنی میں ہڑتال کو ناکام بنانے کی اہلیت رکھتا ہوگا۔

ہڑتال کے اعلان پر کارخانہ داروں نے اپنے کارخانے ایک غیر معین مدت کے لیے بند کر دئے۔ مزدوروں کی انقلابی شورش روزانہ بڑھنے لگی۔ وہ روزانہ شام کو ایک درخت کے نیچے سابرمتی ندی کی ریت پر ایک بہت بڑا جلسہ کرتے اور لڑائی کو آخر تک جاری رکھنے کا اعلان کرتے۔ ان روزانہ کے جلسوں میں گاندھی جی بھی اپنے ناقابل تقلید انداز میں تقریر کرتے۔ مزدوروں کو ہڑتال جاری رکھنے اور اس کی شرطوں کی پابندی کرتے ہوئے انتہائی نظم وضبط قایم رکھنے کی تلقین فرماتے۔ مزدور روزانہ ہزاروں کی تعداد میں پر امن جلوس کی شکل میں شہر کا چکر لگاتے۔ ان کے ہاتھوں میں جھنڈے ہوتے جن پر "اپنی بات پر اڑے رہو" درج ہوتا۔ ہم میں سے جنھوں نے مزدوروں کے جوش وخروش کی اس بڑھتی ہوئی رو کو دیکھا انہیں مزدوروں کی قطعی کامیابی میں کوئی شبہ نہ رہ گیا

مزدور اپنی جنگ مستقل مزاجی سے جاری کیے ہوئے تھے کہ بھوک اور افلاس جیسے دشمنوں نے انہیں اپنے شکنجوں میں کسنا شروع کیا۔ ان کی انتڑیاں قل ہو اللہ پڑھنے لگیں۔ ہڑتال جاری رکھنے کے لیے انہیں اس آڑے وقت کچھ امداد کی ضرورت تھی، خواہ وہ کتنی حقیر ہی کیوں نہ ہوتی۔ اگرچہ شری متی انسویا بہن اور گاندھی جی پر ہر طرف سے زور ڈالا گیا کہ مزدوروں کے لیے کچھ نہ کچھ امدادی رقموں کا انتظام کیا جائے، لیکن گاندھی جی کا دل نہ پسیجا۔ وہ اپنے اس اصول پر سختی سے قائم تھے کہ مزدوروں کے ساتھ بھکا سلوک نہ کیا جائے۔ اس موقع پر ایک جلد باز شخص یہی نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوتا کہ گاندھی جی نے مزدوروں کو کچل دینے اور انہیں بھوکوں مارنے کے لیے کارخانہ داروں سے ساز باز کر رکھا تھا۔ اس لیے کوئی تعجب نہ کرنا چاہیے کہ ہڑتال شروع ہونے کے دوسرے ہی ہفتے مزدوروں میں بزمردگی اور اضمحلال کے آثار پیدا ہو گئے جس طرح جسمانی کمزوری سے انسان میں چڑچڑے پن کی عادت پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح ہڑتال کا زور گھٹنے سے ہڑتالیوں کا رویہ بھی غیر ہڑتالی مزدوروں کے خلاف اشتعال انگیز اور امن شکن ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ مجھے خدشہ ہو گیا کہ کہیں وہ غنڈہ گردی پر نہ اتر آئیں۔ روزانہ کے جلسوں میں بھی ان کی حاضری بتدریج کم ہونے لگی اور جو لوگ

شریک بھی ہوتے تو ان کے چہروں پر مایوسی اور افسردگی برستی ہوتی۔ غرض کہ تیسرے ہفتہ ہڑتال ختم ہونے کے آثار صاف صاف نظر آنے لگے۔

ایک مزدور رہنما کی حیثیت سے گاندھی جی نے اس ہڑتال میں اپنی نیکنامی اور شہرت کی بازی لگا دی تھی۔ اس لیے اس مہم کو انہیں یا تو کامیابی تک پہنچانا تھا یا اپنی شکست کا اعتراف کر لینا تھا چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں۔ "میں سخت الجھن میں تھا اور یہی سوچتا رہتا تھا کہ ایسے حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے"۔ اس کے بعد انھوں نے ایک نئی پخ نکال کر نہ صرف مزدوروں اور احمد آباد کے رہنے والوں بلکہ سارے ہندستان کو متحیر کر دیا۔ ہڑتال کے اکیسویں دن، شام کے جلسہ میں انھوں نے اعلان کیا: "ہڑتال کرنے والے ہڑتال برابر جاری رکھیں تاوقتیکہ کوئی مصالحت نہ ہو جائے یا سارے مزدور ہڑتال ختم کر دیں ورنہ کسی غذا کو ہاتھ نہ لگاؤں گا"۔

یہ گاندھی جی کا پہلا بڑا اور پبلک برت تھا، جس سے ہندستان میں ہم پہلی بار آشنا ہوئے۔ لیکن اس کہانی کا دوسرا ٹکڑا ابھی ہے جسے گاندھی جی نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔ ان کا برت حقیقت میں ایک خطرناک افواہ کا جبری نتیجہ تھا، جو مزدوروں کے حلقہ میں عام طور سے پھیلی ہوئی تھی اور جس نے ان کے درویشانہ کردار پر زبردست چرکا لگایا تھا۔ بات یہ ہے کہ بھوک کی تکلیف سے بلبلا کر کچھ غیر ذمہ دار مزدور پکار اٹھے کہ بے شک گاندھی جی کو زیب دیتا ہے کہ ہمیں اپنے عہد پر قائم رہنے اور تصفیہ نہ ہونے تک ہڑتال جاری رکھنے کی تلقین فرمائیں انہیں ہماری فکر کیوں ہو، جبکہ ہمیں جلسہ میں پہنچنے کے لیے کئی کئی میل پیدل چل کر آنا پڑتا ہے، وہ موٹر پر اڑے پھرتے ہیں۔ ادھر تو ہمیں روٹی کے سوکھے ٹکڑے میسر نہیں اور ادھر گاندھی جی کے سامنے تازہ پھلوں اور خشک میووں کا انبار لگا رہتا ہے"۔ یہ افواہ آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی اور جوں ہی اس کی بھنک گاندھی جی کے کانوں میں پہنچی وہ تلملا اٹھے چنانچہ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ سمجھوتا نہ ہونے تک وہ صرف برت ہی نہ رکھیں گے بلکہ یہ عہد بھی کیا کہ اس دوران میں موٹر پر بھی نہ سوار ہوں گے۔

اگرچہ گاندھی جی یہی کہتے رہے کہ ان کا برت مزدوروں کی پشت پناہی کے لئے تھا۔ لیکن اس سے کارخانہ داراروں کے سخت دلوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ گاندھی جی کے برت کی خبر سے مزدوروں کے سروں پر بجلی سی گر پڑی اور ان میں ہزاروں کے رخسار آنسوؤں سے تر نظر آنے لگے۔ دوسری جانب کارخانہ داروں کے لیڈر مسٹر امبالال سارابھائی کی نرم دل بیوی سرلا دیوی پر بھی اس کا گہرا اثر پڑا۔ اب گاندھی جی اور کارخانہ داروں کے درمیان گفت و شنید کا سلسلہ شروع ہوا۔ ملک کے ہر حصہ سے کارخانہ داروں کے پاس تاروں کا تانتا بندھ گیا کہ جس قدر جلد ممکن ہو معاملہ کا تصفیہ کر کے گاندھی جی کی جان بچالی جائے۔ مسز بسنت نے بھی مدراس سے اسی مضمون کا ایک تار بھیجا۔ ابھی گاندھی جی کے برت کو تین دن بھی نہ گزرے تھے کہ تخفیف اجرت کے مسئلہ پر کارخانہ دار ثالث مقرر کرنے پر رضامند ہو گئے۔ لیکن جس شخص کو انہوں نے ثالث بنایا وہ ایک علمی آدمی اور کسی کالج کا پروفیسر تھا۔ کارخانوں اور مزدوروں کے متعلق اس کی معلومات بہت محدود تھیں۔ اس میں غریبوں کے مصائب اور حقوق سمجھنے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔

جیسا کہ توقع تھی۔ اس بھلے مانس نے تخفیف اجرت کے مسئلہ پر اپنے سرمایہ دار دوستوں کے حق میں فیصلہ دیا اگرچہ اس نے جس تخفیف کی سفارش کی تھی وہ سرمایہ داروں کی مجوزہ تخفیف سے کچھ کم ضرور تھی۔

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ مزدوروں کی امداد کرنے کے بجائے گاندھی جی نے انہیں زمین کھودنے اور مکانات کی تعمیر کا کچھ کام دیا چنانچہ ان ہڑتالیوں کو چند پیسوں یومیہ کے عوض احمد آباد کی تپتی ہوئی دھوپ میں دن بھر کام کرنا پڑتا۔ شری متی انسویابہن نے پہلا ٹوکرا خود اٹھا کر دوسروں کو بھی اس کی دعوت دی لیکن وہ تو شروع میں چند گھنٹے کام کر کے الگ ہو جاتیں۔ بیچارے مزدوروں کو دن بھر کام کرنا پڑتا۔ یہ مزدور دن بھر کی مشقت سے چور ہو کر جس کے وہ خوگر نہ تھے گاندھی جی کے کارندوں سے صرف چند پیسے پاتے۔ وہ بالکل مایوس ہو چکے تھے اور ان کی قوت عمل قریب قریب جواب دے چکی تھی۔ غرض کہ پوری اسکیم مکمل ناکامی

پر ختم ہو رہی تھی۔ یہ ہندستان کی پہلی مزدور ہڑتال تھی جس کی رہ نمائی گاندھی جی نے اس خوبی سے فرمائی۔ ہڑتال کا حقیقی مقصد حاصل نہ ہو سکا۔ مزدوروں کی اجرت میں زیادہ سے زیادہ تخفیف کی گئی۔ ان بیچاروں کی تسلی کسی طرح اس چیز سے نہ ہو سکتی تھی کہ اُن کی اجرت میں تخفیف کی سفارش انھیں کے رہ نما کی رضامندی سے مقرر کیے ہوئے ثالث نے کی تھی۔

اگر گاندھی جی چاہتے تو ہڑتالیوں کی امداد کے لیے احمد آباد اور پورے ملک سے لاکھوں روپیہ جمع کر کے ہڑتال کو شاندار کامیابی سے ہم کنار کر سکتے تھے۔ مزدوروں نے بے شک بڑے دم خم اور دلیرانہ عزم کا ثبوت دیا۔ وہ تو گاندھی جی کی رہ نمائی میں بھوکوں مر رہے تھے اور سمجھوتہ ان کے مفاد کو قربان کر کے کیا جا رہا تھا۔

احمد آباد کے نیک دل اور بھولے بھالے مزدور گاندھی جی کے سہ روزہ برت سے اس درجہ مسحور ہوئے کہ جب گاندھی جی نے سمجھوتے کو ان کی فتح سے تعبیر کیا تو وہ خوشی سے پھولوں نہ سمائے۔ انہوں نے شری متی انسویا بہن اور مسٹر بینکر کی رہ نمائی میں جو اس ہڑتال میں گاندھی جی کے خاص نائبین میں سے تھے۔ ایک بڑی مزدور سبھا بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت سے اِن دو پرجوش رہبروں کی قیادت اور گاندھی جی کی سرپرستی میں یہ مزدور سبھا نشو و نما پا رہی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس مزدور سبھا نے مزدوروں کی جنگ جویانہ روح کو ابھارنے کے بجائے اس کے کچلنے کا کام کیا۔ اگرچہ یہ مزدور سبھا مزدور طبقہ کے لئے چند مدرسے اور شفاخانے کھولنے کا دعویٰ ضرور کر سکتی ہے لیکن جہاں تک مزدوروں کے عام مفاد کا تعلق ہے وہ قطعی رجعت پسندانہ ثابت ہوئی۔ اس نے آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگرس یا کسی دوسرے بین الاقوامی ادارہ سے اپنا الحاق نہیں کیا۔ غرض کہ اس طرح گاندھی اور ان کے نائبین نے احمد آباد کی مزدور تحریک کو اپنی محفوظ فوج کے قالب میں ڈھال دیا اور اسی پر انہوں نے اپنی آیندہ طاقت اور عظمت کی بنیاد رکھی۔

خدا کا شکر ہے کہ اس عرصے میں غیر ملکی اخبار نویسوں اور مزدور کمیشنوں نے گاندھی جی کی اُس شاندار عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ہے جس کی بنیاد انھوں نے ۱۹۱۸ء کی نام نہاد جیت پر رکھی تھی انھوں نے گاندھی جی کے شہر کے مزدوروں کے تنگ و تاریک اور روشنی اور ہوا سے محروم قبر نما کوٹھریوں کی بڑی صحیح اور سچی تصویر کھینچی ہے۔

دسواں باب

دونوں طرف کامیابی

احمد آباد کی ہڑتال کا جھگڑا چکانے کے بعد ہی، گاندھی جی کو کیرا کی مہم کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ اُن کی سول نافرمانی کی تحریک میں شامل ہونے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ اِس جد و جہد سے مجھے بڑی دل چسپی تھی کیونکہ میرا اپنا ضلع تھا اور نادیاد جو ہماری تحریک کا مرکز بنایا گیا تھا، میرا خاص وطن تھا۔

کچھ بنجر اور ریتلے علاقوں کو چھوڑ کر، کیرا کو ایک زرخیز زرعی خطہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ چھ سو دیہاتوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے اکثر گانوؤں کو ۱۹۱۷ء کی برسات میں بارش کی کثرت سے بہت نقصان پہنچا اور خریف کی فصل قریب قریب بالکل برباد

ہو گئی- لازمی طور پر کسانوں کی ساری امیدیں ربیع پر لگی ہوئی تھیں، جس کا رقبہ بہت محدود تھا-

غرض کہ فصل عام طور سے تباہ ہو چکی تھی اور روپیہ میں تین آنہ کی بھی توقع نہ تھی- کسان اور وہ مقامی لیڈر جو ہوم رول تحریک کی پیداوار تھے، لگان کی دوسری قسط کو ملتوی کرانے کی کوشش کرنے لگے- پہلی قسط ۱۹۱۷ء کے آخر میں ادا کی جا چکی تھی- مسٹر موہن لال پانڈے اور مسٹر شنکر لال پارکھ ضلع بھر میں گھوم پھر کر اپنی تحقیقات ختم کر چکے تھے، اور انھوں نے سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی کے ممبروں، مسٹر وٹھل بھائی پٹیل اور آنجہانی سر گوکل داس کاہن داس کو بھی جو اس وقت بمبئی لیجسلیٹو کونسل میں گجرات کی نمائندگی کر رہے تھے، اس معاملہ کی طرف متوجہ کیا- ضروری تحقیقات کرنے اور کسانوں کے مطالبہ کو حق بجانب خیال کرنے کے بعد مسٹر پٹیل اور سر گوکل داس پارکھ نے ایک وفد کی صورت میں کلکٹر ضلع سے ملاقات کی- انھوں نے کمشنر سے بھی واجبی امداد و اعانت کی اپیل کی- بالآخر ان تمام کوششوں کے ناکام ہونے پر مسٹر پانڈے اور مسٹر پارکھ نے معاملہ کو گاندھی جی اور گجرات سبھا کے سامنے پیش کیا-

میرے حافظہ میں اس چھوٹے سے جلسے کا ایک گہرا نقش آج بھی موجود ہے جو ولبھ بھائی پٹیل کے گھر میں منعقد ہوا تھا- ولبھ بھائی پٹیل نے پچھلی گودھرا کانفرنس میں کافی دلچسپی لی تھی، نیز گجرات سبھا کی عرضداشت کی تائید میں انھوں نے ضلع کے متعدد سیاسی جلسوں میں تقریریں بھی کی تھیں- ولبھ بھائی کے گھر والے جس چھوٹے جلسہ کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے، اسی میں ایک طرف تو گاندھی جی اور ان کی مختصر سی جماعت اور دوسری جانب مسٹر وٹھل بھائی پٹیل اور سر گوکل داس پارکھ کے درمیان کیرا کے مسئلہ پر بحث و تمحیص ہوئی- سر گوکل داس نے کیرا میں کسی قسم کی عدم ادائیگی لگان کی تحریک جاری کرنے کے مشورہ کی سختی سے مخالفت کی- کیوں کہ ان کے خیال میں یہ ضلع یوں ہی ہنگامہ درآغوش تھا- اگرچہ مسٹر وٹھل بھائی پٹیل کسانوں کے مطالبہ کو نسبتاً زیادہ معقول اور منصفانہ سمجھتے تھے، تاہم وہ بھی سر گوکل داس کے دقیانوسی خیال کے حامی تھے- ان لوگوں کی گفتگو کو پوری توجہ سے سننے کے بعد گاندھی جی نے چند لفظ کہے جن کا ہم پر بہت اثر ہوا انھوں نے فرمایا "افسوس کہ میں سر پارکھ اور مسٹر پٹیل کی ہم نوائی نہیں کر سکتا میں تسلیم کرتا ہوں کہ کیرا اور گجرات کے کسانوں کے بارے میں ان کا تجربہ بہت پرانا ہے اور ان کی رائے اس تجربہ کے زیر اثر ہے لیکن عام سول نافرمانی کا میرا بیس پچیس سالہ تجربہ مجھے بالکل ایک دوسرے نتیجہ کی طرف لے جاتا ہے- اگر واقعات وہی ہیں جو مسٹر پانڈے اور مسٹر پارکھ نے ہمارے سامنے بیان کیے ہیں تو میں بلاشبہ کسانوں کو یہی مشورہ دوں گا کہ وہ لگان کی دوسری قسط ہرگز نہ ادا کریں- سب سے ضروری بات یہ ہے کہ مجھے خود کسانوں کے مطالبہ کی معقولیت کا یقین ہونا چاہیے- اس لئے میں اپنے نوجوان دوستوں سے گزارش کروں گا کہ وہ ضلع کے چھ سو دیہاتوں کا دورہ کر کے مجھے صحیح حالات سے روشناس کرائیں تاکہ قبل اس کے کہ میں قطعی طور پر عدم ادائیگی لگان کی مہم شروع کرنے کا فیصلہ کروں معاملہ کو ذمہ دار احکام کے سامنے پیش کر سکوں"

مسٹر وٹھل بھائی پٹیل اور سر گوکل داس پارکھ اس اہم فیصلہ سے کبیدہ خاطر تھے مگر ہم نوجوان اس پر خوشیاں منا رہے تھے- اور اسی وقت سے ہم نے ہندوانا تھ آشرم ناڈیاد میں اپنا مرکز قایم کرنے کے انتظامات شروع کر دئے

ہوم رول ایجیٹیشن کے سلسلہ میں ہم میں کچھ لوگ کیرا کے چند دیہاتوں کا دورہ کر چکے تھے- لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ گاندھی جی نے ہمیں پورے چھ سو دیہاتوں کے دورہ پر مامور کیا ان میں سے بعض کی آبادی دس ہزار نفوس تک تھی- اور بعض میں صرف چند جھونپڑے تھے انھوں نے ایسی سختی کے ساتھ ضابطہ کی زنجیروں میں جکڑا اور تحقیقات کو صرف دس دن کے اندر مکمل کر لینے کا حکم دیا- چناں چہ کارکنوں کو دس یا بارہ گروہوں میں تقسیم کر دیا گیا اور ہر گروہ کے لیے روزانہ چار پانچ گاؤں کا دورہ لازمی ٹھہرایا گیا ہونے پر سہاگہ یہ کہ ہندوستان کی چلچلاتی دھوپ میں ضلع کے ریتلے راستوں اور میدانوں کو طے کرنے کے لئے ہمیں بیل گاڑیوں پالکی اور سواری کے استعمال کی اجازت نہ دی گئی-

اس طرح ہم ایک سخت آزمایش میں مبتلا کر دیے گئے ہمیں روزانہ پندرہ بیس میسل پیدل چلنا پڑتا تھا اور جب کسی گاؤں میں کھانا نہ ملتا تو خشک میوؤں اور ناریل پر بسر کرنا پڑتا۔ ہم نے ہر جگہ کچھ لوگوں سے ملاقات کی اور اعداد و شمار سے زیادہ ان کے تاثرات معلوم کرنے کی کوشش کی۔ ہم نے اپنی رپورٹ ٹھیک وقت پر گاندھی جی کی خدمت میں پیش کر دی۔ صورت حال سے اچھی طرح واقف ہونے کے بعد گاندھی جی نے ذمہ دار حکام سے لگان کی دوسری قسط کے التوار کی درخواست کی۔ جب مراسلوں اور ملاقاتوں سے ذمہ دار حکام کے دل نہ پسیجے تو گاندھی جی نے ضلع کیرا میں عدم ادائیگی لگان کا آوازہ بلند کیا اور اس طرح غالباً ہندستان میں حکومت برطانیہ کے خلاف پہلی عظیم الشان تحریک کا آغاز ہوا۔

گاندھی جی نے اس سلسلہ میں ضلع کسانوں کے لیے حسب ذیل عہد نامہ تیار کیا۔

"یہ جانتے ہوئے کہ دیہاتوں کی پیداوار روپیہ میں چار آنہ سے بھی کم ہے، ہم نے حکومت سے سال رواں کے لگان کے التوا کی درخواست کی لیکن حکومت نے ہماری فریاد نہ سنی لہٰذا ہم دستخط کنندگان حلفاً اعلان کرتے ہیں۔ کہ ہم بہ طور خود اس سال کا پورا یا بقایا لگان حکومت کو ہرگز نہ ادا کریں گے۔ حکومت جو قانونی کارروائی بھی مناسب سمجھے کرے، ہم عدم ادائیگی لگان کے نتائج کو بہ خوشی برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ہم بہ طور خود لگان ادا کر کے اپنے معاملہ کو خراب اور اپنی خودداری کو مجروح نہ ہونے دیں گے خواہ ہماری زمینیں ضبط ہی کیوں نہ کر لی جائیں تاہم اگر حکومت پورے ضلع میں لگان کی دوسری قسط کو ملتوی کرنے پر راضی ہو جائے تو ہم میں وہ لوگ جو لگان ادا کرنے کے قابل ہیں اپنے ذمہ کا پورا یا بقایا لگان ادا کریں گے۔ جو لوگ لگان ادا کر سکتے ہیں انہیں بھی لگان دینے سے روکنے کا سبب یہ ہے کہ اگر انہوں نے لگان ادا کر دیا تو نادار کسان بھی گھبرا کر لگان ادا کرنے کی کوشش کریں گے خواہ اس کے لیے انہیں اپنے مویشی بیچنے پڑیں یا قرض لینا پڑے اس طرح یہ بیچارے بڑی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ ان حالات میں ہم محسوس کرتے ہیں کہ جو لوگ لگان ادا کر سکتے ہیں، غریبوں کی خاطر ان کا بھی یہی فرض ہونا چاہئے کہ وہ اپنا لگان روک لیں"

اس سے پتہ چلتا ہے کہ احمد آباد کے ہڑتالی عہد نامے کی طرح گاندھی جی نے اس عہد نامہ میں بھی بھاگ جانے کا ایک چور راستہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ اس لیے جنگ کا قرنا پھونکنے کے ساتھ ہی اگر وہ ذمہ دار حکام سے گفتگوے مصالحت کے لیے بھی بے حد بیتاب نظر آنے لگے تو اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے۔ یہ چور دروازہ انھوں نے اس غرض سے بنایا تھا کہ کسی سمجھوتے پر پہنچنے کی صورت میں حکومت کو یا انہیں (گاندھی جی) یہ فیصلہ کرنے میں کہ کون سے کسان لگان ادا کرنے کے قابل ہیں کافی سہولت اور گنجائش رہے۔

عہد نامہ کی اس بنیادی خامی کے باوجود عدم ادائیگی لگان کی تحریک تیزی سے بڑھتی چلی گئی اور ضلع بھر کی تحصیلوں کے چھوٹے بڑے کسان گاندھی جی کے جھنڈے تلے آتے گئے

"مسز ڈاکٹر بیسنٹ کے زبردست ہوم رول ایجی ٹیشن سے کسان ضرور متاثر ہوئے تھے، لیکن یہ کیرا کی مہم کا طفیل تھا کہ ملک کا تعلیم یافتہ طبقہ کسانوں کی اصلی زندگی سے واقف ہوا"[1] اس طرح گاندھی جی نے تیار زمین میں بیج بو کر بہت عمدہ فصل کاٹی۔

دوسری طرف حکومت نے بھی تخویف اور تشدد کا سلسلہ شروع کیا۔ ہزارہا کسانوں کو نوٹسوں کے ذریعہ تنبیہ کی گئی کہ اگر انہوں نے وقت پر لگان نہ ادا کیا تو ان پر بھاری جرمانے کیے جائیں گے۔ کسانوں کی منقولہ جایدادیں اور مویشی تک قرق کیے جانے لگے، آخر انھوں نے بھی مالگذاری کے افسروں کے ساتھ "آنکھ مچولی" کھیلنا شروع کر دیا۔ رضاکار دیہاتیوں کو مالگزاری کے افسروں کے چھاپہ مارنے کے وقت سے مطلع کر دیتے اور ایک نقارہ کے ذریعہ سارے کسانوں کو آگاہ کر دیا جاتا کہ وہ گھروں میں تالے

---

[1] یہ ٹکڑا گاندھی جی کی خود نوشت سوانح عمری سے درج کیا گیا ہے ہوم رول کی تحریک کے دوران میں اگرچہ وہ اس سے بالکل الگ تھلگ رہے لیکن یہی کیا کم ہے کہ انھوں نے اس کے بعض اثرات کا اعتراف کیا۔

لگا کر اپنے مویشی کھول دیں، اور خود ادِھر اُدھر منتشر ہو جائیں۔ مالگذاری کے افسر نہ تو مویشیوں کو شناخت کر سکتے اور نہ کوئی سامان قرق کر سکتے کیونکہ اس وقت تک انھیں تالا توڑنے اور مکانوں میں گھسنے کا اختیار نہ تھا۔ اس رکاوٹ کے باوجود بھی انھوں نے دلیر کسانوں کے سینکڑوں مویشی اور دوسری منقولہ جائدادیں قرق کر لیں۔

کشمکش بڑھتی ہی گئی۔ عدم ادائیگی لگان کے سلسلہ میں یہ کسانوں کا پہلا تجربہ تھا۔ اگرچہ وہ یہ جانتے تھے کہ انہیں تشدد سے دور رہنا چاہئے۔ تاہم قدرتی طور پر ان سے یہ توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی کہ مالگذاری کے بے رحم اور سنگدل افسروں کے ساتھ ان کا رویہ نرم اور شریفانہ ہی رہے گا، چنانچہ کبھی کبھار گانو کے شریر لوگ مالگذاری کے افسروں کو دق کرتے اور اُن کے قبضہ سے قرق شدہ مویشی چھڑا لیتے۔ اسی طرح ان دیہاتی مردوں اور بعض عورتوں نے بھی جن پر اس انقلابی شورش کا ذرا زیادہ گہرا اثر پڑا تھا۔ چند افسروں کی توہین کی اور انہیں بُرا بھلا بھی کہا۔ اِن فطری حادثات پر گاندھی جی نے حسب ذیل لفظوں میں ماتم کیا ہے۔

"اس وقت کسانوں کو شائستگی اور ایمانداری کے فرائض کا احساس کرانا بالکل غیر ممکن معلوم ہوتا تھا اور ان کے دلوں سے ایک بار افسروں کا ڈر نکل جانے کے بعد انہیں ان (افسروں) سے اپنی توہین کا انتقام لینے سے روکنا بہت مشکل نظر آ رہا تھا۔ غرض کہ ان کے غیر شریفانہ اطوار سے ستیہ گرہ کی تباہی اسی طرح یقینی تھی جس طرح سنکھیا کا ایک ذرہ سیلے دودھ کو کسی مصرف کا نہیں رکھتا۔"

حکومت بھی اپنی سخت گیر اور جابرانہ پالیسی پر سختی سے قایم رہی۔ قرق شدہ مویشی بڑی تعداد میں فروخت کیے جانے لگے اور افسروں نے کھڑی کھیتیاں بھی ضبط کرنی شروع کر دیں۔ سینکڑوں کسانوں کو اس مضمون کے نوٹس دے گیے کہ اگر انھوں نے مقررہ میعاد میں اپنا لگان ادا نہ کیا تو ان کی زمین ہمیشہ کے لیے بحق سرکار ضبط کر لی جائے گی۔ جن کسانوں کو پہلے پہل یہ نوٹس ملے وہ بچارے بہت گھبرائے اور دیہاتوں سے بھاگ کر اس وقت گاندھی جی کی خدمت میں پہنچے جب کہ وہ اپنی قیام گاہ کے احاطہ میں چہل قدمی فرما رہے تھے۔ میں حسن اتفاق سے اس وقت وہیں موجود تھا اور میں نے اپنے کانوں سے وہ دلیرانہ الفاظ سنے جو پیر سابرمتی نے کسانوں کو باہمت اور مستقل مزاج رہنے کی تلقین کرتے ہوے ارشاد فرمائے گاندھی جی نے انہیں یقین دلایا کہ جو زمینیں پچھلی کئی صدیوں سے ان کے باپ دادا کے قبضہ میں رہتی چلی آئی ہیں، اس دنیا کی کوئی حکومت انھیں ان سے بے دخل نہیں کر سکتی۔

کسانوں کو گاندھی جی کی باتوں سے اطمینان ہو گیا اور وہ ان کی دعاؤں سے مالامال ہو کر گھروں کو واپس ہوے تاکہ اپنی مہم کو بدستور جاری رکھیں۔ لیکن تحریک میں کمزوری اور انحطاط کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ کم ہمت کسانوں نے لگان دینا شروع کر دیا تھا اور مالگزاری کے افسر آہستہ آہستہ حکومت کا خزانہ بھرتے چلے جا رہے تھے۔ تحریک کو شرمناک تباہی سے بچانے کے لیے گاندھی جی نے ایک نیا حربہ ایجاد کیا، چنانچہ وہ خود تحریر فرماتے ہیں کہ "ڈرے ہوے لوگوں کی ڈھارس بندھانے کے لیے میں نے کسانوں کو یہ صلاح دی کہ وہ مسٹر پانڈے کی رہبری میں اپنی پیاز کی فصل کاٹ ڈالیں جو میری رائے میں ناجائز طور پر ضبط کی گئی تھی۔" چنانچہ اس رائے پر عمل کرنے پر مسٹر پانڈے اور ان کے ساتھیوں کو ایک ایک مہینہ کی سزا ہوئی۔

یہ چال بھی کسانوں کو آنے والی تباہی سے بچانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ گاندھی جی لکھتے ہیں کہ "تحریک غیر متوقع طور پر ختم ہو گئی صاف پتہ چلتا تھا کہ کسانوں کی ہمتیں جواب دے چکی ہیں۔ ان کسانوں کو برباد ہوتے ہوے دیکھ کر جو اب تک اپنے اصول پر قائم تھے مجھے بڑی پریشانی ہوئی۔ میں جدوجہد کو ختم کرنے کے لیے ایک ایسا خوبصورت بہانہ ڈھونڈھ رہا تھا، جو ایک ستیہ گرہی کے لیے قابل قبول ہو۔" خوش قسمتی سے انہیں جلد ہی ایک موقع مل گیا۔ کسی افسر کی طرف سے انہیں ایک پیغام ملا کہ اگر خوش حال کسان اپنا لگان ادا کر دیں تو ناداروں کے لیے التوا منظور کیا جائے گا۔ اسی پیغام کی بنیاد پر وہ کلکٹر سے ملے جس نے نہایت سرد مہری سے انہیں بتایا کہ تحصیلدار کے خط کے مطابق التوا کے احکام پہلے ہی نافذ کر دیے گیے ہیں۔ اتنی سی بات پر گاندھی جی نے عدم ادائیگی لگان کی تحریک بند

کرنے کے لئے کافی سمجھی اور اُسے جانبین کی فتح سے تعبیر کیا۔

گاندھی جی خود تسلیم کرتے ہیں کہ "مجھے اس انجام سے چنداں خوشی نہ ہوئی۔ کیوں کہ اس میں وہ بات نہ تھی، جو ایک ستیہ گرہ کے انجام میں ہونی چاہئے تھی۔ کلکٹر کا رویہ ایسا تھا کہ گویا اس نے سمجھوتے کے لیے کچھ کیا ہی نہ تھا"۔

چونکہ اس تحریک کا آغاز ہوم رول ایجی ٹیشن کے دوران میں ہوا تھا۔ لہذا اس نے گجرات کے کسانوں میں صحیح سیاسی بیداری پھیلانے میں بہت بڑا حصہ لیا اور گجرات کی سیاسی زندگی ایک نئے جوش اور ولولے سے معمور ہو گئی۔ کسانوں کو اپنی ناقابل فراموش طاقت کا اندازہ ہوا، اور یہ بات عوام کے دلوں میں بیٹھ گئی کہ اُن کی نجات خود ان کی قربانیوں اور تکالیف برداشت کرنے کی قوت پر منحصر ہے۔

اگرچہ تحریک سے بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں مگر حقیقت میں کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ البتہ اس نے نہ صرف ضلع اور صوبہ بلکہ ہندستان بھر کے کسانوں میں زندگی کی ایک نئی روح ضرور دوڑا دی۔ تحریک کے عبرتناک انجام سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح گاندھی جی کسی انقلابی مہم کو ایک خاص مرحلے تک لے جانے کے بعد، خود کو اور دوسروں کو کامیابی کا یقین دلاتے ہیں، اگرچہ حقیقت میں کامیابی کوسوں دور ہوتی ہے۔ انہوں نے بارہا اس قسم کے ناکام سوانگ رچائے ہیں، جنھیں ہندوستان کی آزادی کی راہ میں وہ اپنی اور قوم کی فتح سے تعبیر کرتے ہیں۔ چناں چہ اس قسم کے تماشوں میں تازہ ترین اور انتہائی احمقانہ وہ مشہور یا بدنام تماشہ ہے جو "گاندھی اروِن پیکٹ" کے نام سے موسوم ہے اور جس کی بنا پر پچھلے سال سول نافرمانی کی تحریک کا جنازہ نکلا

گیارھواں باب

وار کانفرنس میں

جس زمانے میں گاندھی جی کیرا میں عدم ادائیگی لگان کی تحریک چلا رہے تھے، جنگ عظیم ایک نازک مرحلہ پر پہنچ گئی تھی۔ اب تک حکومت برطانیہ، ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو جنگ میں گھسیٹنے میں کامیاب نہ ہوئی تھی۔ ہندستان روپیہ اور آدمیوں کی امداد دیتے دیتے بالکل خستہ حال ہو چکا تھا۔ چنانچہ لارڈ ہارڈنگ کے قول کے مطابق جنگ کے ابتدائی سالوں ہی میں اس کا خون چوس لیا گیا تھا اور ہندوستانی خزانے کا کروروں روپیہ اور ہندستان کے لاکھوں سپوت زبردست وبا کی نذر ہو چکے تھے۔ لیکن جب یہ قربانیاں بھی لڑائی جیتنے میں کچھ مدد نہ دے سکیں تو حکومت برطانیہ نے حکومت ہند پر زور ڈالا کہ وہ ہندستان سے مزید روپیہ اور آدمیوں کی فراہمی کے لیے زیادہ سے زیادہ کوشش کرے۔

ان ہدایتوں کے ملتے ہی وائسرائے ہند لارڈ چیمسفورڈ نے ایک نئی ترکیب نکالی۔ سرکاری اثر و رسوخ اور زمینداروں اور والیان ریاست سے انتہائی فائدہ اٹھانے کے بعد انہوں نے ملک کے اونچے طبقہ اور سیاسی عقل و شعور رکھنے والوں کو ایک جگہ اکٹھا کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ ان کا بھی اشتراک اور تعاون حاصل ہو سکے چناں چہ انہوں نے اس مقصد کے لیے دہلی میں ایک خاص وار کانفرنس

منعقد کی۔ ہندستان کے مقتدر ارباب سیاست کو نظر انداز کر کے موصوف نے راجاؤں، زمینداروں اور تاجروں کے ایک وسیع گروہ کے ساتھ گاندھی جی کو بھی کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی۔

گاندھی جی کو یہ دعوت نامہ اس وقت ملا جب کہ وہ کیرا کے کسانوں کو عدم ادائیگی لگان کی تحریک کو کامیابی کے ساتھ آخری منزل پر پہنچانے کی تلقین کر رہے تھے لیکن حکومت اپنے آدمیوں کو خوب پہنچانتی ہے۔ ارباب حکومت کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ظاہری مخالفتوں کے باوجود گاندھی جی حکومت برطانیہ کے دلی وفادار ہیں۔ گاندھی جی پر حکومت کا اعتماد کس حد تک درست تھا۔ اس کا اندازہ ان کے ایک خط کے حسب ذیل جملوں سے کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے کانفرنس کے خاتمہ کے بعد ہی وائسرائے کو لکھا۔

"اگر میں اپنے اہل وطن کو رجعت پر آمادہ کر سکتا تو میں ان سے کہتا کہ جب تک جنگ جاری رہے وہ کانگریس کی ساری تجویزیں واپس لے لیں اور ہوم رول یا ذمہ دار حکومت کا تذکرہ تک نہ کریں۔ کاش ہندستان اس نازک لمحہ میں اپنے اُن تمام سپوتوں کو جو جسمانی حیثیت سے جنگ کے قابل تھے مملکت برطانیہ کی چوکھٹ پر قربان کر دیتا۔" (اس خط کو ریورنڈ آئرلینڈ اف کیمبرج جیسے مقدس انسان نے اپنے مبارک ہاتھوں سے وائسرائے بہادر کی خدمت میں پیش کیا) اپنے چمپارن اور کیرا کے "کارہائے نمایاں" کے متعلق گاندھی جی نے جو ذیل کے ریمارک کیے ہیں۔ ان سے بھی ان کی برطانیہ پرستی کا پردہ چاک ہوتا ہے۔

"چمپارن میں صدیوں کے مظالم کا مقابلہ کر کے میں نے برطانوی انصاف کی حتمی فوقیت ثابت کر دکھائی ہے۔ کیرا کی وہ آبادی جو حکومت کو کوس رہی تھی محسوس کرنے لگی ہے کہ حقیقی قوت کا سرچشمہ خود ہے نہ کہ حکومت اور یہ کہ جس سچائی کی وہ نام لیوا ہے اس کے لیے اُسے خود شدائد برداشت کرنے چاہئیں۔ چناں چہ اسی کے پیش نظر حکومت سے اُس کے اختلافات ختم ہوتے چلے جا رہے ہیں اور یہ کہتی ہوئی سنائی دیتی ہے کہ حکومت کو عوام کے مفاد کا خیال رہتا ہے۔ کیوں کہ یہ حکومت اس معمولی اور ذمہ دار نافرمانی کو نظر انداز کر دیتی ہے جو بے انصافی کے احساس کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ چمپارن اور کیرا کے معاملات جنگ کی امداد کے سلسلہ میں میرے خاص اور اہم کارنامے ہیں مسلم حکومتوں اور مقامات مقدسہ کے متعلق ہندستانی مسلمانوں کے اندر جو بے پناہ جذبۂ عقیدت و احترام موجود ہے اور ہندستان کے لیے حکومت خود اختیاری کا جو برمحل اور منصفانہ مطالبہ ہے ان سب کی تہہ میں بھی سلطنت برطانیہ ہی کی سلامتی کا تصور کار فرما ہے میں یہ اس لئے لکھ رہا ہوں کہ مجھے برطانوی قوم سے محبت ہے اور میں ہر ہندستانی کے دل میں انگریزوں کی وفاداری کا جذبہ بیدار کرنا چاہتا ہوں۔"

اس حقیقت کے باوجود کہ برطانیہ نے ہندستان کی آزادی چھینی اور اب بھی وہ اس پر بزور شمشیر حکومت کر رہی ہے گاندھی جی کی کوشش یہی رہی کہ وہ ہندستان کو محبت اور شفقت کے ریشمی دھاگوں کے ذریعہ سلطنت برطانیہ سے باندھ رکھیں۔

گاندھی جی کانفرنس کی شرکت کے غرض سے دہلی گئے لیکن بالکل آخری وقت وہ کانفرنس میں شریک ہونے سے ہچکچانے لگے کیوں کہ حکومت نے لوکمانیہ تلک مسز بسنٹ اور علی برادران کو جنھیں گاندھی جی ہندستان کے بہت بااثر اور طاقت ور سیاسی رہنماؤں میں شمار کرتے تھے کانفرنس میں مدعو نہیں کیا تھا۔ وہ انگلستان اور اٹلی کے بعض ان خفیہ معاہدوں سے بھی تشویش میں پڑ گئے۔ جن کی طرف ان کی توجہ ریورنڈ اینڈریوز نے مبذول کرائی تھی۔ چناں چہ انہیں وار کانفرنس کے نیک مقاصد اور اس میں شرکت کے اخلاقی جواز پر شبہ سا ہونے لگا۔ انہوں نے پہلے تو وائسرائے کی خدمت میں ایک نجی خط بھیجکر خود کو تسکین دینی چاہی۔ لیکن بعد میں ان سے ملاقات بھی کی اُس ملاقات میں انہوں نے وائسرائے کے سامنے اپنی مشکلات پیش کیں اور بالآخر "اور کسی وجہ سے نہیں تو صرف اسی بنا پر کہ ان کے دل میں وائسرائے کا بڑا احترام تھا۔ اس کانفرنس میں شرکت کی جسے لوگ عام طور پر اب تک مہاجنوں ساہوکاروں اور حکومت کے خوشامدیوں کا کعبۂ مقصود سمجھتے تھے اس پر بھی وہ ایک بڑی خدمت انجام دیتے اگر وہ کانفرنس میں کنایتہً بھی ہندستان کی سیاسی توقعات کا تذکرہ کر دیتے۔ ظاہر ہے کہ انہیں توقعات

پر ہی ہندستان کی آئندہ امداد کا انحصار ہو سکتا تھا وہ کانفرنس میں اہم اور ممتاز سیاسی رہنماؤں کی عدم شرکت پر بھی وائسرائے کی توجہ مبذول کرا سکتے تھے لیکن "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"۔ ایسے سرکاری مجمع میں انھوں نے ہندستانی (جو ہندستان کی قومی زبان ہے) میں تقریر کی اور اس کے پردہ میں ساری کام کی باتیں نظر انداز کر گئے یعنی ہندستانی میں تقریر کرنے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ ہندستانیوں کے سیاسی مطالبات اور توقعات کے اصل موضوع کو گاو خورد کرنے میں انھیں کوئی رکاوٹ نہ پیش آئے۔ انگریزی میں انھوں نے صرف یہ ایک جملہ ارشاد فرمایا۔

"پوری ذمہ داری کے ساتھ میں اس تجویز کی تائید کرتا ہوں۔"

غرض کہ اوپر کی سطروں سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ جب سارا ہندستان سیاسی بےچینی کی کھولن میں مبتلا تھا، گاندھی جی لڑائی کے لیے رنگروٹ بھرتی کرنے کی مہم شروع کر رہے تھے۔ انھوں نے وائسرائے کو ایک بہت لمبا چوڑا خط لکھا —— بالکل بے ضرر اور جوش وفاداری سے لبریز۔ اس میں کہیں کہیں سیاسی مطالبات کے بھی چھینٹے تھے۔ گویا اس خط سے وہ اپنے ضمیر کو اس فریب میں مبتلا کرنا چاہتے تھے کہ اُن کا طرز عمل حق بجانب تھا۔

کانفرنس میں ایک پکے ملوکیت پرست کی طرح اپنا فرض بجالانے کے بعد گاندھی جی سیدھے بمبئی واپس ہوئے۔

اس کے بعد صوبائی حکومتوں نے صوبائی وار کانفرنسیں منعقد کرنی شروع کر دیں۔ مقصود یہ تھا کہ جہاں تک ہو سکے چھوٹی ریاستوں، کاروباری طبقوں اور دولت مندوں کے مجموعی وسائل اور ذرائع لڑائی کے لیے حاصل کیے جائیں۔ اسی قسم کی ایک کانفرنس میں حکومت ہند کے زیر ہدایت بمبئی کی حکومت نے نہ صرف گاندھی جی بلکہ مسٹر تلک اور دوسرے اہل سیاست کو بھی مدعو کیا۔ اگرچہ مسٹر تلک اور ان کے احباب نے بخوشی دعوت منظور کر لی، لیکن ان کے بارے میں کسی کا بھی یہ خیال نہ تھا کہ وہ بھی ایسے ہی وفادار اور سعادت مند ثابت ہوں گے جیسے کہ گاندھی جی، اس کے خلاف ان سے یہ توقع ضرور تھی کہ وہ اپنے فیصلوں سے کانفرنس کو ایک گونہ حیرت میں مبتلا کر دیں گے۔ میں بھی بمبئی پہنچا تاکہ ان سیاسی تغیرات کے اتار چڑھاؤ کو قریب سے دیکھ سکوں۔

بمبئی پہنچتے ہی مسٹر تلک نے ہوم رول لیگ کے کارکنوں اور دوسرے آزاد سیاسی رہنماؤں سے، جو کانفرنس میں مدعو تھے مشورے شروع کر دیے۔ سارے قوم پرور اراکین کو ایک متحدہ پالیسی پر لانے کے لیے مسٹر تلک اور ان کے احباب نے چند متبادل تجویزیں تیار کیں ان میں سے بعض تجویزیں ضرور انتہا پسندانہ خیالات کی حامل تھیں لیکن بقیہ کے عملی اور معقول ہونے میں کلام نہ تھا آخر کار جب سارے اراکین کسی مشترکہ طریق کار پر متفق نہ ہو سکے تو قدرتی طور پر مسٹر تلک کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہ گیا کہ وہ اپنی راہ الگ نکالیں۔

ان نجی جلسوں کی خبریں اور اُن کی تجویزیں بہت جلد سارے شہر میں پھیل گئیں اور شہر کے اکثر سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں شدید بےچینی کی لہر دوڑ گئی۔ جلد ہی لوگوں کو پھر یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حکومت نے مسٹر تلک کو اس ابتدائی کمیٹی میں شریک کرنے سے انکار کر دیا ہے جو کانفرنس کے لیے تجویزیں مرتب کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ کانفرنس کے کھلے اجلاس میں بھی کسی تجویز کے پیش کرنے یا تائید کرنے کے لیے انھیں حکومت نے تکلیف دینی مناسب نہ سمجھی اس سے اسکے علاوہ اور کیا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ حکومت نے مسٹر تلک جیسے عالی قدر سیاسی رہنما کو کانفرنس میں شریک ہونے کی دعوت دے کر اور بعد میں اُنکے ساتھ انتہائی بے توجہی برت کر ان کی بہت بڑی توہین کی۔ اگر وہ کسی آزاد ملک میں ہوتے تو ان حالات کے تحت اُنکا وہ سب کچھ اعزاز و اکرام کیا جاتا جو حزب مخالف کے رہنما کے شایان شان ہوتا۔ غرض کہ اس اہم کانفرنس کے انعقاد کے وقت بمبئی کا سیاسی ماحول اسی قسم کی تلخیوں سے معمور تھا۔

گاندھی جی اس منظر پر اس وقت نمودار ہوئے جبکہ معاملات بہت آگے بڑھ چکے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے شاید ہی گاندھی جی نے کانفرنس کے متعلق مسٹر تلک سے کوئی مشورہ کیا ہو۔ اگر کبھی کبھار وہ ان سے ملے بھی تو ان کے وفادارانہ مسلک اور مسٹر تلک کے مجاہدانہ رویہ کے مابین کوئی سمجھوتے کی صورت نہ پیدا ہو سکی گر میرے حافظے میں اُس غیر رسمی جلسے کی یاد اب تک تازہ ہے۔ جو گاندھی جی کی قیام گاہ پر (گاندھی جی) کے حکومت بمبئی کے اس فیصلہ سے واقف ہونے کے بعد کیا گیا تھا، جس کے رو سے حکومت نے مسٹر تلک اور ان کے رفقا کو بالکل نظر انداز کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ بمبئی کی نوکر شاہی سے گاندھی جی کو اس بد خلقی کی توقع نہ تھی۔ انھیں بمبئی کی حکومت کی طرف سے ایک

خط بھی ملا تھا، جس میں اُن سے کانفرنس میں ایک غیر اہم تجویز کی تائید کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔ اس موقع پر بمبئی کے سارے ہوم رول کارکن موجود تھے اور گاندھی جی کے فیصلہ کا بےچینی سے انتظار کر رہے تھے۔ ایک لمحہ کے لیے گاندھی جی کچھ بےچین سے نظر آئے اور پھر ایک گہری اور ناقابل فہم خاموشی میں ڈوب گئے چناں چہ تھوڑی دیر کے لیے تو ہم سب کا یہ خیال ہو گیا کہ شاید حکومت کے غلط اور غیر معقول رویہ سے بیزار ہو کر گاندھی جی کانفرنس کے بائیکاٹ کا فیصلہ کر بیٹھیں گے۔ بالآخر انھوں نے اپنے لب کھولے اور نہایت دل جمعی اور سکون کے ساتھ اپنے مقدس فیصلے کا اعلان کیا کہ وہ کانفرنس کا بائیکاٹ نہ کریں گے۔ لیکن اس تجویز کی تائید بھی نہ کریں گے جس کی تائید حکومت اُن سے کرانا چاہتی تھی۔

دوسرے دن بمبئی ٹاؤن ہال میں اس اہم اور مشہور کانفرنس کا اجلاس شروع ہوا۔ گاندھی جی نیز مسٹر تلک کے ساتھیوں نے اس میں شرکت کی۔ حسب معمول گورنر صاحب نے ایک ملوکیت پرستانہ تقریر کرتے ہوئے حاضرین سے اپیل کی کہ برطانیہ کی فیض رساں شہنشاہیت کو بچانے کے لیے روپیہ کی فراہمی اور رنگروٹوں کی بھرتی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جائے۔

مرہٹوں کی "عظیم الشان قوم" نے اپنے مختصر اور روشن عہد میں دلیری اور بہادری کے جو "کارہائے نمایاں" انجام دیے تھے۔ تقریر میں ان کو بھی خاص طور پر سراہا گیا تھا۔ اس کے بعد ایک وفا شعار اور خیر خواہ حکومت نے کانفرنس کی خاص تجویز پیش کی جس میں جنگ عظیم کو جاری رکھنے کے لیے صوبہ بمبئی کے راجگان اور باشندگان کی جانب سے ہر ممکن امداد و اعانت کا یقین دلایا گیا تھا۔ ایک دوسرے "بڑے آدمی" نے تہ دل سے تجویز کی تائید کی، چناں چہ حسب قاعدہ، کھوکھلے نعرہائے مسرت کے درمیان، تجویز کانفرنس میں پیش ہوئی۔

پرجوش اور جنگجو تلک اس وقت خموشی سے کھڑے ہوئے اور انھوں نے کانفرنس کے صدر سے ایک ترمیم پیش کرنے کی اجازت چاہی۔ ترمیم کا منشا یہ تھا کہ امداد کو مشروط کر دیا جائے۔ یعنی اس جنگ میں حکومت کی مدد اس وقت کی جائے جبکہ وہ باشندگان ملک کو حکومت خود اختیاری دینے پر راضی ہو جائے۔ وہ اس کے متعلق غالباً حسب ذیل باتیں کہنا چاہتے تھے۔

"فی الحال برطانوی حکومت میں ہماری کوئی جگہ نہیں۔ ہم محض اس کے غلام اور خدمت گزار ہیں۔ جس طرح دوسری نوآبادیوں کو برطانیہ کے سایہ میں مساوات اور حکومت خود اختیاری کے حقوق حاصل ہیں۔ اسی طرح اگر ہمیں بھی آزاد اور خود مختار کر دیا جائے تو حقیقت میں برطانوی حکومت کو ہم اپنی حکومت سمجھیں گے، ہم اس پر فخر کریں گے اور پھر ہم اس کی امداد بھی نہایت خلوص اور سچے دل سے کریں گے۔" لیکن جوں ہی وہ تقریر کرنے کھڑے ہوئے اور اُن کا منشا معلوم ہوا۔ صدر نے ترمیم کو بے ضابطہ قرار دے دیا اور انہیں تقریر کرنے سے روک دیا۔

لیکن کانفرنس کے صدر یعنی گورنر صاحب کو شاید اس بڑے مرہٹہ لیڈر کی فولادی طبیعت اور اس کی جرات و ہمت کا اندازہ نہ تھا۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ ۱۹۰۷ء میں سورت کانگریس میں سر فیروز شاہ مہتا اور سر سریندر ناتھ بنرجی گاندھی کی پرغضب آوازیں اور ان کے سینکڑوں اعتدال پسند پیرووں کا شور و شغب بھی اس شخص کو خاموش نہ کر سکا تھا نہ اسے اجلاس کے پلیٹ فارم سے ایک انچ بھی ہٹا سکا تھا ——— جب کہ اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ کانگریس کو خیر خواہ اعتدال پسندوں کے ہاتھوں میں رہنے دینے سے اس کا تباہ کر دینا ہی اچھا ہے۔ چناں چہ یہاں بھی شدنی ہو کر رہی، اپنے مقصد اور پالیسی کا غیر مبہم لفظوں میں اعلان کرنے کے بعد وہ اپنی جماعت کے ساتھ نہایت خود دارانہ انداز میں کانفرنس سے باہر نکل گئے۔

مسٹر تلک کے "واک آوٹ" سے کانفرنس بالکل غیر دلچسپ اور پھیکی ہو کر رہ گئی، تاہم اس نے اپنی غلامانہ تجویزوں اور وفادارانہ تقریروں کے پروگرام کو "زور شور" کے ساتھ جاری ہی رکھا۔

اس موقع پر گاندھی جی نے کیا کیا؟ کیا واک آوٹ میں انھوں نے مسٹر تلک کا ساتھ دیا؟ نہیں! کیونکہ انھوں نے خود کو اس سے کہیں اعلیٰ اور برتر سمجھا کہ وہ وقت کے سب سے دلیر اور قوم پرور لیڈر کی اتباع کریں۔ کیا وہ کانفرنس سے باہر چلے گئے؟ نہیں!

انھوں نے کسی تجویز کی بھی تائید نہ کی۔ وہ بڑی باریک چال چلے۔ وہ منڈیر پر بیٹھے رہے اور نہ اِدھر کودے اور نہ اُدھر۔ انہوں نے کانفرنس میں زبان تک نہ کھولی۔ اور اس کھوئے ہوئے سنتری کی طرح خاموش بیٹھے رہے جس سے کسی حادثہ کے بعد کسی بڑے فیصلہ کی توقع کی جارہی ہو۔ ہاں انھوں نے اپنی موجودگی سے عام نظروں میں کانفرنس کے وقار بڑھانے کی ضرور کوشش فرمائی۔

بارھواں باب

ناظرین اس موقع پر مجھے ایک لمحہ کے لیے مذکورہ بالا بیان کا سلسلہ منقطع کرنے کے لیے معاف فرمائیں۔ میں یہاں گاندھی جی کے اس تعلق پر بحث کرنا چاہتا ہوں، جو انھیں مسٹر تلک اور ان کی پارٹی، اعتدال پسند جماعت اور خلافت کمیٹی سے تھا۔

اسی بمبئی کی وار کانفرنس میں گاندھی جی نے شاید پہلی مرتبہ مسٹر تلک سے کسی نہ کسی حد تک اتفاق کیا۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی یہ دونوں آپس میں ملتے اور مختلف معاملات پر بحث ومباحثہ کیا کرتے تھے، لیکن لکھنؤ پیکٹ کے متعلق کانگریس کے وسیع مطالبہ کے سوا، ان میں اور کسی بات پر کبھی اتفاق نہ ہوسکا تھا۔

اپنے آپ کو مسٹر گوکھلے کا ایک ادنیٰ چیلا قرار دینے اور سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی سے گہری وابستگی کی بنا پر شروع ہی سے گاندھی جی تلک پارٹی کی مخالف صف میں شامل ہوگیے تھے۔ مزید برآن گاندھی جی ہوم رول کی تحریک میں بھی الگ تھلگ رہے، جسے مسٹر تلک نے اُن دنوں صوبہ بمبئی میں بڑی سرگرمی اور کامیابی سے پھیلایا تھا۔ بات تو یہ ہے کہ گاندھی جی ہوم رول تحریک کے دل سے مخالف تھے اور اُسے نہ صرف بے کار بلکہ ملک کے مفاد کے منافی بھی تصور کرتے تھے اور جیساکہ انہوں نے خود اعتراف کیا ہے ان کی دلی آرزو یہ تھی کہ جب تک جنگ عظیم ختم نہ ہوجائے، کانگریس کی ساری تجویزیں واپس لے لی جائیں اور حکومت خود اختیاری کا نام تک نہ لیا جائے، یہی نہیں بلکہ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ اس نازک موقع (جنگ عظیم) پر ان کے اہل وطن اپنی جانیں بھی سلطنت برطانیہ کے لیے قربان کردیں۔ اپنے اس مشن کو وہ اب تک صرف اس سے پورا نہ کرسکتے تھے کہ انھیں اس میں ہندستان کے تعلیم یافتہ سیاسی طبقہ سے اشتراک وتعاون کی امید نہ تھی۔ غرض کہ مسٹر تلک اور گاندھی جی بالکل ایک دوسرے کی ضد تھے۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ہندستان کے سیاسی مسئلہ کو حل کرنے اور سلجھانے کے عملی طریقہ میں بھی گاندھی جی کو دوسرے بڑے رہنماؤں سے بنیادی اختلاف تھا، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ گاندھی جی نے سیاسی تعلیم وتربیت جنوبی افریقہ میں حاصل کی تھی، جہاں انہیں اس نوآبادی کی ہندستانی اقلیت کی مخصوص تکالیف اور شکایات کے ازالہ کے لیے جنگ کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ بے شک انہوں نے ایک عجیب وغریب سیاسی حربہ ایجاد کیا تھا اور کسی نہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے تھے، چنانچہ جنوبی افریقہ کی بیس سالہ پبلک زندگی میں وہ ایک خاص سیاسی طریقۂ کار کے خوگر ہوگیے تھے، جس میں مرض کو جڑ سے اکھیڑ پھینکنے کے بجائے اُس کی مختلف کیفیتوں کو نظر میں رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے (افریقہ کے بیس سال تجربہ نے گاندھی جی کے دل ودماغ پر ایک امٹ اور گہرا اثر ڈالا تھا) گاندھی جی کے ستیاگرہ کے حربہ میں جو ہندستان کے لیے بالکل نیا معلوم ہوتا تھا، اگرچہ بظاہر انتہاپسندی کی جھلک بھی نظر آتی تھی۔ لیکن مختلف مقامی، صوبائی اور کل ہند شکایات سے عہدہ برا ہوتے میں ان کا طریق کار وہی تھا جو اعتدال پسندوں کا تھا۔

مسٹر تلک کا تجربہ اور ان کا فطری رحجان دونوں گاندھی جی کے تجربہ اور طریق کار سے مختلف تھے۔ وہ زندگی کے میدان میں ایک

ماہر تعلیم کی حیثیت سے داخل ہوئے اور علمی دنیا میں ممتاز درجہ حاصل کیا پھر اخبار نویسی اختیار کی اور سیاست میں نام پیدا کیا لیکن انہوں نے اپنا تعلق بدستور دکن کی سنگلاخ زمین سے باقی رکھا۔ یہی خطہ ان کی تحریکات کا مرکز تھا۔ ان کی طباعی، غیر معمولی ذہانت اور سیاسی تجربہ کی پختہ کاری نے پچھلی صدی کے اختتام ہی پر انھیں یہ یقین دلا دیا تھا کہ اگر ہندستانی چھوٹی چھوٹی شکایتوں اور ضمنی مسایل پر اپنی قوت عمل ضائع کرنے کے بجائے ہندستان کی آزادی اور حکومت خود اختیاری کے مرکزی اور اہم مسئلہ پر توجہ صرف کریں تو یہ ان کے عام مفاد کے لیے بہت مفید ثابت ہوگا اور ملک کی خدمت بہتر طریقہ پر کر سکیں گے۔ وہ تقسیم بنگالہ جیسے اہم مسئلہ پر بھی قلم اٹھاتے یا زبان کھولتے وقت اسے محض سیاسی غلامی کا نتیجہ قرار دیتے تھے گویا ان کے خیال کے مطابق جب تک سیاسی غلامی کی اصل بیماری باقی ہے، چند پرانی شکایتوں کے دور ہونے کے بعد بھی نئی تکالیف کے پیدا ہونے کا امکان رہ جاتا ہے۔

اور گاندھی جی اصل مقصد پر نظر رکھنے کے بجائے اس کی جزئیات کو اہمیت دیتے تھے۔ اور پھر لطف یہ کہ اُن جزئیات کے درجے بھی متعین نہ کر سکتے، چناں چہ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے پارسال اپنے گیارہ نکات کے حصوں کو حکومت خود اختیاری کے عطیہ کے مترادف قرار دیا لیکن مسٹر تلک کی نگاہ سب سے بڑے مقصد پر رہتی تھی۔ وہ منزل مقصود کی طرف استقلال کے ساتھ بڑھ رہے تھے اور راستہ کے کسی مقدس پتھر یا چشمہ پر کمر کھولنے کے لیے تیار نہ تھے۔ حقیقت میں گاندھی جی کی حیثیت محض ایک مصلح کی تھی مگر مسٹر تلک قوم کے ایک بڑے لیڈر تھے۔

سیاسی نقطہ نظر کے اختلاف نے دونوں رہنماؤں کے طریقہ کار میں بھی بنیادی اختلاف پیدا کر دیا۔ جنوبی افریقہ میں گاندھی جی کی مہم نے انہیں ایک مخصوص عقیدہ کا پابند بنا دیا تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، گاندھی جی حکومت خود اختیاری یا ہوم رول پروپاگنڈہ سے عمداً الگ تھلگ رہے لیکن کسی خاص شکایت کو خواہ وہ نتائج کے لحاظ سے کتنی ہی چھوٹی اور محدود کیوں نہ ہو رفع کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہی وہ فوراً میدان میں اتر آتے تھے، چناں چہ ہندستان میں ان کی سیاسی تگ و تاز مختلف مخصوص شکایتوں کے ازالہ تک محدود رہی، ان شکایتوں کا دایرہ بھی سال بہ سال بڑھتا رہا۔ انہوں نے جنوبی افریقہ کی طرح ہندستان میں بھی ہر مسئلہ کی بہت توجہ اور باضابطہ تحقیقات کی اور ہر شکایت کے ازالہ کے لئے صوبائی یا مرکزی حکومت کو توجہ دلانی ضروری سمجھی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ گاندھی جی اور حکومت کے درمیان طویل مراسلات اور گفت و شنید کا سلسلہ پیدا ہو گیا۔ اس صورت میں بھی کہ وہ حکام سے شکایات کا فوری ازالہ نہ کرا سکے اور انہیں مجبوراً قانون شکنی کا حربہ سنبھالنا پڑا وہ سمجھوتے سے ناامید نہ ہوتے اور بیتابی کے ساتھ حکومت سے از سر نو گفت و شنید شروع ہونے کا انتظار کرتے رہتے۔ اس گفت و شنید کا نتیجہ عام طور سے سمجھوتے کی شکل میں نکلتا رہا۔

دوسری طرف مسٹر تلک کا طریقہ کار انہیں بالکل ایک دوسرے راستہ پر لے جاتا تھا۔ چوں کہ ان کا مقصد حکومت سے سیاسی اقتدار کو چھین کر عوام کے ہاتھوں میں دینا تھا، اس لئے انہوں نے کبھی حکام سے نجی یا سیاسی گفت و شنید کی ضرورت نہ سمجھی چناں چہ جہاں حکام گاندھی جی سے ملنے کے مشتاق رہتے اور ان کی کسی چھوٹی سی شکایت کو حتے المقدور دور کرنے کی کوشش کرتے، جبکہ انہیں ایک آنکھ نہ بھاتے۔ بات یہ ہے کہ مسٹر تلک ہندستان میں غیر ملکی حکومت کے خلاف اپنی قوم کے احتجاج کا مظہر تھے اس لئے حکومت ہمیشہ ان سے ملنے سے آنکھ چراتی تھی۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ابتدا میں گاندھی جی کے اس طریقہ کار نے جو وہ مخصوص شکایتوں کے ازالہ کے لیے کام میں لاتے تھے، لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور وہ سماجی اور سیاسی کارکن جو مختلف تنظیمی کاموں میں مشغول تھے ان کے گرد جمع ہو گئے تاکہ ان مخصوص شکایتوں کا ازالہ کیا جا سکے جن کا اثر ان کے اپنے علاقہ کے لوگوں پر پڑ رہا تھا۔ غرض کہ ایک طرف تو سورما تلک ساری برائیوں اور خرابیوں کے دور کرنے کے لئے ہوم رول اور حکومت خود اختیاری کا واحد نسخہ پیش کر رہے تھے اور دوسری جانب

کمزور اور پست طبیعت کارکن گاندھی جی کی رہنمائی میں اطمینان قلب اور تشفی حاصل کر رہے تھے ——— وہی گاندھی جی جو اپنے پچھلے تجربہ کی بنا پر مخصوص شکایات کا ازالہ کرانے میں حکومت اور عوام کے درمیان ایک عمدہ پچولیا ثابت ہو چکے تھے۔ چوں کہ گاندھی جی ایک گتھی کے بعد دوسری سلجھاتے رہے اور اس طرح انہوں نے ہندستان میں اپنی سیاسی زندگی کے آغاز ہی میں بہت سے مسائل کا تصفیہ کرا دیا اس لیے عوام میں ان کا اعتماد روز بروز بڑھتا گیا اور ان کے ماننے والوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ یہاں لوگوں نے یہ بات بالکل بھلا دی کہ اصل میں یہ حکومت کی نوازش تھی کہ گاندھی جی کو کامیابیاں نصیب ہوئیں اس لیے گاندھی جی کے دوش بہ دوش وہ (حکومت) بھی مبارک باد کی مستحق تھی۔ اس طرح گاندھی جی نے چند معمولی اور عارضی شکایتوں کا ازالہ کرا کے عوام کے دلوں میں حکومت کی وفاداری اور محبت کا بیج بو دیا۔ اس حقیقت کا اعتراف گاندھی جی نے نہایت صفائی کے ساتھ اپنے اس مکتوب میں کیا ہے جو انہوں نے وائسرائے کی خدمت میں بھیجا تھا اور جس کا حوالہ کہیں پہلے دیا جا چکا ہے۔

گاندھی جی کے اس قسم کے رویہ کو مسٹر تلک اپنے دل میں کس قدر برا سمجھتے رہے ہوں گے۔ خدا ہی جانے۔ اس قسم کی کوششیں کسی خاص مرحلہ پر پہنچ کر خواہ کتنی ہی سرفروشانہ کیوں نہ نظر آئیں زمانہ حال کے سیاسی مجاہدوں کی رائے میں محض رجعت پسندانہ ہیں یہاں تک کہ خود گاندھی جی کے نظریں یہ (کوششیں) حکومت کے دسترخوان سے کچھ ریزے چننے کے بعد ختم ہو جاتی ہیں۔ دوسری جانب مسٹر تلک نے اپنی ساری عمر ہندستانی قوم پرستوں کے دلوں کو ابھارنے اور ان میں غیر ملکی حکومت کے خلاف جذبہ پیدا کرنے کی کوشش میں ختم کر دی انہوں نے بھول کر بھی یہ خیال نہ کیا کہ بعض اوقات یہ غیر ملکی حکومت کس قدر مفید اور نفع بخش معلوم ہوتی ہے۔ انہوں نے لوگوں کو سمجھایا کہ پہلا کام یہ ہے کہ اپنے ملک کو برطانوی اثرات سے پاک کر کے اس میں ایک مستقل اور پائیدار حکومت خود اختیاری قائم کی جائے۔

مقاصد اور طریق کار کے بنیادی اختلافوں کے باوجود بھی گاندھی جی نے مسٹر تلک کی مخالفت کبھی کھُل کر نہ کی بلکہ مناسب موقعوں پر انہوں نے اس زبردست مرہٹہ لیڈر (تلک) کی خوش نما الفاظ میں تعریف ہی کی۔ انہوں نے مسٹر تلک کے بعض پیرووں کے دلوں میں بھی اپنی جگہ بنالی۔ لیکن یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی انہوں نے مسٹر تلک کی اتباع نہ کی۔ وہ قومی میدان میں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانا چاہتے تھے۔ اگرچہ وہ ہوم رول کی تحریک اور اس کے پلیٹ فارم سے جان بوجھ کر الگ رہے۔ لیکن انہوں نے اپنی فوج کے بہترین سپاہی یہیں سے حاصل کیے۔

اس طرح گاندھی جی نے ہمارے صوبہ بمبئی کے بہترین ہوم رول کارکنوں کو ان کے اصل مقصد (حکومت خود اختیاری) سے ہٹا کر انہیں ضمنی مسئلوں اور چھوٹی باتوں کی الجھنوں میں لا پھنسایا۔ اب انہوں نے دوسری طرف توجہ کی۔ بد قسمتی سے مسٹر تلک اپنے کٹر ہندو پن کی وجہ سے کبھی ہندستانی مسلمانوں کا اعتماد حاصل نہ کر سکے تھے۔ لیکن گاندھی جی اپنی ترقی یافتہ ہندویت کے طفیل جنوبی افریقہ کے چوٹی کے مسلمان تاجروں اور کارکنوں کی ہمدردی اور تعاون حاصل کر چکے تھے چنانچہ آغاز کار ہی سے انہوں نے ہندو مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ وہ اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھتے ہیں کہ "میرے جنوبی افریقہ کے تجربہ نے مجھے اچھی طرح باور کرا دیا ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کے مسئلہ پر ہی میری "اہنسا" کو شدید آزمائش سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اس مسئلہ نے "اہنسا" پر میرے تجربوں کے لیے ایک وسیع میدان کھول دیا ہے" اگرچہ انہوں نے یہاں محض ہندو مسلم اتحاد کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن اس میں ان کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ غیر ملکی حکومت کے مقابلہ میں دونوں قومیں ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں جیسا کہ جیسا کہ واقعات ما بعد سے معلوم ہو گا وہ اُس حقیقی اور وسیع قومی تحریک کی رہنمائی میں، جو ملک کے دو بڑے فرقوں کے اتحاد کا نتیجہ تھی، مسٹر تلک سے بازی لے گئے۔

فرقہ وارانہ گتھی کے سلجھانے میں گاندھی جی نے وہی اپنا پرانا اصول برتا جس میں نفس مسئلہ کے بجائے اُس کی جزئیات کو اہمیت

حاصل ہوتی ہے۔ انہوں نے خود کو فرقہ وارانہ اتحاد کا علم بردار ثابت کرنے کے لیے ابتدا میں شاید ہی کوئی بڑی تقریر کی ہو۔ اس کے بجائے انہوں نے علی برادران سے جو پہلے چھندواڑہ اور بعد میں بیتول میں نظر بند تھے، نہایت خموشی کے ساتھ اپنے تعلقات بڑھانے شروع کیے۔ مسلم لیگ کے اجلاس کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے مسلمانوں سے پرزور اپیل کی کہ وہ علی برادران کی رہائی کے لیے اور جد و جہد کریں۔ انہوں نے خود بھی اس مقصد کے لیے وائسرائے سے خط و کتابت شروع کر دی۔ اس کے کچھ دنوں بعد ہی مسئلہ خلافت پر مسلمانوں کے مطالبہ کی پرجوش تائید کرکے، انہوں نے اُن (مسلمانوں) کی سچی دوستی اور دلی ہمدردی حاصل کرلی۔

وہ تحریر فرماتے ہیں "کہ مجھے مسئلہ خلافت کی تفصیلات میں پڑنے کی ضرورت نہ تھی میرے اطمینان کے لیے یہی کافی تھا کہ مسلمانوں کے مطالبات میں کوئی چیز ناجائز اور غیر معقول نہ تھی۔ .... مجھے محسوس ہوا کہ خلافت کے متعلق مسلمانوں کا مطالبہ نہ صرف مبنی بر انصاف تھا بلکہ برطانیہ کے وزیر اعظم نے بھی ان کے مطالبہ کی صداقت کو تسلیم کرلیا تھا۔ اس سیلسے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ وزیر اعظم کے اس وعدہ کو پورا کرانے کے لیے جو کچھ بھی میرے امکان میں ہو دریغ نہ کروں"

یہ تھی وہ نازک دلیل جس کی بنا پر قبل اس کے کہ تحریک خلافت کو وہ اہمیت حاصل ہو جو اسے بعد میں ملی گاندھی جی نے مطالبہ خلافت کی تائید اپنے لیے لازمی قرار دے دی۔

ہمیں یہ اڑتی ہوئی خبر مل چکی تھی کہ گاندھی جی نے کمیبہ اکی جہنم کے زمانہ میں علی برادران کی رہائی کے لیے وائسرائے سے نجی طور پر خط و کتابت شروع کردی تھی۔ علی برادران کی رہائی کس قدر خوش گوار اثرات کی حامل ہوگی اور اس سے کیسے عمدہ نتائج نکلیں گے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے مجھ سے کہا "مجھے سہارن پور کے ہندو مسلم فساد اور اس کی ہولناکیوں اور بیرحمانہ مظاہروں سے سخت اذیت پہنچی ہے لیکن ایسے اہم معاملہ میں تنہا میں کرہی کیا سکتا ہوں۔ علی برادران کے بغیر میں اس آگ کو بجھانے سے قاصر ہوں۔ جوں ہی علی برادران رہا ہوئے میں ان کے ساتھ یوپی جاؤں گا۔ اور اس خون سے جو وہاں اس بیدردی سے بہایا گیا ہے اپنے ہندو اور مسلمان بھائیوں کے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ دوں گا۔ میں اسی پر اکتفا نہ کروں گا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ گئوکشا کے لیے بھی میں ان دونوں بھائیوں کی امداد حاصل کرسکوں گا۔ اگر ان کے دلوں میں ہندوؤں کی حقیقی عزت ہوگی تو وہ ان کے نازک احساسات کی خاطر ضرور اپنے ہم مذہبوں کو گاؤکشی سے باز رکھنے کی کوشش کریں گے"

اس وقت یہ الفاظ خواب و خیال معلوم ہوتے تھے لیکن ۱۹۲۱ء میں وہ حقیقت میں تبدیل ہوگئے اور اس طرح گاندھی جی نے کئی سال پہلے جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر صاف صاف نظر آنے لگی۔

لیکن ان نئے میدانوں کو جیتنے کے جوش میں گاندھی جی نے اپنے پرانے مشاغل کو خیرباد نہ کہا تھا۔ اعتدال پسند جماعت اور سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی سے انہیں جو گہرا تعلق تھا اسے انہوں نے بدستور باقی رکھا۔ جیسا کہ انہوں نے بارہا اعتراف کیا ہے۔ اس پوری مدت میں وہ اپنے رجحان طبع اور ابتدائی تربیت دونوں حیثیتوں سے اپنے اعتدال پسندانہ نظریہ پر قایم رہے۔ اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ سول نافرمانی کے دنوں میں انہوں نے اعتدال پسندوں سے اپنے پرخلوص تعلقات قایم رکھے اور دوستانہ خط و کتابت جاری رکھی۔ اعتدال پسند بھی انھیں مجموعی حیثیت سے ایک بہت ہوشیار اور تجربہ کار مدبر سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگرچہ گاندھی جی کبھی کبھی بھٹک جاتے ہیں پھر بھی ان پر اعتماد کیا جاسکتا ہے کہ وہ سیدھی راہ نہ چھوڑیں گے حکومت سے گاندھی جی کی کامیاب جنگوں اور نتیجہ خیز گفت و شنید نے بھی گاندھی جی کے دل پر ان کے اعتدال پسند رفقا کی حقیقی عظمت کا سکہ بٹھا دیا کیونکہ ان کی نسبت گاندھی جی کا خیال تھا کہ وہ حکام سے معاملات طے کرانے میں کارآمد ثابت ہوں گے۔ چناں چہ جب کیرا کے مسئلہ کی تحقیقات کے لیے اپنے تربیت یافتہ نمائندوں کو وہاں بھیجا تو انہوں نے بھی عملی طور پر گاندھی جی کے مطالبہ سے اتفاق کیا

اور بمبئی کی حکومت کے سامنے اپنی عرض داشت پیش کی۔ سوسائٹی کے پریسیڈنٹ مسٹر شاستری کو اگرچہ عدم ادائیگی لگان کی تحریک سے اتفاق نہ تھا پھر بھی گاندھی جی سے ان کی دوستانہ خط وکتابت جاری رہی۔

اس طرح ہندستانی سیاسیات میں گاندھی جی کا درجہ بتدریج بڑھتا گیا۔ انھوں نے مخالف سیاسی جماعتوں سے دوستانہ تعلقات قایم رکھے اور اس ترکیب سے دونوں جماعتوں میں سے جوشیلے کارکن ان (گاندھی جی) کے زیر اثر آگئے۔ اب وہ ایک تیسرے حلیف۔ مسلمانوں کو بلانے کے لیے ڈورے ڈال رہے تھے جن کے عملی اشتراک وتعاون نے انہیں ہندستان کے سیاسی میدان میں سب سے بلند مقام پر پہنچا دیا۔

تیرھواں باب

مہاتما رنگروٹ بھرتی کرنے والے کے رُوپ میں

ہمارے بیان کا سلسلہ جو پچھلے باب میں ٹوٹ گیا تھا پھر شروع ہوتا ہے۔

گاندھی جی لکھتے ہیں کہ "میری ذمہ داریوں کا دوسرا رخ رنگروٹ بھرتی کرنے کی مہم سے تعلق رکھتا ہے۔ رنگروٹوں کی بھرتی کے لیے کیرا سے زیادہ اور کون سی جگہ موزوں ہو سکتی تھی اور اپنے ہی کارکنوں کے سوا میں پہلے کن لوگوں کو بھرتی کر سکتا تھا۔

چناں چہ بمبئی سے ندیاد آکر انھوں نے رنگروٹ بھرتی کرنے کی مہم کا آغاز کر دیا۔ مجھے یہاں ان نوجوان کارکنوں کی ذہنیت بیان کرنے کی اجازت دیجیے جنھوں نے رنگروٹوں کی بھرتی کے سلسلہ میں گاندھی کی صدا پر لبیک کہا۔ حکومت نے جو نئی انڈیا ڈیفنس فورس قایم کی تھی عجیب بات ہے کہ میں بھی اپنے ہوم رول رفقار کے ساتھ ۱۹۱۷ء کے آغاز ہی سے اس کوشش میں مصروف تھا کہ اس کے لیے زیادہ سے زیادہ آدمی بھرتی کیے جائیں۔ ہمارا کام کسی وفادارانہ جذبہ کے تحت نہ تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم حکومت کے بہی خواہ بھی نہ تھے ہمارا اصل مقصد یہ تھا کہ ہم اس غیر معمولی موقع سے جو ہمیں ہتھیاروں کے استعمال کے لیے ملا ہے فائدہ اٹھائیں اور ہندستانی نوجوانوں میں بہادری کی ایک نئی مجاہدانہ روح پھونک دیں۔ میرے بہت سے ساتھی اس کور میں شامل نہ ہو سکے۔ کیوں کہ ۱۹۱۷ء کے اختتام پر وہ دل وجان سے ہوم رول کی تحریک میں لگے ہوئے تھے تاہم مجھے معلوم ہوا کہ میرے بہت سے نوجوان دوستوں اور رفیقوں نے اس میں اپنی بھرتی کرائی اور پونہ میں فوجی تربیت بھی حاصل کی۔ ان کے پیش نظر بھی وہی مقصد تھا جو اُوپر بیان کیا گیا۔ میں عراق بھی گیا تاکہ میں خود کو میدان جنگ کے فوجی ماحول سے آشنا کر سکوں۔

اگرچہ مجھے بصرہ کے مرکزی کیمپ کے دیکھتے ہی سے اطمینان ہو گیا اور میں نے آگے بڑھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

چوں کہ میں نے پہلے ہی سے انڈیا ڈیفنس فورس میں شامل ہونے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اس لیے مجھے گاندھی کی صدا پر لبیک کہنے میں کوئی دشواری نہ معلوم ہوئی۔ اس زمانہ میں مسٹر ولبھ بھائی پٹیل بعض خانگی ضرورتوں سے احمد آباد میں تھے۔ اس لیے رنگروٹ بھرتی کرنے کی مہم میں گاندھی جی نے مجھے اپنا پہلا نائب مقرر کیا۔ مقامی کارکنوں کے دلوں میں بھی میں نے رنگروٹ

بھرتی کرنے کا جذبہ پیدا کر دیا اس طرح رنگروٹ بھرتی کرنے کی مہم میں ایک گونہ کامیابی سی نظر آنے لگی۔

گاندھی جی نے باشندگان ضلع کو اپنی کمپنی میں بھرتی ہونے کی دعوت دیتے ہوئے ایک بہت موثر تقریر کی انہوں نے فرمایا کہ "ہندستان میں حکومت برطانیہ کی بدنظمیوں اور خرابیوں میں ان کا یہ کارنامہ سیاہ ترین ہے کہ اس نے ایک پوری قوم کو اسلحہ سے محروم کر دیا ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ قانون اسلحہ کی تنسیخ کی جائے اور ہم ہتھیاروں کے استعمال سے واقف ہو جائیں تو ہمارے لیے یہ ایک زریں موقع ہے۔ اگر درمیانی طبقہ کے لوگوں نے اس آڑے وقت حکومت کی مدد کی تو حکومت کی بے اعتمادی دور ہو جائے گی اور ہتھیاروں کے رکھنے پر جو پابندی ہے اٹھالی جائے گی"۔

ظاہر ہے کہ گاندھی جی کی یہ اپیل نہ تو کمشنر کو پسند آسکتی تھی اور نہ ہم میں سے بعض کو بے شک ہم ہتھیاروں کے استعمال سے واقف ہونا چاہتے تھے لیکن ہم انہیں اپنی وفاداری اور خیر خواہی کے نشان کے طور پر رکھنے کے لیے ہرگز تیار نہ تھے۔

جب اہنسا کے دیوتا گاندھی جی نے ایک خون آشام جنگ کے لیے رضاکاروں کی بھرتی شروع کی تو ان سے کچھ ناگوار سوالات بھی کیے گیے۔

"آپ تو عدم تشدد کے علم بردار ہیں، بھلا آپ ہمیں ہتھیار اٹھانے کی تلقین کیوں کر کر سکتے ہیں؟"

یہ اور اسی قسم کے دوسرے سوالات ان سے کیے جانے لگے۔ گاندھی جی منطقی داؤپیچ کے بڑے استاد ہیں۔ انہوں نے حسب معمول مذبذب دیہاتیوں کو اپنے مخصوص جوابوں سے خاموش کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ "میں عدم تشدد کے عقیدہ کا سختی سے حامی ہوں اور میں کسی حال میں ہتھیار اٹھانے کے لیے تیار نہ ہوں گا خواہ مجھ پر گولیوں کی بوچھار ہی کیوں نہ ہو رہی ہو لیکن دوسرے لوگ اپنی بزدلی اور کمزوری کی بنا پر عدم تشدد کا سہارا ڈھونڈھتے ہیں ایسے لوگوں کو اپنے فرائض سے جان چرانے کے لیے عدم تشدد کے مقدس اصول کو بہانہ نہ بنانا چاہیئے۔" ایک دوسرے موقع پر انہوں نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اگر سلطنت برطانیہ ہمیں دشمن کے حملوں سے بچانے کی کوشش کرتی ہے تو ایسے نازک وقت میں ہمارا بھی فرض ہونا چاہیئے کہ اس سلطنت کو بچانے کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ بہانے سے بھی دریغ نہ کریں"۔

گاندھی جی چند ہفتوں میں کچھ رضاکار بھرتی کر سکے لیکن عدم ادائیگی لگان کی تحریک میں انہیں جو کامیابیاں ہوئی تھیں انھیں دیکھتے ہوئے ان کی یہ اپیل بہت کم کارگر نظر آتی تھی جیسا کہ وہ اپنی خود نوشت سوانح عمری میں تحریر فرماتے ہیں کہ "میری امید کو سخت دھکا لگا۔ جب کہ عدم ادائیگی لگان کی مہم کے زمانے میں لوگ اپنی بیل گاڑیاں مفت دے دیتے اور اگر ایک رضاکار کی ضرورت ہوتی تو دو مل جاتے، اب رضاکاروں کا تو ذکر ہی نہیں کرایہ پر بھی بیل گاڑیوں کا ملنا مشکل معلوم تا تھا۔" بجائے اس کے کہ گاندھی جی کی اپیل کا کچھ اثر ہوتا الٹا اور دیہاتیوں کی مخالفت بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

مجھے یاد آتا ہے کہ ایک موقع پر تو گاندھی جی بالکل ہی مایوس ہو گئے تھے۔ وہ مسٹر ولبھ بھائی پٹیل اور ایک رضاکار کے ساتھ نوگام نامی ایک چھوٹے سے گاؤں میں تشریف لے گئے جو عدم ادائیگی لگان کی تحریک کے دوران میں بہت امتیاز اور شہرت حاصل کر چکا تھا اس گاؤں کے جفاپسند کسانوں نے بڑی بہادری سے حکومت کی سختیوں کا مقابلہ کیا تھا اور اس کی اس دھمکی کی ذرہ برابر پروا نہ کی تھی کہ لگان ادا نہ کرنے کی صورت میں ان کی زمینیں بحق سرکار ضبط کر لی جائیں گی۔ تحریک مذکورہ کے دوران میں جب میں اس گاؤں میں مقیم تھا تو یہاں کے لوگوں نے متحدہ طور پر میری بڑی مدد کی تھی۔ مگر اس مرتبہ حالات کچھ اور ہی تھے۔ گاؤں کے کسی متنفس میں اتنے بڑے "مہاتما" کے پہنچنے سے بھی کوئی حرکت نہ پیدا ہوئی اور نہ کوئی ان کے درشن ہی کے لیے آیا۔ آخر کار ان کی دیکھ بھال اور کھانے پینے کا انتظام کرنے کے لیے ایک توی دل گروے والا رضاکار وہاں پہنچا۔ گاندھی اور مسٹر ولبھ بھائی پٹیل تین دن تک گاؤں کے باہر کس مپرسی کے عالم میں پڑے رہے۔ انہیں اپنا بھوجن بھی خود اپنے ہاتھوں تیار کرنا پڑا۔ غرض کہ رنگروٹوں کی بھرتی

کے بارے میں ان کی اپیل صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔

مگر ان مشکلات کے باوجود بھی گاندھی جی مایوس نہ ہوئے اور انہوں نے اپنا کام جاری رکھا بہت سے نام رجسٹر میں درج کیے گیے۔ بالآخر انھیں کمشنر سے پوچھنا پڑا کہ" ان رنگروٹوں کو کہاں رکھا جائے گا "۔ مگر گاندھی جی کی اچانک خطرناک اور قریب قریب جان لیوا بیماری کی وجہ سے رنگروٹوں کی بھرتی کا کام رک گیا۔ دوسری طرف ۱۹۱۸ء میں بارش بالکل نہ ہوئی۔ دیہاتوں کا مسلسل دورہ کرنے کے بعد ہم مجبوراً اس نتیجہ پر پہنچے کہ قحط زدگان کی امداد کے سلسلہ میں کچھ نہ کچھ کرنے کی سخت ضرورت ہے۔

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے میں مانٹگو چیمسفورڈ اصلاحات کی رپورٹ پر چند سطریں لکھنا چاہتا ہوں، جو رنگروٹوں کی بھرتی کے مہم کے دوران میں شائع ہوئی تھی۔ قوم پرست اخباروں اور رہنماؤں نے رپورٹ میں درج شدہ اصلاحات کو بالاتفاق ناکافی اور غیر تسلی بخش قرار دیا۔ مسز بسینٹ نے فوراً اعلان کر دیا کہ " انگلستان نے جو اصلاحات دی ہیں۔ وہ اس کی شایان شان نہیں اور ہندستان کا انہیں قبول کر لینا اس کے وقار کے خلاف ہے"۔ مسٹر تلک کے اخبار "کیسری" نے "صبح ہوگئی مگر آفتاب ندارد" کے عنوان سے ان اصلاحات پر سخت نکتہ چینی کی۔ مخالفت کا سیلاب چاروں طرف پھیلنے لگا۔ لیکن اعتدال پسند لیڈروں نے ان رجعت پسندانہ اصلاحات کی تائید کے لیے بصیغہ راز ایک سمجھوتا کر لیا تھا۔ یہ قومی اخبارات کی سخت تنقیدوں اور تبصروں سے بالکل حواس باختہ ہو گئے۔ ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۷ء کے آتش بیان خطیب مسٹر شاستری بھی اسی زمرہ میں شامل ہو کر بہت محتاط اور ذمہ دار سیاست داں بن گئے۔

کسی خاص سیاسی جماعت سے تعلق نہ رکھنے کی بنا پر گاندھی جی کو ہندستان میں ایک مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ اس لیے مسٹر شاستری کو تشویش تھی کہ کہیں وہ بھی ان قیمتی اصلاحات کی مخالفت میں آگے نہ بڑھ جائیں۔ چنانچہ انھوں نے گاندھی جی کو لکھا کہ اصلاحات پر رائے زنی کرنے سے پہلے وہ انہیں اچھی طرح جانچ لیں۔ انہوں نے یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ وہ گاندھی جی کی خدمت میں ندیاد حاضر ہو کر اس اہم مسئلہ پر ان سے بالمشافہ تبادلہ خیالات کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے اپنے سابق رہنما کے اس خط کے بارے میں سب کچھ معلوم تھا لہٰذا میں بےچینی سے اُن کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

اس عرصہ میں گاندھی جی نے اخبارات کے ذریعہ مانٹگو چیمسفورڈ رپورٹ کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کر لی تھیں وہ ان دنوں عام طور سے روزانہ صبح ایک گھنٹے کے قریب اخبارات کا مطالعہ کرتے تھے' بعد میں وقت کی تنگی کی وجہ سے ان کا یہ معمول جاری نہ رہ سکا۔ اخبارات میں رپورٹ کی سفارشات کا ملخص پڑھنے کے بعد یقیناً گاندھی جی کی رائے اصلاحات کے متعلق غیر ہمدردانہ نہ تھی۔ ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ گاندھی جی مسٹر مانٹگو سے ذاتی طور پر واقف تھے اور پہلے ہی اُن سے لندن میں مل چکے تھے۔ ایسی صورت میں مسٹر شاستری کا یہ خدشہ بالکل دور از کار تھا کہ کہیں گاندھی جی اس رپورٹ کے بارے میں جلد اپنے خیالات کا اظہار نہ کر دیں۔

آخر کار ایک روز صبح کے وقت مسٹر شاستری ندیاد پہنچ گئے۔ شاید یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اتنی بڑی مسافت طے کر کے گاندھی جی سے ملنے آئے تھے، جوں ہی وہ ہمارے صدر مقام پر پہنچے گاندھی جی نے انہیں اطلاع دی کہ انہیں (گاندھی جی) ساڑھے دس بجے کی گاڑی سے جا کر ایک گانو میں رنگروٹوں کی بھرتی کے سلسلہ میں تقریر کرنی ہے۔ چوں کہ مسٹر شاستری گاندھی جی کا ساتھ نہ چھوڑنا چاہتے تھے، اس لیے دوپہر کے کھانے سے جلد ہی فراغت حاصل کر کے وہ ہمارے ساتھ گاڑی پر سوار ہو گئے۔ گاڑی ہی میں مسٹر شاستری نے اپنی گل فشانی کے خوب خوب جوہر دکھانے شروع کیے۔ انہوں نے گاندھی جی کو یہ باور کرانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ ان حالات میں ہم جن اصلاحات کی توقع کر سکتے تھے مجوزہ اصلاحات کسی طرح ان سے پست نہیں ہیں۔

گانو میں گاندھی جی کو آرام کرنے کا جو تھوڑا سا وقت ملا اس میں بھی یہ بحث جاری رہی۔ بہت کم لوگ گاندھی جی کی تقریر سننے کے لیے اکٹھا ہوئے تھے۔ لیکن انہوں نے اس کا خیال نہ کیا اور نہ بددل ہوئے۔ انہوں نے بدستور سلطنت برطانیہ کی خدمت کے لیے رنگروٹوں کی بھرتی کی پرزور اپیل کی۔ آخر میں مسٹر شاستری سے بھی تقریر کرنے کی درخواست کی گئی۔ انہوں نے حسب توقع انگریزی میں تقریر

کی ابجسے حاضرین کی بڑی تعداد نہ سمجھ سکی۔ انہوں نے بڑے شاندار الفاظ میں گاندھی جی کی تعریف کی حالانکہ اگر انہیں (مسٹر شاستری) گاندھی جی کی ان تقریروں کے سننے کا اتفاق ہوتا جو انہوں نے عدم ادائیگی لگان کی مہم کے دوران میں اسی گاؤں کے بڑے بڑے جلسوں میں کی تھیں تو مجھے پورا یقین ہے کہ وہ (مسٹر شاستری) ان جلسوں سے کوسوں دور بھاگ نکلنے کی کوشش کرتے۔ مسٹر شاستری نے اپنی تقریر حسب ذیل الفاظ پر ختم کی "تم لوگوں کو گاندھی جی کی باتوں پر دھیان دینا چاہیئے۔ تمہیں گاندھی جی سے اچھا رہنما نہیں مل سکتا اگر میں سات بار بھی جنم لے کر آؤں تو بھی میرے الفاظ کا تم پر وہ اثر نہیں پڑ سکتا جو گاندھی جی کے لفظوں کا پڑتا ہے" ان دونوں رہنماؤں نے جلسہ میں جو ایک دوسرے کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے تو میں سمجھتا ہوں کہ اُس سے دونوں کو کافی مسرت ہوئی اور اصلاحات کے مسئلہ پر دونوں میں انتہائی دوستانہ تبادلہ خیالات کا سلسلہ پیدا ہوگیا۔

سہ پہر کو ہم ندیاد جانے والی گاڑی میں سوار ہوگئے مجھے یاد ہے کہ رپورٹ پرچسے میں جلد سے جلد پڑھ لینا چاہتا تھا مجھے ایک وجد سا آرہا تھا۔ غالباً اسی گاڑی میں میں نے رپورٹ کے جستہ جستہ حصے پڑھے۔ رپورٹ کو میرے ہاتھوں میں دیکھ کر گاندھی جی نے ارشاد فرمایا "اچھا یہی وہ رپورٹ ہے جسے ہمارے قوم پرست دوست ردی کی ٹوکری میں پھینک دینے کا مشورہ دیتے ہیں"۔

بالآخر مسٹر شاستری نے اپنی میٹھی وکالت کے ذریعہ اگرچہ کافی عرق ریزی کے بعد گاندھی جی کو سرکاری رپورٹ کی موافقت میں ہموار کر ہی لیا۔ گاندھی جی مسٹر شاستری کی باتیں سنتے جاتے اور عام طور سے ان سے اپنے اتفاق کا بھی اظہار کر دیتے تھے انہوں نے اصلاحات پر مسٹر شاستری کی تقریر سننے کے لیئے شام کو منتخب مقامی کارکنوں کا ایک چھوٹا سا جلسہ بھی منعقد کیا مسٹر شاستری نے حسب معمول اپنی پُر زور اور برمحل تقریر کے ذریعے اصلاحات کے عام اصولوں کو بیان کیا اور اپنی خطابت کا سارا زور اس پر صرف کر ڈالا کہ اصلاحات ہماری نظروں میں بھلی معلوم ہوں۔ غرض کہ ہم سب مسٹر شاستری اور اصلاحات دونوں سے بہت خوش ہوئے۔ گاندھی جی بھی خوشی کی اسی لہر میں ہچکولے کھاتے نظر آنے لگے۔ اپنے مقصد میں کامیاب ہوکر مسٹر شاستری بمبئی واپس ہوگئے۔ انہیں پورا بھروسا تھا کہ اگرچہ اصلاحات کی کھلم کھلا توصیف کرکے گاندھی جی اپنے انتہا پسند دوستوں کی مخالفت مول لینے کے لیے تیار نہ ہوں گے تاہم وہ انہیں مسترد بھی نہ کریں گے۔

اگرچہ اس رپورٹ میں کانگریس لیگ اسکیم (لکھنؤ) کی سفارشات کو بڑی حد تک نظر انداز کر دیا گیا تھا (گاندھی جی نے اس اسکیم کی تہِ دل سے تائید کی تھی) تاہم اس سے گاندھی جی کی رنگروٹوں کی بھرتی میں ذرہ برابر بھی خلل نہ پڑا۔ اس سے ایک بار اور گاندھی جی کی اس خصوصیت پر بڑی خوبی سے روشنی پڑتی ہے کہ ان کی توجہ ہمیشہ ضمنی مسائل اور مخصوص شکایتوں ہی پر رہا کرتی ہے جب کہ مسٹر تلک پونا کی پہاڑیوں سے اصلاحات کے خلاف اپنی آواز اُٹھا رہے تھے اور قریب قریب ہندستان کے سارے قوم پرست اس کے خلاف صف آرا ہو رہے تھے (کیوں کہ یہ اصلاحات اگست ۱۹۱۷ء کے اعلان کے مطابق نہ تھیں) تو گاندھی جی سلطنت برطانیہ کے تحفظ کے لیے بدستور رنگروٹوں کی بھرتی کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ حقیقت میں انہوں نے اصلاحات کے سوال کو اتنی اہمیت بھی نہ دی کہ اپنی خودنوشت سوانح عمری میں اس کا تذکرہ تک کرتے۔ اس سے یہ بات پھر اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ گاندھی جی کی ساری توجہ غیر ملکی استبداد اور بے شمار سر ے رواں کے سروں کو رفتہ رفتہ کم کرنے پر تھی، اور مسٹر تلک کی ساری کوششیں اور طاقتیں خود اس رواکشش کو فنا کرنے پر لگی ہوئی تھیں۔

چودھواں باب

عمل کی راہ میں

گاندھی جی عمر بھر اپنی غذا اور جسم پر تجربے کرتے رہے ہیں۔ یہ تجربے اس وقت خصوصاً اور بھی سرگرمی سے شروع ہوئے جب انہوں نے دودھ سے بھی اسی طرح پرہیز کرنا ضروری سمجھا جیسا کہ گوشت سے۔ وہ اپنے اس اصول پر اور بھی سختی سے پابند ہوگئے جب انہیں معلوم ہوا کہ ہندستان میں گائے اور بھینس کے دودھ کا آخری قطرہ تک دوہ لینے کے لیے اُن پر کیسے وحشیانہ مظالم ڈھائے جاتے ہیں۔ علم الاغذیہ کا مزید مطالعہ کرنے کے بعد انہوں نے ناریل، اخروٹ وغیرہ اور تازہ پھلوں پر زندگی بسر کرنی شروع کردی۔ ہندستان میں بھی وہ اسی اصول پر کاربند رہے، لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ یہاں پھلوں کا استعمال جنوبی افریقہ کی بہ نسبت مہنگا پڑتا ہے تو انہوں نے اس کا استعمال ترک کردیا۔ اور عام ہندستانی غذا دال روٹی، چاول اور سبزیوں کا استعمال شروع کردیا روٹی کو چھوڑکر جو پکی ہوئی ہوتی تھی باقی چیزیں محض اُبال کر کھاتے تھے، اور ان میں مسالہ تو کیا نمک تک نہ ڈالتے تھے۔ تاہم جب کبھی انہیں پھلوں کے استعمال میں سہولت نظر آتی تو وہ پھر اپنی اسی محبوب غذا کا استعمال شروع کردیتے۔ ان بار بار کی تبدیلیوں اور ٹھوس غذا کی بجائے پھلوں کے استعمال نے ان کی صحت پر بہت بڑا اثر ڈالا۔ گیہوں کے میٹھے دلیے کی ثقیل غذا نے ان کے نحیف و زار جسم پر، جو رنگروٹوں کی بھرتی کی مہم کے دوران میں بالکل تباہی کے قریب پہنچ چکا تھا اور بھی قیامت ڈھائی۔ وہ سخت پیچش میں مبتلا ہوگئے۔

پیچش میں وہ انڈا یا دودھ ہی ہضم کرسکتے تھے اور اسی سے انہیں بیماری کے زمانہ میں کچھ تسکین و تقویت حاصل ہوسکتی تھی، لیکن وہ ان چیزوں کو ہاتھ لگانے کے لیے بھی تیار نہ تھے انہیں دوا کے استعمال سے بھی پرہیز تھا۔ بہت کچھ سمجھانے بجھانے سے وہ سبزیوں کی غذائی روح کے انجکشن لینے پر آمادہ ہوئے۔ اس سے اُن کی حالت اور بھی مخدوش ہوگئی اور وہ شدید درد میں مبتلا ہوگئے۔ انہیں ندیاد کے مرکز سے مسٹر امبالال سارابھائی کی عظیم الشان کوٹھی میں منتقل کردیا گیا اور پھر وہاں سے اُن کے اپنے آشرم میں۔ ایک ان تو انکی حالت اس درجہ نازک ہوگئی کہ انہیں اپنی زندگی کی امید نہ رہی۔ چناں چہ انہوں نے بستر مرگ سے قوم کے نام اپنا آخری پیغام قلم بند کرایا۔ بڑی رات گیے ان کے احباب بھی اُن کے پاس جمع ہوگیے۔ خدا خدا کرکے ڈاکٹروں نے بڑی مشکل سے انہیں (گاندھی جی) یقین دلایا کہ یہ کیفیت حد سے بڑھی ہوئی اعصابی کمزوری کا نتیجہ تھی۔ غرض دن نکلا اور موت سر سے ٹل گئی۔

جن دنوں گاندھی جی احمدآباد میں صاحب فراش تھے، اسی زمانہ میں اصلاحات کے اہم مسئلہ پر غور و خوض کرنے کے لیے، انڈین نیشنل کانگریس کا ایک خاص اجلاس مسٹر حسن امام کی صدارت میں بمبئی میں منعقد ہونے والا تھا۔ مسز بیسنٹ اور مسٹر تلک فوراً بمبئی پہنچے۔ تاکہ اصلاحات کی رجعت پسندانہ تجاویز کو مسترد کرانے کے لیے ایک مضبوط محاذ جنگ قائم کریں۔ دیش بندھو داس اور بپن چندر پال بھی کلکتہ سے اسی مقصد کو لے کر آئے۔ دوسری جانب سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر شاستری کی قیادت میں اعتدال پسند حضرات اصلاحات قبول کیے جانے کی تجویز منظور کرانے پر تلے ہوئے تھے۔ مجلس مضامین میں دونوں جماعتوں میں خوب گتھم گتھا ہوئی۔ اعتدال پسندوں نے بڑی طرح منہ کی کھائی

اور جماعتی حیثیت سے یہ لوگ کانگریس سے الگ ہوگئے، لیکن کانگریس نے ایک اعلیٰ درجہ کی تجویز منظور کرلی جس میں اصلاحات کو بالکل ناکافی اور غیر تسلی بخش قرار دیتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ انھیں ۱۹۱۶ء کے کانگریس لیگ معاہدہ کی سطح پر لانے کے لیے اُن میں بنیادی تبدیلیاں کردے تاکہ وہ باشندگانِ ہند کے لیے قابل قبول ہوسکیں۔

گاندھی جی نہ تو کانگریس میں شریک ہوئے اور نہ انھوں نے اس کے فیصلوں کو زیادہ اہمیت دی۔ اس کے چند دنوں بعد ہی ۱۱ جون ۱۹۱۹ء کو عارضی صلح نامہ پر دستخط ہوگئے اور جنگ عظیم ختم ہوگئی۔

اس عرصے میں گاندھی جی کی طبیعت سنبھل گئی اور وہ مزید علاج کے لیے بمبئی تشریف لے گئے۔ ڈاکٹر دلال نے ان کی بحالی صحت کے لیے انہیں دودھ کے استعمال کا مشورہ دیا لیکن گاندھی جی نے اس مشورے کو سختی سے مسترد کردیا۔ آخر کار سوال جواب کے دوران میں ڈاکٹر نے اپنی فراست سے جب یہ معلوم کرلیا کہ گاندھی جی کو صرف گائے اور بھینس کے دودھ سے انکار ہے، تو مسز گاندھی نے بڑی ہوشیاری سے فرمایا کہ پھر تو انہیں (گاندھی جی) بکری کے دودھ کے استعمال پر کوئی اعتراض نہ ہونا چاہئے۔ ڈاکٹر نے فوراً یہ تجویز مان لی کیونکہ اُسے تو دودھ سے غرض تھی خواہ گائے کا ہو یا بکری کا۔ گاندھی جی نے بھی سکوت اختیار فرمایا۔ اس طرح بکری کا دودھ استعمال کرکے انھوں نے اپنی قسم کے نفس معنی کو چھوڑ کر صرف ظاہری الفاظ کو پیش نظر رکھا۔ وہ خود بھی اس واقعہ کا خود نوشت سوانح عمری میں بڑے بھولے پن سے یوں تذکرہ کرتے ہیں: "زندہ رہنے کی خواہش سچائی پر ثابت قدم رہنے کے ارادے پر غالب آگئی"، غرض کہ اس طرح ایک بار پھر "سچائی کے بھگت" نے محض "ستیہ گرہ کی جنگ جاری رکھنے کی خاطر" اپنے "مقدس نظریہ" میں کتر بیونت گوارا کرلی۔

بکری کے دودھ کا استعمال شروع کرنے کے ساتھ ہی گاندھی جی کی تندرستی ٹھیک ہونے لگی۔ ان میں کچھ توانائی بھی آچکی تھی انھوں نے اخبارات میں رولٹ ایکٹ کی رپورٹ پڑھی۔ وہ اپنی خود نوشت سوانح عمری میں اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ "اس کی سفارشات کو پڑھ کر میں بالکل...... بھونچکا سا رہ گیا۔ وہ قطعی غیر تسلی بخش اور نامنصفانہ ہیں۔ یہاں تک کہ میری رائے میں کوئی خود دار قوم انہیں قبول نہیں کرسکتی"۔

حقیقت میں یہ کمیٹی چند ماہ پہلے حکومت ہند کی طرف سے اس غرض کے لیے مقرر کی گئی تھی۔ کہ وہ پنجاب اور بنگال کی انقلابی اور دہشت انگیز سازشوں کا جائزہ لے کر حکومت کے سامنے ایسی تجاویز پیش کرے جن سے آیندہ کے لیے اس قسم کے جرائم کی روک تھام ہوسکے۔ کمیٹی نے اس حکم کی بڑی عمدگی سے تعمیل کی اور ایک ایسا مسودۂ قانون تیار کیا جس کی رو سے انتظامی حکام اور پولیس کے افسروں کو اندھا دھند گرفتاریوں، خانہ تلاشیوں اور خفیہ مقدمات چلانے کے اختیارات تفویض کردیے گئے تھے گویا اس رپورٹ نے برطانیہ کی اسٹار چیمبر والی عدالت کے طرز پر پولیس گورنمنٹ کا ایسا مستبدانہ اور ظالمانہ ضابطہ قانون تیار کردیا تھا جس کی نظیر روس کی زار شاہی یا دنیا کے پردہ میں پہلے کبھی موجود نہ تھی۔ جنگ عظیم میں فتح حاصل کرکے برطانیہ کا مزاج ہی بدل گیا تھا۔ اُس نے سیاسی بے چینی کے ہر مظاہرہ کو جو کہ پورے ملک میں عام ہو رہا تھا پوری طاقت سے دبانے کا فیصلہ کرلیا۔

یہ امر قابل لحاظ ہے کہ گاندھی جی نے اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں نہ لیا تاوقتیکہ ہوم رول کے مقتدر کارکنوں نے ان کی توجہ اس طرف مبذول نہ کرائی۔ مسٹر شنکر لال بینکر اور مسٹر عمر سوبانی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے درخواست کی کہ وہ اس معاملہ میں فوری کارروائی کریں۔ احمد آباد سے واپس آکر گاندھی جی نے مسٹر ولبھ بھائی پٹیل سے اس کا تذکرہ کیا۔ انھوں نے بمبئی کے احباب سے بھی خط و کتابت شروع کردی جو روز بروز حکومت کے خلاف اپنے عقیدے اور عمل میں سخت ہوتے جارہے تھے۔ بالآخر وہ اس پر راضی ہوئے کہ اگر چند آدمی بھی سول نافرمانی کے عہد نامے پر دستخط کرنے کے لیے تیار ہوجائیں تو وہ خود اس ظالمانہ قانون کے خلاف ستیہ گرہ کی مہم کی رہنمائی کریں گے۔ بمبئی کے احباب نے اس مشورہ کو فوراً قبول کرلیا اور جلد ہی گاندھی جی کے آشرم میں بااثر

کارکنوں کا ایک جلسہ طلب کیا گیا۔

یہ اجتماع بہت اہم ثابت ہوا۔ احمد آباد کے کارکنوں کے علاوہ اس میں مسٹر شنکر لال بینکر، مسٹر سوبانی، مسز سروجنی نائیڈو، مسٹر ہارنیمین اور شری متی انسویا بہن نے بھی شرکت کی۔ پوری بحث وتمحیص کے بعد گاندھی جی نے ستیہ گرہ کے عہد نامہ کا مسودہ تیار کیا جس پر اسی وقت چوبیس آدمیوں نے جن میں کچھ گاندھی جی کی نو آبادی کے رکن تھے دستخط کر دئے۔ ایک لمحہ ضایع کیے بغیر گاندھی جی نے لارڈ چیمسفورڈ کی خدمت میں اپنا یادگار تار روانہ کیا جس میں انہیں یہ اطلاع دی تھی کہ اگر یہ ظالمانہ قانون پاس کر دیا گیا تو وہ اور ان کے چوبیس ساتھی جنھوں نے آج ہی حلفاً عہد کیا ہے سول نافرمانی کی مہم شروع کر دیں گے۔ یہ تار ہندستان بھر کے اخباروں میں شائع ہوا اور اس سے بڑی سنسنی پھیل گئی۔ آنے والا طوفان صاف نظر آرہا تھا۔

وائسرائے نے بڑا ہمدردانہ جواب دیا۔ انہوں نے از راہ کرم گاندھی جی کی صحت کا حال دریافت کیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ دہلی آکر اُن سے اس مسئلہ پر بالمشافہ گفتگو فرمائیں۔ گاندھی جی نے یہ دعوت قبول کرلی اور دہلی کے دورے پر روانہ ہوگئے جو حقیقت میں بہت سے کل ہند دوروں کی تمہید تھا اور جس سے ایک ایسے ملک گیر ایجی ٹیشن کا آغاز ہوا جو پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

پندرھواں باب

اپنے چیلوں سے جھڑپ

رولٹ ایکٹ کے خلاف ایجی ٹیشن برپا کرکے گاندھی جی نے ایک قومی شکایت کے خلاف اپنی پہلی ہندستان گیر تحریک کا آغاز کیا۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے اب تک گاندھی جی نے اپنے اس انوکھے طریق کار یعنی ستیہ گرہ کی آزمائش جنوبی افریقہ کے مزدوروں اور تاجروں پر کی تھی یا ہندستان میں چمپارن، کیرا اور احمد آباد جیسے چھوٹے علاقوں کے مزدوروں اور کسانوں پر۔ ان چھوٹی چھوٹی لڑائیوں میں انہیں بظاہر جو کامیابیاں ہوئی تھیں انہوں نے ان کی ہمت بڑھا دی تھی اور وہ حکومت برطانیہ کے خلاف اپنی پہلی ملک گیر ستیاگرہ کا آغاز کرکے اپنے تجربوں کے میدان کو وسیع کرنا چاہتے تھے۔ گاندھی جی کی سول نافرمانی کی پکار پر ہندستان نے جس حیرت انگیز طریقہ سے لبیک کہا اُس سے نہ صرف ان کی قومی خدمات میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا بلکہ اس سے ہندستان کی جنگ آزادی میں بھی ایک نیا دور قایم ہوا۔

حالات کا ان کے اصلی رنگ میں مطالعہ کرنے سے پہلے باشندگان ہند کی اس ذہنی کیفیت اور مایوسی کا اندازہ کرنا بہت ضروری ہے جو ان میں ظالمانہ رولٹ ایکٹ کے اعلان سے پیدا ہوگئی تھی۔ سیاسی شعور رکھنے والوں یہاں تک کہ تاجروں، وکیلوں اور طالب علموں نے گاندھی جی کی سول نافرمانی کا جس سرگرمی سے خیر مقدم کیا اور جس ہمہ گیر اور قلبی جوش وخروش سے سرشار ہوکر انہوں نے ان کی اپیل پر توجہ کی، اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

میں ہوم رول تحریک کے اُس انقلابی پہلو پر بحث کر چکا ہوں جس نے ملک بھر میں نئے سیاسی جوش وخروش کی آگ

بھڑکادی تھی۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح مانٹگو چیمسفورڈ اصلاحات نے انڈین نیشنل کانگریس کے نسبتاً اعتدال پسند رہنماؤں کو خواب غفلت سے چونکادیا تھا جنھوں نے ان معمولی اور برائے نام اصلاحات کے خلاف حکومت برطانیہ پر اپنا احتجاج واضح کرنے کے لیے اس کی بھی پرواہ نہ کی کہ ان کے اس طرزعمل سے ان کے پرانے اعتدال پسند رفقا ان سے بالکل الگ ہوجائیں گے۔ غرض جنگ عظیم کے ختم ہوتے ہی ہندستان سخت سیاسی بے چینی اور رنج والم میں مبتلا ہوگیا اور ایسی بڑی لڑائی میں شرکت کے بعد ہندستان اس حالت پر رہ بھی نہیں سکتا تھا جس پر وہ پہلے تھا اس ہولناک تباہی سے بعض ہندستانی تاجروں اور اہل صنعت نے ضرور بہت بڑا فائدہ اٹھایا تھا۔ مگر اب لڑائی ختم ہونے کے بعد ان کا خیال تھا۔ کہ اگر حکومت ہند کی پالیسی اُن کے مفاد کی طرف جھکی تو وہ بین الاقوامی بازاروں میں اور بھی زیادہ نفع حاصل کرسکیں گے۔ دوسری جانب ملک کے سیاسی کارکنوں، طالب علموں اور جوشیلے اشخاص میں واقعات عالم کے مطالعہ سے حالات کو بین الاقوامی نقطہ نظر سے دیکھنے کا شعور پیدا ہوگیا اور انھیں ایک ایسی غیر ملکی حکومت کی غلامی پہلے کی بہ نسبت کہیں زیادہ باعث ننگ وعار معلوم ہونے لگی جو "چھوٹی قوموں کی آزادی" اور "آپ اپنے پر حکومت کرنے کا حق" کے کھوکھلے اور احمقانہ نعرے بلند کرتی رہتی تھی۔ رولٹ رپورٹ میں دہشت انگیزی کی داستانوں کو پڑھ کر جنھیں بڑی تفصیل اور عمدگی سے قلم بند کیا گیا تھا، اور ہندستان جرمنی اور دوسرے ملکوں میں ہندستانیوں کے ان بہادرانہ کارناموں سے باخبر ہوکر جو انھوں نے دوران جنگ میں حکومت برطانیہ کا تختہ الٹنے کے لیے انجام دیے تھے، ملک کا نوجوان طبقہ بہت متاثر ہوا اور ایک نئے جوش وولولہ سے سرشار ہوگیا۔ وہ فوجی سپاہی، سفرمینا والے، اسپتالوں کے ملازمین اور ڈاکٹر، درزی، دھوبی یہاں تک کہ تلی اور مہتر تک، جنھیں غیر ملکوں میں عجیب و غریب حالات سے سابقہ پڑا تھا، نئے تجربات کے ساتھ ہندستان واپس ہوئے۔ انہوں نے ہندستان کی سیاسی بے چینی میں اور بھی اضافہ کیا۔ مسلمانوں کا وہ طبقہ بھی جو اب تک حکومت پر اپنی خیرخواہی اور وفاداری ظاہر کرکے خاص مراعات حاصل کرنے کی فکر میں لگا رہتا تھا، خلیفۂ اسلام کے استنبول سے جلاوطن کیے جانے پر بہت برہم ہوا اور حکومت کے رویہ کے خلاف نہایت شدت کے ساتھ شورش برپا کرنے لگا۔

اس طرح اس عام بے چینی نے ایک خطرناک شکل اختیار کرلی۔ دستوری اصلاحات ملنے کے خیال سے لوگوں نے جو تھوڑی بہت امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں، رولٹ ایکٹ کی اشاعت نے ان پر بھی ہمیشہ کے لیے پانی پھیر دیا۔ ہندستانیوں کو اچھی طرح یقین ہوگیا کہ اس محسن کش حکومت نے ان کی حیرت انگیز وفاداری کا صلہ ان کے پیروں میں نئی زنجیروں کے ڈالنے اور پولیس کو اُن پر خاطرخواہ تشدد کرنے کا حق دینے کی صورت میں عطا کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ غرض کہ بارود کی سرنگ بچھادی گئی تھی۔ یہ گاندھی جی نہ تھے بلکہ خود حکومت تھی جس نے رولٹ ایکٹ شائع کرکے فیتیلے کو آگ دی اور سارے ملک کو آتش کدہ بنا دیا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیونکر گاندھی جی ہندستان کے دوسرے ممتاز لیڈروں کو پیچھے چھوڑ کر اس زبردست تحریک کے سالار اعظم بن گئے۔ بات یہ ہے کہ اس وقت ملک کے بہت سے ممتاز رہنما مع مسٹر تلک اور مسز بسنٹ کے برطانوی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی مشترکہ کمیٹی کے سامنے قانون اصلاحات پر شہادت دینے کی غرض سے انگلستان جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ ملک کے مقتدر رہنماؤں میں صرف گاندھی جی تھے۔ جو ہندستان میں رہ گئے تھے چناں چہ سارے سیاسی کارکن انہیں کے جھنڈے تلے جمع ہوگئے۔ جہاں تک اس نفرت انگیز قانون کا تعلق تھا لوگوں کو گاندھی جی پر پورا بھروسا تھا کیوں کہ شکایات کا ازالہ کرانے اور گورنروں اور وائسرائے سے گفت وشنید کرکے سمجھوتہ کرانے میں وہ خاصی شہرت حاصل کرچکے تھے۔ عوام کا جوش وخروش محض اسی لیے ہرا نہ تھا کہ حکومت کے خلاف فیصلہ کن جنگ شروع کرنے کے واسطے انہیں گاندھی جی

جی جیسے پختہ کار مدبر اور ہوشیار سیاست داں کی رہ نمائی میسر تھی، بلکہ ان کے دلوں میں گاندھی کے نئے ہتھیار سول نافرمانی کی غیر محدود مکانی قوتوں کو بھی معلوم کرنے کی بڑی تڑپ تھی۔

مزید برآں گاندھی جی کوئی معمولی سیاست داں نہ تھے۔ وہ بے لوث آدمی تھے اور انہوں نے اپنی زندگی ملک کے لیے وقف کر دی تھی۔ وہ اپنی تمام ذاتی جائداد سے دست بردار ہو گئے تھے۔ جو لوگ انہیں جانتے تھے وہ ان کا احترام ایک مہارشی اور اوتار کی طرح کرتے تھے۔ وہ ایک معمولی کسان کی طرح رہتے سہتے تھے۔ ہندستان جیسے مذہبی ملک میں ان کی ریاضت اور فاقوں نے انہیں ولایت کا نورانی تاج پہنا رکھا تھا۔ گجرات کے باہر وہ جہاں کہیں بھی جاتے ہندستانی میں تقریر کرتے تاکہ اُن کا پیغام براہ راست کسانوں تک پہنچ سکے جو ان کی تقریر سننے کے لیے بے چین رہا کرتے تھے۔ ابھی ہندستان کے لوگ اگلے زمانے کے اُن مقدس بزرگوں کی پاک روایات کو نہیں بھولے تھے۔ جو راجا پرجا کے اختلاف اور راجاؤں کے آپس کے جھگڑوں کو بڑی کامیابی سے طے کرا دیا کرتے تھے، چناں چہ جوں ہی گاندھی جی نے طبل جنگ بجایا۔ ساری قوم جوش و خروش کے ساتھ ان کے جھنڈے تلے جمع ہو گئی۔

لیکن خود گاندھی جی کا رویہ ان لوگوں کے رجحانات کے بالکل خلاف تھا، جو ان کی ایک آواز پر اتنی بڑی تعداد میں اُن کے گرد جمع ہو گیے تھے۔ اِدھر تو لوگ ظالمانہ نظام حکومت کے خلاف بھرے بیٹھے تھے اور اسے جڑ سے اکھاڑ دینے کی فکر میں تھے اور اُدھر دوسری جانب گاندھی جی نے اس موقع کو دیہ اور بات ہے کہ کسی دوسرے موقع سے بھی وہ یہی فائدہ حاصل کرتے) احکام کے خلاف اپنی "اہنسا" کے عجیب و غریب طریقوں کے استعمال اور اس کے تجربوں کے لیے بہت موزوں خیال کیا تاکہ وہ اپنے "عالم گیر صداقت اور عدم تشدد" کے پیغام کو اس دنیا تک پہنچا سکیں جو آپس کی جارحانہ اقتصادی، سیاسی اور فوجی ٹکروں سے پاش پاش ہو چکی تھی۔ غرض کہ اس وقت ہندستانیوں کے دلوں میں آزادی کی سچی تڑپ تھی اور وہ کالے قانون" یعنی رولٹ ایکٹ کے خلاف، غیر ملکی حکومت کا جوا اتارنے کے خیال سے ہنگامہ آرائی کرنی چاہتے تھے، لیکن گاندھی جی اس سیاسی جنگ کو دشمن کے خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر اپنے نئے نظریہ کے ذریعہ جیتنا چاہتے تھے، خواہ اس کے لیے ان کے پیرووں کو کتنی ہی بڑی قربانیوں بے شمار سختیوں اور بے انتہا جانی و مالی نقصانات ہی سے کیوں نہ دوچار ہونا پڑے۔

ہمیں یہاں سے گاندھی جی اور باشندگانِ ہند کی ذہنیتوں کے اس بنیادی تضاد کو یاد رکھنا چاہیے، تاکہ ہم ان کی تنظیمی سرگرمیوں اور مشکلات نیز ان کے احکام کو سمجھ سکیں جو اکثر انہوں نے دوران جنگ میں یکا یک جنگ بند کر دینے کے بارے میں نافذ فرمائے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ہمیں گاندھی جی کے اس مخصوص انفرادی رنگ کو بھی نہ بھولنا چاہیے، جس میں وہ ہمیشہ ضلع داری، صوبائی یا ملک گیر قومی تحریکوں کو رنگتے رہے ہیں چونکہ صرف وہی جنوبی افریقہ کی ساری سیاسی تحریک کے ذمہ دار رہے۔ اس لیے ان میں ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی بلکہ خودسری پیدا ہو گئی تھی۔ ہندستان میں بھی وہ بڑے سے بڑے سیاسی مسائل کو اپنی عادت کے مطابق اپنے ہی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی رہے، چنانچہ چمپارن میں انہوں نے اپنی سرگرمیوں کو کسی مقامی کانگریس کمیٹی سے وابستہ کرنا مناسب نہ سمجھا، یہی نہیں بلکہ انہوں نے اس مہم کے دوران میں اپنے پیرووں کو کانگریس کا نام تک لینے یا ہوم رول کا پروپاگنڈا کرنے سے بھی روک دیا۔ رہ گیا کیرا کا معاملہ تو یہ محض اتفاق تھا کہ ان کی عدم ادائیگی لگان کی مہم گجرات سبھا سے متعلق ہو گئی جس کے وہ ان دنوں صدر بھی تھے۔ بمبئی پروانشیل کانگریس کمیٹی کے جلسے میں انہوں نے عمداً اس مسئلہ (عدم ادائیگی لگان) پر بحث نہ ہونے دی، اور نہ پابند مزدوری کے تصفیہ میں جس کی بدولت ہندستان میں انہیں پہلی کامیابی نصیب ہوئی تھی، انہوں نے کانگریس سے مشورہ کرنے کی زحمت گوارا فرمائی۔ بالکل اسی طرح اس موقع پر بھی جبکہ ایک بہت بڑے قومی ایجی ٹیشن کا آغاز ہونے والا تھا، انہوں نے صرف اپنے مٹھی بھر دوستوں سے نجی صلاح و مشورہ کرنے پر اکتفا کی اور پراونشیل یا آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو خبر تک نہ دی۔ انہوں نے اپنی پُرامن ستیاگرہ کی انوکھی اسکیم کو اس

لیے بھی کانگریس کے سامنے پیش کرنے سے احتراز کیا کہ انہیں اس سے تائید کے بجائے مخالفت کا اندیشہ تھا۔
غرض کہ انہیں دو امور کی روشنی میں ہم گاندھی جی کے لائحہ عمل کی تدریجی نشو و نما کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ وہ اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھتے ہیں کہ "اگر میں اس بُری طرح بیمار نہ ہوتا تو ابس (رولٹ ایکٹ) کا تن تنہا مقابلہ کرتا اور دوسروں کو اپنے نقش قدم پر چلنے کی دعوت دیتا لیکن بیماری سے مجبور ہوں اور اس بار کو تنہا اٹھانے کی اہلیت نہیں رکھتا" چناں چہ یہ اُن کی بیماری کا صدقہ تھا کہ انہیں ستیہ گرہ کی مہم شروع کرنے کے لیے دوستوں کی ایک مختصر کانفرنس طلب کرنی پڑی۔ اگرچہ وائسرائے نے گاندھی جی کے خط کا جواب بڑے اخلاق سے دیا لیکن اُن کی درخواست کو شرف قبول نہ عطا فرمایا۔ اب گاندھی جی کو ایک نئی سبھا بنانے کی فکر ہوئی، جو حکومت کے خلاف ان کی غیر جارحانہ جنگ کے پیغام کو پھیلانے میں بہترین آلہ کار ثابت ہو سکے۔ وہ خود تحریر فرماتے ہیں کہ "چوں کہ موجودہ اداروں سے کسی سے یہ امید نہ تھی کہ وہ ستیہ گرہ جیسے نئے ہتھیار کا تجربہ کرنے پر تیار ہوگی، اس لیے میرے ایما سے "ستیہ گرہ سبھا" کا قیام عمل میں آیا۔" اس سے بظاہر ہوتا ہے کہ ان کی نظروں میں ہندستان کی حقیقی آزادی سے زیادہ جس کے سارے ہندستانی بھوکے تھے، اپنی شخصی اپج، لیڈری اور ستیہ گرہ کے انوکھے حربے کی وقعت تھی۔
ان میں اور ان کے پیرووں میں جو بنیادی اختلاف تھا وہ جلد ہی ظاہر ہو گیا چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں کہ "مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ مجھ میں اور سبھا کے ممبروں میں اتفاق و اتحاد کے امکانات زیادہ نہیں۔ مجھے صاف صاف نظر آ رہا ہے کہ یہ سبھا بہت دنوں زندہ نہ رہ سکے گی۔ میں نے دیکھ لیا کہ سچائی اور "اہنسا" پر میرا اصرار سبھا کے بعض ممبروں کو پسند نہیں۔" یہاں ہم اس بنیادی اختلاف کا اچھی طرح مشاہدہ کر سکتے ہیں جس نے ابتدا ہی سے گاندھی جی کو عوام سے دور پھینک دیا اور جو پچھلے بارہ سال سے برابر بڑھتا جا رہا ہے۔ قیصر بورجیا کی طرح گاندھی جی کا نصب العین بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ:۔
"یا تو قیصر یا کوئی بھی نہیں"

سولھواں باب

قومی ہڑتال

گاندھی جی کے لیے ستیہ گرہ کا عہد نامہ مرتب کرنا اور ستیہ گرہ سبھا قایم کرنا آسان تھا لیکن انہیں ہماری سول نافرمانی کی مہم کے لیے مکمل لائحہ عمل پیش کرنا بہت مشکل معلوم ہوا۔ عہد نامہ کی رو سے ہم چند قوانین کو منظم اور غیر جارحانہ طریق پر توڑنے کے پابند تھے لیکن رولٹ ایکٹ نے اب تک قانونی شکل اختیار نہ کی تھی، اس قانون کے خلاف کوئی اقدام اس لیے بھی مشکل تھا کہ اس قانون کا منشا ر خود جارحانہ اور متشددانہ سرگرمیوں کا انسداد تھا۔ گاندھی جی نے خود بھی تسلیم کیا تھا کہ "پبلک جلسوں کو منعقد کرنے کے سوا میں اس وقت تک اور کوئی لائحہ عمل نہ سوچ سکا اور یہ بات اب تک میری سمجھ میں نہ آئی تھی کہ رولٹ بل کے قانون بن جانے کے بعد کیوں کر سول نافرمانی شروع کی جائے گی" آگے چل کر وہ اپنے شبہات کا یوں اظہار کرتے ہیں "آیا ہم دوسرے قوانین کی خلاف ورزی کر سکتے ہیں اور اگر کر سکتے ہیں تو ابس کے لیے ہمیں کیا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔"

ان ابتدائی شکوک کے باوجود انہوں نے احمد آباد سے بمبئی اور دہلی جانے سے پہلے ہمیں سول نافرمانی کے متعلق واضح ہدایات دیں۔ انہیں اچانک یاد آیا کہ ان کی دو بے ضرر کتابیں ہند سوراج اور سرآودے جو رسکن کی کتاب Unto This Last کا ترجمہ تھیں اور جنوبی افریقہ میں چھپ چکی تھیں پھر سے چھاپ کر بیچی جائیں تاکہ حکومت کی اس پابندی کو توڑا جا سکے جو اس نے ان کتابوں پر لگائی تھیں لیکن گاندھی جی نے ان کتابوں میں صرف رسکن کی پابندی کو توڑا جا سکے جو اس نے ان کتابوں پر لگائی تھیں لیکن گاندھی جی نے ان کتابوں میں صرف رسکن کی مثالی اشتراکیت کو جو ٹالسٹائی کی تعلیمات پر مبنی تھی پیش کیا تھا اور اس کی بنیادوں پر ایک ایسے آنے والے ہندستان کا نقشہ تیار کیا تھا جو نہ صرف غیر ملکی حکومت سے آزاد ہوگا بلکہ موجودہ مغربی تمدن کے ہر سازو سامان ریلوے تار برقی، کارخانوں اور شفاخانوں وغیرہ سے بے نیاز ہوگا۔ حقیقت میں ان کتابوں کو بہ مشکل سیاسی کہا جا سکتا تھا کیوں کہ ان میں سلطنت برطانیہ یا ہندستان میں برطانوی نظم و نسق پر کوئی سخت نکتہ چینی نہیں کی گئی تھی۔ بہرحال ہم نے ان کتابوں کے چند نسخے گاندھی جی کے آشرم سے حاصل کیے اور انہیں بڑی عجلت کے ساتھ چھپوانا شروع کر دیا تاکہ جوں ہی گاندھی جی اقدام کا حکم نافذ کریں، ہم کتابوں کو بیچنا شروع کر دیں۔

غرض کہ گاندھی جی نے اس طرح ہمارے سارے سیاسی جوش و خروش کو اپنی دو انتہائی بے ضرر اور غیر سیاسی کتابوں کی اشاعت پر محدود کر دیا تاکہ "حکومت کو قوم کی خواہش پر جھکایا جا سکے" خود پسندی کی کوئی انتہا بھی ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ گاندھی جی خود کو بے نفس بھی کہتے ہیں۔

احمد آباد، بمبئی اور دوسرے مقامات پر ستیہ گرہ سبھاوں کی مشین کو حرکت دے کر گاندھی جی وائسرائے کی دعوت پر دہلی تشریف لے گیے۔ دلی میں ایک بار وہ ہندستانی مجلس قانون ساز کی کارروائیاں دیکھنے بھی گیے اور انہوں نے شاستری کی آتشیں تقریر کی جس میں انہوں نے بہت صاف اور سنجیدہ طریقہ پر حکومت کو رولٹ بل کے خطرہ سے آگاہ کیا تھا۔ یہیں انہوں نے وائسرائے کو دیکھنے کا بھی شرف حاصل کیا جو بڑی توجہ سے مسٹر شاستری کی تقریر سن رہے تھے اور جن کی آنکھیں مسٹر شاستری پر لگی ہوئی تھیں جب کہ وہ (مسٹر شاستری) اپنی پُر زور خطابت کے گرم چشمے بہائے جا رہے تھے۔ آخر گاندھی جی وائسرائے بہادر سے ملے اور بڑے خلوص کے ساتھ انہیں رولٹ بل کے مسئلہ پر قائل کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے وائسرائے کو ایک نجی اور کچھ کھلی چٹھیاں بھی بھیجیں جن میں انہوں نے صاف صاف لکھ دیا کہ حکومت کے رویہ نے ان کے لیے ستیہ گرہ کے سوا اور کوئی راستہ نہیں چھوڑا مگر سب بیکار ثابت ہوا۔

اپنے وقار کو اس طرح ٹھیس لگتے دیکھ کر گاندھی جی نے حکومت کی حکمت عملی کے خلاف زیادہ سخت اور تہدید آمیز رویہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ دلی سے مدراس گیے اور وہاں انہوں نے حکومت کے خلاف سول نافرمانی کا پروگرام بنانے کے سلسلہ میں شیر بحث کستوری آئنگر ایڈیٹر ہندو مسٹر راجگوپال اچاریہ اور شیر بحث وجیا راگھو اچاریہ سے مشورہ کیا کیوں کہ سول نافرمانی کے جس پروگرام پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت انہوں نے ہم کو دی تھی وہ گجراتی کی صرف دو کتابوں کی اشاعت پر محدود تھا اور جن کا سمجھنا بھی بمبئی اور گجرات کے صوبہ جات کے باہر غیر ممکن تھا باقی ہندستان کے لیے سول نافرمانی کا کوئی پروگرام نہ تھا۔ مسٹر وجیا راگھو اچاریہ نے گاندھی جی کو مشورہ دیا کہ وہ (گاندھی جی) ستیہ گرہ کے اصول و قواعد پر ایک مفصل ضابطہ قانون مرتب کریں۔ گاندھی جی نے اس کام کو اپنی طاقت سے باہر تصور کرتے ہوئے اس کے کرنے سے معذوری کا اظہار کیا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گاندھی جی کو سیاسی دیوالہ کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ انہوں نے برطانوی نوکر شاہی کے خلاف ہندستانی قومیت کی خوابیدہ طاقتوں کو بیدار بھی کر دیا تھا بالکل اسی طرح جیسے جنگ کا قرنا پھونکنے کے باوجود سپہ سالار جنگ کا لائحہ عمل مرتب کرنے سے قاصر ہو، لیکن گاندھی جی کے ذرایع نے بہت جلد انہیں اس مصیبت سے بچا لیا۔ وہ

وہ تحریر فرماتے ہیں کہ "... ابھی سوچ بچار ہو ہی رہا تھا کہ یہ خبر ملی کہ رولٹ بل نے قانونی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس سوال پر غور کرتے ہوئے میں اس رات سو گیا۔ ابھی رات باقی تھی کہ میری آنکھ معمول سے کچھ پہلے کھُل گئی۔ ابھی میں خواب و بیداری کی درمیانی حالت ہی میں تھا کہ یکایک خواب کی طرح ایک خیال میرے ذہن میں آیا" صبح کو انھوں نے مسٹر راج گوپال اچاری سے جن کے تعلقات حال ہی میں گاندھی جی سے قایم ہوئے تھے لیکن آگے چل کر جو گاندھی جی کے سب سے بڑے حامی ثابت ہونے والے تھے، کہا "پچھلی رات یہ خیال مجھے خواب میں نظر آیا کہ ہم ملک کو ایک عام ہڑتال کی دعوت دیں۔ ستیاگرہ تزکیہ نفس کا ایک ذریعہ ہے۔ ہماری جنگ ایک مقدس جنگ ہے اس لیے میری رائے میں اس کا آغاز تزکیہ نفس کے عمل سے ہونا چاہئے۔ اس روز باشندگان ہند اپنا سارا کاروبار بند کر دیں اور اسے روزہ اور عبادت کا دن قرار دیں"۔

اس تجویز کو مدراس کے دوستوں نے بہت پسند کیا۔ گاندھی جی نے فوراً ہی اہل ہند کے نام اپیل شایع کی کہ ۳۰ مارچ ۱۹۱۹ء کو ملک بھر میں عام ہڑتال کی جائے۔ رولٹ بل کے قانونی شکل اختیار کرنے کے بعد پہلے اتوار کو یہ تاریخ پڑتی تھی۔ بعد میں یہ تاریخ ۶ اپریل تک بڑھا دی گئی تاکہ ہڑتال کو کامیاب بنانے کے لیے کارکنوں کو کافی موقع مل سکے۔

یہاں اس امر کا اعتراف ضروری ہے کہ اس انتہائی سیاسی ہیجان کے زمانہ میں اس اپیل کی اشاعت نے ہم میں ایک نئی تازگی اور بے اندازہ جوش و خروش پیدا کر دیا۔ ہڑتال کا حربہ ہمارے لیے نیا نہ تھا۔ ہندستانی شہروں اور ریاستوں کے باشندے اس ہتھیار کو اپنی بے اطمینانی کے اظہار کے لیے حکومتوں کے ظالمانہ قوانین کے خلاف استعمال کرتے رہے ہیں مزید برآں ہڑتال میں شریک ہونے کے لیے صرف تاجروں اور دوکان داروں کو ہی ہدایت کی گئی تھی۔ خود گاندھی جی کا تعلق بھی بنیا اور ویش جاتی سے تھا جنھوں نے ہڑتال کو ہمیشہ حکومت کے خلاف خاموش احتجاج کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اپنی بنیا روایات کے بموجب گاندھی جی نے نہایت چالاکی سے ہڑتال کے اس پرانے ہتھیار کو نئے حالات کے مطابق بنا کر اور اسے چھوٹے شہروں اور گاؤں کے تنگ بازاروں کے نکال کر پورے ہندستان کے وسیع خطّہ میں پھیلا دیا تاکہ کالے قانون (رولٹ ایکٹ) کے اجرا کے خلاف ساری قوم کا احتجاج نمایاں ہو سکے۔

یہ بات بھی غور طلب ہے کہ گاندھی جی نے بڑی دانائی سے اتوار کا دن ہڑتال کے لیے منتخب کیا۔ اس روز لازمی طور پر حکومت کے سارے دفاتر، جدید قسم کے تجارتی اداروں، بینکوں، میونسپلٹی اور لوکل بورڈ کے دفتروں کا بند رہنا یقینی تھا۔ چناں چہ اس طرح انہیں کسی دفتری کاروبار میں خلل اندازی کا خطرہ نہ رہا۔ ملیں اور کارخانے بھی عام طور سے اتوار کو بند رہتے ہیں اس لیے مزدوروں کو بھی کام بند کرنے کی ضرورت نہ تھی گویا گاندھی جی نے اپنے دوش پر کم سے کم ذمہ داری کا بوجھ اٹھایا اور کم سے کم مقاومت کی شکل نکالی۔

غرض کہ اس ہڑتال کو کسی طرح بھی ایک حقیقی قومی ہڑتال سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ریلوے، بجلی گھروں اور محکمہ ہائے آب رسانی کے ملازموں کو ہڑتال میں حصّہ لینے کے لیے نہیں کہا گیا۔ حقیقت میں مزدوروں کو ہڑتال کرنے کا موقع ہی نہ دیا گیا۔ پرانے اصول کے مطابق ہڑتال کا دائرہ صرف تاجروں اور دوکانداروں تک محدود رہا جو ایسے مواقع پر صدیوں سے ہڑتال کرتے آئے ہیں۔ گاندھی جی نے ہڑتال کے پرانے ڈھانچ میں نہ کوئی نئی جان ڈالی اور نہ اس میں کوئی جدید اور صنعتی اہمیت کا پہلو نکالا جس سے حکومت کی پوری مشینری بیکار ہو سکے۔

ان تمام پابندیوں اور رکاوٹوں کے باوجود اس قومی ہڑتال نے جو دوسرے حالات میں شاید ایک معمولی بزدلانہ تماشے سے زیادہ وقعت نہ رکھتی باشندگان ہند کے حد سے بڑھتے ہوئے انقلابی جوش و خروش کو یکایک بھڑکا دیا۔ اس مظاہرہ کی شاندار کامیابی میں مسلمانوں کا بہت بڑا حصہ تھا جن کی تائید مسئلہ خلافت پر گاندھی جی نے بڑی گرم جوشی کی تھی۔ سب سے پہلے دلی میدان

میں اتری۔ اور اس نے ۳۰ مارچ ہی کو ہڑتال کر دی، کیوں کہ یہاں کے رہبروں کو بروقت یہ اطلاع نہ پہنچائی جا سکی تھی کہ ہڑتال ۶ اپریل پر ملتوی ہو گئی ہے۔ گاندھی جی تحریر فرماتے ہیں کہ سوامی شردھانند جی اور حکیم اجمل خان صاحب مرحوم کے احکام قانونی حیثیت رکھتے تھے اس سے پہلے دلی میں ایسی ہڑتال کبھی نہ ہوئی تھی۔ ہندو اور مسلمان ایک جان دو قالب نظر آتے تھے۔ سوامی شردھانند جی کو جامع مسجد میں تقریر کرنے کے لیے مدعو کیا گیا۔ چنانچہ انہوں نے وہاں تقریر کی (سوامی شردھانند جیسے کٹر مذہبی ہندو پیشوا کو اس سے پہلے کبھی ایسی مقدس مسجد میں مدعو نہیں کیا گیا تھا) یہ چیز کا حکام کی برداشت سے باہر تھا۔ جوں ہی جلوس ایک ریلوے اسٹیشن کی طرف مڑا اسے پولیس نے روکا، جلوس کے انکار کرنے پر پولیس نے اس پر گولیاں چلائیں۔ کئی آدمی مارے گئے اور اس طرح دلی میں ظلم و تشدد کا بازار گرم ہو گیا۔

مختصر یہ کہ ہندستان کے اس تاریخی دارالحکومت میں گاندھی جی نے ۳۱ مارچ کو ہندستان کو خون اور آگ کا پہلا بپتسمہ دیا۔ حکومت کے تشدد اور دہشت انگیزی کے اس مظاہرہ نے ملک بھر میں غم و غصہ کو بہت بڑھا دیا۔ چنانچہ اس روز (۶ اپریل) ملک کے اس سرے سے اس سرے تک ہر گانو اور شہر نے مکمل ہڑتال منائی۔ ۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد قومی اتحاد کا شاید یہ پہلا حیرت انگیز مظاہرہ تھا جو فرزندان ہند نے مہذب دنیا کی چندھیائی آنکھوں کے سامنے پیش کیا۔ ۶ اپریل کو قومی ماتم روزہ اور عبادت کا دن منایا گیا۔ صدیوں کی رسم کے مطابق لوگ صبح کے وقت لاکھوں کی تعداد میں ننگے پانو تالابوں، ندیوں اور سمندروں پر نہانے کے لیے گئے تاکہ مقدس پانی میں نہا کر اپنے آپ کو پاک کریں۔ نہانے کے بعد مجمع نے جلوس کی شکل اختیار کر لی۔ جلوس سیاہ جھنڈیاں اور کپڑے کے بڑے بڑے پوسٹر لیے نعرے لگاتا ہوا شہر کی گذرگاہوں سے نکل کر میدانوں اور کشادہ باغوں میں جمع ہو گیا۔ مقامی لیڈروں نے اپنی پرجوش تقریروں کے ذریعہ ہندوؤں مسلمانوں اور دوسرے فرقہ کے لوگوں کو دیش بھگت گاندھی جی کی رہبری میں منظم ہونے کی ہدایت کی تاکہ حکومت برطانیہ کو اس سیاہ قانون کو کتاب آئین سے خارج کرنے پر مجبور کیا جا سکے۔ ہمیں خود احمد آباد میں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ قریب ایک لاکھ آدمیوں نے ہمارے جلوس اور جلسہ میں شرکت کی جس سے پتا چلتا تھا کہ پچھلے چند ہفتوں سے جو پروپاگنڈا ہم کرتے تھے یہ اس کا انتہائی درجہ تھا۔ ہر مقام پر ایک تجویز خود گاندھی جی نے زوردار لیکن معتدل الفاظ میں مرتب کیا تھا پُرزور نعرہائے تحسین کے ساتھ منظور کی گئی اور خط اور تار کے ذریعہ وائسرائے کی خدمت میں بھیجی گئی۔

گاندھی جی خود بھی ۶ اپریل کے مظاہرہ میں شرکت کی غرض سے مدراس سے بمبئی تشریف لائے۔ دلی کی عجیب و غریب نظیر کی پیروی میں انہوں نے اور مسز سروجنی نائیڈو نے بمبئی کی ایک مسجد میں بہت بڑے مجمع کے سامنے تقریر کی۔ نہ صرف یہ کہ ہڑتال دوسرے مقاموں کی طرح بمبئی میں بھی کامیاب رہی، بلکہ یہاں کرایہ کی موٹروں، گھوڑا گاڑیوں اور دوسری سواریوں کی آمد و رفت بھی عملاً بند ہو گئی۔ سنسان گزرگاہوں، ویران بازاروں، بڑے بڑے عدیم المثال اجتماعوں اور ہندو مسلمانوں کے بے نظیر بھائی چارے نے حکومت کو ملک کے نئے رجحان سے روشناس کرا دیا۔ حکومت نے عوام کے ان مظاہروں کو دھمکی اور چیلنج سے تعبیر کیا جس کا جواب جلد ہی خون کے سیلاب سے دیا جانے والا تھا۔

پورے ملک میں ۶ اپریل کے مظاہرے پُرامن طریقے پر گزر گئے۔ شاید یہ تحریک اس حد سے آگے نہ بڑھتی کیونکہ اب تک گاندھی جی نے متحدہ اقوام کے لیے کوئی لائحہ عمل مرتب نہیں کیا تھا۔ صرف بمبئی، احمد آباد اور گجرات کے بعض دوسرے شہروں میں "ہند سوراجیہ" اور "سروودے" کے گجراتی ایڈیشن کی ہزاروں جلدیں (جو اس موقع کے لیے خاص طور پر تیار کی گئی تھیں) مشتاق مجمعوں میں بعض اوقات ناقابل یقین گراں قیمتوں پر بھی فروخت کی گئیں۔ تاکہ حکومت کی اس پابندی کو توڑا جا سکے جو اس نے ان کتابوں کے چھاپنے اور بیچنے پر لگا رکھی تھی۔ اس عمل سے حکومت کے کانو پر جوں تک نہ رینگی کیونکہ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں، اس نے ان کتابوں کو بالکل بے ضرر اور غیر سیاسی قرار دیا گویا جن کتابوں پر پابندی عائد کی گئی تھی وہ حقیقت میں فروخت ہی نہیں ہوئی تھیں اور جو کتابیں ہم نے فروخت کی تھیں وہ ممنوعہ لٹریچر کی تعریف میں داخل نہ تھیں۔ حکومت کی اس بے نیازی سے ہمارے صوبہ بھر میں مایوسی کی ایک لہر دوڑ گئی کیونکہ ہم تو اپنی جگہ یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ اس

"ممنوعہ لٹریچر" کی فروخت سے ہمیں سستی شہادت اور قید و بند کی عزت نصیب ہو جائے گی۔

غرض کہ اس کا قوی امکان تھا کہ اگر حکومت اپنے دماغی توازن کو درست رکھتی تو چند دنوں میں یہ تحریک خود بخود ناکام ہو کر رہ جاتی۔ کس قدر اچنبھے کی بات ہے کہ ۶ اپریل کی شاندار کامیابی کے بعد اس کے بجائے کہ گاندھی جی قوم کے سامنے ایک دلیرانہ جنگی پروگرام پیش کرتے، دوسرے ہی دن انہوں نے تزکیہ نفس اور روحانی اتحاد کا راگ چھیڑ کر قومیت کی بڑھتی ہوئی رو کو پسپا کر دیا اس طرح ایک بار انہوں نے پھر اپنے انوکھے خیالی لائحہ عمل کو حقیقی عملی اقدام پر ترجیح دی۔ وہ اپنی خود نوشت سوانح عمری میں تحریر فرماتے ہیں کہ "دوسری صبح (۷ اپریل) سودیشی کپڑوں کے پرچار اور ہندو مسلم اتحاد کی تبلیغ کے لیے ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ اس میں صرف مٹھی بھر آدمیوں نے شرکت کی۔ حاضرین کی قلت تعداد سے نہ میں مایوس ہوا اور نہ مجھے تعجب ہوا کیونکہ میں نے لوگوں کے عام رویہ سے اندازہ کر لیا تھا کہ انہیں ہنگامہ خیز اور جوشیلے پروگرام پسند ہوتے ہیں نہ کہ خاموش تعمیری کوشش یہ فرق آج بھی موجود ہے۔"

گاندھی جی کا ارشاد سر آنکھوں پر۔ لیکن لوگوں کی بے عملی کا راز یہ نہیں کہ انہیں حقیقی کام سے زیادہ خالی خولی شور شغب پسند ہے بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ ان بچاروں کو قرون وسطیٰ کے مذہبی بندھنوں میں جکڑ کر ان کے قوائے عمل کو معطل کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ پھر ہمیں اس بنیادی فرق کو بھی نہ بھولنا چاہئے جو عوام اور گاندھی جی کے نظریہ میں ہر وقت اور ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔ ایک طرف تو عوام کی ساری سیاسی جد و جہد کا مقصد حکومت کے تختے کو الٹ دینا تھا اور دوسری جانب گاندھی جی ان لوگوں کو جو روحانیت اور تصوف کے مفہوم سے بھی نا آشنا تھے، اپنی روحانی طاقت کے مافوق الفطرت تجربوں کا تختۂ مشق بنانا چاہتے تھے۔

یہ گاندھی جی اور ہندوستان کی خوش قسمتی تھی کہ حکومت جلد اُن کی امداد پر مائل ہو گئی۔ گاندھی جی ۷ اپریل کی شب کو بمبئی سے دہلی روانہ ہوئے۔ اس ڈر سے کہ کہیں ۳۰ مارچ کا حادثہ پھر نہ تازہ ہو جائے حکومت گاندھی جی کی آمد سے بدحواس سی ہو گئی اور اس نے فیصلہ کیا کہ انہیں (گاندھی جی) شمال کے جنگجو صوبوں میں داخلہ کی اجازت نہ دی جائے۔ جب ان کی ٹرین دلی کے قریب پلول اسٹیشن پر پہنچی تو انہیں ایک تحریری حکم کے ذریعہ پنجاب کی سرحد میں داخل ہونے سے روکا گیا۔ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ مجھے پولیس نے ٹرین سے اتر جانے کا حکم دیا۔ میں نے یہ کہتے ہوئے کہ میں پنجاب میں بےچینی پیدا کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ اسے دور کرنے جا رہا ہوں، اس حکم کے ماننے سے انکار کر دیا۔ چونکہ پلول اسٹیشن پر مجھے پولیس نے گاڑی سے اتار کر اپنی نگرانی میں لے لیا۔"

سترھواں باب
گرفتاری اور فسادات

گاندھی جی کی گرفتاری کی اطلاع سارے ملک میں آگ کی طرح پھیل گئی اور اس سے لوگ مشتعل ہو گئے۔ انہیں پولیس کی نگرانی میں تیسرے درجہ کے ایک ڈبے میں داخل کیا گیا تھا مگر بعد کو انہیں اول درجے کے ڈبے میں بٹھا کر بمبئی روانہ کیا گیا مسٹر

بوانگ انسپکٹر نے جو ایک درمیانی اسٹیشن سے اُن کے ساتھ ہو گئے تھے اُن سے درخواست کی کہ وہ خود اپنی آزادانہ خوشی سے بمبئی واپس چلے جائیں اور پنجاب کی سرحد میں داخل نہ ہوں مگر انہوں نے اس سے انکار کر دیا چنانچہ انہیں گاڑی کے بمبئی پہنچنے تک پولیس کی حراست میں رکھا گیا اور اس کے بعد رہا کر دیا گیا۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے عوام ان کی گرفتاری کی خبر پاکر آگ بگولہ ہو گئے انہوں نے ۱۰ اپریل کی حالیہ مثال کو پیش نظر رکھ کر صرف ہڑتال منانے پر ہی اکتفا نہ کی بلکہ سڑکوں پر لوگوں کو موٹروں اور گاڑیوں سے اترنے کی تلقین نیز دکانوں اور تھیٹروں کو بند کر دینے اور جو انگریز بھی راستے میں ملے اُس پر حملہ کر دینے کی ہدایت کرنے لگے۔ احمد آباد میں ایک سینما کا اشتہار جلا دینے سے فساد اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ سینما کا پارسی مالک اس دن کے تماشے کو ملتوی کر دینے پر آمادہ نہ تھا۔ مجھے مسٹر دلبھ بھائی پٹیل کے ساتھ سڑکوں پر دورہ کرنے سے یہ جلد معلوم ہو گیا کہ جو مجمع لحہ بہ لمحہ آگے بڑھتا جا رہا تھا وہ تشدد اور آتش زنی پر آمادہ ہو چکا تھا اور وہ ان لوگوں کی بات سننے پر تیار نہ تھا جن کے ہاتھوں میں اب تک گاندھی جی کی پر امن تحریک کی قیادت رہی تھی۔

بہت جلد پولیس اور فوج اس مقام پر پہونچ گئی۔ یہ دیکھ کر ایک پولیس افسر بیتاب ہو گیا۔ کہ مشتعل مجمع اس کی جماعت کے قریب آ گیا ہے اس نے بعض لوگوں کو ایک لمبے ہنٹر سے زدوکوب کرنا شروع کیا لوگوں نے بھی سڑک کی مخالف سمت پر کھڑے ہوئے بعض انگریز فوجیوں پر سنگ باری شروع کر دی ایک پتھر کسی سارجنٹ کو جا لگا، اس نے سپاہیوں کو سنگین چڑھا لینے اور گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ خوش قسمتی سے ایک ہندستانی بیرسٹر نے سارجنٹ کو اس کے اس ارادے سے باز رہنے کی ہدایت کی اور میں نے ایک اونچے پلیٹ فارم پر چڑھ کر عوام کو گاندھی جی کی اس خواہش سے آگاہ کیا کہ وہ پُر امن رہیں نیز اُن سے درخواست کی کہ وہ منظم طریقے پر واپس چلے جائیں۔ ایک لمحہ کے لیے یہاں فساد رفع ہو گیا۔ میں نے شام کو سنا کہ ایک انگریز گاڑی سے زبردستی نیچے گھسیٹ لیا گیا اسے چوٹیں بھی آئیں اُس نے مشتعل مجمع کے غیظ و غضب سے بمشکل بچ کر ایک ہندستانی کارخانہ (کالوپو گیٹ کے پاس) میں پناہ لی۔ اس کارخانے کے چاروں طرف ہزارہا آدمی جمع ہو گئے اور پولیس نے موقعہ پر پہنچ کر مجمع منتشر کرنے کے لیے گولیاں چلائیں

۱۱ اپریل کو یعنی جس روز گاندھی جی کی گرفتاری کی اطلاع ملی فساد عارضی طور پر ملتوی ہو گیا دوسری صبح کو فساد اٹھ کھڑا ہوا میں نے مسٹر دلبھ بھائی پٹیل اور ڈاکٹر کانگرا کے ساتھ تمام فساد زدہ علاقوں کا دورہ کیا۔ یہ امید ہو چلی تھی کہ مطلع صاف ہو جائے گا لیکن لوگ بانس کے ڈنڈوں سے مسلح ہو کر جو انہوں نے اکثر دکانوں سے زبردستی حاصل کیے تھے صبح سویرے ہی سے تہدید آمیز رنگ میں سڑکوں پر گشت کر رہے تھے۔ ہم ان لاٹھیوں کی بہت بڑی تعداد چھیننے میں کامیاب ہو گئے اور ہم نے انہیں اپنے موٹر میں رکھ لیا۔ ہم ہر جگہ امن و امان ہو جانے کا اطمینان کر کے گھر لوٹ رہے تھے کہ ایک عارضی پنڈال سے جو یونیورسٹی کے طلبہ کے امتحان کے لیے بنوایا گیا تھا۔ دھوئیں کے بادل نکلتے دیکھ کر ہمیں تکلیف دہ تعجب ہوا اس بات نے گویا شہر میں آتش زنی اور قتل کے لیے سگنل کا کام دیا۔ مشتعل مجمعوں نے دفتر کلکٹر اور ٹیلیگراف آفس میں آگ لگا دی اور دوسرے مجمعوں نے پولیس کے جن جن تھانوں میں ممکن ہو سکا آتش زنی کا آغاز کر دیا۔ شہر کی کسی شاہراہ میں ایک بدقسمت انگریز سارجنٹ ایک مجمع میں گھر لیا اور مار ڈالا گیا ادھر مزدوروں نے کام بند کر دیا جس سے بدنظمی میں اور اضافہ ہو گیا۔

دوسرے دن حکومت نے ہمارے شہر میں مارشل لا نافذ کر دیا۔ اب ہم نے سنا کہ لاہور امرتسر بمبئی اور دوسرے مقامات پر فساد برپا ہو گیا اور ندیاد کے قریب ایک فوجی ٹرین پٹری سے اتر گئی کیونکہ گذشتہ شب بعض مجمعوں نے ریل کی پٹریاں اکھاڑ ڈالی تھیں۔ گاندھی جی کی رہائی اور بمبئی میں ان کی آمد کی اطلاع پا کر ہم نے انہیں اور انسویا بہن کو گھر آنے کے لیے فوراً تار دیا۔ اسی دوران میں گاندھی جی بمبئی کی صورت حال کو قابو میں رکھنے کی کوشش میں منہمک تھے خوش قسمتی سے وہ اس غضبناک اژدہام کو ٹھنڈا کرنے کے لیے وقت پر پہنچ گئے جو پائدھونی کے پاس جمع ہو گیا تھا وہ لکھتے ہیں۔ کہ مجھے دیکھ کر لوگ خوشی کے مارے جامے میں پھولے

نہ سماتے تھے فوراً ایک جلوس ترتیب دیا گیا اور فضا "بندے ماترم" "اللہ اکبر" کے نعروں سے گونجنے لگی میں نے مجمع کو پُرامن رہنے کی ہدایت کی مگر ایسا محسوس ہونے لگا گویا ہم اینٹوں کی بارش سے محفوظ نہ رہ سکیں گے۔ جیسے ہی جلوس نے کرافورڈ مارکیٹ کی طرف جانے کا ارادہ کیا فوراً سوار پولس کے ایک دستے نے جو جلوس کو فورٹ کی طرف جانے سے روکنے کے لیے آیا تھا اُسے اس سے زیادہ آگے بڑھنے سے روک دیا۔ مجمع بہت گنجان تھا وہ پولیس کی صف کو چیر کر آگے بڑھ چکا تھا۔ اس وسیع ہجوم میں میری آواز کے سنائی دینے کا بہت کم امکان تھا اسی وقت افسر انچارج نے سوار پولیس کو مجمع منتشر کرنے کا حکم دیا اور سوار جماعت فی الفور اپنے بلم تانے ہوئے ہجوم پر حملہ آور ہوئی۔ مجھے ایک لمحہ کے لیے یہ خیال پیدا ہوا کہ میں زخمی ہو جاؤں گا مگر میرا خوف بے بنیاد تھا جیسے ہی بلم سوار پاس سے گذرے ان کے بلم چھلتے ہوئے موٹر سے لگے لوگوں کی صفیں ٹوٹ گئیں اور اُن میں انتشار پیدا ہو گیا جو تھوڑی دیر کے بعد غل غپاڑہ کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔ کچھ لوگ پاؤں تلے دب گئے دوسرے بری طرح زخمی ہوئے اور کچل دیے گئے۔ انسانوں کے اس بڑے اور پرجوش ہجوم میں نہ تو گھوڑوں کے گذرنے کی کوئی جگہ تھی اور نہ آدمیوں کے جانے کے لیے کوئی راہ، اچانک چہ بلم سواروں نے آنکھ بند کر کے مجمع میں سے اپنی راہ نکالنے کی کوشش کی مجھے یہ ٹھیک یاد نہیں کہ وہ جو کچھ کر رہے تھے وہ اسے دیکھ بھی سکتے تھے یا نہیں؟ پورا منظر نہایت وحشتناک تھا اس جنون انگیز انتشار میں سوار اور عوام آپس میں بالکل گتھ گئے تھے۔"

گاندھی جی سیدھے پولیس کمشنر کے دفتر "پولیس کے رویہ کی شکایت کرنے تشریف لے گئے۔ مسٹر گریفتھس پولیس کمشنر نے پنجاب اور احمد آباد کے خوفناک واقعات کے پیش نظر حکومت کی احتیاطی تدابیر کو نہایت آسانی کے سمجھا دیا گاندھی جی نے اپنے شہر میں فساد برپا ہو جانے کی اطلاع پہلی بار بہت تکلیف سے سُنی اور فوراً احمد آباد روانہ ہو گئے۔

دوسری صبح کو احمد آباد اسٹیشن پر پہونچنے کے بعد گاندھی جی سیدھے کمشنر کے بنگلہ پر تشریف لے گئے تندمزاج کمشنر مسٹر پراٹ نے گاندھی جی کو بہت ملامت کی کہ انہوں نے جابجا جہنمی آگ روشن کر دی ہے نیز ان سے قتل و غارت گری کی وارداتوں کو جو صوبہ میں ہو رہی تھیں بہت مبالغے سے بیان کیا گاندھی جی نے کمشنر سے اس طویل گفتگو کے بعد ہماری کیفیت سُنی ہم نے مارشل لا کی شکایت کی انہوں نے فوراً طنزیہ جواب دیا "کیا ہمارے آدمیوں سے خوفناک اعمال ظہور میں نہیں آئے" اب انہوں نے اپنے آشرم میں پہونچ کر ہندستان بھر میں جو فسادات رونما ہوئے اُن کا ذاتی طور پر کفارہ ادا کرنے کے لیے تین روز کے برت کا اعلان کر دیا اور اپنے متبعین کو ہدایت کر دی کہ وہ بھی چوبیس گھنٹے کا برت رکھیں۔ مارشل لا جلد ہٹا لیا گیا۔ گاندھی جی نے بھی اپنی طرف سے ستیہ آگرہ کی جد و جہد ملتوی کر دی اور اپنے پیرووں کے دلوں میں جو سچائی اور عدم تشدد کے مقدس اصولوں سے اتنے زیادہ دور ہٹ گئے تھے از سر نو یہ چیزیں پیدا کرنے کی کوشش شروع کر دی۔

اٹھارواں باب

عظیم الشان تخمینہ

ایک طرف گاندھی جی غیر ذمہ دار عوام کے گناہوں کی پاداش میں سخت کفارہ ادا کر رہے تھے اور دوسری طرف پنجاب میں خوفناک امور منظر عام پر رونما ہو رہے تھے۔ احمد آباد اور بمبئی کی طرح گاندھی جی کی گرفتاری کی خبر پر لاہور۔ امرتسر اور پنجاب کے بعض دوسرے مقامات پر ایسے عام ہنگامے برپا ہوئے جس کی اس سے پہلے نظیر نہیں ملتی۔ کچھ انگریز قتل کر ڈالے گئے۔ اور بعض سرکاری عمارتیں نذر آتش کر دی گئیں لیکن پولیس اور فوج کی دہشت انگیزی کی مثال جو حکومت نے قانون و امن کے نام پر قائم کی تھی اور جس کی انتہا جلیانوالہ باغ کے قتل عام پر ہوئی وہ اس سے کہیں زیادہ تھی جس کا نظارہ بمبئی اور گجرات میں دیکھنے میں آیا تھا۔ درحقیقت ۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد ہندستان میں ایسا کوئی منظر نہیں آیا" امرتسر میں معصوم مردوں اور عورتوں کو کیڑے کی طرح پیٹ کے بل رینگنے پر مجبور کیا گیا" لاہور میں سینکڑوں طالب علم گرفتار کر لیے گئے اور انہیں ہندستان کی شدید گرمیوں میں سولہ سولہ میل پیدل چلایا گیا۔

بغاوت کی روح کچلنے کے لیے سینکڑوں کو بید لگائے گئے۔ مار دھاڑ بید زنی اور گولیوں کی بوچھاڑ روزانہ کا معمول ہو گیا، لیکن وہ جنرل ڈائر کی بندوق بازی ہی تھی جس سے جلیانوالہ باغ کی چار دیواری کے اندر بارہ سو آدمی لقمۂ اجل بن گئے اور یہ بندوق بازی اس وقت تک جاری رہی جب تک کہ اس کے سپاہیوں کا سارا گولہ بارود ختم نہ ہو گیا۔ اس واقعہ نے جمہور ہند اور بقیہ اہل عالم کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کر لیا۔

اس غیر قانونی دہشت انگیزی میں پولیس کی تفتیش نے اضافہ کر دیا جو عام گرفتاریوں، نیز بعض قتلوں اور آتش زدگی کے وارداتوں کے متعلق حکومت کی بہیمیت اور بربریت کے طوفان میں بہت پہلے دب چکی تھی۔ رہنما گرفتار کر لیے گئے مارشل لا یا بالفاظ دیگر بے آئینی کا اعلان کر دیا گیا مارشل لا کی خاص پنچائتیں مقرر کر دی گئیں۔ یہ عدالتیں کوئی انصاف کی عدالتیں نہ تھیں بلکہ ایک مستبد کی خود مختار مرضی کو پورا کرانے کا ذریعہ تھیں جو سزائیں دی گئیں اُن کا انحصار شہادت اور انصاف پر قطعی نہ تھا" سزائیں زیادہ تر وحشیانہ اور انتقامی تھیں۔ یہاں تک کہ بہت معتدل قسم کے شورش انگیزوں کو بھی جلاوطنی، حبس دوام یا پندرہ اور دس دس سال کی سزائیں دی گئیں۔

آیئے اب ذرا دیکھیں کہ اس وقت جبکہ حکومت کے ادھادھند ظلم وستم کی حکمت عملی زوروں پر تھی اور پنجاب میں اس کا پوری عریانیوں کے ساتھ مظاہرہ ہو رہا تھا گاندھی جی کیا کر رہے تھے؟

ایک بڑے جلسے میں تقریر کرنے کے بعد گاندھی جی محبت و امن کا درد پیدا کرنے کے لیے ندیاد تشریف لے گئے یہاں انہیں چند ہفتوں ہی کے اندر اس بات کا یقین ہو گیا کہ ستیہ آگرہ کی تحریک کا اجراء ان کی بہت بڑی غلطی تھی وہ لکھتے ہیں "جب میں ندیاد

پہنچا اور وہاں کے صحیح حالات کا مطالعہ کیا اور یہ سنا کہ کیرا ضلع کے ہزاروں آدمی گرفتار کرلیے گیے ہیں تو مجھے یکایک محسوس ہوا کہ کیرا اور دوسرے مقامات کے لوگوں کو سول نافرمانی کی دعوت دینے میں مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے مجھے احساس ہوا کہ یہ بات قبل از وقت تھی میں نے یہاں "ہمالیہ برابر غلطی" کے الفاظ جو بعد میں اتنے مشہور ہوئے استعمال کیے اگر کوئی شخص اپنے آپ کو سول نافرمانی کے عمل کا اہل بنانا چاہتا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ پہلے سلطنت کے قوانین کی فرماں برداری کرنا سیکھے اس ضروری حد بندی کی پابندی نہ کرنے ہی میں میری غلطی کا راز پوشیدہ ہے۔ میں نے عوام کو اس وقت سول نافرمانی کی ہدایت کی جب کہ وہ ابھی اسکے لیے تیار نہیں تھے اور میری یہ غلطی مجھے ہمالیہ کی طرح عظیم الشان نظر آتی ہے،، گاندھی جی آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں کہ "مذکورہ بالا مثالی شرائط کو پورا کرنا لاکھوں آدمیوں کے لیے آسان کام نہیں ہے چناں چہ آزمودہ اور صاف دل رضاکاروں کی ایک ایسی جماعت بنانے میں مصروف ہوگئے جو ستیہ آگرہ کی سخت شرائط کو بہت اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اور جس میں عوام کو حدود کے اندر رکھنے کی صلاحیت موجود تھی۔

اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر وہ بمبئی چلے گئے اور وہاں ستیہ آگرہ کے رضاکاروں کی ایک جماعت تیار کرنے اور اس کی تعلیم و ہدایت میں مصروف ہوگئے یہ ان کے اخلاقی فلسفے اور ان کے متبعین کے سیاسی رجحانات میں بنیادی فرق تھا جس سے ان کی یہ اسکیم بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے ناگزیر نتائج سامنے آنے لگے۔ رضاکاروں کی بڑی تعداد میں بھرتی بند ہو گئی اور ان لوگوں نے بھی جو بھرتی ہو چکے تھے باقاعدہ تربیت حاصل کرنا چھوڑ دیا اور جیسے جیسے دن گزرتے گیے نئے بھرتی ہونے والوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی چلی گئی"

اب انہوں نے فوراً ایک روحانی معلم کے بجائے ایک پرجوش انقلاب پسند کا چولا بدل لیا۔ کوئی تعجب نہیں اگر وہ پرجوش نوجوان جو غیر ملکی استبداد کے خلاف ان کی پُر امن بغاوت کے علم کے نیچے جمع ہوگئے تھے اپنے آپ کو آسانی سے اخلاق کے اُس نئے مکتب کے مطابق نہ بنا سکے جسے گاندھی جی نے اپنی تحریک سول نافرمانی کی راکھ پر قایم کیا تھا اس دوران میں پنجاب میں ظالمانہ دہشت انگیزی برابر بلا کھٹکے جاری تھی حکومت پنجاب کسی کی کچھ سنے بغیر سر مائیکل اوڈائر لفٹنٹ گورنر کے زیر ہدایت مارشل لا اور وحشیانہ سزاؤں کی جنون انگیز حکمت عملی پر عمل کرتی چلی گئی

"اب مسٹر سی۔ ایف اینڈریوز پہنچ چکے تھے ان کے خطوط سے میری نگاہوں کے سامنے وہاں کے حالات کی تصویر کھنچ گئی اور اس سے یہ خیال میرے دل میں بیٹھ گیا کہ اخبارات میں جو اطلاعات چھپتی رہی ہیں، مارشل لا کے مظالم ان سے کہیں زیادہ بڑھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے مجھ پر بہت زور ڈالا کہ میں وہاں پہنچ کر ان کا شریک کار ہو جاؤں" اس طرح پنڈت مالویہ اور پنجاب کے بعض دیگر کارکنوں نے بھی تحریریں بھیجیں۔ مگر حکومت نے پنجاب میں ان کے داخلہ پر جو پابندی عائد کر دی تھی اس کی موجودگی میں وہاں کس طرح جا سکتے تھے؟ انہوں نے وہاں جانے کے لیے بار بار وائسرائے کی اجازت طلب کی مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا اس سوال نے کہ کیا انہیں از سر نو سول نافرمانی شروع کر دینی چاہئے انہیں ایک عجیب تذبذب کے عالم میں مبتلا کر دیا "ان حالات میں پنجاب میں میرے داخلہ پر جو پابندی عائد کر دی گئی تھی اس کی خلاف ورزی کر کے وہاں داخل ہونا سول نافرمانی نہیں کہا جا سکتا تھا کیونکہ میرے گرد و پیش وہ پُر امن ماحول نہ تھا جس کی مجھے تمنا تھی۔ پنجاب کے بے پایاں مظالم نے ہر طرف غیظ و غضب کے جذبات کو اور مشتعل کر رکھا تھا۔ غرض کہ اگر ایسے وقت میں میرے لیے اس کا امکان ہوتا بھی تو سول نافرمانی جاری کرنا گویا شعلوں کو اور بھڑکانا تھا۔ لہٰذا وہ "یہ تلخیات" بھی پی گیے اور انہوں نے پنجاب نہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس طرح سول نافرمانی کی جنگ جو احمد آباد میں ملتوی کر دی گئی تھی بمبئی میں آکر عملاً ختم ہو گئی جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اسے کچھ اچھے طریقے سے کبھی دفن نہیں کیا گیا اور ہم نے اس کی قبل از وقت موت پر گاندھی جی کا کوئی ماتمی خطبہ ہی سنا!!

اس طریقے سے گاندھی جی حکومت کے مقابلے میں آخر تک اس لڑائی کو جاری رکھنے سے قاصر رہ گئے۔ نہ حکومت کے شدید مظالم کی تحقیقات کے لیے وہ پنجاب ہی جا سکے اور نہ انہیں ستیہ آگرہ کے دوررس اور گہرے اصولوں کی تربیت حاصل کرنے کے لیے رضاکار ہی مل سکے۔ اس کے باوجود انہوں نے پھر یہ خیال کیا کہ جب تک وہ ایسے اول درجہ کے ستیہ آگرہیوں کی ایک معقول تعداد کی تنظیم و تربیت نہیں کر لیں گے جو ہندستان کے ہر حصے میں فوراً لاکھوں آدمیوں کو بیدار کر سکیں اور انہیں پوری طور پر قابو میں رکھ سکیں اس وقت تک وہ کبھی ستیہ آگرہ جاری نہ کریں گے اس وقت ہر طرف سے ان کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے ستیہ آگرہ کے پیغام، اس کے بنیادی اصول اور اسے عملی جامہ پہنانے کے وسیع امکانات کا بدرجاتہ کرنے پر تلے ہوئے تھے اس مرحلہ پر انہیں اپنا اخبار نکالنے کی اتنی زیادہ ضرورت محسوس ہوئی کہ اس سے پہلے کبھی محسوس نہ ہوئی ہوگی۔

حکومت بمبئی نے مسٹر ہارنمین اڈیٹر "بمبئی کرانیکل" کو عارضی طور پر انگلستان بھیج دیا تھا میرے دوست مسٹر سوبانی اور مسٹر بینکر نے جن کا اس اخبار کے انتظام سے تعلق تھا گاندھی جی کی خدمت میں اخبار کی ادارت کی پوری ذمہ داری پیش کی مگر حکومت نے "کرانیکل" کے ادارتی مقالوں پر سخت سنسر بٹھا دیا اور اس طرح گاندھی جی ایک روزانہ اخبار کے فرائض ادارت کی مصیبت سے بچ گئے۔ انہیں دوستوں نے اس فوری شکل سے بے نیاز ہو کر اُن کی خدمت میں ینگ انڈیا کی ادارت پیش کی، ہم نے اس اخبار کو ۱۹۱۵ء میں جاری کیا تھا اُس وقت سے یہ کبھی چلتا اور کبھی بند ہوتا، گاندھی جی نے یہ پیش کش فوراً قبول کر لی اور اسے ہفتے میں دوبار شایع کرنا شروع کر دیا کیونکہ اس زمانے میں کرانیکل ادارتی مقالوں کے بغیر شایع ہوا کرتا تھا۔

گاندھی جی تحریر فرماتے ہیں "میں لوگوں کو ستیہ آگرہ کا باطنی مفہوم سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا اور مجھے یہ امید تھی کہ میں اپنی اس کوشش میں کم از کم پنجاب کی صورت حال کا مقابلہ کر سکوں گا۔ انہوں نے یہ کام قابل تحسین رنگ میں انجام دیا۔ حکومت پر وہ بہت معتدل الفاظ میں تنقیدیں کرتے تھے۔ اس زمانے میں پنجاب میں برائے نام مقدمے چلا کر وحشیانہ سزائیں دے دینے کی عام وبا پھیلی ہوئی تھی گاندھی جی ان چیزوں پر جو تنقیدیں کرتے ان میں کسی قسم کی سیاسی تلخی کے بجائے قانونی باریک بینی اور حقائق کا فاضلانہ تجزیہ زیادہ ہوتا تھا۔ اس اخبار کی کامیابی کو دیکھ کر مسٹر بینکر اور میں نے یہ فیصلہ کیا کہ ماہانہ نوجیون کو بھی ایک ہفتہ وار اخبار کی حیثیت سے چلانے کے لیے ان کے سپرد کر دیا جائے انہوں نے نہایت خوشی سے اس پیش کش کو قبول کر لیا اور میں نے بھی ان کی ماتحتی میں اس اخبار کی سب اڈیٹری کا کام شروع کر دیا اس تعلق کے چند ہفتوں کے اندر مسٹر بینکر نے اس اخبار کی طباعت کے لیے احمد آباد میں "نوجیون پریس" کے نام سے ایک نیا مطبع قائم کرنے میں ان کی مدد کی۔ اس مطبع اور اخبارات سے مسلح ہو کر جن کی اشاعت کے متعلق مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں انہوں نے نہ صرف گجرات اور ہندستان کے ہزاروں اور لاکھوں آدمیوں کو بلکہ ساری دنیا کو سول نافرمانی کے انوکھے عقیدے اور سیاسی مسائل پر اپنے خیالات سنانا شروع کر دے۔

انیسواں باب

شکست پسندی کی انتہا

اب ہمیں ستیہ گرہ کی اس تحریک پر غور کرنا ہے۔ جو شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گئی۔ ہمیں گاندھی جی کی تمام حکمت عملی کو بھی ذہن میں رکھنا ہے جنہوں نے اپنے سپاہیوں کو ہتھیار اٹھانے کا حکم دینے کے قبل ہی ایک فوری پسپائی کا حکم دے دیا۔

اس سلسلہ میں مسٹر گاندھی کے اقوال و اعمال سے اندازہ لگاتے ہوئے ہمارے فکر کے تین نتائج بر آمد ہوتے ہیں۔

(۱) گاندھی جی کو یقین تھا کہ وہ رولٹ ایکٹ سے متعلق تمام جوش و خروش کے تنہا ذمہ دار تھے اور اس تکلیف دہ عام تشدد کے بھی جو ملک کے مختلف حصے میں رونما ہوا۔

(۲) اس لیے یہ مانتے ہوئے کہ واقعی سول نافرمانی کے لیے ان کی پکار ہی اس تمام تکلیف دہ آشوب کی تہ میں کارفرما تھی انہوں نے نہ صرف اپنی ستیہ گرہ کی جارحانہ کارروائیوں کو روک دینے اور اسے یک قلم ختم کر دینے کی طرف عاجلانہ پیشقدمی کی بلکہ ساری سیاسی سرگرمیوں کو بھی موقوف کر دینا چاہا۔

(۳) اسکے علاوہ انہوں نے عوام کے جذبات کی رَو کو (بالخصوص سربرآوردہ سیاسی کارکنوں اور رضا کاروں کو) عملی سیاسی جدوجہد سے صداقت اور عدم تشدد کے گہرے اصول کے ماتحت اخلاقی اور روحانی تربیت کی طرف پھیر دینے کی کوشش کی۔

اب ہمیں دیکھنا ہے کہ آیا گاندھی جی گجرات اور پنجاب کے بلووں کی ذمہ داری کا سارا بوجھ اپنے کندھوں پر رکھنے میں حق بجانب تھے۔

اول تو ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ گاندھی جی کے لیے ان کے سارے سیاسی دورِ عمل میں ایسے ملک گیر آشوب کا پہلا تجربہ تھا جبکہ انہوں نے نفرت انگیز رولٹ ایکٹ کے خلاف ملک کو اپنے سول نافرمانی کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے کی دعوت دی۔ اگرچہ وہ جنوبی افریقہ کی حکومت کے قانونی اور انتظامی مظالم کے خلاف اپنے عملی احتجاج کی جدوجہد میں اپنے ہزاروں اہل وطن کی امداد حاصل کر چکے تھے لیکن درحقیقت انہوں نے ابھی تک مقابلتاً صرف لوگوں کی ایک ادنیٰ اقلیت کی رہنمائی ایک ایسے ملک میں کی تھی جو کسی طرح بھی ہندستان کے کسی صوبے یا ایک بڑی ریاست سے بڑا نہ تھا۔ ہندستان میں اُن کے ابتدائی تجربات بھی نسبتاً ایسی چھوٹی جماعتوں تک محدود تھے جنہیں ابھی تک کسی شدید سیاسی ظلم نے غیظ و غضب کی مجنونانہ حالت تک نہیں پہنچایا تھا۔ درحقیقت ۱۹۱۹ء کے اوائل کی بات ہے جب کہ سیاہ قانون (رولٹ ایکٹ) کے خلاف اپنی جدوجہد کے دوران میں گاندھی جی نے پہلی مرتبہ برطانوی شہنشاہیت کی قوتوں کے خلاف جنگ میں اگرچہ وہ تشدد سے خالی تھی برطانوی ہند کے ۲۰ کروڑ باشندوں کی سرداری کی۔ اس لیے اگر اُن کی سیاست کی غلطیاں جزوی طور سے نسبتاً ناتجربہ کاری کی بنا پر معاف کی جاسکتی ہیں، تو اُن کا آخری فیصلہ ضروری نہیں کہ لغزش سے خالی تصور کیا جائے۔ چنانچہ اس مختصر مگر شاندار شورش کا جائزہ لینے کے بعد

ہمیں کیا معلوم ہوتا ہے؟ یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ گاندھی جی کی عام عملی احتجاج کی پکار ہی نے اگرچہ وہ پُرامن تھی حکومت کے خلاف ہمہ گیر ناراضی کی آگ کو ہوا دے کر بھڑکانے اور ہندستان کے لاکھوں باشندوں کے دلوں میں خوداعتمادی کی ایسی روح پھونکنے میں جو پہلے انہوں نے کبھی محسوس نہیں کی تھی بڑا کام کیا۔ اس عملی احتجاج کے اصول نے لاکھوں نئے رنگروٹوں کو عام ہلچل کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا اور ان صفوں کے بڑھانے اور جم غفیر کے جوش و خروش کو جس کے اژدحام کا مظاہرہ ملک کے جلسوں اور جلوسوں میں ہو رہا تھا شدید کرنے میں بہت مدد دی۔ پھر ۶ اپریل کے قومی ہڑتال نے صرف چند ہفتوں کی شدید ترین شورشوں کے انتہائی عروج ہی کو ممتاز نہیں کیا بلکہ قوم کے متحدہ عزم و جزم کے شعلوں کو بھی دہکانے کا باعث اور ملک کے اندر اور زیادہ پُرجوش مجلسوں اور مظاہروں کا ابتدائی نقطہ ثابت ہوئی۔ مجھے یقین ہے کہ تاریخ گاندھی جی کی اس ہڑتال کی پکار کو ہندستان کی سیاسی زندگی میں ایک نئے عہد کا پیش خیمہ خیال کرے گی۔

لیکن گاندھی جی کی تگ و تاز یہیں تک ختم ہو کر رہ گئی۔ ان کی اصلی امداد درحقیقت ان کی قومی ہڑتال کی پکار کے بعد بند ہو گئی اور یہ اسٹرائک درحقیقت آل انڈیا ہڑتال کا ایک انوکھا پیرایہ تھی۔ قانون شکنی کی عملی جدوجہد ابھی کہیں شروع بھی نہیں ہوئی تھی کیونکہ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے۔ ہمارے گاندھی جی کے چند ہزار غیر سیاسی رسالوں کے فروخت کرنے کو حکومت نے قانون شکنی سے تعبیر ہی نہیں کیا اور نہ اسے کسی حکومتی اختلاف او تعزیرے سابقہ پڑا۔ اس لیے جو کچھ ۶ اپریل کے بعد واقع ہوا اس کا سبب وہ عظیم الشان حرکت عمل تھی جو گاندھی جی کے عملی احتجاج کے نئے مسلک کے مجرد اعلان اور قومی ہڑتال کی کامیاب سرانجامی سے حاصل ہوئی۔ اور جہاں مسٹر گاندھی مابعد کے ان واقعات کے جو شہابی سرعت سے رونما ہوئے صرف ایک جامد اور تقریباً بالکل مجبور تماشائی ہو کر رہ گئے ہیں خود ان واقعات کی تشریح صرف سیاسی بے اطمینانی کے اُن وسیع ہنگاموں سے کی جا سکتی ہے جو جنگ عظیم کے عام سیاسی واقعات۔ سوراج کی ہلچل اور ہمہ گیر غیر معین بے چینیوں سے جنگ کے فوراً بعد صرف ہندستان ہی میں نہیں بلکہ تمام دنیا میں پیدا ہو چکے تھے

اب ہمیں اس انتشار کے فوری اسباب کی طرف آنا ہے۔ ان میں سب سے اہم سبب یقیناً پلول میں گاندھی جی کی گرفتاری تھی۔ درحقیقت گاندھی جی گورنمنٹ کے امتناعی حکم کی خلاف ورزی کر کے خود اس حراست کے جویاں ہوئے۔ اس لیے اصطلاحی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان تمام جھگڑوں کا سبب صرف ان کی سول نافرمانی تھی۔ لیکن جیسا کہ ان یادگار ایام کے جاننے والے بالعموم تصدیق کریں گے، گاندھی جی کی گورنمنٹ کے حکم کی خلاف ورزی کو جس چیز نے زیادہ اہمیت دی وہ اُن کی گرفتاری کی سنسنی پیدا کرنے والی خبر تھی۔ حکومت ان کو کسی سول نافرمانی کے ارتکاب کے بغیر بھی گرفتار کر سکتی تھی۔ لہٰذا انتشار کا فوری سبب محض یہ تھا کہ وہ گرفتار کر لیے گئے تھے نہ کہ وہ خاص طریقہ جس سے انہوں نے یہ گرفتاری تلاش کی۔

لیکن جہاں احمد آباد اور گجرات کے جھگڑے پوری طور سے گاندھی جی کی گرفتاری کی طرف منسوب کیے جا سکتے ہیں وہیں ایک اہم معاون سبب نے عام بے اطمینانی کے بارود خانے کو مشتعل کرنے میں دیاسلائی کا کام کیا اور یہ بے اطمینانی پنجاب میں ترقی کر کے پہلے ہی بہت اہم ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کی جلاوطنی نے بھی لاہور اور امرتسر کے عوام کو بھڑکانے میں کچھ کم مدد نہیں دی۔

اس لیے حقیقت میں یہ "تین گرفتاریاں" یعنی گاندھی جی کی اور ان دو محبان وطن کی، پنجاب اور گجرات کے بلووں کا سبب ہوئیں۔ اب ہندستان ہی کی نہیں بلکہ دوسرے ممالک کی بھی تاریخ پر نظر ڈالتے ہوئے، یہ بات تسلیم کی جائے گی کہ نام آور سیاسی رہنماؤں کی گرفتاری اگر ہمیشہ نہیں تو اکثر ایسے عام بلوے اپنے ساتھ لائی ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ ایسے ہنگامے دوسرے ملکوں میں ہندستان کی نسبت زیادہ عام رہے ہیں لیکن ایسا نہ ہو تو بھی ہندستان اپنی سیاسی دہشت انگیزیوں اور عام تشدد کا حصہ گاندھی جی کے منظر عام پر آنے سے پہلے ہی پا چکا تھا۔ اُس بلوے کو کون نہیں جانتا جو بمبئی میں اُس وقت ہوا تھا جب مسٹر تلک کو چھ سال کی وحشیانہ سزا سنائی گئی تھی اور ڈنڈم کے اس بلوے کی خبر کس کو نہیں تھی جو اس وقت رونما ہوا جب کوماگاٹامارو کے مسافر گرفتار کیے گئے تھے۔

حقیقتاً ایسے اچانک عام بلووں کے ایک گہرے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ رہنما جن کے ہاتھوں میں معمولی قسم کی شورشوں کی باگ ڈور ہوتی ہے کم ایسے بلوؤں کے بانی ہوتے ہیں اور اس سے بھی کم یہ بلوے اُن کے غور و فکر کے نتائج ہوتے ہیں۔ عام تشدد خود اپنے مجوبہ قوانین کی پیروی کرتا ہے۔ گاندھی جی کے متعلق قطعاً فیصلہ کرلینا چاہیئے کہ وہ اس وقت اپنی خودبین فطرت سے کامل طور پر مغلوب ہوتے ہیں جب وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ گویا اُن کی ذات ہی اِن تمام مقابلتاً ہلکے ہلکے بلوؤں کی ذمہ دار ہے اور اپنی ہمالیہ جیسی اس غلطی کو ان تمام جھگڑوں کا اصلی سبب کہتے ہیں۔

اب ہمیں صرف ستیہ گرہ کی جدوجہد ہی کی التوا۔ کی طرف نہیں بلکہ رولٹ ایکٹ کے خلاف تمام سیاسی سرگرمیوں کی موقوفی کے دوسرے نقطہ کی جانب آنا ہے۔ جب گاندھی جی نے اپنی وہ جدوجہد ملتوی کردی جس کی بنیاد ایسے اصولوں پر تھی۔ جن کے وہ قدرتاً ماہر استاد سمجھے جاتے تھے۔ تو اُن کے پیرو اور دوسرے لوگ عموماً سرتسلیم خم کردینے پر درحقیقت مجبور ہوگئے پھر بھی یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ پُرامن قانون شکنی کا کافی موقعہ نہ رہ گیا تھا اس لیے کہ ان دو صوبوں میں جنھوں نے اس جھگڑے میں سب سے زیادہ حصہ لیا تھا لوگ بالکل مرعوب اور خوفزدہ ہوگئے تھے۔ اس لیے اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ صرف رولٹ ایکٹ ہی کے مقابلہ میں نہیں بلکہ اُس انسانیت سوز بربریت کے مقابلہ میں بھی جس کا ارتکاب پنجاب میں ۱۹۱۹ء کے اپریل میں ہوا اور اس کے بعد سے آئے دن ہوتا رہا۔ تمام سیاسی جدوجہد کو روک دینے میں گاندھی جی کہاں تک حق بجانب تھے؟ اس میں مجھے کچھ شک نہیں کہ ایک .... مستقل مزاج اور حقیقی سیاست دان فوراً کسی جارحانہ انداز کی کوئی متوسط سیاسی ہلچل پیدا کرکے اپنے دہشت زدہ متبعین کے دلوں میں حوصلہ اور امید پیدا کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرتا۔ ایسا عمل رائے عامہ کے سارے سیلاب کو گورنمنٹ کے خلاف پھیر دینے میں کارگر ہوتا۔ لیکن گاندھی جی نے جان بوجھ کر قطعی اور حتمی شکست پسندی کی حکمت عملی اختیار کی اور حکومت کو مورد الزام قرار دینے کے بجائے عوام کی غلطیوں ہی کا راگ الاپتے رہے۔ اور وہ جب کبھی اپنے اخبار (ینگ انڈیا) میں کچھ لکھتے بھی تو غیر اہم اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر۔ وہ رولٹ ایکٹ کی تنسیخ کے لیے یا اور اس سے زیادہ اہم خود اختیاری حکومت اور سیاسی آزادی کے مطالبات کے لیے لڑنا بھول گئے۔ غرض کہ وہ اپنے تمام حربوں کو ے دے کے بجا۔ یں حکومت کے ہیبت ناک مظالم کے خلاف استعمال کرنے لگے۔

اب تیسرے مرحلہ کی طرف رجوع ہونے کے لیے میں کہتا ہوں کہ سیاسی جوش و خروش کی رو کو اخلاقی اور روحانی تنظیم کے خاموش راستوں کی طرف پھیر دینے کو پیش نظر رکھتے ہوئے جیسے گاندھی جی بلووں کے اصلی سبب دریافت کرنے میں ناکام رہے اُسی طرح آیندہ ایسے ہنگاموں کے انسداد کا علاج تجویز کرنے میں اُنھوں نے اور بھی زیادہ فاش غلطی کی جس طرح وہ اس یقین پر اڑے رہے کہ اُن کا آتشیں مسلک ہی تمام جھگڑوں کا اصلی سبب تھا اسی طرح بہر حال وہ اس مغالطے کو بھی اپنے اندر جگہ دیتے رہے کہ ان بلووں میں بہت نہیں تو کچھ ستیہ گرہیوں کا بھی ہاتھ تھا۔ یہ بھی یاد رکھئے کہ بمبئی کے ایک طوفانی منظر کے سوا جسے گاندھی جی نے خود دیکھا وہ ہمیشہ بدنظمی کی ایسی عملی آشوب گاہ سے سینکڑوں کوس دور رہے ہیں۔ ان بلووں نے گاندھی جی کو ایسا کمزور اور نیست کر دیا کہ وہ اپنے معتمد دوستوں کے بیان سے کہیں زیادہ بلووں کی سرکاری توجیہ سے متاثر ہونے کے لائق ہوگئے۔ میں نے خود گاندھی جی سے اس کے متعلق بات کی جس کے بعد مجھے یقین ہوگیا کہ جو منظر مسٹر گریفتھس نے بمبئی میں اور مسٹر پراٹ نے احمد آباد میں پیش کیا وہ گاندھی جی کو قائل کرنے کے لیے کافی تھا کہ ستیہ گرہ کے کافی کارکنوں نے کم و بیش پنجاب و گجرات کے بلووں میں رہنمائی کی تھی۔ ہم میں سے بعض نے اس غلط خیال کے یک قلم مٹا دینے کی سخت کوشش کی لیکن اپنا نقصان دہ بیان جو احمد آباد پہنچنے کے بعد تعلیم یافتہ اہلکاروں کی ذمہ داریوں کی متعلق انھوں نے دیا تھا اُسے واپس نہ لیا۔ آخری مرتبہ جب بلوے کے کئی مہینہ بعد بمبئی میں میں نے اس کے متعلق اُن سے گفتگو کی اور لڑ جھگڑ کر طے کیا تو وہ میری استدعا سے اس

قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے کسی افسر کو جو احمد آباد کے جرائم کی تفتیش کر رہا تھا ایک نجی چٹھی لکھی۔ پھر بھی باوجود اس کے کہ وہ جانتے تھے کہ ان کا بیان بہت عاجلانہ دور غیر منصفانہ تھا انہوں نے عوام کے درمیان اُس کے نرم کرنے یا واپس لینے کی زحمت آج تک نہ گوارا فرمائی۔

میں خود اس طوفان کے درمیان موجود تھا جو میں احمد آباد میں ہمارے بجیس سروں پر برپا ہوا۔ میں آسانی سے تائید کر سکتا ہوں اور مجھے اعتبار ہے کہ میرے تمام احباب بشمول جناب ولبھ بھائی پٹیل میرے اس بیان میں مجھ سے اتفاق کریں گے کہ باخبر لیڈر اور کارکن جو ۱۱ اپریل کی صبح تک تبلیغ میں مصروف تھے یہی نہیں کہ اس بلوے میں ان کا کوئی ہاتھ نہ تھا بلکہ وہ عام غیظ و غضب کے اس تپتے ہوئے لاوے کو دیکھ کر بالکل بدحواس ہو گئے۔ جو شروع ہونے کے بعد شیطانی قوت کے ساتھ خطۂ زمین کے کسی پُر اسرار خفیہ تہ خانے سے اُبل پڑا اور جس نے تین دن تک تمام شہر کے اوپر جہنم کی آگ روشن رکھی۔ یہی قصہ دوسرے شہروں پر بھی منطبق ہوتا ہے جنہوں نے ایسے ہی عام بلوؤں کا مشاہدہ کیا۔ تاریخ میں ایسی تمام لڑائیاں چاہے وہ سودمند انقلاب کی نقیب رہی ہوں چاہے ان سے بہت بڑی ابتری اور بدنظمی برپا ہوئی ہو تقریباً ہمیشہ عوام کی نفسیات کے عجوبہ قوانین سے عمل میں آئی ہیں اور باخبر لیڈر اور مدبروں کی مختصر گروہ کی بہت کم رہین منت رہی ہیں۔

پھر اس کے بعد لوگوں کی اس تھوڑی تعداد کا کوئی تصور نہیں تھا جنہوں نے گاندھی جی کے سول نافرمانی کے عہد نامے پر دستخط کی تھی۔ اور پھر خود ان کو کسی قانون کی خلاف ورزی کا مشکل سے موقعہ ملا۔ لیکن چونکہ وہ لوگ چند دنوں کے بلوؤں کی حیرانی اور بدحواسی سے رو باطمینان ہو رہے تھے گاندھی جی نے انہیں بلایا کہ وہ ایک صلح پسند جماعت کی صورت میں اپنی تنظیم کریں اور لوگوں کے دلوں میں محبت اور عدم تشدد کے اصول کو مضبوط کریں۔ ہم چھوٹی گلیوں میں مجمع کرنے کے لئے جایا کرتے جہاں روز گاندھی جی کا ایک نہ ایک پیغام سناتے جسے وہ اپنے آشرم کی چار دیواری کے اندر سے ہر روز بھیجا کرتے۔ لیکن افسوس ہمیں ایسے لوگوں کے سامنے تبلیغ کرنی پڑی جنہوں نے بلوؤں میں مشکل سے کسی قسم کا حصہ لیا تھا۔ لیکن وہ مارشل لا کے طرز حکومت اور پولیس کے حملوں کی یاد سے جن سے انہیں اب بھی نجات نہ ملی تھی اس قدر دہشت زدہ تھے کہ ہمارے الفاظ کا ان پر کوئی اثر کیا پڑتا۔ گاندھی جی کی تقدس مآب نصیحتوں سے ہم لوگ احمد آباد کی زمین روندتے رہے لیکن یہ ایک بالکل کمزور بے مزہ اور بیکار کام تھا۔ صدیوں کے مظالم اور اسلحہ سے محرومی بحت افلاس تھوڑا اور وہ بھی بھاجی کا کھانا۔ ہندوؤں کا صلح پسند مذہب ان سب نے ملکر ہندستانی عوام کو ایسا دل کا کمزور اور عمل کا بودا بنا دیا تھا کہ انہیں مشکل سے عدم تشدد کے مزید خوراکوں کی ضرورت ہوتی۔

یہ یاد رہے کہ وہ سربرآوردہ کارکن جو سب سے پہلے گاندھی جی کے سول نافرمانی کے جھنڈے کے نیچے دوڑ کر آنے والے تھے اور جنہوں نے ان کی نئی تحریک کو کامیابی حاصل کرنے میں مدد دی اُن میں سے بہتوں نے سوراج کی شورش کے زمانے سے مسز اینی بسنٹ اور مسٹر تلک کے ماتحت سیاسی کاموں میں تربیت حاصل کی تھی۔ درحقیقت گاندھی جی کی جماعت اور ان کے متبعین میں جب سے انہوں نے اپنے مشہور ستیہ گرہ کے پیمان کا اعلان کیا قابل لحاظ تقویت ہو گئی تھی۔ لیکن پھر بھی ان میں سے بہتروں کے اندر شدید سیاسی مقاصد نے پہلے ہی سے روح پھونک دی تھی اور وہ لوگ گاندھی جی سے صرف اس لیے مل گئے کہ انہوں نے ان کو حکومت سے لڑنے کے لیے عملی احتجاج کا ایک نیا اور غیر آزمودہ آلہ پیش کیا۔ اور جب ہندستان کے شمال اور جنوب کے کچھ شہروں میں تین دن کے بلوؤں کی وجہ سے گاندھی جی نے اچانک تحریک کے روک دینے کا شور مچا بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھا کر انہیں ایک نرالی اور اخلاقی اور خیالی تبلیغ سپرد کی تو یہ خیرہ سر بدحواس ہو گئے۔ انہوں نے درحقیقت محسوس کیا اگرچہ ان میں سے بہتوں کو گاندھی جی کی لیڈری قبول کرنے میں اُن کا مطمح نظر عملی احتجاج کے ذریعے ہندستان کی سنیاسی

آزادی تھی۔لیکن اب ان کی رہبری ایک عجیب منزل کی طرف ایک نرالے راستہ سے ہو رہی تھی جس کا انھوں نے پہلے کبھی خواب بھی نہ دیکھا تھا۔آخر کار جب جد وجہد کے جاری ہونے کی ساری امیدیں درہم برہم ہوگئیں اور گاندھی جی عملاً اعتدال پسندوں کے دوش بدوش آتے ہوئے ان کے پسندیدہ ترین انداز سے پنجاب میں حکومت کی سیاست پر نرم تنقیدیں کرنے لگے تو کارکن قدرتاً افسردہ دل ہو کر اُن کی جماعت سے الگ ہونے لگے۔

لیکن اتنا ہی نہیں ہوا۔سیاسی صورتِ حال کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گاندھی جی نے اپنی کتاب "ہند سوراج" میں واضح کردہ اصول کے دوش بدوش ایک انوکھے طرز کا سوراج قائم کرنے کی غرض سے ہمارے سامنے اپنے نئے مسلک کے شگوفے کو چھوڑ کر اور نئی سبھاؤں کی تنظیم کر کے اپنے منصوبے کو اور بھی تقویت دینی شروع کی۔لیکن اس معاملے میں ان کی شروعات کی تشریح ایک نئے باب میں کرنی چاہیئے۔

بیسواں باب

چرخے کا انکشاف

چوں کہ چرخے کے ساتھ گاندھی جی کی والہانہ محبت نے بمبئی کے اندر ۱۹۱۹ء کی گرمیوں میں سبھا شروع کرنے کے وقت سے روز افزوں ترقی کی ہے اس لیے یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اس نے پہلے پہل کیسے اس صدی کے آغاز میں نشو ونما پائی

اس میں شک نہیں کہ یہ سودیشی تحریک آزادی کی جد وجہد میں اُسی وقت سے شامل ہو گئی جب لارڈ کرزن نے ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کی اسکیم کا اعلان کیا۔اس میں بھی شک نہیں کہ حکومت کی حکمت عملی سے جو ناراضگی پیدا ہوئی اس نے پہلے اہل بنگال اور پھر سارے ہندستانیوں کو اس پر آمادہ کر دیا کہ وہ اہل برطانیہ کے روئی کے سامان کا مقاطعہ کر کے اپنے انتقام کی آگ بجھائیں۔اس لیے اس مقاطعہ کی تحریک کے طوفان کو بالکل اس قسم کی چیز سمجھنا چاہیئے جیسے برطانوی چائے کا مقاطعہ بوسٹن بندرگاہ نے کیا تھا یا پھر غضب چینیوں نے تمام برطانوی مالوں کا مقاطعہ کیا۔لیکن اگر برطانوی روئی کا مقاطعہ کیا جاتا تو ضمنی نتیجے کے طور پر یہ لازمی تھا کہ ہندستان کے تیار کردہ کپڑوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی۔اس طرح سے مقاطعہ کی تحریک سودیشی کپڑوں کی اور واقعتاً تمام ہندستانی سامان کی حوصلہ افزائی کی تبلیغ کے ساتھ منسلک ہو گئی۔احمد آباد اور بمبئی کے مل والوں نے بہر حال خوش اعتقاد ملک پرست عوام کو اچھی قیمتوں پر برے مال نکالنے سے دھوکا دے دے کر اس سنہرے موقع کو خوب استعمال کیا۔جونہی اس کا پردہ فاش ہوا تو لوگ قدرتاً ایسی حکمت عملی سے برگشتہ ہو گئے، اور اس عمل نے پرانی سودیشی تحریک کا قبل از وقت خاتمہ کر دیا۔پھر بھی اس کے بہت سے نقوش ضرور باقی رہ گئے۔

اسی طرح جیسے تقسیم بنگال کے خلاف شورش نے ہندستانیوں کے سیاسی لغایت میں سوراج اور سودیشی جیسے مبہم فقرات کا اضافہ کیا ویسے ہی اس تحریک نے بھی ہندستان کے خاص خاص شہروں اور قصبوں میں سودیشی گودام بنانے میں مدد کی جہاں

ہندستانی ملوں کے بنے ہوئے کپڑے فروخت ہوتے تھے۔ اسی اثنا میں مسز اینی بیسنٹ جب سامنے آئیں تو انہوں نے بھی ہندستانی مال کو بیرونی سامان پر ترجیح دینے کی لوگوں کو نصیحتیں کیں۔ اس طرح جہاں "سودیشی" صرف قسم کھانے کے لیے ایک لفظ رہ گیا وہیں برطانوی سامان اور کپڑوں کے "بائیکاٹ" کی اصطلاح کو بھی جس نے بنگال اور دکن کی سیاسی مرکزوں کی موافقت حاصل کی تھی لوگوں نے ناقابل عمل ہونے کی حیثیت سے چھانٹ دیا۔

اس لیے یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ درحقیقت یہ بمبئی کے خاص سودیشی گودام کے منتظم (جنہیں مسٹر تلک نے ترقی دی تھی) کوئی مسٹر جیراجانی تھے جنہوں نے بہت التجائیں کیں اور آخر کار ۷ اپریل ۱۹۱۹ء کو گاندھی جی پر زور ڈالنے میں کامیاب ہو گئے کہ گاندھی جی سودیشی کا عہدنامہ پبلک کے سامنے پیش کریں۔ یہاں یہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ اس وقت اس عہدنامہ کی کیا شکل تھی جب مسٹر گاندھی نے اسے پہلے پہل پیش کیا اور سربرآوردہ کارکنوں سے کہا کہ وہ اس پر لوگوں کے دستخط حاصل کرنے کی کوشش کریں خصوصاً بمبئی اور گجرات کے لوگوں کے! گاندھی جی نے اس وقت تک چرخے کے متعلق اپنے خیال کو زیادہ نشوونما نہیں دی تھی۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ وہ اپنے طور پر اس معاملے میں تجربات کر رہے تھے تو بھی اس وقت کھادی یعنی ہاتھ کا کاتا بنا کپڑا بازاروں میں دستیاب نہیں ہوتا تھا، بدیں وجہ اگرچہ یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ تین اختیاری عہد تھے جو مسٹر گاندھی نے اپنے خاص خاص کارکنوں سے بہت بحث وتمحیص کے بعد تیار کیے تھے، پہلے عہد کی رو سے دستخط کنندگان ہندستانی ملوں کے کتے ہوئے سوت کے ہاتھ سے بنے ہوئے کپڑے پہننے پر مجبور تھے۔ دوسرے کا مقصد دستخط کنندگان کو ہندستانی ملوں کے کتے ہوئے سوت سے ہندستانی ملوں کے بنے ہوئے کپڑے کے استعمال تک محدود کرتا تھا۔ اور تیسرا عہد جو درحقیقت شوقین لوگوں کی آسانی کے لیے تیار کیا گیا تھا اس کی رو سے بیرونی سوت سے ہندستانی ملوں کے بنے ہوئے کپڑوں کے استعمال کی اجازت تھی۔ گاندھی جی کو واقعتاً عہدنامہ کی اس تیسری شق کی معقولیت میں شک تھا کیوں کہ انہیں اس کا پورا یقین تھا کہ بدیسی سوت سے بنے ہوئے کپڑے ضرور بیرونی کپڑے سمجھے جائیں گے۔ عہدناموں پر دستخط حاصل کرنے کا کام خوب چلتا رہا اور یہ پہلے اس غرض سے تھا کہ اس تحریک کو مستحکم کیا جائے جو ۷ اپریل کو وجود میں لائی گئی تھی کیوں کہ گاندھی جی نے اپنی سودیشی سبھا کی تنظیم کو اس وقت سے ضروری سمجھا تھا جب وہ بمبئی میں اپنی جدوجہد کی التوا کے بعد ستیہ گرہ کے اعتقاد کے سلسلے میں روحانی تربیت دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

ایک دفعہ سودیشی تحریک کے راستہ پر گامزن ہونے کے بعد گاندھی جی کو اس معاملے کی گہرائی تک پہنچنے میں دیر نہ لگی۔ اب انہیں اس کا وقت اور موقعہ ملا کہ اس سوال کے حل کرنے کے لیے جسے وہ ہندستان کا اہم ترین اقتصادی جزو سمجھتے تھے اپنے دماغ کو یکسو کریں عوام کے غیظ وغضب اور برطانوی اسلحہ کی طاقت کی وجہ سے جب انہیں اپنی ستیہ آگرہ کی جدوجہد سے پیچھے ہٹ جانا پڑا تو انہوں نے فوراً اپنی تسکین اس وعظ میں ڈھونڈی اور اب کی دفعہ ہمیشہ سے زیادہ شدومد کے ساتھ کہنے لگے کہ ہم نے ایک قوم کی حیثیت سے لنکا شائر کے سامانوں کا خرید نا جس وقت بھی بند کر دیا اسی وقت ہندستان میں برطانوی طاقت کو نابود سمجھو۔ کیوں کہ انہیں یقین تھا کہ برطانیہ نے لنکا شائر کے سامانوں کے لیے ایک مناسب بازار پیدا کرنے کی غرض سے ہندستان میں سیاسی غلبہ حاصل کیا ہے۔ اس لیے ہمیں ان مالوں کا خرید نا بند کر دینا ہے جنہوں نے ہماری پھولتی پھلتی کاتنے اور بننے کی صنعتوں کو برباد کر دیا ہے۔ تاکہ اس عمل سے ہم برطانوی دکانداروں کو اپنے اوپر حکومت کرنے کے امداد سے محروم کر دیں۔ تاہم اس پر انھوں نے برطانوی مال کے مقاطعہ کی صاف صاف ہدایت نہیں کی کیونکہ اگر ہم نے صرف برطانوی کپڑے ترک کر دیئے تو کوئی دوسرا ملک مثلاً جاپان یا امریکہ والے اس کے بجائے اپنے مالوں کی بھرمار کر سکتے ہیں اور اس کو حیلہ بنا کر برطانیہ کی جگہ اپنا اقتدار قائم کر سکتے ہیں۔ پس گاندھی جی نے ہم کو سخت تاکید کی کہ ہم تمام بدیسی کپڑوں کی

روگردانی کریں اور صرف ہندستانی سوت کے بنے ہوئے ہندستانی کپڑے پہنیں۔ اور انھوں نے پیشین گوئی کی۔ جیسا کہ آج بھی وہ کرتے ہیں کہ اس ملک کے باشندے وہ تمام کپڑے جو اُن کو درکار ہیں خود بنانے اور پہننے لگیں تو ان کو حقیقی سوراج حاصل ہو جائے گا۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ بیان بھی اعتراضات کی زد سے نہ بچ سکا۔ رولٹ ایکٹ کی ہلچل بہت سے مسٹر سوبانی جیسے مالکانِ مل کو ان کے متبعین کی صف میں کھینچ ہی چکی تھی اور جب انھوں نے اپنے سودیشی مسلک کی تبلیغ شروع کی تو بہتیرے اس سے بھی زیادہ پرجوش جذبے کے ساتھ ان کے گرد جمع ہونے لگے۔ جہاں یہ لوگ ایک جماعت کی حیثیت سے نئی تبلیغ کے زیر اثر اپنے مالوں کو زیادہ اچھا بیچنے کی امید رکھتے تھے وہیں مسٹر سوبانی جیسا آدمی بھی تھا جس نے گاندھی جی کو صحیح صورت حال سے آشنا کرایا۔ انھوں نے صاف صاف یہ کہہ دیا کہ ان کی یہ تبلیغ صرف ہندستانی مالوں کے لیے ایک اچھا بازار فراہم کرے گی اور ان کی قیمتوں میں بہت ترقی کا باعث ہوگی اور آخر کار اس طرح ہندستانی مالکان مل کی تجوریوں کو بھر دے گی ہندستان کے بنے ہوئے کپڑوں کے علاوہ ہندستان .... مالیت کے کپڑے سالانہ صرف کرتا ہے اور سودیشی کپڑوں کے لیے چیخ پکار درحقیقت بے معنی ثابت ہوگی۔ اگر اس کے ساتھ ساتھ کپڑوں کی ایک ایسی کافی مقدار کی تیاری نہ ہو جو بدیسی کپڑوں کی قایم مقام ہو سکے

لہٰذا مسٹر گاندھی نے ہندستان میں کپڑوں کی تیاری میں اضافہ کی راہیں تلاش کرنی شروع کیں قدرتاً انھیں پہلے ہندستان کے کاتنے والے کارخانوں کے سوت کو بننے کے لیے ایک بڑے پیمانے پر دستی راچھے جاری کرنے کا خیال آیا۔ یہ یاد رہے کہ انھوں نے اپنے آشرم میں ۱۹۱۵ء ہی سے دستی راچھے نصب کر رکھے تھے اور اپنے بہت سے ساتھیوں کو پارچہ بافی میں ماہر کر دیا تھا۔ پھر انھیں معلوم ہوا کہ "کامل سودیشی" کی راہ میں جیسا انھوں نے غور کیا تھا کوئی درمیانی قیام گاہ نہیں تھی۔ آشرم میں ان کے تجربہ نے انھیں یقین دلا دیا تھا کہ ہندستانی سوت کاتنے والے کارخانے اپنی ضرورت سے اتنا زیادہ سوت نہیں تیار کر سکتے جتنا دستی راچھوں کے ذریعے وسیع پیمانے پر بنا جا سکتا ہے۔ اگر سب نہیں تو زیادہ تر دیسی راچھے جو ہندستان میں کام کرنے والے ہیں۔ ولایتی سوت استعمال کرتے ہیں جو ان کے لیے ناقابل قبول تھا۔ اس لیے ملک کے تمام طول و عرض میں قدیم چرخوں کے استعمال کو از سر نو زندہ کرنے پر انھوں نے اپنے کو مجبور محسوس کیا۔ اور اس طرح ہندستان میں کافی مقدار میں سوت اور کپڑا پیدا کرنے کی مشکلات اور ہندستان کے دیہاتوں میں رہنے والے ہزاروں کی مفلسی اور نیم مفلسی کے علاج کی دقتوں کو حل کرنا چاہا۔

یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ اس تجربے کی وجہ سے جو کپڑے کی تیاری کے سلسلے میں وہ اپنے آشرم میں کر رہے تھے۔ انھوں نے اس ناگہانی واقعہ کے لیے اپنے آپ کو پوری طور پر تیار پایا۔ مختلف مدارج جن کی وجہ سے انھوں نے چرخے کی طرف توجہ کرنی ضروری سمجھی اُن کا بیان انھوں نے وضاحت کے ساتھ کیا ہے۔ اپنی کتاب "ہند سوراج" میں جو ۱۹۰۸ء میں شائع ہوئی تھی، وہ کس بھولے پن سے اعتراف کرتے ہیں کہ جب انھوں نے ہندستان کے روز افزوں افلاس کے لیے راچھ یا چرخہ کو اکسیر اعظم بتایا تھا انھوں نے کوئی دستی راچھ یا چرخہ نہیں دیکھا تھا۔ اور یہ کافی اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے احمد آباد میں اپنے آشرم کے اندر پہلا دستی راچھ ابتداً صرف عورتوں اور مردوں کی ایک ایسی بستی پیدا کرنے کے لیے لگایا تھا جو صرف کھانے پر رہتے اور اپنے ہاتھوں کے بُنے ہوئے کپڑے پہنتے اور جو اس طرح ایک خود کفیل سوسائٹی کے لیے ایک عمدہ نمونہ ہوتے جو گاندھی جی کو بہت محبوب تھی وہ کہتے ہیں کہ جو مدعا ہم نے اپنے سامنے رکھا تھا وہ یہ تھا کہ اپنے آپ کو ہاتھوں کے بنے ہوئے کپڑوں سے ملبوس کرنے کے لائق بنائیں۔ اس لیے اس وقت سے ہم

لوگوں نے ملوں کے بنے ہوئے کپڑے پہنے چھوڑ دیئے اور آشرم کے ممبروں نے صرف ہندستانی "بہت سے اپنے ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑے پہننے کی ٹھان لی۔ بہرحال انھیں ملوں کے سوت حاصل کرنے کی مشکلات سے فوراً دوچار ہونا پڑا اس کے علاوہ ان کو یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ اس نئے مسلک پر کاربند ہوکر وہ اور ان کے ساتھی اپنے آپ کو اچھا خاصہ ہدف تضحیک بنا رہے تھے اس لیے کہ انہوں نے خود ہی اپنے کو ہندستانی سوت کاتنے والی ملوں کا ایجنٹ بنا لیا تھا۔ اس طرح معاملات کو جاری رکھتے ہوئے اپنے آشرم میں بھی چرخے کے متعلق ان کو یہ یقین ہوچکا تھا کہ سودیشی پروگرام کو چلانے کے لیے یہ ایک ناگزیر ہتھیار ہے۔ اور ایک خلیق اور مستعد خاتون کچھ چرخے بہم پہنچا کر اُن کی مدد کر ہی چکی تھیں جو دور افتادہ دیہاتوں میں بھیجے جا چکے تھے۔ اس طرح مسٹر گاندھی چرخے کے متعلق ایک تجرباتی مرحلے پر اپنے آشرم ہی میں اس وقت پہنچ چکے تھے جب کہ سودیشی سبھا کو انہوں نے اپنے چرخے کے عجیب مسلک کا ذریعہ اشتہار بنایا تھا اس لیے یہ بالکل نمایاں ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ پھر اُن نوجوانوں کے سیاسی جوش و خروش کو جو اس مدت میں ان سے متعلق ہو چکے تھے اپنی قدیم" خود کفیل "سوسائٹی کے تخیل (آئیڈیل) کی خدمت پر آمادہ کرنا چاہا۔ جیسا کہ انہوں نے "ہند سوراج" میں بیان کیا ہے۔ اور پھر اسے اپنے پیروؤں کی نگاہوں میں دلکش بنانے کے لیے انہوں نے ہلکی نقاب کے طور پر منطقیانہ اور انسان پرستانہ دلائل استعمال کیے، جیسا کہ آج بھی وہ کرتے رہتے ہیں۔

پھر بھی اس وقت ہمیں یہ ایسا عجیب اور دلکش معلوم ہوتا تھا گویا یہ کوئی نئی چیز تھی اور بعض پاک عقیدت مندوں کو تو اس کے اندر غیر محدود امکانات نظر آ رہے تھے بہت سی شوقین معزز خواتین کسی ماہر پارچہ باف سے بنائی کا کام سیکھنے کے لیے گاندھی جی کے کاشانے کے گرد جمع ہونے لگیں ہم لوگوں نے بھی احمد آباد میں ایک شاخ کھولی۔ اور شاید میں تمام سیاسی کارکنوں میں پہلا شخص تھا جس نے ۱۹۱۹ء کی خزاں میں بننا سیکھ لیا۔ یہ بہت مشکل اور تھکانے والا کام تھا، پھر بھی میں نے یہ محسوس کیا کہ اگر اس کام میں مہارت نہ حاصل کی تو بدعقیدگی کا مجرم ٹھہروں گا۔ یہ محتاج بیان نہیں کہ زیادہ تر سوت جو اس وقت کاتا جاتا تھا۔ کوئی چیز بننے کے لیے بالکل بیکار ہوتا تھا۔ اور نہ کمزور تاگے کو سنبھالنے کے لیے جیسا کہ اس وقت کاتا جاتا تھا، کافی بننے والے دستیاب ہوتے تھے لہٰذا زیادہ تر تاگا جو چرخے پر کاتا جاتا ضائع ہو جایا کرتا۔ اگرچہ گاندھی جی کے آشرم اور مرکزی دیہاتوں میں چرخے پر تجربات جاری تھے لیکن سیاسی کارکن فوراً بعد ہی خلافت کے ہنگاموں اور کانگریس کے سالانہ جلسے کی شورشوں کی طرف جو امرتسر میں ۱۹۱۹ء کے بڑے دنوں کے ہفتے میں منعقد ہونے والا تھا بے تحاشا ٹوٹ پڑے اور ہم سودیشی سبھا کی باقاعدہ تجہیز و تکفین بھی بھول گئے جسے گاندھی جی نے پنجاب کے مظالم کے فیصلہ کن تفتیش کے لیے روانہ ہونے سے پہلے اپنے آپ کو برسر عمل رکھنے کی غرض سے جاری کی تھی۔ یہ کافی تعجب کی بات ہے کہ گاندھی جی اپنی سوانح حیات میں اپنے بچے کی موت کا تذکرہ بھی بھول گئے جو قبل از وقت مر گیا تھا۔

اکیسواں باب

آخر کار پنجاب میں

جب مسٹر گاندھی اپنی چرخے کی تبلیغ میں کوشاں تھے اور پنجاب کی مارشل لائی پنچائت کے ظالمانہ احکام سزا پر شدید فکر میں مبتلا

تھے، گورنمنٹ نے لارڈ ہنٹر کے زیر صدارت ایک کمیٹی متعین کی جو افسران اور چند اعتدال پسند غیر سرکاری ارکان مشتمل تھی اس نے پنجاب کی واردات کی آزادانہ تفتیش شروع کی - یہ محتاج بیان نہیں کہ ہندستان کے قوم پرست اخباروں نے کمیٹی کے اس تعین کا تلخ تنقیدوں سے استقبال کیا. کیوں کہ کمیٹی کے سامنے پیش کردہ حوالوں کی شرائط اور اس کی ہیئت ترکیبی کو بالکل غیر اطمینان بخش اور امید شکن سمجھا گیا - آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو جو گورنمنٹ کے اعلان پر غور کرنے کے لیے طلب کی ہنٹر کمیٹی کی روئداد کو بالکل بائیکاٹ کر دینے کا فیصلہ کرنے میں کوئی دقت نہ محسوس ہوئی "ہنٹر کمیٹی کے بائیکاٹ کے منطقی نتیجے کے طور پر قریب قریب بالکل اسی کے متوازی تفتیش جاری کرنے کے لیے ایک غیر سرکاری کمیٹی کے تقرری کا فیصلہ کر دیا گیا - پنڈت موتی لال نہرو، دیش بندھو آنجہانی، مسٹر عباس طیب جی، مسٹر ایم - آر جیکار اور اینجانب (گاندھی جی) اس کمیٹی کے رکن متعین کیے گیے "

ویسا ہی ہوا جیسا کہ ہونا چاہئے تھا، قارئین کو بہر حال تعجب ہوگا کہ اگرچہ کانگریس نے ہنٹر کمیٹی کا مقاطعہ کر رکھا تھا نیز یہ کہ گاندھی جی ایک غیر سرکاری کانگریس کمیٹی کے صدر مقرر کیے جا چکے تھے. تاہم انہیں بمبئی احمد آباد اور گجرات کے واقعات کے متعلق ہنٹر کمیٹی کے سامنے شہادتیں پیش کرنے میں کوئی تامل نہ ہوا مقاطعہ کی تجویز کو درحقیقت بہت ہوشیاری سے الفاظ کا جامہ پہنایا گیا تھا، تاکہ اس کا دائرۂ عمل پنجاب تک محدود رہے - لہٰذا ہنٹر کمیٹی سے تعاون کے غیر معمولی فعل کے متعلق گاندھی جی کو خود کو تسلی دینے اور دوسروں کو مطمئن کرنے کے لیے زیادہ کاری گری کی ضرورت نہ پڑی - انہوں نے تو یہاں تک کیا کہ ہنٹر کمیٹی کے ساتھ پنجاب میں تعاون کرنے اور دوسرے صوبوں میں تعاون کرنے میں ایک عجیب فرق پیدا کر دیا کیونکہ انہیں جہاں یہ یقین تھا کہ پنجاب کے مظالم کے معاملے میں سیاسی کارکنوں کی حیثیت سے شہادتیں پیش کرنا خود اپنے کو اور قوم کو ذلیل کرنا ہے وہیں انہوں نے کمیٹی کے سامنے گجرات اور پنجاب کے سارے دیکھے ہوئے اور سنے ہوئے واقعات کے متعلق نجی حیثیت سے شہادت پیش کرنے کا مطالبہ محسوس کیا - یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس معاملہ میں وہ ایک مجرم ضمیر کے حامل تھے - کیوں کہ بمبئی اور گجرات کے واقعات کی تقریباً" ان تمام ذمہ داریوں کو اپنے کندھوں پر رکھے میں انہیں قطعاً" پس و پیش نہ تھا جن کے درمیان انہوں نے اپنے کو مضبوطی سے گھیر رکھا تھا - اس لیے اس پنچائت کے سامنے جسے گورنمنٹ نے حقیقتاً" محض اس لیے مقرر کیا تھا کہ سرکاری آدمیوں کی چیرہ دستیوں کے سیاہ داغوں پر سفیدی پھیر دی جائے گاندھی جی اپنی اخلاقی ذمہ داری کے برملا اظہار کے لیے تڑپ رہے تھے۔

جس وقت گاندھی جی اپنے سنجیدہ اور نپے تلے لہجے میں ۱۹۱۹ء کے یادگار ہفتے کی کہانی سنا رہے تھے ہاتھی سنگھ وادی کا مختصر ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا - لارڈ ہنٹر بہت خلیق اور شائستہ آدمی تھے دوسرے سرکاری اور غیر سرکاری برطانوی ارکان نے گجرات کے بلووں کے متعلق ان کی ذمہ داری پر اُن سے گہرے سوالات کیے لیکن سر چمن لال سیتلواد بھی اعتدال پسند جماعت کے ایک رکن تھے اور اس وقت بھی گاندھی جی کے اس نئے مسلک (سول نافرمانی) کے سخت مخالف تھے سوالات کے سلسلہ میں لب و لہجہ کی درشتی اور خشونت کے لحاظ سے وہ اپنے تمام رفقائے کار سے بہت بڑھے چڑھے تھے - مسٹر گاندھی نے اپنے ایک دوست سے جو احمد آباد کے اصلی باشندے تھے بہت دلچسپ بحث کی - اور ماننا پڑے گا کہ اس مباحثے میں کامیابی کا سہرا گاندھی جی ہی کے سر رہا - اس سلسلہ میں سامعین نے کئی مرتبہ بڑے جوش و خروش سے تالیاں بجا کر انہیں خراج تحسین بھی پیش کیا -

اس مباحثہ کے سلسلہ میں دو ایک نکتے یاد رکھنے کے قابل ہیں مسٹر چمن لال گاندھی جی پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ چوں کہ سول نافرمانی کا پروگرام بلند اخلاقی اصول پر مبنی ہے لہٰذا اسے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کے ذریعے

عمل میں لایا جا سکتا ہے اور ملک کے لاکھوں جاہل اور غیر تعلیم یافتہ لوگوں کو ستیہ گرہ کے خطرناک راستے پر لانا گاندھی جی کی فاش غلطی تھی۔ لیکن مسٹر گاندھی نے اپنے ممتاز مقابل کا سارا پانسا یہ کہہ کر پلٹ دیا کہ جنوبی افریقہ کی ستیہ گرہ کی جدوجہد کے زمانے میں ملک کے مزدور طبقہ اور غیر تعلیم یافتہ خوانچہ والوں اور تاجروں میں سے ہزاروں مردوں اور عورتوں نے کتنی عالی ظرفی بہادری اور خوشی سے کیسی کیسی سختیاں برداشت کی تھیں۔ سر چمن لال نے سوال کیا کہ کیا "خفگی اور بدلی کے بغیر شدائد کی برداشت کے لیے اعلیٰ درجہ کی درویشانہ اور روحانی تربیت ضروری نہیں ہے" فوراً جواب دیتے ہوئے گاندھی جی نے کہا۔ "سر چمن لال! ہر عورت مصیبت اٹھاتی ہے لیکن ہر عورت درویش نہیں ہوتی"۔

جب گاندھی جی نے ستمبر ۱۹۱۹ء کے شروع میں اپنا ہفتہ واری اخبار جاری کیا تو گورنمنٹ نے اپنی پوزیشن کو استوار کرنے کے لیے اور آگے قدم بڑھائے پولیس اور فوجی افسروں نے پنجاب اور گجرات کے بلووں میں جو جو مظالم کیے تھے اُن کے متعلق انہیں ہر قسم کی قانونی ذمہ داری سے بری کرنے کے لیے ہوم ممبر نے لیجسلیٹو کونسل میں تلافی نقصان کا ایک بل پیش کیا۔ ایسا بل اگرچہ آزاد ممالک میں کوئی نامناسب چیز نہیں سمجھی جاتی مگر میرے لیے ایک ہتکلیف دہ تعجب کا باعث ہوا۔ میں نے خیال کیا کہ گورنمنٹ نے یہ بل واقعی سرکاری ذمہ داریوں کے اس معاملے میں جانب داری اور قبل از وقت رائے قایم کرنے کی غرض سے بنایا تھا جو رسمی تفتیش کے لیے ہنٹر کمیٹی کے سپرد کیا گیا تھا۔ لہٰذا "نوجیون" کے سب اڈیٹر کی حیثیت سے میں نے اس معاملے پر گاندھی جی سے بحث شروع کی۔ لیکن مجھے اور بھی تکلیف دہ تعجب ہوا جب میں نے دیکھا کہ گاندھی جی میرے دلائل کا کوئی اثر قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اپنی جگہ انہیں پورا یقین تھا کہ گورنمنٹ ایسے بل کے جاری کرنے میں بالکل حق بجانب تھی اور یہ کہ ایسا قانون پاس کرنے سے لازم نہیں آتا کہ گورنمنٹ کسی افسر کے خلاف جس نے عمداً کوئی ظالمانہ حرکت کی ہو کوئی قانونی یا تادیبی اقدام نہ کر سکے۔ اور جو چیز میرے لیے اس سے بھی زیادہ تعجب خیز تھی وہ گاندھی جی کی سرد مہری اور ہٹ دھرمی تھی جس کی بنا پر وہ بغیر کوئی اخلاقی یا قانونی دلیل پیش کیے جمے ہوئے تھے۔

لہٰذا اس معاملے میں ان کے دلائل سے غیر مطمئن ہو کر اپنے قانون داں دوستوں سے مشورہ لینے کے لیے میں نے ان سے بمبئی جانے کی اجازت چاہی۔ اصلیت تو یہ ہے کہ انھوں نے اس خیال ہی کو پسند نہ فرمایا اس وقت مجھے پتہ چلا کہ گاندھی جی معقولیت سے زیادہ عقیدت کی روشنی میں مجھ سے قدم بڑھانے کے طالب تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں تقریباً بالکل بے چون و چرا ان پر اعتماد کروں۔ جب وہ روزانہ صبح مجھ سے کچھ نہ کچھ لکھواتے تھے وہ بولتے تھے میں لکھتا جاتا تھا وہ چاہتے تھے کہ اس طرح میں انکے طرزِ تحریر کی نقل کرنے کی مشق حاصل کروں میری طبیعت نے اس زبردستی کے خلاف بغاوت کی کیوں کہ ابھی تک میرا یہ خیال تھا کہ وہ ہر قسم کی اختلاف رائے کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتے ہیں اور اپنے مخالف کو معقول دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب میں ایک سیاسی پیرو یا ان کے اخبار کے سب اڈیٹر کی حیثیت سے اُن کے ماتحت کام کرنے پر رضامند ہوا تھا تو میرے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اُن کے ہر لفظ اور ہر خیال کی مجھے ہمنوائی کرنی پڑے گی۔

پھر بھی اپنے قانون داں دوستوں سے "تلافی نقصان" کے بل پر مشورہ لینے کے لیے میں بمبئی چل دیا۔ اُن میں سے بہتوں نے تسلیم کیا کہ یہ بل اتنا غیر مضر نہیں جتنا گاندھی جی نے سمجھ رکھا ہے اور مختلف وجوہ کی بنا پر اس کی سخت مخالفت کی جا سکتی ہے ان مشوروں سے مضبوط ہو کر میں نے اسے گاندھی جی کے غور کے لیے پیش کیا۔ لیکن سارا جواب جو مجھے ملا یہ تھا کہ ایسی بحث و تمحیص کے لیے تمہیں بمبئی جانے کی زحمت گوارا کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اب اس وقت سے زیادہ مجھ پر یہ روشن ہو گیا کہ دل کی سادی عقیدت ان کے نزدیک عقل کی آزادی سے کہیں زیادہ قابل قدر ہے اور یہ کہ استدلالی قوتوں اور فیصلوں کو متاثر کرنے کے مقابلے میں وہ اپنے متبعین اور سارے ملک والوں پر ان کے احساسات کو چھیڑنے اور اُن کے دلوں میں عقیدتمندی

کی آگ روشن کرنے کے حکومت کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

آخر کار گاندھی جی کو ۱۷ اکتوبر کے بعد پنجاب جانے کی اجازت مل گئی جس کے وہ بہت دنوں سے متمنی تھے۔ لہٰذا اُن کی سیاسی سرگرمیوں میں جو تعطل پیدا ہو گیا تھا اس کا ایک بار پھر خاتمہ ہو گیا۔ شمال کی جانب اُن کا سفر ایک مرتبہ پھر ایک دراز تر اور سخت تر دور شورش کی ابتدا ثابت ہوا جس کی انتہا درحقیقت ۱۹۲۲ء میں ان کے یرواڈا جیل جانے کے ساتھ ہوئی۔

گاندھی جی گذشتہ دو مہینے تک اخباروں کی تبلیغی روشنی میں چمکنے کے بعد چھ مہینے تک یعنی ۱۳ اپریل سے لے کر، جب کہ انہوں نے اپنی تحریک ملتوی کی، اکتوبر کے آخر تک، جب وہ لاہور کے لیے روانہ ہوئے اپنے سفر کا وقت ہی مقرر کرتے رہے۔ اور پھر بھی ان کی ہر دلعزیزی کم نہ ہوئی تھی۔ واقعی پنجاب کے مارشل لائی نظام کے خلاف اُن کی پرزور اخباری تبلیغ نے (اگر اس کا کچھ حقیقی وجود تھا) پنجاب کے نیک لوگوں کے دلوں میں ان کی جگہ اور بھی زیادہ کر دی تھی۔ لہٰذا کچھ تعجب نہیں اگر لاہور میں ان کا داخلہ فاتحانہ شان سے ہوا۔ جب سیکنڈ کلاس سے نکل کر انہوں نے پلیٹ فارم پر قدم رکھا تو وہ لکھتے ہیں کہ "اپنے لاہور پہنچنے کا نظارہ جو میں نے دیکھا کبھی میری یاد سے محو نہ ہو سکا۔ ریلوے اسٹیشن پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک انسانوں کا ایک بے پایاں ہجوم تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ساری کی ساری آبادی کسی مدت کے بچھڑے ہوئے قریبی رشتہ دار سے ملنے کے لیے انتہائی اشتیاق میں گھر سے باہر نکل پڑی تھی اور خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتی تھی۔"

چوں کہ پنجاب کے بیشتر لیڈر جیل میں تھے مسٹر گاندھی نے پنڈت مالویا، پنڈت موتی لال اور سوامی سارو دھانند جی کے گہرے مشوروں کے بعد کانگریس سب کمیٹی کی طرف سے تفتیش کا کام فوراً شروع کر دیا۔ یہ درحقیقت پہلا موقع تھا کہ گاندھی جی کو ان قومی لیڈروں کے ساتھ آئے دن کے سیاسی کاموں میں مشغول ہونا پڑا۔ تفتیشی کمیٹی نے پہلی مرتبہ گاندھی جی کا دو بڑے ثابت قدم لیڈروں سی آر داس آنجہانی اور ایم آر جیکار کے ساتھ گہرا تعلق پیدا کر دیا۔ انہوں نے فطرتاً ان دونوں بڑے لیڈروں کے ذاتی مزاج اور ان کی امکانی طاقتوں کا مطالعہ بہت ہوشیاری سے کر لیا۔ اور واقعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ آئے، انہوں نے دیکھا اور وہ فتح مند رہے۔ کیوں کہ ستیہ گرہ کی تحریک کی لیڈری نے پہلے ہی سے ان کو ایسی زبردست سیاسی اہمیت دے رکھی تھی کہ تفتیش کے شروع ہونے کے ساتھ ہی انہیں تحکمانہ طاقتیں مل گئی تھیں۔ اگرچہ اس اہمیت کی ذمہ داری اُن کی کمزور کانگریسی سیاست کی کارگذاریوں سے اس وقت تک وابستہ نہ تھی۔

وہ لکھتے ہیں کہ "کمیٹی کے کاموں کی تنظیم میرے سپرد ہوئی اور چونکہ بیشتر مقامات پر تفتیش کرنا میرے ہی حصہ میں پڑا اس لیے پنجاب کے اور وہاں کے دیہاتوں کے لوگوں کے مطالعہ کا ایک نادر موقع میرے ہاتھ آ گیا اور رپورٹ تیار کرنا بھی میرے ہی سپرد کیا گیا۔" اس طرح مسٹر گاندھی نے شہادتوں کا بہت بڑا ذخیرہ ہی جمع نہیں کیا بلکہ وہ رپورٹ بھی مرتب کر لی جو ہندستانی قوم پرستی کی تاریخ میں آنے والی نسلوں تک ایک انتہائی تکلیف دہ تاہم انتہائی شاندار دستاویز کی صورت میں پہنچے گی۔

بائیسواں باب

خلافت کی خدمت میں

مسٹر گاندھی نے مارشل لائی نظام کی تفتیش ابھی شروع بھی نہیں کی تھی کہ خلافت کے مسئلے پر غور کرنے کے لیے ہندو مسلم متحدہ کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ ملا، یہ کانفرنس نومبر ۱۹۱۹ء کے شروع میں دہلی میں منعقد ہونے والی تھی۔ دعوتی رقعہ حکیم اجمل خاں مرحوم اور سر آصف علی کے متفقہ دستخطوں سے بھیجا گیا تھا۔ سوامی شار دھانندجی آنجہانی جنھوں نے سرخ اتوار (رڈسنڈے) کے دن نہایت قابلیت سے نمایاں طور پر کام کیا تھا، اس کانفرنس کے نائب صدر مقرر کیے گئے تھے۔ کانفرنس کے سامنے صرف خلافت کے معاملے میں حکومت کے غدارانہ برتاؤ ہی کا مسئلہ نہ تھا۔ بلکہ یہ سوال بھی تھا کہ ہندستان جشن فتح مندی منانے میں شرکت کرے یا نہ کرے۔ دعوت نامے میں منجملہ اور چیزوں کے یہ بھی تھا کہ تحفظ گاؤ کے مسئلے پر بھی اچھی طرح بحث ہوگی لہٰذا گاؤکشی کا قضیہ طے کرنے کے لیے کانفرنس ایک زریں موقع پیش کرے گی۔

کانفرنس کے مباحثے کے بیان سے قبل جن میں گاندھی جی نے پہلے پہل گورنمنٹ کے خلاف اپنے پُرامن ترک موالات کے تاریخی منصوبے بے نقاب کیے ہمیں مسئلہ خلافت کے نفس مضمون پر غور کرنا ہے۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ ۱۹۱۸ء کے گرما میں گاندھی جی نے وائسرائے کو ایک خط لکھا تھا جس میں انھوں نے مسلمانوں کے مقدس مقامات کے متعلق مسلم ریاستوں کے حقوق اور اسلامی جذبات کے چبھتے ہوئے حوالے دئے تھے۔ اس کے بعد جنگ بھی ختم ہو چکی تھی اور صلح نامہ ورسلیز پر قریب قریب دستخط بھی ثبت ہو چکے تھے، حکومت برطانیہ نے عراق اور فلسطین کے انتظام کرنے کا جہاں کی کثیر آبادی بیشتر مسلمانوں پر مشتمل ہے ایک رسمی حکمنامہ حاصل کر لیا تھا۔ اور حجاز کے تخت پر جہاں مکہ اور مدینہ جیسے مقدس شہر واقع ہیں۔ ایک اپنا ساختہ پرداختہ بادشاہ بھی بٹھا دیا تھا پھر یہ کہ سلاطین ترکیہ صرف قدیم ترکی ہی کے حکمران نہیں تھے۔ جس میں عراق عرب اور میسوپٹامیہ بھی شامل تھی بلکہ روئے زمین پر پھیلے ہوئے تمام مسلمانوں نے انھیں اپنا خلیفہ تسلیم کیا تھا اور گذشتہ چار صدیوں سے وہ اسلام کے محافظ سمجھے جاتے تھے پھر بھی پرانی ترکی قلمرو کے ٹکڑے کر کے تین بڑے حصوں پہ اہل برطانیہ نے صرف قبضہ ہی نہیں کیا بلکہ خود سلطان کو جس نے جنگ عظیم میں قیصر جرمن کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کر دی تھی۔ اس کے قسطنطنیہ کے محل میں ان فاتحین نے ایک بیکس قیدی کی طرح گرفتار کر لیا۔ الغرض ان تین صوبوں کو جو اسلامی دنیا کے لیے اس قدر متبرک تھے برطانیہ نے چھین لیا اور بوڑھے سلطان کا سیاسی اور مذہبی اقتدار ختم کر دیا۔ یہی وہ اسباب تھے جن سے خلافت کا مسئلہ پیدا ہوا اور جس کے خلاف ہندستان کے مسلمانوں نے شورش خلافت کا علم بلند کیا۔

بہر حال اس موقع پر اس کا تذکرہ بھی موزوں ہوگا کہ برطانوی قبضہ سے متاثر ریاستوں نے اس مسئلے کے ساتھ کیا رویہ ظاہر کیا۔ وہابی تحریک عرب کے ریگستانوں میں آتش صحرا کی مانند پھیل چکی تھی۔ اور دوران جنگ میں وہابی بادشاہ ابن سعود کو برطانوی

حکمت علی نے بھاری بھاری رشوتیں دے کر روک رکھا تھا، بہر حال صلح کے بعد جوں ہی یہ رشوت بند کی گئی ابن سعود نے حجاز کے اس ساختہ پرداختہ بادشاہ کے خلاف اپنا آتشیں علم بلند کردیا اور یہ تکہ میں اپنے بے بنیاد تخت پر کانپنے لگا۔ مسوپٹامیہ میں برطانوی انتظام کے خلاف اہل عرب پھر بغاوت کر بیٹھے امیر فیصل کو فرانسیسیوں نے فوراً ٹھوکر مار کر شام کی حکومت سے برطرف کر دیا مگر انہیں برطانوی محسنوں نے بغداد کے تخت پر جگہ دے دی۔ یہودی کثیر تعداد میں فلسطین کے اندر برطانوی سنگینوں کی حفاظت میں جمع کیے جا رہے تھے وراس کی مخالفت میں عربوں کی تحریک پھر سے زندہ ہو رہی تھی۔ اگرچہ یہ نا قابل اختلاف ہے کہ ان ہنگاموں کے پیچھے مذہبی مقاصد کارفرما تھے لیکن یہ تمام شورشیں ہر اعتبار سے سیاسی کہی جا سکتی تھیں۔ یہ صرف اس لیے برپا کی گئی تھیں کہ عرب میں ایسی چھوٹی چھوٹی جمہوریتیں قائم کی جائیں جو بیرونی اثر سے قطعاً آزاد ہوں۔ اور ان شورشوں میں سے کوئی بھی اس جوش میں نہیں تھی کہ قدیم ترکی سلطنت کے ان سرحدی صوبوں پر قسطنطنیہ کا اقتدار واپس لایا جائے۔

لہٰذا جہاں عرب والے مسئلہ خلافت کے معاملے میں غیر جانب دار کہے جا سکتے تھے وہیں ترک مصطفےٰ کمال کی لیڈری میں آہستہ آہستہ اناطولیہ کی پہاڑیوں میں ابھر رہے تھے جو صرف برطانویوں کو باسفورس کے دونوں کناروں سے نکال دینے ہی پر نہیں تلے تھے بلکہ بوڑھے سلطان کے نیم مذہبی اور نیم سیاسی۔ ناقص اور فرسودہ اقتدار کے آثار کو بھی یک قلم ختم کر دینے کا تہیہ کر چکے تھے وہ درحقیقت بالکل دنیاوی طریقہ کی ایک جمہوریت قایم کرنے میں سرگرم تھے۔ جیسا کہ انھوں نے چند سالوں کے اندر کر دکھایا اور ایسے تمام رجعت پسندانہ رواجوں کو فنا کر دینے پر آمادہ تھے جیسے عورتوں کا پردہ اور ان کی خانہ نشینی جن کے سبب سے ترک موجودہ ترقی کی تگ و تاز میں پیچھے رہ گئے تھے۔ تعجب کی بات معلوم ہوگی کہ ترکی سلطنت کے اصل سپاہی اور شہری تو اہل برطانیہ کے اقتدار کے خلاف بلکہ اتنا ہی اپنے سلطان کے خلاف بھی بدحواسی سے لڑ رہے تھے اور ہندستانی مسلمانوں نے "شاخ زریں" پر پھر خلیفہ کا اقتدار قائم کرنے کے لیے ایک عجیب و غریب شورش برپا کر رکھی تھی اس بیان کا اضافہ کرنا بھی ناموزوں نہ ہوگا کہ نہ مصر کے سنی عربوں نے شورش خلافت میں کسی موقعہ پر اور کسی صورت میں اپنی دلچسپی ظاہر کی نہ فارس کے شیعوں نے"۔

لیکن خلافت کانفرنس جو نومبر ۱۹۱۹ء کے شروع میں دہلی میں منعقد ہوئی اس نے ان واقعات پر نہ غور کیا اور نہ اُن واقعات کی پروا کی جو انہیں ممالک میں رونما ہو رہے تھے جن کے متعلق یہ لوگ اتنی دلچسپی لے رہے تھے "صاف روشن ہے کہ کسی نے یہ معلوم کرنے کی زحمت نہ اٹھائی کہ آیا کسی مسلم سرزمین میں ان کی تحریک کے متوازی کوئی اور تحریک بھی ہے یا نہیں۔ علماؤ مولویوں کی شرعی اور نیم شرعی جماعتوں پر مشتمل مسلمان لیڈروں نے با آسانی اس کا یقین کر لیا کہ حکومت برطانیہ نے خلافت کے پاک مقاصد کے ساتھ دغا کی۔ برطانوی حکومت نے واقعی دوران جنگ میں عربوں کی تحفظ کے پکے معاہدہ کی برملا خلاف ورزی کرتے ہوئے بیشتر اسلامی ممالک پر اپنے آہنی قدم جما دیے تھے۔ لیکن حقیقی سیاست ان مجلسوں میں پس پشت ڈال دی گئی تھی اور ان میں اسی نکمے اور ناقص سلطان کے سیاسی اور مذہبی اقتدار کو پھر سے قایم کرنے کا شور مچایا جا رہا تھا جس کے خلاف خود اس کی قدیم رعایا اسی طرح علم بغاوت بلند کر چکی تھی جیسے اس نے برطانیہ کے خلاف کیا تھا۔ ہندو لیڈر جو اس کانفرنس میں مدعو کیے گئے تھے وہ بھی گاندھی جی اور شاردھانند جیسے انسان تھے جن کی سیاست ہمیشہ ایک گہرے مذہبی رنگ سے رنگی ہوئی ہوتی تھی۔ گاندھی جی اپنی ستیہ گرہ کی جد و جہد کی وجہ سے محاربانہ سیاست میں بلند مرتبہ حاصل کر چکے تھے اس نے ان کو اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ اپنے ہندو ساتھیوں کو کانفرنس میں یقین دلادیں کہ ہندستان کے ہندوؤں کا یہ مین فرض ہے کہ خلافت کے سلسلہ میں جو زیادتیاں ہوئی ہیں ان کی تلافی کے لیے وہ اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ ہر جنگ میں دوش بدوش کھڑے ہوں لہٰذا کانفرنس کو اس پر آمادہ کر لیا گیا کہ وہ ایک طوفانی پروپیگنڈا کی مہم شروع کر دے تاکہ خلیفہ کے اقتدار کو از سر نو قایم

کرنے پر گورنمنٹ کو مجبور کیا جاسکے" کانفرنس نے اس سے بھی بڑھ کر یہ طے کیا کہ یوم صلح کے جشن میں (جو ۱۳ نومبر کو ہونے والا تھا) شرکت سے انکار کرتے ہوئے برطانیہ کی غلط سیاست کے خلاف ایک گہری نفرت کا مظاہرہ کیا جائے۔ مسٹر گاندھی لکھتے ہیں کہ "چند گوشوں سے یہ تجویز بھی سنی گئی کہ پنجاب کے مسئلے کو تصفیہ خلافت کے ساتھ منسلک کر دیا جائے" نیز بیان کرتے ہیں کہ "میں نے اس مشورے کی سخت مخالفت کی۔ میں نے کہا کہ پنجاب کا معاملہ ایک مقامی معاملہ ہے جس کا کوئی خاص وزن ہمارے جشن صلح میں شرکت یا عدم شرکت کے فیصلہ پر نہیں پڑ سکتا۔ اگر ہم نے اس مقامی مسئلے کو خلافت کے ساتھ مخلوط کر دیا جو شرائط صلح کا نتیجہ ہے تو ہم ایک بہت بڑی بے اعتیازی کے مجرم ہوں گے" مگر چند مہینے بھی نہیں گزرنے پائے کہ مسٹر گاندھی نے پنجاب اور خلافت کے متفقہ مظالم کے خلاف ملک سے ایک پرامن ترک موالات کی درخواست کر دی۔

تیئسواں باب

ترکِ موالات کی ابتداء

کانفرنس اپنے جنگی پروگرام کے اس اہم ترین مسئلہ پر رد و قدح کرتی رہی کہ اگر حکومت نے خلافت کے مقدس مسئلہ میں جب اندیشہ غداری کی تو کیا طریق کار اختیار کیا جائے گا۔ کانفرنس نے بغیر کسی زحمت کے یہ قرارداد بھی منظور کر لی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اس پر آمادہ کیا جائے کہ وہ سودیشی کپڑوں کے استعمال کا عہد کریں، اسی ضمن میں گویا بدیشی کپڑوں کا مقاطعہ بھی آگیا۔ مشہور اردو شاعر اور سیاست داں جناب حسرت موہانی نے اختلاف کیا۔" ان کا مدعا یہ تھا کہ اگر خلافت کے معاملے میں برطانیہ انصاف نہ کرے تو اس سے انتقام لیا جائے۔ لہٰذا انھوں نے ایک دوسری تجویز پیش کی کہ حتی الامکان خاص برطانوی مال کا مقاطعہ کیا جائے۔ کانفرنس میں ایک مرتبہ پھر برطانوی سامان اور کپڑوں کے مقاطعے کے معاملے میں بحث و نزاع کا بازار گرم ہو گیا ایک طرف حسرت موہانی کی قیادت میں دکن اور بنگال پارٹیوں کا وہ مسلک تھا کہ برطانوی مال کا مقاطعہ کیا جائے اور اس کی علم برداری اس وقت حسرت موہانی کر رہے تھے دوسری جانب گاندھی جی کا پیش کیا ہوا وہ انوکھا مسلک تھا کہ ملک میں ضروری سامان اور کپڑوں کی مصنوعات کو فروغ دینے کے لیے بدیسی مال بالخصوص کپڑوں کا مقاطعہ کیا جائے۔ اس کے متعلق گاندھی جی کے دلائل اب کافی مشہور ہو چکے ہیں۔ برطانیہ کے مظالم اور لوٹ کھسوٹ کی حکمت عملی سے بیزار ہوتے ہوئے بھی وہ برطانوی سامان کے مقاطعہ کی منظوری نہیں دیتے تھے کیونکہ اس تجویز میں برطانیہ والوں سے نفرت کا ایک جذبہ پایا جاتا ہے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ہمارا حربہ جنگ ہمیشہ صاف اور نفرت کے رنگ سے عاری ہونا چاہئے کیونکہ نفرت بھی درحقیقت تشدد ہی کی ایک دوسری صورت ہے۔ انھوں نے محض اس روحانی دلیل ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ برطانوی سامان کے مقاطعہ کو بڑے مزے سے ایک بے اثر اور ناقابل عمل تجویز کہہ کر ختم کر دیا۔

وہ کہتے ہیں کہ "حاضرین نے میری تقریر بہت توجہ سے سُنی اس تقریر نے ان لوگوں کو جو پلیٹ فارم پر موجود تھے میری مکمل تائید پر آمادہ کر دیا۔ میری نظریہ کی تائید میں یکے بعد دیگرے مقررین اٹھ اٹھ کر تقریر کرنے لگے۔ تمام لیڈروں کو یہ دکھائی دینے لگا

گہ یہی نہیں کہ برطانوی سامان کا بائیکاٹ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوگا بلکہ یہ اگر عمل میں لایا گیا تو لوگ خود سرمایۂ تضحیک بن جائیں گے۔ اس مجلس میں بمشکل ہی کوئی ایسا شخص ہوگا جس کے بدن پر کوئی برطانوی مصنوعات کی چیز نہ رہی ہو۔ لہٰذا اکثر سامعین نے یہ محسوس کر لیا کہ ایسی تجویز اختیار کرنے بس نقصان کے سوا کیا حاصل ہوگا جس کی حمایت میں ووٹ دینے والے خود بھی اس پر کاربند نہ ہو سکے۔"

اس دلیل کے وزن کا اندازہ میں ناظرین پر چھوڑ دوں گا تاکہ وہ ۳۱-۱۹۳۰ء کے عظیم الشان مقاطعہ کے مہم سے حاصل کردہ تجربات کو اس معاملے میں کام میں لائیں اور فیصلہ کریں۔ مسٹر گاندھی کے جیل خانے کے بعد نئی پود کے لیڈروں نے برطانوی سامان اور کپڑوں کے بائیکاٹ کا کھلا ہوا اعلان کر دیا جو غیر برطانوی بدیسی سامان کو برطانوی سامان پر ترجیح دینے کی حد تک پہنچ گیا۔ اور اب یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ یہ مقاطعہ جو کانگریسیوں کی بڑھتی ہوئی فوج کے ذریعے جس میں مرد، عورت، لڑکے، لڑکیاں سب شامل تھے عمل میں لایا گیا تھا۔ برطانیہ کے کپڑوں اور دوسرے مصنوعات کو کم کرنے میں ایسا کارگر ثابت ہوا کہ اس نے برطانیہ کے کان کھڑے کر دیئے اور اُسے بالآخر گاندھی جی کو آزاد کر کے اُن سے گفت وشنید کا سلسلہ جاری کرنے پر مجبور کر دیا۔

گاندھی جی سودیشی کی قرارداد پر قانع نہ رہے کیوں کہ اس پر تو بہرحال عمل درآمد ہونا ضروری تھا خواہ خلافت کے معاملہ میں کچھ بھی فیصلہ ہو بلکہ انھوں نے اسی کانفرنس میں پہلے پہل عدم تعاون کا نعرۂ جنگ بلند کیا جس کا مدعا یہ تھا کہ گورنمنٹ کو مسلمانوں کے جائز مطالبات کے ساتھ انصاف کرنے پر مجبور کر دیا جائے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "میں نے اسے عدم تعاون کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ اس فقرہ کو پہلے پہل میں نے اسی کانفرنس میں استعمال کیا۔ جب مولانا حسرت موہانی تقریر کر رہے تھے تو مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس صورت میں کہ اسلحہ کا استعمال ناممکن ہے یا نامناسب ہے مولانا کا ایک ایسی حکومت کے مقابلہ میں جس کے ساتھ مختلف حیثیتوں سے تعاون بھی جاری تھا کسی موثر اقدام کی گفتگو محض عبث ہے۔ مجھے گورنمنٹ کے مقابلے کی ایک ہی صورت نظر آئی۔ وہ یہ کہ گورنمنٹ سے تعاون ترک کر دیا جائے۔ اس طرح میں لفظ "عدم تعاون" تک پہنچا۔ یہاں پر اتنا اور اضافہ کرنے کی ضرورت ہے کہ اپنی سابق ستیہ گرہ کی مہم کی طرح جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں۔ وہ اس موقع پر بھی تحریک کے تمام الجھاؤ کو بخوبی سمجھنے سے قاصر رہے۔ چند تفصیلات جو اس وقت ان کے ذہن میں آئیں وہ یہ تھیں کہ گورنمنٹ کے اعزاز اور خطابات واپس کر دیئے جائیں اور سرکاری ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کی جائے

کانفرنس میں "تحفظ گاؤ" کے مسئلہ پر بھی بحث ہوئی تھی۔ ظاہر ہے مسلمان لیڈروں نے یہ چارا صرف کٹر ہندو لیڈروں کی موافقت حاصل کرنے کے لیے پھینکا تھا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جس وقت گاندھی جی نے ہندستان کی سرزمین پر قدم رکھا ہے۔ اسی وقت سے یہ بات ان کے دل سے لگی ہوئی تھی۔ یہ بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ وہ علی برادران کا ذاتی اعتماد اور اُن کی سیاسی رفاقت حاصل کر کے گاؤکشی روک دینے کی توقع میں تھے۔ لہٰذا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گاؤکشی بند کر دینے کے لیے وہ جلد از جلد مسلمان لیڈروں سے ضمانت حاصل کر کے اس سنہرے موقع کو کام میں لائیں گے تاکہ کٹر ہندوؤں اور قوم پرست لیڈروں کو خلافت کے معاملے میں حصہ لینے پر مجبور کر سکیں۔

گاندھی جی بہرحال اپنے معاملے میں بڑی ہوشیاری سے لگ گئے۔ اپنے دعوتی رقعہ کے جواب میں بھی انھوں نے یہی تجویز کیا کہ یہ دونوں سوال آپس میں مخلوط نہ کئے جانے چاہئیں اور نہ انہیں دادوستد کے جذبات سے پرکھنا چاہیے بلکہ ان کا فیصلہ خود ان کے حسن وقبح پر اور بالکل ایک دوسرے سے الگ کر کے ہونا چاہیے۔

مباحثے کے دوران میں وہ اور بھی کھل گئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "میں اس پر قانع ہوں کہ اگر خلافت کا سوال ٹھیک اور

جائز بنیادوں پر قایم تھا جیسا کہ میرا خیال ہے کہ یقینی تھا اور اگر گورنمنٹ اس سلسلہ میں شدید ناانصافی کی مرتکب ہوئی تھی تو ان زیادتیوں کی تلافی کے مطالبات میں لازم تھا کہ ہندو اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ دوش بدوش کھڑے ہوتے۔ اس معاملہ میں گائے کا سوال پیش کر دینا یا اس موقع کو مسلمانوں کے ساتھ معاملہ طے کرنے کے کام میں لانا ہندوؤں کے لیے زیبا نہ ہوگا بالکل ایسے ہی جیسے خلافت کے معاملے میں ہندوؤں کی موافقت حاصل کرنے کے لیے گاؤکشی روک دینے کو اُن کے سامنے قیمتاً پیش کرنا مسلمانوں کی شان کے منافی ہوگا"

وہ کس ہوشیاری سے لکھتے ہیں کہ" اگر مسلمان اپنی آزادانہ خواہش سے اور ہندوؤں کی ہمسائگی اور ہم وطنی کو دیکھتے ہوئے ان کے ساتھ اپنے فرائض کا احساس کریں اور ان کے مذہبی جذبات کا خیال کر کے گاؤکشی بند کردیں تو یہ اور ہی بات ہوگی اور یہ فعل یقیناً نہایت درجہ قابلِ ستایش وتحسین ہوگا دوسری جانب اس کے دوستانہ جواب میں کوئی تاخیر نہیں ہوئی اور مولانا عبدالباری نے فرمایا" ہندو ہماری مدد کریں یا نہ کریں، مسلمانوں کو اُن کے ہم وطن ہونے کی حیثیت سے صرف ان کے جذبات واحساسات کے پیش نظر گاؤکشی چھوڑ دینی چاہیئے" بہرحال گاندھی جی بھی خوب سمجھتے تھے کہ اگر ہنگامہ خلافت کے سلسلہ میں مولانا کا دل گاندھی جی اور دوسرے ہندو لیڈروں کی موافقت حاصل کرنے کے خیال سے متاثر نہ ہوتا تو مسلمانوں سے اس قسم کی اپیل کرنے کا خیال بھی مولانا کے دماغ میں کبھی نہ آسکتا تھا۔

یہ کانفرنس اُس ترک موالات کا پیش خیمہ تھی جو ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۲ء کے شروع تک نہایت کامیابی سے جاری رہا یہی ہندو مسلم تعاون اور اتحاد کے دور کا بھی پیش خیمہ تھی۔ اگرچہ یہ زمانہ بہت مختصر ثابت ہوا۔ اسے فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ ان جزوی کامیابیوں کی بھی ہندستان کو بڑی قیمت دینی پڑی۔ یہ غالباً پہلا مرتبہ تھا کہ ایک بڑی قومی تحریک کی بنیاد مذہبی تخیلات اور ایک گروہ کی توہمانہ شکایات پر رکھی گئی یہ ایسا وقت تھا کہ ایک طرف عہد وسطیٰ کے کٹر مولاناؤں، مولویوں اور عالموں اور دوسری طرف کٹر سادھوؤں رشیوں، اور سنیاسیوں نے اس نئے سیاسی پلیٹ فارم پر یورش کردی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی دلائل اور مقدس کتابوں نے سیاسی مصلحتوں اور عقلی براہین کی جگہ بآسانی چھین لی۔ سیاسی تقریروں کے ہر دوسرے جلسے میں رام، کرشن، قرآن اور اللہ کی سندیں پیش کی جانے لگیں عوام کے بڑے بڑے مجمعوں کو ہندستانی کہنے کے بجائے ہندو اور مسلمان کہہ کر مخاطب کیا جانے لگا۔ دونوں کے مذہبی جذبات جو متعدد حیثیتوں سے باہم مخالف اور متضاد تھے کسی نہ کسی طرح ترک موالات کے عملی پروگرام کی تائید میں متفق کر کے پیش کیے جانے لگے۔ مختصر یہ کہ ہندستانیوں کے گرد پرانی دنیا کے توہمات اور مجنونانہ جذبات کا طوفان برپا کر دیا گیا تاکہ عوام سیاسی مصالح کے تقاضوں اور استدلال کی غیر ہنگامی روشنی کو بالائے طاق رکھ کر جذباتی ہیجان اور مذہبی عقائد کی روشنی میں بے تحاشا اس لائحہ عمل کی طرف دوڑ پڑیں۔

چوبیسواں باب

خلافت کمیٹی کے بعد گاندھی جی نے پنجاب کے مظالم کی تفتیش پھر سے جاری کر دی برطانوی پارلیمنٹ نے مسودۂ اصلاحات کو قانون کا جامہ پہنا دیا تھا۔ ملکِ معظم نے اصلاحات کے ایکٹ سے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کانگریس کے اجلاس سے کچھ پہلے ہی ایک فرمان صادر کیا جس کی رُو سے مارشل لا کے ہزاروں قیدی بشمول جناب ہرکشن لال اور دوسرے لیڈر آزاد کر دیے گئے ایک طرح کی

عام معافی کا بھی حکم صادر ہوا جس کے ماتحت مولانا محمد علی اور شوکت علی اپنی چھندوارہ کی نظر بندی سے رہا کر دیئے گیے۔ یہ سب کے سب جیل سے تقریباً بالکل براہ راست کانگریس کے اجلاس میں پہنچے۔

مسٹر گاندھی لکھتے ہیں کہ اس وقت لوگوں کی خوشی کی کوئی حد نہ تھی۔ مسٹر موتی لال نہرو کانگریس کے صدر تھے، جنہوں نے اپنی شاندار وکالت قربان کر کے پنجاب کو اپنا مستقر بنا لیا تھا اور بہت سی خدمتیں کی تھیں۔ سوامی شاردھانندجی، آنجہانی استقبالیہ کمیٹی کے صدر تھے اصلاحات کے پیچیدہ مسئلے کے منتظرہ قومی فیصلہ میں شرکت کے لیے مندوبین ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئے تھے مسٹر تلک اور بنگال کے مسٹر سی آر داس اور مسٹر سین چندر س اہم مسئلہ پر ایک فیصلہ کن جنگ کے لیے اپنے اپنے صوبے ایک بڑی امدادی فوج ساتھ لائے تھے۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ کانگریس اپنے خاص اجلاس میں مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ کے تجویز اصلاحات کے خاکے کو غیر تسلی بخش اور ناقص قرار دے کر مسترد کر ہی چکی تھی۔ اور گورنمنٹ سے اس کا مطالبہ کیا گیا تھا کہ ان اصلاحات کو لوگوں کے لیے قابل قبول بنانے کی غرض سے یہ ضروری ہے کہ ان کے اندر جمہوریت پسندانہ انداز کی وسعت پیدا کی جائے۔ کانگریسی نمائندوں نے برطانوی مشورت خانوں کو کانگریس کے حسب منشا مسودے کی اصلاح پر آمادہ کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔ مسٹر تلک، مسز بیسنٹ، مسٹر وی جے پٹیل نے کانگریس کے مطالبات کو حکومت برطانیہ کے سامنے مکمل طور پر واضح کرنے کے لیے پارلیمنٹ کی متحدہ کمیٹی کے سامنے شہادتیں پیش کیں انگلستان اور ہندستان میں اس تمام پروپگنڈا کے باوجود، سوا ناقابل لحاظ تبدیلیوں کے یہ بالکل ویسا ہی رہا جیسا کہ پارلیمنٹ کے ایکٹ کی صورت میں تھا لہٰذا دستوری نقطۂ نگاہ سے امرتسر کانگریس سے یہی توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ بمبئی کے گزشتہ اجلاس کے فیصلہ کی اتباع میں اصلاحات کو غیر تسکین بخش اور ناقابل قبول کہہ کر مسترد کر دے۔

مسٹر تلک اور مسٹر داس کانگریس سے اصلاحات کے خلاف فیصلہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اور یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ کانگریس ان زبردست سورما لیڈروں کی قیادت تسلیم کر لیتی اگر گاندھی جی میدان میں نہ ہوتے، لیکن گاندھی جی پنجاب میں قدم جما ہی چکے تھے اور پنجاب کے مظالم کی تفتیش کے سلسلے میں کانگریسی کمیشن کی رہنمائی کر رہے تھے۔ اس لیے انھیں ایک ایسی قوت حاصل ہو گئی تھی جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا مالوی جی سے بھی ان کے تعلقات اچھے تھے جن کے اعتدال پسندانہ رجحانات اور مسٹر تلک اور مسٹر داس کے مسلک میں ایک بین اختلاف تھا لہٰذا مالوی جی نے نہایت ہوشیاری سے کام لے کر یہ طے کیا کہ انتہا پسند لیڈروں کے تقریباً ناقابل شکست اختلافات کے مقابلے میں یہ کرنا چاہیئے کہ گاندھی جی کو ترپ کے پتے کی حیثیت سے استعمال کیا جائے کافی تامل کے بعد آخر کار گاندھی جی نے کانگریسی سیاست کے طوفانی سمندر میں کود پڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

ہم نے دیکھ ہی لیا ہے کہ مسٹر شاستری گاندھی جی کو ان اصلاحات کو موافقانہ روشنی میں دیکھنے کی ترغیب دے ہی چکے تھے اگرچہ بظاہر یہ بات ناقابل یقین معلوم ہوتی ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ سیاہ قانون (بلیک ایکٹ) کی منظوری، خود ان کی ستیہ گرہ کی تحریک اور وہ سفاکانہ طرز حکومت جس کا پنجاب اور بمبئی میں گورنمنٹ نے مظاہرہ کیا، ان تمام واقعات کا بھی گاندھی جی کے نظریہ پر تقریباً کوئی اثر نہیں پڑا۔ اور نہ خلافت کے اغراض کی حمایت سے دستور اصلاحات کے متعلق اُن کی سابقہ رائے پر کوئی اثر پڑا۔ صلحنامہ سیورے پر اس وقت تک دستخط نہیں ہوئے تھے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ شاہی اعلان سے بھی پوری طرح مطمئن نہیں تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "میں نے اس وقت محسوس کیا کہ اصلاحات کتنے ہی ناقص سہی پھر بھی قبول کیے جا سکتے تھے۔ ملک معظم کے اعلان اور اس کے طرز بیان میں مجھے لارڈ سنہا کا ہاتھ نظر آ رہا تھا، اس وقت کچھ امید کی کرن پھوٹی۔ اس واقعہ سے ہر شخص گاندھی جی کی سیاسی باریک بینی کا اندازہ لگا سکتا ہے کہ شاہی اعلان جیسے اہم سرکاری دستاویز میں لارڈ سنہا جیسے

اول درجہ کے ملوکیت پسند کا ہاتھ دیکھ کر اُن کا دل اُمید سے معمور ہو گیا۔

لہٰذا مسٹر گاندھی کے نظریات اور مسٹر تلک اور مسٹر داس کے نظریات کے درمیان پہلے مجلس موضوعات میں اور اس کے بعد کانگریس کے کھلے اجلاس میں ایک معرکہ آرا جنگ چھڑ گئی۔ "میں نے محسوس کیا کہ اصلاحات کو مسترد کرنے کی نہیں بلکہ قبول کرنے کی قرار داد صحیح چیز ہوگی۔ دوسری طرف دیش بندھو چترنجن داس اپنی اس رائے پر اڑے ہوئے تھے کہ اصلاحات بالکل ناقص اور ناقابل عمل ہونے کی حیثیت سے اسی قابل ہیں کہ مسترد کر دیئے جائیں۔" لیکن مسٹر داس اپنی جگہ پر ایک حیثیت سے غلط تھے۔ انہوں نے اصلاحات کو تو مسترد کر دیا مگر ملک سے یہ درخواست نہیں کی کہ اصلاحی ایکٹ کے ماتحت قائم کی جانے والی قانون ساز مجلسوں کو بائیکاٹ کر کے انہیں بالکل ٹھکرا دیا جائے۔ اور نہ انہوں نے اس کونسل کے برباد کر دینے اور اس میں روڑے اٹکانے کی اس اعلیٰ حکمتِ عملی کو پیش کیا جس کے حامیوں کی بعد میں بہت بڑی جماعت ہو گئی تھی لہٰذا مسٹر گاندھی نے انھیں بآسانی ایک گومگو کے عالم میں مبتلا کر دیا "یا اصلاحات کو باہمہ نقص قبول کر کے اُن پر عمل کیا جائے یا انھیں مسترد کر کے کونسلوں کا مقاطعہ کیا جائے" یہی وہ تذبذب تھا جس میں پھنس کر انتہا پسند جماعت تباہ ہو گئی۔ رہنماؤں کی دو جماعت کے درمیان کھلی ہوئی خلیج کو پاٹنے کے لیے دورانِ بحث میں ایک ترمیم کی تحریک ہوئی اور اس تجویز کو کانگریس کی متفقہ توثیق کے لیے پیش کیا گیا" پنڈال تالیوں سے گونجنے لگا اور لوگوں کے اُداس چہروں پر شادمانی کی لہریں دوڑنے لگیں"۔

اس کے بعد کانگریس نے مسٹر گاندھی مسٹر کیلکر اور مسٹر آئی پی سین پر مشتمل ایک چھوٹی سی کمیٹی مقرر کی (آخر الذکر دونوں صاحبان اپنی اپنی جگہ پر مسٹر تلک اور مسٹر داس کی نمائندگی کر رہے تھے) تاکہ یہ کانگریس کے لیے ایک نیا دستور مرتب کرے۔ قومی تحریک میں نئے ہیجان کے پیدا ہو جانے سے موجودہ دستور اساسی بالکل غیر اطمینان بخش ثابت ہو چکا تھا۔ لہٰذا کانگریس کے نئے دستور اساسی کے مرتب کی حیثیت سے گاندھی جی نے کانگریس میں پھر ایک کلیدی پوزیشن حاصل کر لی تھی" اور اس ذمہ داری کی قبولیت کے ساتھ ساتھ کانگریس میں میرا حقیقی داخلہ ہوا"۔ آخری کانگریس جس میں انھوں نے شرکت کی تھی وہ کلکتہ میں ۱۹۱۷ء میں ہوئی تھی۔ اُس وقت وہ کانگریسی سیاست میں کسی اہم حیثیت کے لیڈر نہ تھے ۱۹۱۸ء کے دونوں اجلاسوں میں وہ علالت کے باعث شریک نہ ہو سکے تھے۔ مگر ایک ہی سال گذرے تھے کہ ۱۹۱۹ء کے آخر میں امرتسر کانگریس میں ان کا استقبال اس حیثیت سے کیا گیا کہ کانگریس کے تین چار سب سے بڑے لیڈروں میں ان کا شمار ہونے لگا۔

پچیسواں باب

کانگریس پنجاب کمیٹی کی رپورٹ کا مسودہ

مسٹر گاندھی پنجاب میں اپنی تفتیش ختم کر کے ۱۹۲۰ء کے شروع میں احمد آباد واپس آئے اور کانگریس پنجاب کمیٹی کی رپورٹ کا مسودہ تیار کرنے میں مصروف ہو گئے وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ عنقریب اپنی رپورٹ کی اشاعت سے وہ جن چیزوں کا انکشاف کرنے والے ہیں تمام ملک میں ہیجان و اضطراب کو نقطہ کمال تک پہنچانے میں ان کی کتنی زبردست اہمیت ہوگی۔ لہٰذا وہ قدرتاً رپورٹ کی تکمیل کے لیے

بے چین ہو گئے لیکن پھر بھی وہ اس تکلیف دہ فکر میں مبتلا تھے کہ ان کے ہاتھ سے تیار ہو کر جو دستاویز نکلے اُسے صحیح واقعات کا آئینہ دار ہونا چاہئے۔ اور ہر اس واقعہ کی جو اس میں درج ہو کثیر شہادتوں سے تائید ہونی ضروری ہے یہ بھی چاہتے تھے کہ یہ دستاویز مسودہ نویسی کے عیوب سے بھی قطعاً پاک ہو۔ انھوں نے ہر لفظ اور ہر جملے کو بار بار اپنے دماغ میں تولا، پھر کہیں جاکر اسے قلم بند کیا۔ جب ہم شہادتوں کے اُس ضخیم جلد پر جس کی انھیں اس سلسلہ میں چھان بین کرنی پڑی اور اس رپورٹ کے حجم پر جو ضخامت میں مانٹگو چیمسفورڈ رپورٹ کے برابر تھی غور کرتے ہیں تب ہم کو اس کا صحیح اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے نظر ثانی کے آخری مدارج میں کس جانفشانی سے تن تنہا انھوں نے کام کیا ہوگا۔

گاندھی جی نے بہت دنوں بلکہ ہفتوں تک درحقیقت خود کو اپنے آشرم کے چھوٹے کمرے کی چار دیواری کے اندر مقید کر لیا تھا۔ اور اس زمانہ میں یہ حالت تھی کہ نہ اُن تک کوئی خود جا سکتا تھا نہ کسی کی نظر پہنچ سکتی تھی۔ اس وقت وہ روزانہ بیس بائیس گھنٹے کام کرتے تھے اور اُن کے کھانے اور سونے کے لیے بمشکل دو چار گھنٹے کا وقت بچتا تھا۔ ان کی اس زود کاری نے ہم لوگوں کو بدحواس کر دیا تھا۔ ان کے نزدیک ترین اور محبوب ترین پیرو اور ساتھی بھی ایک سکنڈ کے لیے انھیں چھیڑنا ستم سمجھتے تھے حالات کا ایسا ہی کوئی بہت خاص دباؤ پڑتا کہ وہ احمد آباد وغیرہ میں کسی جلسے یا مجمع میں بعجلت شرکت کرنے کے لیے اپنی رپورٹ کے اوقات میں سے ایک گھنٹے کا خون کر دیتے۔ اُن کے غیر معمولی انہماک اور مسلسل محنت کا منظر ہی ہمارے اس اعتقاد کی آگ میں ایندھن کا کام دیتا تھا جو ہم ان کی معجزنما طاقت پر رکھتے تھے اور جذبات کی جس برقی شدت سے ہم ان کے انکشافات کا انتظار کر رہے تھے، اس میں اور اضافہ ہو جاتا تھا

ایک مرتبہ میں نے اُن سے باتوں باتوں میں دریافت کیا کہ آخر آپ دن رات میں مسلسل ۲۲ گھنٹے کیوں کر کام کرتے ہیں کہنے لگے "زیادہ کام کرنے اور کم سونے کے لیے صرف اس کی ضرورت ہے کہ کھانا کم کر دیا جائے۔ مجھے یاد ہے کہ میں جب پنجاب رپورٹ میں مشغول تھا تو میں صرف ایک مرتبہ صبح کے وقت کھاتا تھا اور وہ بھی تھوڑا پھل اور دودھ مستقل دماغی محنت اور مسلسل کام کا راز غذا کے انضباط و باقاعدگی میں مضمر ہے"

گاندھی جی کی یہ دماغی محنت گویا ہمارے اوپر کابوس کی طرح مسلط ہو گئی اور ہم ان کے محنت شاقہ کی جلد از جلد تکمیل کی دعائیں مانگتے تھے، ۲۵ مارچ تک رپورٹ ختم ہو گئی اور اپریل ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی۔ اور جیسا کہ اب ہر شخص جانتا ہے اس رپورٹ نے اُن تمام وحشیانہ اور انسانیت سوز مظالم کا پردہ فاش کر دیا جو سول، ملٹری اور پولیس افسروں نے پنجاب کے مختلف شہروں اور دیہاتوں میں کیے تھے۔ اس کی اشاعت نے لوگوں میں ہلچل پیدا کر دی۔ منجملہ اور چیزوں کے کمیٹی نے مطالبہ کیا تھا کہ وائسرائے کو واپس بلا لیا جائے اور مائیکل اوڈائر کو جو اُس وقت پنجاب کے گورنر تھے اور جنرل ڈائر کو جو جلیاں والا باغ کے قتل عام کے بانی تھے نیز چند دیگر برطانوی اور ہندستانی افسروں کو ملازمت سے برطرف کر دیا جائے رپورٹ کے سنسنی پیدا کرنے والے حصے اخباروں، رسالوں اور تقریروں کے ذریعے بہت جلد تمام ملک میں نشر کر دیے گئے، جنھوں نے ملک میں غیظ و غضب کا ایک طوفان برپا کر دیا۔ مسٹر گاندھی نے واقعی بہت خوبی اور ہوشیاری سے کام کیا تھا اور ان کی جانفشانیوں کا پورا اجر انھیں اس برقی جوش و خروش کی صورت میں مل گیا جو انھوں نے اپنی رپورٹ کی اشاعت سے سارے ملک میں پیدا کر دیا اتنا ہی نہیں۔ اپنی رپورٹ کے مسودے کو بنارس میں گنگا کے پانی سے صرف اتنے فاصلے پر کہ اگر پتھر پھینکیں تو پہنچ جائے اپنے ممتاز رفقائے کار کے سامنے پیش کرتے ہوئے مسٹر گاندھی نے صرف اُن کی ذہنی تائید اور دستخطوں ہی کی درخواست نہیں کی بلکہ ہر اس سیاسی جنگ میں ان سے دلی تعاون کے خواہاں ہوئے جو کمیٹی کی سفارشات کو گورنمنٹ سے جاری کرانے کے لیے ضروری سمجھی جائے۔ لہٰذا جہاں اعتدال پسندی کی وجہ سے کمیٹی پر غلطی کرنے کا جرم لگایا گیا ہے اس لیے کہ اس نے

پنجاب کے مظالم کے ارتکاب کرنے والوں کی صرف برخاستگی چاہی اور اُن پر مقدمہ چلانے کی خواہاں نہ ہوئی۔ وہیں گاندھی جی کو بہت بڑی تسلی یہ تھی کہ عدم تشدد کی جدوجہد میں جو پہلے ہی سے ان کی نظر میں تھی انھوں نے اپنے دوستوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ان کو ایک سنجیدہ عہدہ پیمان سے پھانس رکھا ہے۔ ینگ انڈیا ۱۶ مارچ ۱۹۲۱ء میں اپنے ایک مضمون میں انھوں نے لکھا کہ "اس معاملہ میں کمیشن کے ارکان گھنٹوں متفکر رہے اور اُن کے درمیان سفارشات پر گرما گرمی سے بحث ہوئی اور وہ متفقہ طور سے اس نتیجے پر پہنچے کہ مقدمہ چلانے سے احتراز کرنا ہی ہندستان کے لیے کچھ نفع بخش ہو سکتا ہے۔ پونا میں مسٹر داس نے حال ہی میں ایک مشہور تقریر کے اندر اہل کمیشن کے اس معاہدہ کا حوالہ دیا جو اُن کے درمیان ہوا کہ اگرچہ انھوں نے سفارشات میں حد درجہ تخفیف روا رکھی ہے تاہم انھیں منظور کرانے کے لیے ان کو اپنی جان تک کی بازی لگانے سے دریغ نہیں ہوگا۔ لہٰذا اس عہد کی بنا پر کمیشن کے تمام ارکان تارک موالات ہیں"۔

اس طرح مسٹر گاندھی نے ایک پنتھ دو کاج پر عمل کیا۔ پنجاب رپورٹ شایع کر کے نی الحقیقت انھوں نے قوم پر ایک بم کا گولہ پھینک دیا اور ساتھ ہی ساتھ ہندستان کے ایک دلیر مدبر شیر بنگال مسٹر داس، بمبئی کے اعتدال پسند وکیل مسٹر جیکار بروده کے سابق مسلم جج مسٹر عباس طیب جی سے اس کا بھی پہلے عہد لے لیا کہ کمیٹی کے معتدل مطالبات تک منوانے کے لیے بھی جس تحریک کی ضرورت محسوس ہوگی اس میں پورے طور پر شریک ہوں گے۔ یہ بھی یاد رکھئے کہ یہ بیان آخر مارچ ۱۹۲۰ء میں لیے گئے تھے۔ اور اگرچہ اس وقت ترک موالات کا پورا نقشہ ذہن میں جمایا جا چکا تھا تاہم عملاً ابھی تحریک مستقبل کے پردے ہی میں تھی۔

اسی اثنا میں تحریکِ خلافت بھی زور پکڑ گئی۔ ۱۹ جنوری ۱۹۲۱ء کو خلافت کا ایک وفد ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں وائسرائے کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وائسرائے کا جواب واقعی بہت امید شکن تھا۔ اس پر مسلم لیڈروں نے ایک بیان شایع کیا جس میں بہت وثوق سے کہا گیا تھا کہ "اگر شرائطِ صلح کا نتیجہ اسلامی مذہب اور جذبات کے خلاف ہوا تو اس سے مسلمانوں کے جذبۂ وفاداری پر برا اثر پڑے گا" اور اس مطالبہ کو بھی پیش کیا کہ ملک عرب اور اسلام کے مقدس مقامات کو اسی طرح خلیفہ کے تصرف میں رہنا چاہئے جس طرح اسلامی حکومت نے ان کی حد بندی کی ہے"۔ اُس وقت تیسری خلافت کمیٹی فروری ۱۹۲۰ء میں بمقام بمبئی منعقد ہوئی اور اُس نے اس وفد پر اپنا اعتماد ظاہر کیا جو مولانا محمد علی کی قیادت میں انگلستان جا رہا تھا اور پھر اس کمیٹی نے ایک اہم اعلان شائع کیا جس میں کم سے کم مسلم مطالبات درج کیے گیے اور برطانوی حکومت کو وہ سنجیدہ وعدے یاد دلائے گیے جو اُس نے دوران جنگ میں مسلمانوں کی تائید اور حمایت حاصل کرنے کے لیے کئے تھے۔ ابھی وفد یورپ ہی میں تھا کہ سیوری میں ترکی سے جو صلح ہوئی اُس کی شرائط ۱۴ مئی ۱۹۲۰ء کو شائع ہو گئیں۔ بابو راجندر پرشاد ینگ انڈیا (ایس۔ گنیشن ۱۹۲۲ء) کا دیباچہ لکھتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ "مجوزہ شرائطِ صلح کی اشاعت سے انتہائی غیظ و غضب کے جذبات بھڑک اُٹھے اور چوں کہ اسی زمانہ میں ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ (فسادات پنجاب کی سرکاری رپورٹ) بھی شائع ہوئی۔ سارا ملک بے حد مشتعل ہو گیا تھا۔ بمبئی میں گاندھی جی کے ترک موالات کی تجویز پر غور کرنے کے لیے خلافت کمیٹی کا جلسہ منعقد ہوا اور ۲۸ مئی ۱۹۲۰ء کو اس تجویز کو واحد چارہ کار سمجھ کر قبول کر لیا گیا۔ ہنٹر رپورٹ اور ترکی کی شرائط صلح پر غور کرنے کے لیے ۳۰ مئی کو کانگریس آل انڈیا کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ طویل بحث و تمحیص کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ ترک موالات کے مسئلے پر غور و خوض کے لیے کانگریس کا ایک خاص اجلاس کیا جائے"۔

گاندھی جی نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ کانگریس کمیٹی کے فیصلے کا انتظار نہیں کر سکتے۔ ترک موالات کے اصول اور پروگرام کا از خود فیصلہ کر کے وہ خلافت کمیٹی اور کانفرنس کو پہلے ہی سے پابند کر چکے تھے کیوں کہ یہ جانی بوجھی بات ہے کہ وہ خلافت

کمیٹی کے جس نے اپنی پہلی کانفرنس سے (منعقدہ ۲۳ نومبر ۱۹۱۹ء بمقام دہلی) اپنے کو کلیتاً اُن کی ہدایت اور فرماں برداری کا کا تابع بنا رکھا تھا اصل رہنما تھے یہ بھی قابل لحاظ بات ہے کہ ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ اور ترکی شرائط صلح کی اشاعت سے پہلے ہی گاندھی جی نے ینگ انڈیا (مورخہ ۵ مئی ۱۹۲۰ء) میں اپنے ایک مضمون میں ترکِ موالات کے چار مرحلے از خود اختراع کر کے پیش کیے تھے۔

(۱) خطابات اور اعزازی عہدوں کا ترک کرنا (۲) سرکاری ملازمتوں سے علیحدگی۔ (۳) پولیس اور فوج کی علحدگی۔ (۴) ٹیکسوں کی ادائیگی روک دینا۔

۱۳ جون ۱۹۲۰ء کو بنارس میں آل انڈیا کانگریس کیمٹی کے اجلاس نے خلافت کیمٹی پر زور دیا کہ وہ مجلس ترک موالات کے نام سے ایک انتظامیہ مجلس بنائے اور ایک مفصل پروگرام تیار کر کے اس پر عملدرآمد کرائے پھر مجلس نے وائسرائے اور برطانوی حکومت کو ایک الٹی میٹم دینے کا فیصلہ کیا کہ حقوق خلافت کے متعلق کوئی تشفی بخش فیصلہ نہ ہونے کی صورت میں ہندستان کے مسلمان پہلی اگست ۱۹۲۲ء سے ترک موالات کی جدوجہد شروع کر دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔

مسٹر گاندھی تحریر فرماتے ہیں (ینگ انڈیا ۹ جون ۱۹۲۱ء) کہ "اس جلسے سے پہلے ایک ہندو مسلم متحدہ جلسہ ہو چکا تھا جس میں ہندو لیڈر اپنی اپنی رائے دینے کے لیے مدعو کیے گئے تھے۔ اس جلسے میں مسز بسینٹ، پنڈت مالویہ، ڈاکٹر سپرو مسٹر موتی لال نہرو، مسٹر جناح اور دوسرے رہنما موجود تھے۔" ان میں سے بہتوں نے حقیقتاً ترک موالات کی حکمت عملی پر بہت زوردار اعتراضات کیے لیکن ظاہر ہے کہ اُن کی رائے صرف اس لیے طلب کی گئی تھی کہ بہ خلقی سے مسترد کر دی جائے۔

ان اعتدال پسند لیڈروں کے اعتراضات اور پس و پیش سے بے نیاز ہو کر مسٹر گاندھی اور مسلمان لیڈروں نے ۲ جون ۱۹۲۰ء کو الہ آباد کے تصفیہ کے مطابق منشور جاری کیے جن کے ذریعہ اعلان کیا گیا کہ "اگر پہلی اگست ۱۹۲۰ء تک پیش کردہ شرائط تسلیم نہ کی گئیں تو ترکِ موالات شروع کر دیا جائے گا نیز وائسرائے سے مطالبہ کیا گیا کہ اگر ملک معظم کی حکومت مسلمانوں کے مطالبات نہ مانے تو وہ مستعفی ہو جائیں۔" مسٹر گاندھی نے ۷ جولائی کو خلافت کانفرنس کی مجلس عدم تعاون کی طرف سے ترک موالات کے پہلے مرحلے کے لیے نقشۂ ذیل کے مطابق تفصیلات پیش کیں:- (۱) خطابات اور عہدوں سے دست برداری۔ (۲) سرکاری قرضوں میں عدم شرکت۔ (۳) قانون پیشہ اصحاب کا اپنی وکالت ترک کر دینا اور خانگی پنچایتوں کے ذریعے ملکی جھگڑوں کا تصفیہ کرنا (۴) لڑکوں کے والدین کا سرکاری مدارس کا مقاطعہ کر دینا۔ (۵) مجلس اصلاحات کا مقاطعہ (۶) سرکاری پارٹیوں اور اس قسم کی دوسری تقریبات میں شرکت نہ کرنا (۷) مسوپوٹیمیا یا اور کسی قدیم ترکی عملداری میں گورنمنٹ کی فوجی یا سول ملازمتوں سے انکار۔ (۸) سودیشی کا پروپیگنڈا۔

جولائی میں جب وائسرائے کی طرف سے کوئی تشفی بخش جواب نہ ملا تو آخر کار گاندھی جی نے پہلی اگست کو اپنے وہ تمام تمغے واپس کرتے ہوئے جو انھیں افریقہ میں جنگی خدمات اور انسان دوستی کے صلہ میں ملے تھے ملک کو ایک پُرامن ہڑتال منانے اور گورنمنٹ کی زیادتیوں کے خلاف ہر جگہ احتجاجی مجلسیں قائم کرنے کی دعوت دی۔ اور اس طرح عدم تعاون کی مہم شروع ہو گئی۔ ہندستان کی بدقسمتی کہ اسی روز یعنی پہلی اگست کو ایک طویل بیماری کے بعد مسٹر تلک بمبئی میں انتقال کر گئے۔ ان کے جنازہ کے جلوس میں گاندھی جی اور بمبئی کے لاکھوں باشندے شریک تھے۔ یہ ایک غیر معمولی اعزاز تھا جو ایک محبِ وطن کو نصیب ہوا جس کی نظیر اس وقت کے لوگوں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

لوگ کہتے تھے کہ مسٹر تلک کی وفات اور گاندھی جی کی تحریک کی آغاز کا بیک وقت عمل میں آنا اس بات کی علامت تھی کہ آج سے گاندھی جی ہندستانی سیاست کے اس بلند مقام پر پہنچ گئے جس پر چوتھائی صدی تک مسٹر تلک فائز رہے تھے۔

چھبیسواں باب

گاندھی جی اور تحریک خلافت

ترک موالات کی جدوجہد شروع ہونے تک کے واقعات کو مختصر بیان کر دینے کے بعد ہمیں تھوڑی دیر کے لیے اس پر غور کرنا ہے کہ ہندستان کی مختلف جماعتوں پر ان سیاسی ڈراموں کی کارروائیوں کا کیا اثر پڑا اس سے پہلے یہ بیان کرنا کارآمد ہوگا کہ گاندھی جی ۱۹۱۹ء کے دوران میں ملک کے اندر سیاسی اقتدار کی کلیدی حیثیت کیونکر حاصل کر چکے تھے۔

مسٹر گاندھی نے ۱۹۱۹ء کی انقلابی، جدوجہد کی سرداری حاصل کرنے کے لیے تین واضح عملی قدم اٹھائے۔ اول رولٹ ایکٹ کے خلاف اپنی ستیہ گرہ کی جدوجہد شروع کر کے انھوں نے ملک کے نہایت جری اور دلیر افراد کو ملکی سیاست سے وابستہ کر دیا تھا۔ انھوں نے اس فعل سے ہندستان کی سوسائٹی کے بلند تر طبقے کے دماغ پر پورا قابو حاصل کر لیا تھا دوسرے ۳؍ نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں خلافت کانفرنس کی صدارت کر کے اور اسی تاریخ سے ایک ایسے معاملے کے ساتھ کامل اتفاق کر کے جو ہمیں اس وقت کٹر مسلمانوں سے متعلق معلوم ہوتا تھا، مسٹر گاندھی براہ راست "اسلامی قلعہ" میں داخل ہو گئے اور اس خاص لیور کو پکڑ لیا جس سے انہیں آخر کار نسبتاً غیر ترقی یافتہ مسلمان عوام میں سے لاکھوں کی پیروی حاصل ہو گئی۔ یہ درحقیقت ایک اہم سبقت بھی مسلم لیگ کے اُن گذشتہ لیڈروں کی مساعی پر بھی، جو فرقہ پرستی کو تفریق طلب سیاسی پروپگنڈا کا آڑ بناتے ہوئے تھی کٹر مذہبیت کو عملی سیاست سے الگ رکھنا چاہتے تھے۔ گاندھی جی نے ملک کے ہندو مسلم عوام کے وسیع اور قوی ترین سیاسی ہراول دستے کی بے نظیر اور غیر متنازعہ رہنمائی حاصل کر لی۔ جو پہلے کسی لیڈر کو نصیب نہیں ہوئی تیسرے یہ کہ کانگریس کا نیا دستور مرتب کرنے والی کمیٹی کے رکن بن کر انھوں نے نہایت خاکسارانہ طور پر تنظیمی رہنمائی تک کی راہ طے کر لی۔

تاہم ۱۹۱۹ء کے اوائل میں گاندھی جی کی گاڑی بھی تیز نہ چلی۔ ابتدا میں معاملات کی رفتار سست تھی کیوں کہ ترکی کی قسمت کا ابھی فیصلہ نہیں ہوا تھا اور نہ پنجاب کے معاملے پر سرکاری یا غیر سرکاری رپورٹ چھپی تھی۔ پھر بھی تمام توجہات پنجاب اور خلافت کے مظالم کی طرف مبذول کرنے کے لیے گاندھی جی ہر ہفتہ لاتعداد تقریریں کرتے اور متعدد مضامین شایع کرتے چلے گئے۔ انھوں نے تفصیل کے ساتھ شرحیں کیں، دشمن دوست دونوں سے یکساں بحثیں کیں، اور کامل قابلیت سے اعتراضات کے جواب دیتے رہے جن کی بوچھار صرف ہندستان ہی سے نہیں بلکہ تمام ممالک سے ان پر ہوتی تھی۔ اس وقت تک انھوں نے اردو ہندی زبانوں میں کافی مہارت حاصل کر لی تھی۔ جہاں وہ جاتے ہزاروں مسلمانوں کو مخاطب کرنے کے لائق ہو گئے تھے اور انتہائی پکے قسم کے ہندو ہونے کے باوجود انھوں نے سب سے زیادہ نادان اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ مسلمانوں کے نازک ترین اور عمیق ترین جذبات کو بیدار اور مرتعش کرنے کا ایسا زبردست ملکہ حاصل کر لیا تھا کہ ان کی

تمام مجاہدانہ سرگرمی قوت عمل اور جوش وخروش کو اس نازک حد تک پہنچا دینے میں کامیاب ہو گیے کہ یہ تمام چیزیں ایک طوفانی ہنگامہ کی صورت میں اُبل پڑیں۔ ہر خلافت کمیٹی اور خلافت کانفرنس کے ساتھ جو منعقد ہوتی، ہر یوم خلافت کے ساتھ جو منایا جاتا، خلافت کی قسمت کے متعلق ذرا سی خبر بھی معلوم ہوتے ہی مسٹر گاندھی ایک اثرانگیز مقرر سے ترقی کر کے ایک پرجوش مبلغ ہو گیے اور آخر کار دنیا میں اسلام کے تحفظ اور نجات کے لیے ایک شاندار اور پُر امن جہاد کے رہنما ہونے کا منصب اختیار کر لیا۔ لیکن یہ ساری گرماگرمی کی تبلیغ جسے گاندھی جی بڑی ہوشیاری سے ہر ہفتے ایک بلند تر سطح پر قائم کر رہے تھے ملک کے غیر مسلم عوام کے دماغ کو مطمئن کرنے اور اہل الرائے طبقے کے دلوں کو ہلانے میں ناکامیاب رہی یہ سب کو معلوم تھا کہ مسٹر گاندھی نے ادھا دھند عجلت اور بےنظیر جانفشانی سے پنجاب رپورٹ تیار کی: اس لیے دنیائے سیاست واقعی ایک امید و سراسیمگی کے عالم میں پنجاب کے لیے انصاف اور ہندستان کے لیے آزادی حاصل کرنے کی غرض سے ایک نئی شورش شروع کرنے پر آمادہ تھی ۱۹۱۹ء کی ناقابل فراموش بہادری کی یادگار قائم رکھنے کے لیے گاندھی جی کی ایما سے ۶ سے ۱۳ اپریل تک قومی ہفتہ بھی منایا گیا اور یہ محسوس کیا گیا کہ گاندھی جی نے خلافت کو اپنا اُصول و پنجاب کو اپنی جد وجہد کا ایک امدادی جزو قرار دیا ہے۔ سیاسی غیر مسلم کارکن اور عوام گاندھی جی کے نیم مذہبی اور نیم سیاسی جوش سے بآسانی بیدار اور متاثر نہ ہو سکے مسئلہ خلافت پر ان مسلسل تقریروں سے انھوں نے اپنے آپ کو آشفتہ اور خیرہ سر محسوس کیا۔ انھیں توقع تھی کہ پنجاب رپورٹ بہت جلد قومی مسئلہ کو عملی سیاست کی صف اولین میں جگہ دے گی۔ اور ملک کی حقیقی آزادی کے لیے جنگ کا ابتدائی نقطہ بنے گی۔

۱۹۲۰ء کے اپریل اور مئی میں ہم پر جلد مسلسل کئی تباہ کن مصائب نازل ہوئے ان میں سب سے اوّل وہ خوفناک انکشاف تھا جو پنجاب کے متعلق گاندھی جی کی رپورٹ میں کیا گیا تھا۔ اس کے بعد سیورے کے صلحنامہ کی خبر تھی جس کی رُو سے ترکی کی قدیم عثمانیہ سلطنت ٹکڑے ٹکڑے کر دی گئی اور ترکی کو عرب، مسوپٹامیہ، شام اور فلسطین پر اقتدار سے محروم کر دیا گیا۔ اور اخیر میں یہ ہوا کہ پنجاب کے متعلق ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ شایع ہوئی جس نے اور بھی زخم پر نمک چھڑکا اور تمام ملک میں نفرت اور غضب کی آگ مشتعل کر دی تمام سیاسی کارکنوں پر ان چیزوں کا ایک ہی جیسا اثر پڑا ایسا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں پڑا تھا سب کو یہ احساس ہو گیا کہ کام کا وقت آگیا اور اب کسی نہ کسی فوری اور فیصلہ کن احتجاجی اقدام کے بغیر چارہ نہیں۔

گاندھی جی نے وقت کی پوری پابندی کی ور ۵ مئی ۱۹۱۹ء کو ترک موالات کا پروگرام جس کی انھوں نے چار منزلیں قائم کی تھیں شایع کر دیا۔ خلافت کمیٹی نے اسے قبول بھی کر لیا اور ایک خاص کمیٹی اس پروگرام کو خود گاندھی جی کی ہدایت کے مطابق چلانے کے لیے مقرر کر دی۔ اس میں شک نہیں کہ ہندستان کے مسلمان اس ناپاک صلحنامہ کی وجہ سے جس پر محض بزور شمشیر سلطان کے دستخط حاصل کیے گیے تھے اس قدر مجروح اور برافروختہ ہو گیے تھے کہ مسٹر گاندھی کے ایک اشارے پر سب کچھ کرنے کو تیار تھے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ ہندستان کے صرف مسلمان گورنمنٹ پر خاطر خواہ اثر نہیں ڈال سکتے تھے کانگریس کمیٹی نے آئندہ ستمبر میں کلکتہ میں اجلاس کے انعقاد کا اعلان کر کے فیصلہ کی ساعت کو ٹالنا چاہا تھا۔ اس وقت سوال یہ تھا کہ آیا ہندستان کا روشن خیال طبقہ اور غیر مسلم عوام کانگریس کے فیصلہ سے پہلے ہی پنجاب اور خلافت کے مظالم کی اصلاح کے لیے مسٹر گاندھی کے پرامن بغاوت کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے کو تیار بھی ہوں گے یا نہیں اب چوں کہ گورنمنٹ خلافت اور پنجاب کے مسائل کا قریب قریب فیصلہ کر چکی تھی ہم گجرات اور بمبئی کے "اولڈ گارڈ" والوں کو گاندھی جی کی تبلیغی سرگرمیوں کے ماتحت ان مسائل کا پوری طور سے مقابلہ کرنا پڑا۔ ہمیں محسوس ہوا کہ ممکن ہے گاندھی جی ایسے کٹر اور محتاط ہندو ہونے کے باوجود خلافت کے معاملے میں اپنے کو مسلم نقطۂ خیال سے ملا کر ایک کر دینے پر مجبور ہو جائیں۔ ہم میں سے بیشتر افراد کامل ملحد نہیں تو متشکک ضرور تھے ہم کو

بہت فخر تھا کہ ہم اُن توہمانہ معتقدات اور قدیم رسوم سے بلند تر اور ان کے مخالف ہیں جنھوں نے ملک کے عوام کی ہستیوں اور دماغوں کو اسیر کر رکھا تھا۔ کسی نیم مذہبی یا سیاسی مذہبی تحریک میں ان کے ساتھ شامل ہونے کے لیے ہم نے گاندھی جی سے معاملہ نہیں کیا تھا ہمیں تو قومی آزادی حاصل کرنے کی غرض سے خالص سیاسی لڑائی لڑنے کے لیے کسی اہم عملی احتجاج کے راستے پر ان کی رہنمائی مطلوب تھی جو ہم اُن سے مل گئے تھے۔ اس وقت جو سوال ہمارے سامنے تھا وہ یہ تھا کہ خلافت کی جدوجہد کی تعبیر خالص سیاسی جنگ سے نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے کہ ہم لوگ اس وقت درحقیقت گاندھی جی کے زیر ہدایت خلافت کمیٹی ہی کے جھنڈے کے نیچے طلب کیے گئے تھے۔ کیوں کہ سیاسی آزادی اور پنجاب کے مسائل تو کانگریس کے غور و خوض کرنے کے لیے اس جلسہ پر انحصار رکھے گئے تھے جو عنقریب ہونیوالا تھا بہرحال اس اہم موقعہ پر ہمارا فرض کیا تھا؟ یہ تھا وہ سوال جس پر تمام سیاسی حلقوں میں اہم بحثیں ہونے لگیں، جو گاندھی جی کے روزافزوں جارحانہ لب ولہجہ اور طریق کار کو دیکھ کر بالکل حیران و ششدر رہ گیا تھا۔ اس لیے کہ وہ اسلام کے مفاد کے لیے اپنے جوش و خروش کی شدت میں مسلمانوں سے بھی آگے جا رہے تھے۔

پہلے خلافت کے سوال کو لیجئے۔ اسے مذہبی اور وہمی ارائشات سے الگ کر کے دیکھئے کہ خالص سیاسی حیثیت سے اس مسئلہ کا مفہوم کیا ہے؟ گاندھی جی نے ۱۰ مارچ سنہ ۱۹۲۰ء کو ذیل کے مختصر الفاظ میں تحریر فرمایا ہے "مختصراً دعویٰ یہ ہے کہ سلطنت ترکیہ میں جتنی غیر مسلم نسلیں آباد ہیں ان کی حفاظت کی پوری ضمانت لے کر یورپی ترکی کو ترکی کے قبضے میں رہنا چاہئے۔ مقدس مقامات اور جزیرۂ عرب یعنی ملک عرب حسب تعریف علمائے اسلام پر سلطان کا اقتدار بدستور قائم رہے البتہ اگر اہل عرب چاہیں تو وہ خود اختیاری حکومت کے حقوق ہر وقت حاصل کر سکتے ہیں" عرب عراق عرب اور فلسطین کے عربی باشندوں کے متعلق بار بار سوال کیے جانے پر گاندھی جی نے فرمایا (ینگ انڈیا ۱۲ مئی سنہ ۱۹۲۰ء) "جیسا کہ ہر واقف کار جانتا ہے مسلمانوں کی یہ خواہش کبھی نہیں ہوئی کہ عرب میں اہل عرب کے خلاف مرضی ترک حکومت کریں" اور یہ کہ "ان کا سارا مدعا صرف یہ تھا کہ وہاں سلطان کا اقتدار بحال رہے اور ترکی عرب کو کامل خود اختیاری حکومت کی ضمانت دے دی جائے"۔ مسٹر ریڈ مینڈ کینڈلر ایک اخبار نویس کے دلائل کے جواب میں جو اس نے عربوں کی آزادی کے متعلق پیش کیے تھے گاندھی جی نے ذیل کی عبارت لکھی:-

"میرا خیال ہے کہ ہر شخص بہادر عربوں میں جذبۂ آزادی کی پوری پوری حمایت کرے گا۔ لیکن میں اس خیال سے کانپ اٹھتا ہوں کہ عارضی حکومتوں کے ذریعہ ان کا تحفظ ضرور کیا جائے گا۔ مگر حریص سرمایہ داروں کے اُن منصوبوں سے جو انھوں نے اس ملک سے استفاع کی غرض سے بنا رکھے ہیں ان عربوں پر ستم گذر جائے۔ اگر عہد پورا کیا جانے والا ہے تو جیسا کہ ٹائمز آف انڈیا نے تجویز کیا ہے ترکی اقتدار کے ماتحت ان مقامات کو کامل خود اختیاری حکومت ملنی چاہئے۔ البتہ عربوں کی اندرونی آزادی کے متعلق ترکوں سے ہر قسم کی ضروری ضمانت لے لی جائے۔ لیکن اس اقتدار کا برطرف کر دینا اور ان متبرک مقامات سے خلیفہ کو محروم کر دینا خلافت کو مضحکہ بنا دینا ہے جسے دیکھ کر غالباً کوئی مسلمان بغیر مضطرب ہوئے نہیں رہ سکتا"۔

ہم عرب اور عراق عرب کے سرحدی صوبوں میں ترکی سلطان کا اقتدار قائم کرنے کے لیے گاندھی جی کے جوش و خروش میں حصہ نہیں لے سکتے تھے اس لیے کہ ہم خود ہی ہندستان کو برطانوی اقتدار سے آزاد کرانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہم نے سوچا کہ ترکی تاریخ سے لاعلمی کی بنا پر گاندھی جی معذور ہیں ورنہ ترکی انقلاب کی کوششوں کے متعلق اور گذشتہ صدیوں میں ترکی کے مظالم و بدنظمی کے خلاف عرب، عراق عرب اور فلسطین کے عربوں کی لگاتار بغاوت کے بارے میں ان کو بہتر آگاہی ہوتی۔ بہرحال گذشتہ جنگ عظیم کے نتائج کے ماتحت قسطنطنیہ کی شخصی اور ناقص حکومت کو وہ دھکا لگا تھا جس سے وہ سنبھلنے کے قابل نہیں تھی یعنی ترکی انقلاب پسندوں اور عربی باغیوں کے متحدہ حملوں سے اس کا تباہ ہو جانا یقینی ہے اس وقت ہمارے لیے غور طلب مسئلہ برطانوی اقتدار اور مداخلت سے عرب ریاستوں اور ترکی انقلابیوں کی آزادی کا سوال تھا۔ اور اس وقت ہمارے سامنے یہ سوال تھا کہ آیا ہم برطا

کے مجبور غلام دوسروں کے لیے جنھیں برطانوی حکومت ہماری طرح غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رہی ہے جدوجہد کرنے کا حق اور صلاحیت رکھتے ہیں؟ اس زمانہ میں مجھے اکثر اپنے دوست اور ساتھی جناب ولبھ بھائی پٹیل سے تبادلہ خیال کا موقع ملا جن کے ساتھ میں اس وقت مقیم تھا۔ انھوں نے کامل طور پر میرے تفکرات اور پریشانیوں میں حصہ لیا اور وہ اکثر مجھ سے کہتے "گاندھی جی ایک مرتبہ پھر پوری طاقت سے لکھنے لگے ہیں مگر اُن کے مضامین میں اور ان کے مقالوں میں نہ وہ گرمی ہے اور ولولہ انگیز نکات ہیں جو گذشتہ سال رولٹ ایکٹ کی جدوجہد کے زمانہ میں ان کے مقالوں میں ہوتے تھے۔ ولبھ بھائی پٹیل نہ مقاصدِ خلافت کے لیے کسی جوش و خروش سے معمور بھی نہ تھے اگرچہ مسٹر گاندھی روز افزوں خواہش سے ہمارے اندر یہ ولولہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ولبھ بھائی مزاج کا ایک نکھرا ہوا مذاق رکھتے تھے اور ہم خلافت کے متبرک مقاصد کا بہت مذاق اڑاتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے کہا "عزیز دعرب فلسطین شام اور عراق عرب کے لیے ہمارا لڑنا جب کہ ہم خود اپنے ملک میں برطانوی سنگینوں کے نیچے غلام بنے ہوئے ہیں یہ اچھا خاصہ تماشا نہیں تو اور کیا ہے۔ ہم اس موضوع پر جکڑ ہی کھاتے رہے مگر جب گاندھی جی نے اس کا عزم کر لیا کہ اس معاملہ کو انجام تک پہنچا کر ہی رہیں گے تو ہماری پریشانی و سراسیمگی اور بھی بڑھ گئی

ہم لوگ گورنمنٹ سے ایک کھلے ہوئے سیاسی مسئلے پر لڑنے کے لیے بلا فن و فریب بچارے کے سے جوش میں جل رہے تھے لیکن ان دنوں مسٹر گاندھی کے مضامین اور تقریروں کچھ ایسا مذہبی طمطراق اور تاریک و قیانوسی عقائد کا خول چڑھا رہتا تھا کہ ہمارے لیے وہ بالکل بے اثر و بے معنی چیز ہو کر رہ جاتی تھی۔ اس وقت بھی ہمارے دماغوں میں کوئی روشنی نہ پیدا ہو سکی جب انھوں نے ۲۲ جون ۱۹۲۰ء کو وائسرائے کی خدمت میں اپنا الٹی میٹم روانہ کیا۔ دوران جنگ میں برطانوی وزرار کی خلافت اور اسلامی مقدس مقامات کے پیماں تحفظ کی خلاف ورزی کی دُھرائی ہوئی کہانی کہنے کے بعد انھوں نے لکھا "ایسے حالات میں مجھ جیسے آدمی کے لیے یہی ایک راستہ ہے کہ برطانوی حکومت سے بالکل ترکِ تعلق اختیار کر دوں۔ یا اگر اب بھی میرا یہی اعتقاد ہو کہ برطانوی قانون اب اس وقت کے تمام مروّجہ قوانین سے بہتر ہے تو ایسے ذرائع اختیار کیے جائیں جو تمام مظالم کی اصلاح کر دیں اور اس طرح زائل شدہ اعتماد کو پھر بحال کیا جائے۔ میں اب بھی برطانوی نظام حکومت کی فوقیت کا معتقد ہوں اور ممکن کہ مجھے اس کی توقع ہو کہ انصاف اب بھی کیا جائے گا اگر ہم اپنے اندر مصائب کی برداشت کی قابلیت ظاہر کریں، حقیقتاً اس نظام کا مفہوم میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ یہ ان کی مدد کرتا ہے جو خود اپنی امداد کرتے ہیں۔ میرا یہ عقیدہ نہیں کہ یہ کمزوروں کی حفاظت کرتا ہے۔ یہ مضبوطوں کو اپنی طاقت قایم رکھنے اور بڑھانے کا پورا موقع دیتا ہے اور کمزور کو چھانٹ کر الگ کر دیتا ہے۔

"چوں کہ میں برطانوی نظام کا معتقد ہوں اس لیے ممکن ہے کہ اگر شرائط صلح پر برطانوی وزرار کے سنجیدہ بیان اور اسلامی جذبات کے مطابق نظر ثانی نہ کی گئی تو میں اپنے مسلمان دوستوں کو ہز اکسلنسی کی گورنمنٹ سے اپنی حمایت کو علٰحدہ کر لینے کی صلاح دوں، اور ہندوؤں کو اس میں شامل ہونے کی ترغیب دوں۔"

پھر مسٹر گاندھی نے کہا کہ تشدد اور ہجرت کے دو قابل اختیار طریق کار کو رد کرنے کے بعد میں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کو مشورہ دیا کہ وہ گورنمنٹ سے ترک تعاون کر کے بے انصافی کے جانب دار نہ ہوں۔" مسٹر گاندھی نے واقعی تسلیم کر لیا کہ "اگرچہ ایسے عملی احتجاج کی شاندار اور آئینی صورت ترک موالات ہی ہے" لیکن جب ملک کے عوام اس پر عمل پیرا ہوئے تو اسے بہت خطروں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ البتہ انھوں نے اس بات سے اپنی تسکین کر لی کہ اب خطرے میں نہ پڑنا اگر نظام و قانون کی مکمل تباہی نہیں تو کم از کم موجودہ خطروں سے زیادہ بڑے خطروں کا باعث ہو گا۔

لہٰذا مسٹر گاندھی بقول خود مسلمانوں کے غضب کو صرف کسی پر امن راستے کی طرف پھیر دینے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ اس طرح ملک کے غالباً بالکل یقینی پیدا ہونے والے خونی انقلاب کو بخوبی دفع کر دیں اور ساری جدوجہد کا صرف یہ مقصد

تھا کہ ہندوستان کے خشمگیں اور منتفر لوگوں کی ایک بار پھر برطانوی نظام سے آشتی پیدا کر دی جائے کیوں کہ اُن کے خیال میں یہ نظام اوروں کی نسبت بہتر ہے اگرچہ یہ صرف مضبوطوں کا محافظ اور کمزور کو تباہ کرنے والا ہے۔ لہٰذا ہم میں سے وہ لوگ جو درحقیقت برطانوی نظام کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنے کے جوش سے معمور تھے وہ ایسی نیم وفادارانہ اور بیدلی کی درخواست سے ممکن نہ تھا کہ بیدار ہوتے۔

اس کے بعد ہم نے گاندھی جی کے عملی پروگرام پر نظر ڈالی جو ہمارے سامنے اس لیے پیش کیا گیا تھا کہ اس ذریعے سے عوام کی خواہشات کی طرف گورنمنٹ کا میلان پیدا کیا جائے۔ یاد رہے کہ ۹ نومبر ۱۹۱۹ء کو بمقام دہلی جب گاندھی جی نے خلافت کمیٹی سے اس ترک موالات کی تجویز کی سفارشیں کی تھیں تو اُن کے ذہن میں بس خطابات کی واپسی اور سرکاری ملازمتوں سے دست برداری کا ایک مبہم سا خیال تھا۔ انھوں نے پروگرام کی چار منزلوں کی تفصیل جن کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے، پہلے پہل ایسے ایک مضمون مطبوعہ ۵ مئی "ینگ انڈیا" کے ذریعہ شایع کی۔ یہ بھی پہلی نظر میں بالکل ناقابل عمل، غیر امید افزا، اور غیر موثر دکھائی دیا۔ کیوں کہ پہلی دونوں منزلوں پر سیاسی پروگرام سے زیادہ ایک مقدس تمنا کا گمان ہوتا تھا۔ کسی کو یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اتنے کثیر تعداد میں خطاب یافتہ لوگ اپنے خطابات یا سرکاری ملازم اپنا مستقل ٹھکانہ ترک کر دیں گے۔ تمام پولیس اور فوج کو باز رکھنے والا تیسرا درجہ واقعی اہم معلوم ہوا اس لیے کہ ایسی تبلیغ بھی حقیقتاً ایک دلیرانہ عمل کہی جا سکتی ہے چاہے وہ کسی کامیابی سے دوچار ہو یا نہ ہو۔ لیکن اُسی مضمون میں اس تیسرے درجہ کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "وہ ایک دور دراز منزل ہے" محاصل کی التوا کا چوتھا درجہ ایک محکم اور ممکن العمل اقدام ہونے کے باعث ہمیں بہت بھایا۔ لیکن مسٹر گاندھی نے اس کے متعلق کہا کہ "یہ منزل اور بھی دور دراز اور بڑے بڑے خطرات سے بھری ہے" فی الجملہ تمام جد وجہد کا مطلب صرف یہ تھا کہ خطابات یافتگان سے ان کے خطابات اور وفادار سرکاری ملازموں سے اُن کی ملازمتوں سے دست برداری حاصل کر لی جائے۔ اور خود عوام سے اس کا مطالبہ تھا کہ وہ کسی سیاسی احتجاج میں کوئی عملی حصہ اس وقت تک نہ لیں جب تک چوتھی منزل نہ آ جائے جس کا مستقبل قریب میں کوئی امکان نہ تھا۔ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اُس شدید جوش اور مقدس جذبے کے باوجود جس سے گاندھی جی ہمارے دماغوں کو متاثر کرنا چاہتے تھے ہمارے اوپر کوئی اثر نہ ہوا۔

اور اس پروگرام کے ذریعہ گورنمنٹ کو متاثر کرنے کا جو طریق کار اختیار کیا گیا تھا اس میں بھی کسی کو ذہنی حیثیت سے قائل کر سکنے کی صلاحیت نہ تھی مسٹر گاندھی نے ساری داستان کا خلاصہ ایک لفظ میں بیان کر دیا "شدائد کی برداشت کا قانون" ہم لوگوں سے کہا جاتا تھا کہ اس بات کا یقین رکھیں کہ عدم تعاون کے چار اصولوں پر عمل کر کے جو شدائد اپنے سر لیں گے ان کی آہوں سے اہل برطانیہ کے قلوب انتہائی سخت ہونے کے باوجود پگھل کر سراپا رحم بن جائیں گے۔ مسٹر گاندھی نے اس معاملہ پر اپنے ایک خاص مضمون میں (ینگ انڈیا ۱۶ جون ۱۹۲۰ء) لکھا تھا کہ "آج تک کسی ملک نے شدائد کی آگ میں پاک ہوئے بغیر ترقی نہیں کی۔۔۔۔۔۔ زندگی موت سے پیدا ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔ کیا ہندوستان شدائد کے ذریعے پاک ہونے کے ازلی قانون کی پیروی کیے بغیر ہی اپنی غلامی سے آزاد ہو جائے گا؟ قربانی کرنے والے کی قربانی ہی سے ترقی کرنے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے مصائب کی برداشت جس قدر زیادہ ہو گی اتنی ہی عظیم الشان ترقی بھی ہو گی۔ مسیح کا ایثار اسی قانون کے ماتحت ایک دکھ بھری دنیا کے لیے وجہ آزادی ثابت ہوا۔"

"ہمیں مظالم کی تلافی اس وقت تک قبول نہیں کرنی چاہیے۔ جب تک ظلم کرنے والے کے دل میں اپنی زیادتی کا احساس بیدار نہ ہو جائے ہمیں نہ اپنا خوف ہونا چاہیے اور نہ دوسروں کا جنھیں مصائب برداشت کرنا ہے اور اس میں شریک رہنا ہے ہمیں غلطی کرنے والے کو بلاواسطہ یا بالواسطہ مدد پہنچانے سے انکار کر کے اس غلطی کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ اگر کوئی حکومت بہت

بڑی ناانصافی کرے تو محکوم کو اس سے تعاون ترک کر دینا چاہئے۔ یہ کلی یا جزوی طور پر حاکم کو شرارتوں سے باز رکھنے کے لیے کافی ہوگا۔"

بظاہر دو طریقے تھے جن سے گاندھی جی حکومت کو ترک موالات کے ذریعے جھکانے کا خیال رکھتے تھے۔ اوّل یہ کہ ان کا خیال تھا کہ اگر ملک کے سیاسی روشن خیال طبقے اور عوام الناس نے ان کے پورے پروگرام کو بڑے پیمانے پر اختیار کرلیا تو گورنمنٹ کا کام بند ہو جائے گا۔ اگرچہ ابھی تک عوام کو کوئی موثر سیاسی لائحہ عمل نہیں دیا گیا تھا جس میں وہ لگے رہتے، اور پھر خطاب یافتگان اور سرکاری ملازموں کو کافی تعداد میں گاندھی جی کی درخواست پر لبیک کہنے پر آمادہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دوسرے یہ کہ گاندھی جی کو توقع تھی کہ جب لوگ ترک موالات کے آخری مرحلوں میں مصیبتیں برداشت کر چکے ہوں گے تو گورنمنٹ اگر بالکل بے کار نہ ہوگی تو آخر کار وہ ان سے بات چیت کرنے کی طرف ضرور راغب ہوگی انھیں درحقیقت اس کا یقین تھا اور آج بھی ہے کہ وہ روحانی اشراق کے ذریعے برطانوی آقاؤں کے قلوب بدل دیں گے۔ لیکن اس فعل کا سیاست سے دور کا بھی تعلق نظر نہیں آتا۔ اس کی روحانی قدر جو کچھ بھی ہو لیکن اس میں ایک کثیر جماعت کو اپنے ساتھ لینے کی صلاحیت قطعاً نہ تھی اس کے علاوہ ابتدائی دور میں گاندھی جی ترک موالات کو حکومت کی مشینری کو تباہ کرنے کے آلہ سے زیادہ ایک مقدس فرض کی حیثیت دیتے رہے کہ ایک پاپی حکومت سے ہر قسم کا تعاون ترک کر دیا جائے لہٰذا یہ لائحہ عمل ۱۹۱۹ء کے قانون شکنی کے عملی احتجاج کے پروگرام سے بالکل مختلف نظر آیا۔ جس کا مدعا، گورنمنٹ کو راولٹ ایکٹ کے واپس لینے پر مجبور کرنا تھا، اور کئی مہینوں میں بھی عوام میں وہ والہانہ جوش و خروش اور جذبۂ اتباع نہ پیدا ہو سکا جو پچھلی تحریک میں چند ہفتوں ہی میں پیدا ہو گیا تھا۔

ہم نے اس معاملے میں اپنی مشکلات اور شکوک سے گاندھی جی کو ناآشنا بھی نہیں رہنے دیا۔ غالباً ۱۹۲۰ء کا واقعہ ہے کہ میں نے گجرات کے سربرآوردہ لیڈروں کو خلافت کے مسئلے اور اس عملی لائحہ عمل پر بحث کرنے کے لیے جسے گاندھی جی نے ملک کے سامنے پیش کیا تھا، اُن کے آشرم میں مدعو کیا۔ ہوم رول لیگ کی ابتدائی جدوجہد اور پچھلی ستیہ گرہ کے تمام روح رواں اس نئی تحریک کے متعلق گاندھی جی کے خیالات معلوم کرنے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ میں ان سب کی طرف سے وکالت کر رہا تھا میں نے گاندھی جی سے عرب عراق عرب، شام اور فلسطین کے عربوں کی آزادی کے بین الاقوامی مسئلہ پر بحثیں کیں۔ کیوں کہ تمام متبرک اور توہمانہ طمطراق کو نظر انداز کرنے کے بعد مسئلہ خلافت کا یہی لب لباب تھا۔ مسٹر گاندھی نے سُنا مگر اس خالص سیاسی سوال پر بہت کم لب کشائی کی۔ وہ مسلم رائے کے تابوت سے مضبوطی کے ساتھ لپٹ گئے جو ہماری رائے میں بالکل توہمانہ اور فرقہ پرستانہ جذبات پر مبنی تھا۔ لہٰذا یہ مجمع کسی نتیجے پر پہنچے ہوئے بغیر ہی منتشر ہو گیا۔ اور آخر کار میرے تمام دوستوں نے جو بالفاظ دیگر صوبہ میں گاندھی جی کے "اولڈ گارڈ" کے قائم کرنے والے تھے، مجھ سے کہا کہ "یہ تمام پیچیدہ مباحث ہماری سمجھ میں نہیں آتے اور ہم تحریک ترک موالات کے قائل نہیں ہیں۔ بہر حال جب تمھاری سمجھ میں آجائے کہ اس میں شریک ہو جانا ہی مناسب ہے تو ہم کو بتا دینا ہم تحریک کو کامیاب بنانے کی حتی الامکان پوری کوشش کریں گے۔"

میرے تمام ساتھی تو اپنی رائے اور شبہات پر قائم رہنے میں آزاد تھے مگر میں اپنے ہفتہ واری نوجیون کے سب ایڈیٹر ہونے کی حیثیت سے گاندھی جی سے وابستہ تھا۔ اور ان دنوں چوں کہ وہ ینگ انڈیا کے لیے انگریزی میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ اس لیے خلافت اور ترک موالات کے پروگرام پر اُن کے جتنے تبلیغی مضامین ہوتے ان کے ترجمے کا ناقابل رشک کام میرے سپرد کیا گیا۔ جس کا میں کبھی معتقد نہ ہو سکا۔ ان دنوں میرے اندر غصہ اور بغاوت کا جذبہ پیدا ہونے لگا۔ آخر کار میں ضبط نہ کر سکا۔ جون ۱۹۲۰ء میں مسٹر گاندھی کی خدمت میں حاضر ہوا، اور جس مقصد کے لیے وہ اٹھے تھے اور جو تحریک وہ شروع کرنے والے تھے اس کے متعلق اپنے تمام اضطراری شبہات اور مشکلات بیان کر کے میں نے اپنے دل کے بوجھ کو ہلکا کر لیا تو

اسسٹنٹ اڈیٹری سے اپنا استعفا پیش کیا۔ درحقیقت ایک ایسے اخبار سے جسے پانچ سال پہلے میں نے جاری کیا تھا اور جس کی وجہ سے میں نے ایک سال گاندھی جی کی ماتحتی میں کام کیا تھا، ترکِ تعلق کرنا ہی نہیں بلکہ ایک بڑے لیڈر کے عقائد اور عملی نظام کے خلاف جس کی میں نے تین سال تک اس جوش وعقیدت کے ساتھ اتباع کی تھی، بغاوت کرنا بھی میرے لیے تکلیف دہ تھا۔ مسٹر گاندھی نے معمولاً اپنے پدرانہ شفقت اور محبت آمیز ترغیبات سے بحثیں کرنے کی کوشش کی۔ بہرحال میں غیر مطمئن ہی رہا اور سنہ ۱۹۳۰ء کے آخر میں میں نے اپنے پیارے اخبار کو خیرباد کہہ دیا اور گاندھی جی کی تمام تبلیغی اور تنظیمی مجلسوں سے اپنے کو عملاً بالکل منقطع کرلیا۔

تیئیسواں باب

گجرات کا ہر چہ باداباد پر عمل

جولائی میں سیاست کا دھارا ایک نئے رُخ پر بہتا ہوا نظر آیا۔ لالہ لاجپت رائے نے اپنے اُردو اخبار بندے ماترم کے ایک مضمون کے دوران میں اس سرخی کے ماتحت کہ "میں انتخاب کے لیے نہ کھڑا ہوں گا" جولائی سنہ ۱۹۲۰ء کے پہلے ہفتے میں اس شائع کے بعد کہ گورنمنٹ نے پنجاب کے مظالم کی تلافی کیسے کی، ذیل کے الفاظ میں لیجسلیٹو کونسل کے مقاطعہ پر بہت زور دیا۔ "یہ نئی کونسلیں ہمارے لیے اُسی وقت نفع بخش ثابت ہوسکتی ہیں جب ہندستانی اور سرکاری افراد ہم خیال اور متحد ہوکر کام کریں اور باہمی مشورے سے ملک کی گتھیوں کو مل جل کر سلجھائیں۔ لیکن پنجاب کی موجودہ حالت سے اس اُمید کے برآنے کی کوئی صورت نہیں۔ اگر سول اور ملٹری گزٹ صحیح طور سے پنجابی افسروں (یورپین) کے خیالات کی نمائندگی کرتا ہے تو مجھے یہ کہنے میں کچھ تامل نہیں کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ہندستانی اور یورپین مل کر ملک کی بہبودی کے لیے کام کرسکیں۔ میری یہ دلی تمنا ہے کہ ایسا وقت ضرور آئے لیکن ابھی یہ کہنا کہ وہ وقت آگیا واقعات سے چشم پوشی کرنا ہے ابھی تک وہ حاکم ہیں ہم محکوم۔ پنجاب کی اشاعتی کمیٹی جسے گورنمنٹ کا اعتماد بھی حاصل ہے وہ بھی یہی چیز ظاہر کرتی ہے۔ لہٰذا میرا خیال ہے کہ میں کونسل میں رہ کر اپنے ملک کے لیے فائدہ مند نہیں ہوسکتا اس لیے یہی بہتر ہے کہ میں اس میں داخل نہ ہوں۔"

لہٰذا پنجاب کے مظالم کی بنا پر جن کی نہایت عمدہ تصویر گاندھی کمیٹی کے رپورٹ کے اندر ایسی دہشت انگیز تفصیل کے ساتھ موجود ہے لالہ راجپت رائے نے پہلی مرتبہ ملک کو تمام قانون ساز مجلسوں کے مقاطعہ پر ابھارا۔ چوں کہ یہ درخواست ملک کے قدیم ترین اور سب سے زیادہ جنگجو شخص کے زبان سے نکلی تھی اس لیے صاف دل میں اتر گئی۔ ہم کو پہلی مرتبہ پنجاب کی شکایات کی بنا پر یہ ایک حقیقی سیاسی لائحہ عمل نظر آیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا تمام سرکاری عملہ بلکہ سارا ہندستان کوڑوں، پستولوں، رائفلوں اور سنگینوں سے مسلح ہوکر پچھلے سال کی طرح پھر ہزاروں بے گناہ مردوں اور عورتوں کو مجروح و مقتول کرنے پر آمادہ ہے۔

ابھی تک انھوں نے ذرہ برابر اپنی سفاکیوں اور خونریزیوں پر ندامت کا اظہار نہیں کیا تھا للٰذا ہم کو ان کا ہاتھ اب بھی اسی طرح خون آلود نظر آتا تھا۔ ایسی صورت میں ہندستان کے پاپی اور ناپشیمان عمال کے سفاک نمائندوں سے ہمارا اتحاد کیوں کر ممکن ہو سکتا تھا اور ملک کے مفاد کے لیے بھلا منظم اور باقاعدہ جبر و تشدد کرنے والے خیرہ سروں سے تعاون کرنے سے کیا حاصل ہو سکتا تھا، کونسلوں کا عام مقاطعہ انھیں تباہ نہیں کر سکتا تھا مگر یہ ضرور کر سکتا تھا کہ ان کی حیثیت کٹھ پتلی کے تماشے کی سی بنا کر رکھ دیتا اور عوام کی نظر سے اُن کا وقار بالکل ختم ہو جاتا۔

یہ درحقیقت اس نئے دستور پر حملہ کرنے کا ایک انوکھا طریقہ معلوم ہوتا تھا جس سے امرتسر کانگریس کی تجویز کے باوجود بھی ہمارے دماغ رضامند نہ ہوئے ۔ لالہ لاجپت رائے کی تجویز مقاطعہ نے ان نفرت انگیز اصلاحات کے مرکز پر براہ راست وار کرنے کا ایک آلہ دے دیا۔ پنجاب کے مظالم کا انتقام لینے کے جذبہ نے ہماری بے حسی زائل کر کے ہم میں ایک ہیجان انگیز اشتعال پیدا کر دیا ہم نے ۱۹۲۱ء کے قانون اصلاحات کے ماتحت چند ہی مہینوں میں قایم ہونے والی کونسلوں کے مقاطعہ کی جدوجہد نہایت سرگرمی سے شروع کر دی۔

چوں کہ گاندھی جی سیاسی رد کے ہلکے سے ہلکے انحراف کو فوراً تاڑ لیتے ہیں لہٰذا انھوں نے لالہ راجپت رائے کی تجویز مقاطعہ پر ہاتھ مارنے اور اُسے ترک موالات کے ابتدائی لائحہ عمل میں شامل کرنے کی فوراً کوشش کی۔ اس خیال سے کہ کہیں میرے تجزیہ کی صحت پر لوگ شک نہ کریں گاندھی جی کے ایک مضمون کا حوالہ دیتا ہوں جو ینگ انڈیا میں ۹ جون ۱۹۲۰ء کو اس عنوان کے تحت شایع ہوا تھا " ووٹ دینے والوں کو کیا کرنا چاہیے":

یاد رہے کہ مئی کے مہینے میں خلافت اور پنجاب کے متعلق بدترین صورت حال پیدا ہو چکی تھی۔ خلافت کمیٹی نے گاندھی جی کے پیش کردہ ترک موالات کے نقشے کو قبول ہی کر لیا تھا۔ اور الہ آباد کانفرنس پہلی اگست ۱۹۲۰ء کو ترک موالات شروع کر دینے کی غرض سے ۳۰ جون کو وائسرائے کو الٹی میٹم دینے کا فیصلہ بھی کر چکی تھی۔ یہ بھی یاد رہے کہ ۵ مئی کے پروگرام میں جس کا خاکہ گاندھی جی نے تیار کیا تھا پہلا سوچا سمجھا مرحلہ خطابات کا ترک کرنا اور اعزازی عہدوں سے مستعفی ہونا تھا۔ اور اس میں مدرسوں، عدالتوں اور کونسلوں کے مقاطعہ کا کوئی تذکرہ نہیں تھا۔

مسٹر گاندھی کا یہ فعل حیرت انگیز تھا کہ انہوں نے ایک مضمون کے دوران میں جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے (۹ جون ۱۹۲۰ء) جب کہ ترک موالات کی بڑی مہم کی پیشین گوئی یقینی صورت میں کی جا سکتی تھی آنے والے انتخاب کے مقاطعہ کی حمایت کرنا تو درکنار، ووٹروں کو "اہل کردار" کے انتخاب کا حکم دیا بشرطیکہ وہ ذیل کے سوالات کا جواب دے کر انھیں مطمئن کر دیں:-

"(۱) آپ کو موجودہ سودیشی تحریک منظور ہے؟

(۲) کیا آپ کی رائے ہے کہ ہر صوبے کا کام وہیں کی زبان میں ہوا کرے اور یہ کہ قوم کے امور ہندستانی میں طے پایا کریں جو اردو و ہندی کا مجموعہ ہوگی؟

(۳) کیا آپ مانتے ہیں کہ ہندستانی صوبوں کی تقسیم انتظامی اور سیاسی غرض سے کی گئی تھی اور اس میں عوام کی خواہش کو کوئی دخل نہ تھا؟

(۴) کیا آپ تسلیم کرتے ہیں کہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر ہندستان کی اصلاح کا کوئی دور و دراز امکان بھی نہیں ہے؟

اس طرح مسٹر گاندھی جہاں ملک کو سیاسی جنگجوئی کی بحرانی سطح تک ابھارنے میں مشغول تھے، وہیں یہی نہیں کہ انھوں نے صرف کونسلوں کے مقاطعہ پر غور نہیں کیا بلکہ ایک معمولی تجویز کے علاوہ جو انھوں نے اس مضمون کے اختتامی سطور میں پیش کی، ووٹروں سے یہ بھی نہیں کہا کہ وہ خلافت کے یا پنجاب کے پیچیدہ مسائل یا اور کسی سیاسی سوال سے متعلق اپنی حکمت عملی یا اعتقادات

کے مطابق اُمید واروں کو پرکھیں۔ بہرحال اس کے متعلق کسی اختلاف کی گنجائش نہیں کہ مسٹر گاندھی نے پہلی مرتبہ ۷ جولائی کو کونسلوں کے مقاطعہ کی تائید کی (اس معاملے پر لالہ لاجپت رائے کا مضمون پہلے ہی شایع ہو چکا تھا) پھر اسی دن مسٹر گاندھی نے ترک موالات کیٹی (خلافت کمیٹی) کے شایع شدہ پروگرام میں پہلی بار کونسلوں عدالتوں اور مدرسوں کا مقاطعہ شامل کر دیا۔

اس طرح مسٹر گاندھی پھر کامیابی کے ساتھ ایک پنتھ دو کاج کر گزرے۔ انھوں نے پنجاب اور خلافت کے معاملات کو دوہرے پروگرام کی صورت میں متحد کر دیا تاکہ یہ تحریک ترک موالات کے لیے قدم رکھ کر جست کرنے کی جگہ کا کام دے۔ انھوں نے لالہ لاجپت رائے اور سارے ہندستان کے ایسے لوگوں کی تائید بھی حاصل کر لی جن کے دلوں پر خلافت سے زیادہ پنجاب کی چوٹ تھی۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے اپنی تحریک ترک موالات میں ترمیم و اضافہ کر کے اور وسعت پیدا کر دی۔ تاکہ ملک کے روشن خیال طبقوں کے شدید احساسات کے لیے احتجاجی اظہار کا موقع پیش کر دیں۔

لیکن کونسل کے مقاطعہ ہی کی ایک جدت نہیں تھی جسے مسٹر گاندھی نے ترک موالات کے اول مرحلے میں شامل کیا۔ ترک موالات کے پورے پروگرام کا جو انھوں نے ۵ مئی کو وضع کیا، اس پروگرام کے مرحلۂ اول سے موازنہ کرتے ہوئے جسے ترک موالات کیٹی نے ۷ جولائی کو پیش کیا، ہمیں دو اور انوکھی خبریں نظر آتی ہیں۔ عدالتوں کا مقاطعہ اور مدرسوں کا مقاطعہ۔

سیاسی کارکن اِن دونوں مقاطعوں سے پھر چکر میں آ گیے کیوں کہ مشکل ہی سے سمجھ میں آتا تھا کہ یہ مقاطعے حکومت کو پریشان یا سراسیمہ کر سکتے ہیں۔ اب میں ناظرین کے سامنے اس کے اسباب پیش کرتا ہوں کہ گاندھی جی نے کیوں ایسے مقاطعوں کی تجویز پیش کی جن کے متعلق وہ خود بھی جانتے تھے کہ رائے عامہ کو پسند نہ آئیں گے۔

اس کے اسباب حسب ذیل تھے۔ ۱۱ اگست ۱۹۲۰ء کو ینگ انڈیا میں لکھتے ہوئے انھوں نے حسب ذیل شرائط کے ماتحت بہت زور دیا کہ وکلا اپنا پیشہ ترک کر دیں: "میں عرض کرتا ہوں کہ قومی ترک موالات قانون پیشہ اصحاب سے اپنے اس پیشہ کو ترک کر دینے کا مطالبہ کرتا ہے۔ غالباً حکومت سے اس کے قوانین کے ذریعے وکیلوں سے زیادہ کوئی تعاون نہیں کرتا۔ وکلا لوگوں کے سامنے قوانین کی ترجمانی کر کے اقتدار حکومت کی تائید کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عدالتوں کے خاص خطابات سے مخاطب کیے جاتے ہیں۔ البتہ کہا جا سکتا ہے کہ وکیل ہی ایں جو گورنمنٹ کے خلاف سخت جنگ کرتے ہیں۔ یہ بات بے شک صحیح ہے لیکن یہ اس پیشے کی جبلّی شرارت کو نہیں روک سکتی۔ لہٰذا جب قوم حکومت کو معطل کرنا چاہتی ہے اور قانون پیشہ لوگ گورنمنٹ کا سر جھکانے میں اس کے موید ہیں تو انہیں اپنا پیشہ ضرور ملتوی کرنا چاہیے۔"

ہمیں ایسا معلوم ہوا کہ چوں کہ قانون دانوں کے دماغ قانونی جھک جھک اور غلط سخن سازیوں سے کج ہو چکے تھے اور ذاتی اغراض نے ان کو سادہ لوح عوام اور حکومت کے درمیان ایک ثالث کی حیثیت دے رکھی تھی۔ لہٰذا گاندھی جی کے پکار پر لبیک کہنا ان کے لیے سب سے زیادہ ناممکن ہے۔ لیکن اس بیان کا مخاطب ایک مقدمہ باز طبقہ بھی تھا جس کا اس نئی پکار پر لبیک کہنا کسی حد تک ممکن تھا۔ پھر بھی پروگرام کی یہ شق قانونی عدالتوں کی حکومت کو کوئی برباد کن صدمہ پہنچاتی ہوئی نہ معلوم ہوئی۔ بلکہ وہ بدستور اُسی چہل پہل کے ساتھ جاری رہیں یہاں پھر ایک سیاسی دلیل کی کمی کی وجہ سے مسٹر گاندھی گورنمنٹ کی مادی بنیادوں سے زیادہ اس کی اخلاقی بنیادوں کو متزلزل کر دیتے اور کبھی اس بحث کو ایک روحانی دھندلی فضا میں کھینچ لے جاتے جو کارکنوں کی بڑی اکثریت کو ابھارنے یا بیدار کرنے سے قاصر رہتی۔

مدرسوں کا مقاطعہ عدالتوں کے مقاطعہ سے بھی زیادہ حیرت انگیز اور بعید از عقل تھا۔ مسٹر گاندھی نے ینگ انڈیا ۱۱ اگست ۱۹۲۰ء کے اسی نمبر میں اسکولوں کے مقاطعہ پر بہت زور دیا جو ذیل میں درج ہے:۔

"میرے لیے ترک موالات کی اسکیم منجملہ اور چیزوں کے اتباع کی وسعت اور شدت کے امتحان کا ذریعہ ہے۔ کیا ہم مصیبتوں کے سہنے کے لیے تیار ہیں؟ یہ کہا گیا ہے کہ خطاب یافتہ اصحاب سے ہم زیادہ توقع نہ رکھیں۔ ...... میں معترضین کے سامنے اپنی دلیل کا تحفہ

پیش کرتے ہوئے پوچھتا ہوں کہ مکتبی لڑکوں اور کالج کے نوجوان طلبار کے والدین کے متعلق وہ لوگ کیا کہتے ہیں؟ ان کا تعلق گورنمنٹ سے اتنا قریبی نہیں جتنا خطاب یافتہ لوگوں کا۔ انہیں اتنا کافی احساس ہے یا نہیں جو اُن سے مکتبی تعلیم کی قربانی کرا سکے"؟

آمدم برسر مطلب ۹ ستمبر ۱۹۲۰ء کو مسٹر گاندھی نے معترضین کو حسب ذیل جوابات دیئے :۔

" یہ کیا بات ہے کہ بعض لوگ اس مسئلہ کی صداقت کو صاف صاف دیکھ رہے ہیں اور بعض مسلم رہنما اسے غلط قرار دیتے ہوئے مسترد کرتے ہیں۔ اس کا جواب جو میں پا چکا ہوں وہ یہ ہے کہ موخر الذکر نے اول الذکر طبقے کی طرح موجودہ نظام حکومت کو ایک غیر مخلوط شر نہیں سمجھا بالفاظ دیگر مخالفین نے کافی طور پر پنجاب اور خلافت کے مظالم کی اہمیت محسوس نہیں کی۔ دوسروں کی طرح انھوں نے یہ محسوس نہیں کیا کہ یہ مظالم قطعی طور پر اس بات کے ثبوت ہیں کہ موجودہ حکومت کی کارروائیاں مجموعی حیثیت سے قومی ترقی کے لیے مضرت رساں ہیں مجھے بالکل یقین ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ایسے مدرسوں میں نہ بٹھائیں گے جہاں کسی طرح بھی ترقی کرنے کے بجائے اُن کی تنزلی کا زیادہ امکان ہو۔ اور اسی طرح مجھے اس پر بھی یقین ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ایسے مدرسوں میں نہ بھیجیں گے جن کا انتظام تحفظ بلکہ جن پر اثر بھی ایسے قزاقوں کا ہو جنھوں نے ان کی ساری ملکیت ان سے چھین لی ہو ایسی حکومت کے زیر اثر کوئی تعلیم حاصل کرنا سراسر گناہ ہے خواہ کتنے ہی اعلیٰ قسم کی کیوں نہ ہوں، جیسے وہ دودھ جس میں زہر ملا ہوا ہو۔ سب کا سب مضر ہوتا ہے "۔

اس طرح مسٹر گاندھی نے کسی سیاسی مصلحت سے زیادہ اپنے ذاتی جذبات اور حکومت کے متعلق اپنے بدلے ہوئے نظریات کی بنا پر اس مقاطعہ پر زور دیا (کیوں کہ ایک ہی رات میں اسکولوں کی صورت وسیرت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوگئی تھی) پنجاب اور خلافت سے متعلق عوام کی برافروختگی اور برہمی کو پیش نظر رکھتے ہوئے مسٹر گاندھی لوگوں کی قوت برداشت کا امتحان لینے اور اسے مزید تقویت دینے کی طرف فوراً راغب ہوئے۔ لہٰذا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس دُہرے مقاطعہ کی حکومت پر براہ راست حملہ کرنے سے زیادہ لوگوں کی اخلاقی تربیت اور تنظیم مقصود تھی۔

بہر حال اس معاملے میں مسٹر گاندھی کی ذہنیت کا سمجھنا ہمارے لیے مشکل نہ تھا۔ انھوں نے ینگ انڈیا ۱۰ ر نومبر ۱۹۲۰ء کی بعد کی اشاعت میں اپنی تائید کے ساتھ ٹالسٹائی کا ایک مضمون بطور اقتباس پیش کیا جس کا مدعا یہ تھا کہ حکومت کو معطل کرنے کے لیے بچوں کو ان مدارس سے جو سرکار کے زیر اقتدار ہوں اٹھا لیا جائے۔

تمام سرکاری درسگاہوں کونسلوں اور عدالتوں سے گاندھی جی کو بنیادی اختلاف تھا اس کی حقیقت ہم کو ان کے فلسفیانہ مزاج کے نظریہ سے جو ان کی کتاب ہند سوراج میں درج تھا ــــــ معلوم ہوئی۔

ہم نے ان کے گہرے خلوص کی بہت داد دی۔ جب انھوں نے اپنے کو "ایک گہری چال بازی" اور "اپنے مذہبی شغف کو ہندستان کے سر تھوپنے کے لیے موجودہ کشمکش کو استعمال کرنے" اور ہندستان کو بھینٹ چڑھا کر مذہبی تجربات کرنے" کے جرم سے اپنے آپ کو "بری" ثابت کرنے کی کوشش کی ہیں اس میں کچھ شبہہ نہیں تھا کہ وہ عدالتوں اور خاص طور سے مدرسوں کے ایسے سرسری مقاطعہ پر کبھی زور نہ دیتے اگر ان تعلیم گاہوں کی خرابیوں کا انہیں اصولاً یقین نہ ہوتا دوسرے سیاسی رہنما اور کارکن بہر حال اس معاملے کے متعلق گاندھی جی کے اصولی نظریات میں شریک نہیں رہے اور یہ ہی نہیں بلکہ وقت پر انھوں نے اُن سے انتہائی اختلاف کا اظہار کیا۔ لہٰذا ہندستان کے ہر گوشے سے گاندھی جی کے مدارس اور عدالتوں کے اس دُہرے مقاطعہ کے منصوبے کے خلاف شور وغوغا بلند ہوا۔ اور اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب مسٹر گاندھی کانگریس کو یا عوام کی اکثریت کو اپنے اس عجوبہ روزگار طرز عمل میں جسے وہ ان کے سر منڈھنا چاہتے تھے اپنا متبع نہیں بنا سکیں گے۔

جہاں تک قوم کا تعلق ہے یہ معاملہ ابھی تذبذب میں پڑا تھا کیوں کہ کانگریس کا خاص اجلاس بمقام کلکتہ منعقد ہونے والا تھا کہ جولائی اور اگست میں ہم میں سے بعض لوگ گاندھی جی کے اس نئے پروگرام کی طرف تیزی سے ڈھلکنے لگے۔ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ محض مظالم پنجاب کی بنا پر کونسلوں کا مجوزہ مقاطعہ منافرت و برہمی کے اُن حد سے بڑھے ہوئے جذبات کے مظاہرہ کی ایک صورت تھی جو ہمارے دلوں میں مشتعل تھے۔ اور فی الحال صرف کونسلوں کا نہیں بلکہ عدالتوں اور مدرسوں کا مقاطعہ جو شروع میں محض ایک جذباتی اور ناقابل عمل پروگرام معلوم ہوتا تھا واقعی عملی شکل اختیار کرنے لگا۔ گاندھی جی نے اپنے مقربین خاص سے نجی گفتگو کے دوران میں اپنا یہ منصوبہ ظاہر کیا کہ جیسے جیسے قوم بابی حکومت کی درسگاہوں سے علٰحدہ ہوتی جائے گی وہ تعمیری اور قومی درسگاہیں قائم کرتے جائیں گے۔ چنانچہ انھوں نے ہمیں ہدایت کی کہ ہم ووٹ دینے والوں کو محض انتخاب گاہوں سے دور رکھنے ہی پر اکتفا نہ کریں بلکہ اس خیال کو پیش نظر رکھ کر انھیں کانگریس کے دائرہ میں جمع کریں کہ ملک کی قومی حکومت کی حیثیت سے کانگریس کے کل پرزوں اور سرگرمیوں کو تنظیم اور ترقی دینے کے کام میں لائیں گے۔ جب عدالتوں کے مجوزہ مقاطعہ سے ہمارے دماغ پھر پراگندہ ہوئے تو گاندھی جی نے حسب ذیل جواب دیا (ینگ انڈیا ۱۱ اگست ۱۹۲۰ء)

"اس کے علاوہ میری اسکیم میں التوا کا مطلب جمود نہیں۔ قانون پیشہ حضرات کو اپنا کام چھوڑ کر آرام نہیں کرنا ہے۔ اُن سے یہ توقع کی جائے گی وہ اپنے موکلوں پر زور ڈالیں کہ وہ بھی عدالتوں کا مقاطعہ کریں اور نزاعات کے تصفیہ کے لیے پنچایتی عدالتیں مقرر کرنی پڑیں گی"۔ اس کے علاوہ انھوں نے اس امر پر بھی زور دیا کہ قانون پیشہ حضرات کو عارضی طور پر وکالت چھوڑ کر محض فرصت کے اوقات میں کام کرنے کے بجائے پورے وقت کے لیے قوم کا خادم بننا چاہیے۔

اس طرح ترکِ موالات کی جد و جہد کے دوران میں کانگریس کے زیر سرپرستی قومی پنچایتی عدالتوں کا ایک سلسلہ قائم کرنے کا ہمیں خواب دکھایا گیا بالکل اُسی طرح جیسے آئری سن فینروں نے اپنی سخت جد و جہد کے آخری مرحلوں میں کیا تھا۔ اس معاملے میں آئرلینڈ والوں کی نظیر نے ہمارے تخیل کو گرمانے اور ہمیں گاندھی جی کے محکم اساس نقشے کی گہری حکمت پر پہلے سے زیادہ وثوق کے ساتھ اعتماد کی ترغیب دینے میں کافی مدد دی۔

اب مدرسوں کے مقاطعہ کے متعلق سُنیئے۔ اس مسئلے پر ہم لوگوں نے گاندھی جی سے متعدد بار بحثیں کیں۔ سرکاری مدرسوں کے بانی ہونے کے متعلق اُن کے تمام شاندار مضامین بھی ہم کو مطمئن نہ کر سکے اور ہم نے گاندھی جی کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر آپ کی پکار پر بچوں نے بغیر یہ سوچے سمجھے کہ اب انھیں کیا کرنا ہے مدرسوں کو چھوڑ دیا تو کتنی تباہی کا سامان ہوگا۔ مسٹر گاندھی نے چالاکی سے جواب دیا . . . . . . کہ جیسے جیسے مدرسین اور طلبار سرکاری درسگاہیں چھوڑیں گے اسی حساب سے اصل کام خود بخود منظم ہوتا جائے گا۔ جو بچے سرکاری مدرسوں کو چھوڑ چکے ہوں گے ان کے فائدے کے لیے انہیں اساتذہ یا نئے استادوں کے ذریعہ قومی مدراس قایم کر دیے جائیں گے اور کانگریس ان کی مدد کرے گی۔ اس طرح ہمیں ترغیب دی گئی کہ عدالتوں یا مدرسوں کے بائیکاٹ کا خمیازہ نہ موکلوں کو بھگتنا ہوگا نہ طلبار کو اس لیے کہ کانگریس عوام کی پُرزور تائید کے ذریعے ان کے فائدے کے لیے سینکڑوں پنچایتی عدالتیں اور ہزاروں مدرسے فوراً کھول دینے کے قابل ہو جائے گی۔ کچھ دنوں یا ہفتوں کے ناگزیر انتشار سے قطع نظر کر کے ان دونوں مقاطعوں میں جو کامیابی حاصل ہوگی اس کا متوازی غیر سرکاری اداروں کی قیام کی صورت میں ظاہر ہوگا اس طرح ہم نے دیکھا کہ ترکِ موالات کا لائحہ عمل اپنے ابتدائی مرحلوں میں بھی درحقیقت جذباتی بے حاصلی کی رو میں نہیں سوچا گیا تھا بلکہ اس کا مدعا تھا کہ سیاسی کارکنوں کو متوازی قومی حکومت قایم کرنے کے ڈھرہ پر لگایا جا سکے۔ یہاں پھر آئرلینڈ کی مثال نے ہمارے ولولوں کو تیز کر دیا اور جولائی کے مہینے میں ہم نے عزم کر لیا کہ اب کمربستہ ہو کر گاندھی جی کے ساتھ ہولیں اور اس زبردست تاریخی جنگ کا جب اگلے ہی مہینہ میں گاندھی جی شروع کرنے والے تھے کام شروع کریں۔

اپنے کو گاندھی جی کا عقیدت مند بنا دینے کے بعد میں فوراً ہی اپنے رفقاءِ کار کو بھی اسی مسلک میں لانے کے لیے گجرات روانہ ہوا۔ اپنے بعض بہترین دوستوں سے مشورہ کرنے اور انھیں اپنا ہم خیال بنانے کے بعد میں نے گاندھی جی کے ترکِ موالات کے پروگرام پر بحث و تمحیص کرنے اور اس کی منظوری کے لیے گجرات سیاسی کانفرنس کی مجلس عاملہ کا جلسہ طلب کیا۔ اس سلسلے میں میرے دوست مسٹر بنکر نے میری بہت مدد کی۔ اس جلسہ کے اکثر ارکان ہوم رول اور گاندھی جی کے ستیہ آگرہ کی جد و جہد کے ذریعے ہمارے ساتھ سیاست کا درس لے چکے تھے لہٰذا اکثریت کو اپنے نقطۂ نظر کی طرف راغب کرنے میں ہمیں کوئی دشواری نہ ہوئی کمیٹی نے ترک موالات کے سارے پروگرام کو تہ دل سے قبول کر لیا اور طے کیا کہ اپنی اس تجویز کو تمام باشندگان گجرات کے عزم اور خواہش کی جامع ہونے کی حیثیت سے کانگریس کے آئندہ اجلاس میں پیش کرے۔

ہم نے اس طرح خالص سیاسی جماعت کے ماتحت قومی رائے کو منظم کرنے میں سبقت کی یہ ضرور یاد رہے کہ ابھی تک جتنی شورشیں خلافت کمیٹی کے مسلم رہنماؤں یا گاندھی جی کے ذریعے جاری ہوئیں اُن میں تنہا گاندھی جی کی ذمہ داری تھی۔ اس لیے تنظیمی نقطۂ نگاہ سے صورت بالکل غیر اطمینان بخش تھی۔ گاندھی جی کو خود بہت جلد اس کا احساس ہو گیا۔ اس کانفرنس کی مجلسِ عاملہ کی تجاویز سے گاندھی جی کی ہمت بلند ہو گئی اور انہوں نے ہمیں یہ مشورہ دیا کہ اگست کے آخر میں گجرات پولیٹکل کانفرنس کا ایک عام اجلاس طلب کیا جائے تاکہ وہ ستمبر کے شروع میں کانگریس کے خاص اجلاس کے سامنے باشندگانِ گجرات کی غور کردہ رائے پیش کر سکیں۔ بلاشبہ یہ بہت بڑا حکم تھا۔ چند ہفتے رہ گئے تھے اور ایک ایسی بڑی کانفرنس کو طلب کرنے اور اُس کی تیاری کیلئے کم سے کم چند ماہ کی ضرورت تھی۔ میرے بہت سے احباب نے اُس معاملے میں کسی قسم کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کیا۔ مگر میں بغیر کچھ سوچے سمجھے ایک ایسے جوش و خروش کے ساتھ جو نوجوانوں کے دل میں ہوتا ہے اس پر آمادہ ہو گیا اور میں نے گاندھی جی سے وعدہ کر لیا کہ یہ چند ہفتے جو باقی رہ گئے ہیں اسی میں کانفرنس کا سب انتظام کروں گا۔ گاندھی جی نے خود اپنی سوانح عمری میں اس کانفرنس کی روداد اس طرح تحریر فرمائی ہے:-

”گجرات کانفرنس میں جو (احمد آباد میں) فوراً بعد منعقد ہونے والی تھی (اگست کے آخر ہفتہ میں) ترک موالات کی تجویز کا محرک میں تھا۔ معترضین کا سب سے پہلا اعتراض یہ تھا کہ ایک صوبائی کانفرنس کو کسی طرح یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کانگریس سے پہلے کسی ایسی قرارداد کو منظور کرلے۔ اس کے خلاف میں نے یہ کہا کہ اس پابندی کا اطلاق صرف ایک پس ماندہ تحریک پر ہو سکتا ہے لیکن چونکہ آگے بڑھنے کے لیے ماتحت ادارے مستحق ہی نہیں بلکہ اگر اُن کے اندر ضروری اعتماد اور کس بل نہ ہو تو ایسا کرنا اُن کا فرض عین ہے۔ میں نے بحث کرتے ہوئے کہا کہ مرکزی ادارے (کانگریس) کے وقار میں اضافہ کرنے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر کوئی ایسا کرنا چاہے تو وہ اپنی ذمہ داری پر کر سکتا ہے۔ اس کے بعد اس تجویز پر اس کی خوبیوں کے اعتبار سے بحث کی گئی۔ یہ مباحثہ اپنی گرماگرمی کے لیے اُس خنک معقولیت پسندی کی نسبت کچھ کم ممتاز نہیں تھا جس کی تحت میں یہ جاری رکھا گیا۔ اور تقسیم آراء کے بعد یہ اعلان کیا گیا کہ تجویز بہت بڑی اکثریت کی تائید سے منظور ہو گئی۔“

اس طرح بقول گاندھی جی کے گجرات نے اپنے سفینے جلا دیے لیکن اتنا ہی نہیں ہوا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ میرا دل قومی عدالتیں، مدارس اور کالج قائم کرنے کے تعمیری پروگرام پر جما ہوا تھا۔ اس لیے قومی تعلیم کی تجویز سے مجھے خاص دلچسپی تھی۔ گاندھی آشرم کے وہ ارکان جو تعلیم میں ماہر تھے ہر درجے کے قومی مدارس کا ایک سلسلہ قائم کرنے پر زور دے رہے تھے میرا کہنا یہ تھا کہ ایسے مدارس کی مؤثر تنظیم نہیں کی جا سکتی جب تک ان کے سر پر ایک قومی یونیورسٹی نہ ہو۔ دوسرے دوستوں نے میری تجویز کو بہت قبل از وقت خیال کیا۔ ہمارے درمیان اس موضوع پر بڑی گرماگرمی کی بحث ہوئی۔ آخر کار میں اپنی بات منوانے میں کامیاب ہو گیا۔ چنانچہ قومی تعلیم کی قرارداد کے ماتحت کانفرنس کی مجلسِ عاملہ کو ایک ایسی قومی یونیورسٹی قائم کرنے کا اختیار دے دیا گیا جو گجرات کے قصبوں اور دیہاتوں میں عنقریب شروع ہونے والی قومی تعلیم کی تنظیم کے لیے اصل محور کا کام دے۔

ملک میں اس کانفرنس کی کارروائیوں اور منظور کردہ قرارداد سے بڑا اضطراب پیدا ہوگیا۔ کیوں کہ یہ پہلا موقع تھا کہ ایک صوبائی کانفرنس نے چپ چاپ مرکزی ادارے کا منصب اختیار کرکے اس سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کی تھی۔ گاندھی جی ان تمام معاملات سے بے حد خوش ہوئے۔ کانفرنس نے اُنھیں گجرات کے سینکڑوں مندوبین کو لے کر کلکتہ جانے کا اختیار دے دیا تھا۔ تاکہ وہ لوگ کلیتاً اُن کے حق میں ووٹ دیں اور اگر کچھ نہیں تو اپنی تعداد ہی کے زور سے کانگریس کو ترکِ موالات کے محاربانہ پروگرام اختیار کرنے اور ایک ایسی سلطنت کے خلاف جس سے زیادہ مستحکم سلطنت چشمِ عالم نے کبھی نہ دیکھی تھی، عدیم المثال غیر جارحانہ بغاوت کے ایک "عہدِ نو" کا آغاز کر دینے پر مجبور کر دیں۔

اٹھائیسواں باب

خُفیہ سرچشمے

اس طرح سیاسی روشن خیال طبقے نے جو خلافت اور پنجاب سے متعلق گورنمنٹ کی حکمتِ عملی سے جلا بیٹھا تھا، دو امور کی بنا پر گاندھی جی کے ترکِ موالات کے لائحۂ عمل کو قبول کرلیا۔ اول یہ کہ گاندھی جی کی روز افزوں کامیابیوں کو دیکھتے ہوئے اُنھوں نے محسوس کیا کہ ترکِ موالات کے اس پروگرام کے ذریعے جس کی ابتدا خطابات کے ترک کرنے، اور انتہا محاصل کی عدم ادائگی اور سول نافرمانی پر ہوتی تھی ہر جماعت، فرقہ اور طبقہ کو بیدار کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے یہ خیال اُن کے لیے بہت ولولہ انگیز تھا کہ برطانوی حکومت کے عملوں کو اس کی خدمت و معاونت سے نکال کر اور اُنھیں کل پرزوں کے ذریعہ ایک متوازی کانگریسی حکومت بنا کر موجودہ نظامِ حکومت کو معطل بلکہ قریب قریب برباد کر دیا جائے گا۔

ہاں تو پہلا خیال یقیناً بالکل درست تھا اور عملاً بہت کامیاب بھی ثابت ہوا۔ جیسا کہ ابھی سامنے آتا ہے، لیکن دوسرے کو کبھی عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا۔ اس لیے کہ ہم آئرلینڈ کی سی کامیابیوں کا خواب تو ضرور دیکھ رہے تھے، مگر ہم نے دونوں تحریکوں کے بنیادی اختلاف کو نظر انداز کر دیا تھا۔ آئرلینڈ کے سن فنروں نے متوازی حکومت قائم کرنے کے لیے جمہوری فوج اور فوجی دہشت انگیزی کی تنظیم کی تھی، اور گاندھی جی نے عدمِ تعاون کی ساری تحریک عدمِ تشدد کی بنیادوں پر قائم کی تھی۔ سیاسی کارکنوں میں بیشتر لوگ چونکہ ترکِ موالات کے اصول کی طرف ابھی نئے نئے آئے تھے اس لیے حکومت کے خلاف اپنی ہنگامہ آرائی کے طوفانی جوش میں دونوں تحریکوں کے بنیادی اختلاف کو نظر انداز کر جانا کافی قرینِ قیاس تھا۔ بہر حال خود گاندھی کے لیے یہ صورت نہ تھی۔ جیسے جیسے یکم اگست کی تاریخ قریب آتی گئی وہ عدمِ تشدد کے نازک اصول پر روز افزوں اصرار کے ساتھ زور دیتے گئے۔ ایک طرف گاندھی جی لوگوں کے جوش کو انتہائی حد پر پہنچانے کے لیے سب کچھ کہتے اور کرتے رہے، دوسری طرف اُن سے درخواست بھی کرتے رہے کہ وہ اپنے اس شدید جوش کو ایک خاص تنظیمی عمل کے تحت میں لے آئیں۔ یکم اگست کو اُن کے الٹی میٹم کی میعاد ختم ہوتی تھی اور یہی دن اُن کی تحریک کے آغاز کا تھا۔ چناں چہ اُنھوں نے یکم اگست کا دن منانے کے سلسلے میں عوام کے تشدد اور ۱۹۱۹ء کے خوں ریز ہنگاموں کے اعادہ کے خدشے سے بے نیاز ہوکر تنظیم اور عدمِ تشدد کی دوگونہ ضرورت پر حسبِ ذیل الفاظ میں اظہارِ خیال فرمایا:-

"لیکن ترکِ موالات کی جد وجہد میں سب سے بڑی چیز لوگوں کے درمیان اتحاد و تعاون اور کارکنوں میں ترتیب باہمی کا قائم کرنا ہے۔ موثر ترک موالات کا انحصار مکمل تنظیم پر ہے........"

"مگر جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے ہر شہری کو یہ نہیں معلوم کہ منظم طریقے سے اس (ترک موالات) پر کس طرح عمل کیا جا سکتا ہے۔ غصہ سے بدنظمی پیدا ہوتی ہے اور اگر سمجھ بوجھ کے ساتھ مقاومت کی جائے تو اس سے ضبط و نظم پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے حقیقی کامیابی کی پہلی شرط یہ ہے کہ تشدد کے امکانات کو حتمی اور قطعی طور پر ختم کر دیا جائے۔ اگر ایسے لوگوں سے جو حکومت کی نمائندگی کرتے ہیں یا جو ہماری صفوں میں شامل نہیں یعنی حکومت کے مؤید ہیں تشدد کیا گیا تو اس کا نتیجہ ہر حال میں رجعت قہقری اور انحطاط ہے اور جہاں تک ہمارا تعلق ہے اس کا نتیجہ ترکِ موالات کا خاتمہ اور بے گناہ لوگوں کی جانوں کا تلف ہونا ہے۔

لہٰذا وہ لوگ جو ترکِ موالات کو جلد از جلد کامیاب بنانا چاہتے ہیں اُنھیں اسے اپنا فرض اولین سمجھنا چاہیے۔"

گاندھی جی نے یکم اگست کو جو خط وائسرائے کو لکھا تھا اُس میں اُنھوں نے ذیل کے الفاظ میں اعتراف کیا کہ میں نے لوگوں کے انقلابی غیظ و غضب کو عمداً پُر امن راستوں پر ڈال دیا ہے:-

"یوربین ممالک میں پنجاب اور خلافت جیسے شدید مظالم سے چشم پوشی کا نتیجہ عوام کے خونی انقلاب کی شکل میں رونما ہوتا ——— لیکن ہندستان کے آدھے آدمیوں میں تشدد کی قوت ہی نہیں، بقیہ آدھے کرنا نہیں چاہتے۔ لہٰذا مجھے ایسے لوگوں کے لیے جو حکومت سے قطع تعلق کرنا چاہتے ہیں ترکِ موالات کا تریاق تجویز کرنا پڑا اور اگر یہ تحریک تشدد سے خالی رہی اور اس پر منظم طریقے سے عمل کیا گیا تو حکومت اپنے طریق کار پر نظر ثانی کرنے اور اُن زیادتیوں کی تلافی کرنے پر مجبور ہو جائے گی جو اُس نے کی ہیں۔ لیکن جب تک میں حتے الامکان عوام کو اپنے ساتھ چلا سکوں گا ترکِ موالات کی حکمتِ عملی پر گامزن رہوں گا۔ اور یہ امید رکھوں گا کہ آپ انصاف کرنے کی کوئی سبیل نکالیں گے۔" میں اس موقع پر نہایت ادب سے گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ آپ عوام کے مسلّمہ رہنماؤں کی ایک کانفرنس (ایک قسم کی گول میز کانفرنس) طلب کریں اور اس کے مشورے سے کوئی ایسی سبیل نکالیں جس سے مسلمانوں کی تشفی ہو جائے اور جو بدنصیب پنجاب کے مظالم کی تلافی کا باعث ہو۔"

جیسے گاندھی جی نے پہلے کیا تھا کہ سینکڑوں پلیٹ فارموں سے شیطانی نظامِ حکومت کو تہ و بالا کر دینے کے نعرے بھی بلند کر رہے تھے اور برطانوی نظام حکومت کے محاسن کی نہایت وفادارانہ تعریف بھی کرتے جاتے تھے (ملاحظہ ہو الٹیمیٹم مورخہ ۲۲ر جون) اُسی طرح اس خط میں بھی اُن کا یہ انداز تھا کہ ایک آنکھ تو وائسرائے کے چشم کرم کی ادنیٰ سی جنبش پر لگی ہوئی ہے اور دوسری سے کروڑوں ہندستانیوں کی غیر جارحانہ بغاوت کی دھمکی کا اظہار ہو رہا ہے۔

لہٰذا مسٹر گاندھی کی پُر امن جنگ کی خصوصیات کا اہم جزو ذاتی گفت و شنید کی وہ پالیسی تھی جس کا نتیجہ عارضی معاہدوں اور سمجھوتوں کی صورت میں نمودار ہوا۔ یہ بات اُس وقت ہماری سمجھ میں نہ آئی، گو اب اسے ہندستان میں لوگ بخوبی سمجھتے ہیں حالانکہ اُن کی جنوبی افریقہ کی تحریک کی تاریخ ہی سے یہ بات کافی روشن ہو جانی چاہیے تھی۔

پھر ترکِ موالات کا مفہوم اُن کے ذہن میں اُس سے کہیں زیادہ وسیع تھا جتنا عام طور پر اس لفظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے گاندھی جی برطانوی مال کے مقاطعہ کو بھی ایک طرح کا تشدد سمجھتے تھے اور ہندستان میں قدم رکھتے ہی اس کی مخالفت کرنے لگے تھے۔ یہاں پر اس بات کو نوٹ کرنا کافی کار آمد ہوگا کہ گاندھی جی نے کیوں کر ترک موالات کی پُر امن حکمت عملی اور برطانوی مال کے منتقمانہ مقاطعہ کی چالوں میں نمایاں تفریق پیدا کی ہے۔ الٰہ آباد کے "لیڈر" اخبار کو جواب دیتے ہوئے ینگ انڈیا (۱۷ر مارچ) میں اُنھوں نے حسب ذیل عبارت لکھی تھی:-

"بائیکاٹ ایک طرح کی سزا ہے اور یہ خیال ایک انتقامی جذبہ کی پیداوار ہے۔ برطانوی مال کے مقاطعہ کا یہ مطلب ہے کہ اگر

برطانوی مال جاپانی مال سے اچھا ہو تو بھی ہم برطانوی دزرار سے انتقام لینے کی غرض سے اُسے نہ خریدیں - میرا یہ عقیدہ ہے کہ ایسے حالات میں مقاطعہ ایک قسم کا تشدّد ہے - ترکِ موالات کا قیام ایک اور ہی بنیاد پر ہے - اگر حکومت ظلم کرتی ہے اور میں اُس سے تعاون کرتا ہوں تو گویا میں اُس کے ظلم میں خود شریک ہوتا ہوں اور اس طرح سے حکومت کے لیے ظلم کا اور امکان پیدا کر دیتا ہوں - لہٰذا یہ میرا فرض ہے کہ میں سزا یا انتقام کے خیال سے نہیں بلکہ اس خیال سے کہ مجھے خود ظالمانہ افعال کا ذمہ دار نہ ہونا چاہیے - حکومت سے ترکِ تعلق کر دوں - اس طرح حکومت کو معطل کر دینے میں بھی میں حق بجانب ہوں گا - لہٰذا میرے سامنے یہ چیز بالکل صاف ہے کہ ترکِ موالات اور مقاطعہ بالکل مختلف چیزیں ہیں اسی طرح جیسے ہاتھی گدھے سے مختلف ہے۔"

مختصر یہ کہ ایک طرف تو گاندھی جی عوام کو ایسے ولولہ انگیز انداز میں دعوتِ عمل دیتے تھے کہ زمانۂ قدیم کے خلفاء اور جنگ صلیبی کے سرداروں کی یاد تازہ ہوتی تھی اور دوسری طرف اُن کے جوش و خروش کو محدود راستوں میں جکڑ دینے کے نقشے بھی بنا رہے تھے - چنانچہ جب اُنھیں اس طوفان پر پوری قدرت حاصل ہوگئی اور اس کی رہنمائی کا موقع ملا تو اُنھیں بے حد خوشی ہوئی - لیکن اس رہنمائی کا مقصد اپنے حریفوں کو تباہ کرنا تو درکنار اُن سے بدلہ لینا یا اُن کو سزا دینا بھی نہیں تھا، بلکہ اس کا مُدّعا تو صرف یہ تھا کہ عوام کی داخلی تنظیم کر کے اُنھیں بے حد مضبوط بنا دیا جائے بزدلی اور خوف سے نجات دلانے کے لیے ان کو مصائب میں ڈال کر ان کے اندر شدائد کی برداشت کا مادہ پیدا کیا جائے اور بالآخر ساری دنیا کے سامنے حکومت کے مقابلہ میں اُن کے بظاہر بے زور مگر حقیقتاً بے اثر مقابلہ کا مظاہرہ کیا جائے - اور یہ سب کچھ محض اِس لیے ہوتا تھا کہ آخر میں وائسریگل لاج سے اُنھیں دعوت نامہ ملے اور وہ ایک معقول مفاہمت تک پہنچنے کے لیے حکومت کے حاکمِ اعلیٰ سے بہ نفسِ نفیس گفت و شنید کر سکیں - ہم بہر حال اس حقیقت سے کما حقہٗ واقف نہ تھے - ہمیں بس اتنا معلوم تھا کہ وہ ایک ملک گیر آشوب کے طوفان کی رہبری اِس غرض سے کر رہے ہیں کہ ہمارے لیے مکمل اور غیر مشروط کامیابی حاصل کریں - لہٰذا سیاسی کارکنوں میں گاندھی جی کی ذات پر اتنا اعتماد پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ان کی مقدس مہم کو جاری رکھنے کے لیے ناقابلِ بیان اور عدیم المثال قربانیاں پیش کرنے کے لیے سر بکف تیار رہتے تھے - اس مہم کا تقدس صرف خلافت کے باعث نہ تھا بلکہ گاندھی جی ترکِ موالات کے مسلک کو سری کرشن، حضرت محمد صلعم، حضرت عیسٰےؑ اور زرتشت کے اقوال سے بھی ثابت کرتے تھے - چنانچہ ہندستان اپنے اس نئے پیغمبر گاندھی جی کی غیر مسئول رہنمائی میں پہلی اگست کو حکومتِ برطانیہ کے خلاف ایک مقدس اور پر امن جہاد کی راہ پر گامزن ہوا - اگلے باب میں بتایا جائے گا کہ گاندھی جی نے اپنے انوکھے مسلک اور لائحۂ عمل کا سفینہ کیوں کر کنارے لگایا -

---

اُنتیسواں باب

کلکتہ میں گاندھی جی کی فتح یابی

میں نے گاندھی جی اور اُن کی جماعت کے ساتھ کلکتے کا سفر کیا - میاں محمد چھوٹانی، علی برادران اور خلافت اور گجرات کے بہت سے دوسرے کارکن بھی اسی ٹرین میں سفر کر رہے تھے - ہمارا جلوس واقعی بہت فاتحانہ شان کا تھا - دن ہو یا رات جس وقت بھی اور جہاں کہیں بھی گاڑی ٹھیرتی تھی گاندھی جی اور دوسرے مندوبین کا بڑے جوش و تپاک سے استقبال کیا جاتا تھا - چونکہ گاڑی ملک کے ایک سرے

سے دوسرے سرے یعنی بمبئی سے سیدھی کلکتہ تک جاتی تھی اور گاندھی جی کے درشن اور اُن کی گفتگو سے لوگوں میں ایسا جوش و خروش پیدا ہوتا تھا کہ ان تمام حالات کو دیکھتے ہوئے ہمیں اپنے مقصد کی کامیابی اور کانگریس کے آیندہ اجلاس کے آخری فیصلے کے متعلّق کوئی شبہ نہ رہ گیا۔

ٹاٹا نگر پہنچتے پہنچتے گاندھی جی اپنی اصل تجویز کا مسودہ مرتب کر چکے تھے۔ ہمارے واسطے تو یہ ترک موالات کے موضوع پر گجرات کی قرارداد کی ایک تازہ تفصیل کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں کہ یہ اس وقت ہمیں اُس سے کہیں زیادہ محاربانہ اور سیاست آمیز معلوم ہوتا تھا جتنا آخر میں ثابت ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گاندھی جی نے اُس وقت تک عدم تشدد کے اصول پر جو اس میں پنہاں تھا اتنا زیادہ زور نہیں دیا تھا۔ اُن کے نزدیک تو عدم تشدد اُس پروگرام کا اہم ترین عنصر تھا مگر ہمارے ذہن میں اُس کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی۔

گاندھی جی نے فوراً ہمیں راہ پر لگالیا جیسا کہ وہ خود اپنی سوانح حیات میں تحریر فرماتے ہیں:-

"اصل مسودے میں لفظِ "عدم تشدد" کو میں چھوڑ گیا تھا۔ اس فروگزاشت کو دیکھے بغیر میں نے وہ تجویز مولانا شوکت علی کو دے دی، جو اُسی ڈبے میں سفر کر رہے تھے۔ رات میں مجھے اس غلطی کا علم ہوا۔ صبح کے وقت میں نے مہادیو کے ذریعہ کہلا بھیجا کہ مسودہ کو پریس میں بھیجنے سے پہلے اس غلطی کی اصلاح ہو جانی چاہیئے۔

گاندھی جی اس تجویز میں ایک اور بات بھی چھوڑ گئے تھے جس پر ہمدرد ترین ناقدوں کی نظر بھی پڑ ہی گئی۔ مسلمانوں کی خوشنودی اور پنجاب کے متعلّق اپنی رپورٹ کو بہت زیادہ اہمیت دینے کی دُھن میں گاندھی جی قوم پرستوں کے خود اختیاری حکومت کے اہم ترین مطالبہ کو تجویز میں شامل کرنا بھول گئے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے پنڈت موتی لال نہرو پہلے لیڈر تھے جنھوں نے خود اختیاری حکومت کے مطالبے کو خلافت اور پنجاب کے مظالم کی چارہ جوئی سے بھی زیادہ اہم ہونے کی حیثیت سے شامل کیے جانے پر زور دیا۔ گاندھی جی لکھتے ہیں "میں نے اس مشورے کو فوراً مان لیا اور سوراج کے مطالبے کو اپنی تجویز میں شامل کر لیا۔" اگرچہ بظاہر یہ نہایت معمولی سا واقعہ ہے لیکن اس سے پتہ چلتا ہے کہ اپنی سیاسی زندگی کے ابتدائی زمانہ ہی سے گاندھی جی ہمیشہ سیاسی اور آئینی مطالبات کو پس پشت ڈال کر اخلاقی قدروں اور ہنگامی شکایتوں پر زیادہ زور دیتے رہے ہیں۔

گاندھی جی نے اس تجویز میں دو اور جدتیں پیدا کیں اور تجویز کو کانگریس کے کھُلے اجلاس میں پیش کر دیا۔ یاد رہے کہ گاندھی جی کی شدید مخالفت کے باوجود خلافت کانفرنس نے ۱۹۱۹ء کے آخر میں برطانوی مال کے مقاطعہ کو منظور کر لیا تھا۔ اب موقع پا کر اُنھوں نے اصل منصوبے کو تمام بدیسی مال کے مقاطعہ کی شکل دے کر اس کی شدت کو کم کرنے کی کوشش شروع کی۔ اس خیال سے کہ کہیں یہ بات بالکل مبہم اور ناقابلِ عمل نہ معلوم ہو اُنھوں نے مشورہ دیا کہ "سودیشی سامان کا ایک وسیع پیمانے پر استعمال شروع کر دیا جائے اور چوں کہ ہندستانی کارخانے قوم کی تمام ضروریات کو پورا نہیں کر سکتے تھے اس لیے اُنھوں نے مالکانِ مل کو مشورہ دیا کہ "وہ ہاتھ سے کاتنے کی صنعت کو گھر گھر وسیع پیمانے پر فروغ دیں تاکہ اُن لاکھوں پارچہ بافوں کو جنھوں نے ہمت افزائی نہ ہونے کے باعث اس باعزت اور قدیم پیشے کو چھوڑ دیا ہے پھر کام مل جائے۔" اس طرح ایک ہی وار میں اُنھیں وہ ساری مرادیں حاصل ہوگئیں جو بالکل خیالی اور باہم متضاد نظر آتیں۔ اوّل تو یہ کہ اُنھوں نے صرف اپنے ضمیر کے شکوک اور شبہات کو تسکین دینے کے لیے عوام کے غیظ و غضب کے توپ خانے کا رُخ برطانوی مال کے مقاطعہ کی جانب سے ہٹا کر تمام غیر ملکی مال کے مقاطعہ کی طرف پھیر دیا۔ دوسرے یہ کہ اُنھوں نے کانگریس کو ہندستانی پارچہ بافی کی صنعت کے ماہروں کے ساتھ لا کھڑا کیا۔ جو اب لاکھوں ہندستانی گاہکوں سے پہلے کی بہ نسبت بہت زیادہ قیمتیں وصول کر سکتے اور زیادہ نفع اُٹھا سکتے تھے۔ تیسرے یہ کہ وہ اپنے چرخے کے انتہائی رجعت پسندانہ اور قدیم عقیدے کو کانگریس پروگرام کی صف اوّلیں

میں جگہ دینے میں کامیاب ہو گئے۔ مزید براں اُنھوں نے اُن تمام بے شمار منصوبوں کے لیے جنھیں وہ آگے چل کر پیش کرنے والے تھے ناجائز طور پر کانگریس کا نام استعمال کرنے کی غرض سے ضروری فرمان حاصل کر لیے۔

گاندھی جی نے کلکتہ کانگریس میں پہلی مرتبہ ترکِ موالات کے پروگرام میں چھ سات کروڑ "اچھوتوں" سے چھوت چھات دور کرنے کی ایک نئی شق بھی شامل کر دی۔ بعد میں اس تجویز کا پروپیگنڈا کرنے کے سلسلہ میں اُنھوں نے تحریر کیا (ینگ انڈیا ۲۷ اکتوبر ۱۹۲۰ء) کہ "پنجاب کے دوستوں کے لیے یہ دیکھنا آسان ہے کہ اس پاپی حکومت کے خلاف عدم تعاون کا مفہوم یہ ہے کہ ایسی تمام جماعتوں کے درمیان جن سے ہندوستانی قوم کی تشکیل ہوتی ہے باہمی اتحاد و تعاون قائم کیا جائے۔ اگر ہند حکومت کے خلاف مؤثر طریقے پر عدم تعاون کرنا چاہتے ہیں تو اُنھیں اس مقصد میں پنجاب والوں سے اس طرح اتحاد عمل کرنا چاہیے جیسا کہ اُنھوں نے مسلمانوں سے کیا تھا۔ جب ترکِ موالات تشدد سے قطعاً خالی ہو تو پھر وہ تزکیۂ نفس کی تحریک بن جاتا ہے"۔ اُنھوں نے ۳ نومبر کو پھر لکھا "اچھوت ادھار کو پروگرام میں ثانوی حیثیت نہیں دی جا سکتی کیوں کہ اس داغ کے دھوئے بغیر ترکِ موالات ایک بالکل بے معنی چیز ہے میرا خیال ہے کہ سوراج حاصل کرنے نیز خلافت کے سلسلہ میں اچھوت ادھار ایک قوی عنصر ہے غیر پاکیزہ ہندو یئت اسلامی تزکیہ کے طریق کار میں معاون نہیں ہو سکتی" پروگرام کے اس حصے کی حد بندیوں کا بہت خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے ایک مرتبہ اور انھوں نے اس سلسلہ میں لکھا کہ "اچھوت ادھار کے بغیر اسی طرح سوراج کا تصور ناممکن ہے جیسے ہندو مسلم اتحاد کے بغیر" خود بقول گاندھی جی کے وہ اچھوت طبقوں کی حقیقی ... ترقی سے کہیں زیادہ ہندوؤں کی وسیع جماعت کے اندر تزکیۂ نفس دیکھنے کے خواہشمند تھے۔ وہ غیر ترقی یافتہ مسلم عوام کی اقتصادی اور تعلیمی حالت کو بہتر بنانے سے کہیں زیادہ ہندو اور مسلمان کے دلوں کو جادو کے زور سے جوڑ دینے کے شائق تھے۔ اس ضمن میں یہ بات بہت دلچسپ ہے کہ مسٹر گوکھلے نے جنھیں گاندھی جی ہمیشہ اپنا سیاسی گرو کہہ کر یاد کرتے ہیں پست طبقوں کے متعلق اپنے پروگرام میں اُن کی اقتصادی برتری کو مقدم ترین قرار دیا تھا۔ اس کے بعد تعلیمی ترقی کا درجہ رکھا تھا اور تیسرا نمبر معاشرتی مساوات کو دیا تھا۔ مگر گاندھی جی نے اس موضوع کو مسٹر گوکھلے کے محبوب طریقے کی طرح واقعاتی نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا بلکہ اُنھوں نے اس پر اپنے شخصی اور جذباتی نقطۂ نگاہ سے نظر ڈالی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کانگریس نے سرکاری اداروں کے مقاطعہ کو کامیاب بنانے کے لیے قومی مدارس اور کالج کھولنے کا فیصلہ کرنے کے بعد بھی اچھوتوں کے مدرسے اور کارخانے کھولنے کا کوئی پروگرام نہیں بنایا تھا۔

گاندھی جی اس قرارداد سے مسلح ہو کر ایسی زبردست اور شدید مخالفت کا مقابلہ کرنے کے لیے مجلس موضوعات میں گئے جس کی نظیر پہلے اُنھوں نے اپنی سیاسی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔ فی الحقیقت یہ کانگریس کا پہلا اجلاس تھا جس میں وہ اپنا خاص پروگرام منوانے گئے تھے۔ اُنھوں نے امرتسر کانگریس میں ایک جانب اعتدال پسندوں اور دوسری جانب انتہا پسندوں کے درمیان بیچ بچاؤ کر کے ایک ثالث کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اور گزشتہ نو مہینوں میں وہ اور بھی ممتاز اور زبردست لیڈر بن چکے تھے۔ مجلس موضوعات میں اگر سب نہیں تو اکثر اُن کے کامل مطیع اور وفادار بن چکے تھے (یعنی مجلس موضوعات کے مسلم اراکین) اس کے علاوہ خلافت کمیٹی نے ایک منظم جماعت کی حیثیت سے اور انھوں نے مع اپنے تمام مذہبی اور سیاسی پیروؤں کے تقریباً ایک مہینے سے ترکِ موالات کی جدوجہد جاری کر رکھی تھی۔ اُن کی جیب میں گجرات کانفرنس کی قرارداد بھی موجود تھی۔ اس طرح اُنھوں نے فتح مندی کے پورے یقین کے ساتھ کانگریس کا مقابلہ کیا۔ وہ اس سے پہلے ہی ایک ایسے اقدام سے جو تھوڑا بہت جماعتی اور زیادہ تر ذاتی اور انفرادی تھا کانگریس پر سبقت حاصل کر چکے تھے۔ اس طرح اُنھوں نے مجلس موضوعات کے سامنے چالاکی سے یہ سوال پیش کر دیا کہ آیا مجلس موضوعات اور کانگریس اُس پروگرام کو قبول کرنے کے لیے تیار ہے یا نہیں جس پر وہ اور مسلمان پہلے ہی سے کاربند ہو چکے ہیں۔ اور آیندہ بھی چاہے کانگریس کچھ بھی حکم صادر کرے اُس پر عمل کرنے کا عہد کر چکے ہیں اور اس پروگرام کو منظور کر کے انتہائی مصیبت کے وقت مسلمانوں کی شکستہ خاطر جماعت کی امداد پر اور واقعتاً پنجاب کے مظالم کی تلافی اور قوم کے لیے سوراج حاصل کرنے

پر آمادہ ہی یا نہیں۔ اس سوال کا یہ نتیجہ ہوا کہ مجلسِ موضوعات صرف ایک دفاعی جماعت کی حیثیت میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔ اِس طرح گاندھی جی نے ہوشیاری سے اپنی موافقت میں پانسہ پھینک دیا تھا مجلسِ موضوعات میں اس کے ارکان کا پورا نصاب موجود تھا۔ اور ساری فضا میں گویا برقی رو دوڑ رہی تھی۔ علی برادران اور دوسرے مسلمان رہنما جو گاندھی جی کی حمایت کرنے آئے تھے لمبے ڈھیلے ڈھالے لبادوں میں ملبوس اور ترکی ٹوپیاں دئیے ہوئے تھے جن پر ہلال جگمگا رہے تھے۔ اور جہاں ایک طرف ابتدا ہی سے بہت سے غیر مسلم نوجوان وجدانی طور پر گاندھی جی کی حمایت میں کھڑے تھے وہیں دوسری طرف ارباب سیاست اور آزمودہ کار اصحاب جن کے بال ملک کی خدمت میں سفید ہو چکے تھے ، سختی سے اُن کے نقطۂ نظر کی مخالفت کر رہے تھے۔ گاندھی جی نے اس موضوع پر ایک معتدل مگر نہایت پر جوش اور قابلانہ انداز میں تقریر کی اور اس کے بعد دونوں طرف سے خوب خوب بحثیں اور موشگافیاں ہوئیں۔ یہ مباحثہ واقعی "بہت جامع ، اہم اور طوفان انگیز تھا" اور تقریباً دو تین دن تک جاری رہا۔ درحقیقت اس سے زیادہ شاندار مباحثہ میں نے نہ کبھی پہلے سُنا تھا ، نہ بعد میں سُنا۔ گاندھی جی نے سارے مباحثات کے جواب میں ایک تقریر کی جو بمشکل بیس پچیس منٹ تک رہی۔ اس تقریر نے اُن تمام اختلافات کی عمارت کو ڈھا دیا جو مسٹر سی آر داس کی گرج دار آواز ، مسٹر بپن چندر پال کے مجتہدانہ دلائل ، پنڈت مالویہ کی محتاط اعتدال پسندی ، جناح کی پر شوکت ، قانونی موشگافیوں ، مسز بسنٹ کی سال خوردہ مرصع براہین ، لالہ لاجپت رائے کی متزلزل مخالفت اور دوسرے قابل مقرروں کے ایک گروہ کی مشکلات اور شکوک سے تیار ہوئی تھی۔ میرے حافظے میں ان کی یہ خطابت سب سے بڑے شاہکار کی حیثیت سے محفوظ ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اس تقریر سے مجلسِ موضوعات ہی کی قسمت کا نہیں بلکہ کانگریس کی قسمت کا بھی فیصلہ کر دیا۔ یہ قرارداد نعرہائے تحسین کے ساتھ ایک زبردست اکثریت کی تائید سے منظور ہو گئی۔

کانگریس کے پختہ کار اور قدیم رہنما مجلسِ موضوعات کی اس شکست کو سکونِ قلب کے ساتھ برداشت کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ وہ کھلے اجلاس میں اس سوال پر زور آزمائی کا عزم کر چکے تھے۔ مباحثہ کی گرم بازاری کا یہی تماشہ دس ہزار مندوبین کے درمیان کھلے اجلاس میں بھی ہوا۔ اس سے زیادہ تعداد میں نمایندے کانگریس پنڈال میں کبھی جمع نہیں ہوئے تھے۔ پنڈت موتی لال ، علی برادران ، حکیم اجمل خان مرحوم اور بعض دوسرے چھوٹے ہندو رہنماؤں نے گاندھی جی کی تائید کی۔ دوسری جانب بہت سے قانون داں اور پختہ کار لوگ تھے۔ گاندھی جی نے تمام بحثوں کے جواب دینے میں ایک مرتبہ پھر موقع سے فائدہ اُٹھایا۔ یہ مباحثہ دو دن تک جاری رہا لیکن اب فیصلہ کے متعلق کوئی شبہ نہیں رہ گیا تھا۔ اور جب رائے شماری ہوئی تو گاندھی جی کا ریزولیوشن مجلسِ موضوعات سے بھی زیادہ کثرتِ آرا سے منظور ہو گیا۔

بے شک یہ مسٹر گاندھی کی شخصی فتح تھی۔ اس طرح گاندھی جی جو اپنے قول کے مطابق کانگریس کے ادنیٰ درجے کے بھگت اور اُس کی متابعت کرنے والے تھے ایک ہی جست میں ترقی کر کے کانگریس کے ڈکٹیٹر ہو گئے۔ اس کے بعد سے انھوں نے طے کر لیا کہ اپنی پسندیدہ اسکیموں ، نیز اپنے تمام توہمانہ منصوبوں اور مخصوص رجحانات کو فروغ دینے کے لیے کانگریس کے نام اور وقار سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا جائے۔

ہم اُن کی کامیابی کے رازوں کا تجزیہ آیندہ باب میں کریں گے۔

تیسواں باب

داس کی شکست

گاندھی جی نے اپنے انوکھے پروگرام (ترکِ موالات) کے سلسلہ میں کانگریس کے اتنے زبردست اور پختہ کار اراکین کی مخالفت کے باوجود کیوں کر فتح حاصل کی؟ پرجوش سیاسی کارکنوں کی اتنی زبردست اکثریت کے خیالات پر جس میں ملک کے ہر گوشے کے لوگ شامل تھے انھوں نے کیوں کر قابو حاصل کیا؟ اُن کے جذبات کو برانگیختہ کرنے میں اُنھیں کیوں کامیابی ہوئی؟ یہ ہیں وہ سوالات جن کا جواب دینا لازمی ہے۔

میں اس جواب کا آغاز اُن دلائل کے بیان سے کرتا ہوں جو اس وقت کے ایک ممتاز ترین اور نہایت کامیاب وکیل مسٹر سی، آر، داس نے حزبِ مخالف کی قیادت کرتے ہوئے، گاندھی جی کے خلاف پیش کی تھیں۔ گاندھی جی کی ذات ہندستان کے قدیم سادھوؤں اور رشیوں کی سی روحانی پاکیزگی، نفس کشی اور بُردباری کی جامع تھی۔ اس کے بالکل برعکس سی، آر، داس میں ہند جدید کی وطنی حب الوطنی، محاربانہ جوشِ عمل اور ذہنی صفائی کی تمام خصوصیات جمع تھیں۔ اس لیے یہ لڑائی گاندھی جی کے مشرب کے جذباتی عقیدت پرستی اور مسٹر داس کی جنگجویانہ ذہنی قوتوں کے درمیان تھی۔

جب گاندھی جی مجلس موضوعات میں اپنا مُدعا پیش کر چکے تو مسٹر داس نے حسبِ ذیل انداز میں سوالات کی بوچھار شروع کردی۔ انھوں نے اس کا اعتراف کیا کہ یقیناً وہ بہت سے امور میں گاندھی جی سے متفق تھے، خلافت کے سلسلہ میں اور پنجاب میں جو مظالم ہوئے ہیں اُن کی تلافی کے وہ بھی مع اپنی جماعت کے اُتنی ہی شدت سے خواہاں تھے جتنا کوئی اور ہو سکتا ہے۔ (گاندھی جی کے ساتھ اُنھوں نے بھی پنجاب رپورٹ پر دستخط کیے تھے) سب سے بڑھ کر یہ کہ ظالم برطانیہ کے ہاتھ سے اقتدار چھین کر اس قسم کے مظالم کا ہمیشہ کے لیے سدِ باب کرنے کے عزم میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہ تھے۔ لہٰذا وہ حکومت کی مشینری کو معطل بلکہ پاش پاش کر دینے کے والہانہ جوش میں کسی کی بھی نہیں سنتے تھے۔ اُنھوں نے بے باکی سے یہ سوال کیا کہ آیا گاندھی جی کے پروگرام کا یہی نتیجہ نکلے گا؟ کیا ہمارے مقاطعہ سے کونسلیں ٹوٹ جائیں گی؟ کیا اس کا مطلب یہ نہیں نکلتا کہ ان کا سے بیس مجالسِ قانون ساز کو حکومت کے ہاتھوں میں مُفت سونپ کر ہم خود اپنے کو حکومت کی مقصد برآری کا ایک ذریعہ بنا لیتے ہیں؟ کیوں کہ حکومت ان مجالس کے فیصلوں کو مہذب دنیا کے سامنے پیش کر کے اپنی سرخروئی کا سامان حاصل کرے گی؟ اور پھر ظالم حکومت کے مقابلے میں ہماری سیاسی لڑائی سے عدالتوں اور مدرسوں کے مقاطعوں کا کیا تعلق ہے۔ اگر عدالتوں کے مقاطعہ سے فی الواقعی حکومت کا خاتمہ ہو جاتا تو وہ اور ان کے ساتھی اپنی وکالت چھوڑنے کے لیے تیار تھے۔ اس کے برعکس اُن کا یہ خیال تھا کہ گو مذہبی نقطۂ نظر سے عدالتوں، مدرسوں اور کونسلوں کا مقاطعہ کتنا ہی مناسب کیوں نہ معلوم ہو لیکن وہ اُس عظیم الشان مقصد کے لیے مفید نہیں ہو سکتا جس کے لیے ہم سب دل سے کوشاں ہیں۔ اس طرح وہ بھی اسی مقام سے چلے اور شیطانی حکومت کے خاتمے کے معاملے میں گاندھی جی کے ہم نوا بھی رہے۔ مگر گاندھی جی سے اُن کا سوال یہ تھا کہ اس سیاسی نصب العین تک پہنچنے میں یہ مقاطعے کیوں کر کارآمد ہو سکتے ہیں؟

ان تمام سوالات پر گاندھی جی کے علیحدہ علیحدہ جوابات مختصر طور پر پہلے ہی بیان کیے جا چکے ہیں جب اُنھیں اُن مختلف دفعات کو ایک مکمل پروگرام کے اجزائے اصلیہ کی صورت میں پیش کرنے کی ضرورت محسوس کرائی گئی تو گاندھی جی نے اپنے سیاسی فلسفے کو ایک عجوبہ طریقے سے پیش

کیا۔ اُنھوں نے بتایا کہ موجودہ نظامِ حکومت ایک پوری زنجیر ہے جو شملہ کی ابر آلود چوٹیوں پر بیٹھے ہوئے وائسرائے سے لے کر اُس چھوٹے سے تلاتی (دیہات میں محصول جمع کرنے والا محرر) تک پھیلی ہوئی ہے جو چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں بھوکے کسانوں سے تانبے چاندی کے دو چار سکے لے مرتا ہے۔ اور کونسلیں، عدالتیں، اور مدرسے سب اسی زنجیر کی ناگزیر کڑیاں ہیں۔ میں اس پورے نظام کو برباد کرنے کے لیے اُٹھا ہوں جس کا مطلب میرے الفاظ میں یہ ہے کہ پوری عمارت کی از سرِ نو جمہور کی خواہش کے مطابق تعمیر کی جائے۔ لہٰذا میں نے یہ چاہا کہ ملک کے کروڑوں باشندے حتے الامکان شیطانی حکومت سے تمام ناپاک رشتے توڑتے ہوئے اپنے قلوب صاف کر کے آپس میں بیباکانہ طور پر متحد ہو جائیں تاکہ وہ سول نافرمانی اور عدمِ ادائگی محاصل کے زبردست ہتھیاروں سے طاقتور حکومت پر فیصلہ کُن حملہ کرنے کے قابل ہو سکیں۔ سب سے زیادہ اُنھوں نے عقیدۂ محبت، عدمِ تشدد اور نفس کشی کی اشد ضرورت پر زور دیا جس کی مدد سے نہ صرف پروگرام کے اُس تعلیمی حصے کو عملی جامہ پہنایا جا سکے گا جس میں کانگریسی ادارہ کی تنظیم اور قومی عدالتی پنچائتوں اور مدرسوں اور کالجوں کا قیام شامل ہے بلکہ قوم کی منظم قوتوں کو اس زبردست غیر جارحانہ بغاوت کے آخری اور نازک ترین مرحلوں میں بروئے کار لایا جا سکے گا۔

جب گاندھی جی نے اس اسلوب سے اپنا مدعا پیش کیا تو مسٹر داس اور اُن کے ساتھیوں کی راہ میں بہت سی رُکاوٹیں پیدا ہو گئیں۔ سب سے پہلی اور بڑی چیز اُن کی شخصیت تھی۔ تعلیم یافتہ مردوں اور عورتوں کا جمِ غفیر جو ہیز کے اردگرد جمع تھا۔ اُس نے بھی مسٹر داس اور دوسرے قانون پیشہ اصحاب کو طعنہ دینا شروع کیا کہ وہ لوگ عدالتوں میں اپنی معقول پریکٹس چھوڑ کر قربانی کے لئے آمادہ نہیں ہیں۔ اُنھوں نے کہا کہ جب مسٹر داس کو خود روزانہ عدالتوں سے اتنی زیادہ آمدنی ہوتی ہے تو ایسی صورت میں وہ پریکٹس کیسے ترک کر سکتے ہیں؟ اگرچہ اس موقع پر مسٹر داس اور اُن کے رفقا اپنے انگریزی سوٹ اُتار چکے تھے اور سفید شفاف کُرتے اور دھوتی میں ملبوس تھے، مگر ہوشیار بنگالی عورتوں نے کہنا شروع کیا "سادگی کی اِس نمائش پر اعتماد نہ کرو۔ یہ صرف مسٹر گاندھی کو دکھانے کے لیے ہے۔ گاندھی جی کے پیٹھ پھیرتے ہی یہ لوگ بدیشی لباس پہننا اور عدالتوں میں جا کر بڑی بڑی رقمیں جمع کرنا شروع کر دیں گے۔"

غرض کہ پیچھے بیٹھے ہوئے لوگوں نے عدالتوں کے مقاطعہ پر مسٹر داس اور اُن کے ہمراہیوں کی مخالفت کا جواب طعن و تشنیع سے دیا اُن کے مقابلے میں بالکل جُداگانہ حیثیت کے ساتھ دُبلے پتلے تارک الدنیا پیغمبر اور سیاسی سنیاسی گاندھی جی بیٹھے ہوئے تھے، جو بہت پہلے خدمتِ قوم کے لیے اپنی بڑی پریکٹس اور دولت سے دستکش ہو چکے تھے۔ اور اب غیر مُلکی حکومت کے خلاف ہندستان کے کروڑوں باشندوں کی مقدس جنگ کی قیادت کے فرائض انجام دینے والے تھے۔ مگر وہ اپنے منصوبوں میں کامیاب کیوں کر ہوں جب تک یہ بڑے بڑے ذی شان اور فضیلت مآب قانون پیشہ حضرات اُن کی بات نہ مانیں۔ اور اُن کی مدد نہ کریں۔ مگر سوال تو یہ ہے کہ آخر یہ حضرات ایسا کریں کیوں، بہر حال اس قسم کی طعن و تشنیع نے وہ کیا جو گاندھی جی کے دلائل سے نہ ہو سکتا تھا اور مسٹر داس اور اُن کے رفقا کو مکمل شکست ہو گئی۔

لیکن گاندھی جی کا پروگرام صرف اُن سہ گانہ یا پنجگانہ مقاطعوں کا سلسلہ اعزازی خطابات اور بدیشی کپڑوں کے مقاطعہ سے شروع ہوا تھا، تاہم اس پر ختم نہیں ہوتا تھا۔ کانگریس کی تاریخ میں پہلی مرتبہ گاندھی جی نے عملی احتجاج کا پروگرام پیش کیا تھا۔ مقاطعوں کو بجائے خود عملی اقدام کہا جا سکتا تھا۔ لیکن عملی سیاست میں ان کا کارآمد ہونا محلِ نظر تھا۔ تاہم اس مکمل پروگرام میں سول نافرمانی اور عدمِ ادائگی محاصل جیسی خوفناک منزلیں بھی شامل تھیں اور ان کی قدر و قیمت میں کسی شبہ کی گنجایش نہ تھی۔

جب سے گاندھی جی نے ہندستان میں قدم رکھا تھا اُس وقت سے بہت سے کارکنوں کے اندر یہ خیال پیدا ہو گیا کہ ان تیس برسوں میں کانگریس نے حکومت کی خدمت میں وفادارانہ عرض داشتیں پیش کرنے اور قراردادیں بھیجنے کے سوا اور کچھ بھی نہیں کیا۔ اصل میں کانگریس دریوزہ گری کی پالیسی پر عمل پیرا رہی ہے اس نے وقتاً فوقتاً عملی اقدام کی بعض حکمتوں اور طریقوں پر بحثیں ضرور کی ہیں۔ لیکن اب وہ سب عدمِ محض کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اب جا کر ایک ایسا شخص نمودار ہوا جس کے پاس عمدہ عملی اقدام کا ایک ایسا مکمل

پروگرام ہے جس کی حیثیت دراصل سلطنت برطانیہ کی طاقت کے مقابلے میں ایک قوم گیر پرامن بغاوت سے کم نہیں ۔ گویا اب یہاں سے اصلی معنوں میں دورِ عمل شروع ہوتا ہے ۔ اور جس شخص نے یہ نقشہ پیش کیا ہے اُس نے صرف جنوبی افریقہ میں اس کا امتحان ہی نہیں کیا اور قابلِ تعریف کامیابی ہی حاصل نہیں کی بلکہ کیرا اور چمپارن کے میدان جنگ میں اور راولٹ ایکٹ کی شورش کے دوران میں کتنے ہی محدود پیمانے پر کیوں نہ سہی اِس پر کاربند ہو کر بھی دکھا دیا ہے ۔ اور اس کی تجویز عمل اور محض عمل ہے ۔ اور دوسری طرف مسٹر داس اور پال کے پاس وائسرائے کی خدمت میں وفد بھیجنے کے علاوہ اور کوئی چیز پیش کرنے کے لیے کیا ہے یا پھر وہ عمل میں ایک سال کی تاخیر کے خواہشمند ہیں ۔ جس کا مطلب درحقیقت یہ ہے کہ بس باتیں ہی باتیں اور کچھ نہیں! چوں کہ سیاسی رہ نما حکومت کی ظالمانہ حکمتِ عملی پر بھڑک اُٹھے تھے اور وہ ایک لمحہ بھی ضائع کرنا نہیں چاہتے تھے اِس لیے اُنھوں نے کانگریس کی محض زبانی تجویزوں اور شان دار تقریروں کی قدیم حکمت عملی کو جاری رکھنے کے مقابلے میں عملی اقدام کے حق میں گو وہ کتنا ہی محدود اور تخیل پرستانہ ہی کیوں نہ ہو رائے دے دی ۔

لیکن اگر ایسا اقدام کسی مؤثر اور فیصلہ کن پیمانے پر اختیار کیا جانے والا تھا تو یقیناً اس کے لیے ابھی سے قوم کی تعلیم و تربیت ہونی چاہیے اور اسے منظم کرنا چاہیے ۔ بہرحال اب ایک لمحہ بھی ضائع کرنے کا موقع نہ رہ گیا تھا ۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اگر نام آور لیڈروں نے اپنے کو جیل میں مقید کر لیا اور قانون پیشہ اصحاب نے آمدنی کے لیے عدالتوں کو نہ چھوڑا تو قوم کیسے منظم ہوگی ؟ اور اگر حکومت کے خلاف ایک مقدس جنگ جاری ہوئی تو پھر ملک کے نوجوانوں کو مدرسوں اور کالجوں کے تنگ و تاریک حجروں میں کس طرح چھوڑا جا سکتا ہے ؟ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ جس طرح جنگِ عظیم میں متحارب ممالک کے نوجوانوں نے کام کیا اُسی طرح اس ملک کے نوجوان بھی مدرسوں کو خیرباد کہہ کر اپنے ایثار پیشہ اساتذہ اور دوسرے لوگوں کی رہ نمائی میں اپنی فوج کے اندر سپاہی کی طرح کام کریں ؟ غرض گاندھی جی کا پروگرام عملی نقطۂ نظر کے علاوہ اپنی وسعت اور گیرائی کے اعتبار سے بھی بہت زیادہ دل کش اور دلیرانہ معلوم ہوتا تھا ۔ کیوں کہ یہ لائحۂ عمل ملک کے تمام کارآمد عناصر کو شیطانی حکومت کے متحدہ مقابلہ میں ایک ہی صف کے اندر لا کر کھڑا کر دینا چاہتا تھا ۔

اس سے بھی زیادہ یہ کہ گاندھی جی کا دعویٰ تھا کہ اُنھوں نے برطانوی کپڑوں کے مقاطعہ کے قدیم نعرۂ جنگ کے اصل جوہر شامل کر لیے ہیں اور اپنے خاص مقاطعہ کے نئے پروگرام میں وسعت پیدا کر دی ہے اور ملک کی قدیم کتائی اور بُنائی کی صنعتوں کو ازسرِنو منظم کیا ہے ۔ اُنھوں نے کہا کہ برطانوی مصنوعات اور کپڑوں کی درآمد کے خلاف ہر طریقہ سے جنگ کرو ۔ لیکن جاپانی اور امریکی کپڑوں کے خلاف بھی ایسا ہی کیوں نہ ہو ؟ کیا تم جاپانی اور امریکی اقتدار سے برطانوی اقتدار کو بدلنا چاہتے ہو ؟ کیوں کہ اُن کا خیال یہ تھا کہ کسی ملک سے کپڑے یا دوسرے سامان کا زیادہ مقدار میں آنے دینا گویا اس ملک کے سیاسی اقتدار کو از خود دعوت دینا ہے ۔ جب تک ہم اپنے ملک کے لوگوں کی ستر پوشی کے لیے معقول مقدار میں خود کپڑے نہ تیار کرنے لگیں، اُس وقت تک ہم کس طرح غیر ملکی درآمد کو روک سکیں گے ۔ ملک میں فوراً پارچہ بافی کے کارخانے قائم کرنا اور اُن کی تعداد میں اضافہ کرنا بالکل ناممکن سی بات تھی اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ ملک کے طول و عرض میں چرخوں اور راچھوں کا ایک جال بچھا دینے کی کوشش کی جائے جس سے ایک یہ بھی فائدہ ہوگا کہ ہندستان کے کروڑوں غریبوں کی شکم پُری کا بھی سامان ہو جائے گا ۔ اُن کی رائے یہ بھی تھی کہ اقتصادی نقطۂ نظر سے چرخہ مفید ہونے کے علاوہ ہندستان کے ہزاروں دیہاتوں میں کانگریس کی سرگرمیوں کے مرکز کا بھی کام دے گا، اور کسانوں بلکہ اُن بُڈھی عورتوں کو بھی جو اپنے جھونپڑوں میں کام کر رہی ہیں شہریوں کی اُس وسیع فوج کے دوش بدوش کر دے گا جو ہندستان کی آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں ۔

اس طرح گاندھی جی نے لوگوں کی نظر کے سامنے ایک دل کش امکان اور ایک محاربانہ آزمایش کا موقع پیش کر دیا ۔ صورتِ

حال یہ تھی کہ اگر یہ تحریک اپنے مقصد میں ناکام رہتی ہے تو بھی قوم خسارہ میں نہ رہے گی۔ کیونکہ اس کے ذریعہ کم ازکم جرأت وخود اعتمادی ضرور پیدا ہو جائے گی جو بہت بڑی چیز ہے، پھر کامیابی کے امکانات بھی ہیں۔ بہرحال کانگریس کے مندوبین برانے رہنماؤں کی لمبی چوڑی باتوں سے اُکتا چکے تھے۔ لہٰذا اُنھوں نے فیصلہ کر لیا کہ پُرامن ترکِ موالات کے اس رہنما کو ایک موقع ضرور دیا جائے۔

جدید اقتصادیات کا ہر عالم اور ہر پکا سیاسی انقلاب پسند اعتراضوں کی بوچھار سے گاندھی جی کے اِس پروگرام کی دھجیاں اُڑا سکتا تھا اور مارکسی اشتراکیت اور جدید انقلابات کی تاریخ کے علم کی مدد سے اُس انفرادی جذبات پرستی اور شخصی قسمت آزمائی کے تیار کردہ ڈھانچہ کے تمام معائب کو ایک ایک کر کے بے نقاب کر سکتا تھا۔

مثلاً حکومت کی مشنری کی مختلف کڑیوں پر زور دینے کے بجائے یہ زیادہ مناسب تھا کہ وہ زمینداروں اور سرمایہ داروں کو حکومت کا ساتھی قرار دے کر (اس لیے کہ موجودہ سرمایہ دارانہ ملکیت کی یہی جماعتیں سب سے زیادہ پشت پناہی کرتی ہیں) لوگوں کو اُن کے خلاف برانگیختہ کر کے اپنے مقاصد کے لیے آلۂ کار بنایا جاسکتا تھا۔ وہ کانگریس پر زور ڈال سکتے تھے کہ ہندستان کے کسانوں اور مزدوروں کے موروثی حقوق اور مراعات کا پہلے سے اعلان کر دے تاکہ مزدور اور کسانوں کے اندر یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ وہ کانگریس کی قیادت میں ایک منظم جماعت کی حیثیت سے اپنا بدلہ لے سکیں۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ خلافت جیسے توہم پرستانہ ادارے کے ساتھ ناانصافی یا پنجاب کے گزشتہ مظالم یا آزادی کے مبہم خوابوں کے بجائے اگر عوام کے سامنے مستقبل قریب میں بہتر زندگی کا ایک واضح نقشہ پیش کیا جاتا تو ہندستان کے کروڑہا جفاکش عوام زیادہ مضبوطی سے اس تحریک کا ساتھ دے سکتے تھے۔ اس کے متعلق اور بھی اس قسم کی بہت سی دلیلوں سے کام لیا جاسکتا تھا۔ مگر مسٹر داس اور اُن کے رفقا اِس باب میں گاندھی جی اور اُن کے مسلمان دوستوں سے کچھ زیادہ اونچی سطح پر نہیں تھے۔ دونوں اقتصادی اور سیاسی مقصد برآریوں کے جدید تشخیص اور عام انقلاب کو چلانے کی نئی اصطلاحوں سے بالکل ناواقف تھے۔ غرض کہ کوئی چیز نہ تھی جو گاندھی جی کو ایک یقینی فتح حاصل کرنے سے روک سکتی اور اُنھیں برطانیہ کے خلاف اپنی ترکِ موالات کی جدوجہد شروع کرنے سے باز رکھ سکتی۔

مگر اس تحریک کے لیے سیاسی لڑائی سے کچھ اور زیادہ ہونا مقدر ہو چکا تھا۔ وہ حضرات جنھوں نے کلکتہ کانگریس کی روداد اور اُس کے بعد سے جو سیاسی سرگرمیوں کی روح ملک میں دوڑ گئی تھی اُس کا مطالعہ کیا ہے وہ بآسانی اتفاق کریں گے کہ کانگریس کے مندوبین کی زبردست اکثریت نیز اُن کے کروڑوں مقلدین جو بعد میں شامل ہوئے انھیں محض سیاسی محرکات ہی نے نہیں اُبھارا تھا۔ اس کا پہلے ہی تجربہ ہو چکا ہے کہ جب گاندھی جی نے خلافت کے مسئلے کو چھیڑا اور ترکِ موالات کا پروگرام پیش کیا تو اُنھوں نے اپنے پروپیگنڈے میں نئی مذہبی مصطلحات کا استعمال شروع کر دیا تھا۔ اب ہندوستان کو صرف سیاسی آزادی کے لیے لڑنا نہیں تھا۔ بلکہ وہ ایک ایسی دنیا میں جو نوچی اور اقتصادی اختلافات سے پارہ پارہ ہو چکی تھی، رام راج یا دھرم راج (صداقت اور محبت کی سلطنت) قائم کرنے کا بیڑا اُٹھا چکا تھا۔ اور اس معاملے میں جیسے جیسے اُن کا پروپیگنڈا بڑھتا گیا وہ نئی نئی چیزیں بھی پیش کرتے گئے جن کی بنیاد پر وہ غیر ملکی حکومت سے لڑنا چاہتے تھے۔ مثلاً اگر وہ جدید مدارس اور اس کے اندر جو تعلیم داخل کی جارہی تھی اُس کے خلاف لڑنا چاہتے تھے تو اُس کا صرف یہ مطلب نہیں تھا کہ یہ مدارس غیر ملکی جفاکاروں کے قائم کیے ہوئے تھے بلکہ وہ بجائے خود صریح بُرائیوں کے حامل تھے، اُنھوں نے ہمیں بزدل بنا دیا، ہمارے ذہنوں کو محدود اور ہماری قومی تہذیب کی قدیم پاکیزگی کو بالکل برباد کر دیا ہے۔ ایک مرتبہ مسٹر تلک اور راجہ رام موہن رائے جیسے لوگوں نے انگریزی تعلیم سے جو ممکن فوائد حاصل کیے ہیں اُن پر بحث کرتے ہوئے گاندھی جی نے یہ رائے زنی کی کہ یہ لوگ عوام پر وہ اقتدار نہیں رکھتے جو چیتن، شنکر، کبیر، اور نانک کو حاصل تھا۔ اور اُن کے مقابلے میں بالکل "بالشتیے" تھے۔ اس طرح وہ اپنی بحثوں اور دلیلوں کے دوران میں برابر قدیم زمانے کے قابلِ فخر اصحاب اور ادبِ اعلیٰ کے جواہرات کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ اور کلکتہ میں کانگریس کے انعقاد کے بعد سے وہ سیاسی بغاوت ہی کی نہیں

بلکہ موجودہ شیطانی تہذیب کے خلاف بھی جسے حکومت برطانیہ نے ہندوستان پر مسلط کر دیا تھا، ایک اخلاقی بغاوت کی فضا پیدا کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ اسی طرح اُنھوں نے غیر ملکی ادب و فن اور طرز فکر کے خلاف بھی بغاوت کا ماحول پیدا کر دیا۔ وہ ہند قدیم اور ہند وسطیٰ کے مثالی تصور پیش کرتے چلے گئے یا ایک ایسی سوسائٹی کی خیالی تصویریں دکھاتے رہے جس کا نقشہ اُنھوں نے اپنی کتاب "ہند سوراج" میں کھینچا ہے۔ اس طرح کانگریس نے اُن کی ترک موالات کی حکمت عملی کو قبول کر کے نادانستہ طور پر ایک ایسے رجعت پسندانہ عمرانی فلسفے اور اقتصادی نقطۂ خیال کو اختیار کر لیا جو ناگزیر مستقبل کی تشکیل کے بجائے گھوم پھر کر مُردہ ماضی ہی کی طرف رجوع ہوتا تھا۔ اُس وقت سے اب تک جو دس سال گزر چکے ہیں جب ان پر نظر ڈالی جاتی ہے تو یہ صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ گاندھی جی نے کلکتہ میں عملی اقدام کا جو پروگرام پیش کیا تھا اُس سے کانگریس کو کچھ نہ کچھ فائدہ تو ہوا مگر تمام عمرانی اور اقتصادی اصلاحات میں جن پر سیاسی مسائل کا دارومدار ہے مذہبی ظلمت پرستی اور رجعت پسندانہ پاکبازیوں کو شامل کر کے اسے اس تھوڑے سے فائدے کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔

اکتیسواں باب

سہ گانہ مقاطعے کا غم انگیز افسانہ

جب ہم خلافت اسپیشل سے پھر بمبئی واپس ہوئے تو ہماری خوشی اور فخر کی کوئی حد نہ رہی۔ ہم اپنے بڑے رہنما کی کامیابی پر جس کے مقصد کو ہم اپنا مقصد بنا چکے تھے خوشی سے بغلیں بجا رہے تھے، اور اپنے کو مبارکباد دے رہے تھے کہ ہم کافی دلیر اور دور بیں ہیں کہ تقریباً تین سال پہلے ہی ہم اُن کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے تھے۔ حالانکہ ابھی قوم نے اُنھیں متفقہ طور پر اپنا ہادیٔ مطلق نہیں تسلیم کیا تھا۔ اور ہم اس امر پر بھی خوش تھے کہ اُس پُرامن جنگ کا جسے قوم نے کمیٹی اور کانگریس کے کھلے اجلاس میں اس قدر بحث و تمحیص کے کے بعد بہت بڑی اکثریت سے منظور کیا ہم نے پہلے ہی گجرات میں آغاز کر دیا تھا۔

لیکن ایسا نہیں تھا کہ ہماری خوشی میں خوف کی آمیزش نہ رہی ہو۔ ہمیں یہ بات فراموش نہیں ہوئی تھی کہ پنڈت مالویہ جیسے قدیم رہنما سے لے کر مسٹر داس جیسے نئے کارکنوں تک سے گاندھی جی کے سیاسی مقاصد کی پوری پوری تصدیق کے باوجود آخیر تک اُن کے پروگرام کی ہر شق کی مخالفت بھی کرتے رہے۔ گو اُن کی مخالفت کانگریس کی اکثریت سے دب گئی تھی۔ لیکن اتنا ظاہر تھا کہ اگر ان رہنماؤں نے اُس تحریک کو جسے کانگریس نے اُن کی متحدہ مرضی کے خلاف طے کر دیا تھا دل و جان سے چلانے کی کوشش نہ کی تو ملک کے مختلف صوبوں میں یہ پروگرام کوئی نمایاں کامیابی نہیں حاصل کر سکتا۔ الغرض ہمیں اور شاید گاندھی جی کو بھی رہ رہ کر اس خیال سے تکلیف ہوتی تھی کہ کیا یہ رہنما سارے ذہنی اختلافات اور ذاتی جذبۂ افتخار سے قطع نظر کر کے قوم کے فیصلے پر جس کا کلکتہ میں مظاہرہ ہو چکا ہے سر جھکا دیں گے اور سوراج کے بہادر سپاہیوں کی طرح خوش خوش اور وفاداری سے گاندھی جی کے جھنڈے تلے کمریں کس کر مارچ کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے؟ یا وہ کانگریس کی صفوں میں اپنی مخالفت جاری رکھیں گے اور دسمبر کے آخر میں بمقام ناگپور کانگریس کا جو اجلاس ہونے والا ہے اُس میں اکثریت کو اپنے نقطۂ نظر کی طرف پھیرنے کی کوشش کریں گے؟

لیکن ابھی چند دن بھی نہیں گزرے تھے کہ مسٹر داس اور مخالفین کی قلیل جماعت نے اپنے حب الوطنی اور کانگریس کی تابعداری کے جذبے کی ایک روشن مثال قائم کردی جس سے ساری قوم پر ایک مسرت خیز تعجب چھاگیا۔ مقتدر رہنماؤں میں صرف موتی لال نہرو ہی ایک ایسے رہنما تھے جنھوں نے کلکتے میں گاندھی جی کے پروگرام کو دل سے مکمل طور پر قبول کرلیا تھا اور اپنی شان دار پریکٹس چھوڑنے کا بھی فیصلہ کرچکے تھے، لالہ لاجپت رائے کانگریس کے فیصلے سے کئی ماہ پہلے ہی کونسلوں کے بائیکاٹ کا تصفیہ کرچکے تھے۔ حزب مخالف کے رہنماؤں میں غالباً مسٹر داس ہی سب سے پہلے رہنما تھے جنھوں نے کانگریس کے فرمان کے مطابق ترکِ موالات کی تحریک میں شرکت کرلی۔ اُنھوں نے مع اپنے دوسرے بنگالی رفقاء کے فوراً ایک اعلان شائع کیا جس میں کونسلوں کے انتخابات کے لیے کھڑے ہونے کی اپنی مشہورہ خواہش سے دست کشی کا اظہار کیا اور رائے دہندوں پر زور دیا کہ وہ آنے والے انتخابات میں صوبائی اور مرکزی مجالس قانون ساز کا مقاطعہ کردیں۔ دوسرے اختلاف کرنے والے رہنما مثلاً مسٹر وی۔ جے پٹیل بمبئی میں، مسٹر جیکر مدراس میں، مسٹر سری نواس آئنگر پونا میں مسٹر کیلکر ناگپور میں، مسٹر مونجے اور بہت سے اور رہنماؤں نے بعجلت یکے بعد دیگرے مسٹر داس کی تقلید کرنی شروع کردی۔ لہٰذا چند ہفتوں میں آنے والے انتخابات کے مقاطعہ کی اس تحریک نے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک عجیب قوت حاصل کرلی۔ نوجوان سیاسی کارکنوں اور عوام کو یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ بڑے بڑے رہنما حکومت کی زبردست طاقتوں کے مقابلہ میں ایک متحدہ محاذ پیش کرنے کے لیے کانگریس کے نظم اور گاندھی جی کے سامنے جُھک رہے ہیں۔ عوام تک کانگریس کا پیغام پہنچانے کے لیے سارے مُلک میں بڑے بڑے جلسے اور مظاہرے ہوئے، گو حزب مخالف کے بہت سے رہنماؤں نے اپنے مشوروں کو مجالس قانون ساز کے مقاطعوں تک محدود رکھا مگر عوام کو پورے پروگرام کی تائید کرنے سے جس کا پرچار گاندھی جی ملک بھر میں اپنے طوفانی دوروں نیز بہت سے اخبارات اور کثیر التعداد پلیٹ فارموں سے کر رہے تھے روکنا ناممکن تھا۔

انتخاب کے دن کانگریس کے پروپگنڈے کو اس معاملے میں پوری کامیابی حاصل ہوئی۔ انتخاب کے لیے کوئی کانگریسی نہیں کھڑا ہوا۔ صرف کچھ اعتدال پسند سیاست داں زمیندار اور ایسے لوگ جو حکومت کے حامی تھے، انتخاب کے لیے کھڑے ہوئے۔ کانگریسی کارکنوں نے رائے دہندوں سے صرف انتخابات کے کامل مقاطعہ ہی کی درخواست نہیں کی بلکہ یہ بھی چاہا کہ وہ پرامن طریقے سے اس پر عمل کریں۔ ان لوگوں کو کہا گیا کہ یہ لوگ اپنے اپنے گھروں میں مقیم رہیں بلکہ پکٹنگ کے لیے انتخاب گاہوں میں بھی نہ جائیں۔ سارے ملک میں انتخابات کے ایام پوری خیروخوبی سے گزر گئے۔ جیساکہ حکومت کے اعدادوشمار سے ظاہر ہوتا ہے، رائے دہندوں کی ایک بڑی اکثریت نے ووٹ نہیں دیے، اور اعتدال پسندوں اور دوسرے رہنماؤں کو جن کا مجالسِ قانون ساز میں انتخاب ہوا۔ رائے عامہ کی اکثریت کا ہرگز نمائندہ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ جیساکہ مسٹر گاندھی نے "ینگ انڈیا" میں صحیح طور سے لکھا ہے (۲۴ر نومبر ۱۹۲۰ء) "جہاں تک رائے دہندگان کا تعلق ہے احاطہ بمبئی اور دوسرے مقامات کے انتخابات سے کونسلوں کے مقاطعہ کی کامیابی کا اظہار ہوتا ہے۔ بعض جگہ تو ایک رائے دہندہ نے بھی ووٹ نہیں دیا۔ یہ نام نہاد نمایندے کریں گے کیا؟ .... رائے دہندوں نے اس کو نہایت واضح طور پر ثابت کردیا ہے کہ وہ اصلاحی کونسلوں سے کوئی واسطہ نہ رکھیں گے۔ اگر ملک کے اس واضح فرمان کے باوجود بھی کچھ ممبر کونسل میں داخل ہونے پر مصر ہیں تو یہ نمائندہ ادارے محض مہمل چیز بن کر رہ جائیں گے۔"

کونسلوں کے مقاطعے کے پروگرام سے کارکنوں کی اکثریت کا سیاسی جذبہ ضرور متاثر ہوا۔ مگر تعلیمی اداروں کے مقاطعے کے متعلق گاندھی جی کے بے مثال پروپگنڈے کا اُن پر کوئی اثر نہ ہوا۔ پھر مسٹر داس، لالہ لاجپت رائے اور کلکتے کی مخالف جماعت کے دوسرے رہنما مدرسوں اور کالجوں کے بائیکاٹ کے بارے میں کانگریس کے فرمان کو اتنی آسانی سے ماننے پر آمادہ بھی نہ تھے۔ جیسے اُنھوں نے حب الوطنی کے جوش میں کونسلوں کے مقاطعہ کے لیے آمادگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ مُلک کا کوئی اول درجے کا رہنما گاندھی جی کی حمایت میں نہ تھا اس لیے اُنھیں اپنے پروگرام کی اس شق کو کامیاب بنانے کے لیے علی برادران اور کانگریس کی بڑھتی ہوئی تقلید اور عوام کے جوش وخروش

سے مدد لینی پڑی - اگرچہ اُنھوں نے بڑے صبر و استقلال سے مقابلہ کیا - مگر اُن کی ابتدائی ناکامیوں ہی کو دیکھ کر ہمیں اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ تحریک ترکِ موالات کے سلسلہ میں یہ شق سب سے زیادہ کمزور کڑی کی حیثیت رکھتی ہے - واقعی پروگرام کے اس حصّے کی تیاری میں گاندھی جی نے بڑی اختراع اور سوجھ بوجھ سے کام لیا تھا - وہ حکومت کی تعلیمی مشینری پر تمام ممکن محاذوں سے حملہ کرنے کے خواہاں تھے - اُنھوں نے اس پر اس طرح عمل شروع کیا کہ بچّوں کے والدین سے اُنھوں نے درخواست کی کہ وہ ایسے مدرسوں سے جو حکومت کے اختیار میں ہوں یا اُن کو حکومت سے مالی امداد ملتی ہو اپنے لڑکوں کو اُٹھالیں - اُنھوں نے اس مقاطعے کی رفتار اس طرح اور بڑھادی کہ سولہ برس سے زائد عمر کے طالب علموں اور طالبات سے براہِ راست اپیل کرنے لگے کہ وہ اپنے والدین کی مرضی سے قطع نظر کر کے بطور خود ان حکومت زدہ مدرسوں سے تعلق ترک کردیں - بہت سے روشن خیال والدین نے ایسی اپیلوں کے خلاف کچھ نرم اور کچھ گرم احتجاج کیا؛ ان درخواستوں کا جن کی بنیاد اطاعت والدین اور خاندانی ضبط و نظم کے مقدس اصولوں پر رکھی گئی تھی گاندھی جی پر کوئی اثر نہ ہوا، وہ نوجوانوں سے بدستور براہِ راست درخواست کرتے رہے حتیٰ کہ اُنھوں نے ہندوستانی مذہبی تاریخ اور اساطیر سے مقدس مثالیں پیش کر کر کے نوجوانوں سے اپیل کی کہ وہ والدین کی مرضی کو نظر انداز کر کے ترکِ موالات کی صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جائیں - گو عملی ترکِ موالات کے حقیقی اعداد و شمار کچھ زیادہ امید افزا نہ تھے تاہم گاندھی جی کی نئی حکمت عملی نے کانگریسی کارکنوں کو اس قابل کر دیا کہ وہ اطراف و اکناف ملک میں نوجوانوں کے بے شمار جلسے منعقد کر سکیں اور اُن کے دلوں میں پُرامن بغاوت کے انوکھے عقیدے کی داغ بیل ڈال سکیں جسے ملک کی ایک بڑی اکثریت منظور کر چکی تھی -

گاندھی جی نے فی الحال اپنی جدوجہد کے لیے ایک دوسرا راستہ اختیار کیا - چونکہ غیر سرکاری جماعتیں بہت سے ثانوی مدارس اور کالج چلاتی تھیں اِس لیے اُنھوں نے ان جماعتوں سے کانگریس کے نام پر اپیل کی کہ وہ سرکاری امداد لینی بند کر دیں اور سرکاری اقتدار سے آزادی حاصل کرنے کے علاوہ سرکاری یونیورسٹیوں سے الحاق بھی منقطع کر لیں - یہی نہیں اُنھوں نے ایم - اے - او کالج اور بنارس ہندو یونیورسٹی جیسے تعلیمی مرکزوں کو بھی "قومی" رنگ میں رنگنے کی ایک تحریک شروع کر دی -

اس زمانے میں اس موضوع پر گاندھی جی کے زبردست پروپیگنڈے نے اور مدرسوں اور کالجوں کے طلبا کے روز روز کے جلسوں نے ملک کے نوجوانوں میں ایک سیاسی بغاوت کی روح پھونک دی - اگرچہ ہر مقام پر بہت تھوڑے سے طلبا سرکاری تعلیم گاہوں کے مقاطعہ پر آمادہ ہو گئے - مگر گاندھی جی اپنے شہر احمد آباد اور گجرات کے پُورے صوبے میں بہت سے ثانوی مدرسوں کو قومی رنگ میں رنگ کر ہندوستان کے لیے ایک عمدہ مثال قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے - اس سلسلے میں احمد آباد کے پروپرائٹری اسکول نے شاندار مثال قائم کی اور دوسرے شہروں اور مدرسوں نے اس کی تقلید کی - بعض بڑے شہروں بلکہ چھوٹے دیہاتوں میں بھی مدرسے کھولے گئے اور گجرات اور دوسرے مقامات پر قومی کالجوں اور یونیورسٹیوں کے کھولنے کی غرض سے انتظامات ہونے لگے -

گاندھی جی کو ڈرامائی اور سنسنی پیدا کرنے والی حرکتوں سے جو محبت ہے اُس کے تقاضے پر اُنھوں نے علی برادران کے مشورے سے علیگڈھ کالج کو قومی رنگ میں رنگنے کی پُرزور جدوجہد کرنے کا فیصلہ کر لیا - مولانا محمد علی اکتوبر کے پہلے ہفتے میں یورپ سے واپس آئے تھے - اب گاندھی جی اُن کے ساتھ علی گڈھ تشریف لے گئے اور اُنھوں نے وہاں کے طلبا اور پروفیسروں کے ایک بہت بڑے مجمع کو مخاطب کیا اور اُنھیں ترغیب دی، کہ وہ حکومت کی امداد لینے سے انکار کر دیں اور اُس کے اقتدار سے نکل آئیں - غرض کہ اُنھوں نے کالج کے ٹرسٹیوں (معتمدین) کے نام ایک کھلا خط لکھا جن سے اُن کے بعض ترک موالاتی لیڈروں نے یونیورسٹی کو قومی رنگ میں رنگنے کی درخواست پہلے کر دی تھی -

گاندھی جی نے اپنے اخبار ینگ انڈیا (۲۷ اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ء) کے ایک مضمون میں اپنی سرگرمیوں اور دلیلوں کا خلاصہ جس انداز میں پیش کیا ہے اُس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا - اس چہل و پنج سالہ ادارے کی روایات کی تعریف کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

"یہ ہندوستان میں اسلامی تہذیب کا سب سے زیادہ معروف مرکز ہے، میں اسے برباد کرنے کے درپے کیوں ہوں؟ واقعی

بعض مسلمان سمجھتے ہیں کہ میں علی گڈھ کی بہی خواہی کے بہانے سے اس کے ساتھ بُری نیت رکھتا ہوں۔ انھیں اس کی خبر نہیں کہ میں پنڈت جی (مالویہ) سے بنارس ہندو یونیورسٹی کے ساتھ بھی وہی معاملہ کرنے کی درخواست کر رہا ہوں جو میں نے یہاں کے ٹرسٹیوں سے مسلم یونیورسٹی کے ساتھ کرنے کو کہا ہے۔ میں یقیناً ہندو یونیورسٹی کے طلبا کے سامنے بھی اُسی خلوص کے ساتھ اپنے مدعا کی پیروی کروں گا جیسے میں نے مسلم یونیورسٹی کے طلبا کے سامنے کیا ہے۔ خالصہ کالج کے ساتھ بھی جو سکھ تہذیب کا واحد مرکز ہے میرا یہی رویہ رہا۔ میں ان تینوں کو برباد کرکے ان کی جگہ زیادہ پاکیزہ اور زیادہ سچے ادارے قائم کرنے کا بے حد خواہشمند ہوں۔" مجھے یہ تسلیم نہیں ہے کہ یہ ادارے اپنی اپنی تہذیب کے صحیح نمائندے ہیں۔" جس طرح اسلام انگریزوں کے ہاتھوں تباہی میں ہے اُسی طرح ہندو مذہب اور سکھ مذہب بھی اُن کے ہاتھوں تباہی میں ہیں۔"

"حکومت برطانیہ کے ارادوں سے واقف ہوتے ہوئے یہ امر بالکل ہماری مردانگی اور حب الوطنی کے خلاف ہے کہ ہم خود اپنی رقم کا کوئی حصہ ایسے ہاتھوں سے قبول کریں جو جلیانوالہ باغ کے معصوموں کے خون سے رنگین ہیں۔ اس حکومت نے ہم سے ہماری عزت چھین لی ہے اور ہمارے ایک مذہب کو خطرہ میں ڈال دیا ہے۔ میری ناچیز رائے میں قوم کے لیے یہ گناہ ہے کہ وہ ایسے مدرسوں میں تعلیم حاصل کرے جن کی مالی مدد حکومت کرتی ہے، یا جو حکومت کے زیر اقتدار ہیں۔"

۱۷ اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ء کو علی گڈھ کے ٹرسٹیوں (معتمدین) کا جلسہ ہوا اور اُنھوں نے اِس ادارے کو پُرانے ڈھرے پر چلانے کا فیصلہ کیا۔ نئی تحریک سے متاثر ہوکر جن چند طلبا نے قدیم ادارے کو چھوڑ دیا تھا اُن کو تعلیم دینے کے لیے ۱۲ اکتوبر کو قومی مسلم یونیورسٹی یعنی جامعہ مِلّیہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا جس کے پرنسپل مولانا محمد علی مقرر ہوئے۔ اسی طرح گو پنجاب میں گاندھی جی کے ورود سے طلبا میں بہت جوش پیدا ہوگیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے کالجوں میں عام ہڑتال منائی گئی، مگر گاندھی جی کسی کالج کے ارباب حل وعقد کو اپنے اداروں کو قومی بنانے پر آمادہ نہ کرسکے۔ بنارس میں گاندھی جی کی تقریروں اور پروپیگنڈوں نے ہندو یونیورسٹی کے طلبا کے اندر ایک عارضی اسٹرائک کا جذبہ ضرور پیدا کردیا۔ مگر پنڈت مالویہ اور یونیورسٹی کے دیگر مقتدر لوگوں نے اپنی زندگی بھر کے کام کو ایک سیاسی تحریک کی وقتی ضروریات پر قربان کرنے سے انکار کردیا۔ ملک کے بہت سے کالجوں اور اسکولوں میں ایسی ہی عارضی ہڑتالیں ہوتی رہیں مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے کسی ایسے کالج کو جو اُس وقت موجود تھا قومی رنگ میں رنگنے کی کوشش میں گاندھی جی کو بالعموم ناکامی ہی کا مُنھ دیکھنا پڑا۔

گاندھی جی نے اس راستے میں مخالفت کی مضبوط دیوار دیکھ کر اپنی پوری قوتِ عمل نئے اسکولوں اور نئے کالجوں کے قیام کے لیے وقف کردی۔ اُنھوں نے ۱۵ نومبر کو نیشنل کالج اور گجرات نیشنل یونیورسٹی کا افتتاح کیا۔ لازمی طور پر اُنھیں اسی یونیورسٹی کا پہلا چانسلر مقرر کیا گیا۔ پروفیسر گدوانی جو ابھی سینٹ اسٹیفن کالج سے مستعفی ہوئے تھے اُنھیں نیشنل کالج کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ اور کالج کا آغاز تین سو طلبا سے ہوا۔ ۵ جنوری سنہ ۱۹۲۱ء کو اس طرح کا ایک کالج گاندھی جی کے زیر ہدایت پٹنے میں قائم ہوا۔ فرگوسن کالج اور نیو پونا کالج کو قومی بنانے کی کوششیں ناکام ثابت ہوچکی تھیں اس لیے ۱۱ دسمبر کو پونا میں تلک مہاودیالیہ (نیشنل کالج) قائم کیا گیا۔ فی الحقیقت اسکولوں اور کالجوں کو قومی بنانے کی کوشش میں نمایاں ناکامیابی کو چھپانے کی غرض سے گاندھی جی نے نسبتاً چھوٹے اور معمولی قومی اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کی بنیاد رکھنی شروع کی۔

اُنھیں قانون پیشہ اور خطاب یافتہ لوگوں کے معاملے میں اور بھی کم کامیابی ہوئی۔ یہ صحیح ہے کہ نوجوان قانون پیشہ اصحاب اور معمر وکلا بھی کانگریس کی پکار پر پریکٹس چھوڑ کر پورے وقت کے لیے قومی کارکن بن گئے تھے، مگر ان کی حیثیت مستثنیات کی سی تھی۔ خطاب یافتہ لوگوں کی صرف ایک ادنےٰ ترین اقلیت نے خطابوں کو ترک کیا۔ تاہم بڑے زوروں سے یہ شور کیا گیا کہ کانگریس کے پروپیگنڈے سے کونسلوں، عدالتوں، اسکولوں، اور خطابوں کی اخلاقی قدر کو بہت نقصان پہنچا۔ واقعتاً ایسا ہوا، مگر یہ کامیابی عارضی تھی، اور ایک مرتبہ پھر دسمبر کے آخر میں

ہزاروں مندوبین کانگریس کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے ناگپور آئے اور یہ دیکھنے لگے کہ آیا کلکتے میں مخالفت کرنے والے لیڈر اکثریت کا ساتھ دیتے ہوئے حکومت کے خلاف پُر آشوب بغاوت کی شدید جدوجہد کی قیادت پر آمادہ ہیں یا نہیں؟

بتیسواں باب

ناگپور میں قومی اِتّحاد

ہم لوگ یعنی گجرات کے کارکن ناگپور کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی غرض سے ایک جماعت کی صورت میں احمد آباد سے بذریعہ اسپیشل ٹرین کم و بیش ایک تفریحی کیفیت کے ساتھ روانہ ہوئے۔ سورت سے بردولی تک مختلف اسٹیشنوں پر دوسرے کارکن بھی ہمارے ساتھ شامل ہوتے گئے۔ کلکتے میں ہماری کامیابی کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ گاندھی جی کے پروپیگنڈے سے تمام ملک میں عام جوش و خروش کا اچھا خاصہ طوفان برپا ہو چکا تھا۔ اس مختصری مدت میں اُنھیں جو عملی کامیابی حاصل ہوئی تھی اُس سے ہمیں یقین ہو گیا کہ اگر ناگپور میں مسٹر داس کی جماعت نے مخالفت بھی کی تو وہاں ہمیں کلکتے سے زیادہ اکثریت کی تائید حاصل ہوگی اور فتح ہماری ہی ہوگی۔ ہمیں کانگریس کے فیصلے کا یقین تھا ہی۔ لہٰذا ہم ٹرین میں بہت خوشی دخرمی کے عالم میں سفر کرتے جا رہے تھے اور اسٹیشنوں پر اُتر اُتر کر قومی نعرے بلند کرتے اور قومی ترانے الاپتے تھے۔ ہمیں اس ٹرین میں ضیافتوں کا جو لطف آیا ویسا لطف نہ اس سے پہلے کبھی آیا تھا نہ اس کے بعد کبھی آیا۔ ہم نے ریلوے ملازمین سے بھی خوب چھیڑ چھاڑ کی۔ ہمیں پہلی مرتبہ یہ یقین ہوا کہ اس قسم کے معمولی امور میں بھی منظم اور پُر زور طریقے پر سب لگایا جائے تو کامیابی ہو سکتی ہے۔ اس طرح ہم ناگپور پہنچے، ہم نے یہاں دیکھا کہ انسانوں کا ایک جمِ غفیر کانگریس کے اس غیر معمولی اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے ملک کے ہر ہر گوشے سے آکر جمع ہوا تھا۔

میرا خیال ہے کہ شاید یہ پہلا موقع تھا کہ ناگپور میں کانگریس کے مندوبین کے ٹھہرانے کے لیے ایک نیا شہر آباد کیا گیا۔ اب تک یہ ہوتا چلا آیا تھا کہ جن شہروں میں کانگریس کے اجلاس منعقد ہوتے تھے وہاں مختلف نجی اور پبلک عمارتوں میں چند ہزار مندوبین کے ٹھیرانے کا انتظام کر لیا جاتا تھا۔ اس مرتبہ مندوبین کی تعداد پندرہ ہزار سے بھی تجاوز کر گئی۔ ناگپور جیسے چھوٹے شہر میں جہاں عمارتیں بھی نسبتاً کم ہی ہیں، زیادہ مندوبین کے قیام کا امکان نہ تھا۔ اور پھر گاندھی جی کی یہ خواہش تھی کہ مندوبین نوابوں کی طرح زندگی بسر کرنا چھوڑ دیں کیوں کہ اُن کی رائے میں یہ لوگ جب پہلے کانگریس میں شرکت کی غرض سے آیا کرتے تھے تو نوابوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے، وہ درحقیقت یہ چاہتے تھے کہ کانگریس کے نمایندے معمولی غربا کی طرح زندگی بسر کریں جس سے اُن کے جذبۂ ایثار اور قوتِ برداشت کا مظاہرہ ہو جو ترکِ موالات کے ریزولیوشن کی روح ہے۔ نیا شہر ایک وسیع احاطے میں آباد کیا گیا تھا۔ اس میں پھوس اور پتّوں سے چھوٹی چھوٹی عارضی جھونپڑیاں بنا دی گئی تھیں۔ پانی اور روشنی کا البتہ معقول انتظام تھا۔ ایسی معمولی جھونپڑیوں میں رہنا اور ایسی چارپائیوں پر سونا جو اکثر راتوں میں ٹوٹ جایا کرتی تھیں بہت سے مندوبین کے لیے ایک نئی چیز تھی، بہت سے مندوبین نے فرداً فرداً اور بہتوں نے اجتماعی طور پر ایسی خراب چھاجن کی جھونپڑیوں کے متعلق شکایت بھی کی کہ وسط ہند کے شدید جاڑوں کے لیے یہ بے حد تکلیف دہ ہیں۔

ہم میں سے بعض چھوٹے چھوٹے پکے مکانوں کی ایک نو آبادی میں مقیم ہو گئے۔ بہر حال جب ہم اپنے اپنے ٹھکانے پر جا کر قیام پذیر ہو چکے تو ہم نے یہ ناخوشگوار افواہ سُنی کہ دکن اور بالخصوص بنگال کے مندوبین بڑے زور کی یورش کرنے والے ہیں۔ ہمارے کانوں میں یہ بھنک

بھی پڑی کہ مسٹر داس کلکتے کے فیصلے کو پلٹنے اور گاندھی جی کی اکثریت کو مغلوب کرنے کے لیے مندوبین کی ایک کثیر امدادی فوج لے کر آ رہے ہیں۔ ہمیں یہ معلوم تھا کہ جہاں تک نظری اختلاف کا تعلق تھا بنگال، بمبئی اور دکن کے ڈیلیگیٹ ترک موالات کے پروگرام کے ایک بڑے حصے کی مخالفت میں باہم مضبوطی سے متفق تھے اگرچہ ان کے لیڈر بڑی خوبصورتی سے کونسلوں کے مقاطعہ کا اعلان کر کے گاندھی جی کی اکثریت کی صف میں آ گئے تھے۔ ان صوبوں پر عملاً اسکولوں اور عدالتوں کے مقاطعہ کے پروپیگنڈے کا کوئی اثر نہ پڑا تھا۔ یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا مسٹر داس اور دوسرے لیڈر اپنے متبعین کے ساتھ ٹھیک وقت پر پہنچ آئے۔ اب ہم نے سنا کہ ایک طرف گاندھی جی اور دوسری طرف مسٹر داس، لالہ لاجپت رائے اور دوسرے مخالف لیڈروں کے درمیان کسی متفقہ فیصلے تک پہنچنے کے لیے درپردہ مشورے ہو رہے تھے۔ جب تک گاندھی جی کے ترکِ موالات کے ریزولیوشن پر غور کرنے کے لیے مجلسِ موضوعات کا جلسہ منعقد نہ ہوا اُس وقت تک دوسرے تماشائیوں کے لیے یہ مسئلہ لاینحل رہا۔

مجلس موضوعات کی روئداد کے شروع ہوتے ہی کچھ ایسے حالات رونما ہوئے جن سے بے حد حیرت و مسرت ہوئی۔ جب گاندھی جی اپنی اس تجویز کو جو کم و بیش کلکتے کے ڈھرے پر مرتب کی گئی تھی پیش کر چکے تو مسٹر داس نے کلکتے کی طرح سختی سے اُس کا مقابلہ کرنے کے بجائے اُس کے بعض حصوں میں چند زبانی ترمیمیں پیش کرتے ہوئے گا ۔ ںاجی کے نقطۂ خیال کی طرف رضامندی کے ساتھ رجوع کرنے کا اعلان کر دیا۔ جتندر لال برجی نے مسٹر داس کی تجویزوں کو غیر مربوط قانونی نکتہ دانی کی نمائش کہہ کر مسترد کر دیا۔ بنگال کے کارکنوں میں جو لوگ پہلے پہل کلکتے میں گاندھی جی کے شریکِ کار بنے تھے اُن میں یہ بھی تھے، اس لیے وہ بجا طور پر صرف اپنی لاج رکھنے کے لیے مسٹر داس کی ہر تنقید کی مخالفت پر تُلے ہوئے تھے۔ دوسری طرف مسٹر گاندھی تھے جو اب کلکتے کے آتش بیاں مبلغ کے بجائے ایک نہایت معقول پسند اور موقع شناس مدبر نظر آ رہے تھے۔ اس لیے وہ مسٹر داس، لالہ جی، اور دوسروں کے مشوروں کے مطابق اپنی تجویز میں ترمیم کرنے پر آمادہ ہو گئے اور یہ تجویز متفقہ طور پر مجلسِ موضوعات میں منظور کر لی گئی۔ جب مسٹر داس نے جو کلکتے میں حزبِ مخالف کی علم برداری کر رہے تھے کھلے اجلاس میں ایک مختصر مگر مؤثر تقریر میں گاندھی جی کے ریزولیوشن کی تائید کی اور جب اُنھوں نے اپنی شان دار وکالت کو قربان کر دینے کا مردانہ اعلان کیا تو پوری کانگریس یک زبان ہو کر متفق ہو گئی اور حاضرین نے متحدہ طور پر ترکِ موالات کے پروگرام کو منظور کر کے بڑے جوش و خروش کے ساتھ خوشی کے نعرے بلند کیے۔ اس وقت مسٹر داس اور اُن کے مقلدوں کے تبدیلِ مسلک کی حقیقت اور غایت کو بہت کم لوگوں نے سمجھا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کے تیز اور ہوشیار دماغ گاندھی جی کی تائید میں نہ تھے۔ کلکتے میں نہ کوئی ایسی بات ظاہر ہوئی اور نہ گاندھی جی نے کوئی ایسی نئی بات کہی جس سے وہ مدرسوں اور عدالتوں کے مقاطعہ کو اُس کی اصلی اہمیت کے لحاظ سے ہندستان کے مرض کے لیے تریاق سمجھنے پر مجبور ہو جاتے۔ اُنھوں نے گاندھی جی کے ریزولیوشن کی حمایت کر کے درحقیقت اپنی ذہنی قلبِ ماہیت سے زیادہ اپنے جذباتی تاثر کا مظاہرہ کیا تھا۔ اُن کے دماغ ان شکوک کے متعلق جو اس موضوع سے متعلق تھے کوئی فیصلہ نہ کر سکے تو اُن کے دل قومی جذبات کے چڑھتے ہوئے دریا میں راضی خوشی بہنے لگے۔ اُنھوں نے خیال کیا کہ ایک ایسے نئے اور غیر معمولی پروگرام کو چلانے میں جس سے گاندھی جی کو اس قدر عشق تھا اختیار دے دینے اور اُن کا ہاتھ بٹانے میں کسی نقصان کا احتمال نہیں بلکہ کچھ نہ کچھ فائدے ہی کی توقع ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اس موقع پر جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ اُن کی مخالفت ختم نہیں ہوئی بلکہ عارضی طور پر ملتوی ہو گئی جیسا کہ آیندہ معلوم ہوگا۔ اِس ذہنی مخالفت کا اظہار خود مہاتما کے خلاف ہونا یقینی تھا چناں چہ ۱۹۲۳ء میں مسٹر داس نے اپنی سوراج پارٹی کا سنگِ بنیاد رکھا اور جب گاندھی جی ۱۹۲۴ء میں جیل سے رہا ہوئے تو اُس وقت مسٹر داس اُن کی آمرانہ کوششوں کی مخالفت کے لیے پورے عزم کے ساتھ مسلح تھے۔

جب ایک مختصر اور رسمی بحث کے بعد ترکِ موالات کا ریزولیوشن مجلس موضوعات میں منظور ہو گیا تو دو اور اہم موضوع کمیٹی میں پیش ہوئے جن پر کافی سرگرمی سے اور بہت طویل بحثیں ہوئیں۔ ایک غیر ممالک میں پروپیگنڈے کا مسئلہ تھا اور دوسرا کانگریس کے دستور کا۔ جہاں تک ترکِ موالات کی عام حکمتِ عملی کا تعلق تھا ناگپور کانگریس کلکتہ کانفرنس کے نقشِ قدم پر گام زن تھی۔ مگر اس نے خاص طور پر انگلستان میں کمیٹیوں اور اخبارات کے ذریعے تمام پروپیگنڈا بند کرنے کا فیصلہ کر کے اور ایک مکمل اور عملی دستور منظور کر کے جسے گاندھی جی نے امرتسر کانگریس کی مقرر کردہ کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے مرتب کیا تھا ملک کی سیاسی تاریخ میں ایک نئے عہد کا آغاز کیا۔

غیر ملکوں میں پروپیگنڈا کرنے کے متعلق اس وقت جو کچھ فیصلہ کیا گیا اُس پر کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ ناگ پور کانگریس میں کمانڈر وجوڈ، مسٹر بالفور ڈنانٹ اور مسٹر بن اسپور کی موجودگی کی وجہ سے اس موضوع پر اتنی گرم بحثیں ہوئیں ورنہ شاید یہ نہ ہوتا۔ ان تینوں اصحاب نے لندن میں ہندستانی کانگریس کی طرف سے اخبار نکلتے رہنے اور برطانوی کمیٹی کو چلانے کے لیے کانگریس کی حمایت حاصل رہنے کے سلسلے میں بڑی فصیح تقریریں کیں۔ اور مسٹر گاندھی نے بھی اُن کو جواب دینے میں فصاحت کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ اُن کی خاص دلیل یہ تھی کہ ہندستان کو آزادی حاصل کرنے کے لیے برطانوی حکومت، برطانوی افراد یا اور کسی غیر ملک کے افراد پر اعتماد نہ کرنا چاہیے۔ اُنھوں نے فرمایا کہ ہمیں قوم کو منظم کرنے اور اس کے اندر ایک ایسی ناقابلِ شکست قوت پیدا کرنے کے لیے اپنی تمام قوتِ عمل کو ایک مرکز پر لانا چاہیے جس کے سامنے طاقت ور سے طاقت ور سلطنت کو جھکتے ہی بنے۔ لہٰذا اُن کی رائے میں غیر ممالک کے اندر پروپیگنڈا کے کام جاری رکھنے کی تجاویز سے اس سے زیادہ اور کچھ نہ ہوگا کہ قوم کے دلوں میں ایک زبردست توانائی پیدا کرنے کی طرف سے توجہ ہٹ جائے گی۔ اگر ہندستانی لوگوں کو اپنی روح کی حفاظت منظور ہے تو اُنھیں اپنی تمام قوتِ عمل کو اپنے اندر جذب کر لینا چاہیے۔ اور دوسرے لوگوں سے بے معنی امیدیں وابستہ رکھنے سے احتراز کرنا چاہیے۔ مولانا محمد علی اور بعض دوسرے لوگوں نے گاندھی جی کی پوری پوری ہم نوائی کی، مسٹر داس اور اُن جیسے دوسرے اصحاب نے جن کا نقطۂ نظر کچھ مختلف تھا اس خیال کا مذاق اُڑایا کہ غیر ملک میں پروپیگنڈا کے لیے گزشتہ سال صرف تین ہزار روپے کی حقیر رقم منظور کی گئی تھی۔ گاندھی جی کا ریزولیوشن ہمارے برطانوی مہمانوں کی مایوسی اور جھنجلاہٹ کے باوجود کثرتِ آرا سے منظور ہو گیا۔

کانگریس کا پرانا دستور بنیادی طور پر تبدیل کر دیا گیا۔ گاندھی جی نے جو بالکل نیا دستور مرتب کیا تھا تھوڑی سی ترمیم کے بعد وہی مجلس موضوعات میں منظور ہو گیا۔

گاندھی جی اپنی سوانحِ عمری میں لکھتے ہیں "کانگریس کے (نئے) نصب العین کے سوال پر بڑی بحثیں ہوئیں۔ میرے پیش کردہ دستور میں کانگریس کا جو نصب العین کہا گیا تھا وہ یہ تھا 'سوراج حاصل کرنا' اگر ممکن ہو تو سلطنت برطانیہ کے اندر ورنہ اُس کے باہر، کانگریس کی ایک جماعت اِس نصب العین کو سلطنت برطانیہ کے اندر ہی سوراج حاصل کرنے تک محدود کرنا چاہتی تھی۔ مسٹر جناح اور پنڈت مالویہ نے یہ نقطۂ خیال پیش کیا تھا، لیکن اُنھیں زیادہ ووٹ نہ مل سکے۔ دستور اساسی کے مسودے کی رو سے یہ بھی ضروری تھا کہ پر امن اور جائز طریقوں سے آزادی حاصل کی جائے۔ اس شرط کی بھی مخالفت کی گئی اور کہا گیا کہ طریقِ کار کی حد بندی نہ کی جائے۔ لیکن کانگریس نے ایک سبق آموز اور بے لاگ مباحثے کے بعد اصل سودے کو منظور کر لیا۔

یہاں سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کی سیاست کا ایک مبہم نصب العین اختیار کر کے گاندھی جی بالکل مطمئن ہو گئے۔ جہاں اُنھیں سلطنت کے اندر خود مختاری کے حصول کا اصل مقصد بہت محدود معلوم ہوا وہیں وہ سلطنتِ برطانیہ یا دولت مشترکہ کے باہر ہندستان کی مکمل آزادی کے زیادہ صحیح اور زیادہ منطقی نصب العین کے متعلق ابھی تک کوئی فیصلہ نہ کر سکے تھے اور غالباً اس وقت تک بھی نہیں کر سکے۔ اسی طرح ذرائع حصول کے مسئلے میں بھی وہ "آئینی" کی اصطلاح کو حذف کرا دینے میں کامیاب ہو گئے مگر اُنھوں نے اس کی نئی توضیح کر دی تاکہ ہر ایسی بات کا سدِ باب ہو جائے جس میں ذرا بھی تشدد کا شائبہ ہو سکتا ہو۔

یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ واقعی یہ گاندھی جی کے مستحکم اور غیر متزلزل اصرار ہی کا نتیجہ تھا کہ نئے دستور اساسی نے ہندستانی ریاستوں کی حدود میں کانگریس کمیٹیوں کے قیام کی اجازت دیتے ہوئے ان پر ایک مؤثر پابندی عائد کر دی کہ یہ ان ریاستوں کے داخلی امور پر غور و خوض بھی نہ کر سکیں۔ اس طرح اُنھوں نے ریاست ہائے ہند کے باشندوں کے لیے کانگریس کا دروازہ کھول تو دیا۔ مگر اس جدید استحقاق کو اپنی شکایتوں کے ازالے کے لیے استعمال کرنے سے اُنھیں روک دیا۔ اور حال ہی میں گاندھی جی نہایت بے باکی سے اس خبیث رُکاوٹ کو کانگریس کی جانب سے ہندستان کے "بلند مرتبہ والیان ریاست" کی ایک ممتاز خدمت قرار دے کر خوش ہو رہے تھے۔

مجلسِ موضوعات میں کانگریس کے مندوبین کی تعداد پر بھی گرما گرم بحث ہوئی۔ گاندھی جی لکھتے ہیں "میرے مسودے میں غالباً مندوبین کی

تعداد پندرہ سو تھی۔ مجلس موضوعات نے چھ ہزار کی تعداد رکھی۔ میری رائے میں یہ اضافہ ناعاقبت اندیشی پر مبنی تھا۔ اور اُس وقت سے اب تک کے تجربہ نے مجھے اس رائے میں اور زیادہ پختہ کر دیا ہے۔ پندرہ سو مخلص اور روشن خیال نمایندے جنھیں قومی بہبود کی دُھن ہو ان چھ ہزار غیر ذمہ دار نمایندوں سے جنھیں خواہ مخواہ منتخب کر لیا گیا ہو کہیں زیادہ جمہوریت کے محافظ ثابت ہوں گے۔" لیکن یہاں گاندھی جی نے یہ نہیں بتایا کہ یہ پندرہ سو نمایندے جو بالکل اسی طرح منتخب کیے گئے تھے جیسے آج چھ ہزار نمایندے کیے جاتے ہیں کیوں کر ان سے زیادہ سچے، روشن خیال اور عوام کے ہمدرد تھے۔

نئی آل انڈیا کمیٹی کے لیے یہ قرار پایا تھا کہ وہ آیندہ ہر اجلاس میں مجلس موضوعات کا کام انجام دیا کرے گی۔ اس کے علاوہ گاندھی جی نے کانگریس اجلاس کے اس ہنگامہ میں وہ سب دقتیں بھی دور کر لیں جو مجلس موضوعات کے انتخاب سے متعلق تھیں اور اخیر میں ایک مختصر سا کابینہ قائم کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے جو مجلسِ عاملہ کے نام سے موسوم ہے۔ اور جس کا یہ منصب ہے کہ کانگریس کے فیصلوں کو عملی جامہ پہنائے۔ بلکہ فوری ضرورت کے موقع پر تمام معاملات کا فیصلہ بھی خود کر لے آگے بتایا جائے گا کہ اس نئے دستور اساسی نے جسے بقول گاندھی جی کے اتنا وسیع ہونا چاہیے تھا کہ اعتدال پسندوں تک کے لیے گنجایش نکل سکے کیوں کر رفتہ رفتہ مسلسل قراردادوں کے ذریعہ کانگریس کو اچھا خاصہ عمال شاہی ادارہ بنا کر رکھ دیا۔

اس طرح ناگپور کانگریس نے سارے ہندستان کو گاندھی جی کے قدموں پر لا کر ڈال دیا۔ سارے اختلافات کسی نہ کسی طرح ختم کر دیے گئے اب کانگریس کے پاس نئے دستور کی مشینری بھی آ گئی تھی جس سے ترک موالات کے مکمل پروگرام کو چلانے کے لیے فوری کام لیا جا سکتا تھا۔ اس وقت قوم جس طرح زورِ عمل اور جوش و خروش سے معمور تھی اُس کی مثال اس کے پہلے نہیں مل سکتی۔ گاندھی جی نے حصولِ سوراج کے لیے ایک سال کی مدت مقرر کی تھی بشرطے کہ قوم اُن کی شرائط کو پورا کر دے۔ اس طرح قوم ایک نئے نصب العین، ایک نئے طریقۂ جنگ اور ایک نئی تنظیم کے تحت "دنیا کے سب سے بڑے آدمی" کی قیادت میں آزادی حاصل کرنے کے لیے چل کھڑی ہوئی۔

تینتیسواں باب

ایک سال میں سوراج

اس طرح کانگریس نے حکومت برطانیہ کے خلاف ترکِ موالات کی پر امن جنگ کا بگل بجا دیا۔ کانگریس نے بہ حیثیت نمایندۂ قوم مہاتما گاندھی کے ساتھ اپنی وفاداری اور محبت کا پیمان باندھا اور وہ صحیح معنوں میں قومی افواج کے سالارِ اعظم مقرر کر دیے گئے۔ اب اُن کے سب سے زبردست اور بڑے نقاد اور مخالف بھی بخوشی اُن کے دلیر سرداروں کی طرح لڑنے لگے۔ نئے دستور نے اس زبردست جنگ میں لڑنے کے لیے پورے ملک کو متحد اور تیار کر کے منظم دستوں کی شکل میں صف آرا کرنے کا خاکہ پیش کر ہی دیا تھا۔

ہمیں ترکِ موالات کا پورا پروگرام بالکل معقول اور عملی نظر آنے لگا۔ اس لیے نہیں کہ ہمیں فوراً اس کے ذریعہ سے سوراج حاصل ہو جائے گا بلکہ اس سے ہم یہ مطلب سمجھے کہ یہ عظیم الشان نصب العین قریب تر ہوتا جائے گا جس طرح گاندھی جی نے ۱۹۱۹ء میں ملک کو ستیا گرہ یا عدم ادائگی محاصل کا پہلا سبق دیا تھا اسی طرح ملک کے سامنے سول نافرمانی کا فوری پروگرام پیش کرنا بہت آسان تھا لیکن

یہ اچھی طرح سمجھ لیا گیا تھا کہ گاندھی جی نے جو یہ سہ گانہ مقاطعہ پیش کیا ہے اور جسے کانگریس نے منظور کرلیا ہے اس سے ملک کے مضبوط ترین سیاسی طاقتوں کی موثر طریقے پر لام بندی کی جا سکے گی۔ کونسلوں کے مقاطعے سے سیاسی کارکنوں کی بہت بڑی اکثریت کو اپنی توجہ قومی فوج کی تنظیم کی طرف منعطف کرنی پڑی تھی۔ اسی طرح قانونی عدالتوں کے مقاطعے سے ایک نہایت شان دار اقلیت یعنی قانون داں اربابِ سیاست کی مختصر سی جماعت خالص قومی کارکنوں اور قوم کے سپاہیوں کی شکل میں تبدیل ہوگئی۔ اور پھر مدرسوں اور کالجوں کے مقاطعے نے نوجوانانِ ملک کے دل و دماغ میں ہیجان پیدا کردیا تھا۔ اور انھیں سوراجی فوج میں نئے رنگروٹ کے طور پر بھرتی کرانے میں کافی کار آمد ثابت ہوا۔ اگرچہ سہ گانہ مقاطعہ کونسلوں اور عدالتوں کو برباد کرنے، یا اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کو معتد بہ تعداد میں قومی بنانے میں کامیاب نہ ہوسکا لیکن اتنا ضرور معلوم ہوتا تھا کہ ان سب سے سرفروشانہ قوتِ عمل کا ایک ایسا سیلاب ضرور جاری ہوسکے گا جو دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کی دیواروں اور قلعوں کو توڑنے میں موثر ثابت ہوگا!

گاندھی جی اس سے پہلے، اس سے زیادہ عظمت و قوت کی بلند مینار پر کبھی نہ پہنچے تھے۔ وہ جنوبی افریقہ میں نسبتاً ایک چھوٹی سی ناقابلِ ذکر اقلیت کے رہنما تھے جو صرف چند تاجروں، کلرکوں اور بہت سے قلیوں پر مشتمل تھی۔ ہندستان میں ۱۹۱۹ء کی ستیاگرہ واقعی پہلی جدوجہد تھی جسے انھوں نے قومی پیمانے پر شروع کیا تھا۔ لیکن چوں کہ وہ خود اسے ایک آزمائشی تجربے سے زیادہ نہ سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے کبھی کانگریس کی توثیق حاصل کرنے کی کوشش نہ کی۔ مگر اب سرزمین ہند میں قدم رکھنے کے صرف سات برس بعد ہی یعنی ۱۹۲۱ء میں وہ پرزور پروپیگنڈے، پختہ کارانہ موقع شناسی، پُرجوش حب الوطنی اور سب سے زیادہ اپنے عملی احتجاج کے لاجواب حربے کے ذریعے اپنی سیاسی جدوجہد کے انوکھے طریقِ کار کے لیے کانگریس کی مکمل منظوری ہی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے بلکہ عام اتفاق سے قومی افواج کے فیلڈ مارشل بھی مقرر کردیے گئے۔

ان تمام گزشتہ سالوں کے دوران میں وہ مطالعہ کرتے اور خواب دیکھتے رہے۔ وہ جنوبی افریقہ سے ستیاگرہ کا قوی الاثر بیج منتقل کرکے ہندستان لائے اور اسے یہاں کے روز افزوں وسیع رقبے میں بو دیا تھا۔ انھوں نے اس پودے کی خوب دیکھ بھال اور خدمت کی تھی، اور اسے نئی سرزمین میں پھلتے پھولتے دیکھ کر بے انتہا خوش تھے۔ لیڈر، کارکن، طالب علم، کسان، مرد، عورت اور روپیہ سب کچھ اُن کا تھا، اُن کے لیے بس حکم دینے کی دیر تھی، پوری قوم غلبہ کی منزل تک اُن کے پیچھے چلنے کو تیار تھی۔

یہ بات نہایت المناک ہے کہ اپنے حوصلوں کے معراجِ کمال تک پہنچ جانے اور اپنے ہاتھوں میں قومی فوج کی کمان لینے کے بعد پہلے ہی قدم پر گاندھی جی لڑکھڑائے اور ٹھوکر کھا گئے۔ صاف ظاہر ہے کہ اس مرتبہ بھی انھیں اور گویا ساری قوم کو وہی حادثات پیش آئے جو ۱۹۱۹ء میں رونما ہوئے تھے۔ انھوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ دو برس پہلے اُن کے پاس کوئی قطعی نقشہ یا پروگرام نہیں تھا۔ گو اس مرتبہ خود انھوں نے ایک صاف پروگرام بنایا تھا۔ اور دشمن کے محاذوں پر حملہ کرنے کے لیے قوم کی فوجی تنظیم کی تھی لیکن شومیِ قسمت نے پہلے ہی قدم پر انھیں ڈگمگا دیا۔ عجیب و غریب خوابوں اور مقدس نعروں سے مسحور ہوکر اُن کا دماغ یا تو داخلی تصوریت کے بادلوں میں گم ہوکر رہ جاتا تھا یا اُن کی عقل قدیم مادیت کی ادنیٰ ترین تفصیلات میں اُلجھ کر معطل ہوجاتی تھی۔ یہاں سے مجھے یہ بتانے کا ناخوش گوار فرض انجام دینا پڑے گا کہ ابتدائی تیاریوں اور تنظیموں کے سیدھے اور معقول راستے پر گامزن رہنے کے بجائے جس کے بعد دشمن کے محاذات پر براہِ راست حملے ہوسکتے وہ کس طرح اپنے وسیع ذرائع اور اپنی بے نظیر قوت کو ہر روز نت نئے نعروں اور اُصولوں کی اختراع اور قومی طاقتوں کے سیلاب میں بند باندھنے اور اس کے دھارے کا رُخ بے کار راستوں کی طرف پھیرنے میں صرف کرتے رہے۔

۱۹۲۱ء کے آغاز ہی سے "ایک دن میں سوراج" اُن کا نعرۂ جنگ بن گیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ انھوں نے پہلے پہل ستمبر ۱۹۲۰ء میں کلکتہ کے اجلاس میں اس کی ابتدا کی تھی، لیکن چوں کہ اس وقت کانگریس کی صفوں کے اندر بہت امید شکن افتراق تھا، اور عام بڑے بڑے رہنما اس کی مخالفت پر کمربستہ تھے اس لیے یہ نعرہ قدرتی طور پر رائج نہ ہوسکا تھا۔ گو ابتدائی مدارج میں وہ اپنی اصل

کوشش کے لیے ستمبر ۱۹۲۰ء سے ایک سال کی مدت بتاتے رہے مگر بعد کو آخر کار اُنھوں نے رفتہ رفتہ غیر محسوس طور پر اس مدت میں ۱۹۲۱ء کے پورے سال تک کی توسیع کر دی۔ یہ سال مقدس جنگ کا سال سمجھا جانے والا تھا اور پہلی دسمبر ۱۹۲۱ء تک کسی نہ کسی طرح سوراج کا حاصل ہو جانا یقینی تھا۔

بلاشبہ گاندھی جی نے آغازِ کار ہی سے سوراج کے اس وعدے کو چند قومی عہد و پیمان کی تکمیل سے مشروط کر دیا تھا۔ یہ تماشا دردناک ہی کہ وہ ان شرائط کی تعیین بلکہ خود سوراج کی تعریف میں کس طرح کبھی کچھ کہتے تھے کبھی کچھ۔

گاندھی جی نے اپنے اس نئے نعرے پر بہت سے نقادوں کے "مذاق اُڑانے" کا حوالہ دیتے ہوئے ینگ انڈیا (۲۲ ستمبر ۱۹۲۰ء) میں پُرزور اعلان کیا" میں کھُلے بندوں اعتراف کرتا ہوں کہ جب تک یہ تینوں شرطیں (کونسلوں، عدالتوں اور مدرسوں کا مقاطعہ) جو میں نے بیان کی ہیں پوری نہ ہو جائیں اُس وقت تک سوراج کی ہوا بھی نہیں لگ سکتی۔ ہم کالجوں میں جا جا کر ڈگریاں بھی لیتے رہیں، موکلوں سے ایسے مقدمات کی پیروی کے لیے جو منٹوں میں ختم ہو سکتے ہیں ماہانہ ہزاروں بھی کھرے کرتے رہیں۔ کونسلوں میں جا کر قومی وقت ضائع کرنے کا لطف بھی اُٹھاتے رہیں اور پھر قومی اعزاز حاصل کرنے کے بھی حوصلے رکھیں"

"این خیال است و محال است و جنوں"

ابھی "مایا" کے سب سے آخری اور اہم حصے پر غور کرنا باقی ہی، اور وہ سودیشی ہی ـــــ اگر ہم کو اقتصادی غلامی سے نجات حاصل کرنی ہی تو ہمیں اپنے کپڑے خود تیار کرنے چاہئیں جنھیں فی الحال اپنے ہی ہاتھوں سے کاتنا اور بننا بھی ہی"

"دوسرے الفاظ میں ہمارے اندر ضبط و نظم، خودشکنی، ایثارِ نفس، تنظیمی قابلیت، اعتماد اور ہمت ہونی چاہیے"

اس سب کے باوجود اُنھوں نے پانچ ہی مہینے کے بعد" ان پانچ مہینوں کے تجربے" پر انتہائی اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے (ینگ انڈیا ۲۲ فروری ۱۹۲۱ء) حصول سوراج کی شرائط میں حسب ذیل ترمیمیں کر دیں:-

"اب ہمیں اپنی توجہ ذیل کے امور کی طرف مبذول کرنی چاہیے:-

۱۔ عدم تشدد کے جذبے کو نشو و نما دینا۔

۲۔ ہر گانو میں کانگریس کمیٹی قائم کرنا۔

۳۔ گھر گھر چرخے کو رواج دینا اور اپنی ضرورتوں کے لیے گانو کے پارچہ بافوں کے ذریعے کپڑے تیار کرانا۔

۴۔ جہاں تک ممکن ہو سکے زیادہ سے زیادہ روپیہ جمع کرنا۔

۵۔ ہندو مسلم اتحاد کو ترقی دینا اور

۶۔ ہندو دھرم کو چھوت چھات کی لعنت سے نجات دینا اور منشی اشیاء سے پرہیز کر کے اپنے کو پاک بنانا۔

"کیا ہمارے پاس اس انتہائی سادہ پروگرام کے لیے ایمان دار، مخلص، محنتی، محبِ وطن کارکن موجود ہیں؟ اگر ایسا ہی تو آیندہ اکتوبر سے پہلے ہی ہندستان میں سوراج قائم ہو جائے گا"

اس سے واضح ہو جاتا ہی کہ پانچ ماہ پیشتر جن شرائط کا تذکرہ کیا گیا تھا وہ اب ختم ہو چکی تھیں اور اُن کی جگہ نئی شرائط قائم ہوئیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ بے سبب نہیں تھا، اس لیے کہ مجلسِ قانون ساز کے لیے انتخابات ماضی کی داستان بن چکے تھے۔ اور اس اثناء میں مسٹر گاندھی کو یہ معلوم ہو گیا کہ مدرسوں اور عدالتوں کا مقاطعہ برقرار رکھتے ہوئے ہم اپنے پروگرام کو آگے نہیں بڑھا سکتے۔ اِس لیے اُنھوں نے پینترا بدل دیا، انھیں اندیشہ ہوا کہ عوام کا جوشِ انقلاب کوئی مخدوش راہ نہ اختیار کرلے۔ لہٰذا اُنھوں نے فوراً عدم تشدد کو سب سے مقدم قرار دے کر اس پر زیادہ زور دینا شروع کر دیا۔ اس کے بعد کانگریس کے دستور کی باری آئی جو ابھی ناگپور ہی کے اجلاس میں کانگریس نے اختیار کیا تھا۔ سب سے زیادہ اہم تبدیلی یہ تھی کہ گاندھی جی نے چرخہ کاتنے کے مسلک کو تین اصلی شرطوں کے

ضمیمے سے آگے بڑھاکر چھ نئی شرطوں میں تیسری شرط بنادیا ۔ گویا اصل میں مؤثر عملی طریقوں میں اسے سب سے پہلا درجہ عطا کر دیا گیا۔

ایک بیرونی شخص یہ دریافت کرسکتا ہے کہ آخر پُرانی تین شرطوں یا نئی چھ شرطوں کے ذریعہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک محکوم قوم ایک زبردست سلطنت کے ہاتھوں سے اقتدار کی باگ ڈور چھین لے ؟ یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ یہ شرطیں زیادہ سے زیادہ ایک پُرامن جنگ لڑنے کے لیے کسی قوم کی لام بندی اور اس کے منظم کرنے میں شاید مدد دے سکیں ۔ اس کے ذریعہ سے لیڈروں کو عوام کے عاجزانہ اور بیکسانہ رویہ میں نیم اخلاقی اور نیم ذہنی انقلاب برپا کرنے میں بھی مدد مل سکتی ہے ۔ مگر تاریخ میں کسی ایسی فوج کا خواہ تشدد پسند ہو یا امن پسند پتہ نہیں چلتا جس کی محض صف آرائی نے دشمن کو اتنا خائف کر دیا ہو کہ وہ قبل از وقت ہتھیار ڈال دے ۔ پھر بھی گاندھی جی نے اپنے پروگرام کی سب سے زیادہ محاربانہ مَدیں یعنی سول نافرمانی اور عدم ادائگی محاصل کو فراموش کر کے قوم کو اپنی سحر آفرینیوں سے اس کا یقین دلانا چاہا کہ وہ نعرے لگاتی رہے، قومی ترانے الاپتی رہے، جلوس نکالتی رہے اور چرخہ کاتتی رہے اور جس وقت وہ اس منزل پر پہنچ جائے گی کہ ہندستان اپنے کروڑوں نیم برہنہ باشندوں کی ستر پوشی کے لیے ہاتھ سے کاتے اور بُنے ہوئے کپڑے تیار کرنے لگے ۔ بس اُسی آن وائسرائے اور گورنر صاحبان مع اپنے سول ملازموں اور فوجوں کے رخت سفر باندھے ہوئے سمندر کے ساحل پر نظر آئیں گے

جب ٹائمز کے نامہ نگار نے ناگپور کانگریس کے اجلاس کے دوران میں بُری طرح جھنجھوڑا تو اُس وقت وہ اپنے پروگرام کے اس بے تکے نقص کے متعلق کوئی تشفی بخش جواب نہ دے سکے ۔

اُنھوں نے اس ملاقات کے دوران میں (ینگ انڈیا مورخہ ۱۹ ستمبر ۱۹۲۰ء) میں اعلان کیا " لوگ روز بروز عدم تشدد کی اسپرٹ کو ایک عقیدے کی حیثیت سے نہ سہی لیکن ایک ناگزیر حکمت عملی کی حیثیت سے قبول کرتے جارہے ہیں ۔ لوگوں کے عدم تشدد کے قبول کر لینے سے میں بہت حیرت انگیز نتائج کی توقع رکھتا ہوں ! ایسے حیرت انگیز نتائج جو جے سی بوس کے انکشافات سے بھی نہیں پیدا ہوئے ۔ اگر حکومت کو بلا کسی شک و شبہ کے یہ یقین دلا دیا جائے کہ ہم کسی قسم کے تشدد کا مظاہرہ نہ کریں گے تو، بلاشک وہ اُسی وقت سے غیر محسوس طریقہ پر اپنا رویہ بدل دے گی ۔ مگر ہاں یہ سب کچھ عدم تشدد ہی کی بدولت ہو سکتا ہے "

جب اُن سے اس مسئلہ کے بارے میں اور سوالات کیے گئے تو اُنھوں نے کہا :-

" یہ تحریک موجودہ حکومت کو اس کی خود غرضی اور لالچ سے جو اس کے ہر عمل کی تہ میں کارفرما ہے نجات دلانے کی ایک مستقل کوشش ہے ۔ فرض کرو کہ ہم اُن سے ترکِ موالات کر کے اُن کی اس حرص کی ترقی کو ناممکن بنا دیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ شمالی لینڈ کی طرح ہندستان میں بھی رہنا نہ پسند کریں "

اُنھوں نے اس موضوع پر مزید تقریر کرتے ہوئے اس بات کے غیر ممکن ہونے کا اعتراف کیا کہ انگریز خود ہندستان چھوڑ کر چلے جائیں گے اور اب انھوں نے برطانوی نظام حکومت کی از سر نو ترتیب اور سلطنتِ برطانیہ کے اندر ایک ایسے دستور کے قیام کو جو " باشندگان ہند کی مرضی کے موافق ہو گا " اپنی تحریک کا نصب العین قرار دیا ۔

بظاہر مسٹر گاندھی کو یہ امید تھی کہ اگر باشندگانِ ہند کانگریس کے ڈھرے پر منظم اور متحد ہو کر (عملی تنظیم و اتحاد نہ سہی ذہنی اور اخلاقی ہی سہی) مخالفت پر کمربستہ ہو جائیں گے تو اہل برطانیہ کو اُن نفرت انگیز زیادتیوں کا علم ہو جائے گا جو شاہی وزرا اور ان کے نمائندے اُن کے نام سے ہندوستان میں کرتے آئے ہیں " اگرچہ اُنھوں نے ان الفاظ میں نہیں ظاہر کیا ۔ مگر اُنھیں یہ توقع ضرور تھی کہ اگر باشندگانِ ہند کسی تشدد پر عمل کیے بغیر سالِ رواں کے آخر تک کانگریس کے جھنڈے تلے لاکھوں کی تعداد میں صرف جمع ہو جائیں گے اور تمام بدیشی کپڑے کا جس میں برطانوی کپڑا بھی شامل ہے مقاطعہ کر دیں گے تو وائسرائے اُنھیں ہندستان کے حقوق کے متعلق تصفیہ کی غرض سے مدعو کریں گے ۔ اور پھر جو کچھ بھی اُس وقت وہ سمجھوتے سے حاصل کر سکیں گے اُسے حصول سوراج سمجھ کر خوش آمدید کہا جائے گا ۔ یہ امر یقینی تھا کہ وہ کسی ایسی بات پر رضامند نہ ہوں گے ۔ جو معقول طور پر کانگریس ریزولیوشن کے مطابق نہ ہو گی

اب اگر اسے سوراج کی دیگر شرائط سے ملا کر پڑھا جائے تو ہر شخص یہ اعتراف کرنے پر مجبور رہے گا کہ بلاشبہ سمجھ دار لوگوں کے سامنے

"ایک سال کے اندر سوراج" کا نعرہ بلند کرنا حد سے زیادہ بے اصل اور مغالطہ آمیز حرکت تھی۔ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ گاندھی جی نے سال کے شروع میں کسی اُستادانہ چال کی بنا پر اس پروگرام میں سے تمام جارحانہ دفعات کو حذف کر دیا تھا تو بھی تین انتہائی اہم امور ہر ہوشمند شخص کو یہ یقین دلانے کے لیے کافی ہوں گے کہ اُس وقت جو زبردست اُمیدیں کروڑوں آدمیوں کے دلوں میں پیدا کی جا رہی تھیں اُن کا پورا ہونا قطعی ناممکنات سے تھا۔

اول یہ کہ اس تحریک کی ساری بنیاد اس بات پر رکھی گئی تھی کہ دشمن کو کسی قسم کی سزا یا اذیت دینے کے بجائے خود ہمیں ایذا طلب ہونا چاہیے۔ اگر کبھی خون بہے تو وہ دشمن کا نہیں ہمارا خون ہو۔ گاندھی جی ہم سے اکثر کہا کرتے تھے جیسا کہ اب بھی کہتے ہیں کہ ہمیں حکومت خود اختیاری اُسی دن مل جائے گی جس دن ہم انگریزوں کو یہ یقین دلا دیں گے کہ ہندوستانی حکومت کے زیر سایہ برطانیہ کی عورتوں اور بچّوں کی زندگی اور آزادی اس سے زیادہ محفوظ رہے گی جتنی موجودہ برطانوی حکومت میں محفوظ ہے۔ ہماری جانب سے کوئی "تشدّد" نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ ہم پر جو ظلم ہو اُس کا بدلہ بھی نہ لیا جائے۔ درحقیقت سارا مدعا یہ تھا کہ حتے الامکان زیادہ سے زیادہ مظالم خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کر کے برطانوی حکومت کی تمام بے دردیوں کو اس کی وحشت ناک عریانیوں کے ساتھ بے نقاب کر دیا جائے۔ اور یہ جتنا ہی زیادہ ہو اُتنا ہی بہتر ہے۔ یہ اچھی طرح معلوم تھا کہ جب عوام کے کسی ذمے دار طبقے کا رجحان ظاہری تشدد کی طرف معلوم ہوگا تو گاندھی جی اُسی وقت ساری تحریک ملتوی یا ختم کر دیں گے۔

اب اس بنیادی نکتے کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ سمجھنا ناممکن ہے کہ اگر عوام نے پہلے اور دوسرے آرٹیکل کی تمام شرائط کو پورا بھی کر دیا تو اس سے یہ کیسے ہوگا کہ برطانیہ اپنی حکومت سے دست بردار ہونے پر مجبور ہو جائے گی؟ حکومتیں افراد تو نہیں ہیں۔ حکومت ایک نظام کا نام ہے۔ حکومتیں ہندوستان اور انگلستان میں بعض حکمران طبقوں کی نفسیات کی مُظہر ہیں۔ اور ایک بنیادی غلطی جس نے اُن کے تمام منصوبوں کو باطل کر دیا ہے اور اب بھی کیے جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنے اندر اُس امید کو جگہ دیے جا رہے ہیں کہ بے گناہوں کی قربانی کے ذریعے دشمن کا مقابلہ کر کے وہ اُس کا دل بدل دیں گے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ باشندگانِ ہند پر جو بے رحمانہ مظالم توڑے گئے اور جو قتلِ عام کیے گئے اُن سے ہندوستان اور انگلستان دونوں مقامات پر متعدد انگریزوں کے دل پسیج اُٹھے۔ مگر برطانوی حکمراں طبقے کی ذہنیت بدستُور ویسی ہی رہی بلکہ اہل ہند کی پُرفن مستقل مزاجی کو دیکھ کر جو تحریک ستیاگرہ میں اپنی پوری آب و تاب سے ظاہر ہوئی اُن کے دل نرم ہونے کے بجائے اور بھی سخت ہو گئے۔

ذرا دیر کے لیے یہ بھی مان لیجیے کہ کانگریس نے سول نافرمانی کی تحریک بلکہ عدم ادائگی محاصل کی جدوجہد کا بھی آغاز کر دیا۔ اب اگر یہ تحریکیں وسیع ترین پیمانے پر شروع ہوئیں تو یہ صحیح ہے کہ ان سے حکومت کی مشینری کسی حد تک ضرور معطل ہو جائے گی۔ میں یہ مانتا ہوں کہ ایسے تعلّق سے بھی گورنمنٹ صرف اپنے رجحانات کو بدلنے اور شہر کے متوسط طبقے کے رہنماؤں کو بہلا پھُسلا کر ۱۹۳۱ء کے گاندھی ارون میثاق کی طرح ایک کھوکھلا معاہدہ کرنے پر مجبور ہو سکتی تھی۔ کیوں کہ یہ کھُلی ہوئی بات ہے کہ اگر عوام ملک بھر میں خطرناک تشدد پر آمادہ ہو جائیں تو برطانیہ ہندوستان میں اپنا راج قائم رکھنے کی خاطر زبردست نقصان کو برداشت کرتے ہوئے چند سال یا کئی سالوں تک اپنے دنیا بھر کے مالی ذرائع استعمال کرے گی۔ علاوہ بریں حکومت اس وسیع خطّے کے کسی بھی ضلع کے باشندوں کو تشدّد پر اُکسا کر ایک طرف مارشل لا کا نفاذ عمل میں لا سکتی تھی اور دوسری طرف گاندھی جی کو اپنی تحریک ملتوی کرنے پر مجبور کر سکتی تھی۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ گاندھی جی نے خود سول نافرمانی کرنے والوں اور اُن دیہاتیوں کو جو عدم ادائگی محاصل پر کاربند ہونے والے تھے سخت اور مقدس شرائط سے پابند کر دیا تھا تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ انتہاپسندانہ کارروائیاں نسبتاً بہت چھوٹے پیمانے پر جاری کی جا سکتی تھیں۔ وہ بھی محدود حلقوں میں، اور دُنیا کی کوئی حکومت بھی ہندوستان کے دو سو پچاس اضلاع میں سے چند ضلعوں کے چند ہزار باشندوں کے مصائب اور قربانیوں کے مظاہرے سے چاہے وہ کتنا ہی بہادرانہ کیوں نہ ہو اقتدار چھوڑتا تو

درکنار زیادہ پریشان بھی نہیں ہوسکتی۔

دوسرے اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ گاندھی جی محض تمام بدیسی کپڑوں کے مقاطعے کا اعلان کر کے جس میں برطانوی کپڑے کا مقاطعہ بھی شامل تھا موجودہ حکومت کو اس کی حرص اور خودغرضی سے کیسے باز رکھ سکتے تھے۔ اتنے سال سے گاندھی جی وقت بے وقت برابر یہی شور مچاتے رہے ہیں کہ ہندوستان برطانیہ سے کپڑے لینا بند کر دے گا تو برطانیہ کے پاس ہندوستان میں ٹھہرے رہنے کی کوئی وجہ نہ باقی رہ جائے گی۔ ملکی کپڑوں کی درآمد سے جو ساٹھ کروڑ روپے کا نقصان ہندستان کو ہوتا ہے اس کا انھوں نے بار بار تذکرہ کیا ہے۔ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ تجارت میں برطانیہ کا حصہ تیس کروڑ ہے تو کیا یہ سمجھنا حماقت نہیں کہ انقطاع کے اس ایک کروڑ کو بند کر دیا جائے تو برطانوی ملوکیت کو ہندوستان سے کوئی دلچسپی نہ رہ جائے گی۔ یہ بات تعجب انگیز ہے کہ اتنے سالوں میں کسی نے اس عامیانہ تنگ بندی پر کوئی تعرض نہیں کیا، اور اگر لاکھوں کروڑوں نہیں تو ہزاروں ایمان دار اور مخلص کارکن اس مغالطے میں کیسے مبتلا رہے کہ ہندستان میں برطانیہ کی کپڑے کی تجارت برباد ہوتے ہی برطانوی اقتدار کا بھی یقیناً خاتمہ ہو جائے گا۔ اس شان دار مصنوعی دلیل کا کھوکھلا پن سمجھنے کے لیے بس اتنا جان لینے کی ضرورت ہے کہ برطانیہ ہر سال ہندستان سے کئی کروڑ کی تجارت کرتا ہے اور اس کا سرمایہ جو ہندستان میں لگا ہوا ہے فقط اس کے سود ہی سے سالانہ پندرہ کروڑ پونڈ وصول ہوتے ہیں۔ گاندھی جی داخلی تخئیل پسندی کی رَو میں بہنے اور خارجی بصیرت سے محروم ہونے کے باعث برطانوی اقتدار کے اصلی مفہوم و منشا کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ برطانوی حکومت ہندستان میں ایک لاکھ انگریزوں یا ساٹھ ہزار سپاہیوں کی محکم رانی سے عبارت نہیں ہے۔ بلکہ اس کا حقیقی مفہوم ہندستان کی کثیر خام پیداوار اور ہندستان کے لاکھوں سستے مزدوروں پر برطانیہ اور اس کے مستعمرات کے وسیع سرمائے کا اقتدار ہے۔ یہ بات بالکل روشن ہے کہ جب تک ملک پر برطانوی سرمایہ داری کا سیاسی یا مالی اقتدار قائم ہے یہ ہندوستانی ذرائع اور سستی مزدوری سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی سینکڑوں نئی ترکیبیں نکال لے گی۔ اگر برطانوی کپڑے کے مقاطعے پر پوری طرح عمل کیا جاتا تو بلاشبہ اس سے مانچسٹر کے کچھ مالکانِ مل کو دھکا پہنچتا اور چند ہزار انگریز بے کار ہو جاتے لیکن اس سے اہلِ برطانیہ کو ہندستان سے بستر بند ہوا دینے کی کوئی ضرورت نہ پیدا ہو سکتی تھی۔ بخلاف اس کے جب برطانوی سرمایہ داروں کو جن کے ذرائع بہت وسیع ہیں، یہ گمان ہو جاتا کہ ان کے کپڑے کے سامان کے لیے ہندستان میں کوئی گنجایش نہیں ہے تو وہ ہندستان کے آدمیوں کی تعداد اور ذرائع سے فائدہ اٹھانے کے لیے نئے طریقے نکال لیتے۔ اگر برطانوی کپڑے کے بجائے ہر قسم کی برطانوی پیداوار اور جو برطانوی کارخانے اور تجارتی ادارے ہندستان میں موجود ہیں اُن سب کے خلاف منظم مقاطعہ کا اعلان کیا جاتا تو درحقیقت یہ اور بات ہوتی۔ ۱۹۳۲ء سے پہلے اس کے پرچار کا تو کیا ذکر گاندھی جی نے کبھی اس پر غور بھی نہیں کیا تھا۔ اصل میں وہ اب تک برطانوی کپڑے کا محض "برطانوی کپڑے" کی حیثیت سے مقاطعہ کرنے سے بھی ہچکچا رہے تھے اس لیے یہ امر روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ برطانوی کپڑے یا غیر ملکی کپڑے کے مقاطعے سے ایک سال تو کیا ایک سو سال میں بھی سوراج حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

تیسری اور آخری بات یہ ہے کہ ایک سال کا تعین بہرحال مہمل اور بے معنی تھا۔ جب کانگریس نے اُن کے اُلجھے ہوئے اور شاخ در شاخ ترکِ موالات کے ریزولیوشن کو منظور کر لیا تو گاندھی جی نے اُسی آن، وقت کی تعیین کر دی تھی۔ اور پھر اُس پر طرّہ یہ کہ نیا دستور اس کے تین ماہ بعد صحیح طور پر اختیار کیا گیا۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ ملک میں صوبہ واری، ضلع واری اور تعلقہ واری کمیٹیوں کے پورے طور پر قابلِ عمل ہونے ہی میں کم سے کم چھ مہینے لگ جاتے۔ اس کے علاوہ نئے دستور کی رو سے گجرات، اندھرا، کیرالا اور اُوڑیسہ جیسے کئی صوبے ابھی حال ہی میں بنے تھے۔ ابھی خود کانگریس کی مشینری کو حرکت میں لانے کے لیے بہت مشقت سے کام کرنے کی ضرورت تھی اور پھر کانگریس کے نئے پیغام میں جمہور کے مختلف طبقوں اور جماعتوں کے لیے جو مختلف قسم کے فرائض قرار دیے گئے تھے اُن کا اچھی طرح سمجھنا اور سمجھانا بھی ضروری تھا۔ علاوہ بریں ایک ایسے غریب ملک سے ایک کروڑ روپے کی رقم جمع کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی جہاں اس سے پیشتر قومی مقصد کے لیے نہ کبھی اتنی بڑی رقم کا مطالبہ کیا گیا تھا اور نہ اتنی رقم جمع کی گئی اور تعلیمی، تنظیمی اور تبلیغی یہ سارے کام قدرتاً اُسی وقت

مؤثر طریقہ پر کیسے جاسکتے ہیں جب ہاتھ میں رقم ہو، اِن تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے یہ جان لینا بہت آسان تھا کہ پروگرام کی محاربانہ دفعات تو برطرف تعمیری دفعات بھی سال کے اختتام سے پہلے کسی معتدبہ حد تک تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ اس کے باوجود بھی گاندھی جی کو اس اعلان میں کوئی تردد نہیں ہوا کہ سال کے ختم ہونے سے پہلے پہلے سوراج مل جائے گا۔

مجھے اپنے اس نکتے کی زیادہ تفصیل کی ضرورت اب نہیں معلوم ہوتی۔ خارجی نقطۂ نگاہ سے دیکھنے والوں کے لیے اس نعرے کی لغویت صاف ظاہر ہے، خود گاندھی جی نے دوراندیشی سے اپنی اس غلطی کا دبی زبان میں اعتراف کیا ہے۔ چناں چہ اُنھوں نے ۳۱-۱۹۳۰ء کی زبردست جدوجہد کے بعد سے ایسا کوئی نعرہ اپنی زبان سے نہیں نکالا۔

یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ اگر یہ نعرہ کسی اور معمولی سیاست داں کی طرف سے ہوتا تو اس کا مذاق اُڑا لیا جاتا۔ لیکن چوں کہ گاندھی جی جیسے سنیاسی اور پیغمبر نے اس نعرے کو ایجاد کیا تھا اس لیے اس نے خوب کام کیا۔ بہرحال میں اور میری طرح کے دوسرے سیاسی کارکن اس گہرے مذاق کو مشکل سے ضبط کرسکے۔ مگر جیسے جیسے تحریک آگے بڑھتی چلی گئی اور ہم نے یہ دیکھا کہ اس سے ملک بھر میں ہزاروں لاکھوں آدمی مسحور ہو رہے ہیں اور اُن کا جوش و خروش جنون کی حد تک پہنچ رہا ہے تو ہمارے ذہن بھی قومی آواز کے سحر سے مسحور ہو گئے۔ اور ہم بھی تھوڑے ہی عرصے میں نئے مسیح کے اس زبردست پیغام کو ہزاروں پلیٹ فارموں سے دُہرانے لگے، حالانکہ ہمارے ذہنی شکوک ایک معطل ہیجان کی سی حالت میں بدستور قائم رہے!!

چونتیسواں باب

طلبا سے غدّاری

کلکتہ میں اور خاص طور پر ناگپور میں آزادی کی زبردست آگ بھڑکانے کے بعد گاندھی جی کو یہ خوب معلوم تھا کہ یا اسے جلتے رہنے کے لیے ایندھن بہم پہنچاتے رہیں یا بُجھ جانے دیں۔ مگر اُنھوں نے اس آگ کو صحیح قسم کا ایندھن بہم پہنچانے کے بجاے اس کے دہکتے ہوئے انگاروں کو گرم ہوا دینی شروع کی تاکہ ان کی چمک دمک باقی رہے اس وسیع ملک کے عوام مختلف طبقوں کو کانگریس کے جھنڈے تلے جمع ہونے کی غرض سے کسانوں کے لیے "زیادہ زمین اور کم لگان" اور مزدوروں کے لیے "زیادہ مزدوری اور کام کرنے کے بہتر حالات" وغیرہ کے مانند واضح اور عملی ترکیبیں سوچنے کے بجائے وہ اِس بات کے جویاں ہوئے کہ ان کے دلوں کو "ایک سال میں سوراج" کے کھوکھلے اور احمقانہ نعرے کا بانگ دہل اعلان کرکے گرمایا جائے۔ اس نے کام تو ضرور دیا۔ مگر بہت تھوڑی مدت کے لیے۔ ان کھوکھلے نعروں کا یہ ایک پُراسرار خاصہ ہے کہ یہ بہت جلد بے اثر ہو جاتے ہیں۔ پھر عام شورشوں کی آگ کو تقویت دینے کے لیے فوراً کچھ چلتے ہوئے کلمے استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ ابھی ناگپور کانگریس کو ختم ہوئے ایک مہینہ بھی نہ گزرا تھا کہ گاندھی جی کو جو اپنی تصوریت پسندی کے نشہ میں چور ہیں کچھ چلتے ہوئے دل کش کلمات سے مدد لینے کی ضرورت لاحق ہو گئی۔

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ گاندھی جی نے اپنے ترکِ موالات کے پروگرام میں چرخے کی مد کو ترقی دی تھی۔ واقعی وہ اس ترقی کے

لیے میدان تیار کرنے میں مسلسل مصروف رہے۔ (۱۰ دسمبر سنہ ۱۹۱۹ء سے) اُنھوں نے "سودیشی سوراج" کے عقیدے سے ابتدا کی اور پھر سنہ ۱۹۲۰ء کے دوران میں کھدر کے اقتصادی فوائد پر متعدد مضامین لکھتے چلے گئے حتیٰ کہ اپنے ناظرین کو "چرخے کی موسیقی" سے مسحور کرنے کی بھی کوشش کرنے لگے۔ اُن کے ہندو اور مسلم متبعین کو بہت مسرت و تعجب ہوا جب اُنھوں نے قرآن اور گیتا سے بھی چرخے کی نشاں دہی کی۔ اُن کی "سودیشی" سے "چرخے" کی طرف ترقی کی رفتار اتنی تیز تھی کہ اُنھوں نے ہاتھ سے کاتے اور بُنے ہوئے کپڑے کے سوا اور کچھ (مثلاً ہندستانی کارخانوں میں بنی ہوئی اشیا) فروخت کرنے کی غرض سے سودیشی اسٹور قائم کرنے کو مہمل اور بے کار ہی نہیں بتایا بلکہ اسے مضرت رساں بھی قرار دے دیا۔ سنہ ۱۹۲۱ء کے شروع ہوتے ہوتے وہ چرخہ کاتنے کے قومی فریضہ کو جس کا کلکتہ اور ناگپور کانگریس کے ریزولیوشنوں میں اتنے زور شور سے اعلان کیا گیا تھا، آسانی سے ہر ممبر کے سر منڈھ چکے تھے۔ اور مسٹر گاندھی کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ مدرسوں اور عدالتوں کے مقاطعہ کے معاملے میں اب اور آگے بڑھنا بالکل ناممکن ہو گیا ہے، اس لیے اُنھوں نے اپنی فصاحت و بلاغت کا سارا زور چرخے کے عقیدے پر صرف کر دیا گویا یہ ایک ایسی جادو کی چھڑی تھی جس سے ہندوستان کے فاقہ کش باشندوں کو غذا اور آزادی دونوں کی برکتیں میسر آ جائیں گی۔

اُن کا یہ نظریہ بجواڑے میں زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا تھا لیکن اس سے پہلے گاندھی جی نے فوراً اس مشتبہ تحفے کو اُن ہزاروں کیا بلکہ کئی لاکھ طلبا کے گلے لگا دینے کا فیصلہ کر لیا جو کانگریس کی پُکار پر لبیک کہتے ہوئے مختلف صوبوں کے قومی اداروں میں شامل ہونے کی غرض سے ایسے مدرسوں اور کالجوں کو چھوڑ چکے تھے جو حکومت کے اختیار میں تھے۔ سنہ ۱۹۲۱ء کے آخر میں جب گاندھی جی کو عملاً یہ یقین ہو گیا کہ سرکاری اداروں میں سے اب ان کے چکر میں مزید طلبا نہیں پھنسیں گے تو اُنھوں نے پھر پینترا بدلا جیسا کہ آگے بیان ہوگا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اُس وقت اُنھیں جو ایک مذہبی پیغمبر کا مرتبہ حاصل تھا اور اب جو ایک سیاسی ڈکٹیٹر کا درجہ حاصل ہے، یہ نہ ہوتا تو جھنجھلائے اور بپھرے ہوئے طلبا اُن کی اس نئی حکمتِ عملی کو شدید اور پُر فریب غداری قرار دیتے اور اُنھیں ملزم ٹھہراتے کیوں کہ گاندھی جی نے اُس کے بعد، ۷ نومبر سنہ ۱۹۲۰ء ہی کو نیشنل یونیورسٹی پر کچھ لکھتے ہوئے قومی تعلیم کے آئیڈیل اور پروگرام کو بالکل مختلف حیثیت سے پیش کیا۔ ینگ انڈیا میں اس موضوع پر اُنھوں نے صاف صاف لکھ دیا:۔

"آج نیشنل یونیورسٹی برطانوی بے انصافی کے خلاف احتجاج اور قومی اعزاز کے ثبوت کی حیثیت سے قائم ہے۔ یہ ہندستان کی دیسی زبانوں کو جو زبردستی گوشۂ گمنامی وکس میپُرسی میں پڑی ہوئی ہیں اُس سے نجات دلانا اور اُن کو ہندستانی تہذیب کی حیاتِ نو کے بُنیادی پتھر بنانا چاہتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ زندگی کی مکمل تعلیم حاصل کرنے کے لیے ایشیائی تہذیبوں کا باقاعدہ مطالعہ مغربی سائنسوں کے مطالعے سے کچھ کم ضروری نہیں ہے۔ سنسکرت، عربی، فارسی، پالی اور مگھدی کے وسیع خزانوں کو کھولنا ضروری ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ قوم کے لیے اصلی قوتوں کا سرچشمہ کہاں پوشیدہ ہے .... محض مذہبیات، سیاسیات اور تاریخ کے ذریعے آزادی کی روح نہیں پھونکی جائے گی بلکہ پیشے کی تعلیم و تربیت سے بھی کام لیا جائے گا جو ملک کے نوجوانوں کو اقتصادی آزادی دینے کا تنہا ذریعہ ہو سکتی ہے، اور اس سے ایسی تقویت بھی مل سکتی ہے جو عزتِ نفس کی پیداوار ہوتی ہے۔ یونیورسٹی امید کرتی ہے کہ گرد و نواح کے شہروں میں اونچے درجے کے ہائی اسکول قائم کر سکے گی تاکہ تعلیم عام ہو کر جلد از جلد عوام تک پہنچ جائے۔"

اس طرح گاندھی جی نے صحیح طور پر گجرات نیشنل کالج اور یونیورسٹی کے لیے جن پر ہم اُس وقت نظریں جمائے ہوئے تھے سلسلۂ درسیات اور نصابِ تعلیم کا خلاصہ پیش کر دیا۔ اُس وقت یونیورسٹی کمیٹی کے ایک سکریٹری ہونے کی حیثیت سے میں خوشی کے مارے پھولا نہ سمایا جب میں نے یہ دیکھا کہ پرنسپل گدوانی، سائنس، صنعت، حرفت اور اقتصادیات کے مغربی علوم کے ساتھ ساتھ مشرقی تہذیب کا امتزاج چاہتے ہیں۔ اُس زمانے میں ہم سب یہ خواب دیکھ رہے تھے کہ یونیورسٹی میں جس کے

لیے چاروں طرف سے چندوں کی بھرمار ہو رہی تھی ہم لوگ بہت جلد نئے طریقوں پر کتب خانے اور تجربہ گاہیں (معمل) کھولنے کے قابل ہو جائیں گے اور ادبی، سائنٹفک اور صنعتی مضامین طلبا کے سامنے پیش کر سکیں گے۔ مسٹر گدوانی سُرخ روس کے متعلق تازہ ترین کتابیں اور اشتراکیت کے عقائد کے مطالعہ میں ہم سب سے زیادہ حریصانہ طور پر منہمک تھے۔ ہم لوگ اس جدید روشن خیال مگر محبِ وطن ماہرِ تعلیم کے اردگرد جمع ہو کر بہت بحثیں کیا کرتے تھے، اور اُس وقت ہم سب یہ خواب دیکھا کرتے تھے کہ ہم لوگ ہندستان کے اس وقت کے سیاسی دار السلطنت کے اندر ایک ایسا ادارہ قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جو انتہائی طور پر جدید ہونے کے ساتھ قوم پرستی میں بھی کچھ کم سخت نہ ہوگا۔

لیکن بدقسمتی سے رجعت پسندانہ رحجانات خود ہادیوں کی جماعت میں کچھ کم سر نہیں اُبھار رہے تھے۔ ان معصوم رجعت پسندوں کے بال کی کھال نکالنے والے لیڈر، اور مسٹر گاندھی کے آشرم کے نیک دل پروفیسر مسٹر کیلکر تھے۔ لہٰذا یہ خود یونیورسٹی کی صفوں کی متخالف قوتوں کے درمیان رسہ کشی شروع ہو گئی۔ اس طرف ایک جماعت کے سردار پرنسپل گدوانی تھے اور اُس طرف دوسری جماعت کی رہنمائی پروفیسر کیلکر کر رہے تھے۔ مسٹر گاندھی گو اس پُرجوش نقل و حرکت کے منظر سے بہت دور تھے لیکن قدیم مذاہب اور قدیم تہذیبوں کی طرف ہدایت پر جو وہ زور دیتے تھے اُس نے پروفیسر کیلکر کے بازو کو مضبوط کرنے میں کافی مدد دی۔ بہت جلد ایک جین سنیاسی عالم مُنی جیناوی جایاجی اس منظر پر نمودار ہوئے اور اُنھیں گاندھی جی کی ذاتی ہدایت پر اچانک یونیورسٹی کے زیر سایہ ایک اورنٹیل ریسرچ انسٹیٹیوشن (ادارۂ تحقیقات علوم شرقیہ) کھولنے کی منظوری دے دی گئی۔ یہ نیا ادارہ بہت جلد تمام رجعت پسندانہ اور تاریک رجحانات کا مرکز بن گیا۔ اور اب تو اس میں کوئی راز نہیں رہا کہ رجعت پسندوں نے پرنسپل گدوانی کو اندر ہی اندر ایسا پریشان کیا کہ وہ اپنے فرائض منصبی کی ادائگی نہ کر پاتے تھے اور بالآخر یونیورسٹی سے الگ ہو جانے پر مجبور ہو گئے۔ گو یہ بات سال سوراج کے ختم ہونے سے بہت بعد ظہور میں آئی۔

ہندوستان کا دورہ کر کے گاندھی جی کو اس کا اندازہ ہو گیا کہ قومی مدرسوں اور کالجوں کے سلسلۂ درسیات اور نصاب تعلیم مقرر کرتے وقت قدیم اور جدید تہذیبوں کے اندر صحیح توازن قائم کرنے میں کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کام کو مناسب ماہرین فن کے سپرد کرنے کے بجائے اُنھوں نے اس عقدۂ دشوار سے عہدہ برآ ہونے کی خاطر جنوری ۱۹۲۱ء کے اختتام سے پہلے پہلے قومی مدرسوں اور کالجوں کو بھی چرخہ کاتنے کے اسکولوں اور کارخانوں میں تبدیل کرنے کی کوشش کی۔

ناگپور میں دلیش بندھو داس کی کامل نظری تبدیلی سے بنگال میں سرکاری اداروں کے مقاطعہ کی پُرزور مہم کو چلانے کے لیے حیرتناک امکانات پیدا ہو گئے" قریباً وسطِ جنوری میں دلیش بندھو، سی، آر، داس کی صرف ایک درخواست پر ہزاروں طلبا نے اپنے اسکول اور امتحانات چھوڑ دیے۔ مہاتما گاندھی کلکتہ گئے اور وہاں ۴ رفروری کو نیشنل کالج کا افتتاح کیا۔ وہاں سے پھر پٹنہ پہنچے اور یہاں نیشنل کالج کی افتتاح کرنے کے علاوہ بہار ودیا پیتھ بھی قائم کیا۔"

لیکن یہ سب کس لیے؟

گاندھی جی نے کسی کانگریس کمیٹی یا رہنما سے دریافت کیے بغیر حسبِ ذیل آمرانہ الفاظ میں (ینگ انڈیا ۱۹ر جنوری ۱۹۲۱ء) قومی اداروں کے لیے نئے پروگرام کا اعلان کر کے ساری کانگریس دنیا پر ایک اچھا خاصہ بم کا گولہ پھینک دیا۔

"ہم ایک روحانی جنگ میں مصروف ہیں۔ ہم معمولی زمانے میں زندگی نہیں بسر کر رہے ہیں۔ معمولی سرگرمیاں ہمیشہ غیرمعمولی زمانوں میں رُک جاتی ہیں۔ اگر ہم ایک سال میں سوراج حاصل کرنے کے درپے ہیں تو ہمیں اور تمام امور سے قطع نظر کر کے اپنی تمام توجہات کو اپنے نصب العین پر مرکوز رکھنا چاہیے۔ اس لیے میں ہندستان بھر کے طلبا کو (جو قومی اداروں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں)

یہ مشورہ دینے کی جرأت کرتا ہوں کہ وہ ایک سال کے لیے اپنی معمولی تعلیم کو موقوف کرکے اپنا وقت ہاتھ سے کاتا ہوا سوت تیار کرنے کے لیے وقف کردیں۔ یہ مادرِ وطن کی سب سے بڑی خدمت ہوگی اور حصولِ سوراج کی راہ میں سب سے زیادہ فطری امداد ہوگی۔ ہمارے حکمرانوں نے گزشتہ جنگ میں چستے کی گولیاں تیار کرانے کے لیے ہر کارخانے کو اسلحہ خانہ میں تبدیل کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں اپنی اس جنگ میں ہر نیشنل اسکول اور کالج کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ وہ قوم کی خاطر تاگے کی پونیاں بنانے کا کارخانہ بن جائے۔"

اس خیال سے کہ کہیں کوئی طالبِ علم چرخہ کاتنے پر یہ اعتراض نہ کردے کہ یہ زنانہ کام ہے، اُنھوں نے اور آگے اپنی رائے کا یوں اظہار کیا:۔

"کوئی بھی شخص اس کام کو یہ کہہ کر ذلیل نہ بتائے کہ یہ مردوں یا طلبا کی شان کے خلاف ہے۔ ہندستان میں یہ فن محض عورتوں تک اس لیے محدود تھا کہ موخرالذکر کے پاس فرصت کے اوقات زیادہ تھے۔ چوں کہ اس میں دل رُبائی اور موسیقیت دونوں ہیں اور محنت بھی زیادہ نہیں کرنی پڑتی اس لیے یہ کام عورتوں کی جاگیر ہوگیا تھا لیکن موسیقی کی طرح یہ بھی دونوں صنف کے لیے یقیناً دل رُبائی رکھتا ہے۔"

"میں اب پہلے سے کہیں زیادہ صاف طور پر یہ محسوس کررہا ہوں کہ ہمیں اس تغیر کے دور میں چرخا کاتنے اور فوری قومی فائدے کی بعض دوسری چیزوں کی طرف خاص توجہ کرنی چاہیے۔ تاکہ گزشتہ لاپروائیوں کی تلافی ہوجائے۔"

پھر اس میں کیا تعجب اگر گاندھی جی نے بنگال کے جوشیلے اور ذہین طلبا سے بھی نہایت بے باکی کے ساتھ کہہ دیا (۱۹ر جنوری ۱۹۲۱ء) کہ:۔

"میں تمھاری معطل شدہ تعلیم کی جگہ تم پر زور دوں گا کہ جہاں تک ممکن ہوسکے تم اس پورے سال میں نہایت خاموشی کے ساتھ جلد از جلد سوراج حاصل کرنے کے طریقوں کا مطالعہ کرو۔ میں تمھیں چرخے کا ہدیہ پیش کرتا ہوں اور بتاتا ہوں کہ ہندوستان کی اقتصادی نجات کا دارومدار اسی پر ہے۔ لیکن اگر تم چاہو تو میری اس تجویز کو مسترد کرسکتے ہو اور اس کالج میں جاسکتے ہو جس کا مسٹر داس نے تم سے وعدہ کیا ہے۔ نیشنل کالج گجرات کے بیشتر طلبا نے کم از کم چار گھنٹے یومیہ چرخہ کاتنے کی ذمہ داری لی ہے۔"

مسٹر گاندھی نے "ایشیائی تہذیب کے باقاعدہ مطالعے" اور "مغربی سائنس، مذہب، سیاست، تاریخ اور پیشوں کی تربیت" کی جگہ "چرخا کاتنے اور چند دیگر ضروریات کی طرف خاص توجہ" کو دے دی (اور وہ قومی فائدہ غالباً قومی زبان کا مطالعہ تھا) اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو کانگریس پر مکمل اقتدار حاصل کرنے کے بعد یہ پہلا آمرانہ حکم تھا جسے اُنھوں نے اپنی ذمہ داری پر صادر فرمایا۔ ناگپور کانگریس کے موقع پر دیش بندھو داس، لالہ لاجپت رائے اور پنڈت موتی لال جیسے قدیم رہنماؤں اور عظیم الشان مفکروں کی رضامندانہ اور ضروری موافقت حاصل کرنے کے بعد یہ خیال کیا جاسکتا تھا کہ کسی جدید اہم اور نتائج کے اعتبار سے دوررس پالیسی کو اختیار کرنے سے پہلے گاندھی جی بہرحال اُن سے ضرور مشورہ کریں گے اور اُن کی منظوری حاصل کریں گے۔ مگر گاندھی جی اپنے آپ کو ہر چیز کا مرکز و محیط سمجھنے کو ہمیشہ ترجیح دیتے ہیں۔ اُن کے زندگی اور سیاست کے سارے نقطۂ خیال کی بنیاد لازمی طور پر ایک روحانی مگر انفرادیت کے فلسفیانہ نظام پر قائم ہے خواہ شعوری حیثیت سے ہو یا غیر شعوری حیثیت سے مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہر ایسے نظام سے بالاتر سمجھنے کے عادی بن چکے ہیں جن میں وہ شامل ہوں۔ جس شخص نے ترکِ موالات کی عظیم الشان پرامن جدوجہد شروع کرنے میں کانگریس کی منظوری لینے کے لیے ایک لمحہ بھی توقف نہ کیا ہو، اُسے ایسے لیڈروں سے جنھیں وہ کانگریس کے دو متواتر اجلاسوں میں زک دے کر حد سے زیادہ مرعوب کرچکا تھا، چاہے وہ کتنے ہی قابل اور مشہور کیوں نہ ہوں مشورہ لینے کے لیے ایک لمحہ کے لیے بھی توقف کرنے کی بھلا کیا پروا ہوسکتی تھی۔ یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اس حکم سے ہندستان کی سیاسی قسمت پر گاندھی جی کے مکمل شخصی اور ذاتی آمرانہ اقتدار کے نئے عہد کے آغاز کی نشان دہی ہوتی ہے اُس وقت سے وہ ہر کانگریسی کو کانگریس اور اپنی جیبی کمیٹیوں کے ہر ریزولیوشن کی پوری پوری اتباع کی نہایت پُرزور ترغیب دیتے تھے مگر خود اُن کو تنہا اپنی ذمہ داری پر نئی نئی پالیسی ایجاد کرنے اور جو کچھ جی میں آئے کر گزرنے میں قطعاً تردد نہیں ہوتا تھا اور چاہتے تھے کہ اُن کی ہر تجویز کو کانگریس ایک فیصلہ شدہ امر تصور کرکے منظور کرلیا کرے۔

گاندھی جی نے قومی مدرسوں، کالجوں بلکہ یونیورسٹیوں کو بھی کتائی اور بُنائی کے اداروں میں تبدیل کرنے کی جو نئی حکمت عملی اختیار

کی تھی اُس نے اُن لوگوں کے چونکانے میں ایک زبردست حادثے کا کام کیا جو حقیقی طور پر ایک نئی قسم کی قومی تہذیب و تعلیم کو نشو و نما دینے کی مخلصانہ آرزو کے ساتھ اُن کی تعلیمی تحریک میں شامل ہوئے تھے۔ ہم لوگوں نے واقعی گجرات میں پہلی ہندوستانی قومی یونیورسٹی قائم کرنے میں پیش قدمی کی تھی۔ مسٹر گاندھی کے آشرم سے یونیورسٹی اور کالج کے لیے اساتذہ اور مزدوروں کی پہلی جماعت فراہم کی گئی اور دوسری جماعت جو اول درجہ کے گریجویٹ عمدہ تنظیمی کام کرنے والے اور پرجوش اساتذہ پر مشتمل تھی، گجرات ایجوکیشن سوسائٹی سے بہم پہنچائی گئی جسے میں نے اُن کی امداد سے قائم کیا تھا۔ ہم نے درحقیقت اپنا کام کئی سال پہلے شروع کر دیا تھا لیکن ایجوکیشن سوسائٹی پونہ کے ڈھرہ پر اپنی سوسائٹی قائم کرنے میں ۱۹۲۰ء میں جا کر کامیاب ہوئے؛ احمد آباد میں ایک مثالی پرائمری اسکول اور ایک گرلز کالج کے ساتھ ساتھ دوسرے ادارے جو ہماری کوششوں کے نتائج تھے اُن سے قطع نظر کر کے ہم لوگوں نے اُس نئے اسکول کا بھی چارج لے لیا ہے جو ذہین اور ایثار پیشہ اساتذہ کی نئی جماعت کے تحت بہت تیزی سے ترقی کر رہا تھا۔ اُس وقت ہم احمد آباد میں ایک نیا اور نسبتاً زیادہ آزاد کالج قائم کرنے کی تحریک شروع کرنے کے متعلق بہت انہماک کے ساتھ غور و فکر کر رہے تھے کہ اچانک ترکِ موالات کی نئی تحریک نے ہم کو آ دبایا۔ درحقیقت اس عظیم الشان قومی تحریک کے لیے اپنے سارے تعلیمی کام کے تعمیری اور سنجیدہ خوابوں کو قربان کرنے میں ایک لمحہ کے لیے بھی نہ ہم کو کوئی تردد ہوا نہ ہمارے ساتھیوں کو ہم نے اس ہائی اسکول کو چھوڑ دیا اور نئی نیشنل یونیورسٹی کی تحریک میں دل و جان سے شامل ہو گئے۔ میرے دوست حضرات پاٹھک شاہ اور پارکھ نے آغاز کار ہی سے اپنا نام نئے ادارہ کی خدمت کے لیے مندرج کرا دیا تھا اور اپنے تمام بلند تعلیمی خوابوں کی تعبیر نیشنل یونیورسٹی کی وساطت سے اور زیادہ بہتر اور وسیع پیمانہ پر دیکھنے کی توقع رکھتے تھے۔ لہٰذا گاندھی جی کا یہ نیا حکم سُن کر انھیں جتنا صدمہ ہوا وہ بیان سے باہر ہے اور انھیں بس یہ محسوس ہوا کہ 'ابھی بجھائے تھے تنکے کہ گر پڑی بجلی'۔ اگرچہ اُنھوں نے ضبط و نظم کے تحت چرخہ کاتنے کے طریق کار سے موافقت ظاہر کی۔ لیکن اس معاملہ میں وہ اپنے آزادانہ فیصلے سے بالکل دست کش نہ ہوئے۔ وہ نیشنل یونیورسٹی کے احاطے میں غیر مزاحم احتجاج کرنے والوں کی طرح اپنے خیال پر مضبوطی سے قائم رہے، اور اب جیسا کہ اور زیادہ شدید آمرانہ حکمتِ عملی ان لوگوں کو یونیورسٹی کی حدود سے آخرِ کار بالکل نکال باہر کر دینے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ یہ دوست اور یہ نام نہاد یونیورسٹی جس کی شاندار عمارتیں جو بعض سرپرستوں کی مالی امداد سے تیار کی گئی تھیں صرف اس یادگار کے طور پر باقی ہیں کہ وہ کیا کچھ ہوتیں اگر گاندھی جی نے "اقلیمِ علم" کا تھوڑا سا احترام کیا ہوتا اور ان تمام امید افزا نقشوں کو اس معصومیت اور بے دردی سے پامال نہ کیا ہوتا جنھیں خود اپنے ہاتھوں سے گاندھی جی نے چند ماہ قبل تیار کیا تھا۔

گاندھی جی کے نئے احکام پر مختلف صوبوں میں کم و بیش عمل درآمد شروع ہو رہا تھا، مگر یہ احکام فوری اور مکمل نفاذ کے لیے قدرتاً گجرات کے تعلیمی اداروں میں آئے۔ اس نئے حکم پر غور کرنے کے لیے فوراً نیشنل یونیورسٹی سینیٹ کا جلسہ طلب کیا گیا۔ تمام شکوک اور اعتراضات "ہمہ داں مہاتما" اور قومی جنگ کی ضروریات کے واسطے سرسری طور پر برطرف کر دیے گئے۔ نیشنل کالج قدرتاً پہلا ادارہ تھا جو اس نئے حکم کے مکمل نفاذ کا ہدف بنایا گیا۔ مسٹر گدوانی سے کہہ دیا گیا کہ وہ اپنے ادارے کو از سرِ نو اس طرح منظم کریں کہ کتابی تعلیم سے زیادہ چرخا کاتنے کے لیے وقت ملے۔ یہ محب وطن پرنسپل صاحب ایک قدم اور آگے بڑھ گئے۔ بعض اوقات یہ ایک بجے رات کو کالج سے روانہ ہو جاتے تاکہ صبح کی عبادت سے پہلے دو بجے گاندھی جی سے ملاقات کر سکیں۔ مہاتما گاندھی کی گفتگو سے اُنھیں جو فیضان حاصل ہوا اُس سے متاثر ہو کر انھیں خود یونیورسٹی کے احاطے میں سوراج آشرم کے نام سے ایک انوکھے قسم کے ادارے کے قیام کی سوجھی۔ کالج کے طلباء سے سرسری طور پر دریافت کیا گیا کہ آیا وہ دیہاتوں میں فوراً کام کرنے کی غرض سے اپنے کو چرخا کاتنے کے لیے بالکل وقف کرنے اور کچھ ابتدائی سیاسی درس لینے کی خاطر اس نئے آشرم میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ یا کالج میں رہ کر اصل تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں جس میں چرخا کاتنے کا کافی کام شامل کر دیا گیا ہے۔ گدوانی کے جاذبانہ جوش کا بھلا ہو کہ اُس وقت بہت سے طلبا نے نئے آشرم میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ جو فوراً سیاسی کارکنوں کا تربیت گاہ بن کر رہ گیا۔ اس طرح ذہانت، جذبات اور تخیل کی پرورش کرنے کے بجائے چرخے پر

طلبا کے اوقات ضائع کرنے سے قومی تعلیم کا آئیڈیل محض ایک تمسخر د تماشا بن کر رہ گیا۔

میں اس کالج کی نئی تنظیم سے تو بے حد متنفر تھا مگر پرنسپل گدوانی کے اس نئے آشرم میں البتہ مجھے کچھ امید کی جھلک نظر آئی ۔ وہ خود کئی گھنٹے چرخا ضرور کاتا کرتے تھے ۔ مگر اُن کی ذہنیت اور نظریہ کامل سیاسی ہی رہا ۔ اس لیے میں اُن کے ساتھ شریک ہو گیا۔

گجرات پراونشل کانگریس کمیٹی کا پہلا سکریٹری ہونے کے باعث مجھ پر پورے صوبے کی تنظیم کا بار تھا ۔ مجھے یہ خیال پیدا ہو گیا کہ گدوانی کے آشرم سے دیہاتوں میں کام کرنے والے لائق کارکنوں کی ایک بہت معقول تعداد مل سکے گی اگرچہ چند ہفتوں کے اندر نہ اُنھوں نے چرخا کاتنا سیکھا تھا اور نہ کچھ اور جانتے تھے مگر ہوشیار پرنسپل کو اُن کی خدمت پیش کرنے میں ذرا بھی تردّد نہ ہوا ، اس لیے دو دو اور تین تین کی جماعت میں میں نے اُنھیں مختلف تعلقوں میں روانہ کرنا شروع کیا ۔ مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ ان میں سے بہتوں نے اپنی قابلیت اور اہلیت کا شاندار ثبوت دیا ۔ نہ صرف دیہاتوں میں معمولی کانگریس کے کاموں اور چرخا کاتنے کی تنظیم ہی کرنے میں بلکہ ایسے دیہاتوں کے اندر جو ریلوے لائن سے بہت دور واقع ہیں امدادی کام کرنے اور عام سیاسی بے چینی کو ترقی دینے میں بھی ۔

ہائی اسکول اور پرائمری اسکول پر بھی بہت جلد یہ نیا تیشہ چلا دیا گیا ۔ ظاہر ہے کہ ان اداروں کو کتائی کے کارخانے بنا دینے میں کوئی خوبی نہ تھی ۔ کیوں کہ ان سے ہمیں ایسے کارکن حاصل ہونے کا امکان نہیں تھا ، جو دیہات کی تنظیموں میں مدد دے سکتے ۔ بہت سے ہائی اسکولوں کے بہت سے طلبار نے اپنے اسکولوں میں چرخا کاتنے سے دلچسپی لینا ختم کر دیا اور اُس کے بجائے کانگریس میں ممبروں کی بھرتی اور شہروں اور دیہاتوں میں دوسرے متفرق سیاسی کاموں میں مصروف ہونے لگے ۔

نئی اسکیم کے تحت پرائمری اسکولوں کی حالت بہت شرمناک ہو گئی تھی ۔ میں اکثر یہ محسوس کرتا تھا کہ کمیٹی نے طلبا کے والدین کے ساتھ شدید بد عہدی کی ہے انھوں نے اپنے بچوں کو اس لیے ہمارے سپرد کیا تھا کہ ہم انھیں نوشت د خواند اور حساب کی عمدہ تعلیم دیں گے مگر اس کے بجائے ہم نے گندی اور بدنما عمارتوں میں نہایت ذلیل قسم کے اسکول قائم کر دیے تھے جن میں فرنیچر تک نہ تھا ۔ ان میں کچھ ٹوٹے پھوٹے چرخے رکھ دیے گئے تھے ، وہ بھی ایسے کہ کسی کے کل پُرزے الگ ، کسی میں ایک حصّہ ہے تو دوسرا نہیں ، دوسرا ہے تو تیسرا نہیں ، غرض کہ محض بے کار جن سے کتائی کا کام بھی نہیں لے سکتے تھے ۔ اس کے علاوہ کچھ سوت کے پلندے (جن میں اکثر مل کے بنے ہوئے ہوتے تھے) کچھ پونیاں جن میں اُلجھے ہوئے تاگے ہوتے تھے جو گرگوں پر لگائے بھی نہ جا سکتے تھے ۔ غرضے کہ یہ کل کائنات تھی جن سے ان اسکولوں کی تزئین کی گئی تھی ۔ سیاسی پروپیگنڈے کی غرض سے دیہاتوں میں دورہ کرتے ہوئے میرے لیے یہ نظارہ بہت دردناک اور غم انگیز تھا کہ یہ الم انگیز تماشہ یکے بعد دیگرے دیہاتوں کے ہر اسکول میں کیا جا رہا ہے ۔ اگرچہ میں اُس وقت سیاسی قضیے میں اس قدر منہمک تھا کہ مجھے ان مدرسوں پر اس امر کے سوا اور کسی نقطۂ نظر سے خیال کرنے کی مہلت نہ تھی کہ یہ سرگرمیوں کے مرکز ہیں اور ان کے اساتذہ سوراج کی نئی روشنی کے مشعل بردار ہیں ، مگر میرے دل کی گہرائیوں میں یہ بات اُسی وقت سے کھٹکنے لگی کہ کیا لڑکوں ، اور لڑکیوں کی نئی نسل اور قومی تعلیم کے ان اغراض و مقاصد کے خلاف یہ گناہ نہیں ہے کہ ایک مقدس جنگ کے نام پر ایسا تماشہ کھڑا کر دیا جائے ۔

صرف یونیورسٹی ہی کے لیے نہیں بلکہ صوبے کے مختلف اسکولوں کے لیے بھی بڑی بڑی رقمیں جمع کی گئیں ۔ مجھے یہ کہتے ہوئے بہت افسوس معلوم ہوتا ہے کہ ان رقوم کا زیادہ حصّہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں سے چرخہ کتا کر اور بے کار قسم کا تاگہ بنوا کر جو کسی کام نہیں آ سکتا تھا اُن کا وقت ضائع کرنے پر صرف کیا گیا ۔ اس طرح روپیہ اور وقت کا ضائع کرنا یقیناً مجرمانہ حرکت تھی ۔ ہمیں اس شرمناک تباہی سے جو کچھ حاصل ہوا وہ سیاسی بغاوت کا جذبہ تھا جس کا استعمال اس سے زیادہ بہتر طریقے سے ہو سکتا تھا ۔ نتیجہ یہ تھا کہ جو اسپرٹ گجرات میں بلکہ پورے ملک میں پیدا ہوئی تھی اس سے پتہ چلتا تھا کہ ہماری تباہیوں کی شدت اور نتائج

کی بے مائگی میں کوئی مناسبت ہی نہیں - یقیناً یہ ایک غیر متوازی حالت تھی - زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ یہ امید افزا عمارت ڈھیر ہوگئی - سارا طلسم ٹوٹ گیا - نظر کے سامنے تاریکی ہی تاریکی تھی، اور ردِ عمل کا دور شروع ہوگیا -

یونیورسٹی کے اندر جس کے قائم کرنے میں میں نے مدد دی تھی کچھ دن اور لڑنے اور اُن ذلیل پابندیوں سے بے حد بددل ہونے کے بعد جنھیں گاندھی اور اُن کے پاک باز مقلدین اس پر عائد کر رہے تھے، آخرِ کار مئی ۱۹۲۱ء میں میں یونیورسٹی سنیٹ سے مستعفی ہوگیا -

اُس وقت میں یہ محسوس نہ کرسکا جیسا کہ اب مجھے معلوم ہوا کہ گاندھی جی عمداً نہ سہی جبلی طور پر ہی سہی نوجوانانِ وطن کی اُن وسیع انقلابی قوتوں کو جو اس تحریک نے اُن کے اندر پیدا کر دی تھیں چرخے کی بے سود اور تباہ کن سرگرمیوں کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے -

آیندہ باب میں معلوم ہوگا کہ ۱۹۲۱ء کے اوائل میں اسی طرح اُنھوں نے کارخانوں کے مزدوروں اور دیہاتوں کے کسانوں کے بڑھتے ہوئے سیلابِ بغاوت کو کیوں کر روکا +

پینتیسواں باب

مزدوروں اور کسانوں سے غداری

ایک نئی گلابی صبح نے ۱۹۲۱ء یعنی "سال سوراج" کے پہلے مہینہ کا آغاز کیا۔ ہندستان کا دل ایک نئی امید اور ایک نئے اعتقاد سے دھڑک رہا تھا۔ کانگریس اور سب سے بڑھ کر مسٹر گاندھی ایک آسمان اور ایک نئی زمین پیدا کرنے کے لیے تلے بیٹھے تھے۔ جب گاندھی جی نے یہ کہا کہ ہم حکومت اور عوام دونوں کے اندر ایک طرح کا انقلاب۔ ایک پرامن انقلاب برپا کرنے کو ہیں تو لاکھوں نے یہ سمجھا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سچ کہتے ہیں۔ لوگ ہر قیمت پر اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے ایک نئی شان و خودداری اور ایک نئی ہمت و عزم کا احساس لیے ہوئے جان توڑ کوشش سے کام کرنے کی خاطر نکل پڑے۔ نیا نظریہ اگرچہ سیاسی صورت حال کو منقلب کر دینے کی غرض سے وضع کیا گیا تھا مگر زراعتی اور حرفتی دنیا میں اس کا فوری اور براہ راست اثر پڑا جہاں غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے کسان اور عہد حاضر کی مشینریوں کے بارے دبے ہوئے مزدور اپنے اُن بندھنوں کو کاٹ ڈالنے کے لیے ایک بے تاب مگر قدرتی آرزو ظاہر کرنے لگے جنھوں نے ان کو غلامی میں پھانس رکھا تھا۔

پھر کیا عجب اگر گاندھی جی نے ینگ انڈیا مورخہ ۱۶ فروری ۱۹۲۱ء میں یہ لکھا کہ "ہڑتالیں روزانہ کا معمول بن گئی ہیں۔ یہ موجودہ بے چینیوں کی علامات ہیں" پھر تو وقت کی ان نشانیوں کا خیر مقدم کرنا، سرمایہ داروں کے ظلم کے خلاف لڑنے کے لیے عملی تنظیم کرنا اور مناسب راستوں پر تحریک کی رہبری اور مدد کرنا گاندھی جی اور کانگریس کا کھلا ہوا فرض تھا۔ کانگریس کے لیے تو یہ بے حد آسان تھا کہ وہ ہندستان کے تمام حصوں میں مختلف قسم کے مزدوروں کی جماعت کی تنظیم کرنے کے لیے، اپنے بعض سربرآوردہ کارکنوں کو روانہ کر دیتی تاکہ وہ صنعتی اور سیاسی تحریک میں ایک ربط قائم کرے ادھر سے تو عملاً گاندھی جی بالکل بے نیاز تھے لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ مزدوروں نے مالکان کارخانہ کے خلاف تمکنت سے سر اٹھایا ہے تو ان پر سراسیمگی طاری ہو گئی۔ یہ اعتراف کرتے ہوئے کہ مزدوروں کا "غیر مطمئن ہونا بالکل جائز ہے" "کیوں کہ" انھیں یہ سکھایا جا رہا ہے" "اور صحیح بھی ہے کہ اپنے مالکوں کو دولت مند بنانے میں وہ سمجھ لیں کہ ان کا خاص ہاتھ ہے انھوں نے مزدوروں کی تعریف میں اتنا بخل سے کام لیا کہ وہ تعریف نہ رہ گئی۔ مگر اس کے بعد ہی انھوں نے یہ کہتے ہوئے اپنا رُخ بالکل بدل دیا کہ "میری رائے میں ایک ایسے (سیاسی) مقصد کے لیے مزدوروں کی ہڑتالوں سے کام لینا بہت بڑی غلطی ہوگی اور یہ ہڑتالیں پُرامن ترک سوالات کے دائرے میں نہیں آتیں۔

ان الفاظ کی قیمت کا اندازہ لگانے میں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ گاندھی جی نے احمد آباد کے اپنے محبوب گوشے کے سوا ہندستان بھر میں کہیں بھی منظم مزدوروں سے کوئی تعلق یا رشتہ نہیں رکھا۔ اور نہ کانگریس نے سارے ملک میں مزدوروں کی بڑھتی ہوئی انجمنوں اور جماعتوں سے کوئی تنظیمی علاقہ قائم کیا۔ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت بمشکل کانگریس میں کوئی ایسا مشہور لیڈر تھا جس نے سارے ملک کے کسی حصے میں بھی کبھی مزدوروں کی جدوجہد کی قیادت کا فرض انجام دیا ہو۔ اس لیے جب مسٹر گاندھی نے "سیاسی

ہڑتال" کہ کر بعض ہڑتالوں کی مذمت کرنی چاہی تو اُن کا تیر نشانے سے دور جا پڑا۔ (ان سیاسی ہڑتالوں کے ساتھ ساتھ گاندھی جی نے ۲۲ ستمبر ۱۹۲۱ء کو آسام بنگال ریلوے کی زبردست اسٹرائک پر ایک مضمون لکھ کر ایک اور اسٹرائک کا اضافہ کر دیا تھا جو ان کے قول کے مطابق "ہمدردانہ اور انسان پرستانہ اسٹرائک" تھی) جب انھوں نے آغاز سال میں پُرامن ترک موالات کے موجد کی حیثیت سے صنعتی ہڑتالوں کے خلاف پہلا حملہ کیا تو انھوں نے یقیناً مکمل اور کافی معلومات حاصل کیے بغیر یہ سب کچھ لکھ دیا تھا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ جن ہڑتالوں کی انھوں نے مذمت کی وہ ہمدردانہ اسٹرائک تھیں۔ لیکن دنیا کے تمام منظم مزدوروں کے اسلحہ خانے میں ہمدردانہ ہڑتالیں ایک ناگزیر حربہ سمجھی جاتی ہیں اس وقت ملک بھر میں جو سیاسی جوش و خروش برپا تھا اس کے مزدور رہنما کافی طور پر متاثر تھے چناں چہ وہ بیشک ہڑتالوں پر اتر آئے حکومت کا سر جھکا دینے کے لیے نہیں بلکہ دوسرے محکموں یا صنعتوں میں جو مزدور کام کر رہے تھے اور جو خالص اقتصادی بنیادوں پر اپنے مالکوں کے خلاف ہڑتال کرنے پر تلے ہوئے تھے ان کی صفوں میں اپنے آدمیوں کو لا کھڑا کرنے کی نیت سے انھوں نے ہڑتالیں کیں۔ اس طرح گاندھی جی نے ان بیچاروں کے ساتھ "ملزم ٹھہراؤ اور دار پر چڑھا دو" والی صورت اختیار کر لی

جب ناظرین اس بیسویں صدی کی ہڑتالیں چلانے کے بارے میں گاندھی جی کے عجیب اقوال ملاحظہ فرمائیں گے تو اور بھی حیرت زدہ ہوں گے۔ انھوں نے ۱۹۱۹ء میں احمد آباد کے پارچہ بافوں کی ہڑتال چلانے اور اس کے تج دینے کے بعد سے پھر اس سلسلے میں کوئی مزید معلومات نہیں حاصل کی تھیں۔ انھوں نے مزدوروں کو صرف اپنے امکان ترقی کو وسیع کرنے اور "اپنے آپ کو شریک مالک کے مرتبے پر پہنچانے" کا مشورہ دیتے ہوئے ہڑتالوں کے چلانے کے لیے حسب ذیل دو غیر معمولی شرطیں پیش کیں "اول: ہڑتالیوں کو ہڑتال کے دوران میں یونین کے فنڈ (انجمن اتحاد کے چندے کی رقموں) پر نظر ڈالے بغیر اپنا گزارہ کرنے کے قابل ہونا چاہیے اور اس دوران میں کوئی ایسا عارضی کام کرنا چاہیے جو نفع بخش اور صنعتی ہو مثلاً (دھننا، کاتنا، بُننا) جیسا کہ ۲۲ ستمبر ۱۹۲۱ء کے ایک دوسرے مضمون میں انھوں نے اس کی تفصیل دی تھی۔ دوم، جب ہڑتالیوں کی جگہ کام کرنے کے لیے دوسرے مزدور موجود ہوں تو ہڑتال کوئی علاج نہیں ہے۔ ایسی حالت میں غیر منصفانہ یا نامعقول مزدوری یا اسی قسم کی اور صورتوں میں استعفا دینا ہی صحیح مداوا ہے"

یہ شرائط آپ اپنی تردید کرتی ہیں۔ گاندھی جی ۱۹۱۹ء میں یا اس سے بھی پہلے غالباً جنوبی افریقہ میں ان شرائط پر عمل پیرا ہو کر ناکام ہو چکے تھے، گو اپنی رائے میں اپنے آپ کو وہ کتنا ہی کامیاب کیوں نہ سمجھیں۔ لیکن ۱۹۲۱ء میں تو ان شرائط کو فرسودہ اور رجعت پسندانہ ہی کہا جائے گا۔ ایسے وقت جب وہ اپنے فائدہ اٹھانے والے مالکوں کے خلاف موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھے اپنے گزارے کے لیے نہیں تو پھر ہر ہفتے اور ہر مہینے مزدوروں نے کس لیے اپنے پیسے چندوں میں لگائے تھے۔ عارضی پیشے کے ذریعے مزدوروں کی کفالت کا تجربہ خود گاندھی جی کی رہنمائی میں ۱۹۱۹ء میں نہایت ذلت سے ناکام ہو چکا تھا۔ انھیں یہ معلوم ہونا چاہیے تھا کہ کوئی شخص ایک دن یا چند ہفتوں کے اندر بھی چرخا چلانا نہیں سیکھ سکتا اور ایک ایسا مزدور جسے چرخہ چلانے کی عادت نہ ہو وہ دن بھر چرخہ چلا کر آنے دو آنے کی قلیل رقم اگر کما بھی سکتا ہے تو یہ اُسے اور اس کے خاندان کو زندہ رکھنے کے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔

پھر ہندستان جیسے غریب ملک میں بے روزگاروں کی ایک کثیر تعداد ہے جو ہڑتال کے زمانے میں مالکان کارخانہ کا ساتھ دے کر ہڑوران کا کام کریں گے۔ اور اس طرح ہڑتال توڑ دیں گے۔ لہٰذا ان کی موجودگی میں ہڑتال کا امکان ہی نہیں اور موجودہ دنیا میں مزدوروں کو ابدی غلامی کی لعنت سے نجات مل ہی نہیں سکتی۔ جس طرح گاندھی جی اور کانگریس کے احکام کی تعمیل میں شراب خانوں اور غیر ملکی کپڑوں کی دکانوں پر شراب اور غیر ملکی کپڑوں کی فروخت کو منع کرنے کے لیے کانگریسی پکٹنگ کرنے

کا حق رکھتے ہیں اُسی طرح مزدوروں کو بھی یہ حق حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ مالکان کارخانہ جات سے ساز باز رکھنے والوں کو کارخانوں میں داخل ہونے سے روکنے کے لیے کارخانوں کے دروازوں پر پکیٹنگ کریں۔

یہ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں جبکہ گاندھی جی غیر ملکی حکومت کے خلاف تمام طبقوں کو جنگ میں متحد کرنے کی کوشش کر رہے تھے وہ مزدوروں کو کسی سیاسی تحریک میں شرکت کی اجازت نہ دینے ہی کا عزم نہیں کر چکے تھے بلکہ انہیں سرمایہ دار طبقوں کے خلاف مزدوری کی خاطر جدوجہد کرنے کی بھی اجازت نہیں دینا چاہتے تھے۔ گذشتہ، دس برس میں مزدوروں کی لڑائیوں میں کانگریس نے محض ہٹ دھرمی اور مخالفت کا رویہ رکھا، لہٰذا یہ نتیجہ نکالنا سوءِ ظنی نہ ہوگی کہ گاندھی جی ان تمام لڑائیوں کی فی الواقعی مذمت کرکے جو مزدوروں نے اُن کے نئے دوستوں کے خلاف جاری کی تھیں کانگریس تحریک میں تمام سرمایہ دار طبقے کی مالی اور اخلاقی مدد حاصل کرنے کی ترکیب میں تھے۔

کسانوں نے اپنے حقوق کے لیے ظالم زمینداروں کے خلاف جو جدوجہد جاری کر رکھی تھی اس کے متعلق جب ہم گاندھی جی کے مقدس اقوال کا جائزہ لیتے ہیں تو اُن سے بھی یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے۔

صوبجات متحدہ کے کسانوں نے جن پر تین بار ظلم کیا جا چکا تھا۔ خود اعتمادی کے نئے جذبہ سے متاثر ہو کر ایک بار پھر اوائل ۱۹۲۱ء میں "ایک زرعی تحریک" کا آغاز کر دیا، یہ تحریک زمینداروں اور کسانوں کے درمیان شروع ہوئی تھی سبب یہ تھا کہ کسانوں نے ہر قسم کے ناجائز اور ظالمانہ محاصل کی ادائگی سے انکار کر دیا تھا۔ بہت سے مقامات پر لوگوں کے بڑے بڑے اجتماع ہوئے اور متعدد مقاموں پر کئی بلوے ہوئے۔ کہیں کہیں پولیس نے گولیاں چلا کر مجمع کو منتشر کر دیا اور امن و امان قایم ہوتے ہوتے ایک ماہ سے زائد عرصہ لگ گیا۔ بابو راجندر پرشاد نے اس صورت حال کا خلاصہ ینگ انڈیا کے دیباچے میں ذیل کے پیرائے میں پیش کیا ہے۔

ہر شخص کو یہ خیال ہوگا کہ کانگریس جو اب ملک کی قومی حکومت کی حیثیت سے منتظم ہو چکی ہے۔ کسانوں کو اُن ناجائز اور ظالمانہ محاصل اور زائد لگان کے خلاف جو بالعموم ان سے وصول کیے جاتے ہیں جدوجہد کرنے کے لیے ایک جنگ پر جا ہے وہ کتنی ہی پر امن کیوں نہ ہو تیار کرے گی۔ کسانوں کی جنگ کے متعلق اندازہ لگانے کے لیے یوپی میں زمین داروں کے مالیہ اور حکومت کے لگان کے متعلق ذیل کے اعداد و شمار پر ایک نظر ڈالنا ہی کافی ہوگا:-

سال	مال گزاری	لگان
۱۸۹۸-۹۹ء	۶۱۹	۱۲۱۱
۱۹۱۴-۱۵ء	۶۵۱	۱۵۹۳
۱۹۲۹-۳۰ء	۷۰۷	۱۹۴۰

(اعداد لاکھ میں ہیں)
یہ نقشہ "یوپی میں زرعی بدحالی" سے لیا گیا ہے جس کو یوپی کانگریس کمیٹی نے ۱۹۳۱ء میں شائع کیا تھا۔

اگر فرض کر لیا جائے کہ ۱۹۲۱ء کے اعداد و شمار بھی اس سطح پر تھے جس پر ۱۹۳۱ء کے دکھائے گئے ہیں تو ماننا پڑے گا کہ اس صدی میں زمین داروں کے مطالبات میں ساٹھ فی صدی کا اضافہ ہوا ہے اور گورنمنٹ کے مطالبات میں صرف تیرہ فی صدی کا وہ ناجائز محاصل اور ٹیکس اس اُنیس ۱۹ کروڑ روپیوں کی خطیر رقم کے علاوہ تھے جو یوپی کے قلاش کسان لاکھی زمین داروں اور تعلقہ داروں کو دینے پر مجبور کیے جاتے تھے۔

اس لیے یہ صحیح وجدان تھا جس نے اس بدنصیب صوبہ کے فلاکت زدہ کسانوں کو اپنی نئی بیداری کی ابتدائی نئی منزلوں میں زمین داروں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہونے پر اُبھار دیا اور گاندھی جی نے جو اپنے آپ کو ہندستان کے لاکھوں بے زبانوں کا (جن میں اکثریت کسانوں ہی کی ہے) بہی خواہ اور نجات دہندہ کہتے ہیں اس نئی بیداری کا

کس طرح خیر مقدم کیا؟ ۹ر مارچ ۱۹۲۱ء کو اُنھوں نے ینگ انڈیا میں یوپی کے کسانوں کو ہدایات دیتے ہوئے تحریر فرمایا:-

"اگر زمیں داروں کے خلاف کسی قسم کی شکایتیں ہوں تو پنڈت موتی لال نہرو کو اطلاع دی جائے اور اُن کے مشوروں پر عمل کیا جائے۔"

(اس بات پر نظر ڈالنا کافی سبق آموز ہوگا کہ گاندھی جی نے جہاں اپنے بیش بہا پیغام کو طرح طرح کے اخلاقی نسخوں اور خوش آیند کلمات سے زیر بار کر رکھا ہے وہیں زمیں داروں کے استحصال بالجبر کے مسئلہ کو صرف ایک جملہ میں ختم کردیا۔)

کیا پنڈت موتی لال اور خود مسٹر گاندھی کا فرض نہیں تھا کہ وہ بھرتی کے کارکنوں میں سے کچھ ایسے لوگوں کو جو چرخے کی مقدس جنگ میں لائے گئے تھے کسانوں کے حالات کی کامل اور گہری جانچ پڑتال اور زمیں داروں کے خلاف اُن کی حق بجانب جدوجہد میں صحیح اور مناسب راستوں پر اُن کی رہنمائی کے لیے مقرر کرتے؟ مگر گاندھی جی سے اس قسم کی توقع فضول تھی، کیوں کہ تھوڑے ہی دنوں بعد انھوں نے جب کسانوں کی لڑائی کے سیلاب کو بڑھتے ہوئے دیکھا تو اُن کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے اور اُنھوں نے کسانوں کو اپنے زمیں دار دشمنوں سے کسی قسم کی بھی لڑائی جاری کرنے کی سخت ممانعت کردی۔ اُنھوں نے ینگ انڈیا (۱۸ر مئی ۱۹۲۱ء) میں اس طرح اپنے دل کا بخار نکالا:-

"جہاں یوپی گورنمنٹ معقولیت کی حدود سے گزر رہی ہے اور لوگوں پر ہیبت طاری کردینا چاہتی ہے وہیں اس میں بھی شبہ نہیں کہ کسانوں کو جو نئی قوت حاصل ہوئی ہے اُس کا استعمال وہ بھی عقل مندی سے نہیں کر رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ متعدد زمیں داریوں میں حد سے زیادہ تجاوز کرگئے ہیں، اُنھوں نے قانون کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے اور جو شخص بھی ان کی مرضی کے مطابق عمل نہیں کرنا چاہتا اُس کو برداشت نہیں کرتے وہ معاشرتی مقاطعہ کی بُرائی کرتے ہیں اور اُسے تشدد کے ایک آلہ کی صورت میں بدل رہے ہیں بعض بعض حالتوں میں اُن کے متعلق اطلاع ملی ہے کہ اُنھوں نے زمیں داروں کے یہاں پانی کا پہنچانا روک دیا ہے، نائی کو جو خدمت کی اجرت پاتا ہے اُن کے یہاں نہیں جانے دیتے اور جو لگان اُن کے ذمے باقی ہے اُس کی ادائگی بھی ملتوی کردی ہے۔ کسان تحریک نے ترکِ موالات سے وقتی قوت ضرور حاصل کی ہے مگر وہ اس سے پہلے سے ہے اور اس سے آزاد ہے، جب حکومت کے محاصل کی ادائگی روک دینے کا وقت آجائے گا تو ہم کسانوں کو مناسب مشورہ دینے میں ذرا بھی توقف نہ کریں گے، مگر یہ بالکل نہیں ہے کہ ترکِ موالات کی کسی منزل پر بھی ہم زمیں داروں کو اُن کے لگان سے محروم کرنے کی فکر کریں گے، کسان تحریک کو کسانوں کا مرتبہ بلند کرنے اور اُن کے اور زمیں داروں کے تعلقات کو بہتر بنانے تک محدود ہونا چاہیے کسانوں کو بڑی احتیاط سے مشورہ دینا چاہیے کہ ازروئے رواج اُن کے اور زمیں داروں کے درمیان جو معاہدہ ہوا ہے وہ غلط ہو یا بُرا اُس پر قائم رہیں۔ اگر کہیں پر رواجی یا تحریری معاہدہ غیر منصفانہ ہو تو وہ اُسے بذریعہ تشدد یا زمیں دار کو پہلے سے اطلاع دیے بغیر اُس کے توڑنے کی کوشش نہ کریں، ہر حال میں زمیں دار سے دوستانہ تبادلۂ خیال کر کے کسی سمجھوتے تک پہنچنے کی کوشش ہونی چاہیے، سوراج کی اہلیت کا دارومدار ہماری اس اہلیت پر ہے کہ ہم اپنے ایسے مختلف النوع اور پیچیدہ مسائل کو جن کا پیدا ہونا ہماری جیسی عظیم الشان اور قدیم قوم کے معاملات میں لازمی ہے، حکومت کی طرف تفویض کیے اور اُس کی مداخلت کے بغیر خود حل کرلیں۔"

گاندھی جی "ترکِ موالات کے کسی مرحلے میں "زمیں داروں کو اُن کے لگان سے محروم کرنا نہیں چاہتے تھے، اُنھوں نے کسانوں سے یہ بھی مطالبہ کیا کہ وہ غیر منصفانہ شرائط کی بھی درستی، زمیں داروں سے بحث اور گفت وشنید کے ذریعہ کریں حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ دونوں فریق کے درمیان سرے سے کوئی حقیقی معاہدہ ہی نہ تھا، ان نام نہاد معاہدوں کی شرائط ہی سے

پورے طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ یہ زمیں داروں کی مستبدانہ قوت کے عائد کیے ہوئے شرائط ہیں جن میں غریب کسانوں کی مرضی کو مطلق دخل نہیں ہے۔ مزید برآں کسانوں سے کوئی تذکرہ کیے بغیر اُن پر طرح طرح کے ناجائز اور جابرانہ محاصل عائد کر دیے گئے تھے۔ پھر اوپر دیے ہوئے اعدادِ شمار سے واضح ہو جائے گا کہ زمیں دار غیر ملکی حکومت سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر اپنے مطالبات میں اضافہ کر رہے تھے۔ اُس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح ہے کہ گاندھی جی نے اپنی زبردست تحریک میں ان زمیں داروں کی مدد حاصل کرنے کے لیے کسانوں کی المناک حالتِ زار سے عمداً چشم پوشی کر لی اور بے چاروں کو اُن کے بدترین دشمنوں اور ظالموں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

کیا ایسی تحریک کبھی کامیاب ہو سکتی ہے؟ قومی ترکِ موالات حکومت اور اس کے پٹھوؤں اور طفیلیوں۔ کے خلاف زرعی، سیاسی، تجارتی اور صنعتی نقطۂ نظر سے منظم اسٹرائک نہیں تو اور کیا ہے؟ اس قسم کی ہڑتال میں اُسی تناسب سے کامیابی ہوگی جتنی تعداد میں لوگ اس کی حمایت کریں گے، اور ہندستان کے بے شمار عوام میں کثیر التعداد غیر زمیں دار مستاجر، بڑے بڑے سرکاری اور غیر سرکاری ریلوے کے کارخانوں میں یا صنعت گاہوں اور کارگاہوں یا گھریلو دستکاریوں کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی ایک زبردست اکثریت ہے۔ بہرحال ہر وہ ہڑتال جس کا منشا حکومت کو معطل کرنا ہو اُس کی بُنیاد ضروری ہے کہ کسانوں اور مزدوروں کی منظم قوت پر ہو۔ مگر گاندھی جی نے صاف صاف مزدوروں اور کسانوں کو اُنھیں لوگوں کے فولادی پنجوں کے نیچے ڈال دیا جو ان غریبوں کو سب سے زیادہ لوٹتے تھے اور اس طرح تحریک کو ایسے قوی الاثر ذرائع سے محروم کر دیا جو اس تحریک کو کامیاب بنانے کا باعث ہوتیں۔

چھتیسواں باب

ایک کروڑ جمع کرو

بابو راجندر پرشاد (ینگ انڈیا کے دیباچے میں) لکھتے ہیں کہ کانگریس کا پروپگنڈا دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا، اور ملک جبر و استبداد کے اوّلین حملہ کے دور سے گزر رہا تھا کہ مارچ ۱۹۲۱ء کے آخر میں بمقام بجواڑہ آل انڈیا کانگریس کا جلسہ منعقد ہوا اور اُس نے آئندہ تین مہینوں کے لیے ایک لائحہ عمل مرتب کیا جس کی رو سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ ۳۰ جون ۱۹۲۱ء سے پہلے پہلے کانگریس

(۱) تلک سوراج فنڈ کے لیے ایک کروڑ روپیہ جمع کرے۔

(۲) ایک کروڑ ممبر بھرتی کرے اور

(۳) ملک میں بیس لاکھ چرخے چلانے کا انتظام کرے

"گورنمنٹ نے جبر و تشدد کی جو پالیسی اختیار کی ہے اور کمیٹی کی نظر میں صورتِ حال جس کی مقتضی نہ تھی اس کے پیشِ نظر بہت سے اراکین نے یہ خواہش ظاہر کی کہ سول نافرمانی شروع کر دینی چاہیے، مگر کمیٹی کی یہ رائے تھی کہ ملک ابھی فوری سول نافرمانی اختیار

کرنے کے لیے کافی طور پر منظم اور باقاعدہ تیار نہیں ہے اس لیے کمیٹی نے طے کیا کہ جن افراد کو حکم ملے وہ بہ رضا و رغبت اس کی تعمیل کریں اور اس اعتماد کا اظہار کیا کہ جو لوگ حکومت کی کارروائیوں کے باعث کام نہ کر پائیں گے اُن کی جگہ دوسرے لوگ آجائیں گے اور عوام خوف زدہ یا بددل نہ ہوں گے بلکہ خاموشی سے اپنے تنظیمی اور تعمیری کاموں میں مشغول رہیں گے ؛

ان رزولیوشنوں کی پوری اہمیت کا جائزہ لینے کے لیے ہمیں ترکِ موالات کے پروگرام کے اُن چار مرحلوں کی طرف رجوع کرنا چاہیے جن کو پہلے خلافت کمیٹی نے اختیار کیا اور پھر گاندھی جی نے ۵ مئی ۱۹۲۰ء کے ینگ انڈیا میں اُن کی توثیق فرمائی - ہر شخص یہ سمجھ سکتا تھا کہ جب کانگریس کمیٹی کو اپنی جدوجہد کے پہلے مرحلے میں کافی کامیابی ہو جائے گی تو پھر وہ ملک کو اگر چوتھے، نہیں تو کم از کم دوسرے اور تیسرے مرحلوں کو اختیار کرنے کی دعوت ضرور دے گی - اس لیے یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ کمیٹی نے مندرجۂ بالا ریزولیوشنوں کی تمہید کے سلسلے میں کونسلوں، عدالتوں اور اسکولوں کے مقاطعے میں قوم کی معقول ترقی پر کافی اظہارِ اطمینان کیا حالانکہ ان امور میں بھی ابھی بہت کچھ کرنا باقی تھا - بہرحال کمیٹی کو یا اپنے سہ گانہ مقاطعہ کی دعوت کا اعادہ کرنا چاہیے تھا یا پھر اور آگے بڑھ کر سول ملازموں اور پولیس اور فوج کو بھی سرکاری ملازمتیں چھوڑ دینے کی ہدایت کرنی چاہیے تھی، کمیٹی نے ان میں سے ایک بات بھی نہ کی اور اس نے گاندھی جی کی اعلیٰ ہدایت کے ماتحت اُس راہ سے ہٹ جانے کا فیصلہ کیا جو پہلے اختیار کی گئی تھی اور اس کے بجائے ممبروں کی بھرتی اور ہر گھر میں چرخا نصب کرانے کا انوکھا پروگرام اختیار کیا - حقیقتاً اس اقدام کے ذریعہ یہ ظاہر کرنا تھا کہ یہ قومی جنگ کے لیے آدمی، روپیہ اور سامانِ حرب کی فراہمی و تنظیم کا باعث ہوگا - گاندھی جی ابھی تک دسمبر ۱۹۲۱ء کے پہلے سوراج" کا راگ الاپے جا رہے تھے، اور ہر پلیٹ فارم پر جنگ کے نعرے بلند کرتے جا رہے تھے - حالانکہ اس نعمتِ غیر مترقبہ کے حصول کی معینہ میعاد میں اب صرف چھ مہینے باقی رہ گئے تھے مگر اسی ایک چیز یعنی فوری جنگ شروع کرنے کی دعوت کو نظرانداز کر کے ملک کو قصداً تمام ادھر اُدھر کے خرافات میں لگائے رکھنے کا تہیہ بھی کر چکے تھے -

اس کا سبب معلوم کرنے کے لیے دور جانے کی ضرورت نہیں - جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ گاندھی جی کے دماغ میں رفتہ رفتہ چرخے کی خاص اہمیت اُس وقت پیدا ہوئی تھی جب ۱۹۲۰ء کی ناکامیابی کے بعد انھوں نے سوراج کا پروگرام مرتب کیا تھا - اگر ملک میں لاکھوں چرخوں کے نصب کرنے سے سوراج حاصل کیا جانے کو تھا تو ظاہر ہے کہ اس کے لیے بہت بڑی رقم کی ضرورت تھی - گاندھی جی نے ایک پکے بنیا کے وجدانی تقاضہ کے بموجب یہ محسوس کیا کہ سیاسی جدوجہد میں اور آگے بڑھنے سے پہلے ایک کثیر رقم جمع کرنے کی اشد ضرورت ہے - ان کے چرخے کی افادیت کا فلسفہ کچھ بھی ہو مگر مجھے اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ انھوں نے وجدانی طور پر اس اشد ضرورت کو محسوس کر لیا کہ بڑے بڑے شہروں، قصبوں اور بڑے دیہاتوں میں ان کثیر التعداد غیر مطمئن نوجوان عورتوں اور مردوں کو چرخے جیسی کسی غیر مضرّت رساں سرگرمی میں مشغول رکھا جائے تاکہ یہ اُن کی قوتِ عمل کو جارحانہ اور مجاہدانہ رستوں پر لگنے سے روک سکے -

حقیقت یہ تھی کہ ایک خوابیدہ دیو گہرے خواب سے بیدار ہو رہا تھا اور گاندھی جی عہدِ قدیم کے شعبدہ باز کی طرح اُسے سیڑھیوں پر اُترنے چڑھنے میں مصروف رکھنا چاہتے تھے تاکہ وہ اُن کے پُرامن منصوبوں یا گورنمنٹ کی نفرت انگیز مشنری کو کوئی شدید ضرب پہنچا کر درہم برہم نہ کر سکے -

حکومت بہرحال اپنے ہر امکانی فعل سے عام غیظ و غضب کی آگ کو مشتعل کرتی رہی - پہلے ہندستان کے وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ نے اس تحریک کو یہ کہہ کر بے وقعت ثابت کرنا چاہا تھا کہ "یہ تمام احمقانہ اسکیموں میں سب سے زیادہ احمقانہ اسکیم ہے" مگر اب واقعات کی رفتار سے وہ اسے اور زیادہ سنجیدگی کی روشنی میں دیکھنے پر مجبور ہو گئے - کلکتہ کانگریس میں گاندھی جی کی اسکیم کے ایک زبردست اکثریت سے منظور ہو جانے کے بعد بھی حکومتِ ہند نے ۲۶ نومبر ۱۹۲۰ء کو اس مضمون کا ایک

سرکاری اعلان شائع کیا کہ اس نے "صوبائی حکومتوں کو ہدایت کردی ہے کہ وہ صرف اُن لوگوں کے خلاف کارروائی کریں جو اپنی تحریک کو بڑھانے میں اُن حدود سے باہر نکل گئے ہوں جنھیں اس تحریک کے منظم کرنے والوں نے پہلے متعین کیا تھا یا جنھوں نے پبلک کو تحریر یا تقریر کے ذریعے تشدد پر اُبھارا ہو یا پولیس اور فوج کی وفاداری میں رخنہ ڈالنے کی کوشش کی ہو"۔

بابو راجندر پرشاد لکھتے ہیں کہ "اس حدبندی پر عملاً کچھ نہیں کیا گیا اور مارچ کی شروع سے ملک کو ظلم وستم کے سیلاب میں ہو کر گزرنا پڑا جس کی معراج یہ تھی کہ نومبر دسمبر میں رضاکاروں کی انجمنیں بند کرادی گئیں "مجمع خلاف قانون" کا ضابطہ بھی نافذ کردیا گیا اور ہزارہا ہندستانیوں کو گرفتار اور قید کرلیا گیا۔ ظلم وستم کے اولین مظاہرے ترک مسکرات کی جدّ وجہد کے سلسلے میں ہوئے جب ملک میں ہز رائل ہائینس ڈیوک آف کناٹ مجلس قانون ساز کا افتتاح کرنے کی غرض سے ۸ رجنوری ۱۹۲۱ء کو ساحلِ مدراس پر اُترے تو کانگریس نے اُن کے بائیکاٹ کا اعلان کردیا تھا، حکومت کو یہ بھی بہت نفرت انگیز فعل معلوم ہوا۔ اور پھر اکالی تحریک ۱۹۲۱ء میں ناننکانہ (مقام) کی وحشت ناک ٹریجڈی کا ظہور ہوا اور قدرتاً اس سے گورنمنٹ کو قانون اور امن کے نام پر اپنی قوتوں کو بروئے کار لانے کا ایک عذر ہاتھ آگیا۔

حکومت کے ظلم وستم کے چڑھتے ہوئے سیلاب کو دیکھ کر کانگریس کے انتہا پسند (آزادی کے بارے میں) لیڈر کمیٹی سے ایسے شرائط کے ماتحت جنھیں یہ مناسب خیال کرے سول نافرمانی کی افتتاح کا اختیار مانگنے میں بالکل حق بجانب تھے۔ کمیٹی نے ملک میں تحریک کی ترقی پر پورا اطمینان ظاہر کرتے ہوئے قصداً اس قسم کی منظوری دینے سے انکار کردیا۔

اور اس طرح ایک بار پھر ملک کے جوشِ عمل کو شاہراہ سے ہٹا کر بے ضرر راستوں پر ڈال دینے کی کوشش کی گئی۔ واقعی بجواڑہ پروگرام کو ۳۰ رجون تک پورا کرنے کے لیے تمام جفاکش کارکن ملک بھر میں زبردست کوشش کر رہے تھے۔ گاندھی جی کے جوشِ عمل استقلال کہئے تو اتنا اور اضافہ کردوں کہ آخری لمحوں کی دردناک چبھتی ہوئی اپیلوں کا بھلا ہو کہ ۳۰ رجون کی رات تک ایک کروڑ روپیہ چندہ ہو جانے کا اعلان بھی ہوگیا۔

یہ عجیب بات ہے کہ گاندھی جی ایک کروڑ ممبروں کی بھرتی اور بیس لاکھ چرخے چلائے جانے پر اتنا زور دینا بھول گئے۔ درحقیقت ۳۰ رجون یا اُس کے بعد ممبروں اور چرخوں کی کوئی تعداد نہ شائع کی گئی اور سارا زور ایک کروڑ روپیہ جمع کرنے ہی پر دیا گیا۔ اور گاندھی جی کو بجواڑہ پروگرام کی معتدبہ تکمیل پر ملک کو تہِ دل سے مبارک باد دینے میں کچھ تکان نہ ہوا حالانکہ تین دفعات میں سے ابھی دو کے متعلق کوئی فیصلہ کن صورت ہی نہیں پیدا ہوئی۔

یہ سب کچھ ہوا مگر کسی نے اس مقدس انسان سے اس موقع پر قطعاً کوئی اعتراض نہیں کیا۔ سارے ملک میں ایک زبردست جذباتی ہیجان پھیلا ہوا تھا قوم رجال پرستی کے ایک زبردست بھنور میں پھنس گئی تھی۔ لوگ گاندھی جی کو ایک درویش اور خدا رسیدہ سیاست داں سمجھے جو قضا وقدر کو بھی مجبور کرکے دگوں پر آزادی کے من وسلویٰ کی بارش کرا سکتا ہے، تو پھر کیا عجب اگر ہزاروں مرد اور عورتیں اس زبردست سورما کا درشن کرنے کے لیے جمع ہو جاتے تھے۔ مہاتما جس گاڑی پر سفر کرتے وہ جدھر سے گزرتی آس پاس کے ہزارہا تماشائی ریلوے لائنوں اور اسٹیشنوں پر پھولوں اور روپیوں (اور لاتعداد موٹے بدقطع سوت کے ہار) کی شکل میں اپنے پریم کی بارش کرنے کی نیت سے کھڑے نظر آتے تھے"۔ (بابو راجندر پرشاد بسلسلۂ دیباچہ ینگ انڈیا)

عورتیں بھی قومی جوش کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے تحریک کی طرف ٹوٹ پڑیں۔ ان کے بڑے بڑے جلسے اس مہم کی ایک امتیازی خصوصیت کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور جب گاندھی جی ملک میں دورہ کرتے تو عورتیں اپنی عمر ہا عمر کی نقابیں اُتار کر ہزاروں کی تعداد میں اس "مقدس انسان" کے درشن کے لیے نکل آئیں اور تانبے چاندی کے سکوں کے علاوہ اپنے سونے اور جواہرات کے زیوروں کو جن میں موتی اور ہیرے ٹکے ہوتے اُن کے قدموں پر چڑھانے میں دریغ نہ کرتیں۔

ان سب چیزوں سے قوم کی اچھائی معلوم ہوتی تھی - مگر جیسے گاندھی جی نے قومی جوش کو "ذاتی شخصیت پرستی" اور چرخے کی بے ضرر سرگرمی کی راہوں کی طرف پھیرنے میں کامیابی حاصل کی، ویسے ہی اُنھوں نے ان جواہرات اور روپیوں کو مقدس چرخے کی قربان گاہ میں پھونک تاپ کر برابر بھی کر دیا اور جب تحریک کا خاتمہ ہو گیا تو روپیہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ اور زیادہ تر چرخے یا تو کوٹھوں یا کباڑ کوٹھریوں میں پھینک دئے گئے یا توڑ دیے گئے اور گھروں کے چولھوں میں جاڑے کی آگ کی ایندھن کی صورت میں جلا دیے گئے۔

سینتیسواں باب

ولبھ بھائی پٹیل سے ٹکر

مسٹر گاندھی آل انڈیا اسٹیج پر اپنا رزمیہ ڈرامہ کھیل رہے تھے کہ میری کانگریس پروگرام کی حد سے زیادہ پُرجوش ترجمانی کی وجہ سے میرے اور کانگریس کے نئے رہنماؤں اور اُن کی بڑی اکثریت کے درمیان ایک تکلیف دہ تصادم ہو گیا۔ اور تعلیمی بلکہ سیاسی حلقوں میں بھی اُن کے ساتھ میری مسلسل جنگ نے بہت جلد اُن کے اندر مجھے خود تحریک ہی سے باہر نکال دینے کی خواہش پیدا کر دی۔ میں اُن چند اولین نوجوانوں میں سے تھا جو گجرات میں کامل تعلیمی اور سیاسی کام کرنے کے خواہشمند تھے اور اُنھوں نے کام بھی کیا تھا۔ چوں کہ میں پہلی گجرات کانفرنس (سنہ ۱۹۱۶ء) کا علمبردار اور پہلی پولیٹکل کانفرنس (سنہ ۱۹۱۷ء) کے خاص کارکنوں میں سے تھا اِس لیے اُس وقت سے میں مستقل ایجوکیشنل اینڈ پولیٹکل لیگ کا جو احمد آباد میں قائم کی گئی تھی معتمدِ خاص تھا اور سال بھر اُس کی سرگرمیوں کو جاری رکھنے پر مامور تھا۔ میں نے سوشل رفارم ہال میں جس کے مقدر میں عنقریب ہی سیاسی سرگرمی کا تاریخی مرکز بننا لکھا تھا ایک کمرے کی صفائی کرا کے چھوٹی سی میز رکھ لی تھی۔ یہاں بھی جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں اگست سنہ ۱۹۲۰ء میں گجرات پولٹیکل کانفرنس کا جلسہ منعقد کرانے میں مجھے پیش قدمی کا قابل ناز شرف حاصل ہوا۔ اس جلسہ نے گاندھی جی کے پرامن ترک موالات کے سارے پروگرام کو منظور کر کے اُن کو بہت تقویت پہنچائی۔ اس وقت سے میں کمیٹی کا سکریٹری مقرر کیا گیا جس کے ذمے گجرات کے لیے نیشنل یونیورسٹی کا قائم کرنا تھا اور اسی طرح گجرات کانفرنس کی اسٹینڈنگ کمیٹی میں بھی معتمد کا منصب میرے سپرد کیا گیا۔ اُن بڑے بڑے تُرّم خانوں کی بہ نسبت جو اس تحریک کی یقینی کامیابی کے آثار دیکھ کر فوراً اس میں کود پڑے تھے میں صوبے کے حالات کے متعلق زیادہ وسیع تجربہ اور طویل خدمات کا دعوے دار ہو سکتا تھا میں نے اوروں کی بہ نسبت قریب قریب صوبہ کے ہر شہر اور گانوں میں سفر بھی زیادہ کیا تھا، اور ہر سرگرم فرد سے میرا ذاتی اور تنظیمی تعلق اس سے وسیع تر پیمانے پر تھا جتنے کا کوئی دوسرا ساتھی یا بمقابل بشمول گاندھی جی دعویٰ کر سکتا تھا۔

چناں چہ سنہ ۱۹۱۹ء کے اوائل میں ولبھ بھائی کی شرکت میں مجھ پر گجرات پراونشل کمیٹی کا نیا دستور مرتب کرنے کی ذمہ داری عائد کی گئی، یہ کہنا مناسب ہوگا کہ مسٹر ولبھ بھائی اُس پر حسب معمول اپنے مختصر الفاظ میں صاد کر دیتے جو میں اُن کے زیادہ تجربہ کار بھائی مسٹر وٹھل بھائی پٹیل کے لائق مشورے اور رہبری کی مدد سے مرتب کرتا۔ لہٰذا گاندھی جی کو میری سفارش کرنے

میں کوئی دشواری نہ ہوئی اور انھوں نے کہہ دیا کہ نئی کمیٹی میں سکریٹری کی جگہ پر مقرر کیے جانے کے لیے یہ شخص سب سے زیادہ موزوں ہے اور ساتھ ہی ساتھ انھوں نے ادارے کے صدر اور حقیقی لیڈر کی حیثیت سے ولبھ بھائی پٹیل کا نام لیا۔ اس وقت کبھی میرے خواب وخیال میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ انتہائی برادرانہ اور محبت آمیز طریقے پر مسٹر پٹیل سے تعاون کرنے میں مجھے کوئی دشواری پیش آسکتی ہے۔ اس لیے کہ احمد آباد کی مجلس امداد قحط زدگان کے شریک معتمد کی حیثیت سے میں نے اُن کے ساتھ نہایت شیر وشکر ہو کر کام کیا تھا، میرے بعض کاموں کے متعلق جنھیں میں نے بڑی مستعدی سے انجام دیا تھا۔ احمد آباد کے بعض لکھ پتیوں کا خیال تھا کہ وہ بے سود تھے اور اس بنا پر انھیں بہت شدید اعتراضات تھے۔ ان کے مقابلے میں مسٹر پٹیل نے میری پر زور حمایت کی تھی میں نے ولبھ بھائی کے مکان کو اکثر اپنا مکان بنایا تھا اور میں جب ان کے ساتھ ان کے مکان میں نہیں رہتا تھا۔ تب بھی میں نے اُن کے ہمراہ بہت زیادہ ذاتی محبت اور سیاسی ہم آہنگی پیدا کر لی تھی۔ غرض کہ میں نے اس نئے ادارے میں بہت امید و مسرت کے جذبہ کے ساتھ کام کرنا شروع کیا اور اس وقت میں نے خیال کیا کہ میں اپنے صوبے اور سارے ہندستان کے لیے ایک سب سے زیادہ ممتاز رفاقت میں سوراج حاصل کرنے چلا ہوں۔

ہمیں تحریک کی کامیابی ہی کے باعث بعض عجیب وغریب ساتھیوں سے سابقہ پڑا۔ مثلاً پر دپرائٹری اسکول احمد آباد کو قومی اسکول بنانے کے سلسلہ میں مسٹر ٹھاکر اور مسٹر دیوان نئی تعلیمی اور سیاسی تحریک کے حلقے میں شامل ہو گئے انکی حب الوطنی اور ان کی نیت کی پاکیزگی ہر شبہ سے بالاتر سہی مگر اُن کی بصیرت اور بالغ نظری پر یقیناً بہت کچھ اعتراضات کیئے جا سکتے ہیں۔ اُن کے داخلے کے نتائج بہت جلد رونما ہونے لگے۔ اُن کی ایثار کی نمایاں اہمیت اور ان کی بلند معاشرتی اور رتبا اور اضافہ کروں گا مالی حیثیت نے بہت جلد انھیں ولبھ بھائی پٹیل کے اتحادیوں میں شامل کر دیا اور اُن کی محبت اور اعتماد کا جو بلند مقام مجھے اس وقت تک حاصل تھا اس سے مجھے برطرف کر دیا۔ گاندھی جی نے اسکولوں کو چرخہ کاتنے کے اداروں میں تبدیل کرنے کے جو نئے احکام صادر فرمائے تھے ابھی میں انھیں کے باعث ایک شدید خلجان اور کوفت میں مبتلا تھا کہ یہ باثر "ارباب ثلاثہ" میرے ان تمام رنگین خوابوں کو درہم برہم کرنے کے لیے جو میں غریبوں اور اچھوتوں کی خدمت اور گجرات کے دور دراز دیہاتوں کی ظلمت و تاریکی دور کرنے کے متعلق دیکھ رہا تھا ایک آہنی دیوار بن کر سامنے آ گئے۔

بجواڑے کا پروگرام مارچ کے آخر میں منظور کیا گیا تھا اور ہم گجرات والوں سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ جتنی زیادہ تعداد میں ہو سکے ہم ممبر بنائیں اور چرخوں کی تعداد بڑھائیں اس وقت مجھے یہ یاد نہیں کہ ان دونوں موقوں پر کتنی تعداد مقرر کی گئی تھی، ہم کو یہ بھی حکم دیا گیا کہ ملک سوراج فنڈ میں اپنے حصۂ رسدی کے طور پر اپنے صوبے سے پندرہ لاکھ روپیہ جمع کریں۔ اپریل ۱۹۲۱ء کے آغاز سے ہمارے دفتر میں ہر طرف سے خوب روپیہ آنے لگا۔ صوبہ کے بعض اور ضلع کے تمام کارکنوں نے زیادہ سے زیادہ چندہ فراہم کرنے کے لیے بڑی جان توڑ کوششیں کیں، نتیجہ یہ ہوا کہ اپریل کے آخر اور مئی کے شروع میں روپیوں کی مسلسل بارش ہونے لگی۔ عام جوش و خروش بہت بڑھا ہوا تھا۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ گاندھی جی کے گجرات کا کام رہ جائے۔ وہ گجرات جس کے بنیوں اور جینوں کی دولت وسخاوت کا سارے ملک میں شہرہ ہے۔ نتیجہ ہمارے توقعات سے کہیں زیادہ تھا اس لیے کہ روپیہ صرف گجرات کے سرکاری صوبہ ہی سے نہیں آیا بلکہ کاٹھیاوار کے ریاستوں سے بھی، بلکہ مدراس، کلکتہ، عدن افریقہ برما اور لندن ایسے دور دراز مقامات میں رہنے والے اہل گجرات نے بھی روپئے بھیجے۔

ہمارے نئے رفیقوں کی طرح ہماری نئی دولت بھی مشکلات کا ایک ہجوم ساتھ لائی۔ ایک رات میں راہبانہ حب الوطنی کی ویران درگاہ دولت سے بھرپور مندر کی شکل میں تبدیل ہوگئی۔ ایسی حالت میں کیا تعجب اگر اس سونے اور جواہرات سے مرصع مندر پر کسی سرپھرے پروہت نے قبضہ جما کر غریبوں اور مسکینوں کی خدمت میں دولت صرف کرنے کے بجائے خیالی دیوتاؤں اور توہمانہ رسومات پر بیدریغ روپیہ خرچ کرنا شروع کر دیا ہو۔

میں زیادہ تر اپنے تنظیمی اور گشتی کام میں مصروف تھا اور میرا وقت احمد آباد کے دفتر اور صوبائی مرکزوں میں بٹا ہوا تھا کہ سونے کے اس نئے دریا نے مجھے ایک عجیب حیرت میں ڈال دیا۔ میں نے دیکھا کہ..........
.... وسطِ اپریل سے ہمارے صدر مسٹر ولبھ بھائی پٹیل روزانہ ٹھیک وقت پر دفتر آنے لگے اور وہ روپیہ جمع کرنے لگے جو چاروں طرف سے آرہا تھا۔ یہ بات نہ تھی کہ ہم نے اس سے پہلے دفتر میں اتنے روپے نہ دیکھے تھے بلکہ ہم نے سنہ ۱۹۱۹ء میں امداد قحط زدگان فنڈ کے لیے لاکھوں روپے جمع کیے تھے اور غلّہ اور گھاس کی جو مقدار ہم نے جمع کی تھی اس کی قیمت ہی لاکھوں روپیوں تک پہنچتی تھی۔ گو ہماری اس نئی سیاسی تحریک میں ہمارے ساتھ تعاون کرنے کے لیے کوئی لکھپتی نہ تھا مگر میرے دوست اور شریک معتمد مسٹر جی۔ وی۔ مالا وانکر معتمد مالیات کی انتہائی مشکل ذمہ داری کا بار اٹھانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ اس لیے اپنے قیلولے کا وقت قربان کر کے دفتر کے میز پر چاندی کے سکے، نوٹ اور چیک جمع کرنے میں مسٹر ولبھ بھائی پٹیل کا یہ تازہ انہماک دیکھ کر مجھے واقعی بہت تعجب ہوا۔ انھیں تعلیمی دنیا کے جو نئے رفقائے کار مل گیے تھے وہ سہ پہر اور شام کو اُن کی میز کے اردگرد بیٹھ کر کانگریس کے خزانے کو معمور کرنے میں اُن کی مدد کیا کرتے تھے اور ادِھر میں عوام کی حقیقی ضروریات معلوم کرنے اور ان کی ترقی اور تسکین دہی کے لیے نئے ادارے قایم کرنے کی غرض سے دور دور مقامات پر دورے میں منہمک رہا کرتا تھا۔

اُدھر میرے دوست اس نئی فصل کو کاٹ کر خوشی اور غرور سے دیوانے ہو رہے تھے اور ادھر مجھے اس صوبے کے اکثر زرعی علاقوں سے قحط کی نہایت افسوسناک اطلاعیں موصول ہو رہی تھیں۔ مجھے اس وقت تک گجرات کے مختلف اضلاع میں اپنے دوست گدوانی کی مدد سے تیس یا چالیس رضاکار مقرر کرنے میں کامیابی ہوگئی تھی۔ وہ اپنے اپنے حلقوں کے حالات سے مجھے اطلاع دیتے رہتے تھے مگر زیادہ دور دراز اور پس ماندہ حلقوں کی اچھی خدمت نہیں ہو رہی تھی اور یہی ایسے علاقے تھے جن کے متعلق مجھے بہت فکر رہتی تھی۔ میں اپنے "سارے گجرات کی تنظیم" کے خواب کو ایک زندہ حقیقت بنانا چاہتا تھا اس لیے میں نے ہر ضلع کے انتہائی دور دراز اور بہت پس ماندہ تعلقوں، مثلاً گوگا واقع ضلع احمد آباد، داگرا ضلع بروچ اور جھلود واقع پانچ محل کے مقامی کارکنوں سے گہرے اور ذاتی تعلقات قائم کرنے میں ہر قسم کی تکلیف گوارا کی اس کے علاوہ دیانت دار مراسلہ نگار اور دیہاتوں کے مظلوم باشندے اپنے مقدمات اور مظالم کی اطلاعیں کانگریس کی ایجنسی کے علاقوں سے مجھے برابر دیتے رہتے تھے۔ ان تمام ذرائع سے حاصل شدہ اطلاعات، نیز میرے ذاتی مشاہدہ نے مجھے پانچ محل اور نئی کتھا ایجنسی کے علاقوں میں افلاس اور فاقہ کشی کی حالت کا کامل یقین دلا دیا۔ میں نے سوچا کہ نئی کانگریس چونکہ ملک کی نئی قومی حکومت کی حیثیت رکھتی ہے لہٰذا اُسے گاندھی جی کے بنیادی اصولوں کے مطابق لوگوں کی خدمت کرنی چاہیئے۔ لہٰذا میں قحط زدہ علاقوں کی امداد کے لیے روپیہ کے واسطے کانگریس کی مجلس منتظمہ کے صدر مقام پر پہونچا۔

مجھے اپنی پہلی تباہ کن نا امیدی سے سابقہ پڑنا تھا۔ میں نے غریبوں کے لیے بھیک مانگی جس کا حشر یہ ہوا کہ دولت کے محافظوں نے میری درخواست ٹھکرا دی۔ میں نے احتجاج کیا! ترغیب دی! بحث کی! لیکن یہ سب بیکار ہوگیا۔ میں

نے عظیم الشان مہاتما کے نام پر وکالت کی کہ ایسی حالت میں جب کہ کانگریس نے لوگوں کو ان کی مصیبت میں گورنمنٹ ایجنسی کی امداد طلب کرنے کی ممانعت کر دی ہے تو اس پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ لوگوں کی نمایاں تکالیف مثلاً سیلاب اور قحط کی مصیبتوں میں ان کی امداد کرے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس اصول ہی کو تسلیم نہیں کرتے یا انھوں نے مجھے تخیل پرست اور خبطی خیال کیا اس لیے کہ میں نے وہ روپیہ طلب کرنا چاہا جو لوگوں سے کثیر تعداد میں محض اس لیے جمع کیا جاتا تھا کہ ایسے لوگوں پر خرچ کیا جائے جو اُن میں سب سے زیادہ ضرورت مند ہیں۔ انھوں نے اپنے کو بہت ہوشیار اور باعمل خیال کیا۔ جب انھوں نے حکومت والا طرز بیان اختیار کر کے مجھے جواب دیا کہ کانگریس کا روپیہ سختی کے ساتھ صرف اُن مقاصد کی ترقی کے لیے استعمال کیا جائے گا جن کا تذکرہ کانگریس کے ریزولیشن میں ہے۔ میں نے اس رویہ پر نہایت افسردگی و بےکسی محسوس کی۔ یہ پہلا مرتبہ تھا کہ میں نے دراصل یہ محسوس کیا کہ میں اُس مندر میں جس کے بنانے میں میں نے اتنی جانفشانی سے مدد دی تھی محض ایک اجنبی کی حیثیت رکھتا ہوں۔ میں انتہائی افسردگی و بےبسی کے عالم میں ان آدمیوں کے سامنے کھڑا رہا جنھیں اس نئی تنظیم میں اختیارات حاصل ہو گیے تھے اور جو ابھی وطن دوستی کے میدان میں محض نووارد تھے۔ یہ وہی لوگ تھے جو ابھی چند ماہ پہلے تک روپیوں کے ڈھیر کمانے اور تعیش کی زندگی بسر کرنے میں مصروف تھے اور میں اپنے صوبہ کے دیہاتوں میں مسلسل دورے کرتا رہتا تھا۔

واقعی مجھے تعجب ہے کہ یہ بات کیسے ہوئی۔ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ آخر یہ کیوں کر ممکن ہوا کہ میں اپنے صدر مسٹر پٹیل کو گجرات کے قحط زدہ علاقوں کے پریشان حال کسانوں کی مدد کرنے کے لیے چند ہزار روپیوں کی بھی منظوری دینے پر بھی آمادہ نہ کر سکا حالانکہ انھیں میری قوتِ فیصلہ اور اخلاص پر اس قدر اعتماد تھا کہ وہ چند ہی سال پیشتر انسانی ہمدردی کے متعدد مقاصد کے لیے ہزاروں روپئے خرچ کرتے تھے اور میرا ساتھ دیتے تھے۔

ظاہر ہے کہ ہم دونوں کے درمیان ایک نئی دیوار کھڑی کر دی گئی تھی۔ گاندھی جی کا اور اس عظیم الشان سیاسی تحریک میں ان کے پروپیگنڈے کا بھلا ہو کہ کانگریس کے میز پر برستے ہوئے روپئے جمع کرتے کرتے تنگ نظر اور محدود خیال مشیر کاروں کی جو ان کے نئے دوستوں میں سے تھے، متاثر ہوتے ہوئے اور صدر مقام میں مہادیوتا کی طرح بالکل ساکن ہو کر بیٹھے رہنے سے وہ روزافزوں ترقی کے ساتھ ضابطہ پرست اور مرکزیت پسند قوت بنتے جاتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ان کے سر پر مہاتما کی طرف سے عوام کے خزانوں کی نگہبانی کی شدید ذمہ داری ہے۔ اگرچہ میری تمام پبلک اور سیاسی سرگرمیوں کا صدر مقام احمد آباد ہی تھا مگر جبلی طور پر میری طبیعت مرکز سے گریز کرنے کا رجحان ظاہر کرتی تھی اور میں تمام ضلع والوں دیہات والوں اور مزدوروں کی جماعت کی ضروریات نقطۂ خیال اور جذبات کا گہرا اثر قبول کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

اُدھر تو یہ نوزائیدہ ضابطہ پرست یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ ہندستان کے لوگ ممبری کا چندہ اور تلک سوراج فنڈ کے لیے عطیے دے کر اور اس طرح مرکز کو مالی حیثیت سے مضبوط کر کے مطمئن ہو بیٹھیں گے ادھر میں تہیہ کر چکا تھا کہ جیسے ہی یہ رقم جمع ہو جائے اسے عوام کی جائز ذہنی اور مادی ضروریات کے رفع کرنے کے لیے صرف کیا جائے گا۔ کیوں کہ گاندھی جی کہہ ہی چکے تھے کہ اداروں کو باقی رکھنے کے لیے بڑے بڑے مستقل فنڈ رحمت سے زیادہ زحمت ہوتے ہیں، انھیں عوام کے سالانہ چندوں پر گزر کرنا چاہئے تاکہ یہ ادارے لوگوں کی ضروریات کے پوری طرح ذمہ دار بن سکیں۔

گاندھی جی دور دور دورہ کر رہے تھے اضلاع کے بہت سے کارکن میری تائید میں تھے لیکن میں مرکز میں اپنے آپ کو اقلیت میں پاتا تھا۔ اس وقت پہلی مرتبہ مجھ پر وہ چیز روشن ہوئی جس کا دھندلا سا خیال گذشتہ چند دنوں سے میرے دماغ میں پیدا ہو رہا تھا یعنی یہ کہ میں اُس طرف بڑھ رہا ہوں جہاں سے ہمارے راستے جدا ہوتے ہیں۔

ابھی کسی فیصلہ کن افتراق کا وقت نہیں آیا تھا کیوں کہ نسبتاً چھوٹے چھوٹے علاقوں کی مصیبت رفع کرنے کے لیے جتنی رقم کی فوری ضرورت تھی وہ کچھ زیادہ نہ تھی۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے اس مسئلے پر بحث وتمحیص کی، انھوں نے مجھے بحیثیت سکریٹری پراونشل کمیٹی اس امر کی اجازت دینے پر رضامندی ظاہر کی کہ میں ان متاثر علاقوں کی امداد کے لیے خاص چندہ طلب کروں۔ اس چندے کی پکار پر اُسی وقت فیاضی سے لبیک کہا گیا۔ میں نے بھی اپنی مشنری کو متحرک کرنے میں کوئی تاخیر نہیں کی۔ فوراً دوبارہ کے اپنے پرانے دوستوں سے رسم وراہ پیدا کی اور ریلوے اسٹیشن سے بیس بیس اور تیس تیس میل دور رہنے والے بھیلوں کو مدد پہنچانے کے دشوار کام کے لیے اُن کے پاس روپئے اور رضاکار روانہ کیے۔ ان ایام میں میرے پاس چاروں طرف سے رضاکار ٹوٹے پڑ رہے تھے، پندرہ بیس سال کے الھڑ نوجوان میٹرک فیل، اچھے اچھے تاجروں کے لڑکے جو حب الوطنی کے جوش میں گھروں سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ ایسے نوجوان جنھیں تعلیم یا محبت میں ناکامی ہوئی تھی سب کے سب احمد آباد کے صدر مقام میں جمع ہونے لگے۔ میرے قبضے میں جو رقم تھی اس میں سے صرف اتنا پیسہ جوان کی منزل مقصود تک کے لیے تیسرے درجے کے ٹکٹ کا کفیل ہو سکے اور ایک مختصر تحریر دے کر میں انھیں گجرات کے دورترین حصوں میں بھیجتا چلا گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت مسرت وتعجب ہوتا تھا کہ یہ نوجوان اپنے بدنصیب ملک کی خدمت کے لیے ان قصبوں اور دیہاتوں کی طرف کس پُرجوش آمادگی کے ساتھ بھاگے چلے جا رہے ہیں جن کے متعلق انھیں پہلے سے کوئی علم بھی نہیں۔ مجھے تقریباً اسّی سے سو رضاکاروں تک کی نقل وحرکت اور سرگرمیوں کی ہدایت ونگرانی کرنی پڑی جو سارے صوبے کے اندر بسلسلۂ قحط اور سیاسی کاموں میں مشغول تھے عین اس وقت جب کہ مئی ۱۹۲۱ء کے آخر میں بمقام بروچ ہماری صوبائی کانفرنس ہو رہی تھی

اگرچہ اس دوران میں مجھے اپنے رفیقوں کی طرف سے کوئی خاص زحمت پیش نہیں آئی تاہم کسی کسی موقع پر یہ دقتیں نمودار ہو ہی جاتی تھیں۔ خصوصاً اس وقت جب وہ اس رقم کو بھی داب لینے کی کوشش کرتے تھے جو قحط کے لیے مخصوص کر دی گئی تھی لیکن یہ صورت تھوڑے ہی دن رہی۔ آخر میں انھوں نے بادل ناخواستہ اور بہت کچھ ناک بھوں چڑھا کر یہ رقم دے دی۔ کانگریس کا جلسہ وقت معین پر منعقد ہوا۔ مسٹر گاندھی، مولانا محمد علی اور مسز سروجنی نائیڈو نے جلسہ کو رونق بخشی۔ میں نے آخر مرتبہ ریزولیشنوں کے اُن مسودوں کے مرتب کی حیثیت سے کام کیا جو بجواڑے کے قومی پروگرام سے بالکل مطابقت رکھتے تھے۔ اس مرتبہ بھی میرا خاص کام یہ تھا کہ میں نے ایک پُرزور اپیل کی کہ نوجوانوں کو قوم کی خدمت کے لیے اپنے کو رضاکارانہ طور پر پیش کرنے کی دعوت دی جائے یہ سب بغیر کسی رکاوٹ کے منظور ہو گیا اور میں اس کامل اعتماد کے ساتھ احمد آباد واپس آیا کہ ہم کانگریس اور قوم کی خدمت کے لیے دیہات کے علاقوں کو رضاکاروں سے اس طرح بھر دیں کہ اس سے پہلے ایسا کبھی نہ ہوا ہو۔

اگر مجھے صحیح یاد ہے تو کانفرنس سے پہلے اپنے ایک سفر کے دوران میں بروچ سے میں نے نیشنل یونیورسٹی سینٹ کی رکنیت سے اپنے استعفا کا خط بھیجا تھا۔ اگرچہ اس خط پر بعد کے ایک جلسے میں جس وقت بغل ہی کے ایک کمرے میں میں بھی بیٹھا کام کر رہا تھا غور کیا گیا مگر سینٹ کے بہت سے ارکان اس بات سے خوش تھے کہ انھیں ایک ایسے کارکن سے چھٹکارا مل گیا جس کو اُن کی پسندیدہ حکمت عملیوں سے کوئی لگاؤ نہ تھا اور جو ہمیشہ کتنی ہی چھوٹی سہی ایک اقلیت کی تائید کے ساتھ ان کی آرام دہ عصبیت کے پُرامن کبوتر خانوں سے انھیں باہر لانے اور دق کرنے پر تلا رہتا تھا۔

اڑتیسواں باب

میرا استعفا

نیشنل یونیورسٹی کے سنیٹ سے میرا استعفا درحقیقت میرے انجام کار کا آغاز تھا۔ میرے اختلافات نے بہت جلد وسیع ہو کر ایک خلیج فارق کی صورت اختیار کرلی۔

مجھ سے پھر یہ حماقت ہوئی کہ میں نے کانگریس پروگرام کو ایک عملی اور حد سے زیادہ پُرجوش اسپرٹ کے ساتھ پھر اختیار کرلیا۔ کانگریس نے ناگپور کے اجلاس میں ہندو سوسائٹی کے دامن سے چھوت چھات کا داغ دور کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ گاندھی جی صبح، دوپہر شام اس وعظ میں مصروف رہتے کہ سوراج کا حاصل ہونا اس وقت تک بالکل محال ہے جب تک ذات والے ہندو اپنے چھ سات کروڑ ہندو بھائیوں اور بہنوں کو دلدرا اور بے ذات سمجھتے رہیں گے۔ اگرچہ ان کے طوفانی پروپیگنڈے کا اثر ہماری سوسائٹی کی ہر صف پر پڑ رہا تھا۔ لیکن یہ امر مجھ پر روشن تھا کہ اچھوت جماعتوں کی تعلیمی اور معاشرتی حیثیت کو بلند کرنے کے لیے عملی اور پُرمشقت کارروائیوں کا خاکہ تیار کرنے کی ضرورت تھی۔ مجھے بآسانی اس کا یقین ہو گیا کہ وہ روپیہ جو ہم چاروں طرف سے جمع کر رہے تھے اس میں سے کچھ بہ تقاضائے شرافت اپنے بدقسمت بھائیوں کی حالت سدھارنے کے لیے صرف کرنا ہمارا فرض ہے اس زمانے میں جو عاجلانہ فیصلے اور فوری عمل کی روح سارے ملک میں کارفرما تھی اس سے متاثر ہو کر میں نے اپنے ساتھیوں کے سامنے اچھوت طبقوں، پست اقوام (مثلاً دھارال اور کالی پراج) اور پانچ محل کے بھیلوں کے بچوں کے لیے کچھ دارالاقامے قائم کرانے کی غرض سے ایک معتدل اسکیم پیش کی۔

ایسا بھی نہیں تھا کہ میں اس کام کے لیے بالکل اہل نہ تھا کیوں کہ قحط کے کام میں کچھ نہ کچھ تجربہ کار بھی تھا۔ بمقام گودھرا گجرات پولیٹیکل کانفرنس کا جو پہلا اجلاس منعقد ہوا تھا اس میں اچھوت طبقوں کے لیے ایک مدرسہ قائم کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ اور وہ منظور بھی ہو گئی تھی۔ گو اس ادارے کی تنظیم سے میرا کوئی تعلق نہ تھا مگر سابقہ نظیر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے اس کے دوسرے اجلاس میں جو ۱۹۱۶ء بمقام ندیاد منعقد ہوا تھا اسی طرح کے مقصد کے لیے چندہ جمع کرنے کی اپیل کی تھی بمبئی اور احمد آباد کے بعض دولت مند دوستوں نے بڑی فیاضی سے چندے دیئے اور یہ فنڈ میرے حوالے کر دیا گیا اور وہ اسکول جو میں نے اس وقت اپنے شہر میں قائم کیا تھا اس نے ۱۹۲۱ء تک قابل اطمینان ترقی کرلی تھی۔ گجرات کے اضلاع میں جو بنیادیں قائم کی گئی تھیں اُن پر میں نے تعمیر کی کوشش کی۔ دوہاد اور جھالرو کے فاقہ کش بھیلوں کے لیے وقتاً فوقتاً جو میں نے امدادی کام کیا تھا اُس سے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ انہیں قدرت کی عام تباہ کاریوں اور حکام کے پنجۂ ظلم سے بچانا اور فی الحقیقت انھیں سدھارنا ہے تو اس علاقے میں چند مستقل نوآبادیوں کی اشد ضرورت ہے مجھے کیریا، احمد آباد اور سورت کے اضلاع کے مسلسل دوروں نے یہ باور کرا دیا تھا کہ اُن لوگوں میں جنھیں یا تو انتہائی افلاس نے بدامنی پھیلانے پر مجبور کر دیا تھا یا شخصی غلامی کے پست ترین گڑھے میں پھینک دیا تھا اگر فلاح و ترقی کی کوئی تحریک چلانی ہے تو ان پس ماندہ حلقوں میں دارالاقامے قایم کرنے کی ضرورت ہے۔

لیکن میرے کانگریسی رفقا مجھ سے اس قدر برہم تھے کہ اُن کو میری تجاویز کے سننے کی بھی تاب نہیں تھی۔ وہ میرے مجنونانہ منصوبوں کی لغویت پر بے حد جھنجھلائے ہوئے تھے مگر بظاہر ایک حق پسندانہ احتجاج کا انداز اختیار کیے ہوئے تھے۔ یہ بات بھی اُن کی سمجھ میں نہ آسکی تھی کہ میری طرح کا ایک تجربہ کار اور ذمہ دار افسر ایسے زمانے میں جب کہ قوم ایک بے مثال سیاسی ایجی ٹیشن میں مبتلا تھی پندرہ لاکھ کی جمع شدہ رقم میں سے ایک ایسے کام کو چلانے کی غرض سے جو اُن کے خیال میں معاشرتی اور انسانی خدمت کی حیثیت رکھتا تھا دس بیس ہزار کی ایک چھوٹی سی رقم خرچ کرنے کا بھی مشورہ دے سکتا ہے۔ وہ لوگ ذلیل قسم کی منطقی موشگافیوں پر اتر آئے۔ اس کا تو انھیں اعتراف تھا کہ ہم نے چھوت چھات کی پابندی دور کرنے کا ذمہ لیا ہے مگر وہ نہایت سنجیدگی سے یہ سمجھتے رہے کہ ہمیں اِس مقصد کیلئے صرف اتنا کرنا ہے کہ ہم لوگوں کو برابر یہ مشورہ دیتے رہیں کہ وہ اچھوتوں کو اپنا بھائی سمجھیں اور انھیں اپنے مدرسوں، مکانوں اور مندروں میں بھی داخلے کی اجازت دیں۔ مختصر یہ کہ انھوں نے یہ خیال کیا کہ اس موضوع پر کچھ چھوٹے چھوٹے رسالے چھاپ کر اور کچھ تقریریں کر کے اپنے ضمیر کو مطمئن کرلیں گے۔ مگر جب اُن بڑی بڑی رقموں میں سے ایک پائی بھی خرچ کرنے کا معاملہ پڑتا جو وہ اس لیے عوام سے دن رات جمع کرتے تھے کہ اُن کے سب سے زیادہ مصیبت زدہ طبقے پر خرچ کریں گے تو کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے اور اُن پر عجب سراسیگی طاری ہو جاتی تھی۔

میں وہاں سے مغموم و مایوس لوٹ آیا۔ مغموم اپنے ناز کے پالے ہوئے خوابوں کے قبل از وقت سپرد خاک ہو جانے پر اور مایوس کانگریس کی تنظیم اور تحریک کے مستقبل سے۔ لیکن میں چپ چاپ شکست قبول کرنے والا آدمی نہ تھا۔ میں اس چیز کے کرنے کا عزم کر چکا تھا جس کا نقشہ میں نے بنایا تھا۔ نئی کانگریس کمیٹی کے وجود میں آنے سے پہلے اور نئے لیڈروں کے دوڑ کر قومی جھنڈے کے نیچے اکٹھا ہونے سے قبل ہی میں بہت سے اداروں کی بنیاد رکھ چکا تھا اس لیے میں نے اپنے ہی بل بوتے پر اپنے محبوب اداروں کی تعمیر کا فیصلہ کرلیا۔ میں نے اُسی وقت مسٹر بینکر اور آنسویابن سے اس کے متعلق گفتگو کی۔ ان سے میرے دوستانہ تعلقات تھے اور یہ لوگ مسٹر پٹیل اور ان کے نئے رفقار کار سے بدظن تھے۔ انھوں نے میرے منصوبے کو سنتے ہی خود بخود پانچ ہزار روپیہ اس کام کو چلانے کے لیے میرے حوالے کیے۔ کیوں کہ ان کو اس بات کا یقین تھا کہ گاندھی جی کو اپنے خزانوں کے ضدی امینوں کو اس رقم کی پائی پائی ادا کرنے پر مجبور کرنا پڑے گا جو میں اس قابل تعریف مقصد میں صرف کروں گا۔ میں نے فوراً اپنا آزاد دفتر قایم کرنا شروع کر دیا اور منتخب مقامات پر نئے مدرسوں کی پہلی قسط قایم کرنے کے لیے لائق اساتذہ کی تلاش کرنے لگا۔

میری قریب الوقوع علحدگی کی خبر پر احمد آباد کے ہمارے بڑے بڑے کارکنوں کے حلقے میں چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ پرنسپل گدوانی کو اس کے متعلق سب سے زیادہ فکر پیدا ہوئی۔ اس لیے میرے ساتھیوں سے میرے اختلافات دور کرنے کے لیے انھوں نے اپنی سی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر انھوں نے بیشتر سربرآوردہ تعلیمی اور سیاسی کارکنوں کے نام ایک گشتی مراسلہ جاری کر کے انھیں نیشنل کالج کے ایک چھوٹے سے جلسے میں مدعو کیا۔ ہم سب تاریخ معینہ پر جمع ہوئے۔ مجھے فوراً معلوم ہو گیا کہ اچھے پرنسپل صاحب نے نادانستہ طور پر گاندھی جی کے آشرم کے "ماہران تعلیم" کی تائید سے ہمارے صاحب اختیار رفقار کے بازوؤں کو اور مضبوط کرنے کا سامان کرلیا تھا۔ کیوں کہ پس ماندہ اقوام کے لیے مدرسے اور دار لاقامے قایم کرنے کی میری اسکیم ہی بحث کا مرکز بنی رہی۔ میرے ساتھی ابھی مالی بنیادوں پر اعتراضات کر رہے تھے کہ اُن کی مدد میں گاندھی جی کے "ماہر" ایسے اداروں میں کام کرنے کے لیے مخلص اور لائق اساتذہ اور کارکنوں کی کمی پر قیمتی دلائل پیش کرنے لگے۔ مجھے اتنا اشارہ کرنا ہے کہ ان "ماہر" دوستوں میں سے کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے نجی طور پر خود مجھ سے اس قسم کے مدرسوں کے قائم کیے جانے کی ضرورت پر گفتگو کی تھی اور اب جس کے خلاف وہ عذر لنگ تراشنے کے لیے دماغ سوزی کر رہے تھے۔ میں نے اپنی طرف سے اپنے معاملے کو پوری وضاحت سے بیان کر دیا۔ میرا مطلب تو یہ تھا کہ میں فریق مخالف کے منصوبوں کو اچھی طرح سے باتوں باتوں

میں دریافت کرلوں ہیں اس کا مشاہدہ کرنے کے لیے بے چین تھا کہ میرے بتائے ہوئے سمت کی طرف یہ لوگ کوئی قدم ہلکا اور رک رک کر سہی، اٹھانے پر آمادہ نہیں یہ دیکھ کر میں حد سے زیادہ پریشان اور شرمندہ ہوا کہ سیاسی رہنما اور یہ مقدس "ماہرین" اس لاکھوں کی رقم سے جو لوگوں سے غریبوں اور مصیبت زدوں کی حاجت روائی کے لیے جمع کی گئی تھی ایک پائی بھی صرف نہ کرنے کے نامعقول رویہ پر آپس میں بالکل متفق ہیں! آخر کار میں اٹھ کھڑا ہوا اور جب میں دروازے کی طرف چلا تو مسٹر ولبھ بھائی پٹیل نے مجھے پکارا۔ "ہاں تو آپ ہم سے اتفاق کرتے ہیں"؟

"میں نے جواب دیا" ہاں "مجھے اتفاق ہے کہ آپ اس معاملے میں اپنی جگہ سے ایک انچ بھی ہٹنے پر آمادہ نہیں، مگر......

"مسٹر پٹیل نے دریافت کیا تو کیا کوئی "مگر" بھی ہے؟" میں نے کہا بیشک "" اس لیے کہ اپنے منصوبے اور کام کو تن تنہا چلانے کا اب تو اور بھی زیادہ عزم رکھتا ہوں" مسٹر پٹیل نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔ "آہ تو یہ ساری گفت وشنید بے کار ثابت ہوئی۔ تشریف رکھیے، ہم پھر سے اس پر گفتگو کریں گے؟ میں نے کہا "بہت خوب"

میں اپنے بزرگ دوستوں کے درمیان ان کے خردمندانہ مقالات سننے کے لیے پھر نیازمندی سے بیٹھ گیا۔ لیکن اس بحث میں استدلال دوری کے سوا تھا کیا جو کوئی گنجائش نکلتی۔

مسٹر پٹیل نے کچھ خفگی اور کچھ بے صبری کے انداز میں مجھ سے پوچھا "تو پھر کیا آپ کے کہنے کا یہ مطلب ہے کہ ہماری متفقہ رائیں آپ کے نزدیک کسی شمار میں نہیں اور یہ کہ ہم سب جو یہاں جمع ہیں ان کی خواہشات اور خیالات کو پس پشت رکھ کر آپ اپنی ہی کیے جانے پر تلے ہوئے ہیں"؟

میں نے استقلال سے جواب دیا" مجھے افسوس ہے کہ میں اس معاملے میں آپ کی پیروی کرنے سے معذور ہوں۔ میرا اپنا آزاد تجربہ ایسے نتیجے کی طرف میری رہنمائی کرتا ہے جو آپ کے نتیجے کے خلاف ہے"؟

غرض کی اس طرح میرے رفقا اور میرے درمیان مفاہمت کی آخری کوشش ختم ہوگئی۔ اگرچہ میں اس وقت بھی پراونشل کمیٹی، بلکہ ڈسٹرکٹ کمیٹی اور استقبالیہ کمیٹی کا بھی جو اس وقت آئندہ کانگریس کے اجلاس کا انتظام کرنے کے لیے بن چکی تھی، ابدستور سکریٹری رہا مگر میں اپنے کو اس پرانے ماحول میں بالکل تنہا محسوس کرتا تھا

دوسری صبح سے میں نے مستعدی سے کام شروع کر دیا۔ میں نے دو ماہ کے اندر اندر دوہاد سے لے کر کاٹھیاوار کے دور و دراز علاقے لاٹھی تک ایک بورڈنگ ہاؤس اور نصف درجن مدرسے قائم کر دیئے۔ مجھے گودھرام اسکول کے مسٹر بھاد کے (ماما) اپنے پرانے دوست مسٹر ٹھکر کی جو نیچے طبقوں کے مسئلے پر بالعموم سند مانے جاتے تھے اور دوسرے قدیم رہنماؤں کی ہمدردیاں اور خیر خواہاں حاصل کرنے میں بھی کامیابی ہوئی۔ گو میں ایک خطرناک بیماری سے صاحب فراش تھا مگر میں نے اس معاملے میں گاندھی جی سے خط و کتابت جاری رکھی اور ان سے ملاقات کرنے کے بعد اس معاملے کی طرف کامل توجہ کرنے کا وعدہ بھی اُن سے حاصل کرلیا

ابھی نیشنل کالج کے جلسے کو بمشکل چند ہی ہفتے گذرے تھے کہ ایک اور اشد ضروری اور نازک مسئلہ سامنے آگیا جس نے میرے اور میرے ساتھیوں کے درمیاں اور بھی خلیج حائل کر دی۔ جون کا مہینہ بیتا جارہا تھا اور ہمارے صوبے میں بارش کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی تھی۔ حسب معمول چاروں طرف دورہ کرنے سے مجھے معلوم ہوا کہ ہر جگہ حالت بد سے بدتر ہوتی جارہی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ بھوک اور فاقہ کا عفریت داگرہ کے سرخ پگڑی والے مغرور پٹی داروں اور جھالود کے نیم برہنہ بھیلوں کی طرف دبے پاؤں یکساں طور پر مسلط ہوا چاہتا ہے۔ خوش قسمتی سے میں اس وقت مسٹر لکھشمی داس کی ہمراہی میں جو کھادی کے ماہر تھے دورہ کر رہا تھا۔ انہوں نے میرے تاثرات کی تصحیح اور اس سے زیادہ تائید کی۔ مجھے اُن کی دانشمندی نے بہت

تقویت پہنچی اور میں نے قحط زدوں کی امداد کے خاطر مفصل خاکہ تیار کرلیا۔ چوں کہ مجھے اپنے ساتھیوں سے یہ اُمید نہ رہی تھی کہ وہ ایک حبہ بھی صرف کریں گے۔ اس لیے میں جون کے دوسرے ہفتے میں بمبئی گیا تاکہ خود گاندھی جی سے مل کر ضروری رقم حاصل کروں گاندھی جی سے بمبئی میں ان کے گام دیوی کے مقام سکونت پر باآسانی ملاقات ہوگئی۔ اُن کو تکلیف دہی کے عذر کے سلسلے میں میں نے غریبوں کی نازک ضرورت اور اُن کی امداد کی فوری حاجت پر زور دیا۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ میرے دوستوں کے ساتھ میرے اختلاف کے باوجود وہ اب بھی میرے فیصلے پر پورا پورا اعتماد رکھتے تھے۔ میں نے بمشکل پانچ منٹ بات چیت کی ہوگی کہ وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیے۔ اُنھوں نے فوراً مسٹر ولبھ بھائی پٹیل کو تار دیا کہ فوراً مجلس عاملہ کا ایک خاص جلسہ طلب کیا جائے کیوں کہ وہ خود بہ نفس نفیس اسی رات کو میرے ساتھ احمد آباد تشریف لے جانے والے تھے۔

یہ جلسہ دوسرے دن شام کو حسبِ منشا صوبائی کمیٹی کے دفتر میں منعقد ہوا۔ گاندھی جی موجود تھے۔ ارکان میرے منصوبے کو سننے اور اُس پر غور کرنے کے لیے اپنی پوری تعداد میں حاضر تھے۔ مسٹر لکھشمی داس مجھے اپنی اخلاقی تائید سے سرفراز کرنے کے لیے وہاں موجود تھے۔ میں نے ایک بار پھر گجرات کی بُری حالت پر تبصرہ کیا، اور اپنا اخراجات کا بجٹ پیش کیا جو مختلف مدات کے تحت ایک لاکھ سترہ ہزار روپیوں پر مشتمل تھا۔ میری تقریر کامل خاموشی کے ساتھ سُنی گئی۔ میرے نقادوں اور مخالفین کو بڑی خلش ہوئی اور وہ سخت نفرت سے بے چین ہوئے مگر انھیں اس بڑے مہاتما کے سامنے ایک لفظ ادا کرنے کی بھی جرات نہ ہوئی۔ صرف گاندھی جی بول رہے تھے۔ اُنھوں نے فرمایا کہ میں نے جن الفاظ میں یہ بجٹ پیش کیا گیا ہے اگر کمیٹی اسے بجنسہٖ منظور کرے تو گویا اس نے اپنے فرائض بہترین طور پر ادا کیے۔ اور یہ کہ اس رقم کو خرچ کرنے اور کمیٹی کے سامنے حساب پیش کرنے کا صرف مجھے اختیار رہنا چاہیے۔ اب کمیٹی نے بجٹ کو منظور کرلیا اور سارے اختیارات اور پوری ذمہ داری مجھے سونپ دی۔ اس نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ قحط فنڈ کے لیے پبلک سے ایک خاص اپیل کی جائے۔

اس طرح میری قوت میں اور اضافہ ہوگیا۔ میں نے اپنی ذمہ داری پر پس ماندہ طبقوں اور قدیم اقوام کے لیے مدرسے کھولنے پر نجی رقمیں پہلے ہی سے خرچ کرنا شروع کردیا تھا اور اب ساتھ ہی ساتھ میں نے صوبائی کمیٹی سے وسیع رقمیں وصول کرکے انھیں اپنے پرائیویٹ دفتر کے ذریعے صوبے بھر میں وسیع امدادی کاموں پر بھی خرچ کرنا شروع کردیا۔ بے شک یہ میرے لیے ایک قابلِ فخر فتح کا دن تھا۔ مگر میرے دوست جو گاندھی جی کی مداخلت سے بالکل علٰحدہ کردیئے گیے تھے اور جنھیں نیچا دیکھنا پڑا تھا، وہ اس کے بعد سے بقول اُن کے میری اس زبردست دیدہ دلیری کو معاف نہ کرسکے۔ اور انھوں نے میرے ساتھ پہلے سے بھی کہیں زیادہ تکلیف دہ، سخت اور ناقدانہ رویّہ اختیار کرنے کا تہیہ کرلیا۔

ہماری خوش قسمتی سے جولائی میں تمام صوبے کے اندر خوب بارش ہوئی اور اب میری امدادی کارروائیاں خود بخود رک گئیں۔ مگر غلّے اور گھاس کی امدادی مدوں میں ۸۶۰۰۰ روپیہ میں پھر بھی خرچ کرچکا تھا (اس میں سے ۵۰۰۰۰ روپیہ چندے کے طور پر اسپیشل فنڈ میں دیا گیا تھا) میرے دوست بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہے تھے کہ میں جونہی اُن کے سامنے اپنا حساب پیش کروں وہ بھڑ کے چھتّے کو چھیڑ دیں جو میں نے مختلف مدوں کے تحت الٹ پھیر کی تھی اُس پر انھوں نے پہلے ہی شور مچایا تھا حالانکہ میں اس رقم کے اندر ہی رہا جتنی میرے لیے منظور کی گئی تھی۔ لیکن وہ میری فردِ حساب کی صحت اور ایمانداری پر کسی قسم کا اعتراض وارد کرنے کی جرأت نہیں رکھتے تھے کیوں کہ خوش قسمتی سے قریب الوقوع اعتراضات کے طوفان سے متنبہ ہوکر میں نے پہلے ہی اپنے دوست نندشاہ کی قابلانہ امداد سے مضبوطی حاصل کرلی تھی، جب میں صوبے کے دورے پر رہتا تو موصوف بڑی ہوشیاری اور محنت سے میرے دفتر کے کام کی نگرانی فرمایا کرتے۔ میرے دوست میرے حساب میں ایک لغزش بھی نہ پا سکے اس لیے کہ ہر ایک مد کی تائید کے لیے ادائگی

کی تصدیقیں اور سندیں موجود تھیں اُن لوگوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ بغیر کوئی ضابطہ کا اعتراض وارد کیے ہوئے میرے حساب کو منظور کریں۔ حالانکہ اجلاس کانگریس میں مشغولیت کی وجہ سے حساب جنوری میں مرتب کرکے پیش کیا گیا۔

پس ماندہ اقوام کی تعلیم اور قحط زدہ علاقوں کی امداد کے متعلق اپنے منصوبوں کی پوری کارروائی میں مجھے کامیابی حاصل ہوئی اور میں اس وقت اپنے نکتہ چین قدامت پرست دوستوں سے کوسوں دور سرگرم سفر تھا۔ خالص سیاسیات کی پیروی اور کانگریس کے ہمیشہ وسیع ہونے والے پروگرام کی آڑ میں انہوں نے ایک نئی دفتری گھس گھس اور ایک تازہ ضابطہ پرست مشینری قائم کر لی تھی۔ اپنے نئے دفتر میں بیٹھے بیٹھے اور اپنی الگ کیاری میں ہل چلاتے چلاتے میں نے فوراً یہ دیکھ لیا کہ وہ خلیج جو ہمارے درمیان حائل تھی بہت گہری اور ناقابل عبور ہو چکی ہے صوبائی اداروں کی بنیاد قایم کرنے میں اپنی تمام امکانی کوشش کر چکنے کے بعد اب چونکہ یہ پورے طور پر ہمارے ساتھیوں کے قبضہ اختیار میں آ چکی تھی اس لیے اس سے علاحدہ ہو جانے کے سوا مجھے اور کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا۔ اپنے سارے عملی کارنامے کی بربادی کا خطرہ مول لیتے ہوئے بھی میں نے ڈسٹرکٹ کمیٹی پراونشل کمیٹی اور استقبالیہ کمیٹی، ان تینوں کی معتمدی سے بیک وقت آئندہ نیشنل کانگریس کے اجلاس کے موقع پر استعفا دے دینے کا دلیری سے فیصلہ کر لیا۔

اگست ۱۹۲۱ء میں سوشل ریفارم ایسوسی کا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جہاں وقت کی گرما گرم سیاست پر خود گاندھی جی کی تقریر سننے کے لیے پراونشل کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا تھا۔ میرے سہ گانہ استعفے میرے رفیق مسٹر مادالنکر نے پیش کیا اور پھر ولبھ بھائی بولنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ انہوں نے بہت پر زور لہجے میں میری دوستی اور رفاقت کی بہت تعریف و توصیف کی۔ تقریر کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ میں اس بڑے مجمع میں بیٹھا تھا، میرے آنسو بھی مجھ سے ضبط نہ ہو سکے۔ میں نے محسوس کیا کہ میں نے ان لوگوں اور اس جماعت سے اپنے کو الگ کر لیا جب وقت نے کھو کھلا کر دیا اور اُسے میرے لیے اتنا باعث احترام بنا دیا کہ اب میں اُسے چھو بھی نہیں سکتا۔ لیکن جیسا کہ مسٹر پٹیل نے خود فرمایا ہمارے درمیان اختلافات گہرے اور بنیادی تھے۔ اب گاندھی جی نے اپنے مخصوص انداز میں ایک اختتامی تقریر کی۔ زبردست مہاتما نے واقعی میری قدر و قیمت کی توصیف میں بہت سخاوت سے کام لیا۔ اس طرح یہ المیہ تماشہ ختم ہو گیا، میری ذلت اور کلفت کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں۔ جلسہ سے یکبارگی اٹھ کھڑا ہوا اور باہر آ گیا کیونکہ مجھے ایک آپریشن کرانے کے لیے صبح ہی کی گاڑی سے بمبئی جانا تھا۔

انتالیسواں باب

بدیسی کپڑے جلا دو

اُدھر گاندھی جی اپنے ایک کروڑ کے لیے تمام ملک کا خوشی خوشی دورہ کرتے پھر رہے تھے ادھر فلاکت زدہ لوگوں کا جوش وخروش بڑھتا جارہا تھا۔ جلد سوراج حاصل ہونے کی توقعات نے ملک میں ایک عجیب بے اطمینانی کا جوش وہیجان برپا کر رکھا تھا۔ ملک کے مختلف حصوں میں اچانک تشدد کا پھوٹ پڑنا اور حسبِ معمول اس کے بعد حکومت کے جبر وتشدد کی بدمستیاں عوام کے اس بڑھتے ہوئے غیظ وغضب اور جوش نفرت کا اظہار کر رہی تھیں جسے گاندھی جی چرخے اور روپیہ جمع کرنے کی سرگرمیوں کی طرف پھیرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مالے گاؤں دکن بمبئی کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے اس میں بھی اس قسم کی ایک بدامنی کا ظہور ہوا۔ بابو راجندر پرشاد لکھتے ہیں اور اِدھر ملک اس تعمیری کام میں مصروف تھا اور ادھر مالے گاؤں ضلع ناسک میں ایک بلوہ ہوگیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے پولیس والے اور کچھ عوام مر گئے اور آتش زدگی کے واقعات رونما ہوئے گریڈیہہ، صوبہ بہار میں بھی گڑبڑی واقع ہوئی مگر وہاں بہرحال جان کا نقصان نہیں ہوا۔"
گاندھی جی نے حسب معمول اپنے خاص رنگ میں ان فسادات کی مذمت کی اور اپنے عدم تشدد کے عقیدے کی تبلیغ تازہ کرنے کے لیے انہیں ایک موزوں حیلہ ہاتھ آگیا۔ ان فسادات کے اقتصادی یا سیاسی اسباب کی تحقیقات کے لیے کوئی کانگریس کمیشن نہیں مقرر کیا گیا۔ اور انہیں اتنا کافی اہم بھی نہیں سمجھا گیا کہ ان کی بنا پر تحریک روک دی جاتی۔

اسی اثنا میں چاندپور سے اور بھی اہم واردات کی اطلاعیں ملیں۔ بابو راجندر پرشاد اپنے ینگ انڈیا کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ "مزدوریوں کی کمی اور زبردست فسادات اور تکلیفوں کے درمیان چائے کے باغات سے تیرہ ہزار مزدوروں کے اخراج کی وجہ سے اوائل مئی ۱۹۲۱ء میں آسام کے چائے پیدا کرنے والے صوبہ کے اندر مزدوروں کا ایک بڑا قضیہ رونما ہوا حکومت نے چاندپور اسٹیشن پر گورکھوں کی ایک بہت بڑی جمعیت کو بھیج دیا تھا جس نے ان قلیوں کو ایک جگہ جمع کر کے ان پر حملہ کر دیا۔ اس ظلم کی اطلاع سے ملک میں نفرت اور حقارت کی لہر سی دوڑ گئی اور مشرقی بنگال میں ریلوے اور اسٹیمر کے قلیوں نے بطور ہمدردی ہڑتال کر دی جس سے تقریباً دو ماہ بالکل کام بند رہا۔

ہم یہ دیکھ ہی چکے ہیں کہ مسٹر گاندھی نے ان ہمدردانہ ہڑتالوں کی کس طرح مذمت کی تھی۔ اور گاندھی جی نے یہ رویہ اس حقیقت کے باوجود اختیار کیا کہ دیش بندھو داس شیر بنگال جیسے عالی مقام رہنما بھی اس معاملے سے بہت متاثر ہوئے جو لوگ اس سفاکانہ قتل عام کے شکار ہوئے تھے ان کے متعلق زوردار پروپیگنڈا کرنے کے لیے مسٹر داس نے اپنے وقت کا بہت زیادہ حصہ صرف کرنے کے علاوہ تلک سوراج فنڈ میں جو رقم بنگال کے حصہ رسدی کے طور پر جمع

کی گئی تھی اس میں سے ایک کثیر مقدار ہڑتالیوں کی امداد میں خرچ کرنے پر اپنے کو مجبور سمجھا۔ لیکن پھر بھی گاندھی جی نے اسے کس نظر سے ملاحظہ فرمایا؟ کیا انھوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ان بدنصیب قلیوں کی اقتصادی شکایتوں کا گہرا مطالعہ کرنے کی کوشش کی جو بیچارے ارباب سیاست کے تغافل اور برطانوی مالکان کاشت کی طماعی کے باعث ایک صریحی غلامانہ نظام کی ذلت میں پڑے ہوئے تھے؟ یا انہوں نے اسے برطانوی انقطاع کے نتائج میں سے ایک نتیجہ تصور کیا یا اسے نیشنل کانگریس کے سامنے لانے کی فکر کی جو ان مصیبت زدہ قلیوں کے مفاد کی حمایت کی پابند تھی؟

نہیں گاندھی جی نے اس قسم کی کوئی بات نہیں کی انہوں نے ایک انتشار کی بابت جو درحقیقت مئی کے آغاز میں پیدا ہوا تھا ہ رجون تک تاخیر کر کے اس کے متعلق کچھ لکھا تو اس طرح کہ پورے موضوع پر مقدس الفاظ اور بظاہر اشتراکی طرز کی عبارت کا غلاف چڑھا دیا۔ انہوں نے اس معاملے میں جو بے جا تاخیر کی تھی اُس کا عذر پیش کرنے کی نیت سے لکھا "میں نے اس انتشار میں ہاتھ ڈالنے سے قصداً گریز کیا ہے گو میں مسٹر انڈروز اور دوسرے لوگوں سے جو اس معاملے میں مشغول ہیں حالات معلوم کرتا رہا ہوں" مسٹر انڈروز جو ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں غالباً اس میدان میں بھی سب سے پہلے ہی پہنچے تھے اور اس بات کی کوشش میں تھے کہ برطانوی مالکان کاشت کے مفاد پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔ گاندھی جی کو ان پادری صاحب کی بات سُن کر تشفی ہو گئی حالانکہ یہ وہ بزرگ ہیں جو ہندستان میں برطانوی سرمایہ داری کے زبردست ستوں کا کام دے رہے ہیں اور انہوں نے یہ سب محض اس لیے لکھا کہ وہ ذمہ داریوں سے اپنا دامن چھڑانا چاہتے تھے۔ گاندھی جی کے الفاظ یہ ہیں "میں اس انتشار کا حوالہ صرف یہ بیان کرنے کے لیے دے رہا ہوں کہ اس کے رونما ہونے کے متعلق مجھے کوئی علم نہ تھا مجھے بہت افسوس ہوگا اگر کوئی شخص میرا نام استعمال کر کے اس راہ پر لگائے کہ وہ اپنے مالکوں کو چھوڑ دیں۔ (اس معاملے میں برطانوی مالکان کاشت سے مراد ہے) یہ بات مسلمہ ہے کہ یہ خالص مزدوروں کا فساد ہے" آگے چل کر انھوں نے اس آرٹیکل میں "ہر ایسے انگریزی یا ہندستانی مفاد کو جس کی بنیاد بے انصافی یا متکبرانہ قوت پر رکھی گئی ہے، یا جو بحیثیت مجموعی پورے ہندستان کی نشو ونما کا مخالف ہے" "تباہ و برباد کر دینے کی بھی دھمکی دی۔ انھوں نے ایسے ناجائز منافعوں پر بھی ملامت کا اظہار کیا جن سے مزدوروں کی اجرت سے کوئی مناسبت نہیں پائی جاتی۔ مگر ایک مقدس توقع کے حسب ذیل اظہار پر انھوں نے اپنے وعظ کو ختم کر دیا "خواہ سرمایہ دار یورپین ہو یا ہندستانی اُسے اس نئی بیداری اور نئی قوت کی تعریف کرنی پڑے گی جو ہم میں پیدا ہو گئی ہے"۔

فی الحقیقت انہوں نے مزدوروں کی مدد کے لیے جن میں خود اُن کے قول کے مطابق زبردست سرمایہ داروں کے خلاف اپنی لڑائی لڑنے کے لیے نہ قوت تھی اور نہ روشنی، کانگریس کی پوری طاقت کو منظم کرنے کے بجائے مزدور فساد کو علٰحدہ رکھنے اور مقامی بنانے کی کوشش کی۔

مالے گانو اور چاند پور کے قبیح واردات سے بے نیاز ہو کر ترک موالات کے نئے پیغمبر نے اولین موقع پر نئے وائسرائے لارڈ ریڈنگ سے شملے میں ملاقات کی اور جیسا انہوں نے خود بیان کیا ہے اس لیے نہیں کہ وائسرائے نے ملاقات کرنے کی انہیں دعوت دی تھی۔ بلکہ "ہز اکسلینسی نے پنڈت جواہر لال اور مسٹر انڈروز سے تذکرہ کیا تھا کہ وہ مجھ سے ملنا اور میرے خیالات سننا پسند کریں گے" "اپنے علم کے مطابق میں نے تینوں دعادی، خلافت، پنجاب اور سوراج کی توضیح کر دی اور ترک موالات کی اصل حقیقت انھیں بتا دی"۔ اتفاق سے اس ملاقات میں لارڈ ریڈنگ نے گاندھی جی سے کہا کہ وہ علی برادران کو بعض تقریروں پر معافی مانگنے کی ترغیب دیں جن سے ان کے خیال میں تشدد کی بو آتی تھی اور آخر میں اتنا اور کہا کہ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو ہم ان پر مقدمہ چلا دیں گے۔ گاندھی جی نے ان دونوں بھائیوں سے

معافی منگوانے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ چناں چہ اس زمانہ میں اس کے متعلق بہت کچھ کہا سنا گیا تھا۔ گاندھی جی نے اس موضوع پر ینگ انڈیا مورخہ ۲۵ مئی ۱۹۲۱ء) اپنے آرٹیکل کو اس طرح ختم کیا:۔

"ممکن ہے کہ بعض اصحاب اس امر میں مجھ سے ہم خیال ہوں کہ باہمی مفاہمت کوئی کم فائدے کی چیز نہیں ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں یہ ملاقات ایک نمایاں کامیابی تھی"۔

اس ملاقات کی اہمیت پر بے کار کوئی کیوں زور دے۔ "ترک موالات" کے رہنما کے لیے بھی درحقیقت یہ جائز ہے کہ وہ سلطنت کے بڑے بڑے کارکنوں سے ملے۔ یہ واقعہ تو بہر حال اپنی جگہ پر ہے کہ وائسرائے کی خواہش کا ہلکا سا اشارا پا کر خود گاندھی جی ہی ان کی ملاقات کے جویا ہوئے۔ گاندھی جی کے بنیادی تصورات کی آئینہ دار ہونے کی حیثیت سے یہ ملاقات بہت اہم ہے جیسا کہ اُنھوں نے اور کسی جگہ بیان کیا کہ وہ ٹھیک اسی طرح "انگریزوں" اور ہندستانیوں کے اندر حقیقی اور دلی تعاون پیدا کرنے" کے خواہاں تھے جس طرح وہ اب "آزاد ہندستان اور انگلستان کو برطانوی دول مشترکہ کے اندر برابر کے حصے دار کی حیثیت سے شریک کرنا چاہتے ہیں" یہ دکھانا اور بھی مناسب ہے کہ اس وقت حکومت سے گفت وشنید کے لیے خود گاندھی جی ایک راستے کی تلاش میں تھے۔ انھوں نے خیال کیا کہ باشندگان ہند نے اپنی قوت کی آنی کانی جھلک دکھا دی ہے کہ وائسرائے اُن کی اصلاح کی تجاویز سننے پر بخوشی راضی ہو جائیں گے۔ وائسرائے نے گاندھی جی کے داؤ پیچ کو بھانپ لیا اور رسّی ان کی ڈھیلی کر دی۔ اس ملاقات سے علی برادران کی معافی کے سوا اور کچھ نتیجہ نہ نکلا اور اُن کی گرفتاری مزید چھ ماہ کے لیے رک گئی۔

گاندھی جی نے مئی ۱۹۲۰ء میں ترک موالات کا جو اصلی پروگرام پیش کیا تھا اُس پر ثابت قدم رہتے ہوئے مولانا محمد علی اپنے مسلمانوں پر خاص طور سے اور سارے ملک پر ضمناً زور دینے لگے کہ وہ پولیس اور فوج کی نوکری سے علٰحدہ ہونے کے تیسرے مرحلے کو اختیار کریں۔ میں نے پہلے ہی اس طرف اشارہ کر دیا ہے کہ بجواڑے میں پروگرام کے اس حصّے میں بہت زیادہ تعویق ہو چکی تھی۔ اسے اس سے پہلے ہی عمل میں آ جانا چاہیے تھا جہاں گاندھی جی خیالی دنیا میں اڑ رہے تھے وہیں مولانا محمد علی نے مضبوطی سے اپنے قدم زمین پر جمائے رکھے۔ کم سے کم انھوں نے سیاسی جد وجہد کے حقائق سے چشم پوشی تو نہیں کی اور صرف چرخہ پروگرام ہی کے عمل میں لانے سے وہ مطمئن ہو جانے کے قائل نہ تھے۔ یہ درحقیقت کانگریس کی سستی تھی، جیسا میں آگے چل کر دکھاؤں گا، کہ محض ایک ریزولیشن کے اختیار کر لینے کے باعث مولانا محمد علی اور دوسرے خلافت کے لیڈروں پر گورنمنٹ برس پڑی ورنہ بصورت دیگر اس کی طرف کسی کی توجہ بھی مبذول نہ ہوتی۔

بابو راجندر پرشاد لکھتے ہیں "۸ جولائی کو بمقام کراچی مولانا محمد علی کی صدارت میں آل انڈیا کانفرنس کا جلاس منعقد ہوا کانفرنس نے مسلم مطالبات کا اعادہ کرتے ہوئے یہ ریزولیشن بھی منظور کیا کہ "آج سے کسی صاحب۔ ایمان مسلمان کا فوجی خدمت انجام دینا یا فوج میں بھرتی ہونا یا اس کام میں مدد دینا بالکل ناجائز ہوگا۔" کانفرنس اس وقت تو بڑی کامیابی سے گذر گئی اور بہت سے رہنما نا گپور کانگریس میں جو نیا دستور منظور ہوا تھا اور اس کے تحت جو آل انڈیا کمیٹی بنی تھی اُس کے پہلے جلسے میں شرکت کی غرض سے بمبئی آئے

اسی اثنا میں گاندھی جی نے جون کے آخر میں اپنا ایک کروڑ بخوبی جمع کر لیا تھا۔ ابھی بجواڑہ پروگرام کی تکمیل کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ گاندھی جی نے بڑے بڑے الاؤ میں پھونک کر تمام غیر ملکی کپڑوں کے مقاطعہ کی نئی جد وجہد کی اشاعت کے لیے تیزی سے قدم بڑھایا۔

یہ یاد رہے کہ انھوں نے ایک بار پھر بمشکل کسی کو سوچنے کا موقع دیا اور نہ خود انھوں نے قابل فہم براہین یا سیاسی جنگ آزمائی کے رنگ میں کچھ غور وخوض کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ گہرے جذبات، اعصابی جوش اور غیر معمولی قوت عمل کی شدت کے باعث غیر محسوس

طور پر ان میں بتدریج اپنی عظمت" کا خبط بڑھتا جارہا تھا۔ اور اسی خبط کے ماتحت وہ یکے بعد دیگرے حدودِ معقولیت سے متجاوز پروگرام پیش کرتے چلے جارہے تھے۔ ان کی نئی تجویز سے جتنا زیادہ تعجب پیدا ہوتا یا وہ جتنی زیادہ بعید از عقل نظر آتی انتہائی زیادہ درویشانہ دانشمندی اور سیاسی طباعی کا کرشمہ سمجھ کر اس کا خوشی سے استقبال کیا جاتا۔ پھر کیا تعجب اگر انھوں نے کسی رہنما سے مشورہ کیے ہوئے بغیر یا ادارۂ کانگریس کے کسی جلسے سے بلا پوچھے ہوئے بدیشی کپڑوں کے ڈھیر کے ڈھیر نذر آتش کرنے کا مشورہ دے دیا۔ اس تجویز نے اپنی دلکش ندرت سے عوام کے تخیل کو مسحور کر دیا اور حکومت کے خلاف حقیقی جنگ کا دن بھی ملتوی ہو گیا۔

گاندھی جی نے (اپنے پروگرام کی تائید میں ینگ انڈیا ۶ جولائی) لکھا "آج یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ غیر ملکی کپڑوں کا مجوزہ مقاطعہ انتقامی کارروائی نہیں ہے مگر قومی زندگی کے لیے یہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا جینے کے لیے سانس لینا۔ جتنی جلدی اس پر عمل ہو اتنا ہی ملک کے لیے بہتر ہے۔ اس کے بغیر سوراج حاصل نہیں ہو سکتا اور نہ حاصل ہونے کے بعد قائم رکھا جا سکتا ہے۔ یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ یہ آئندہ اگست کے پہلے ہی دن کیسے عمل میں آ سکتا ہے۔" (کیوں کہ سوراج جیسا کہ پہلے پہل انھوں نے سوچا تھا پہلی اگست ۱۹۲۱ء کو حاصل کیا جانے والا تھا)

حتی الامکان انھوں نے بائیکاٹ کو جلد از جلد عمل میں لانے کے لیے حسب ذیل سفارشات کی تفصیل پیش کی:-

(۱) مالکان مِل خاص طور سے ہندستانی بازاروں کے لیے مال تیار کریں اور اپنے منافعوں کی حد بندی کریں۔

(۲) باہر سے بدیسی مال منگانے والے تجار بدیشی کپڑے خریدنا بند کر دیں۔

(۳) سب لوگ بدیشی کپڑے خریدنے سے انکار کر دیں اور جہاں بھی ممکن ہو سکے کھادی خریدیں۔

(۴) لوگ صرف کھادی مول لیا کریں اور کارخانوں میں بنے ہوئے کپڑوں کو اُن غریبوں کے لیے چھوڑ دیں جن میں سودیشی اور بدیشی کے اندر تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

(۵) جب تک سوراج قائم نہ ہو جائے اور جب تک کھادی کی پیداوار میں اضافہ نہ ہو جائے لوگ صرف اتنی کھادی استعمال کریں جو اُن کے جسم کو ڈھکنے کے لیے کافی ہو بس۔

(۶) لوگ پرہیز گاری کا حلف اٹھا کر نشہ اور شراب کی طرح بدیشی کپڑوں کو بھی تباہ کر دیں یا اُسے بیرونی ممالک میں استعمال کرنے کے لیے فروخت کر دیں یا اُسے کام کاج... کے وقت یا اوقات فرصت میں پہن ڈالیں۔

اس سوال کے جواب میں کہ "انھیں کیوں جلا دیا جائے" گاندھی جی نے کہا کہ "کپڑوں کا جلانا" (۱) تاریک ایام کی یاد تازہ کر دیتا ہے، نیز یہ ذلت کی نشانی ہے (ایسٹ انڈیا کمپنی نے اسے زبردستی ہمارے سر تھوپا تھا۔ اور اس سے غلامی کا اظہار ہوتا ہے۔ (۲) ان کپڑوں کو غریبوں کے حوالے نہ کرنا چاہیے تاکہ ان کے حب الوطنی وقار اور عزت کے احساسات مردہ نہ ہو جائیں۔

ہمیں آج بدیشی کپڑوں سے بڑے الاؤ میں جھونک دینے کے بارے میں زیادہ سنجیدگی سے بحث و تمحیص کی ضرورت نہیں کیوں کہ عدالتوں اور مدرسوں کے مقاطعوں کی طرح گاندھی جی کے ۱۹۲۱ء کے پروگرام کی یہ مد بھی با عمل سے دور ہو چکی ہے پچھلے چند سالوں کے دوران میں غیر ملکی کپڑوں کا مقاطعہ برطانوی کپڑوں تک محدود کر دیا گیا ہے۔ اور بدیشی کپڑوں کی دوکانوں پر پکٹنگ کے ذریعے اس میں زیادہ وسیع اور موثر کامیابی ہوئی ہے یہ بات بہت دلچسپ ہے کہ گاندھی جی نے خود ہی ان غریبوں کو (جیسا انھیں وہ کہتے تھے) کارخانوں میں بنے ہوئے کپڑوں کو خریدنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا حالانکہ انھوں نے اس کے لیے جو سبب پیش کیا وہ صحیح نہیں یعنی غربا نادانی کے باعث نہیں بلکہ افلاس کی وجہ سے کھدر نہیں خرید سکتے (اور ہندستان میں

غریبوں کی اکثریت ہے) مسٹر گاندھی کو دعوی ہے کہ کھدر غریبوں کے لیے بنایا جاتا ہے لیکن ہمیں یہ یقین رکھنا چاہئے کہ کھدر صرف امیر لوگوں اور شہری متوسط طبقوں کے شوقینی کا سامان بن کے رہ جائے گا اور غریبا جو تانبے کے چند سکوں کے معاوضے میں دن بھر چرخا کاتا کرتے ہیں اپنے ناتواں جسموں کو ڈھانکنے کے لیے مشین پر بنے ہوئے سستے کپڑے خریدنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

یہ بھی صحیح ہے کہ یہ پروگرام ایک جانب برطانوی تاجروں پر وار کرنے کی غرض سے بطور سیاسی حربہ کے وضع کیا گیا اور دوسری جانب چرخے کی سرگرمی بڑھانے کی نیت سے اختیار کیا گیا تھا مگر فی الحقیقت اس سے ہندستان کے مالکان کارخانہ جات کو بہت مدد ملی جو اپنی قیمتوں کو آسانی سے بڑھا سکتے تھے اور اپنا حد سے زیادہ جمع کیا ہوا مال غیر معمولی طور سے کم وقت میں فروخت کر سکتے تھے پہلے پہل مالکان مل کو گاندھی جی کے چرخے پر مسلسل زور دینے سے تعجب اور صدمہ ہوا مگر جلدی ہی انہوں نے بھانپ لیا کہ گاندھی جی اُن کے بڑے گہرے دوست اور پکے ساتھی ہیں!

اگرچہ اُنھوں نے کانگریس کے پروگرام سے کبھی کامل اتفاق ظاہر نہیں کیا مگر گاندھی جی نے اُن کے مفاد کو بالواسطہ ترقی دینے کا جو طریقہ اختیار کیا تھا اس سے وہ بہت خوش ہوئے۔ چونکہ ۱۹۱۹ء سے گاندھی جی نے کارخانوں کے مزدوروں کی کسی جدوجہد میں جو انھوں نے اپنے ہندستانی مالکوں کے خلاف شروع کی قیادت نہیں فرمائی اس لئے انھیں بجا طور پر سرمایہ داروں کے طبقے کا میر میدان کہا جا سکتا ہے۔

چالیسواں باب

بمبئی میں الاؤ

مہاتما جی نے اوائل جولائی میں جو پروگرام پیش کیا تھا اس کو قلم بند کرنے کے لیے ۲۸ جولائی ۱۹۲۱ء کو بمبئی میں نئی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا۔ چوں کہ میں اس کمیٹی کا ممبر منتخب کیا گیا تھا اس لیے مجھے جلسے میں شرکت کی غرض سے احمد آباد سے آنا پڑا میرے ذاتی تجربے نے جس کا بیان پہلے کیا جا چکا ہے مجھے اب ان کمیٹوں کے ظاہری طمطراق کی طرف سے بہت مشکوک و متنفر کر دیا تھا۔

بے داغ سفید کھدر میں ملبوس اراکین کی ظاہری ہیبت "سادہ زندگی کے آئیڈیل پر جس کا نمونہ ملک کے سامنے مہاتما کی سیدھی سادھی زندگی نے پیش کیا تھا" مجھ میں وجد و انبساط نہیں پیدا کر سکتی تھی کیوں کہ مجھے معلوم تھا کہ ان میں سے اکثر یا تو سابق وکلا ہیں یا تاجر یا فرصت والے لوگ غرض کہ سب ایسے حضرات ہیں جنھیں اپنی روزمرہ کی دال روٹی کی فکر نہیں کرنی پڑتی۔ ہاتھ کے بنے ہوئے موٹے جھوٹے کپڑوں سے اُن کی زندگی کی سادگی کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ان کھاتے پیتے اور بنے ٹھنے لیڈروں میں سے اکثر کا نظریۂ سادگی صرف ظاہری پوشاک تک محدود تھا انھیں موٹروں میں ادھر اُدھر ٹہلنے اور دوسرے اسباب تنعم سے لطف اندوز ہونے میں کوئی عار نہ تھا۔ حب الوطنی کی اس نئی پیشہ ور جماعت کے اندر اب مجھے نخوت، خود بینی،

بدتمیزی بلکہ ایک سفیہانہ قسم کی جنگجوئی کی بھی کارفرمائیاں نظر آنے لگی تھیں اور مجھے اس بات میں مسز سروجنی نائیڈو سے بالکل اتفاق تھا جو انھوں نے اُسی سال کے آغاز میں نیشنل کالج احمد آباد کے طلبا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ یاد رکھو کہ ریاکاری کھدر کے بھیس میں بھی نمودار ہوسکتی ہے اور اس کا بھی امکان ہے کہ خاکساری ریشمی کپڑوں میں ملبوس ہو۔

جب میں نے اس بڑے ہال میں کانگریس کے ایک کروڑ روپیہ کے عظیم الشان فنڈ کے محافظوں اور تقسیم کنندوں پر جس کے صدر خود مہاتما جی تھے نظر ڈالی تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ میں ایک سیاسی مجمع میں ہونے کے بجائے ایک ایسے نئے مذہبی نظام کے درمیان ہوں جس کی نظیریں اکثر تاریخ ہند میں قائم ہوتی رہی ہیں۔ اور کون نہیں جانتا کہ نہایت مقدس صوفیوں اور رشیوں کی قائم کی ہوئی بڑی بڑی بہترین مذہبی جماعتوں میں بھی ہمیشہ پاکبازانہ جعلسازی اور ریاکارانہ ابلہ فریبی کی جتھہ بندیوں، منڈلیوں اور سازشوں میں تبدیل ہو جانے کا رجحان ہوتا ہے جو اپنی برائیوں کو اچھائیاں ثابت کر دکھانے کے لیے اپنی دقیق فراست کو مسلسل کام میں لاتی رہتی ہیں۔

جب کمیٹی کام کرنے کے لیے بیٹھی تو گاندھی جی نے عام صورت حالات پر اپنا ناگزیر بیان پیش کیا۔ انھوں نے اپنے ریزولیشنوں کا پوٹ نکالا جو اُن کی ہدایت و رہنمائی میں مجلس عاملہ نے منظور کیے تھے۔ بڑی تعجب کی بات تھی کہ نہ کانگریس نے سوراج کا جھنڈا کھولا اور نہ جدوجہد کے آخری مرحلے کا حکم دیا حالانکہ گاندھی جی کا ایک سال ختم ہوچکا تھا۔ جہاں ہر شخص "سال سوراج" کا کلمہ پڑھتا تھا جو اب پہلی اگست کی بجائے پہلی جنوری تک بالکنایہ بڑھا دیا گیا تھا اور جہاں کانگریس کے پروپیگنڈے پر بڑے اطمینان کا اظہار کیا جارہا تھا وہیں کوئی بھی ایسا نظر نہیں آتا تھا جو نظام حکومت کے قلعہ پر آخری ضرب لگا کر اُسے پاش پاش کر دینے کے لیے کسی عجلت کا اظہار کرتا۔

اس کے بجائے کمیٹی نے بہت سا وقت ضمنی اور ثانوی امور پر غور کرنے میں مصروف کیا۔ مثلاً ایک ریزولیشن میں نشہ والی شراب اور ادویہ کے استعمال اور فروخت کے خلاف پرامن مقاطعہ کی جدوجہد میں رائے عامّہ کے نشوونما پر اظہار اطمینان کیا گیا اور حکومت کو تنبیہ کی گئی کہ اگر وہ پرامن مقاطعہ میں مسلسل بیجا مداخلت کرے گی تو کمیٹی یہ حکم دے گی کہ ان احکام کی پروا نہ کرتے ہوئے مقاطعہ جاری رکھا جائے۔ رائل ہائنس پرنس آف ویلز کے مجوزہ مقاطعہ کو اور بھی زیادہ اہمیت دی گئی یہ توقع تھی کہ وہ آئندہ سرما میں ہندستان تشریف لائیں گے اس لیے کمیٹی نے یہ اعلان کرتے ہوئے ایک ریزولیشن پاس کیا کہ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ پرنس آف ویلز کے کسی خیر مقدم میں شرکت کرنے یا امداد کرنے سے احتراز کرے۔ یہ مشورہ دیتے ہوئے کمیٹی نے یادداشت کے طور پر اپنی اس رائے کو قلم بند کرادیا کہ ہندستان کو ہز رائل ہائنس کی ذات سے کوئی شکایت نہیں، یہ مشورہ اس لیے دیا گیا ہے کہ مجوزہ تشریف آوری ایک ایسا سیاسی اقدام ہے جس سے ایک ایسے طرز حکومت کی تائید ہوتی ہے جس نے مسلمانوں سے عہد شکنی کرنے کے علاوہ باشندگان ہند کے ساتھ شدید بے انصافی کی ہے اور جس نظام کا تقاضہ ہے کہ ہندستان کو اس کے سوراج کے پیدائشی حق سے جہاں تک ممکن ہو محروم رکھا جائے

اس قسم کے جنچے تلے اور فرسودہ اقوال سے لطف اندوز ہونے کے بعد کمیٹی نے مقاطعہ اور بدیشی کپڑوں کو نذر آتش کرنے کے متعلق گاندھی جی کی تجویز کردہ جدوجہد پر مہر تصدیق ثبت کردی۔ "بجواڑے کے پروگرام کو چلانے پر قوم کو مبارکباد دینے کے بعد کمیٹی نے یہ ہدایت کی کہ پوری قوم ۳۰ ستمبر تک بدیشی کپڑوں کا بائیکاٹ مکمل کرانے پر اپنی توجہ مرتکز کردے اور ہاتھ سے کاتنے .... اور بُننے کے کام کو ترقی دے کر کھدر کی پیداوار میں اضافہ کرے، اسی طرح کمیٹی نے اُن تمام اصحاب کو جن کا کانگریس سے تعلق ہے یہ مشورہ دیا کہ وہ یکم اگست سے بدیشی کپڑوں کا استعمال چھوڑ دیں اور تمام کانگریس کمیٹیاں لوگوں کے پاس سے تمام بدیشی کپڑے جمع کرلیں تاکہ انھیں جلا دیا جائے یا باہر بھیجا دیا جائے ...." کمیٹی نے مالکان کارخانہ جات کو دعوت دی کہ وہ کانگریس کے ساتھ تعاون کریں یا گاندھی جی کے بتائے ہوئے ڈھرّوں پر قومی کوشش کی تائید کریں۔

سب سے آخر میں مجبوراً کمیٹی کو اقدام عمل کی تجویزوں پر بھی غور کرنا پڑا لیکن یہ عجیب بات ہوئی کہ ان تجاویز کو ان ناگوار واردات پر جو ملک کے مختلف حصوں میں رونما کردیا گیا اور کمیٹی نے اس اہم ترین موضوع پر اپنی تجویز کے تمہیدی بیان میں "بالیگاؤں" اور

علی گڑھ میں جو زیادتیاں کی گئی تھیں اگرچہ وہ انتہائی اشتعال انگیزی کا نتیجہ تھیں اظہار افسوس کیا اور کانگریسی اداروں کو مشورہ دیا کہ وہ تاکید کریں کہ عدم تشدد ترک موالات کا ضروری جزو ہے نیز عوام کو مبارکباد دی گئی کہ انھوں نے حکام کی طرف سے بہت زیادہ چھیڑ چھاڑ کے باوجود دھاڑوار، موتی ہاری اور گنٹور میں بہت صبر و تحمل سے کام لیا" گورنمنٹ کی انسدادی سختیوں اور کارکنوں کی سول نافرمانی اختیار کرنے کی جائز خواہش کے باوجود کمیٹی کا یہی خیال تھا کہ جب تک سوراج کا پروگرام تکمیل کو نہ پہنچ جائے اس وقت تک سول نافرمانی ملتوی رہے کیوں کہ کمیٹی کی رائے میں اس پروگرام کی تکمیل کانگریس کے حاصل کردہ اثر کے معیار کی آزمائش اور پُرامن ماحول کی مضبوطی کی ضمانت ہے۔ بہرحال اس نے مجلس عاملہ کو کسی خاص مقام یا صوبے میں سول نافرمانی کی منظوری دے دینے کا اختیار دے دیا۔

گو کمیٹی نے سول نافرمانی کے متعلق جو درحقیقت ترک موالات کے اصلی پروگرام کا چوتھا مرحلہ تھا۔ ایسا مذبذب اور بے دلی کا ریزولیشن منظور کیا لیکن اس نے چند ہی ماہ قبل کراچی میں خلافت کانفرنس کے منظور کردہ ریزولیشن کی جس نے حکومت کے پولیس اور فوجی ملازمتوں سے علحدگی کا مطالبہ کیا تھا، اتنی دیر کے بعد بھی کوئی حمایت نہ کی۔ (حالانکہ پولیس و فوج کی علحدگی پروگرام کا تیسرا مرحلہ تھا) علی برادران اور دیگر خلافت کے لیڈر بھی کمیٹی کے جلسے میں موجود تھے۔ مگر انھوں نے گاندھی جی کے دباؤ کے باعث کراچی کانفرنس کے اس سب سے بڑے کارنمایاں پر زور نہیں دیا۔ اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ اگر کانگریس کمیٹی کراچی ریزولیشنوں کو تقویت دیتی اور سارا ملک گرمجوشی سے ان کا خیر مقدم کرتا تو حکومت ایک بالکل دوسری روشنی میں ان کی تعبیر کرتی۔

ایک مرتبہ پھر گاندھی جی نے حکومت کے نظام پر سامنے سے براہ راست اور دلیرانہ حملہ کرنے کے بجائے اپنے پسندیدہ تعمیری پروگرام کے اور دیگر دیگر لگانے اور شراب کی خرید و فروخت جیسی دوسرے درجے کی برائیوں یا پرنس آف ویلز کی تشریف آوری جیسے اتفاقی معاملات کے سلسلے میں نوک جھوک کو ترجیح دی۔ جب انھوں نے بجواڑے کے پروگرام کا اعلان کیا تو الہ آباد کے اخبار "لیڈر" نے بجا طور پر ان کو ترکِ موالات کو التوا میں ڈالنے کا ملزم ٹھہرایا اور اب جولائی کے آخر میں جب کہ ایک سال میں حصول سوراج کے اپنے وعدے کو پورا کر دکھانے کے لیے انھیں وقت نہ رہ گیا تھا اس الزام سے انھیں اور بھی قائل ہو جانا چاہیے تھا یہ سب اس حقیقت کے باوجود تھا کہ سول نافرمانی اور عدم ادائگی محاصل کی منظوری دینے کے لیے چاروں طرف سے زور ڈالا جا رہا تھا اس لیے کہ حکومت سارے ہندستان میں روزافزوں انسدادی جبر و تشدد پر اُتر آئی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اس سال کے دوران میں سوراج اور ترک موالات کے بارے میں خود گاندھی جی کے نقطۂ نظر میں بنیادی تبدیلی ہو رہی تھی۔ چناں چہ ۸ اگست ۱۹۲۱ء کے "ینگ انڈیا" میں انھوں نے اپنی غلطی کا نام نہاد اعتراف ذیل کے پیرائے میں کیا "ترک موالات کی تعلیمی مد کا ضروری حصہ سمجھتے ہوئے چرخہ کاتنے پر زور دیا جاتا تو بہت بہتر ہوتا" اور یہ کہ "میں ان تمام اصحاب کو جو میرے اس عقیدے میں متفق ہیں دعوت دیتا ہوں کہ وہ اس غلطی کی اصلاح کی طرف جلد قدم اٹھائیں اور ایسے تمام قومی اداروں میں جہاں ان کا اثر ہو سوت اور کھادی تیار کرنے کا کام پورے انہماک سے شروع کر دیں" غلطی کا یہ نام نہاد اعتراف محض اس لیے کیا گیا ہے کہ چرخے کے متعلق اُن کے فلسفے میں جو بنیادی انقلاب پیدا ہوا ہے اُس کی پردہ پوشی کی جائے۔ جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا ہے۔ چرخے کی حقیقی قدر و قیمت کے متعلق گاندھی جی کا یہ عقیدہ ہو گیا تھا کہ یہ صرف سوراج حاصل کرنے ہی کا ایک ذریعہ نہیں ہے بلکہ یہ عدم تشدد کی ایک نشانی بھی ہے۔ دراصل ان کے خیال کے مطابق یہ اُس پُرامن، بے خوف اور اپنے آپ پر بھروسہ رکھنے والی سوسائٹی کا ناگزیر نشان تھا جسے وہ ہندستان میں قائم کرنے کے متمنی تھے۔ ان کا خیال تھا کہ شندگان ہند کا ان ڈھروں پر صحیح طور سے دوبارہ مائل ہونا قیام سوراج کے مرادف ہے کیوں کہ انھیں اس کا بھی یقین

تھا کہ کسی غیر ملکی طاقت کا ایک ایسی سوسائٹی پر زیادہ دنوں تک حکومت کرنا ناممکن ہے گو بجواڑے نے انھیں رقم دی مگر کافی تعداد میں چرخے قائم کرنے میں معاون نہ ہوا اس لیے اب انہوں نے اپنی محبوب اسکیم کو آگے بڑھانے کے لیے ایک اور زیادہ نظر فریب طریقہ نکالا اور ہندستان کے ہر بازار میں غیر ملکی کپڑوں کی ایک زبردست ہولی جلانے کا مشورہ دیا۔

اس کے برعکس واقعاتی نقطۂ نظر سے یہ امر بالکل روشن ہونا چاہیے تھا کہ ہندستان میں جتنے کپڑوں کی ضرورت ہے اتنا تیار کر کے تین کروڑ پونڈ کے برطانوی کپڑوں کا مکمل مقاطعہ کر لیا جائے تو برطانوی سرمایہ داری اور شہنشاہیت کا خاتمہ نہیں ہو سکتا تھا کیوں کہ اسکے علاوہ اسے ہندستان سے کروروں پونڈ سالانہ کا فائدہ ہوتا ہے لیکن جیسے ایک سال میں سوراج ملنے کے امکانات پر کوئی چوں نہیں کر سکتا تھا اسی طرح چرخہ کے مقدس مسلک کے خلاف آواز بلند کرنے کی بھی کسی میں جرات نہ ہو سکتی تھی۔

گاندھی جی کے احکام نافذ کرتے ہی بمبئی میں کپڑوں کی پہلی زبردست ہولی جلانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں کانگریس کے رضاکاروں اور کارکنوں کو بلکہ بمبئی کے نیشنل کالجوں اور اسکولوں کے بدنصیب طلبا کو بھی بہت عجلت سے ہدایت کی گئی کہ وہ امیروں کے محلوں، متوسط طبقے کے لوگوں کے محلوں اور غربا کے گھروں سے غیر ملکی کپڑوں کے انبار جمع کریں۔ یورپین سوٹ، ہیٹ، کالر اور نکٹائیاں سب سے زیادہ ہدف لعنت تھیں۔ عورتوں کے تمام غیر ملکی سامان آرائش اور مردوں کے لباس کی معمولی چیزوں کو بھی جو بدیشی کپڑوں سے بنی تھیں غلامی کی نشانی اور غیر ملکی آقاؤں کی وردی کہہ کر ملعون ٹھہرایا گیا۔ ہر محلے کی قریب قریب ہر سڑک کو رضاکاروں کی جماعتوں نے محصور کر لیا تھا جو ان لعنتی اور گناہ آلود کپڑے کے انباروں کو وکٹوریہ، لاری بلکہ ہاتھ گاڑیوں پر بھی لے جاتے نظر آتے تھے۔ پروپگنڈا روز بروز بڑھتا چلا گیا۔ جس طرح گاندھی جی پہلے روپیوں اور زیوروں کے لیے اپیل کیا کرتے تھے اسی طرح اب اُنھوں نے ناٹک والوں کے انداز میں غیر ملکی کپڑوں سے بنی ہوئی اشیا کے لیے التجائیں کرنی شروع کر دیں۔ اس بازی گری کے پروپگنڈے سے رضاکاروں اور عوام میں اس قدر جوش پیدا ہو گیا کہ ہمیں گھوڑے گدھے اور بیل جیسے جانور بھی اعلیٰ غیر ملکی لباس بالخصوص ہیٹ، کالر اور ٹائی میں ملبوس نظر آتے تھے جس کا مقصد یہ تھا کہ عوام کی نظر میں ان چیزوں کی قیمت گھٹ جائے اور شوقین لوگ راضی خوشی سے یہ چیزیں حوالے کر دینے پر مجبور ہو جائیں۔

۳۱ جولائی کو لاکھوں آدمی جن میں سے زیادہ تر کھادی میں ملبوس تھے، مسٹر سوبانی کے کارخانوں کے احاطے میں جو الفنسٹن روڈ پر واقع ہے اس پہلی اور غالباً سب سے بڑی ہولی کی تقریب کا تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہو گیے۔ بہت سے آل انڈیا لیڈر جو کانگریس کمیٹی کے جلسے میں شرکت کی غرض سے آئے تھے وہ بھی موجود تھے۔ گاندھی جی وقت مقررہ پر تشریف لائے اور اس تقریب کی تقدیس پر جو وہ انجام دینے والے تھے ایک مختصر سی تقریر کی اور ریشم اور بیش قیمت سوٹوں کے انبار کو پھونک دیا گاندھی جی ینگ انڈیا (مورخہ ۱۱ اگست) میں لکھتے ہیں "اگر بدیشی کپڑوں کو نذر آتش کرنے کی ضرورت اور علی قدر و قیمت کے بارے میں کسی کے ذہن میں کوئی شبہہ رہا ہوگا تو وہ بریل میں مسٹر سوبانی کے صحن میں اس تقریب کو دیکھ کر سارے شکوک اور شبہات رفع ہو گیے ہوں گے۔ یہ بہت اثر انگیز نظارہ تھا جسے ہزارہا تماشائیوں نے دیکھا۔ جب شعلہ بھڑک اُٹھا اور سارے مینار پر چھا گیا تو فضا خوشی کے نعروں سے گونج اٹھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہماری بیڑیاں کٹ گئی ہیں۔ اس وسیع مجمع پر آزادی کی ایک برقی رو دوڑ گئی اتنا اچھا ہوا کہ صرف چیتھڑے نہیں تھے جو جلا دئے گیے بلکہ بعض عمدہ ساریاں قمیضیں اور جاکٹیں بھی حقارت سے آگ کی نذر کر دی گئیں۔

دوسرا دن یعنی پہلی اگست کا دن، مسٹر تلک کی برسی اور تحریک ترک موالات کے آغاز کے دن کی حیثیت سے منایا گیا۔ پھر چوپاٹی پر لاکھوں مرد اور عورتیں جمع ہوئیں جہاں گاندھی جی اور دوسرے مقرروں کے لیے بیچوں بیچ میں ایک زبردست چبوترہ بنا دیا گیا تھا۔ لیکن ساحل کے ذرات کی طرح بے شمار انسانوں کا مجمع تھا اس لیے اس مجلس کا انتظام کرنا سخت دشوار تھا کیونکہ لاؤڈ اسپیکروں کا انتظام

نہیں کیا گیا تھا۔ گاندھی جی نے صرف اُس بڑے لیڈر کی تعریف پر قناعت کی جس کی عزت کرنے کے لیے لوگ اُسی مقام پر جمع ہوئے تھے جہاں اس بزرگ ہستی کی فانی لاش چتا کے شعلوں کی نذر کی گئی تھی۔

کیا کبھی خواب میں بھی مسٹر تلک کے ذہن میں یہ بات آسکتی تھی کہ اُن کے نام پر ایک کروڑ کی خطیر رقم حکومت خود اختیاری حاصل کرنے کے لیے جمع کی جائے گی اور پھر اس کا بڑا حصہ دقیانوسی چرخوں کے قیام کی خیالی تجویزوں پر صرف کیا جائے گا؟ صنعت و حرفت کے متعلق ان کا زاویہ نظر بالکل جدید اور روشن خیال لوگوں کا سا تھا۔ وہ چرخے کے وہمی مسلک کے کبھی قائل نہ تھے۔ واقعیت پسند سیاسی انسان کی طرح وہ برطانوی کپڑوں اور مالوں کے نہیں بلکہ برطانوی لوگوں کے مقاطعہ پر مسلسل زور دیتے رہے۔ پھر بھی روپیوں کا انبار جمع کرنے اور اُسے اپنے خیالی تجویزوں پر صرف کرنے کی نیت سے گاندھی جی نے ان کے نام کو استعمال کرنے سے دریغ نہ کیا تاکہ مسٹر تلک کے صوبے کی غیر مقلد اقلیت کو مطمئن کردیں۔

اس طرح تحریک جاری رہی۔ اس لیے کہ جو بمبئی نے آج کیا وہی دوسرے دن سارے ہندوستان نے کیا۔ ہزارہا نوجوان اور طالب علم ہفتوں اس خیال سے گاڑیاں بھر بھر کر بدیشی کپڑے جمع کرتے رہے۔ کہ قابل دید ہولیاں روشن کی جائیں۔ اندوہناک حسرت کے ساتھ میں یہ تماشا دیکھ رہا تھا کہ ہمارے صوبے اور خاص طور پر احمد آباد شہر کے ہزاروں خوش استعداد نوجوانوں کی قیمتی قوت عمل بدیشی کپڑے جلوا کر برطانوی اقتدار سے آزادی حاصل کرنے کی مضحکہ خیز تجویزوں اور حرکتوں کے ذریعے زائل کی جارہی ہے۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ یہ شعلے ہماری زنجیروں کو کاٹنے کا کام دیتے ہیں۔ لیکن زنجیریں بہرحال قائم رہیں۔ اور لوگوں نے جو چیز آگ کی نذر کی وہ اصل میں اُن کا جوش منافرت اور انقلابی ہیجان تھا جسے عام تنظیم اور جنگ کی رفتار بڑھانے کے لیے اس سے کہیں زیادہ صحیح طور پر استعمال کیا جاسکتا تھا۔

اکتالیسواں باب

گاندھی جی لنگوٹی میں

ابھی مہاتما اور ان کے نائب ملک بھر میں بدیشی کپڑوں کی ہولی جلا کر جشن منانے میں مصروف تھے کہ اگست کے مہینے میں ہندوستان کے جنوبی مغربی ساحل پر مالابار کے اندر ایک اور خطرناک آگ بھڑک اٹھی جو کئی مہینے تک سلگتی رہی یہ موپلا بغاوت تھی جو حکومت برطانیہ کی پوری قوت سے بھی نہ دب سکی۔ ۲۰ اگست کو مالابار کے موپلاؤں نے کھلم کھلا بغاوت کردی۔ اس بغاوت کا فوری سبب یہ تھا کہ ضلع مجسٹریٹ نے بمقام ترورنگڑی بعض کارکنان خلافت کو گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ تمام جائز سرگرمیوں کا جابرانہ انسداد موپلوں کے اشتعال کا باعث نظر آتا تھا موپلاؤں نے صرف گرفتاری ہی کو نہیں رد کیا بلکہ پہلے حکومت کے خلاف بلوا کردیا اور پھر آخر میں ہندو آبادی کے خلاف بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ موپلاؤں کی جہالت اور دیوانگی

کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہندوؤں کے گھروں کو لوٹنے اور زبردستی مذہب تبدیل کرانے اور ناقابل بیان مظالم کے بے شمار واقعات رونما ہوئے مسلم پبلک ان چیزوں کو باور کرنے پر آمادہ نہ تھی اور مسلم لیڈروں میں سے کم ازکم دو تین اشخاص نے تو اسے تقریباً بالکل نظر انداز کر دیا (ینگ انڈیا۔ صفحہ ۱۱۵۸)

گو یہ صحیح ہے کہ پرانے خیال کے موپلاؤں کا جنون اوّل اُن کے بعض لیڈروں کی گرفتاری سے ابھرا لیکن بعد میں گہرے اقتصادی اسباب کی بنا پر اس کا رُخ ہندوؤں کے خلاف ہوگیا۔ ہندستان کے بہت سے دوسرے حصوں کی طرح مالابار میں بھی ہندو ہی زمیندار اور قرض دینے والے ہیں اور کسانوں نیز دیگر بدحال مزدوروں کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ اس لیے ان حلقوں کے نیم فاقہ کش اور مصیبت زدہ مسلمانوں کے دل میں مالدار ہندوؤں کے اقتصادی مظالم کے خلاف ہمیشہ ایک عناد کا جذبہ کار فرما رہا ہے۔ جب تک اس قسم کے علاقوں میں مصیبت زدہ کسانی دنیا کی اقتصادی اور عمرانی بہتری کے کسی ایسے مضبوط پروگرام پر عمل نہ کیا جائے جو ان حلقوں کے حالات میں یکسانیت پیدا کر دے اس وقت تک اس قسم کے کسی انتشار کے سرچشمے کا سدِّ باب ناممکن ہے۔

مسٹر گاندھی اور کانگریس ان معاملات کا گہرا مطالعہ نہیں کر سکتے تھے اس لیے کہ اگر وہ ایسا کرتے تو وہ ہندوؤں اور متوسط مسلمان طبقے کے درمیان جو جذباتی اتحاد پیدا کرنا چاہتے تھے اُس پر خراب اثر پڑتا۔ اس لیے گاندھی جی نے شتر مرغ کی طرح اخلاقی فقروں کی ریت میں اپنا سر چھپا کر ۸ ستمبر کے ینگ انڈیا میں ایک مضمون کے دوران میں لکھا "موپلاؤں کی تشدد پر اظہار مذمت کرنا اور اُس تشدد کی طرف اشارہ کرنا کامیابی کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے"۔ موپلا بغاوت کے مفہوم پر اسکاٹ لینڈ کے ایک نامہ نگار کا جواب دیتے ہوئے ینگ انڈیا (مورخہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۲۰ء) میں ہندو بزدلوں اور مسلمان غنڈوں کو ایک نہایت اعلیٰ درجہ کا وعظ ارشاد فرمایا۔ وہ اس حد تک پہنچ گئے کہ بزدل ہندوؤں کو یہ نصیحت کی وہ اپنی حفاظت کرنے کے لیے جسمانی تشدد اختیار کریں۔ اُنھوں نے لکھا کہ "موپلا بغاوت ایک دوسرا سبق بھی دیتی ہے کہ ہر فرد کو اپنی حفاظت کرنے کا فن سکھایا جانا ضروری ہے ——— میں یہ چاہتا ہوں کہ ہندو مسلمان دونوں بغیر جان مارے ہوئے مر جانے کی منضبط ہمت پیدا کریں۔ لیکن اگر کسی میں یہ ہمت نہ ہو تو وہ خطرے سے گریز کرنے کے بجائے مارنے اور مارے جانے کا گر سیکھے"۔ اس موضوع پر ۲۶ جنوری ۱۹۲۱ء کو ینگ انڈیا میں پھر لکھتے ہوئے گاندھی جی نے ہندوؤں سے اظہار ہمدردی کے ساتھ ساتھ یہ بتایا کہ ترک موالات کا مفہوم اپنی قوتوں کو ترقی دینا ہے۔ اور ہندوؤں کو چاہیے کہ وہ وحشیانہ قوت سے مقابلہ کرنے اور اگر ضرورت پڑے تو اس عمل میں جان تک دے دینے کی قوت ارادی کو نشوونما دیں۔

قدرتاً انھیں رہنمایان خلافت کے ساتھ موپلاؤں کو ٹھنڈا کرنے کی غرض سے مالابار جانے کی ضرورت محسوس ہوئی لہٰذا ماہ اگست کے دوران میں بہار، آسام اور مدراس کا دورہ ختم کرنے کے بعد وہ کلکتہ سے مولانا محمد علی کے ساتھ مالابار کے لیے روانہ ہوئے۔ حکومت نے انھیں اپنے منصوبوں کے پورا کرنے کی اجازت نہ دی اور ۱۴ ستمبر ۱۹۲۱ء کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے وارنٹ سے مولانا محمد علی بمقام والٹیر ریل ہی پر سے گرفتار کر لیے گئے اور کراچی کے ایک وارنٹ سے ۱۷ ستمبر کو پھر گرفتار ہوئے چوں کہ کراچی کے مشہور ریزولیشن کی ذمہ داری جن رہنماؤں پر عائد ہوتی تھی حکومت انھیں سزا دینا چاہتی تھی لہٰذا اس نے فوراً شوکت علی کو بمبئی میں اور ڈاکٹر کچلو کو شملے میں گرفتار کر لیا اور نیز ہندوؤں کے زبردست مذہبی رہنما ہز ہولینس سری شنکر آچاریہ کو بھی گرفتار کر لیا۔

والٹیر میں مولانا محمد علی کی گرفتاری سے گاندھی جی پر عجیب ردِّ عمل ہوا۔ اُنھوں نے ینگ انڈیا (مورخہ ۲۹ ستمبر ۱۹۲۱ء) میں اس حادثہ کا تذکرہ کرتے ہوئے حسب ذیل حیرت انگیز نکتہ رسی سے مسلمانوں کو تسکین دینے اور عوام کو خوش کرنے کی سعی کی۔

"... اس گرفتاری کو سوراج کے قائم ہونے کی ابتدا سمجھنا چاہیے۔ اب صرف سوراج پارلیمنٹ ہی ان بھائیوں اور ان کے دوسرے

ہمراہی قیدیوں کو جیل کا پھاٹک کھول کر اعزاز کے ساتھ رہائی دلا سکتی ہے۔ اس لیے کہ یہ لڑائی ایک فیصلہ کن جنگ ہے" بہر حال گیارہ برس کے بعد اب بھی یہ جنگ جاری ہے۔

کچھ دنوں بعد ایک اور عجیب تر ردّعمل ہونے والا تھا۔ ابھی اُن کا دل درد سے چور تھا اور اپنے محبوب ساتھی کی گرفتاری سے ان کی روح غیظ وغضب سے جل رہی تھی کہ کسی نے انھیں یہ بتا دیا کہ دھوتی، قمیص اور ٹوپی جیسی معمولی پوشاک کے لیے بھی ضرورت کے مطابق ہاتھ کے کتے اور بنے ہوئے کپڑوں کے دستیاب ہونے میں بڑی دشواری پیش آرہی ہے۔ اپنی ہی ہوئی روح کی گہرائیوں سے اچانک انھیں ایک الہام ہوا کہ ملک کے مفلس ترین لوگ بھی کفایت شعاری سے کام لیتے ہوئے پارچہ کپڑے سے ستر پوشی کرکے محب وطن رہ سکتے ہیں۔ پھر انھیں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر یہ بات قابل عمل ہے تو میں خود ہی کیوں ہندوستان کے سامنے ایک مثال قائم کروں؟ اور ہندوستان کے لاکھوں فاقہ کش انسانوں کے خوفناک افلاس کا ساری دنیا کے کے سامنے مظاہرہ کرنے کے لیے کیوں نہ ایک لنگوٹی باندھ لوں کیوں کہ اس مقصد کے لیے اس سے بہتر اور کوئی نشان نہیں؟ سوچتے ہی اس پر عمل پیرا ہوگئے اُس روز سے گاندھی جی نے لنگوٹی پہننا شروع کردی۔ جسے حال ہی میں اُن کے لندن کے دوران قیام نے ساری دنیا میں مشہور کردیا ہے۔

لیکن کراچی کانفرنس کے لیڈروں کی گرفتاری حکومت کی طرف سے ایک ایسی مستبدانہ حرکت تھی جس کا تقاضا یہ تھا کہ اور زیادہ شدید سیاسی کارروائی کی جائے سب سے بڑ ذمہ داری رہنمایان خلافت پر عائد ہوتی تھی کیوں کہ حکومت نے اپنے اس اقدام کی بنیاد خلافت کانفرنس کے ریزولیشن پر رکھی تھی۔ چناں چہ ۲۱ ستمبر کو "حکیم اجمل خاں کی صدارت میں بمقام دہلی سنٹرل خلافت کمیٹی اور جمعیت العلما کا ایک جلسہ منعقد ہوا اور اُس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ فتوٰی (اس فتوے پر پانچ سو مسلم علما کے دستخط تھے اور اس میں حکومت کی شہری اور فوجی ملازمتوں کو دیندار مسلمانوں کے لیے حرام قرار دیا گیا تھا) تقسیم کرنے کے لیے پھر سے چھپوایا جائے اور کراچی ریزولیشن کا اعادہ کیا جائے ہر جگہ سینکڑوں جلسے ہونے لگے جہاں سامعین کے ہر فرد نے کراچی ریزولیشن کا لفظ بہ لفظ اعادہ کیا" لیکن حکومت نے ان جلسوں کو صرف کراچی کے لیڈروں کی گرفتاری کے خلاف ایک انوکھا احتجاج سمجھا۔ سستی شہادت حاصل کرنے کے لیے خلافت کے لیڈروں نے جو اُمیدیں قائم کی ہوں گی وہ سب حکومت کی خاموشی کے باعث خاک میں مل گئیں اس لیے کہ اُس نے اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی کہ رہنماؤں کی عام گرفتاری یا اُن کے جلسوں میں شریک ہونے والے بے شمار لوگوں پر مقدمہ چلا کر اپنے وقار کو تقویت پہنچائے۔

مسٹر گاندھی اور دوسرے کانگریسی رہنما اُس فروگزاشت کی اصلاح کے لیے بیٹھے جو کانگریس کے آخری جلسے میں اُن سے سرزد ہوئی تھی۔ علی برادران کی گرفتاری کو پیش نظر رکھ کر ۴ اکتوبر تک پڑے سوتے رہنے کے بعد گاندھی جی اور دوسرے تقریباً پچاس مقتدر کانگریسیوں نے ایک اعلان نامہ شائع کیا کہ "ہر شخص کا یہ پیدائشی حق ہے کہ وہ حکومت کے سول اور فوجی محکمے میں شہریوں کی اپنی خدمات پیش کرنے یا ملازمت بدستور جاری رکھنے کے متعلق بلا روک ٹوک اپنی رائے کا اظہار کرے" اس طرح پورے اعلان نامے کی بنیاد آزادیٔ رائے کے اصول پر رکھنے کے بعد دستخط کنندوں نے بیان کیا کہ ایسے نظام حکومت کے تحت جو ہندوستان کی اقتصادی اخلاقی اور سیاسی تنزل کا باعث ہوئی اور جس نے قومی حوصلوں کو دبانے کے لیے فوج اور پولیس کا استعمال کیا ہے مثلاً راولٹ ایکٹ کی شورش کے دوران میں اور جس نے عربوں، مصریوں اور ترکوں کو کچلنے کے لیے جنھوں نے ہندوستان کا کچھ نہیں بگاڑا تھا فوج سے کام لیا بحیثیت شہری اور بالخصوص فوجی سپاہی کی حیثیت سے کام کرنا ہندوستانی کے لیے اس کے قومی اعزاز کے منافی ہے۔ ہمارا یہ بھی خیال ہے کہ یہ ہر ہندوستانی فوجی اور سول ملازم کا فرض ہے کہ وہ حکومت سے قطع تعلق کر دے اور اپنی روزی کا کوئی دوسرا ذریعہ تلاش کرے۔

اس کے فوراً بعد ۵ اکتوبر کو کانگریس کی مجلس عاملہ کا بمبئی میں جلسہ ہوا اور اس اعلان نامے کی تصدیق کر دی گئی جو گذشتہ شام کو جاری کیا گیا تھا، علاوہ بریں اس نے یہ بھی مشورہ دیا کہ جس دن رائل ہائینس پرنس آف ویلز ساحل پر قدم رکھیں اس روز بطور خود عام ہڑتال منائی جائے اور اُن کے ہندوستان کے مختلف شہروں میں جو دورے ہوں ان کے سارے دوران میں پبلک ہڑتال کر دی جائے۔ ۴ نومبر کو دہلی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جو جلسہ ہوا اُس میں بھی اس ریزولیشن کی تصدیق کر دی گئی۔

تعجب تو اس بات کا ہے کہ نہ گاندھی جی نے اس ریزولیشن کو کوئی خاص اہمیت دی۔ نہ ان کے چیلوں نے جو خلافت اور کانگریس میں تھے۔ یہی محلِ نظر ہے کہ آیا علی برادران خود بھی اپنے قبضے کی تمام طاقتوں کو منظم کر کے فوجیوں اور سول ملازموں کو حکومت کی ملازمتوں سے مستعفی ہونے کی ترغیب دینے کی خاطر ایک شدید پروپیگنڈا کے ذریعے اپنے کراچی ریزولیشن کو چلانا بھی چاہتے تھے یا نہیں۔ جب کراچی کانفرنس کے بعد بمبئی میں پھر کانگریس کا جلسہ ہوا تو وہ اُس ریزولیشن کو جو گاندھی جی کے ترکِ موالات کے پروگرام کے تیسرے مرحلے کا جزو لاینفک تھا منظور کرنے کے کھلے ہوئے فرض کو ادا کرنے سے قاصر رہی اور حکومت کو ایک موثر چیلنج دینے کی غرض سے ہندوستان گیر پروپیگنڈے کا ڈھرّا مقرر کرنے میں بھی ناکامیاب رہی۔ یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ گاندھی جی اور اُن کے رفقاء اس موضوع پر رہنمایانِ کراچی کی گرفتاری کو پیش نظر رکھ کر عوام کی عملی قوتوں کو پرنس آف ویلز کے قابل دید مقاطعے پر ضائع کرنے کے بجائے سیاسی پروگرام کے اس جاندار حصے پر اپنی تمام توجہات کو مرتکز کر دیں گے۔ انھوں نے بس احتجاجوں اور دھمکیوں کے ذریعے اپنے کو مطمئن کرنا چاہا۔ جہاں گاندھی جی اپنی رائے (ینگ انڈیا ۱۳ اکتوبر ۱۹۲۱ء) کے مطابق دعویٰ تو یہ کرتے رہے کہ سپاہی کو اُس کے فرض کے متعلق اُس کے روبرو کہنے کا حق ہے مگر نہ انھوں نے اس دعویٰ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کوئی موثر اقدام کیا نہ اُن کے ادارہ نے۔ ایسی حالت میں ظاہر تھا کہ حکومت ان احتجاجی جلسوں کو ایک زبردست مذاق سے زیادہ کچھ نہ سمجھ سکتی تھی۔

کراچی ریزولیشن اور علی برادران کی گرفتاری نے گاندھی جی اور کانگریس کو ایک اول درجے کا سیاسی موقع دیا کہ وہ عوام اور حکومت کے درمیان آخری فیصلہ کن جنگ کی حیثیت سے اپنی ترکِ موالات کی تحریک کو زور شور سے آگے بڑھائیں۔ پس پوچھئے تو اُنھوں نے شروع ہی سے اپنے آپ کو ترکِ موالات کے اس نازک مرحلے کا پابند بنا لیا تھا۔ پھر بھی جب یہ زریں موقعہ آیا تو سب کے سب اس مسئلے کا سامنا کرنے سے بچنے اور ہچکچانے لگے۔ وثوق کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اپنے شعلہ فشاں احتجاجات کے باوجود وہ فوراً پسپا ہوگئے۔ گو یہ لوگ ایک کروڑ روپیہ جمع کرنے اور بدیشی کپڑوں کے مقاطعے کی تجویز کے ہر نقطہ کو عملی جامہ پہنانے میں منہمک رہے لیکن اُنھوں نے یہ دیکھنے کی کبھی زحمت نہ گوارا کی کہ ایک سویلین یا فوجی سپاہی نے بھی سرکاری نوکری سے استعفا دیا یا نہیں۔ نہ سرکاری دفاتر پر پکٹنگ کی فکر کی گئی نہ فوجی بارکوں میں نہ فوج اور پولیس میں کوئی پرجوش اپیل تقسیم کی گئی۔ عوام کے سیاسی جوش کو انتہائی بلندی تک پہنچانے کی غرض سے سب کچھ کرنے کے بعد گاندھی جی نے ایک مرتبہ پھر اُن کا رُخ حقیقی سیاسی مسئلے سے ہٹا کر پرنس آف ویلز کی تفریحی تشریف آوری کے وقتی مقاطعہ کی طرف کر دیا۔ انھوں نے ایک بار پھر ایک حقیقی سیاسی جنگ کے مقابلے میں ناٹک کے سوانگ کو ترجیح دی اور قوم کی عملی قوتوں کا رُخ ایک ایسے جھوٹے اور بیہودہ راستے کی طرف پھیر دیا جو حکومت کی بے وقوفی کے سبب مشیت کی طرف سے ان کے لیے کھُل گیا تھا۔

بیالیسواں باب

پُرامن بغاوت کی طرف

گاندھی جی ملک کے مختلف حصوں میں بدیشی کپڑوں کا کافی ذخیرہ نذرِ آتش کر رہے تھے اور انھیں یہ بات بھی معلوم تھی کہ بہت جلد اُن کو اس سے بھی زیادہ ایک اور بڑی آگ لگانی پڑے گی۔ پُرامن ترک موالات کے پیغمبر کو شاندار تیاریوں اور مقدس رسوم پر بہت دنوں تک توقف کرنا پڑا تھا مگر وقت گزرتا چلا جا رہا تھا اور اب بیکار کھونے کے لیے وقت نہ رہ گیا تھا کیوں کہ نئے حساب سے بھی ایک سال کی میعاد چند مہینوں میں ختم ہونے والی تھی۔ لہٰذا اب وقت تھا کہ یا وہ قوم کو پھسڈیوں کی جماعت قرار دے کر اُس پر لعنت بھیج دیں یا فتح ونصرت کے لیے آخری جنگ کی طرف اس کی رہنمائی کریں۔ چوں کہ ابھی تک وہ اس کی کارگذاریوں کو بڑھا چڑھا کر دکھاتے اور اس کے عیوب کی پردہ پوشی کرتے جا رہے تھے۔ اس لیے ہر طرف سے یہ توقع کی جا رہی تھی کہ آخری جنگ کے لیے وہ اپنا حکم نافذ کرنے ہی والے ہیں

درحقیقت ۳۰ ستمبر تک بھی قوم غیر ملکی کپڑوں کا مکمل مقاطعہ نہ کر سکی اور نہ اس نے مدرسوں اور عدالتوں کا پورا مقاطعہ کیا۔ علاوہ بریں نہ تو کانگریس ایک لاکھ ممبر بھرتی کرنے میں کامیاب ہوئی اور نہ وقت مقررہ پر بیس لاکھ چرخے نصب کرانے میں گاندھی جی ایسے امور میں بہت معقولیت پسند واقع ہوئے تھے۔ وہ بڑے بڑے اقوال کو بآسانی معمولی معمولی تماشوں پر چسپاں کر سکتے تھے۔ بظاہر وہ بس اتنا چاہتے تھے کہ اخلاقی رائے اور عام، ذہنی و جذباتی خلفشار پیدا کر دیں۔ اُس وقت جب ملک متبرک قربانی مناتا اور گاؤں گاؤں شہر شہر بدیشی کپڑوں کو مسترد کرتا جا رہا تھا اُنھوں نے اس مقدس جنگ کے آخری مرحلے کو ممتاز کرنے کے لیے انفرادی اور جماعتی سول نافرمانی کا ایک نیا لائحہ عمل مرتب کرنے کی اشد ضرورت محسوس کی۔

اُن کی غیر معمولی اپج نے کھدّر کے نئے لباس اختیار کرنے اور سول نافرمانی کی جدوجہد میں ایک ربط سا پیدا کر دیا ورنہ اگر یہ ٹھیک سے وضع نہ کیا جاتا اور اس پر سنجیدگی سے عمل نہ ہوتا تو یہ حد سے زیادہ مضحکہ انگیز سمجھا جاتا۔ وہ فی الحال ہر طریقے سے اپنے کو اور اپنے متبعین کو اس امر کا یقین دلانے میں کامیاب ہوئے کہ ہر فرد اور علاقے کے واسطے سول نافرمانی شروع کرنے کی قابلیت کا ثبوت دینے کے لیے پورے طور سے کھدر استعمال کرنا اور کھدّر تیار بھی کرنا ناگزیر ہے۔

جہاں اُنھوں نے حسب معمول پلیٹ فارم اور اپنے اخباروں میں اپنی جنگ شروع کی وہیں انھوں نے خانگی مباحثوں میں اپنے کثیر التعداد پکّے کارکنوں کی آزمائش کر لی اور انھیں گرمانا شروع کر دیا۔ چوں کہ ملک کے مختلف حصوں میں کارکن فرداً فرداً گرفتار کیے جا چکے تھے اس لیے انفرادی سول نافرمانی اپنے رومانی حسن سے خالی ہو چکی تھی پھر بھی گاندھی جی نے تمام چوٹی کے رہنماؤں اور کارکنوں سے یہ تکلیف دہ استفسار شروع کر دیا کہ کس کس نے انفرادی طور پر کتنا کتنا سوت تیار کیا ہے۔ یہ کافی نہ تھا کہ ہم کاتنے کا چرچا پھیلائیں۔ اب ہم میں سے ہر ایک کو بلکہ قابل ترین اور سرگرم ترین مبلغ کو بھی یہ باور کرا دیا گیا کہ فیصلہ کن

مرحلے میں قدم رکھنے کے لیے سوت کاتنا ایک ناگزیر شرط کی حیثیت رکھتا ہے ہم بڑی جفاکشی سے چرخا چلانے کے پروپیگنڈے میں منہمک رہے۔ چناں چہ ہمیں ہاتھ کے کاتے ہوئے سوت کے کئی ہار بھی انعام میں مِل چکے تھے لیکن بدقسمتی سے ہم میں سے بہتیرے خود اپنے ہاتھ سے کاتنا بھول چکے تھے۔ گاندھی جی کی جرح نے ہم کو جرأت دلائی اور ہمارے اندر روزانہ چرخا کاتنے کا ایسا مجنونانہ جوش بھر دیا کہ ہم تبلیغی سرگرمیوں کا نقصان گوارا کرنے لگے اس لیے کہ جدوجہد کے آخری مرحلے میں بہادرانہ شہادت کی قابل رشک سعادت حاصل کرنے کے لیے ہمارے واسطے یہ ضروری تھا۔

اس زمانے میں کوئی مرد، عورت یا بچہ ان پریشان کن سوالات سے بچ نہ سکا۔ مرد اور عورت امیر با اثر اور محبِ وطن لوگ جو کانگریسی مسلک کے نہ تھے روز افزوں تعداد میں گاندھی جی کے ارد گرد جمع ہونے لگے۔ اسکولوں اور کالجوں کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں، دولت مند مالکانِ کارخانہ جات اور دوسرے حکومت و اقتدار کے الش خور اس بات سے خوش ہوتے تھے کہ لفظی نزاع کے میدان میں اس زبردست مہاتما کے کرتب دیکھیں۔ جہاں مالک کارخانہ پر اُس کے سامنے کے کپڑے کی اصل اور تاریخ کے متعلق بے امتیازی سے سوالات کی بوچھار ہوتی وہیں گاندھی جی عورتوں کو بھی جو اُن سے ملنے آتیں اُن کی عمدہ سوتی اور ریشمی ساڑیوں کے تار و پود کے متعلق پیہم سوالات کی بوچھار سے تنگ کرنے میں ذرا بھی نہ ہچکچاتے۔ اگر ان کا وعظ کامیاب نہ رہتا تھا تو بھی وہ اُن سے چرخے کی روحانی مسرت کے بارے میں بات چیت کرتے وقت بہت محظوظ ہوتے۔

لیکن فی الحال سول نافرمانی کی ایک عام نہم کے سب سے زیادہ مشکل مگر ساتھ ہی ساتھ سب سے زیادہ رومانی سوال پر سخت زور دیا جارہا تھا۔ ہم میں سے کسی کو خبر نہ تھی کہ اس سے گاندھی جی کا کیا منشا ہے۔ اس سے پہلے خود گاندھی جی نے اس پر عمل نہیں کیا تھا اس لیے کہ بڑے اور چھوٹے علاقوں میں اُنھوں نے سول نافرمانی کی جو مہمیں جاری کی تھیں وہ ایک قانون یا کئی قوانین کے ایک مجموعے تک محدود تھیں۔ لیکن اس بڑے پیغمبر نے اب ہم سے یہ کہا کہ سول نافرمانی کا مفہوم اس سے زیادہ یا اس سے کم اور کچھ نہیں کہ سیاسی حیثیت سے راندۂ قانون ہو جانا اور تمام غیر اخلاقی قوانین، احکام اور ہنگامی قوانین کا غیر جارحانہ مقابلہ کرنا اور اس طرح حکومت کو تماشہ نا ڈالنا۔ جب اُنھوں نے وجدانی طور پر یہ فیصلہ کیا کہ ہندستان کے دو سو پچاس اضلاع میں سے صرف ایک میں یا اور زیادہ صحیح الفاظ میں یہ کہیے کہ ایسے ضلع کے کسی ایک تعلقے میں سول نافرمانی کا آغاز کر دیا جائے تو شیطانی حکومت کے خلاف مقدس جنگ جاری کرنے میں مہاتما کو کرکشیتر پیش کرنے کے اعزاز کا اہل ثابت کرنے کے لیے گجرات کے مختلف تعلقوں میں مقتدر کارکنوں کے درمیان ایک غیر معمولی لاگ ڈور رقابت قائم ہوگئی۔

ترکِ موالات کا ماہر بھی اس قسم کی جنگ کی رہنمائی کرنے کے لیے اپنا حیرت انگیز طریق کار وضع کرنے میں نہ چوکا اور ینگ انڈیا (مورخہ ۳ نومبر ۱۹۲۱ء) میں ضروری شرائط حسب ذیل الفاظ میں بیان کیے۔

"ستیہ اگرہ کرنے والوں کو ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت پر جس کی بنیاد وقتی مصلحت پر نہ ہو بلکہ جو باہمی حقیقی محبت پر مبنی ہو سخت اعتقاد رکھنا اور صرف ہاتھ کا بنا ہوا کپڑا استعمال کرنا چاہیے۔ اور ہندستان کے دو سو پچاس اضلاع میں سے ایک ضلع بھی اس طرح تیار نہیں تو میرا خیال ہے کہ اس سال کے اندر سوراج کا حصول ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ اگر کوئی بھی ایسا ضلع مل جائے جہاں (۱) نوے فیصدی آبادی نے بدیشی کپڑوں کا مکمل مقاطعہ کر دیا ہو اور اپنی ضرورت کے تمام کپڑے ہاتھ سے کات اور بن کر تیار کرتی ہو (۲) اس ضلع کی پوری آبادی یعنی ہندو، مسلمان، پارسی، سکھ اور عیسائی یا یہودی سب کے سب آپس میں مل جل کر زندگی بسر کرتے ہوں (۳) اس آبادی کے تمام ہندو چھوت چھات کی لعنت سے پاک ہو چکے ہوں (۴) اس آبادی کے ہر دس آدمی میں سے ایک قید ہونے والا اور ضرورت پڑنے پر پھانسی کے تختے پر چڑھنے کے لیے تیار ہو اور (۵) وہ ضلع شہری نقطۂ نظر سے پُر امن رہ کر باعزت طریقے سے حکومت کا مقابلہ کرے اور بقیہ سارا ہندستان تشدد سے احتراز کرتے ہوئے متحدہ طور پر سودیشی لائحۂ عمل پر کاربند رہے تو میرا خیال ہے کہ سال رواں

کے اندر ہی اندر سوراج کے قائم ہو جانے کا پورا امکان ہے۔

فی الحقیقت یہ شرائط نجی مباحثوں کے ذریعے تمام مقتدر کارکنوں تک پہلے ہی پہنچائی جا چکی تھیں۔ یہ بات آشکارا تھی کہ صرف گاندھی جی ہی بذات خود اس قسم کی جنگ کی رہنمائی کے اہل تھے۔ . . . . اس لیے کہ اس کے طریق کار کے وضع کرنے والے بھی تنہا وہی تھے اور ان اہم ترین مسائل پر جو حکومت سے مقابلہ کرنے کی حالت میں ناگزیر تھے، وجدانی طور پر وہ فیصلہ کرسکتے تھے۔ یہ بھی سمجھا جا رہا تھا کہ وہ اس طرح کی جنگ کی گجرات کے کسی حصہ میں قیادت فرمائیں گے اس لیے کہ وہ گجراتی زبان کے ذریعے اپنا شاندار پیغام ہر مرد، عورت اور بچے تک پہنچا سکتے تھے۔ چوں کہ گجرات کے پانچ اضلاع میں سے تین کے بارے میں یہ بلاشک وشبہ سمجھا جا رہا تھا کہ وہ اس قسم کی جنگ میں حصہ لیں گے۔ لہٰذا علی الترتیب اضلاع سورت وکیرا کے کارکنوں نے آنند اور بردولی کے تعلقوں کو اُن تمام اہلیتوں سے آراستہ کرنے کی جان توڑ کوشش شروع کر دی جو گاندھی جی نے عام جنگ کے لیے مقرر فرمائی تھیں۔

اس طرح گاندھی جی نے ایک بار پھر کانگریس کو اپنے لیے ہموار کر کے ۴ نومبر کو دہلی میں اس کا جلسہ طلب کیا تاکہ انھوں نے ینگ انڈیا میں جو پروگرام پیش کیا تھا اس پر اس کی منظوری کی مہر لگ جائے اور وہ لفظ بہ لفظ اس کی تصدیق کر دے۔ کمیٹی نے سرکاری ملازمتوں کے متعلق خواہ وہ سول ہوں یا فوجی مجلس عاملہ کے ریزولیشن کو منظور کرتے ہوئے ایک اور ریزولیشن پاس کیا جس کی رو سے ہر ایک صوبے کو خود اُس کی ذمہ داری پر حسب ذیل شرائط کی پابندی کے ساتھ یہ اختیار دیا گیا کہ وہ سول نافرمانی پر جس میں عدم ادائگی محاصل بھی شامل ہے، عمل پیرا ہو سکتا ہے۔

(۱) انفرادی سول نافرمانی کی صورت میں ہر فرد کے لیے چرخہ کاتنے سے واقف ہونا ضروری ہے، اور پروگرام کے جس حصے کا اُس کا تعلق ہو اُس کا پورا کرنا بھی اُس کا فرض ہی تمام فرقوں کے اتحاد اور عدم تشدد پر اس کا یہ ایمان ہونا چاہیئے کہ یہ قطعی طور پر لازمی ہیں اور اگر وہ ہندو ہے تو اسے اپنے ذاتی چال چلن سے یہ دکھا دینا ضروری ہے کہ وہ چھوت چھات کو قوم کے دامن پر ایک داغ سمجھتا ہے۔

(۲) عام سول نافرمانی کی صورت میں اُس حلقے کی وسیع آبادی کے لیے جو سول نافرمانی میں شریک ہوگی یہ ضروری ہے کہ وہ سودیشی لائحۂ عمل کو اختیار کر چکی ہو اور ترک موالات کے دوسرے تمام مطالبات کا معتقد ہونا اور ان پر عمل پیرا ہونا بھی اس کے ذمے ہے۔

اس نے یہ بھی قرار دیا کہ ستیہ آگرہیوں اور اُن کے خاندانوں کو پبلک فنڈ سے امداد کی توقع نہ رکھنی چاہیے مجلس عاملہ کو یہ بھی اختیار دیا گیا کہ مناسب صورتوں میں وہ اس شرط کو نرم بھی کر سکتی ہے۔

دہلی میں یہ ایک کھلا ہوا راز تھا کہ اگرچہ یہ ریزولیشن عام الفاظ میں ہندستان کے ہر حصے میں سول نافرمانی کو آگے بڑھانے کے لیے مرتب کیا گیا تھا مگر دراصل اس کا مقصد یہ تھا کہ گاندھی جی کو گجرات کے کسی حصے اور بالخصوص بردولی میں جدوجہد شروع کرنے کا اختیار حاصل ہو جائے۔

گاندھی جی نے ۱۰ نومبر کے ینگ انڈیا میں "مہتم بالشان مسئلہ" کے زیر عنوان ایک مضمون لکھا جس میں نئی جدوجہد کے طریق کار کو واضح کیا "جزوی اور انفرادی سول نافرمانی کے نقشوں سے ملک آشنا ہو گیا ہے مکمل سول نافرمانی ایک بغاوت ہے ایسی جس میں تشدد کا شائبہ نہ ہو۔ پکا ستیہ گری سلطنت کے اقتدار کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے۔ وہ سلطنت کے ہر غیر اخلاقی قانون سے بے پروائی کا مدعی ہو کر حلقۂ قانون سے نکل جاتا ہے۔ مثلاً وہ محاصل کی ادائگی سے انکار کر سکتا ہے۔ وہ اپنے روزمرہ کے معاملات میں سلطنت کا اقتدار تسلیم کرنے سے انکار کر سکتا ہے وہ مداخلت بے جا کے قانون کو ماننے سے انکار کر سکتا ہے اور فوجی سپاہیوں سے اُن کی بارکوں میں جا کر گفتگو کرنے کا دعویدار ہو سکتا ہے۔ پکٹنگ کے طریقوں پر جو حدود

عائد کئے جائیں ان کو قبول کرنے سے انکار کرسکتا ہے اور ممنوعہ علاقوں میں پکیٹنگ کر سکتا ہے، ان تمام باتوں کے کرنے میں وہ کبھی قوت استعمال نہیں کرتا اور نہ اس قوت کا مقابلہ کرتا ہے جو اس کے خلاف استعمال ہو۔"

ان لوگوں کے لئے جو ایسی قربانی کو بے کار محض خیال کریں حسب ذیل نکتے تحریر فرمائے۔

"وہ سلطنت کو اس بات پر مجبور کرنے کے درپے ہے کہ وہ اُسے کسی اخلاقی خلاف ورزی کے بغیر ہی گرفتار کرلے، اس طرح غور کیا جائے تو ستیہ آگرہ کسی رُوح کی بے چینی کا پرزور اظہار اور ایک بُری سلطنت کے بدستور جاری رہنے کے خلاف ایک موثر احتجاج ہے، کیا سارے اصلاح کی تاریخ اس کے سوا کچھ اور ہے؟"

بالآخر تمام صوبائی کمیٹیوں کو عام سول نافرمانی کے نقشے پر بعجلت کاربند ہونے کے خلاف متنبہ کرتے ہوئے انہوں نے حکم دیا کہ اس وقت وہ خود (گاندھی جی) اپنے منتخب حلقے میں جدوجہد کی قیادت کررہے ہوں، سودیشی کے معاملے کے علاوہ حکومت کے تمام ظالمانہ اور بُرے احکام کی بھی پوری پابندی کریں۔ انہوں نے لکھا کہ "میں فی الحال جہاں تک اندازہ کرسکتا ہوں ایسی صورت میں جب کہ ہندوستان کا کوئی ایک حصہ قصداً مقاومت کا اقدام کررہا ہو اور حتی الامکان سلطنت کے ہر غیر اخلاقی قانون کی بالارادہ خلاف ورزی کا مرتکب ہو رہا ہو، ہندستان کے تمام دوسرے حصوں کے لئے ہر حالت میں یہ بہترین بات ہوگی کہ وہ نہایت احتیاط کے ساتھ حکومت کے تمام احکام اور ہدایات کا احترام کرے، یہ اضافہ کرنے کی ضرورت نہیں کہ اگر ہندستان کے کسی حصے میں بھی تشدد رونما ہوا تو اس تجربے کو ضرر پہنچائے گا، اور ممکن ہو کہ ان سے روک بھی دے اگر اس علاقے کے لوگوں کو جہاں یہ تجربہ ہو رہا ہے قید کرلیا جائے، گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے یا حکام ان سے بُرا سلوک کریں تو یہ توقع کی جائے گی کہ دوسرے حصے خاموش اور غیر مضطرب رہیں گے۔"

کسی حلقے کو ایسی غیر مزاحم بغاوت پر کاربند ہونے کا اہل بننے کے لئے انتہائی ناممکن باتوں کو ضروری مبادیات قرار دینے کے بعد گاندھی جی نے ہندستان کی بقیہ وسیع آبادی کو ایسی بغاوت پر عمل پیرا ہونے سے باز رکھنے کے لئے اور بھی زیادہ ناممکن شرطیں پیش کیں، اگر ان کی ہر خواہشات کے مطابق یہ بغاوت کسی ایسے چھوٹے سے علاقے تک محدود کر دی جاتی جس کی آبادی ہندستان کے پینتیس کروڑ آدمیوں میں سے صرف ایک یا دو ہزار انسانوں پر مشتمل ہو تو اس سے زیادہ اور کیا حکومت کا مطلب ہو سکتا تھا، کیوں کہ اُن کے مفہوم کے مطابق کوئی شخص یہ یقین نہیں کرسکتا تھا کہ حکومت برطانیہ تو کیا اس زمانہ کی کوئی بھی حکومت کسی ایسی بغاوت سے دب کر ہار مان لے گی، جو ایک وسیع ملک کے کسی چھوٹے سے گوشے میں برپا ہو، اس لئے خود گاندھی جی کے الفاظ میں ان کی تحریک "ہندستان کے دُکھ کا ایک پُرزور اظہار" اور "بُری سلطنت کے بدستور قائم رہنے کے خلاف ایک بلیغ احتجاج" ہی ہوسکتی تھی اور وقت آنے پر اس مظاہرہ کے بعد حکومت سے ذاتی گفت وشنید کی باری آتی جو چند اصلاحات اور مراعات پر منتہی ہوجاتی اور نہ نظام حکومت میں کوئی بنیادی انقلاب ہوسکتا تھا۔

یہ بھی سمجھنا آسان نہیں کہ سودیشی پروگرام کے پوری طرح اختیار کرلینے اور جنگ آزادی میں لوگوں کے ذوقِ ایثار اور برداشت مصائب کی صلاحیت میں آخر کس تعلق کا امکان ہوسکتا تھا، درحقیقت اس وقت گاندھی جی کی نظر میں سودیشی جواب کھدر کا مرادف ہو چکا تھا، صرف اقتصادی آزادی ہی کا نہیں بلکہ اخلاقی اور سیاسی صلاحیت کا بھی نشان تھا، سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے لئے یہ چیز ایک چھوٹی شکل میں عدم تشدد اور تنظیمی کمال کے جوہر کا مظہر تھی، لیکن جو لوگ اسے واقعاتی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں ان کے لئے یہ بات بالکل کھلی ہوئی ہے کہ کارکنوں کی ایک جماعت کی وہ کتنا ہی دلیر اور جفاکش کیوں نہ ہو جاری کی ہوئی چند ماہ کی کھدر کی عارضی سرگرمی کا مقابلہ مزدوروں اور کسانوں کی گروہ کی کسی ایسی تنظیم سے نہیں کیا جاسکتا تھا جس کی بنیاد محض ان کے روزمرہ کے اقتصادی اور سیاسی مفادات پر رکھی گئی ہو، گاندھی جی نے جو کچھ منصوبہ باندھا تھا، وہ محض اتنا تھا کہ وہ ایک چھوٹے سے زرعی علاقہ میں چند لاکھ کاشتکاروں اور کسانوں کی ہڑتال کرانی چاہتے تھے اور اس قسم کی ہڑتالوں کی کامیابی کا انحصار ہمیشہ ہڑتال کرنے والوں کی قوت و اتحاد پر ہوتا ہے۔

مگر گاندھی جی کو اس قسم کے بنیادی اور واقعاتی نظریوں سے دُور کا بھی واسطہ نہ تھا، طبیعت کے تقاضے اور اپنی پرانی عادت کی بناء پر گاندھی جی کا یقین ہو گیا ہے کہ وہ مشکل مسائل کے حل تک پہنچنے کے لئے قیاسی اور وجدانی طریق کار اختیار کرتے ہیں، اور اب جب کہ جدوجہد کی پابندیاں اور شرائط حسب معمول

نظرانداز ہوگئیں تو ان کی جنگجویانہ گرج اور جنگی نعروں سے سارے ہندستان کی فضا برقی رَو سے معمور ہوگئی، تو توقعات انتہائی حد کو پہنچ گئیں، اور ملک بڑی بے صبری اور تعظیمی ہیبت کے ساتھ مہاتما کے آئندہ اقدام کا انتظار کر رہا تھا، وہ عنقریب اپنے منتخبہ میدان جنگ میں لڑائی کا آغاز کرنے والے تھے اور اس طرح اپنے وسیع اور تاریخی ملک کے لیئے آزادی کی جنگ چھیڑ کر ساری دنیا کو اپنی طرف ہمہ تن متوجہ کرنے والے تھے!!

تینتالیسواں باب

بلوے اور جبر و انسداد

جنگ کا اعلان کیا جا چکا تھا مگر عوام کے اتفاقاً مشتعل ہو جانے کے واقعہ سے مکمل فتح کا جام گاندھی جی کے لبوں سے ٹکرا کر چور ہو گیا۔

"۱۷ر نومبر کو ہز رائل ہائی نس پرنس آف ویلز ساحل بمبئی پر اُترے، جہاں حکام، راجگان، یوروپینوں، یوریشینوں پارسیوں اور دوسرے امیر لوگوں نے ان کا استقبال کیا، دوسری جانب اوسط درجہ اور نیچے طبقے کے لوگوں نے ان کا مقاطعہ کر دیا، عوام قابو سے باہر ہو گئے اور اُنہوں نے استقبال کا تماشہ دیکھنے والوں کو راستے میں چھیڑنا شروع کر دیا، ہوتے ہوتے جھگڑا بڑھ گیا، عوام کے مجمعوں نے ٹرام گاڑیوں کو آگ لگا دی۔ شراب خانوں کو تباہ کر دیا، اور کچھ پارسی خواتین سے چھیڑ چھاڑ بھی کی، مہاتما گاندھی اتفاق سے بمبئی ہی میں تھے اور شہر کے ایک دوسرے حصے میں جلسہ کرنے میں مصروف تھے، عوام کو ٹھنڈا کرنے کے لیئے وہ مقام واردات پر فوراً پہنچ گئے" (بابو راجندر پرشاد، دیباچہ ینگ انڈیا)

آشوب گاہ میں جانے کے بعد گاندھی جی نے وہاں کی صورتِ حال کے متعلق جو کچھ فرمایا وہ حسب ذیل ہے:-

"میرے خوابوں کی امیدوں کا مرکز بمبئی کی شہرت تھی جس پر کل دھبہ لگ گیا، اور کب! ٹھیک اس وقت جب میں اپنی سادہ لوحی سے اہل شہر کو باوصفِ اشتعال انگیزی عدم تشدد برتنے پر مبارکباد دے رہا تھا.... میں کیا جانتا تھا کہ عین اُس وقت جب پرنس آراستہ راستوں سے گذر رہے تھے اور شہر کے دوسرے حصہ میں بدیشی کپڑوں کے انبار نذرِ آتش کئے جا رہے تھے اور کارخانوں کے مزدور اپنے مالک کی مرضی کی مجرمانہ خلاف ورزی (مجرمانہ کا لفظ قابلِ لحاظ ہے) کرتے ہوئے کارخانوں کو یکے بعد دیگرے بہ جبر خالی کرا رہے تھے، ایک زبردست مجمع ٹرام گاڑیوں میں پُرامن مسافروں کو چھیڑ رہا تھا اور ٹرام کی آمد و رفت رُکے ہوئے تھا، اور یہ کہ وہ لوگ جو بدیشی ٹوپی دیئے ہوئے تھے، ان کی ٹوپیاں زبردستی چھین کر انھیں برہنہ سر کر رہا تھا اور غیر مزاحم یورپینوں کو پتھر وغیرہ مار رہا تھا، جوں جوں دن گزرا عوام اپنی ابتدائی کامیابی کے نشہ میں سرشار ہو کر اور زیادہ مشتعل اور برہم ہو گئے اُنہوں نے ٹرام گاڑیاں اور ایک موٹر پھونک دیا، شراب خانے جلا دیئے، میں نے سُنا کہ بندوق چلنے سے جانیں بھی گئیں، اور اینگلو انڈین کوارٹروں میں لوگ اگر اپنی کھدر کی قمیص اور ٹوپی نہ آتار دیتے تو ان پر مار پڑتی تھی، میں نے سنا ہے کہ ان میں سے بہتیرے شدید طور پر مجروح بھی ہوئے یہ بات ایسے چھ ہندو اور مسلمان کارکنوں کے بیچ میں بیٹھا لکھ رہا ہوں جو ابھی ابھی آئے ہیں، ان کے سر ٹوٹے ہوئے ہیں خون جاری ہے ان میں سے ایک کی ناک کا بانسہ ٹوٹ گیا ہے اور ایک بُری طرح زخمی ہے جس کی زندگی خطرے میں ہے"

باشندگانِ ہند نے جو اپنی قوت اور تعداد سے آگاہ ہو چکے تھے "وفادار" جماعتوں کو پرنس آف ویلز کا خیر مقدم کرنے سے روکنے کی کوشش کی، یوروپین اور اینگلو انڈین پولس اور فوج کی مدد سے وحشیانہ انتقامی کارروائیوں پر اُتر آئے اگر اس قسم کا فساد یورپ میں ہوتا تو بالکل فطرت

اور سول کے مطابق سمجھا جاتا، جرمنی میں نازیوں اور اشتراکیوں، آئرستان کی آزاد سلطنت والوں اور وہاں کے پروٹسٹنٹ مذہب کی سیاسی انجمن والوں اور ہسپانیہ میں سول گارڈ اور مزدور جماعت کے کارکنوں کے درمیان جو ٹکریں ہوئیں انہیں یہاں مخالف جماعتوں کے درمیان گہری دشمنی کے قدرتی نتائج سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مگر گاندھی جی کے معاملہ میں ایسا نہیں سمجھا جا سکتا کیوں کہ انہوں نے عدم تشدد کو اپنی تحریک کا لازمی جزو قرار دے دیا تھا۔

گاندھی جی آگے چل کر لکھتے ہیں: "میری رائے میں عام سول نافرمانی کو از سر نو زندہ کرنے کی امید پھر خاک میں مل کر رہ گئی۔ عام سول نافرمانی کے لئے جو فضا درکار ہے وہ یہاں مفقود ہے، یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ ایسا ماحول بردولی میں موجود ہے اور بمبئی کے تشدد کے ساتھ یہ جاری رہ سکتا ہے۔ یہ ناممکن ہے، بمبئی اور بردولی میں سے کسی ایک کو بھی غیر متعلق اور علیحدہ وحدت کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا جا سکتا، یہ ایک بڑے کل کے ایسے اجزا ہیں جو ایک دوسرے سے جدا نہیں کئے جا سکتے، مالابار کو الگ کر دینے کا امکان ہو سکتا تھا، یہ بھی ممکن تھا کہ ان سارے گاؤں کی پروا نہ کی جاتی۔ مگر بمبئی کو نظر انداز کرنا ناممکن ہے۔"

جیسا کہ پہلے انہوں نے احمد آباد میں کیا تھا، اسی طرح کانگریس کے نام پر ان کو اس مرتبہ بھی فسادات کی ساری ذمہ داری اپنے کندھوں پر لینے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہ محسوس ہوئی "تارکین موالات ذمہ داری سے نہیں بچ سکتے۔۔۔۔۔۔ ہم اس بات کے مدعی ہیں کہ ہم نے ایک پُرامن ماحول پیدا کر دیا ہے یعنی ہم نے اپنے عدم تشدد کے ذریعے لوگوں پر اتنا کافی قابو پا لیا ہے کہ ان کے تشدد کو بس میں رکھ سکیں، مگر ایسے وقت جب کہ ہمیں کامیاب ہونا چاہئے تھا ہم ناکامیاب رہ گئے۔"

جب یہ عام فسادات اور سرکاری انتقامی کارروائیوں کی بدمستیاں بلا روک ٹوک دو روز تک جاری رہیں تو گاندھی جی نے تا اختتام فسادات روزہ رکھنے کا اعلان کر دیا، انہوں نے ۱۹ نومبر کو اعلان کیا کہ "جب تک بمبئی کے ہندو اور مسلمان، پارسیوں عیسائیوں اور یہودیوں سے اور تارکین موالات اہل موالات سے صلح کرلیں، اس وقت تک پانی کے سوا نہ میں کچھ کھاؤں گا، اور نہ کچھ پیوں گا، آخر کار ۲۳ نومبر کو امن قائم ہو گیا اور تمام فرقوں اور سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کی درخواست پر گاندھی جی نے ایک پبلک ناشتے کی تقریب میں اپنا برت توڑا، اس موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ:-

فسادات کے باعث مجھے معدہ خالی ہی رکھنے میں امن نظر آیا، اور انہوں نے سب کو ہدایت کی کہ وہ آئندہ تشدد پر عمل پیرا نہ ہوں۔

اب واقعات کی رفتار اتنی تیز تھی کہ گاندھی جی کو پُرامن و پرسکون خاموشی میں آہستہ آہستہ بہنے کا موقعہ نہ تھا، اس لئے کہ ۱۹ نومبر کی ہڑتال ہندوستان کے بڑے بڑے تمام شہروں میں امتیازی طور پر کامیاب ثابت ہو چکی تھی، اور اس میں کہیں بھی بمبئی کی طرح تشدد کی سرشاری سی خرابی بھی نہیں پیدا ہوئی تھی، نہ کوئی دوکان کھلی ہوئی نظر آئی اور نہ کرائے کی گاڑیاں دکھائی دیتی تھیں بعض پبلک دفاتر بھی اس لئے بند کر دئے گئے کہ افسران متعلقہ آمد و رفت کا کوئی سامان نہ ہونے کے باعث دفتروں میں حاضر ہونے سے معذور تھے مگر ہڑتال کی کامیابی سے یوروپینوں کی تمام جماعتوں پر ہراس و سراسیمگی طاری ہو گئی، ایوان تجارت بنگال اور یوروپین ایسوسی ایشن کلکتہ نے بمبئی کے بلوؤں کا عذر پیش کرتے ہوئے حکومت پر زور ڈالا کہ وہ شدید کارروائیاں شروع کر دے، لارڈ ریڈنگ کی حکومت نے جس نے عوام کے احتجاجات اور تنبیہوں کے باوجود پرنس آف ویلز کو بلوایا تھا یہ فیصلہ کیا کہ بزور شمشیر شہزادے کا استقبال کرایا جائے۔ فسادات بمبئی کے شروع ہونے سے پہلے ہی ۱۹ نومبر کو حکومت بنگال نے ترمیم شدہ ایکٹ قانون جرائم برائے ہند، ۱۹۰۸ء کے دفعہ ۱۷ کے تحت خلافت اور کانگریس کے رضاکاروں کی جمعیتوں کو اور اسی قسم کی دوسری جماعتوں کو خلاف قانون قرار دیدیا۔ حالانکہ یہ قانون دراصل مزاحمی جماعتوں اور خفیہ انجمنوں کو کچل دینے کی غرض سے پاس ہوا تھا، پنجاب، یوپی، بہار، آسام اور اڑیسہ کی حکومتوں نے بھی حیرت انگیز عجلت سے تمام رضاکارانہ اداروں کے "خلاف قانون" ہونے کا اعلان کرتے ہوئے نوٹسیں جاری کیں، متعدد مقامات پر "باغیانہ جلسوں" کا ضابطہ بھی جاری کیا گیا، تمام مختلف صوبائی کانگریسی اداروں کے رہنماؤں نے حکومت نے اس متکبرانہ چیلنج کا جواب اس طرح دیا کہ وہ خود بھی رضاکاروں کے دستوں میں بھرتی ہو گئے اور ہزاروں نوجوانوں کو بھی بحیثیت ممبر بھرتی کیا۔

اسی دوران میں ۲۲ اور ۲۳ نومبر کو کانگریس کی مجلس عاملہ کا جلسہ منعقد ہوا، اور اس نے صوبائی کانگریس ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کمیٹیوں کو ہدایت کی کہ وہ اپنے علاقوں میں والنٹیر بورڈ قائم کریں تاکہ رضاکاروں کے موجودہ دستوں کو یکساں تنظیم کے تحت لایا جائے۔

اوران پر قابو رکھا جائے۔ اس بات کو عمل میں لانے کے لئے انھیں تحریری ہدایتیں بھی دی گئیں، اس میں ایک معاہدہ کا خاکہ بھی پیش کیا گیا، جو رضاکاروں سے دستخط لینے کے لئے تیار کیا گیا تھا، اس معاہدے میں عدم تشدد، چرخا کاتنے اور خاص کھدر کے استعمال پرزور دیا گیا تھا اور وعدہ لیا گیا تھا، کہ انہیں اپنے فرائض کی انجام دہی کے سلسلہ میں ہر قسم کا جوکھم (جسم وجان کا اور آزادی کا) مول لینا ہوگا [1]

جب گاندھی جی مجلس عاملہ کے جلسے کی شرکت کے بعد بمبئی سے واپس ہوئے تو [illegible] خوش قسمتی سے مجھے سورت میں اُن سے ملنے کا موقعہ ملا۔ اناویلا آشرم کے مچھروں سے بھرے ہوئے ایک کمرے میں بے چینی سے کروٹ بدل بدل کر رات گزارنے کے بعد علے الصباح انہوں نے صوبے کے مقامی کارکنوں سے ملاقات شروع کی، تھوڑی دیر بعد دراز قامت سوامی شاردھانند کمرے میں داخل ہوئے، گاندھی جی اُن سے گلے ملنے کے لئے نہایت محبت اور گرم جوشی سے کھڑے ہوگئے، سوامی جی، سیاسی صورتِ حال پر گاندھی جی سے بحث کرنے کے لئے دلی سے آئے تھے، لالہ لاجپت رائے کا بھی ایک قاصد موجود تھا جو حکومت کے جاری کردہ ہمہ گیر ہنگامی قوانین کے بارے میں گاندھی جی کا ذاتی پیغام لینے آیا تھا، ایک عام مباحثہ چھڑ گیا۔ اگرچہ گاندھی جی بہت بشاش دکھائی دیتے تھے۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں مجھے معلوم ہوگیا کہ اُنہیں فسادات بمبئی سے جو شدید تکلیف اور رنج پہنچا تھا، اس کے اثرات ابھی پورے طور پر زائل نہ ہوئے تھے، اس وقت گاندھی جی پر یاس وندامت کا غلبہ تھا، اس لئے وہ کوئی صاف سلجھی ہوئی ہدایتیں نہ دے سکتے تھے، وہ درس دینے کے بجائے درس لینے کی فکر میں مبتلا ہوتے تھے، وہ موقع کے انتظار میں تھے اور حکومت کی مزید نقل وحرکت کا انتظار کرنے کے خواہشمند تھے، چوں کہ وہ ڈرتے تھے کہ کہیں تشدد برپا نہ ہوجائے اس لئے وہ دہلی یا پنجاب کے رہنمایان کانگریس کو تازہ ہنگامی قوانین کے نفاذ پر بھی فی الفور حکومت کے خلاف معرکۂ عظیم چھیڑ دینے کی ہدایت کرتے ہوئے گھبراتے تھے اس لئے انہوں نے محتاط دانشمندی اور سیاسی خبرداری کے بہت سے الفاظ ارشاد فرماکر سوامی شاردھانند اور لالہ جی دونوں کو آزاد چھوڑ دیا کہ جو کارروائی مناسب سمجھیں کریں، کیوں کہ اس وقت وہ دہ دُور سے "عقل ودانش" کی راہ بتانے کے سوا اور کچھ کرنے سے معذور تھے۔

اسی اثناء میں ہمارے سورت اور برَدولی کے بہت سے دوستوں نے مہاتما کو برَدولی آنے کی اشد ضرورت کا احساس دلایا۔ کیوں کہ اُن لوگوں کے خیال میں مہاتما کی بار بار پیش کی ہوئی شرطوں کے پورا کرنے میں بردولی نے کافی ترقی کرلی تھی۔ انہوں نے فسادات بمبئی کے پیش نظر چند ہی روز پہلے عام سول نافرمانی کے پورے پروگرام کو خارج کر دیا تھا، لیکن اب انہیں اس پر آمادہ کرلیا گیا کہ وہ مسلمانوں کے ایک عالم مولانا آزاد سبحانی کے ساتھ اپنی تشریف آوری سے جو عرصہ سے ملتوی ہورہی تھی بردولی کو سرفراز فرمائیں، مولانائے موصوف کی ہمراہی خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔

ہم بردولی کا قصہ فی الحال یہیں چھوڑتے ہیں اور ان واقعات کی طرف واپس آتے ہیں جو ملک میں تیزی کے ساتھ رونما ہو رہے تھے"۔ دسمبر کے پہلے ہفتہ میں وہ دَور شروع ہوا جسے دَورِ تشدد سے تعبیر کیا جاتا ہے، مشتہر شدہ احکام کی خلاف ورزی کے سلسلہ میں پنجاب میں لالہ لاجپت رائے، بنگال میں مسٹر جتیندر لال بنرجی اور ملک میں اور بہت سے رضاکار گرفتار کرلئے گئے احمد آباد کانگریس کے صدر منتخب دیش بندھو داس، مولانا ابوالکلام آزاد اور ہزار ہا رضاکار بنگال میں پکڑ لئے گئے، عورتوں کی بھی گرفتاری عمل میں آئی۔ اِس میں مسٹر داس کی اہلیہ محترمہ ان کی بہن اور بھانجی بھی شامل تھیں، جنھیں ایک روز شاہ راہِ عام پر رکاوٹ پیدا کرنے کے معمولی سے جُرم پر پکڑ لیا گیا، چند ہی دنوں میں ہزاروں آدمی جیل پہنچ گئے، اعتدال پسند حلقوں میں بھی اس پر بہت چیخ وپکار مچی اور اُن کے مقتدر رہنماؤں اور انجمنوں نے حکومت کے پاس اپنے احتجاجات ارسال کئے"۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا ہندستان مشتعل ہے۔

جب گاندھی جی بردَولی سے اپنے آشرم میں آئے تو ان پر چاروں طرف سے اس خبر کی بوچھار کی گئی، اس نے ان کے اندر

---

[1] اس بیان کی بنیاد بہت کچھ بابو راجندر پرشاد کے ینگ انڈیا کے دیباچہ پر رکھی گئی ہے۔

بھی رُوح پھونک دی اور بجلی سی دوڑادی۔ ان کی افسردہ ہمت میں ایک بار پھر جان سی پڑ گئی، فسادات بمبئی کی اُداس پرچھائیاں فضا میں تیزی سے غائب ہونے لگیں، فی الحقیقت ان کی پوری ذہنیت یکایک تبدیل ہو گئی، وہ اس واقعہ سے بہت شکرگذار ہوئے کہ حکومت آخرکار بیدار ہو گئی اگرچہ اس حد تک بیدار نہیں ہوئی تھی کہ وہ کانگریس کی نئی ترقی یافتہ قوت کو تسلیم کر کے اس کا اندازہ لگائے، اُنہوں نے خیال کیا کہ آخر کار ہیں نے حکومت کو متوجہ کر لیا، گاندھی جی (ینگ انڈیا مورخہ ۸ر دسمبر میں) لکھتے ہیں " پنجاب میں لالہ لاجپت رائے، مسٹر سنتانم، مسٹر گوپی چند، آسام میں، مسٹر پھوکن اور بردولائی بنگال میں بابو جتیندر لال بنرجی، اجمیر میں مولانا معین الدین اور دیگر اصحاب اور لکھنؤ میں مسٹر ہرکرن ناتھ اور دیگر حضرات کی گرفتاری کوئی مذاق نہیں ہے۔ اس سے صرف یہی ظاہر نہیں ہوتا، کہ حکومت محض مستعد ہو گئی ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب زیادہ دنوں تک ترک موالات کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، اب یہ سوال تشدد کو دبانے کا نہیں رہا، یہ زبردستی تعاون حاصل کرنے کا معاملہ ہے اور یہی مدعا بھی ہے، حکومت کو ایک نہ ایک دن اپنے اصلی رنگ میں ظاہر ہونا تھا، انہوں نے قوم کو زوردار الفاظ میں مخاطب کرتے ہوئے اس طرح اپنا مضمون ختم کیا" اگر ہم نے ان گرفتاریوں سے جی چھوڑ دیا، یا ہماری ہمتوں میں پستی آ گئی تو یہ حصول سوراج کے لئے ہماری نااہلیت کا کھلا ہوا نشان ہوگا، اسے سپاہی نہیں کہا جا سکتا۔ جو کسی ایسی قربانی کا جس کا اس سے مطالبہ کیا جائے پیش کرنے پر رضامند نہ ہو، یا ڈر جائے، ــــــ مجھے یہ یقین ہو چکا ہے کہ بحث و دلیل سے نہیں بلکہ بے گناہ کی تکالیف سے ظالم و مظلوم دونوں متاثر ہوتے ہیں، اس قسم کی اذیت کے نظارے سے قوم اپنی قدیم عدم توجہی اور گورنر اپنے جذبات قلبی سے نجات پا جائیں گے، ــــــ جو سب سے زیادہ اذیت جھیلتا ہے، وہی سب سے بڑی خدمت انجام دیتا ہے، ــــــ"

چند روز بعد دیش بندھو داس اور مولانا ابوالکلام آزاد کی گرفتاری نے ان کے اندر اور بھی دم خم پیدا کر دیا، انہوں نے ان گرفتاریوں کو کانگریس کی منظم طاقت کے خلاف براہ راست چیلنج قرار دیتے ہوئے حسب ذیل مجاہدانہ الفاظ میں ان کا جواب دیا۔ (ینگ انڈیا ۱۵ر دسمبر ۱۹۲۱ء) " لارڈ ریڈنگ نے اپنا قول سچ کر دکھایا، ملک کے بڑے سے بڑا انسان بھی گرفتاری سے محفوظ نہ رہ سکا، صدر منتخب رضاکاروں کو بھرتی کرنے اور اعلان نامے شائع کرنے کے بعد گرفتاری سے کیونکر بچ سکتے تھے، ــــــ کلکتہ میں شہزادہ کی آمد کے دن ہڑتال منانے کی سرگرمیوں میں کوئی کمی نہیں واقع ہوئی، میرا خیال ہے کہ اسی قسم کی کسی دلیل کی بنا پر صدر منتخب کی گرفتاری عمل میں لائی گئی، ــــــ کھلی سی بات ہے کہ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہڑتال روک دی جائے ان گرفتاریوں کا مطلب یہ ہے کہ حکام خاموش تحریک عدم تعاون کو بھی برداشت نہیں کرنا چاہتے تھے، دراصل وہ دوکانوں کو زبردستی کھولنا چاہتے ہیں لہٰذا وہ اب لوگوں کے لئے یہ اور زیادہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ۲۴ر دسمبر کو ہڑتال منائیں (یعنی کلکتہ میں پرنس آف ویلز کے ورود کے دن) رہنماؤں کی عزت کا تقاضہ ہے کہ باشندگانِ کلکتہ مکمل طور پر ہڑتال منائیں، ہمارا حقیقی امتحان کا وقت یقیناً اب آیا ہے، کیونکہ قوم واقعی بیدار ہو گئی ہے، بے شمار مرد و عورت میدان میں نکلیں گے اور ہمیں ان کی رہبری کرنی ہوگی، ہماری رسد رسانی حکومت کے مطالبے کے عین مطابق ہونی چاہیئے، جب ہم اپنے کو اس مطالبہ کے پورا کرنے کا اہل ثابت کر دیں گے تو فتح ہماری ہوگی "

کسی اور چیز نے گاندھی جی کی ہمت میں اتنا اضافہ نہیں کیا جتنا کلکتہ میں بعض خواتین کی غیر متوقع گرفتاری نے کیا، مجھے اُن کا رد عمل خوب یاد ہے کیونکہ جب گاندھی جی کو تار موصول ہوا تو اتفاق سے میں ان کے آشرم میں موجود تھا، جب انہوں نے اس مسرت خیز خبر کو سُنا تو سر سے ان کی طبیعت اور مزاج کی کیفیت ہی بدل گئی انہوں نے محسوس کیا کہ یہ تو اتنا اچھا ہوا کہ بیان نہیں کیا جا سکتا، اس سے پہلے دفاعی سول نافرمانی کے کٹھن راستے پر گامزن ہونے کے متعلق جتنے کچھ بھی مشکلات و شکوک انہیں محسوس ہو رہے تھے، وہ سب ہوا ہو گئے۔ انہوں نے اس خبر پر حسب ذیل الفاظ میں اظہار رائے کیا (ینگ انڈیا ۱۵ر دسمبر ۱۹۲۱ء) خواتین کلکتہ نے کھادی فروخت کرنے کی کوشش میں شرفائے کلکتہ سے کچھ مزاحمت کی، اخبارات میں ایک تار شائع ہوا ہے جس میں یہ بتایا گیا کہ اسی ضمن وہ گرفتار کر لی گئیں۔ اس جماعت

یں صدر منتخب کی جاں نثار اہلیہ، ان کی بیوہ بہن اور بھانجی شامل ہیں، مجھے یہ امید تھی کہ ابتدائی مرحلوں میں خواتین کو جیل جانے کی عزت نصیب نہ ہوگی، مگر حکومتِ بنگال نے صنف کے درمیان کوئی امتیاز کئے بغیر اپنے بے لاگ جوش میں تین عورتوں کو گرفتار ہونے کی عزت بخش دی، مجھے امید ہے کہ سارا ملک اس جدت پر خوش آمدید کہے گا، سوراج حاصل کرنے میں خواتین ہند کا بھی اتنا ہی حصہ ہونا چاہیئے جتنا مردوں کا، غالباً اس پر امن جنگ میں عورتیں مردوں کو میلوں پیچھے چھوڑ دیں گی، مرد کا فرض تو ظاہر ہی، ہمیں ابنا ذہنی توازن نہ کھونا چاہیئے، غصہ ہماری عورتوں یا ہماری ملک کی حفاظت نہیں کرسکتا۔" اور انہوں نے ان جیرت انگیز الفاظ پر مضمون کو ختم کیا۔ "سوراج ہماری دسترس میں ہے۔ ہمیں اپنی خود فراموشی سے اب اسے ہاتھوں سے نہ جانے دینا چاہیئے۔"

آخری الفاظ بہت معنی خیز ہیں، کیوں کہ ترکِ موالات کے حلقوں میں یہ بات مشہور ہو چکی تھی کہ اگر ۳۱ دسمبر تک سوراج نہ ملا تو گاندھی جی کی زندگی کسی نہ کسی طرح خطرے میں پڑ جائے گی، انہیں معلوم تھا کہ یہ معاہدہ مشروط ہی، اور ابھی تک نہ ظاہری معنوں میں، یہ شرط پوری ہوئی ہی، نہ اصل مفہوم کے اعتبار سے، مگر اُنہوں نے اپنے محبوب دوستوں اور مقلدوں کے حلقے میں کسی نہ کسی طرح یہ صاف بتا دیا تھا، کہ اگر ۳۱ دسمبر تک سوراج حاصل نہوا تو وہ کسی اور نا قابل بیان طریقہ سے اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیں گے، کیوں کہ بمبئی کے فسادات سے انہیں یقین ہو گیا تھا، کہ حکومت سے سوراج حاصل کرنے کے لئے دسمبر میں کوئی بڑی جد وجہد شروع کرنا بیکار محض ہے، خوش قسمتی سے انہیں ظلم و جبر کی بدمستیوں اور خاص طور پر کلکتہ میں خواتین کی گرفتاری نے جن میں سے کئی تو ۲۴ گھنٹہ کے اندر رہا کر دی گئی تھیں، اس قسم کی تمام متصوفانہ یا فوق العقل توہمات اور تخیلات سے نجات بخش دی کیوں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے خود دیکھا اور کانوں سے سنا کہ جیسے ہی عورتوں کی گرفتاری کی اطلاع ملی۔ اُنہوں نے کسی عجیب و غریب استدلال کے ذریعے اپنے اندر یہ یقین پیدا کر لیا کہ "سوراج ہماری دسترس میں ہے۔" جس کی تشریح کوئی بیرونی آدمی مشکل سے کر سکتا تھا، اپنے خیال میں اس طرح مقررہ میعاد کے اندر نفس سوراج حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو پہلے سے کہیں زیادہ اس امر میں آزاد سمجھ لیا کہ ماضی سے پیٹھ پھیر کر ثابت قدمی سے ایک خیالی صورت پیش نظر رکھتے ہوئے مستقبل کی طرف بڑھ جائے، اتنے میں اُنہوں نے کہیں سے فضا میں بارود کی بو سونگھ لی، اور ان میں ترک موالات کو ایک ڈرامائی اختتام تک پہنچانے کی خواہش اور زیادہ ہو گئی، اب واقعی ان کا دل پوری تیزی سے دھڑکنے لگا، ان کی اختراع پسند فکر کی ناقابل شکست قوتیں اور ماہرانہ پروپگنڈے کا زور انتہائی حد کو پہنچ گیا، ذلت آمیز کفارے اور اذیت خیز شبہات کی شب تاریک غائب ہو گئی اور وہ ہندستان کی صبح آزادی کی طرف اس انداز سے چل پڑے کہ ان کا دل شگفتہ تھا قدم میں جست کی قوت اور آنکھوں میں روشنی تھی۔

چوالیسواں باب

گول میز کانفرنس

لیکن ایک عجیب و ناگہانی حادثہ نے رونما ہو کر ایک مرتبہ پھر ان کو ڈگمگا دیا اور وہ قدم اٹھاتے ہی غلط رُخ پر کود پڑے۔ ہر ملک میں ایسے باا‌ثر مگر ڈرپوک سیاست دانوں کی ایک تعداد موجود ہوتی ہے جو قوم پرستوں کی بڑھتی ہوئی تحریک سے اسی طرح ہکا بکا رہ جاتے ہیں، جس طرح حکومت کی مستبدانہ انسدادی کارروائیوں سے ان کی حالت ہو جاتی ہے، لہٰذا پورے اعتدال پسند لوگ جن کے قائد پنڈت مالویہ تھے، ہر جگہ پہنچ جانے والے، مسٹر داس اور نہرو جیسے قدیم سیاسی رہنماؤں کی اچانک گرفتاری سے یہ لوگ سراسیمہ ہو گئے اور کلکتہ میں ایک وفد لے کر وائسرائے کی خدمت میں حاضر ہوئے تاکہ ان سے درخواست کریں کہ وہ عوام کے نمائندوں کی ایک گول میز کانفرنس طلب فرمائیں جو صورتِ حال کی نزاکت کے مطابق عملی مشورے دے سکے، اور سفارش پیش کر سکے، وفد نے کرمنل امنڈمنٹ ایکٹ اور باغیانہ اجتماعوں کے ایکٹ کو واپس لینے اور ان کے ماتحت جو لوگ مقید تھے ان کو رہا کرنے کی درخواست کی، لارڈ ریڈنگ بہت چلتے ہوئے تھے انہوں نے بہت محتاط قسم کا جواب دیا، اگرچہ اُنہوں نے ان سیاسی خدائی فوجداروں کے مشوروں کو قبول نہ کیا، مگر مزید گفت و شنید کے لئے دروازہ کھلا چھوڑ رکھا تھا، مقدس پنڈت کو جیل میں بھی مسٹر داس سے ملاقات کرنے اور گاندھی جی کو تار دینے کی اجازت دی گئی۔ گاندھی جی نے اس کا جواب دیا، اور کچھ دنوں تک تار پر گفت و شنید جاری رہی، اس بات چیت کو جاری کرنے سے وائسرائے کا اصل منشا یہ تھا، کہ کانگریس نے ۲۴ دسمبر کو ہڑتال کرانے کا جو فیصلہ کیا تھا وہ اسے واپس لے لے تاکہ وائسرائے پرنس آف ویلز کا کماحقہ شاہانہ استقبال کر سکیں - چوں کہ اس تاریخ تک کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا تھا، اور سارا معاملہ بگڑ چکا تھا، اس لئے حکومت نے اس کے بعد سے پنڈت مالویہ اور ان کے دوستوں کی درخواستوں اور التجاؤں کی طرف سے اپنے کان بند کر لئے۔

اس قسم کی تمام گفت و شنید کی اور زیادہ کامل توضیح کرنے سے پہلے ہمیں یہ عرض کرنا ہے کہ گاندھی جی ایک بارگی اس تمام مسئلہ کو کیونکر اتنے غلط رنگ میں دیکھنے پر آمادہ ہو گئے، کیوں کہ لارڈ ریڈنگ نے کلکتہ میں پنڈت مالویہ کے جواب میں جو تقریر کی تھی اس پر ایسوسی ایٹڈ پریس کو ایک انٹرویو کے دوران میں گاندھی جی نے کہا کہ "فوری سوال اب یہ نہیں رہا کہ سہ گانہ زیادتیوں (خلافت، پنجاب اور سوراج) کی تلافی کی جائے بلکہ سردست جلسے کرنے اور پر امن مقاصد کے لئے انجمنیں قائم کرنے کے حقوق کا سوال ہے، اس حق کو حاصل کرنے کے لئے ہم صرف تارکین موالات ہی کی طرف سے نہیں لڑ رہے ہیں بلکہ ہماری یہ لڑائی تمام سیاسی فرقوں کے لئے ہے...... پبلک جلسے منعقد کرنے اور انجمنیں قائم کرنے کے حق کے مسئلے پر جھکنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ہم عزم بالجزم کر چکے ہیں کہ اپنے سفینے جلا کر جب تک انسانوں کے یہ بنیادی حقوق ہمیں حاصل نہ ہو جائیں ہمیں آگے ہی بڑھتے رہنا ہے۔"

اس طرح حکومت اپنی مستبدانہ حکمت عملی کی بدولت گاندھی جی کی توجہات کو دوسری طرف پھیر دینے میں کامیاب ہو گئی، اب تک ترک موالات کی ساری جد وجہد پنجاب اور خلافت۔ سوراج کے لئے جاری تھی، اس وقت تک رضاکاروں کی جمعیتوں اور عام جلسوں کی

ممانعت کا کوئی حکم جاری نہیں کیا گیا تھا لیکن محض اس لئے کہ حکومت ان شدید کارروائیوں پر اُتر آئی تھی گاندھی جی اپنے پورے ایک سال کی جنگ کے اصل مقصد کو تین فوری مسائل یعنی آزادئ رائے، آزادئ اجتماع اور آزادی مطابع کے ماتحت کر دینے پر بالکل تیار ہو گئے" یہ واقعی تمام ملوکیت پسند حکومتوں کی عام چال ہے، وہ قومی جنگ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے شدید ترین دہشت انگیزی کے دھوئیں کا پردہ ڈال دیا کرتے ہیں اور ناعاقبت اندیش رہنما اس جال میں نہایت آسانی سے پھنس جاتے ہیں جو ان کے ملوکیت پسند آقا نہایت چالاکی سے ان کے لئے بچھایا کرتے ہیں، حکومت ہند کی ضد کا بھلا ہو کہ اس وقت سے لے کر اس مدت تک جب تک کہ ان کی گفت وشنید اور کوششیں بالکل ناکامیاب نہ ہو گئیں، گاندھی جی ساری تحریک کو صرف نئے جاری شدہ احکام وقوانین کے خلاف مدافعانہ سول[1] نافرمانی تک محدود کرنے پر قانع نہیں رہے، بلکہ انہوں نے اپنی طرف سے بلا وجہ یہ پیش کش بھی کی کہ اگر حکومت ان نفرت انگیز احکام کو واپس لے لے، اور ان کے مقدس جنگ کے قیدیوں کو رہا کر دینے پر رضامند ہو تو وہ اپنے سب سے زیادہ اہم ہتھیار یعنی عام سول نافرمانی کو قریب قریب ایک غیر معینہ مدت کے لئے ملتوی کر دیں گے۔

اب مجھے ان نتائج کے لئے تائیدی شہادت دینی ہے، گاندھی جی لارڈ رونلڈشے اور بالخصوص لارڈ ریڈنگ سے بحث وتمحیص کرنے کے لئے پہلے ان لوگوں نے اسی زمانہ میں ملک کی سیاسی صورت حالات اور خاص طور پر عارضی سیاسی صلح اور گول میز کانفرنس کے انعقاد کے بارے میں مالویہ جی کی تجاویز پر اظہار خیال کر کے اپنے دل کا بخار نکالا تھا، بلاشبہ گاندھی جی نے اپنے پسندیدہ ترین الفاظ میں ان دونوں معزز افسروں کو خوب پھٹکارا، اور واقعی ایسا ہی ہونا بھی چاہیئے تھا، تحریک ترک موالات کے رہنما سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی، کہ وہ کسی ناپسندیدہ عجلت پسندی میں اپنی پوزیشن پر کوئی حرف آنے دے گا، پھر بھی گاندھی جی کے پرجوش الفاظ کے جھاگ کی تہ میں ان کی حکومت سے سودا کرنے کی آرزو صاف نظر آ رہی تھی،

گاندھی جی نے (ینگ انڈیا ۲۲ نومبر ۱۹۲۱ء میں) گول میز کانفرنس کے موضوع پر لکھتے ہوئے پوری تجویز کو بالکل قبل از وقت قرار دیکر اسے مسترد کر دیا، کیوں کہ ان کی رائے میں "اپنے کار معوضہ کی انجام دہی میں شدائد برداشت کرنے پر آمادہ رہنا ہی بس ایک طریقہ ہے جس سے ہم اپنے دعوے کو ثابت کر سکتے ہیں، لیکن ہم ابھی کوئی نتیجہ خیز ثبوت دے چکنے کا بمشکل دعویٰ کر سکتے ہیں، اس لئے میری رائے میں، ایسی کانفرنس جس میں حکومت کی بھی نمائندگی ہو اسی وقت مفید ہو سکتی ہے، جب حکومت تارکین موالات کو اپنے اطمینان کے مطابق آزما چکی ہو

---

[1] گاندھی جی نے ۲۳ فروری ۱۹۲۲ء کے ینگ انڈیا میں جارحانہ اور دفاعی سول نافرمانی کے امتیازی فرق کو حسب ذیل طریقہ پر واضح فرمایا:-

"جارحانہ، زعیمانہ یا مجادلانہ نافرمانی سلطنت کے ایسے قوانین کی بے تشدد عمداً خلاف ورزی سے عبارت ہے جن کی خلاف ورزی سے کسی قسم کی اخلاقی بدی کے پیدا ہونے کا امکان نہ ہو اور حکومت کے خلاف ایک نشان بغاوت کی حیثیت سے عمل میں لائی جائے، ایسے قوانین جو لگان سے متعلق ہیں، یا جن کا تعلق ذاتی چال چلن سے ہے اور جو حکومت کی آسانی کے لئے وضع کئے گئے ہوں اور جو بذات خود کسی سختی کے باعث نہ ہوں اور ان میں کسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت ہو، ایسے قوانین کی کوئی پرواہ نہ کرنی زعیمانہ یا مجادلانہ سول نافرمانی کہی جاتی ہے۔

بر خلاف اس کے مدافعانہ سول نافرمانی ایسے قوانین کی پُرامن غیر ارادی اور مسلسل خلاف ورزی سے عبارت ہے، جو بذات خود بُرے ہوں اور جن کی پابندی کسی کی عزت نفس یا انسانی وقار کے منافی ہو، اس طرح رضاکاروں کی جماعتوں کی تشکیل اور ایسے ہی اغراض کے لئے پُرامن پبلک جلسوں کا منعقد کرنا اور احکام امتناعی کے باوجود ایسے مضامین کی اشاعت کرنی جن کا مقصد تشدد نہ قرار دیا جائے۔ اور نہ ان سے تشدد کی ترغیب ہو، یہ مدافعانہ سول نافرمانی ہے، ایسے پرامن پکٹنگ کا جاری رکھنا جو اس لئے اختیار کی گئی ہو کہ لوگوں کو بھی اشیاء یا اداروں سے جن کا مقاطعہ ہو چکا ہو باز رکھا جائے اگرچہ احکام اس کے برخلاف ہوں مدافعانہ سول نافرمانی کہی جاتی ہے۔

اور ان کی طاقت کے کیف وکم کا اندازہ لگا چکی ہو"

اس طریقے سے انہوں نے تقریباً ان تمام معاملات کو لغو قرار دیتے ہوئے خوش تدبیری سے ایک انوکھا لائحہ عمل پیش کیا: "چونکہ ترک موالات رائے عامہ کو منوانے کا ایک طریقہ ہے، اس لئے میں اہل موالات اور تارکین موالات کی ایک کانفرنس کو یقیناً خوش آمدید کہونگا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ لوگ خلافت اور پنجاب کی زیادتیوں کی تلافی چاہتے ہیں میں جانتا ہوں کہ وہ لوگ بھی ملکی آزادی کے اتنے ہی آرزومند ہیں جتنا تارکین موالات، مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے کہ ہر اعتدال پسند اخبار نے حکومت کی موجودہ مستبدانہ حکمت عملی کی مذمت کی ہے، ــــ میں جانتا ہوں کہ اگر تارکین موالات نے اپنے کو قابو میں رکھا، تشدد پر عمل نہ کیا، اور اپنے مخالفین کو برا بھلا نہ کہا، تو ہر لبرل تارکِ موالات بن جائے گا"

غرض انہوں نے تارکین موالات اور موالاتیوں کے درمیان ایک ابتدائی کانفرنس کے انعقاد کا مشورہ دیا، جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ان لوگوں کو اپنے اور حکومت کے درمیان ثالث بنانا چاہتے تھے۔

لیکن فی الحال اُنہوں نے ایک قدم اور بڑھایا، وہ معقولیت پسندی کی آواز کی طرف سے اپنے کان نہ بند کرسکتے تھے، لہٰذا اُنہوں نے ذیل کے الفاظ میں وائسرائے کے سامنے اپنی شرائط پیش کردیں۔

"اگر حکومت نے یہ اندازہ کرلیا ہے: ــــــ کہ ترکِ موالات کوئی دل لگی نہیں ہے، اور اس مسلک کے پیرو اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے بے انتہا مصیبت سہنے کا عزم کرچکے ہیں تو بہتر ہے کہ حکومت غیر مشروط طور پر پیچھے ہٹ جائے، رضاکاروں کی جمعیتوں کو منتشر کرنے اور پبلک جلسوں کے انعقاد کے متعلق اپنے احکام کو منسوخ کردے، اور سوا اُن لوگوں کے جنھوں نے دراصل اور بالقصد "تشدد" کا ارتکاب کیا ہو تمام ایسے قیدیوں کو رہا کردے جو مختلف صوبوں میں کسی ایسے جرم کے ماتحت گرفتار کئے گئے ہیں اور سزا بھگت رہے ہیں جو سول نافرمانی کی تعریف میں داخل ہیں، اس لئے تمام ایسی زیادتیوں کا ازالہ جس کی حکومت مرتکب ہوئی ہے خود اُسی کے ذمے ہے، اور ایک ہموار فضاء ہی میں ایسی کانفرنس منعقد کرسکتے ہیں جس کے وہ خواہشمند ہیں"

لہٰذا ناظرین کو یہ معلوم کرکے قطعاً تعجب نہ ہوگا کہ گاندھی جی نے تقریباً بالکل یہی شرائط بذریعہ تار پنڈت مالویہ کو بھیجیں، کلکتہ میں ہڑتال کی منسوخی متیقن کرنے کی غرض سے حکومت کسی حد تک آگے بڑھنے کے لئے صاف طور پر تیار تھی، معلوم ہوتا ہے کہ لارڈ ریڈنگ تمام صوبوں میں صرف ان قابلِ نفرت احکام کو واپس لینے ہی پر نہیں بلکہ ان احکام کے ماتحت جن قیدیوں کو سزا ہوئی تھی ان کی رہائی پر بھی رضامند تھے واقعی ایسے اقدام سے بہت سے لیڈر اور ہزاروں رضاکار رہا ہوجاتے جو اوائل دسمبر سے گرفتار کئے گئے تھے۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ داس اور مالویہ دونوں ان شرائط کے ماتحت عارضی صلح پر دستخط کرنے کے متعلق بالکل مطمئن تھے۔

مگر اس وقت ایک رکاوٹ پیدا ہوگئی، گاندھی جی اور تمام قیدیوں کو جو سال بھر کے اندر تحریک ترک موالات میں سزایاب ہوئے تھے، چھڑانے پر مصر ہوئے، انہوں نے خاص طور پر علی برادران اور دوسرے مسلمان رفقاء کی رہائی پر زیادہ زور دیا، جنھیں کراچی ریزولیوشن کے بانی مبانی ہونے کی حیثیت سے سزا دی گئی تھی لیکن لارڈ ریڈنگ اس پر رضامند نہ ہوتے تھے، گاندھی جی اپنی بات پر اڑے رہے کیونکہ خلافت کمیٹی کے ہادی، فلاسفر اور دوست ہونے کی حیثیت سے وہ حکومت سے کیسے سمجھوتہ کرسکتے تھے جب کہ تحریک خلافت کے ممتاز ترین رہنما قیدخانوں میں بند پڑے تھے، تار کی آمد و رفت بند ہوگئی، گفت وشنید منقطع ہوگئی اور احمد آباد کانگریس کے موقعہ پر از سر نو جنگ کا اعلان کردیا گیا۔

گاندھی جی کا خیمہ وسیع کانگریس کیمپ کے بیچ میں نصب کیا گیا تھا اور اس کا نام کھادی نگر رکھا گیا تھا، کیوں کہ اس میں جو کپڑا استعمال ہوا تھا، وہ ہاتھ سے کاتا اور بُنا گیا تھا، میں نے بہت احتیاط سے اس خیمہ کے اندر نظر دوڑائی، گاندھی جی نے ایک مختصر گفتگو کے دوران میں اس کشاکش کا چھیڑتے ہوئے الفاظ میں حوالہ دیا، جو مسئلہ خلافت کے باعث پیدا ہوگئی تھی، مجھے گاندھی جی کے انداز اور مزاج میں مکمل

تبدیلی دیکھ کر اور دل جسپی پیدا ہو گئی ، اس بات سے گاندھی جی کو بڑی تسلی تھی کہ ان کی تحریک ترک موالات سے جو طوفان برپا ہوا اور دباؤ پڑا اس سے حکومت اور اعتدال پسند دونوں ان کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھانے پر مجبور ہو گئے ، تارکین موالات سارے ملک میں جو شاندار مثال قائم کر رہے تھے اس کو دیکھ دیکھ کر وہ اور بھی مگن ہو رہے تھے اس لئے کہ رہنما اور ان کے معتقد نہایت استقلال اور ہمت سے قید خانوں کی طرف بڑھے چلے جا رہے تھے ، اگرچہ صرف ایک ماہ پہلے وہ بمبئی کے فسادات سے فکر مند ہو رہے تھے مگر گذشتہ چند ہفتوں کے دوران میں غیر معمولی قربانیوں کو کسی ناگوار حادثے نے کوئی داغ نہیں لگایا تھا ، جب وہ اس پر غور کرتے تھے کہ کانگریس نے احمد آباد کی مقامی آبادی اور گجرات کے صوبہ میں ایک غیر معمولی جوش پیدا کر دیا ہے اور کر رہی ہے ، تو واقعی ان کے دل میں انتہائی مسرت و طمانیت کا دریا موجیں مارنے لگتا تھا مندوبین نہایت کثیر تعداد میں ملک کے تمام گوشوں سے چلے آ رہے تھے اور لڑکوں اور لڑکیوں پر مشتمل رضا کاروں کی وسیع فوج نہ صرف محض کانگریس پنڈال اور کھادی نگر ہی کی منتظم نہ تھی بلکہ سابر متی پل کے دوسری جانب آمد و رفت کے سارے انتظامات بھی اس نے اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے اور بھی جوش پیدا کر دیا ،

ان حالات میں چند ہفتوں کے اندر ہی گاندھی جی کا سارا رویہ تبدیل ہو گیا ، انہیں یہ قطعی یقین ہو گیا تھا کہ جبری انسداد کی یہ لہر سوراج کے آغاز کا پیش خیمہ ہی ، حالاں کہ ابھی چند ہی ہفتے پہلے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی جارحانہ عام سول نافرمانی کے آغاز کو ایک غیر معینہ مدت تک کے لئے ملتوی کیا چاہتے ہیں ، یہ بھی یاد رکھئے کہ نافرمانی کے اس طریقے پر جو ترک موالات کے پروگرام کا چوتھا مرحلہ تھا ان کا اعتماد تھا کہ حکومت کو مجبور کرنے کی یہ آخری اور قطعی کارروائی ہی ، لیکن زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ۸ دسمبر ۱۹۲۰ء کو انھیں یہ لکھنے میں کوئی تامل نہ ہوا " جس وقت ہم تمام بدیشی کپڑوں کا مکمل بائیکاٹ کر دیں گے ، اور اپنے اپنے قصبوں اور دیہاتوں میں خود اپنے لئے کھادی تیار کرنے لگیں گے تو عام سول نافرمانی پر عمل پیرا ہوئے بغیر ہی ہم آزاد ہو سکتے ہیں ، لہذا جارحانہ سول نافرمانی سے کم از کم اس وقت تک احتراز کرنا چاہیے جب تک کہ غیر ملکی کپڑوں کا مقاطعہ مکمل نہ ہو جائے اور ہاتھ سے بُنی ہوئی کھادی تیار نہ ہونے لگے "

اور پھر دو ہی ہفتے بعد گاندھی جی نے بالکل ایک دوسرے رنگ میں تحریر فرمایا " یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ تارکین موالات اپنے ارادے کے مطابق سول نافرمانی پر عمل نہیں کر رہے ہیں ، جلسۂ عام کی دعوت اور اس میں شرکت اور رضا کاروں کی پر امن انجمنوں کی تشکیل پر ان کے مُصر ہونے کو سول نافرمانی نہ کہنا چاہیئے ، تارکینِ موالات صرف مدافعانہ پہلو اختیار کئے ہوئے ہیں ، اُن کا یقیناً ارادہ ہے کہ جیسے ہی ان کو ایک پُر امن ماحول کا یقین کامل ہو جائیگا وہ فوراً جارحانہ پہلو اختیار کر لیں گے ، لیکن انہوں نے ابھی تک واقعتاً ایسا نہیں کیا ہے " اور پھر اسی دن کی ایک تحریر میں گاندھی جی نے اپنی مستقل رائے ظاہر کی کہ گذشتہ دس دنوں کے واقعات نے یہ دکھا دیا ہے کہ لوگوں نے اس اعدم تشدد کی بیش بہا قیمت کو سمجھ لیا ہے ،

اِس طرح گاندھی جی نے اپنے کو آخری جنگ کے لئے تیار کیا ، درحقیقت وہ لڑائی کے خواہشمند تھے کیوں کہ انہیں اس بات کا یقین تھا کہ اگر انہوں نے دھمکی دی اور آخر میں اپنے بردولی کے پسندیدہ علاقے کے اندر عام سول نافرمانی کے منصوبے پر جزوی طور پر ہی عمل شروع کر دیا تو بھی ایک طریقہ ہے جس سے حکومت ان سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہو جائے گی ۔

کیا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ گاندھی جی کو اپنے سودیشی اور کھادی پروگرام کے ادنےٰ جزیات تک پورا ہونے کے متعلق جو کچھ بھی اصرار تھا وہ سب اس وقت ان طاقتوں کے انتہائی زور کی وجہ سے ساقط ہو گیا ، جو خود اپنے دلیرانہ اور پرجوش پروپگنڈے کے ذریعے انہوں نے اتنی محنت سے پیدا کر دیا تھا ؟ گاندھی جی نے خود ۱۹۲۰ء کی کلکتہ کانگریس میں کہا کہ پلیٹ فارم حاضرین پر حکومت نہیں کرتا بلکہ حاضرین پلیٹ فارم پر حکمرانی کرتے ہیں ۔ تمام لوگ کثیر تعداد میں جیل کی طرف ٹوٹے پڑ رہے تھے اس لئے گاندھی جی کے واسطے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہ گیا کہ وہ فیصلہ کن جنگ کا بگل بجانے پر آمادہ ہو جائیں ۔

احمد آباد کانگریس نے گاندھی جی کو رسمی طور پر آمرانہ اختیارات تفویض کر دئے تاکہ وہ جس علاقہ کو پسند کریں وہاں ایسے طریقے جو انہیں

مناسب معلوم ہو عام سول نافرمانی کا آغاز کر دیں، حالانکہ پورے سال کے دوران میں یہ آمرانہ اختیارات وہ بالکنایہ پہلے ہی سے اختیار کئے ہوئے تھے

کانگریس کی قابل یادگار کارروائیوں کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے بابو راجندر پرشاد تحریر فرماتے ہیں " کانگریس کے صدر منتخب سی آر داس کے قید ہو جانے پر حکیم اجمل خاں صدارت کے لئے منتخب کئے گئے، کانگریس کی کارروائیوں میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ اور صرف ایک ہی ریزولیوشن منظور ہوا، حکومت کی مستبدانہ انسدادی حکمت عملی کو پیش نظر رکھتے ہوئے کانگریس نے پہلے اپنے ترک موالات کے ریزولیوشن کو جو گذشتہ اجلاس میں منظور کیا جا چکا تھا، ایک نیا لباس پہنایا، اور تمام لوگوں کو یہ ہدایت دی کہ وہ اپنے کو رضاکاروں کے اداروں سے منسوب کرتے ہوئے کسی قسم کے مظاہرے کے بغیر، جیسا کہ وہ چند ہفتوں سے کر رہے تھے، خاموشی سے گرفتاری کے لئے پیش کر دیں، وغیرہ وغیرہ ...... اس نے یہ اعلان کیا کہ مسلح بغاوت کا محتاط اور مؤثر بدل صرف سول نافرمانی ہے اور کانگریسی کارکنوں نیز دوسروں کو یہ ہدایت دی کہ جب عوام عدم تشدد کے طریقوں میں کافی تربیت یافتہ ہو جائیں تو انفرادی اور اجتماعی سول نافرمانی کی تنظیم کی جائے ...... اور (درحقیقت ریزولیوشن کا سب سے زیادہ اہم حصہ یہی ہے) کانگریس کے کارکنوں کی ایک کثیر تعداد کی قریب الوقوع گرفتاری کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس نے یہ مطالبہ کیا کہ معمولی مشنری بدستور رہے اور ساتھ ہی ساتھ مہاتما گاندھی کو انتظامی امور میں پورا اختیار دے دیا نیز انہیں آل انڈیا کانگریس کا مختار کل بنا دیا گیا، اور اس کا بھی اختیار دیا گیا کہ وہ وقت ضرورت اپنا کوئی جانشین مقرر کر سکتے ہیں البتہ مہاتما گاندھی یا ان کے کسی جانشین کو یہ حق نہیں دیا گیا کہ وہ آل انڈیا کانگریس سے منظوری حاصل کئے بغیر اور محض بعد کی منظوری کی توقع پر حکومت سے کسی قسم کی شرائط صلح طے کر سکیں یا مسلک میں کوئی تبدیلی کر سکیں۔

" مولانا حسرت موہانی نے کانگریس کا مسلک بدلنے اور مکمل آزادی کو کانگریس کا نصب العین قرار دینے کے لئے ایک ریزولیوشن پیش کیا تھا مگر وہ کثرت رائے سے مسترد کر دیا گیا "

اس خلاصے سے دو باتیں بالکل صاف ہو جاتی ہیں اول یہ کہ مہاتما گاندھی کا صاف صاف یہ خیال تھا کہ اپنی سول نافرمانی کی جنگ کو حکومت سے گفت و شنید کا ایک مناسب آلہ بنا لیں، دوسرے یہ کہ برطانوی دستور اور تعلق سے وہ اب بھی اتنے متاثر تھے کہ انہوں نے کانگریس کے کھلے اجلاس میں مولانا حسرت موہانی کے پیش کئے ہوئے ریزولیوشن کو جو نہایت معقول تھا، نامنظور کرانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

اسی طرح آخری جنگ کے لئے پلیٹ فارم صاف کر دیا گیا جس کی طرف اب ہم متوجہ ہوتے ہیں۔

پینتالیسواں باب

مزید جھڑکیاں

مہاتما گاندھی نے اب بردولی کو اپنا صدر مقام بنا لیا، اور اس تعلقہ بلکہ اس تعلقہ کے حلقوں اور دیہاتوں کے مقتدر کارکنوں سے بھی ربط ضبط بڑھانے لگے۔ بہت سے خاص دیہاتوں میں کھدر کے استعمال اور چرخہ چلانے میں جو امتیازی ترقی ہوئی اسے دیکھ کر ان کے جوش و خروش کی کوئی حد نہ رہی، واقعتاً وہاں جا کر انہوں نے وہی سب دیکھا جو وہاں کے کارکن دکھانا چاہتے تھے، ان لوگوں کے لیڈر مسٹر کنور جی

جیسے چلتے ہوئے آدمی تھے، چند ہی ہفتوں میں گاندھی جی نے اپنے کو اور نیز دوسروں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ ان کے محبوب حلقے نے اگر لفظ بہ لفظ نہیں تو عملی اعتبار سے قریب قریب ان تمام شرائط کو پورا کر دیا ہے جو مشہور دہلی ریزولیوشن میں پیش کی گئی تھیں۔

دوسری جانب ہم لوگوں میں سے بعضوں کا یہ خیال تھا کہ کچھ چال باز کارکن انھیں اپنے عظیم الشان حلقے کے لئے غیر معمولی ناموری حاصل کرنے کے خیال سے فریب دے رہے ہیں، سطحی نظر سے جو ترقی دکھائی دیتی تھی وہ نہایت جوشیلی اور ہیجانی تھی مگر یہ سب کم و بیش چار دن کی چاندنی تھی جو محض گاندھی جی کو دکھانے کے لئے ہے، بہرحال یہ بالکل سطحی تماشہ تھا، اگرچہ لوگ کھدر کی بھدی وردیاں آہنی زرہ بکتر کی طرح پہنا کرتے تھے، مگر وہ ایسے خانگی زندگی میں چپکے سے اتار دیا کرتے تھے، چرخے استعمال سے زیادہ دکھاوے کی غرض سے رکھے جاتے تھے، اور اگر استعمال بھی ہوتے تو اس طرح کہ عورتیں کام کاج سے تھک کر چور ہونے کے بعد چرخہ کاتنا شروع کرتی تھیں اور مرد کھیتوں کے کام سے فرصت پانے کے بعد گاؤں کے تمام جمگھٹ کی جگہوں پر چائے اور سگرٹ کا لطف اٹھایا کرتے تھے نام نہاد قومی مدرسے حد سے زیادہ مضحکہ خیز بن کر رہ گئے تھے، وہ اس قابل بھی نہ تھے کہ وہاں نوشت وخواند اور حساب کتاب کی مناسب تعلیم دی جاسکتی، زیادہ تر چرخے جو وہاں ڈھیر کر دئے گئے تھے، یا تو قابل استعمال نہ تھے یا ان سے ایسے سوت تیار ہوتے تھے جو بُنائی کے کام بھی نہ آسکتے تھے، لوگوں نے اگرچہ چھوت چھات دور کرنے پر طوطے کی طرح بے سمجھے بوجھے ہاں تو کر دی تھی، مگر اچھوتوں کو اپنے مندروں یا اپنے گھروں میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے تھے اور گاندھی جی بڑے مزے سے غلامی کے اس ذلیل اور دردناک منظر کا تماشہ جس کی سارے گجرات میں نظیر نہ تھی دیکھتے تھے اور خاموش تھے، گجرات کے اور کسی حلقے میں گجرات کی نصف آبادی کو جو دوبلا اور کالی پراگ کہلاتی ہے، برہمنوں بنیوں اور پٹی داروں کی ایک چھوٹی سی اقلیت نے اس بُری طرح اپنے شکنجوں میں کَس رکھا تھا کہ جس کی حد نہیں۔ لیکن گاندھی جی کے لئے یہ سب کوئی بڑی بات نہ تھی، یا ادھر ان کی نظر ہی نہیں گئی یا انہوں نے اس سے چشم پوشی کی اُنہیں بس اس نمایاں تبدیلی سے جو ساری آبادی پر چھا گئی تھی اور اس غیر متزلزل جذبۂ بہادری سے جسے وصف صلح کی آمیزش سے معتدل کیا گیا تھا، بلاشبہ اگر پنڈت مالویہ آخری وقت پر کانگریس اور حکومت کے درمیان پھر ایک مرتبہ مصالحت کی کوشش نہ کرتے تو وہ اس حلقے میں ایک عام جارحانہ سول نافرمانی کی جدوجہد شروع کر دیتے۔

اس وقت حکومت کا عندیہ معلوم کر لینا کوئی مشکل کام نہ تھا، نئے احکام کے التوا اور تارکین موالات بلکہ اسیران خلافت کے بھی ہائی کے کم از کم شرائط کو جو گاندھی جی نے بذریعۂ تار آخر دسمبر میں کلکتہ بھیجا تھا، لارڈ ریڈنگ قطعی طور سے مسترد کر چکے تھے، اور اب حکومت کو کسی سمجھوتے کی پروا بھی نہیں تھی، اس لئے کہ جو نہ ہونا چاہیئے تھا وہ تو ہو ہی چکا تھا، یعنی کلکتہ کی سڑکوں پر پرنس آف ویلز کا شدید ہڑتال کے ساتھ خیر مقدم کیا جا چکا تھا، "حکومت کی جابرانہ انسداد کی حکمت عملی کا از سر نو پورا مظاہرہ شروع ہو گیا اور ہزاروں رضا کار جیل بھیج دئے گئے" "ان چند مہینوں کی تاریخ ایک طرف من مانی گرفتاریوں اور قید وبند اور دوسری طرف چیلنج کے بہادرانہ اور بے خوف استقبال کی تاریخ ہے، فی الحقیقت یہ کہا جاسکتا ہے کہ "جہاں ملک نے ایک قابل فخر مثال پیش کی تھی (جو لیڈر اور والنٹیر گرفتار کئے گئے ان کی تعداد بہت جلد ۲۵ ہزار تک پہنچ گئی)، وہیں یہ بالکل کھلی بات ہے کہ حکومت ترک موالات کی پوری تحریک ہی کو بیخ وبُن سے اکھاڑ پھینکنے کا عزم کر چکی تھی"۔

ایک مرتبہ پھر حکومت کے بے دردانہ انسداد اور گاندھی جی کی عام سول نافرمانی کی دھمکی سے خوف زدہ ہو کر مالویہ جی نے ۱۴ار جنوری ۱۹۲۲ء کو بمبئی میں تمام جماعتوں کا جلسہ طلب کیا، تمام صوبوں سے مختلف جماعتوں سے اوپر رہنما موجود تھے گاندھی جی نے کانگریس کے مقاصد کی نمائندگی کرنے کے لئے کانفرنس میں شرکت کی۔

گاندھی جی نے واقعی کانفرنس میں بہت موثر تقریر کی، انہوں نے استادانہ فصاحت کے ساتھ ان وحشیانہ افعال کا تذکرہ کیا۔ جن کا ارتکاب حکومت نے ابھی چند ہفتے پہلے تک کیا تھا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے تارکین موالات اور اعتدال پسندوں سے

درخواست کی کہ وہ آزادیٔ تقریر، آزادی اجتماع اور آزادیٔ مطابع کو برقرار رکھنے کے لئے کانگریس کے ساتھ اس کے مقاصد میں متحد ہو جائیں،

جب گاندھی جی حامیان موالات میں سے ایک شخص کو بھی اپنی طرف نہ کھینچ سکے تو فوراً انہوں نے ایک مرتبہ پھر اعتدال پسندوں سے مصالحت کرنے کی طرف پیش قدمی کی جو درحقیقت حکومت کے ساتھ مصالحت کی طرف ایک قدم تھا حالانکہ حکومت کی جانب سے ذرّہ برابر بھی مصالحت کی خواہش نظر نہیں آتی تھی، اس کانفرنس کی کمیٹی میں جو مراعات انہوں نے پیش کیں اور جو شرائط تجویز کیں ان کا بیان خود ان ہی کے الفاظ میں زیادہ بہتر ہوگا۔ (ینگ انڈیا ۱۹ر جنوری ۱۹۲۲ء)

"جب مجھ سے کہا گیا کہ میں ان شرائط کو بیان کروں جو ایک کامیاب کانفرنس کے لئے مناسب ماحول پیدا کر سکیں تو مجھے بعض شرطیں لوگوں کے ذہن نشین کرانی پڑیں، اس کے پہلو بہ پہلو میں نے یہ بھی پابندی لگا دی کہ کانفرنس حکومت کی مشکلات پر ہمدردانہ طریقہ پر غور و خوض کرے،

"مفاہمت کی صورت نکل آئی اول یہ کہ نئے قوانین واپس لے لئے جائیں اور ان کے تحت سزا یافتہ قیدی اور اسیرانِ فتویٰ یعنی علی برادران اور دوسرے لوگ جنھیں مشترکہ مقصد یا فوجی ملازم کے متعلق فتوی کے باوجود سزا ہوئی تھی رہا کر دئے جائیں .... دوسری بد پکٹنگ کے متعلق ہے، میرا مشورہ یہ تھا کہ گول میز کانفرنس منعقد ہوگی اگر یہ طے ہو جائے تو کانفرنس کا نتیجہ برآمد ہونے تک ترکِ موالات کی مخالفانہ رنگ کی تمام سرگرمیاں بند ہو جانی چاہئیں اور حقیقی پُرامن پکٹنگ کی بد بھی میں نے بخوشی حذف کر دی اگرچہ اس کا مجھے بہت افسوس رہا۔

"میں مجلس عاملہ کو یہ مشورہ دینے پر راضی ہو گیا کہ وہ کانفرنس کمیٹی کو حکومت سے گفت و شنید کا موقع دینے کی غرض سے کانگریس کی مجوزہ عام سول نافرمانی کو ماہ رواں کی ۳۱ر تاریخ تک کے لئے ملتوی کر دے، میں نے محسوس کیا کہ اپنا خلوص نیت ظاہر کرنے کے لئے یہ بالکل ضروری چیز تھی۔"

گاندھی جی اس حد تک بڑھے کہ انہوں نے خواہ مخواہ اپنی بڑھتی ہوئی تحریک کو پندرہ روز کے لئے ملتوی کر دیا، حالانکہ دوسری جانب سے کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا،

گاندھی جی نے اس کانفرنس کے سامنے باضابطہ خلافت پنجاب اور سوراج کے متعلق کانگریس کے مطالبات بھی پیش کئے، ان تینوں عنوانوں کے تحت جو مطالبات تھے اور جو متعدد بار کانگریس کے ریزولیوشنوں کا موضوع بن چکے تھے ان کی اہمیت کو ذیل کے الفاظ کے ذریعہ گھٹا دیا گیا، (ینگ انڈیا ۱۹ جنوری ۱۹۲۲ء)

"میں نے اس پر بحث ہوتے ہوئے سنا ہے کہ خلافت کے بارے میں امپیریل گورنمنٹ بالکل مجبور رہے، میں اسے سمجھنا چاہتا ہوں اگر یہ صورت ہے اور امپیریل گورنمنٹ مسلمانان ہند کے مقاصد سے اپنے آپ کو ہمدردانہ طور پر وابستہ کرے گی، تو میں دوسری طاقتوں کو خلافت اسکیم کے برحق ہونے کا یقین دلانے میں امپیریل گورنمنٹ کی حقیقی امداد کرنے کا موقعہ حاصل کرنا ضرور پسند کروں گا، اور پنجاب کے متعلق بھی ایسا ہی خیال ہے، اصول تسلیم کیا جا چکا ہے تفصیلات کا تصفیہ ہونا باقی ہے، برخاست شدہ افسروں کی پنشن بند کر دینے کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ مقامی مشکلات حائل ہونگی۔

"سوراج اسکیم بلاشبہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کے متعلق یہ ہے کہ جتنے منہ اتنی باتیں، اسکیم تیار کرنے کے طریقے کے متعلق بھی میں نے وہی راستہ اختیار کیا ہے جو میرے نزدیک سب سے زیادہ سہل ہے، کانگریس کی رائے دہندگی کو منظور کر لینا بھی میرا ہی مشورہ ہے لیکن میں نے جو بنیادی اصول پیش کئے ہیں وہ بالکل ناقابل تردید ہیں سوراج کی اسکیم وہ اسکیم ہے جسے عوام کے نمائندوں نے تیار کیا ہے۔"

اس طرح گاندھی جی نے حکومت کے ساتھ مصالحت کرنے کی سب سے بڑی کوشش کی اور اب وہ جس چیز کے سائل تھے وہ کانگریس کے مطالبات کے سیاسی طور پر قبول کئے جانے سے زیادہ ان کے لئے اخلاقی ہمدردی کی استدعا تھی، یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ درحقیقت حکومت سے اس امر کے خواہاں تھے کہ وہ کانگریس کو ملک کی سب سے زیادہ نمائندہ جماعت کی حیثیت سے تسلیم کرے اور اس کے بے مثل پُرامن ترک موالات کا اعتراف

کرلے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حکومت کی طرف سے بس ایک ہمدردانہ اشارہ کی دیر تھی اور گاندھی جی اپنے ہتھیاروں کو رکھ دینے پر آمادہ تھے۔

لیکن جب مالویہ جی نے اپنی کانفرنس کی نہایت ہلکی اور کمزور تجویزیں بھی وائسرائے کے سامنے پیش کیں تو انہوں نے نہایت بے توجہی سے انہیں بھی مسترد کر دیا۔

اس طریقے سے گاندھی جی کو جنوری ۱۹۲۲ء کے آخر میں حکومت نے ایک بار پھر دھتکار دیا، اب اگر انہوں نے اپنی بردولی کی (جس کی بڑی شہرت کی گئی تھی) عام سول نافرمانی کی جدوجہد کے داؤں پر سب کچھ لگا دیا تو اس پر کوئی تعجب نہ ہونا چاہئیے، آخر کار ۲۲ر جنوری ۱۹۲۲ء کو اس موضوع پر لارڈ ریڈنگ کو انھوں نے اپنا تاریخی الٹی میٹم روانہ کر دیا۔

چھیالیسواں باب

بردولی ستیاگرہی یا غلاموں کے آقا

بردولی کی جدوجہد کے حالات بیان کرنے سے پہلے مجھے بعجلت ہی سہی، بردولی اور اُس کے باشندوں کے متعلق چند تفصیلات کا ذکر کرنا ہے جو چند ہی ہفتوں کے اندر دنیا بھر کے اخباروں کے لئے صفحۂ اول کی خبریں فراہم کرنے والے تھے۔

گاندھی جی کے سکرٹری مسٹر مہادیو ڈیسائی نے اپنی کتاب بردولی کی کہانی (یہ بردولی کی ۱۹۲۸ء کی ستیاگرہ تاریخ ہے) میں بردولی اور وہاں کے لوگوں کا تذکرہ ذیل کے الفاظ میں بیان کیا ہے:-

"بردولی سورت ضلع کا مشرقی تعلقہ ہے جس میں ۱۳۱ دیہات شامل ہیں، اور جس کا رقبہ ۲۲۲ مربع میل ہے، اس کے شمال میں دریائے تاپتی ہے۔ دو تین دریا جو تاپتی سے بہت چھوٹے ہیں، تعلقے کے اندر سے گزر کر بحر عرب میں جاگرتے ہیں، ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس پر پُل بنا ہو یا جسے زیادہ بارش کے زمانہ میں عبور کیا جا سکے، تعلقے کی مغربی حصّہ کی زمین کالی اور زرخیز ہے جس میں ہر قسم کی فصلیں پیدا ہوتی ہیں (خاص پیداوار جوار، کپاس اور چاول ہے) لیکن مشرقی دیہات جنگلی پتھریلے اور غریب واقع ہوئے ہیں، وہاں پانی کی بھی کمی ہے اور آب و ہوا بھی نسبتاً خراب ہے۔"

"تقریباً ۸۰ ہزار کی آبادی کا بڑا حصّہ زراعت پیشہ ہے، خاص اقوام جو کنبی (یا پٹی دار) اہوالا (نیچ ذات کے برہمن) بنیوں اور کالی پراج میں منقسم ہیں ان کے صحیح اعداد و شمار تعلقے کی پرانی بندوبست رپورٹ میں ڈھونڈھنا عبث ہے لیکن سرسری تخمینے کے مطابق آدھی سے زیادہ آبادی کالی پراج ہے، گیارہ ہزار اصل کالی پراج ہیں اور تیس سے چالیس ہزار تک دوبلا ہیں، خال خال پارسی آباد ہیں اور تھوڑی سی تعداد مسلمانوں کی ہے، اول الذکر دونوں قومیں زمینوں کی مالک اور کاشتکار ہیں، بیشتر بنئے، مہاجن ہیں اور روپیہ کا لین دین کرتے ہیں انھیں غیر زراعت پیشہ کہنا چاہئیے، کالی پراج اس تعلقے میں زراعت پیشہ مزدور ہیں دوبلا ایک علیحدہ سی جماعت ہے جس سے تقریباً زبردستی کام لیا جاتا ہے ان کے آقا اپنے خرچ سے ان کی شادیاں کرتے ہیں یہ لوگ اپنے مالکوں کے قرض کے نیچے دبے رہتے ہیں اور ان کا تعلق اپنے مالکوں سے غلاموں کا سا ہے۔"

"کیرا کے دیہاتوں کی بہ نسبت بردولی کے اوسط درجے کے گاؤں بہت چھوٹے ہیں اونچے طبقوں کے مکانات کھپریل کے ہوتے ہیں جن کے سامنے اور پیچھے دروازے ہوتے ہیں اور ان میں بڑے بڑے احاطے ہوتے ہیں لیکن یہ بڑی تعجب کی بات ہے، کہ وہ لوگ جس چھت کے نیچے خود رہتے ہیں اسی میں اپنے مویشی

رکھتے ہیں بدقسمتی سے مسٹر ڈیسائی بانس کی ان جھونپڑیوں کا تذکرہ چھوڑ گئے جو گوبر کے ڈھیروں سے گھری ہوئی ہوتی ہیں اور جن میں ادنےٰ طبقوں کے لوگ اپنے مصیبت زدہ مویشیوں کے ساتھ زندگی کے دن گذارتے ہیں، صداقت پسند ہونے کے باوجود وہ بر سبیل اتفاق بھی ان اچھوتوں کی تعداد یا ان کے حالات کا تذکرہ کرنا ضروری نہیں سمجھتے، جو ہندوستان کی دیہی زندگی کے لئے ناگزیر عنصر ہیں۔

بہرحال مسٹر ڈیسائی آگے چل کر لکھتے ہیں:۔"ان کھلے ہوئے خدوخال سے کسی تعلقے کے بارے میں کوئی غیر معمولی بات ظاہر نہیں ہوتی۔ لیکن ان امتیازی امور کو ذرا زیادہ گہری نظر سے دیکھنا ہے جن کی بدولت بردولی کو ہندوستان کی تاریخ میں ایسی جگہ ملی"۔

"جنوبی افریقہ میں گاندھی جی کے ستیا گرہیوں میں ایک قابل لحاظ تعداد بردولی کے لوگوں کی تھی، جنھوں نے اس تاریخی جدوجہد کے دوران میں اپنی جرأت اور استقلال کا کافی ثبوت دیا تھا، ان میں کنبی، اہولا اور مسلمان تھے جو وہاں قسمت آزمائی کے لئے گئے تھے، اور اور وہاں اپنی ایک مستقل آبادی بنالی تھی، بردولی ان ستیا گرہیوں سے شناسائی کا ہی نتیجہ تھا کہ انہوں نے ۱۹۲۲ء کی عام سول نافرمانی کی جدوجہد کے لئے اس علاقہ کو پسند کیا"۔

یہاں پر مسٹر ڈیسائی نے اس اہم حقیقت پر پردہ ڈالنا چاہا ہے کہ جنوبی افریقہ کے ان آبادکاروں نے وہاں کثیر دولت جمع کرلی تھی اور اس میں سے وقتاً فوقتاً بہت کچھ اپنے اصلی گھروں کی طرف منتقل کرتے رہتے تھے، اس موقعہ پر یہ ظاہر کردینا بے موقعہ نہ ہوگا کہ کسی تعلقے کی زرخیز کالی زمین میں قسم قسم کی روئی پیدا ہوتی تھی، نفع بخش سالوں میں ان سے غیر معمولی قیمت حاصل ہوتی تھی مشرقی اور جنوبی افریقہ میں آباد شدہ آبادکاروں کی طرف سے لگاتار رقمیں تعلقے میں آتی تھیں یہی وجوہات تھے کہ گجرات کے سارے علاقوں میں بردولی سب سے زیادہ متمول نہ سہی تو متمول ترین علاقوں میں سے ایک ضرور بن گیا تھا۔

کالی پراج کے طبقوں میں جنھیں ایک کانفرنس منعقدہ ۱۹۲۶ء میں گاندھی جی نے رانی پراج کے تازہ لقب سے سرفراز بھی فرمایا تھا معاشرتی اور انسانی بھلائی کے کاموں کا حوالہ دینے کے بعد مسٹر ڈیسائی یہ اہم واقعہ بیان کرتے ہیں کہ مسٹر نرہری پارکھ "بہت دنوں تک سربھاؤں آشرم (یہ آشرم ان چار آشرموں میں سے ایک تھا جو ۱۹۲۷ء کے سیلاب کے بعد تعمیری کام کو ترقی دینے کے لئے بنائے گئے تھے) کے انچارج تھے اور ایک موقعہ پر انہوں نے سات دن کا برت بھی اس لئے رکھا تھا کہ ان کے نگرانی میں جو دیہات تھے، ان میں سے ایک گاؤں کے لوگ اپنے ظالمانہ رویہ کی تلافی پر آمادہ نہ تھے، جو ان لوگوں نے دبلاؤں کے ساتھ جن سے وہ زرعی غلاموں کی طرح کام کیا کرتے تھے، جائز رکھا، اتنا اور اضافہ کیا جاسکتا ہے کہ ان بدقسمت لوگوں کے درمیان ترک مسکرات اور چرخا کاتنے کی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کی غرض سے جہاں چند سالوں کے اندر بہت کچھ کیا گیا ہو، وہیں غلامی کی ان زنجیروں کو توڑنے یا ڈھیلا کرنے کے لئے جن میں اعلےٰ طبقوں کے ظالمانہ دباؤ کے تحت ہزارہا دوبلا مرد اور عورتیں جکڑے پڑے ہیں کچھ بھی نہیں کیا گیا۔

"بردولی میں اپنی بہت زیادہ متوقع تشریف آوری" کے بعد ہی اپنے اولین اہم آرٹیکل (ینگ انڈیا، دسمبر ۱۹۲۱ء) میں گاندھی جی نے واقعی انہیں غلام رکھنے والی اعلےٰ طبقوں کی کوششوں سرگرمیوں اور ترقیوں کا حسب ذیل الفاظ میں حوالہ دیا ہے۔

"اس کی آبادی تقریباً ایک لاکھ کی ہے اور اس میں ایک سو چالیس گاؤں ہیں اس میں ۶۵ گورنمنٹ اسکول تھے جن میں ۵۱ قومی رنگ میں رنگ دیئے گئے ہیں (اس کا مطلب یہ ہے کہ ان ۵۱ اسکولوں میں جو لڑکے شریک ہیں وہ درحقیقت قومی مدرسوں میں شریک ہیں، جو ان دیہاتوں میں قائم کئے گئے ہیں) بعض صورتوں میں گورنمنٹ اسکول جاری تو ہیں مگر ان میں حاضری طلباء اس سے بھی کم ہے۔ نیشنل اسکول کی نگرانی میں چھ ہزار سے اوپر لڑکے ہیں جن میں سینکڑوں لڑکیاں بھی ہیں ان تمام مدرسوں میں چرخہ کاتنا لازمی قرار دیا گیا ہے اگرچہ ابھی تک اس کی باقاعدہ تعلیم نہیں دی جاتی اہم نہ اس کی مشق کی جاتی ہے بہت سے اسکول گزشتہ تین ہی مہینوں کے اندر قومی اسکول بنائے گئے ہیں۔

"لوگوں کی اکثریت سر سے پاؤں تک ہاتھ کی بنی ہوئی کھادی میں ملبوس تھی، اور بہت سی عورتیں بھی یہی پہنے ہوئے تھیں اور جو لوگ نہیں پہنے ہوئے تھے انہوں نے کھادی فراہم نہ کرسکنے کا عذر پیش کیا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ مردوں اور عورتوں نے اپنے پرانے اسٹاک کا استعمال

چھوڑ دیا ہی، مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہی کہ بہت سے لوگ اب بھی خانگی کاموں میں اس کا استعمال کرتے ہیں۔

"کھادی تیار کرنے کے سلسلہ میں اب بھی بہت کچھ کرنا باقی ہی، چرخے کی بہت معقول تعداد ہے مگر تعلقے میں اچھے بہت کم ہیں ناظرین کو یہ سُن کر تکلیف ہوگی کہ یہاں کی خاص پیداوار روئی اب تک تمام کی تمام باہر بھیجی جارہی تھی"۔

گاندھی جی یہ بھول گئے کہ اس اعلیٰ درجہ کی روئی کی کثیر پیداوار اور بڑی قیمتوں پر اس کی کامیاب برآمد ہی سے لوگوں کی خوشحالی قائم تھی ہم کو یہ یقین رکھنا چاہیئے کہ اگر قومی مدرسوں اور چرخوں کو چلانے نیز پروپگنڈا کے دوسرے کاموں کے لئے لوگ یہاں سے روپے نہ پاتے تو اس علاقہ میں گاندھی جی یا ستیاگرہ کے قدم بھی نہ جم سکتے تھے،

گاندھی جی آگے بیان کرتے ہیں "اچھوت بہت آزادی سے جلسوں میں شریک ہوتے ہیں تاہم میں نے یہ مشورہ دیا ہی کہ جب تک اچھوتوں کے بچوں کو اپنے اسکول میں لانے کے لئے اسکول کے منیجر اپنی مرضی کے خلاف نہ کریں گے، اور جب تک ان مصیبت زدہ دیہاتیوں کی فلاح کیلئے گاؤں والے ذاتی دلچسپی نہ لینگے۔ اس وقت تک اس کام کو قابل اطمینان نہیں سمجھا جاسکتا بہت سے شراب خانے بھی اجاڑ ہوگئے ہیں۔

اس طرح گاندھی جی نے اچھوتوں کے مسئلہ کو دو جملوں میں ختم کردیا، مگر غلاموں اور ان رنگین مزدوروں کی دردناک حالت کے متعلق جھوٹے منہ بھی کچھ نہ کہا جو ساری آبادی کا نصف ہیں ہر ایسے یاس انگیز خیالات ان کو پریشان نہ کرسکتے تھے، اور وہ غلاموں کے خوش باش آقاؤں کی خوش حالی پر مسرت کے ترانے ہی گاتے رہے۔

ناظرین کو یہ دیکھ کر ایک خوشگوار تعجب ہوگا کہ بردولی میں جو کچھ حیرت انگیز کام کیا گیا وہ سب بلامعاوضہ رضاکاروں نے انجام دیا، بردولی ایسا تعلقہ ہے جہاں غربا بہت تھوڑی تعداد میں رہتے ہیں اور آبادی کے نصف مصیبت زدہ طبقوں سے قطع نظر زیادہ تر کھاتے پیتے لوگ ہیں، اسی سبب سے پبلک زندگی کا یہ مظاہرہ اور نمایاں ہی اور یہ سب اگر بالکل نہیں تو ایک کافی حد تک ضرور لائق اور پرجوش کارکنوں کی جماعت کی بے لوث خدمات کا نتیجہ ہے جو مرف کرنا یا مرنا جانتی ہی، یہ ہیں خود فریبی کی گہرائیاں جن میں واقعاتی دنیا سے منقطع ہونے کے بعد ایک مہاتما بھی غرق ہوسکتا ہی۔

ہر ایک سیاسی واقعیت پسند حیرت میں پڑ جائیگا کہ بارِ خدایا! کیا لوگوں کی ایک ایسی جماعت جیسی بیان کی گئی ہی وہ پورے ملک کی حالت تو درکنار خود اپنی حالت درست کرنے کے لئے بھی کسی سیاسی جدوجہد کی صلاحیت رکھنے والی ہوسکتی ہی، مگر گاندھی جی تو ہر چیز کی پیمائش صرف چرخہ ہی کے پیمانہ سے کرسکتے تھے۔

انہوں نے اپنی تحریر کو ختم کرتے ہوئے لکھا "اس سارے کام کے باوجود میں نے بہت رُکتے رُکتے اپنا فیصلہ سنایا جس سے مولانا آزاد سبحانی پوری طور پر متفق تھے۔ اس فیصلہ کو کارکنوں کی اس شاندار جماعت نے قبول کرلیا، فیصلہ یہ تھا کہ ایک بڑی سلطنت کی قوت کو چیلنج دینے سے پہلے بردولی کو چاہیئے کہ وہ سودیشی پروگرام کو اس حد تک پایۂ تکمیل کو پہنچا دے کہ وہاں ہاتھ سے بُنا ہوا کپڑا اتنا کافی تیار ہوسکے کہ اس کے باشندوں کے بدن ڈھکنے کے لئے کافی ہو نیز یہ لوگ اچھوتوں کو آزادی سے اپنے مدرسوں میں داخل ہونے دیں، اور اس قدر پرامن ہوجائیں کہ اگر موالاتی یا انگریز یا حکام ان کے درمیان غیر مسلح اور تنہا آئیں تو بھی وہ اپنے کو بالکل محفوظ سمجھیں، باشندگان بردولی نے یہ اپنے ذمّے لیا ہے کہ انشاء اللہ چند مہینوں ہی کے اندر وہ ان تمام شرائط کو پورا کردیں گے"۔

ممکن تھا کہ ہندوستان کے عہد وسطےٰ کے مشہور رنانگوں (Naiyayikas) میں اس حیرت انگیز طرز استدلال سے گاندھی جی کو کوئی اونچا خطاب مل جاتا، مگر مہاتما کا تعقل و استدلال کی اس طرح مٹی پلید کرنا آج کل تو سوا چند خوش اعتقادوں اور کسی کو گوارا نہیں ہوسکتا، سمجھدار لوگوں نے بھی جو اس قسم کی متبرک بکواس پر در پردہ مذاق اڑاتے تھے، اس اعتماد و یقین کے ساتھ ثابت قدمی سے گاندھی جی کی متابعت کا فیصلہ کرلیا کہ خواہ کتنے ہی ناقابلِ عمل اور ڈانواڈول طریقے سے سہی وہ باشندگان ہند کے لئے پُرامن بغاوت کا راستہ ضرور نکالیں گے۔

سینتالیسواں باب

الٹیمیٹم!

مالویہ کانفرنس میں کانگریس کے معاملہ کو پیش کرنے کے بعد گاندھی جی نے کانگریس کی مجلس عاملہ کا جلسہ طلب کیا۔ تاکہ طے شدہ مفاہمت کی باضابطہ منظوری حاصل کرلیں۔ پھر عام سول نافرمانی کی جدوجہد شروع کرنے کی پُرجوش تیاری کے لیے وہ بردولی واپس آئے۔

تین ہی مہینہ پہلے گاندھی جی بردولی والوں کے متعلق یہ فرما چکے تھے کہ یہ لوگ دہلی ریزولیوشن کی شرائط کے مطابق تحریک شروع کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ سورت کے جفاکش اور دلیر کارکنوں کو کثیر رقمیں خرچ کرکے بردولی میں چرخہ کے پرچار اور قومی مدارس کے قیام کی کوشش شروع کیے ہوئے بھی ابھی ایک سال کا زمانہ نہیں گذرا تھا۔ وہاں کے بہت سے مدرسوں کو قومی بنائے ہوئے اور ہزارہا آدمیوں کو اپنا روزمرہ کا لباس چھوڑ کر وطن دوستی کے نشان کے طور پر کھادی کی وردی استعمال کرنے پر آمادہ کیے ہوئے بھی تین مہینہ سے زیادہ کا عرصہ نہیں گذرا تھا۔ البتہ مقامی اور صوبائی کارکنوں کی روز افزوں فوج نے گذشتہ چند مہینوں میں جو بے شمار تقریریں کی تھیں اور گھر گھر پھر کر جو پروپگنڈا کیا تھا اُس کی گرما گرمی سے تعلقے کی فضا میں حرارت سی ضرور آگئی تھی۔ نیز یہ کہ تحصیل کے نیک دل باشندوں کے جوش کو ہندوستان کی انوکھی جنگ آزادی کا آغاز کرنے کی توقع دلا کر انتہائی حد تک بھڑکا دیا گیا تھا۔ اور اب گاندھی جی اُن لوگوں کے درمیان اپنی مدتوں کی موقوف شدہ جنگ کا آغاز کرنے کی خاطر نہایت بے باک اور ناگزیر عزم کے ساتھ مسلح ہوکر بردولی کے کرگ شیتر میں تشریف لائے۔

یہ بات نہیں تھی کہ اُن کا دماغ شبہ سے آزاد تھا اس لئے کہ گول میز کانفرنس کا مسئلہ ابھی باقی تھا۔ گاندھی جی نے کم سے کم ۳۱ جنوری تک اپنی جدوجہد کو ملتوی کرنے کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ افسردہ اور پریشان کُن اطلاعات پھر ہر طرف سے آرہی تھیں۔ اُن کے بعض نامہ نگاروں نے ملک کے مختلف حصوں میں تشدد کے گہرے ماحول کی بھیانک تصویریں کھینچیں۔ بعضوں نے اُن کے مقررہ قاعدوں اور نسخوں سے کانگریس رضا کاروں کی کھلی ہوئی سرتابی کی کہانیاں سُنا کر انھیں فکر میں ڈال دیا۔ مثلاً کانگریس کے بعض جنگجو رضا کاروں نے جھجر کے اندر جو ضلع رہتک (پنجاب) میں تحصیل کا صدر مقام ہے۔ ٹاؤن ہال پر قبضہ کرلیا۔ گاندھی جی نے فوراً اس فعل کو پُرخطر ہونے سے تعبیر کیا بلکہ یہاں تک کیا کہ رضا کاروں کو نصیحتیں کیں کہ وہ اس ہال کو حکام کے حوالے کردیں۔ (ینگ انڈیا ۲۶ جنوری) پھر ۲۲ جنوری ۱۹۲۲ء کو انھوں نے بعنوان "عام تحریک کے خطرات" ایک مقالہ لکھنا بھی مناسب سمجھا۔ انھوں نے ینگ انڈیا کی اسی اشاعت کے ایک ادارتی مقالہ میں "بنگال سے ایک تنبیہی آواز" کی سُرخی کا حوالہ دیا۔ جس میں مضمون نگار نے اس اندیشہ کا اظہار کرتے ہوئے کہ بنگال میں تمام لیڈروں کے جیل میں ہونے کے باعث ہر وقت اس کا امکان ہے کہ کوئی اندھا دھند ہنگامہ برپا ہوجائے گاندھی جی کو متنبہ کیا تھا کہ عدم ادائیگی محاصل کی تحریک شروع کرنے کی منظوری نہ دیں۔

اس تمام انتباہ کے باوجود اب نہ گاندھی جی کے پاس کوئی عذر رہ گیا تھا اور نہ کوئی چارۂ کار باقی تھا۔ کیوں کہ وہ بہت پہلے اپنے کو یہ کہہ کر پابند کرچکے تھے کہ کسی ظالمانہ حکومت سے آزادی حاصل کرنے کے لئے ایک غیر مسلح قوم کے پاس سول نافرمانی آخری حربہ ہے۔ تمام سابقہ مراحل صریحی یا غیر صریحی طور پر گذر چکے تھے اور عوام کو سوراج کے بجائے ظالمانہ احکام و ہدایات کا ایک انبار نصیب ہوا تھا۔ ملک میں ہر طرف

دہشت انگیزی کا ایک نیا دور شروع ہو گیا تھا۔ گاندھی جی اور چند دوسرے لوگوں کو چھوڑ کر قوم کے سب سے زیادہ بہادر اور معروف لیڈر پہلے ہی سے جیل میں تھے۔ تیس ہزار سے زیادہ رضا کار قید کیے جا چکے تھے۔ ہزاروں پر ماریں پڑتی تھیں اور ان کے ساتھ بدسلوکی بھی کی جاتی تھی سیکڑوں روزانہ جیل کی طرف مارچ کرائے جاتے تھے۔ چوں کہ حکومت نے گفت و شنید اور سمجھوتے کی تمام پیش کشوں اور التجاؤں کو قطعی طور پر ٹھکرا دیا تھا اس لیے اب گاندھی جی جیل خانوں میں پڑے ہوئے ہزاروں اشخاص اور ملک کے لاکھوں عوام کی متحدہ آواز سے اپنا پُر امن بغاوت کا آخری حربہ استعمال کرنے پر مجبور ہو گئے۔

لہٰذا گاندھی جی نے مجبور ہو کر اس نازک مسئلے پر جو درپیش تھا غور کرنے اور فیصلہ کرنے کی غرض سے ۲۹ جنوری ۱۹۲۲ء کو باقاعدہ اہل بردولی کی ایک کانفرنس طلب کی۔ مسٹر وِٹھل بھائی پٹیل صدارت کے لیے مدعو کیے گئے۔ وہ یقیناً جذباتی اور جوشیلے آدمی نہ تھے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس دہلی سے واپس ہونے کے ایک ماہ پہلے وہ مجھ سے بردولی کی جد و جہد کے سخت خطرات پر جس کی دھمکی دی گئی تھی صاف صاف الفاظ میں بالتفصیل گفتگو کر کے اپنے دل کا بخار نکال چکے تھے۔ اُنھیں اُس وقت یہ یقین ہو چکا تھا کہ گاندھی جی اور کانگریس نے بردولی کے بعض شورش پسندوں کی غلط رہنمائی کی وجہ سے اپنے آپ کو اس خطرناک فیصلہ کا پابند کر لیا ہے۔ مسٹر پٹیل کو اس بات کا یقین تھا کہ لوگ ابھی اتنے منظم نہیں کہ مارشل لائی نظام کی ان سختیوں اور تکالیف کا مقابلہ کر سکیں جو حکومت فوراً ہی شروع کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ خود گاندھی جی کے الفاظ میں (ینگ انڈیا ۲ فروری ۱۹۲۲ء) مسٹر پٹیل صدر نے "تعلقے کے نمائندوں کی ایک کانفرنس کے سامنے ایک موثر تنبیہی تقریر کی اور اس تنبیہہ کے اظہار میں واقعتاً انھوں نے کوئی نرمی نہیں برتی۔"

گاندھی جی کانفرنس کے بیان میں آگے چل کر لکھتے ہیں "کانفرنس میں تقریباً چار ہزار نمائندے حاضر تھے جو سب کے سب کھدر میں ملبوس تھے۔ پانچ سو عورتیں تھیں جن میں سے بیشتر کھدر پہنے ہوئے تھیں ——— یہ نہایت سنجیدہ متین اور معزز مردوں اور عورتوں کا مجمع تھا جو کچھ نہ کچھ کر گزرنے پر تُلا ہوا تھا۔ میں نے وِٹھل بھائی پٹیل کی متابعت کی اور کانفرنس نے عام سول نافرمانی کی جو شرائط پیش کی تھیں اُن میں سے ہر ایک کا مطالعہ کیا۔ میں نے ایک ایک شرط پر علیحدہ علیحدہ جلسے کا عندیہ لیا۔ وہ ہندو، مسلم، پارسی، عیسائی اتحاد کی منشا کو سمجھتے تھے ("اتحاد" کا یہ نیا نام بمبئی کے نومبر ۱۹۲۱ء والے فسادات کے بعد وضع کیا گیا تھا۔ کیوں کہ یہ محسوس کیا گیا کہ صرف ہندو مسلم اتحاد پر زور دینے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ لوگ پارسی، یہودی، عیسائی اور دوسری چھوٹی چھوٹی اقلیتوں کے خلاف متحد ہو جائیں گے) اُنھوں نے صداقت اور عدم تشدد کی اہمیت کو محسوس کیا۔ اُنھوں نے یہ دیکھ لیا کہ چھوت چھات کے دُور کرنے کا کیا مطلب ہے۔ وہ اچھوت لڑکوں کو قومی مدارس میں داخل کرنے کے علاوہ اُن کو ان مدرسوں میں شرکت کی ترغیب دینے پر بھی تیار تھے۔ اُنھیں دیہاتی کنوؤں سے اچھوتوں کے پانی لینے پر بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ جس طرح وہ اپنے بیمار ہمسایوں کی تیمار داری کرتے ہیں اسی طرح اُنھیں اچھوت مریضوں کی تیمار داری بھی کرنی ہے ——— وہ یہ بھی جانتے تھے کہ انھیں محنتی بننا پڑے گا اور اپنے آپ سوت کاتنا اور کھدر بُننا پڑے گا۔ اور یہی نہیں بلکہ وہ لوگ اپنی منقولہ جائداد اپنے مویشیوں اور زمین کی ضبطی کا بھی مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھے۔ قید کے لئے بھی آمادہ تھے اور وقت ضرورت موت کے لئے بھی اور وہ لوگ یہ سب کچھ بغیر غم و غصہ انجام دینے کے خواہشمند تھے۔

کیا کبھی کسی نے یہ سُنا ہے کہ ایسی معصومانہ خواہشات اور مواعید کی ناپائدار بنیاد پر کسی سنجیدہ تحریک کا آغاز ہوا ہے؟ کانگریس نے جو معیار پیش کئے خواہ ان کی کچھ ہی قیمت کیوں نہ ہو اور میرا خیال ہے کہ پیش نظر مقصد کے لیے یہ معیار بہت ناقابل عمل اور ریاکارانہ تھے۔ مگر گاندھی جی تو بس یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ یہ تحریک شروع کرنے سے پہلے پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے۔ یہ بات تو کھلی ہوئی تھی کہ گاندھی جی نے جب اوائل دسمبر میں اپنے فیصلے کا اعلان کیا تھا اس وقت سے اب تک سودیشی اور کاتنے کے پروگرام کی تکمیل یا چھوت چھات دُور کرنے کے متعلق صورت حالات میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی جن اچھے لوگوں نے دلیری سے جنگ کے حق میں رائے دی تھی وہ بمشکل چرخا چلایا کرتے تھے۔ اور وہ اپنی عورتوں کے کاتے ہوئے سوت کا کپڑا بُننے کا خواب بھی کبھی نہیں دیکھتے تھے۔ اچھوتوں کے سلسلے میں صورت حال اور بھی خراب تھی اور اب یعنی جد و جہد کے آغاز کے وقت بھی اچھوتوں کے لڑکے اُن قومی مدارس میں داخل نہیں کیئے جاتے تھے جنھیں نئے محبان وطن نے چلایا تھا۔ اس وقت مندروں میں اچھوتوں کو داخل کرنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ گاؤں کے کنوؤں سے

اچھوت عورتوں کے پانی لینے کا معاملہ ایک خواب بن کر رہ گیا تھا۔ اور سب سے زیادہ عجیب یہ بات ہے کہ ان کھدر پوش محبان وطن نے ان غیر متمدن کالی پرجا (جو آبادی کا نصف ہیں) کے لیے رائے دہندگی کا حق دینے کی طرف کوئی دھیان نہ دیا جن کو انھیں لوگوں نے ذلیل غلامی کا طوق پہنا رکھا تھا جو لاکھوں ہندستانیوں کی آزادی کی جنگ چھیڑنے کی غرض سے خاص سنجیدہ جلسہ گاہ میں جمع ہوئے تھے۔

اُس آرٹیکل میں گاندھی جی لکھتے ہیں "وٹھل بھائی پٹیل اور بعض دوسرے کارکنوں نے نیز میں نے بھی یہ محسوس کیا کہ ہمیں دو ہفتوں کے لیے فیصلہ ملتوی کرنے کا ریزولیوشن پاس کرنا چاہیے تاکہ سودیشی کا کام اور مکمل ہو جائے اور ساٹھوں قومی مدارس میں اچھوت بچوں کے داخلے کے ذریعے چھوت چھات کا دُور ہونا اور یقینی ہو جائے۔" "لیکن" التوا کے بارے میں بردولی کے سرگرم اور بہادر کارکنوں نے کچھ سُننا گوارا نہ کیا" ——— انھوں نے وٹھل بھائی پٹیل کے ہر اعتراض کو نیچا دکھا دیا اور کانگریس نے اس بہت زیادہ مرغوب جد وجہد کا آغاز کرنے کی خاطر حسب ذیل ریزولیوشن منظور کیا:۔

"عام سول نافرمانی جاری کرنے کے لئے جو شرائط ضروری ہیں اُن کو سمجھنے اور اُن پر بہت کچھ غور کرنے کے بعد باشندگان بردولی کی کانفرنس یہ طے کرتی ہے کہ یہ تعلقہ عام سول نافرمانی کے لیے موزوں ہے ———

اس کانفرنس کو یہ اُمید ہے کہ مذکورہ بالا قربانی کے لیے تعلقہ بردولی اوّلیت کا شرف حاصل کرے گا۔ یہ کانفرنس نہایت ادب سے مجلس عاملہ کو مطلع کرنا چاہتی ہے کہ اگر مجلس مذکور نے کوئی اور فیصلہ کیا یا اس دوران میں مجوزہ گول میز کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا تو خیر ورنہ یہ تعلقہ مسٹر گاندھی اور صدر کانفرنس کے مشورے اور رہنمائی میں عام سول نافرمانی شروع کر دے گا۔"

آخر میں کانفرنس نے محصول دہندوں کو ہدایت کی کہ "اُن کے ذمّے زمین کا جو لگان ہو یا حکومت کے جو دوسرے محاصل باقی ہوں وہ انھیں مزید ہدایات ملنے تک ادا کرنے سے احتراز کریں۔"

اب یہ فیصلہ ہو گیا۔ گاندھی جی نے برکت کی دُعا دی اور فوراً وائسرائے لارڈ ریڈنگ کو اپنا یادگار الٹیمیٹم روانہ کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ عجیب بات ہے کہ گاندھی جی نے پھر بردولی ریزولیشن کی بظاہر ناقابل مقابلہ قوت کو اندرونی طور پر کمزور کرنے کی کوشش شروع کر دی اور حکومت کے کیمپ کی جانب صلح یا قبول اطاعت کا سفید جھنڈا دکھانے لگے۔ بردولی کانفرنس کے ریزولیشن اور اس حلقے کے اندر پُر زور جد وجہد شروع کرنے میں جو اُمور مسلسل تاخیر کا باعث ہوئے تھے اُن کا حوالہ دیتے ہوئے بلکہ حکومت نے گذشتہ دسمبر کے آغاز سے جو "شدید قسم کا استبداد" شروع کر رکھا تھا اس کا بھی تذکرہ کرنے کے بعد گاندھی جی نے وائسرائے کو لکھا:۔

"اس وقت ملک کے سامنے فوری کام آزادئ تقریر، آزادئ اجتماع اور آزادئ مطابع کو معطّل ہونے سے چھٹکارا دلانا ہے۔ حکومت ہند کی موجودہ کیفیت مزاج اور تشدد کی قوتوں پر مکمل اختیار حاصل ہونے کے لحاظ سے اس وقت ملک میں جو عدم تیاری کی حالت ہے اُسے دیکھتے ہوئے تارکین موالات بالویہ کانفرنس سے کوئی سروکار رکھنا نہیں چاہتے تھے جس کا سارا مطلب ہز اکسلنسی کو ایک گول میز کانفرنس کے انعقاد پر آمادہ کرنا تھا۔ لیکن چوں کہ مجھے ایسی تمام مصیبتوں سے جن سے بچنا ممکن ہے۔ گریز کرنے کی فکر تھی۔ اس لئے مجھے کانگریس کی مجلس عاملہ کو یہ مشورہ دینے میں کوئی پس وپیش نہ ہوا کہ وہ کانفرنس کی سفارشوں کو منظور کر لے۔ اگرچہ میری رائے میں جیسا کہ میں نے آپ کی کلکتے کی تقریر سے سمجھا۔ یہ شرائط آپ کی ضروریات کے عین مطابق تھیں مگر آپ نے اس تجویز کو سرے سے مسترد کر دیا۔"

"علی برادران کی فیاضانہ، شریفانہ اور غیر مشروطہ معافی کے موقعہ پر جو مہذب حکمت عملی اختیار کی گئی تھی۔ اس سے "کھلم کھلا گریز" کا حوالہ دینے کے بعد گاندھی جی سوراج حاصل کرنے کے متعلق اپنی پوزیشن حسب ذیل الفاظ میں کھو بیٹھے:۔

"اگر حکومت کی حکمتِ عملی غیر جانبدارانہ ہوتی اور وہ رائے عامہ کو پھلنے پھولنے اور اپنا پورا اثر ڈالنے کی اجازت دیتی تو اس وقت تک جارحانہ قسم کی سول نافرمانی کو روکا جا سکتا تھا جب تک کہ ملک کی تشدد کی قوتوں پر کانگریس کا زیادہ کامل اقتدار نہ ہو جاتا اور جب تک کہ وہ اپنے کروروں ماننے والوں میں زیادہ اچھے طریقے پر ضبط ونظم نہ پیدا کر دیتی۔"

گاندھی جی نے ایک بار پھر ہز ایکسلنسی سے قابل نفرت احکام کو واپس لینے اور جنگ کے قیدیوں کو رہا کرنے کی درخواست کرتے ہوئے لکھا: "اگر

آپ کی مصلحت اس اعلان نامے کی اشاعت کے ایک ہفتہ کے اندر ضروری اعلان کرنے کی اجازت دے تو میں جارحانہ قسم کی سول نافرمانی کو اس وقت تک کے لیے ملتوی کرنے کا مشورہ دینے پر آمادہ ہوں۔ جب تک کہ وہ کارکن جو قید میں ہیں رہائی کے بعد پوری صورتِ حالات پر نظرِ ثانی نہ کرلیں اور از سرِ نو اس قضیہ کو نہ سمجھ لیں۔ اگر حکومت نے مطلوبہ اعلان کردیا تو میں اسے حکومت کی جانب سے رائے عامہ کو برسرِ عمل کرنے کی ایک مخلصانہ کوشش سمجھوں گا اور پھر مجھے ملک کو یہ مشورہ دینے میں کوئی تردّد نہ ہوگا کہ کسی جانب سے تشدّد کے دباؤ کے بغیر رائے عامہ کو اور زیادہ اپنے حق میں کرنے کی کوشش کرے اور مجھے یقین ہے کہ رائے عامہ اس طرح کام کرے گی کہ اس کے ناقابلِ ترمیم مطالبات پورے ہوجائیں گے۔"

غرض یہ کہ اگر ملک میں وہی حالات پیدا کردئے جائیں جیسے خلافت اور پنجاب کے لیے انصاف اور ملکی آزادی کے حصول کے لیے اقدامِ عمل کے وقت تھے تو گاندھی جی کو اپنی تلوار میان میں رکھ لینے میں کوئی تردّد نہیں ہوتا۔

ایک بار پھر گاندھی جی اُس جال میں آگئے جو حکومت نے نہایت ہوشیاری سے اُن کی راہ میں بچھایا تھا اور اُنھوں نے اصل معاملہ کو پس پشت ڈال کر معمولی اُمور کی طرف اپنی توجہ منعطف کردی۔ اس لیے کہ اُنھوں نے ساری جدوجہد کو انسدادی حکمتِ عملی کے معمولی مسئلے کی طرف جو سرے سے رُونما ہی نہ ہوتا، پھیر دینے کی شدید اور ناقابلِ ضبط خواہش کا اظہار کیا حالانکہ کلکتہ یا لکھنؤ کانگریس نے جو ترکِ موالات کے پیغام کا اعلان کرنے والی تھی اس پر کبھی غور بھی نہیں کیا تھا مگر وہ تھے کہ رائے عامہ کو ہموار اور تیار کرنے کے سُست رفتار طریقِ عمل کے سامنے ترکِ موالات کے بنیادی مسئلے کو چھوڑ دینے پر مطمئن تھے۔

اُدھر گاندھی جی اپنا مقدس جھنڈا لہراتے رہے اِدھر حکومت نے بھی اس طرف توجہ مبذول کی۔ درحقیقت اس نے گاندھی جی کی کمزوری کا پوری طور سے اندازہ لگالیا تھا۔ لیکن لارڈ ریڈنگ کی حکومت نے گاندھی جی کے الٹیمیٹم کے جواب میں ایک سرکاری اعلان شائع کیا جس میں گاندھی جی کو قانون و امنِ عامہ کے درہم برہم کرنے کی جدوجہد شروع کرنے کی مجنونانہ غلطی کا ملزم ٹھہرایا گیا اور اس پر انھیں تنبیہہ کی گئی۔

غرض گاندھی جی کو ایک ماہ کے اندر یہ تیسری پھٹکار ملی۔ یہ اُن کی برداشت سے باہر تھا۔ اب گاندھی جی کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ رہا کہ وہ لڑائی کا بگل بجادیں اور باشندگانِ بردولی کو سول بغاوت شروع کرنے کی دعوت دیدیں۔

اڑتالیسواں باب

شکست

ابھی جنگ کے بگل کی آواز ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ گاندھی جی نے اپنی فوج کو سخت عاجلانہ پسپائی کا حکم دے دیا۔

گاندھی جی نے حکومت کے سرکاری اعلان کا ایک بلند آہنگ جواب الجواب روانہ کیا اور اس جواب الجواب کی اشاعت کے دوسرے ہی دن اُنھوں نے اچانک روپ بدل دیا۔ کیوں کہ اُن کے چھوٹے چہیتے بیٹے دیوی داس نے اُنھیں چوری چورا میں جو ضلع گورکھپور صوبجات متحدہ میں واقع ہے، شدید فساد برپا ہوجانے کی خوفناک خبر بذریعہ تار ارسال کردی۔

اس ٹریجڈی کا بیان خود گاندھی جی سے سنیئے:۔

"میں سمجھتا ہوں کہ جو سپاہی اتنی بے رحمی سے موت کے گھاٹ اُتار دیے گئے ہیں اُنھوں نے اشتعال انگیزی سے کام لیا تھا۔ انسپکٹر

نے اُنھیں حکم دے دیا تھا کہ وہ مجمع کو نہ چھیڑیں۔ مگر اُنھوں نے اس حکم سے سرتابی کی۔ جب جلوس گذر گیا تو سپاہی بچھڑے ہوئے لوگوں سے بھڑ گئے اور اُنھیں گالیاں دیں۔ یہ بے چارے دُہائی دینے لگے مجمع لوٹ پڑا۔ سپاہیوں نے گولیاں چلاویں۔ اُن کے پاس جو تھوڑی سی گولیاں تھیں وہ ختم ہوگئیں اور وہ اپنی حفاظت کے لیے تھانے میں جا چھپے۔ میرا اطلاع کنندہ مجھ سے کہتا ہے کہ مجمع نے تھانے کو آگ لگا دی۔ اپنے آپ کو خود قید کرنے والے سپاہی اپنی پیاری جان بچانے کے لیے باہر نکل آئے، جیسے ہی وہ باہر نکلے اُن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گئے اور ان کی لاشوں کے ٹکڑوں کو بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونک دیا گیا۔

یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ کوئی ترک موالاتی رضا کار اس سفاکی میں شریک نہیں ہوا اور یہ کہ مجمع کو صرف فوری اشتعال ہی نہیں دیا گیا بلکہ وہ اس ضلع میں پولیس کے شدید مظالم سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔"

اس طرح جن فسادات کا تذکرہ کیا گیا ہے وہ بلاشبہ بہت شدید تھے۔ تقریباً دس یا بارہ سپاہی بہت وحشیانہ حالات میں ذبح کر دیے گئے اور اُنھیں آگ میں جھونک دیا گیا۔

لیکن ہمیں دوسری جانب بھی نظر ڈالنی ہے۔ کوئی کانگریسی آدمی یا رضا کار مجمع کی ہدایت اور نگرانی نہیں کر رہا تھا۔ اس لیے کسی کانگریسی کو اس بلوے کا ذمے دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا تھا۔ اگرچہ اس زمیں دار زدہ صوبے میں تمام وحشیانہ مظالم سے عوام مشتعل اور مضطرب ضرور تھے مگر یہ کھُلی ہوئی بات ہے کہ مجمع وہاں پولیس والوں کو قتل کرنے کے لیے اکٹھا نہیں ہوا تھا۔ یہ فساد پہلے سے سوچا سمجھا واقعہ نہیں تھا۔ اس سے فوری طور پر عوام کے غیظ و غضب کے بھڑک اُٹھنے کا اظہار ہوا۔ مگر پھر بھی یہ سب کچھ حفاظت خود اختیاری کے تحت ہوا۔ اگر پولیس والے مجمع پر جو قریب قریب گذر چکا تھا گولی نہ چلاتے تو وہ کبھی مارے نہ جاتے۔ یہ درحقیقت پولیس والوں کی گولیاں تھیں جن سے بارود میں آگ لگی اور جو اُن کے وحشت ناک انجام کا باعث ہوئیں۔

اگر پورے کام کو انتہائی طور پر بُرا بھی سمجھ لیا جائے تو اسے کسی لحاظ سے بھی اُن حوادث سے بُرا نہیں سمجھا جا سکتا جو مالیگاؤں، مدراس اور بالخصوص بمبئی اور مالابار میں رونما ہوئے۔ موخر الذکر دونوں مقامات پر جان کا بہت زیادہ نقصان ہوا تھا۔ موپلوں اور فوج دونوں نے ایک طرح مردوں اور عورتوں کی اس سے زیادہ بڑی تعداد کو جس کا سرکاری اعداد و شمار سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا، موت کے گھاٹ اُتارا اور ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا تھا۔

اس سے یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ چوری چورا کے واقعے سے بہت زیادہ متاثر ہونے کے باعث گاندھی جی اپنی بردولی کی مقدس جنگ کے آغاز کو چند ہفتوں کے لیے ملتوی کر دیں گے۔ وہ ملک میں منظم امن و امان قائم رکھنے کی ضرورت پر ساری قوم کو سخت تنبیہ بھی کر سکتے تھے تاکہ اپنی بردولی کی جنگ کے لیے بہت کم وقت میں ضروری ماحول پیدا کر دیں۔

مگر مالا گام کے سوا ۱۹۲۱ء کے تمام فسادات اور چوری چورا کے سانحہ میں ایک خاص فرق تھا۔ بمبئی مالابار اور دوسرے مقامات پر بالعموم آبادی کے مختلف حصے باہمی خانہ جنگی میں مبتلا تھے مگر اس کے برخلاف چوری چورا کے مشتعل مجمعے نے سرکاری ایجنٹوں سے ایسی سختی کے ساتھ انتقام لیا کہ ۱۹۱۹ء کے فسادات کے بعد سے کسی مجمعے نے ایسی مثال نہیں پیش کی۔

الغرض گاندھی جی نے اپنے کارناموں پر آپ پانی پھیر دیا۔ یا اور زیادہ منصفانہ طریقے پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء کے دوران میں جو بہت سے المناک واقعات رُونما ہوئے اُنھیں ہضم کر جانے کے بعد گاندھی جی خود اپنی ۱۹۱۹ء کی مثال کی طرف رجعت کر گئے۔ اس المناک واقعے کی اطلاع سے خدا جانے کس طرح انھیں اتنا غیر معمولی اور تکلیف دہ درد ہوا کہ انھوں نے چند ہفتوں یا چند مہینوں کے لیے تو کیا ایک غیر معینہ مدت کے لیے جارحانہ ترک موالات اور سول نافرمانی کی ساری تحریک ملتوی کر دینے پر اپنے کو مجبور سمجھا۔

گاندھی جی نے گہری روحانی تکلیف اور شرمناک ذلت کے اثر سے تحریک کو ایک غیر معین وقت تک کے لیے ملتوی کر دینے کا فیصلہ کرنے کے بعد حسب معمول اپنے فیصلے کی توثیق کے لیے کانگریس کی مجلس عاملہ کا جلسہ طلب کیا۔ ۱۱ فروری کو بردولی میں مجلس کا جلسہ منعقد ہوا۔ گاندھی جی لکھتے ہیں

"میں نے مجلس عاملہ اور دوسرے رفقاء کے سامنے جو میرے نزدیک تھے اپنی تکالیف اور اپنے شکوک پیش کیے۔ پہلے تو وہ سب میری موافقت میں نہ تھے اور بعض تو اب بھی مجھ سے مطابقت نہیں رکھتے ——— وہ میری مشکلات کو سمجھ گئے۔ اور صبر سے میری دلیل سنتے رہے۔"
آخر کار کمیٹی اس پر رضامند ہو گئی کہ سول نافرمانی ملتوی کر دی جائے اور تمام کانگریسی اداروں کو حکم دیدیا جائے کہ وہ اپنی تمام کوششیں عدم تشدد کا ماحول پیدا کرنے، قومی پنچائتوں اور تعلیمی اداروں کو ترقی دے کر اپنی قوت بڑھانے، کانگریس کے لیے ممبر بھرتی کرنے، "چرخوں کو رواج دینے، کھدر تیار کرنے، چھوت چھات دُور کر کے اچھوت طبقوں کی حالت سُدھارنے اور کانگریس کا کام چلانے کے لیے تلک سوراج فنڈ" کے واسطے رقم جمع کرنے پر مرتکز کر دیں۔ گاندھی جی نے چوری چارا ٹریجڈی کے کفارے کے طور پر پانچ دن کا برت بھی رکھا۔" (ڈاکٹر راجندر پرشاد)
اس طرح گویا ملک کو حکومت کے خلاف اپنی تلوار نیام میں کر لینے اور ایک غیر معین مدت کے لیے ایسی مختلف سرگرمیوں میں مصروف رہنے کی ہدایت کی گئی جو معاشرتی خدمت کے دائرے میں آتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس قسم کی سرگرمیاں اس سال کے پہلے بھی جاری کی گئی تھیں۔ مگر ملک ان کی اصلی قدر و قیمت کا قائل ہو کر جوش و خروش سے ان پر عمل پیرا نہیں ہوا تھا بلکہ وہ سمجھتا تھا کہ سال کے آخر تک یہ چیزیں ایسے سول بغاوت کے انتہائی نقطے تک پہنچانے میں معاون ہوں گی۔ بہر حال اس سیاسی زور حرکت اور ارادے سے محروم ہو جانے کے بعد سارا پروگرام قدرتاً سادہ اور بے جان نظر آنے لگا۔

گاندھی جی کو اس کا پورا پورا احساس تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ۱۹۰۹ء سے اب تک بہت کچھ جوش و خروش ضائع کیا جا چکا ہے اگر ۱۹۱۹ء میں گجرات اور پنجاب کے مختلف مقامات پر بیک وقت فسادات برپا ہو جانے کے باوجود صرف جدوجہد روک دینے پر لوگوں کو مایوسی ہوئی تھی تو اب چند ایسے پولیس والوں کے قتل پر جن میں سے سب کے سب نوکر شاہی کے بہت کم تنخواہ پانے والے ملازم تھے۔ جو اس عظیم الشان جنگ کے لیے بطور کارزار منتخب کیے ہوئے مقام سے کئی ہزار میل دُور واقع تھا، جنگ ملتوی کر دینے پر لوگ انتہائی غیظ و غضب کے عالم میں اُن پر ٹوٹ پڑتے۔ اس لیے اُنھوں نے کچھ ایسے انداز میں محاذ بدلنے کا زوردار پروپگنڈا شروع کیا جس میں اگرچہ مجاہدانہ جوش نہ تھا پھر بھی اس میں ذاتی تاسف اور تحقیر کا ایسا گہرا رنگ دیا گیا تھا جس کے متعلق اُنھیں یقین تھا کہ پڑھنے والوں پر اس کا زبردست اثر پڑے گا۔

فی الحقیقت گاندھی جی نے "چوری چورا کے جرم" کے عنوان سے (ینگ انڈیا مورخہ ۱۶ فروری ۱۹۲۲ء) حسب ذیل موثر الفاظ میں ایک نہایت دردانگیز آرٹیکل سے ابتدا کرتے ہوئے ناظرین کو بالکل مطمئن کرنے کی کوشش کی

"خدا مجھ پر بڑا مہربان ہے۔ اُس نے تیسری بار مجھے آگاہ کیا کہ ہندوستان میں ابھی تک وہ سچی اور تشدد سے خالی فضا پیدا نہیں ہوئی جس کے علاوہ اور کوئی چیز عام سول نافرمانی کو حق بجانب نہیں بنا سکتی۔

خدا نے مجھے ۱۹۱۹ء میں رولٹ ایکٹ کی شورش شروع ہوتے وقت متنبہ کیا تھا۔ اُس وقت احمد آباد، ویرم گام اور کھیرا نے غلطی کی اور اسی طرح امرتسر اور قصور سے بھی غلطیاں سرزد ہوئیں۔ میں نے اپنے اقدام پر نظر ثانی کی اور اسے ہمالیہ جیسی غلطی قرار دے کر خدا اور انسان دونوں کے سامنے عاجزی کا اظہار کیا ———

دوسری بار بمبئی کے واقعات کے ذریعے اُس نے مجھے زبردست تنبیہ کی۔ ۱۷ نومبر کو اُس نے مجھے بمبئی کے مجموں کے کرتوت کا عینی مشاہدہ کرایا ——— میں نے بردولی کی عام سول نافرمانی کو جو فوراً شروع ہونے والی تھی ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا ———
مگر ابھی تلخ ترین ذلت کا سامنا کرنا باقی تھا۔ مدراس نے مجھے تنبیہ کی مگر میں نے اُس کی کوئی پروا نہ کی۔ لیکن چوری چورا کے ذریعے خدا نے مجھے صاف صاف بتا دیا۔"

اس طرح گاندھی جی نے خود گویا منجانب خدا اپنے اضطراری اور غیر شعوری ردعمل کی تقدیس کر لی اور اپنے فیصلے کو اس طرح سنایا گویا یہ حکم آسمان کی طرف سے اُنھیں ملا تھا۔

مگر کیا پولیس والوں نے مجمع کو اتنا کافی مشتعل نہیں کر دیا تھا کہ وہ ان لوگوں کا خاتمہ کردے۔ ایسے سوال کی پیش بندی کرتے ہوئے گاندھی جی نے جواب دیا۔

"کوئی اشتعال انگیزی اُن آدمیوں کے وحشیانہ قتل کو حق بجانب نہیں بنا سکتی جو نہتے ہو گئے تھے اور جنھوں نے اپنے آپ کو مجمع کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا تھا۔ اور جب ہندستان تشدد سے خالی ہونے کا مدعی ہے اور آزادی کا تخت پُرامن ذرائع سے حاصل کرنے کا اُمیدوار ہے تو بدترین اشتعال کے جواب میں بھی تشدد سے کام لینا ایک بُرا شگون ہے۔ فرض کر لیجیے کہ اگر بردولی کی غیر متشدد نافرمانی کو خدا کامیاب ہونے کی اجازت دیتا اور حکومت بردولی کے فاتحوں کے حق میں دست بردار ہو جاتی تو اُس وقت مفسد عناصر کو کون قابو میں رکھتا جو اشتعال انگیزی پر انسانیت سوز حرکات کا ارتکاب کیے بغیر نہ رہتے؟ عدم تشدد کے ذریعہ خود مختاری کے حاصل کرنے کے لیے شرط اولیں یہ ہے کہ ملک کے متشدد عناصر پر عدم تشدد کے ذریعے سے قابو رکھا جائے۔"

"تشدد سے خالی تارکین موالات اُسی وقت کامیاب ہو سکتے ہیں جب وہ ہندستان کے غنڈوں کو اپنے قابو میں کر لیں بالفاظ دیگر جب یہ لوگ بھی حب الوطنی یا مذہبی تقاضے سے یہ سیکھ لیں کہ جس وقت ترک موالات کی مہم جاری ہو کم از کم اُس وقت انھیں تشدد آمیز افعال سے احتراز کرنا چاہیے۔ اس لیے چوری چورا کی ٹریجڈی نے مجھے بالکل چونکا دیا ہے۔"

کیا شہدوں میں بھی اس درجہ حب الوطنی اور مذہبیت پیدا ہو سکتی ہے کہ یہ لوگ کسی کے حکم کے مطابق عمل کر سکیں۔ چوں کہ یہ لوگ سخت افلاس اور ناموافق حالات کی پیداوار ہیں۔ اس لیے وہ صرف ایک قانون سے واقف ہوتے ہیں اور وہ قانون طاقت کا قانون ہے۔ اس لیے "بردولی کے فاتحوں کے حق میں حکومت کے دست بردار ہونے کے بعد" گاندھی جی کو ہندستان میں غنڈہ گردی پھوٹ پڑنے کے خوفناک امکان پر لرزہ براندام ہونے کی ضرورت نہ تھی کیوں کہ اس طرح حکومت کی مشینری پر فاتح کا قبضہ ہو جاتا تو آئندہ اس سے غنڈوں کو قابو میں رکھا جا سکتا تھا جس طرح ہر زمانے میں تمام حکومتیں اور حکمران انھیں قابو میں رکھتے آئے ہیں۔

کیا گاندھی جی اس بات میں حق بجانب تھے کہ وہ اس آخری لمحہ میں قوم کے سامنے حسب معمول نہایت آسانی سے کامیاب پُرامن بغاوت کے شرائط کی عجیب وغریب تعریف کا ایک نیا شگوفہ چھوڑ دیں؟ ہم نے جو کچھ سمجھا تھا اور ہمیں اس سے پہلے اُن سے جو کچھ معلوم ہوا تھا وہ بس یہ تھا کہ جب گاندھی جی بردولی میں اپنا انوکھا تجربہ کر رہے ہوں تو ملک بھر میں تمام کانگرسیوں کو امن کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ لیکن اگر انھیں ان لوگوں سے یہ توقع تھی کہ وہ اس وسیع ملک میں تشدد کی تمام طاقتوں کو مکمل طور پر اپنے قابو میں رکھ لیں گے تو ظاہر ہے کہ یہ ایک محال چیز کا مطالبہ تھا۔ اگر کانگرس تنظیم اور صلاحیت کی اس انتہائی منزل پر واقعی پہنچ جاتی کہ وہ قوم کی تمام سرگرمیوں کو جن میں اس کے مفسد اور شریر ترین عناصر بھی شامل ہیں مسلمہ طور پر اپنے قابو میں رکھ سکتی تو پھر ہمارے برطانوی آقاؤں کو چوبیس گھنٹے کے اندر اندر حکومت سے دست بردار ہو جانے میں گاندھی جی کے اشارے کی بھی ضرورت باقی نہ رہتی۔

گاندھی جی نے اس اعتراض کی پہلے ہی سے پیشین گوئی کر دی تھی اور اس کے وزن کا بھی اعتراف کر لیا تھا۔ اُنھوں نے لکھا "میں سول نافرمانی کو کسی قدر نامکمل حالات میں بھی ناممکن نہیں خیال کرتا۔" وہ غیر ارادی تشدد کو بھی مثلاً خشت باری یا اتفاقاً تخویف اور اور جبر و تشدد عمل پیرا ہو جانے کو بھی برداشت کرنے پر تیار تھے۔ مگر جب خشت باری کا جواب جیسا کہ ہندستان میں اکثر ہوتا رہتا ہے گولیوں سے دیا جائے تو پھر مظلوم مجمع کو مشین گنوں کی آگ سے یکایک قتل و آتش زنی کی راہ روشن نظر آنے لگتی ہے۔ لہٰذا اس صورت میں گاندھی جی کو جس قسم کے تشدد سے صدمہ پہنچا اس کے متعلق اب محض کم وبیش کا سوال رہ جاتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ وہ مہاتما جو مالابار کے اُونٹ کو نگل گیا تھا اُسے چوری چورا کی مکھی پر تکلف برتنے کی کیا ضرورت تھی۔

اگر مالابار دُور تھا تو چوری چورا اور بھی زیادہ دُور تھا۔ اس لیے ہندوستان کے ایک تنہا اور دُور و دراز گوشے میں چند پولیس والوں کا اتفاقیہ قتل بردولی پروگرام میں کیوں خارج ہو؟ اس سوال کی پیش بینی کرتے ہوئے گاندھی جی نے جواب دیا:-

"ہندُستان کے نقشے میں بردولی کی حیثیت ایک نقطہ سے زیادہ نہیں۔ جب تک دوسرے حصّوں میں پورا پورا تعاون نہ ہو اس کی کوششیں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ بردولی کی نافرمانی صرف اُسی وقت سول ہو گی جب ہندُستان کے دوسرے حصے تشدّد سے خالی رہیں۔ جس طرح دُودھ کے برتن میں ایک قطرہ زہر پڑ جانے سے وہ کھانے کے قابل نہیں رہتا۔ اُسی طرح چوری چورا کے مہلک زہر کی آمیزش سے بردولی کی امن پسندی قابل قبول نہیں رہ سکتی۔"

یہ خرافات ظاہر ہے ایسی بے سروپا ہیں کہ ان کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ہندُستان ایک وسیع ملک ہے جو باستثنائے روس یورپ کے برابر ہے۔ کوئی انسان اپنے ہوش کی حالت میں یہ توقع نہیں کر سکتا کہ اتنے بڑے وسیع براعظم کے تمام حصّوں کے لوگ مکمل طور پر برابر ایک مخصوص طرزِ عمل کے پابند رہیں گے، اور نہ کوئی شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ ہمالی لینڈ میں کوئی پُرامن تحریک محض اس لیے نہیں چلائی جا سکتی کہ بلقان کے انتہائی جنوب میں کتنا ہی خونی سہی۔ کوئی فساد برپا ہو گیا ہے۔

مگر گاندھی جی ایک خود پسندیدہ حکمتِ عملی سے دوسری خود پسندیدہ حکمتِ عملی کی طرف تیزی سے بڑھتے ہوئے اپنے حیرت انگیز آرٹیکل کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے انتہائی حد تک خود بیں و خود شکن بن گئے۔ اب یہ سوال نہیں تھا کہ چوری چورا کے زہر کا ایک قطرہ ملک بھر کے امن کے دُودھ کے پیالے کو بگاڑ دے گا۔ مہاتما کو نظر آ گیا کہ دراصل معاملہ برعکس ہے۔ کیوں کہ اب اپنے خیال میں اُنھوں نے یہ دیکھا کہ گویا کھدر کی سفید وردی نے محض اس ذہنی تشدّد، خفگی اور نفرت کے وسیع سمندر کے لیے پردے کا کام دیا ہے۔ جو ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک موجزن تھا۔ اب کانگریس کے مقدس لوگ بھی اُن کی نظر میں غیر ملکی ظالموں کے خلاف اپنے اندر خفیہ غیظ و غضب اور جذبۂ انتقام کو جگہ دینے کے مجرم معلوم ہوتے تھے۔

الغرض اُنھوں نے لکھا کہ "چوری چورا کا المناک سانحہ دراصل اُس راستے کو صاف صاف دکھارہا ہے جو ہندُستان والے بآسانی اختیار کریں گے۔ اگر شدید احتیاطی کارروائیاں نہ کی جائیں گی۔ اگر ہم عدم تشدد سے تشدّد نہیں پیدا کرنا چاہتے تو یہ بات بالکل صاف ہے کہ ہمیں اُلٹے پاؤں واپس ہونا چاہیے۔ اور امن کی فضا از سرِ نو قائم کرنا اور اپنے پروگرام کو پھر سے مرتب کرنا چاہیے اور اُس وقت تک عام سول نافرمانی کا خیال بھی نہ لانا چاہیے جب تک ہمیں اس بات کا یقین نہ ہو جائے کہ عام سول نافرمانی کے شروع ہونے پر حکومت کی اشتعال انگیزی کے باوجود امن قائم رہے گا۔"

اور زیادہ گہرائی میں جاتے ہوئے گاندھی جی نے اپنے کانگریسی متبعین کو ہدایت کی کہ وہ اپنی اندرونی حالت کی طرف مائل ہوں اور پوری تنظیم کو زیادہ گہری اور مضبوط بنیادوں پر قائم کریں۔

"یہ واقعہ ہے کہ کانگریس کا نظام اب بھی نامکمل ہے اور اس کی ہدایات پر اب بھی محض سرسری طور پر عمل کیا جاتا ہے۔ ہم نے گاؤں گاؤں کانگریس کمیٹیاں نہیں قائم کیں اور جہاں جہاں قائم بھی کیں وہ قطعی طور پر ہماری ہدایات کے تحت نہیں چل رہی ہیں۔ ابھی ایک کروڑ سے زیادہ ممبر بھی ہمارے پاس نہیں ہیں۔ فروری کا آدھا مہینہ گذر گیا مگر ہم میں سے بہتیرے ایسے ہیں جنھوں نے سال رواں کا چار آنہ چندہ رکنیت بھی نہیں دیا۔ رضاکار لاپروائی سے بھرتی کیے جاتے ہیں۔ وہ اپنے عہد نامے کی تمام شرائط کو پورا نہیں کرتے ہاتھ کے کتے ہوئے اور بنے ہوئے کھدر کے کپڑے بھی نہیں پہنتے۔ اب تک تمام ہندو رضاکار چھوت چھات کے گناہ سے بھی پاک نہیں ہوئے، لوگ تشدّد کے بدنما داغ سے آزاد نہیں۔ کچھ ان کی قید سے ہمیں سوراج نہیں مل جاتا ——— یہ لوگ اپنے متعلق یہ جانتے ہوئے بھی رضاکاروں کے دستوں میں شریک ہو جاتے ہیں کہ ہم تشدد سے خالی نہیں ہیں اور نہ ایسا ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں ہم بالکل اُسی طرح صداقت سے خالی ہیں جس طرح ہم حکومت کو سمجھتے ہیں۔ ہم صداقت اور عدم تشدد کی شان میں محض قصیدہ خوانی کر کے آزادی کی سلطنت میں قدم بھی نہیں رکھ سکتے۔"

کانگریسی جو اس طرح کے وعظ سنتے سنتے اُکتا چکے اور بھڑک اُٹھے تھے شاید تعجب سے کہہ اُٹھے "واہ رے وحشی قوم

کو اُن مخصوص کاموں کی کامیاب سرانجامی پر جو وہ اس کے سامنے ہر چوتھائی سال کے بعد پیش کرتے رہے سال بھر شاباشی دینے کے بعد کیا گاندھی جی یہ سب کچھ کہنے کا بھی مُنھ رکھتے تھے؟ جب وہ ملک میں دورہ کر رہے تھے تو کیا اُن کی آنکھیں اور اُن کے کان کھلے ہوئے نہیں تھے؟ کیا وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ جب وہ اپنی خیالی بہشت کا جہاں سچائی اور امن کے توام دیوتا تختِ حکمرانی پر بٹھائے جاتے، خواب دیکھے جا رہے تھے تو خود اُنھیں کے پروپیگنڈے کے اثر سے کانگریسی نوجوان رضاکار، جنگ جو تجار، فاقہ کش کسان، اور اجرت کے غلام مزدور سب کے سب حکومتِ برطانیہ کے خلاف غضب اور نفرت کے بڑھتے ہوئے احساس سے جوش کے مارے اُبل رہے تھے؟ کیا اُنھوں نے یہ نہیں دیکھا کہ اُن کی زبردست شخصیت کے ساتھ جو اُن لوگوں کا پیمانِ وفا تھا محض اُسی کی بنا پر اُنھوں نے عدم تشدد کو از روئے حکمت قبول کر لیا تھا جس نے اُن کو اس بات سے روک دیا کہ وہ تشدد کے معمولی فعل سے اپنے کو بے نقاب کرتے ہوئے اپنے فطری جذبات کا آزادی سے مظاہرہ کریں؟ پہلے تو اُن کا ایک ایسی چیز پر ایمان رہا جس کا کوئی وجود ہی نہ تھا اور اب اُن کے اندر کسی چیز کی دریافت سے جو حقیقتاً ہمیشہ سے موجود تھی دفعتاً ایک خواہش پیدا ہوئی اور یک بارگی سیڑھی کے مخالف سرے پر پہنچنے کے بعد اب اُنھوں نے جارحانہ رنگ کی کسی جدّوجہد کو شروع کرنے کی ساری امید بالکل ترک کر دی اور اُس چیز کی اتباع کے ذریعے جس کا بعد میں تعمیری پروگرام لقب ٹھہرایا گیا تھا حصولِ سوراج کے خوش آیند امکانات سے اُنھوں نے مایوس لوگوں کو تسلّی دینی چاہی۔

آخر میں گاندھی جی نے لکھا کہ "وہ عملی اور طبعی دونوں لحاظ سے صداقت پسند اور تشدد سے خالی ہو جانے اور سودیشی یعنی کھدر پروگرام کو تکمیل تک پہنچانے سے ہم کامل سوراج قائم کر سکتے ہیں اور خلافت اور پنجاب کی بے انصافیوں کی تلافی کر سکتے ہیں، خواہ کوئی متنفس سول نافرمانی پر عمل کرنے کے لیے ہو یا نہ ہو۔"

الغرض ہندوستان کی صداقت مزاج دریافت کرنے کے بعد گاندھی جی نے اپنے آپ کو توہّم کے سراسر غلط ہجوم کے سپرد کر دیا۔ کیوں کہ اب سوراج کا نسخہ بہت صاف اور سادہ ہو گیا تھا۔ اب بدیشی کپڑوں کے مقاطعہ کے سوا کسی قسم کا مقاطعہ باقی نہ تھا، قومی مدارس کے قیام کی بھی ضرورت نہ تھی اور اسی طرح نہ سول نافرمانی تھی اور نہ عدم ادائگی محاصل کی مہم۔ کانگریس اور ہندوستان کے لیے صرف چرخہ کاتنے کا ایک کام رہ گیا تھا اور اسی سے سوراج ملنے والا تھا۔

اسے بھول ہی گئے کہ ہندوستان صدیوں چرخے کاتا کیا اور پھر بھی اسے بہم حملوں اور مسلسل غیر ملکی حکمرانوں کے یکے بعد دیگرے بہت سے خاندانوں کے طویل زمانۂ حکومت کی اذیتیں برداشت ہی کرنی پڑیں۔ جب اہلِ برطانیہ ہندوستان آئے تو اُس وقت بھی ہندوستان چرخہ ہی چلایا کرتا تھا، مگر برطانوی حملوں کی مدافعت یا انسداد کے لیے نہ یہ سادہ چرخے کام آئے نہ ڈھاکہ کی ململ، نہ مرشدآباد کا ریشم۔

انچاسواں باب

گاندھی جی کے سر پر طوفان

تحریک ستیہ آگرہ اور اُسی کے ساتھ ساتھ مشہور بردولی ریزولیوشن کے التوا کا سارے ملک میں تلخ طعن و طنز اور شدید تنقیدوں سے استقبال کیا گیا ۔ گاندھی جی کے سر پر ایک ایسا زبردست طوفان برپا ہو گیا کہ نہ اُنھیں اِس سے پہلے اس قسم کے طوفان سے کبھی سابقہ پڑا تھا اور نہ اس کے بعد سے اب تک کبھی واسطہ ہوا ہے ۔ عوام کے معمولی غیر تربیت یافتہ دماغوں اور سیاسی طبقوں کی عقلِ سلیم کے نزدیک چوری چورا کا سانحہ ہندوستان کے سفید آسمان پر ایک چھوٹا سا کالا مگر غیر اہم داغ ضرور تھا ، مگر بس اتنا ہی غلط روحانی استدلال کی وسیع بوچھاروں اور غلط سیاسی اجتہاد کا جن کے ذریعے گاندھی جی اپنے فیصلے کو حق بجانب بنانا چاہتے تھے یہ نتیجہ ہوا کہ تنقیدوں کا بازار اور گرم ہو گیا ، اور قریب قریب دونوں طرف سے طعن و تشنیع تک نوبت پہنچ گئی ۔

گاندھی جی کے سر پر ہر طرف سے اعتراضات کی ایک پیہم اور لامتناہی بوچھار شروع ہو گئی ۔ تعمیری کام کے سارے پروگرام کو جس کا خاکہ بردولی میں تیار کیا گیا تھا اصلاحِ معاشرت کہہ کر بُرا بھلا کہا گیا ۔ " معاشرتی خدمت اور شراب خواری کی اصلاح کو سوراج کی جدوجہد کا جزو قرار دینے کی ہنسی اُڑائی گئی ۔ مدرسوں کی تنظیم کا بھی مضحکہ اُڑایا گیا ۔" مسلمان دوستوں نے سوال کیا " خلافت کا کیا ہوگا " ؟ سیاسی روشن خیال طبقے نے دریافت کیا " سیاسی نتائج کا کیا ہوگا ؟ " سیاسی جدوجہد جاری رکھنے کے لیے جس شورش کی ضرورت ہے وہ اس معاشرتی اصلاح کے کام سے کیسے حاصل ہوگی ۔ ؟ " " پنچائتیں بھی ہدفِ تضحیک بنائی گئیں ، پوچھا جاتا تھا کہ اُن ہزارہا قیدیوں کا جن میں ملک کے ممتاز ترین رہنما بھی شامل ہیں کیا حشر ہوگا ؟ " مسٹر کیلکر نے " مرہٹہ " میں لکھتے ہوئے گاندھی جی پر صاف صاف الزام عائد کیا کہ وہ ایک نہایت نازک جنگ میں عین موقع پر قلابازی کھا گئے ۔

اسی طرح اعتراضات ہوتے چلے گئے ۔ گاندھی جی نے اپنے مخصوص انداز میں اِن حملوں کا جواب دینا شروع کیا ۔ اُنھوں نے لکھا (ینگ انڈیا ۲۳ فروری ۱۹۲۲ء) " چوری چورا نے ایک اور سوال پیدا کر دیا ہے یعنی تزکیۂ نفس کے لیے ایک بردست قسم کا کفارہ ! اِس انفعالی تزکیۂ نفس کے لیے مقید کارکنوں اور ہماری بہت سی سرگرمیوں کی عارضی قربانی کی ضرورت ہے ، جنھوں نے قوم میں ایک تازہ زندگی پیدا کی ہے ۔ لیکن ایسی چیزیں سب لڑائیوں میں واقع ہوتی ہیں اور روحانی جنگ میں جیسا کہ ہم اپنی موجودہ جنگ کو کہتے ہیں ان کا وقوع اور زیادہ عام ہوتا ہے ۔"

"معاشرتی خدمت کے محکمہ" کو حق بجانب قرار دینے کی دُھن میں گاندھی جی نے جنگ کے روحانی مقصد کو اور طول دے کر بیان کرنا شروع کیا۔ "اگر تحریک ترکِ موالات خُبثِ باطن کی حامل نہیں ہے تو یہ شعبہ ایک ضرورت کی حیثیت رکھتا ہے" اُنھوں نے ذیل کے حیرت انگیز جوشِ بیاں میں بلند مذہبی استدلال کو سامان تمسخر بنا کر رکھ دیا:-

"ہندو اور مسلمانوں کی کثیر اکثریت موجودہ جدوجہد کو ایک مذہبی چیز سمجھ کر اس میں شریک ہوئی ہے۔ عوام اس لیے اس میں شامل ہوئے ہیں کہ وہ خلافت اور گائے کا تحفظ چاہتے ہیں۔ مسلمان کو خلافت کی امداد کی امید سے ذرا محروم کر دیجیے اور وہ کانگریس کو خیرباد کہہ دے گا۔ ہندو سے اتنا کہہ دیجیے کہ وہ کانگریس میں شریک ہو کر گائے کو نہیں بچا سکتا تو ایک ایک کر کے سب اسے چھوڑ دیں گے"

اور پھر چند فقروں کے بعد ہی خود لکھتے ہیں "خدا کا شکر ہے کہ خلافت کا معاملہ غازی مصطفےٰ کمال پاشا کے ہاتھ میں محفوظ ہے" کیا یہ کہنا بدترین غلط بیانی نہیں ہے کہ سیاسی پستی اور اقتصادی لوٹ کھسوٹ کو ختم کرنے کے لئے لاکھوں کی تعداد میں جو ہندو اس جدوجہد میں شریک ہوئے ہیں وہ محض گائے کی حفاظت کی خاطر کانگریس میں شامل ہوئے تھے۔؟

گاندھی جی کو قیدیوں کے مسئلے میں بھی اپنے ضمیر کو تسکین دینے میں کوئی دشواری نہ محسوس ہوئی "جب چوری چورا کی اطلاع ملی تو میں نے اُنھیں پہلے کفارہ کے طور پر قربان کر دیا۔ وہ محض اس لیے جیل گئے ہیں کہ عوام کی طاقت اُنھیں رہائی دلائے گی۔ توقع واقعی یہی تھی کہ سوراج پارلیمنٹ کا پہلا کام یہ ہوگا کہ وہ جیل کے دروازوں کو کھول دے۔ قیدیوں کے لیے بس اب تو یہی ہے کہ وہ اپنی قید کی مدت پوری کریں"

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس طرح کے بے جا افکار و خیالات کو سپردِ قلم کرنے سے قیدیوں کو کوئی تسلی نہ پہنچی۔ بہت سے ممتاز ترین اسیر رہنماؤں نے بھی قید خانوں کے اندر سے اپنے خطوط کے ذریعہ انتہائی غم و غصّہ کا اظہار کیا۔ گاندھی جی پر تلوّن مزاجی اور بزدلی کے الزامات عائد کیے گئے۔ اُن لوگوں کا استدلال بالکل واضح تھا۔ یا تو گاندھی جی کو پیش کردہ موقع سے فائدہ اُٹھا کر لارڈ ریڈنگ سے مصالحت کر لینی چاہیے تھی، یا پھر اگر وہ عوام کی قوت سے آگاہ تھے اور اُنھوں نے لڑائی کی ٹھانی تھی تو اُنھیں آخر حد تک برسرِ جنگ رہنا چاہیے تھا۔ دونوں صورتوں میں ممکن تھا کہ قیدی رہا کر دیے جاتے۔ لیکن وہ لوگ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ گفت و شنید کے دوران میں ایسا بلند اور زوردار رویہ اختیار کرنے کے بعد جب کہ گاندھی جی فتح کے بہت قریب پہنچ گئے تھے اُنھوں نے اندھادُھند پسپائی کی راہ کیوں اختیار کی۔ دہلی میں ۲۴ فروری کو آل انڈیا کانگریس کا جو جلسہ منعقد ہوا اُس میں قیدیوں کی پرغضب ملامت نے شورش میں اور اضافہ کر دیا۔ یہ واقعی بہت طوفانی اجلاس تھا۔ گاندھی جی کو ایسی شدید مخالفتوں سے دوچار ہونا پڑا کہ پہلے انھیں ایسا سابقہ نہیں ہوا تھا۔ گاندھی جی نے اِس جلسے کی روئداد کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے (ینگ انڈیا ۲ مارچ ۱۹۲۲ء) لکھا ہے۔ "میں افسردگی، مایوسی اور ناراضگی کا ایک حد تک مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ تھا، مگر مجھے اعتراف ہے کہ میں مخالفتوں کے ایسے طوفان سے مقابلہ کرنے کے لیے بالکل تیار نہ تھا" گو بردولی کی قراردادیں کچھ نرم کر کے منظور کر لی گئیں۔ مگر کمیٹی نے حقیقتاً گاندھی جی پر اخلاقی اظہار نفرین کا ووٹ پاس کر دیا۔

یہ مباحثہ قدرتاً عدم تشدد کے مفہوم و معنی پر مرتکز رہا۔ کیا عدم تشدد کے اصول کو احمد آباد ریزولیوشن کے مطابق کانگریس نے اس حیثیت سے منظور کیا اور اپنے ریزولیوشن میں شامل کیا تھا کہ یہ لفظ "قول، نیت اور عمل" یا بالفاظِ دیگر عوام اور افراد کے خارجی افعال تک محدود تھا یا اس کے متعلق یہ سمجھا گیا تھا کہ ایسے شعور کی آخری جڑوں تک پہنچنا چاہیے اور اسے اُن بے شمار لوگوں کے پاک جذبات اور نرم خیالات پر اثر انداز ہونا چاہیے جو ستیہ آگرہ میں مصروف ہیں؟ سیاسی ذہنیت

رکھنے والے ممبروں کی وسیع اکثریت پہلے خیال کی حامی تھی اور گاندھی جی کا زاویۂ نظر دوسرے خیال کے مطابق تھا۔ اس طرح بحث وتمحیص سے ایک بار پھر وہ نمایاں فرق واضح نظر آتا تھا جو باعمل اور حقیقت پسند ارباب سیاست کی ذہنیت اور گاندھی جی کی نیم مذہبی نیم اخلاقی الٰہیات کے درمیان تھا۔

جلسے کے بعد گاندھی جی نے تحریر فرمایا "میں دیکھتا ہوں کہ ہمارا عدم تشدد سطحی ہے۔ ہم غصے کے مارے بھُنے جا رہے ہیں۔ لہٰذا یہ عدم تشدد ہماری بے چارگی کی وجہ سے معلوم ہوتا ہے (بے شک ایسا ہی ہے) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے سینے میں اس خواہش کی پرورش کر رہے ہیں کہ ہمیں جو بھی پہلا موقع ہاتھ آئے ہم انتقام لے لیں۔ کیا کمزور پر اس زبردستی عائد کیے ہوئے عدم تشدد سے حقیقی رضاکارانہ عدم تشدد پیدا ہو سکتا ہے۔؟

گاندھی جی نے ایک بار پھر دعوے کو بمنزلہ ثبوت تسلیم کر لیا۔ کس کم بخت نے اس حقیقت سے انکار کیا کہ ہندوستان کا عدم تشدد اُس کی کمزوری کے باعث تھا؟ کانگریس کے یکے بعد دیگرے اجلاس میں یہ صاف صاف بتا دیا گیا تھا کہ غیر متشدد پروگرام کا قبول کرنا ارباب سیاست کی ایک بڑی اکثریت کے نزدیک بہ تقاضائے ضمیر نہیں تھا بلکہ خالص مصالح حکمتِ عملی کی بنا پر تھا۔ اس لیے کانگرسیوں نے اپنے کو جس چیز کا پابند کیا تھا وہ بس اہم ترین اشتعال کے مقابلے میں بھی ایک منظم پرامن عمل تھا، مالابار اور چوری چورا کے مستثنیات اس امر کا ثبوت تھے کہ حکومت کے مظالم کی بدمستیوں کے باوجود عالمگیر امن قائم رکھا گیا۔ اس لیے کہ نہ کسی ٹرین کو پٹری سے اُتارا گیا، نہ کسی یوروپین پر بم پھینکا گیا نہ گولی چلائی گئی نہ سرکاری عمارتوں میں آگ لگائی گئی اور نہ ۱۹۱۹ء کے فسادات کا اعادہ ہوا۔ اس لیے کانگرسی ارباب سیاست کو کوئی سبب نظر نہ آتا تھا جس کی بنا پر کوئی شخص چوری چورا میں چند پولیس والوں کے قتل کو اُس پُرامن جنگ کے ملتوی کرنے کے لیے ایک عذر بنائے جسے قوم نے چھیڑ رکھا تھا۔

لیکن جہاں ارباب سیاست صحیح طور پر یہ چاہتے تھے کہ "عدم تشدد کے ذریعے حکومت کو ایسی ضرب پہنچائیں" کہ وہ اپنا رویہ بدلے وہیں گاندھی جی کھُلی ہوئی سیاسی جنگ سے "حقیقی رضامندانہ عدم تشدد" پیدا کرنا چاہتے تھے۔ ایک مرتبہ پھر وہ بھول گئے کہ خواہ مخلوط برطانوی و ہندستانی حکومت ہو یا خالص ہندستانی حکومت بہرحال ہر ایک حکومت کو حسب معمول خلاف قانون عناصر کو فوج اور پولیس کی مدد سے قابو میں رکھنا پڑے گا۔ مگر پھر گاندھی جی اس خیال سے کانپ اُٹھے کہ جب "غیظ وغضب بھڑک اُٹھے گا تو کوئی مرد عورت یا بچہ محفوظ نہیں رہے گا اور ہر آدمی کا ہاتھ اپنے ساتھی پر اُٹھ جائے گا۔"

غرض گاندھی جی نے اس طرح سیاسی مہم کو عدم تشدد کے ناممکن العمل عقیدے کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا اور اپنی دست بُرد پر روحانی لغویات اور عہد وسطےٰ والی الٰہیات کے رنگ کی ایک موٹی تہ چڑھا دی۔

اگر ہم کمیٹی کے قبول کردہ ریزولیوشنوں پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ گاندھی جی کے نظریہ پر بہت سے ارکان کی طرف سے دلیلوں کی بوچھار ہونے کے بعد ایک استثنائیہ فقرے کے علاوہ جس کا تعلق کسی جارحانہ یا مدافعانہ انفرادی سول نافرمانی اختیار کرنے کی آزادی سے تھا (جو نہ کبھی عمل میں آئی اور نہ گمان کیا جاتا تھا کہ عمل میں آئے گی) کمیٹی نے بردولی کے فیصلوں کی تائید ہی کی۔ بدیشی کپڑوں کی دوکانوں اور شراب خانوں کی پکٹنگ بھی باقاعدہ طور پر ختم کر دی جانے کو تھی اور ملک کو تمام سیاسی سرگرمیوں سے یکبارگی پیچھے ہٹ جانے کے ساتھ ساتھ یہ ہدایت کی گئی کہ وہ معاشرتی خدمت اور کھدر بُننے کے پروگرام پر عمل پیرا ہو۔

دہلی کمیٹی کی ترمیم کے بعد بردولی ریزولیوشن کی حسب ذیل دفعات میں معمول سے زیادہ دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔

"مجلس عاملہ کی توجہ اس قسم کی شکایات کی طرف مبذول کرائی گئی ہے کہ کاشتکاروں نے زمینداروں کو لگان ادا کرنا بند کر دیا ہے، مجلس عاملہ کارکنان کانگریس اور کانگریسی اداروں کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ کاشتکاروں کو مطلع کر دیں کہ لگان کو اس طرح

روک لینا کانگریس کے ریزولیوشن کے خلاف ہے۔ نیز یہ کہ ملک کے حقیقی مفاد کے لیے مضرت رساں ہے“۔
”مجلسِ عاملہ زمیں داروں کو یقین دلاتی ہے کہ کانگریس تحریک کسی لحاظ سے بھی اُن کے قانونی حقوق پر حملہ کرنا نہیں چاہتی اگر کاشتکاروں کو شکایتیں بھی ہوں تو کمیٹی کی خواہش ہے کہ اُن کا ازالہ باہمی مشورہ اور حسبِ معمول ثالثی فیصلے کے ذریعے ہونا چاہیے“۔

اس طرح کانگریس کمیٹی نے ایک مرتبہ پھر صوبہ جاتِ متحدہ کے فاقہ کش کسانوں کی لڑائی چھڑنے کے لیے عدم تشدد کی مقدس نقاب اوڑھ لی۔ جیساکہ گاندھی جی نے خود ۱۹۲۱ء کے اوائل میں تشریح کردی تھی کہ کسان تحریک ابتدا میں کانگریس سے آزاد تھی۔ زمیں دار جو ظلم و ستم کے ذریعے زائد مطالبات وصول کیا کرتے تھے اُن کے بوجھ سے کسان دبے ہوئے تھے۔ تو پھر کون سی تعجب کی بات ہے اگر ملک کے عام جنگجویانہ ماحول سے متاثر ہوکر مصیبت زدہ کسانوں نے اپنے ظلم کرنے والوں کے خلاف ایک مستقل جنگ جاری کرنے کی غرض سے اپنی تنظیم کرنے کی ہمت باندھ لی۔ اگر کانگریس کمیٹی ایسے حالات میں دلیری سے کسانوں کے مفاد کی حمایت کرتی اور اُن زمیں داروں سے جو انصاف پر راضی نہیں تھے زبردستی انصاف کراتی تو بہت اچھا ہوتا۔ لیکن اس کے بجائے اس نے بھیڑوں کو قصابوں کے رحم و کرم کے حوالے کردینے کا فیصلہ کیا۔

اس طرح جہاں بہت سے اراکین نے شرمناک سپراندازی پر گاندھی جی کو زجر و توبیخ کی وہیں نہ صرف گاندھی جی کی دردانگیز اپیلوں کے ساتھ اپنے فیصلے سے دست بردار ہوجانے بلکہ کسانوں کی تمام تحریک کے ساتھ اس کی ترقی کے نازک مرحلے میں غداری کرنے کی بھی مجرمانہ ذمہ داری خود کمیٹی کے اوپر ہونی چاہیے۔ الغرض یہ سب کچھ ذلت انگیز سپراندازیوں کا ایک طومار تھا جس میں اس کے بانیوں کے نام ہمیشہ قائم رہنے والی شرم و ذلت میں لپٹے رہیں گے۔

پچاسواں باب

گرفتاری اور مقدمہ

ستیہ آگرہ ترک موالات کی مہم کے ملتوی ہوتے ہی گاندھی جی ایک مرتبہ پھر ایسے آتش فشاں بن گئے جو بجھ سا گیا ہو۔ ایک جانب کمیٹی نے جارحانہ اور مدافعانہ دونوں حیثیت کی عام سول نافرمانی کے خاتمہ کی تصدیق کردی تھی اور دوسری جانب گاندھی جی بطور خود تمام ایسے سوراخوں کو بند کرنے کی فکر میں لگ گئے جنھیں کمیٹی نے سیاسی اقدام اور شورش کے لیے کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ اُنھوں نے ہر قسم کی پکٹنگ بند کردی اور تمام پراونشل کانگریس کمیٹیوں کو ہدایت کی وہ ہر قسم کی انفرادی سول نافرمانی بھی روک دیں۔ وہ کوئی بڑا جلسہ بھی نہیں چاہتے تھے۔ نہ کوئی جلوس نہ ہڑتال نہ کسی قسم کی شورش، کیوں کہ اُنھیں یقین تھا کہ ”موجودہ مرحلے میں کسی قسم کی بھی نافرمانی کیوں نہ ہو وہ پُرامن نہیں رہ سکتی بلکہ مجرمانہ بن جائے گی“۔

گاندھی جی نے ۹ رمارچ ۱۹۲۲ء کو (اپنی گرفتاری اور قید سے ایک دن پہلے) "اگر میں گرفتار ہوگیا" کی سُرخی کے تحت لکھتے ہوئے نہایت مختصر الفاظ میں سویں مرتبہ کانگریس کے نئے پروگرام کی حسبِ ذیل تشریح فرمائی :-

"لوگوں کو سوراج کے چار ستونوں کو یاد رکھنا چاہیے - عدم تشدّد، ہندو مسلم، سکھ، پارسی، عیسائی، یہودی اتحاد، چُھوت چھات کا پورے طور سے دور کرنا اور ہاتھ سے کتے اور بُنے ہوئے کپڑوں کا اس طرح تیار کرنا کہ وہ کامل طور پر بدیشی کپڑوں کی جگہ لے لیں"

یہ پروگرام کتنا ہی فائدہ مند اور بیش قیمت کیوں نہ رہا ہو مگر اسے یقیناً سیاسی نہیں کہا جا سکتا تھا - اور یہ جس قسم کے سوراج کا بھی پیش خیمہ رہا ہو مگر اسے سیاسی سوراج نہیں کہا جا سکتا تھا یعنی برطانوی ملوکیت کی جگہ آزاد ہندوستانی حکومت اس کا مدعا نہیں تھی -

اس طرح ہم لوگ پھر اُسی حیثیت پر پہنچا دیے گئے جو ۱۹۱۹ء کے احمد آباد اور پنجاب کے بلووں سے حاصل ہوئی تھی اِس لیے کہ ۱۹۱۹ء میں عدم تشدّد کے متعلق ہمارا احساس حقیقی تھا - مگر اس کے برخلاف انتہائی شمال میں چوری چورا کا اتفاقی فساد ہمارے اندر اُسی درجے کا خوف وخطر پیدا کرنے میں ناکامیاب رہا - لہٰذا جہاں سارا ملک اُس چیز پر جسے وہ صحیح طور سے گاندھی جی کی سیاسی خودکشی سمجھتا تھا خفا اور برانگیختہ تھا - وہیں اُن کے انتہائی وفادار کارکنوں کے اندر بھی جو احمد آباد اور گجرات میں تھے یہ جذبہ پیدا نہ ہوسکا کہ وہ ہمارے صوبے کے مصیبت زدہ اور کم زور لوگوں کے دلوں کے اندر امن اور عدم تشدّد کے عقیدے کو راسخ کرنے کی نیم مذہبی کفارہ کے مہم میں اُن کی اتباع کریں -

جب میں پنج محل ضلعے کے قحط زدہ بھیل کسانوں کے لیے امداد حاصل کرنے کی غرض سے بمقام بردولی گاندھی جی سے ملا تو مجھ پر اُن کی کایا پلٹ کا حال کھُلا - بلاشبہ میں نے بردولی سے کوئی زیادہ توقع نہیں رکھی تھی - اس نسبتاً خوش حال علاقے کی نام نہاد جنگجویانہ تیاریوں کا میں کبھی قائل نہ ہوا تھا - مجھے معلوم تھا کہ یہ تحریک کسی حال میں بھی زور نہیں پکڑ سکتی - کیوں کہ جس روز گاندھی جی اِس کا عملی آغاز کریں گے اُسی روز وہ پکڑ لیے جائیں گے اور پھر کوئی دوسرا شخص اس بات کا اہل نہ ہوگا کہ اسے اُن کے کھینچے ہوئے خیالی ڈھروں پر چلا سکے - اس لیے میں گاندھی جی کے تعطل سے مایوس نہیں ہوا - میں جب بردولی آشرم میں گاندھی جی سے ملاقات کرنے کے لیے گیا اور جب میں نے اُس نیم مذہبی اخلاقی فضا کی گہرائی کو محسوس کیا جس میں اُنھوں نے اپنے کو ملفوف کر رکھا تھا تو مجھ پر ایک سکتے کی سی کیفیت طاری ہوگئی -

مجھے کبھی کسی اور طریقے سے جو کچھ محسوس ہوتا اُس سے کہیں زیادہ مجھے اُس وقت معلوم ہوا کہ گاندھی جی اپنے دورِ عمل کے انتہائی عروج سے گزر چکے ہیں اور خواہ اُنھیں باشندگانِ ہند کے برائے نام رہنما کی حیثیت سے کتنی ہی ممتاز پوزیشن کیوں نہ حاصل رہے مگر اب وہ عام بیداری کی اُن وسیع طاقتوں کو جن کے پیدا کرنے میں خود اُن کا بہت بڑا ہاتھ تھا کبھی جمع نہ کرسکیں گے اور نہ موثر طریقے سے اُن کی رہبری کرسکیں گے -

اگر حکومت اُنھیں آزاد چھوڑ دیتی تو گاندھی جی اپنی کھوئی ہوئی حیثیت کو میدانِ سیاست میں پھر کیسے قائم کرسکتے تھے؟ کیا وہ سیاسی خیال وعمل کے اُن نئے فرقوں سے تصادم بچا سکتے تھے جو خود اُن کے جمود کے باعث پیدا ہو رہے تھے؟ کیا وہ سوراج پارٹی کے سیلاب کو روکنے کے قابل ہوتے جس نے اُن کی قید کے چھ مہینے کے اندر اندر کونسلوں میں لڑائی کا جھنڈا بلند کر دیا تھا؟ یا کفارے اور خاموشی کے ذرا سے وقفے کے بعد کسی قسم کے جان دار سیاسی اقدام کا مطالبہ کرنے پر اُنھیں مجبور کیا جاتا؟ ۱۰ رمارچ ۱۹۲۲ء کی رات کو سابرمتی آشرم میں اُن کی گرفتاری کے سبب سے یہ اور اس قسم کے اور بہت سے سوالات ٹھنڈے پڑ گئے ان پر ہندوستانی ضابطۂ فوجداری دفعہ ۱۲۴ الف کے تحت ملک میں حکومت کے خلاف بغاوت اور بے اطمینانی پھیلانے

کا جُرم لگایا گیا۔

قدرتاً اُن کی قریب الوقوع گرفتاری کی افواہ پورے فروری کے مہینے میں گشت کرتی رہی۔ اس لیے گاندھی جی نے لوگوں کو پہلے ہی سے تاکید کر دی تھی کہ اُن کی گرفتاری کی صورت میں وہ کوئی زیادتی، فساد بلکہ کسی قسم کا مظاہرہ بھی نہ کریں۔ اُن کی مہم کے التوا نے ایسی تمام تنبیہوں کو بالکل غیر ضروری بنا دیا تھا۔ لوگوں کا مزاج یکایک ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اور نئے عہدِ سعادت کے بارے میں اُن کی ساری توقعات پر پانی پھر گیا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر اُس نیم خوابی کے عالم میں پہنچ رہے تھے جس سے وہ عملی اقدام کے صور کے ذریعے بیدار کیے گئے تھے۔ گو گاندھی جی کی گرفتاری نے ایک بار پھر اُنھیں ایک شکستہ دل رہنما کے نیچے درجے کی کرسی سے اُٹھا کر ایک ہیرو اور شہید کے بلند مرتبے پر پہنچا دیا۔ لیکن سارے ملک میں کوئی خلافِ امن واقعہ رونما نہ ہوا۔

احمد آباد شہر سے تین میل کے فاصلے پر دریائے سابرمتی کے کنارے سرکٹ ہاؤس شاہی باغ میں گاندھی جی کے مقدمے کی سماعت ہوئی۔ تمام عام مظاہرات کو بچانے کے لیے معمول کے خلاف یہ مقام جو سڑک کے کنارے واقع ہے گاندھی جی کے مقدمے کے لیے منتخب کیا گیا۔ پھر بھی عدالت کا چھوٹا سا کمرہ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس عظیم الشان مقدمے کو دیکھنے کی خاطر گاندھی جی کے بہت سے وفادار پیرو دور و نزدیک سے آئے تھے۔ احمد آباد اور بمبئی کے کروڑ پتیوں کی بیویاں اور بیٹیاں بھی معقول تعداد میں جمع ہو گئی تھیں۔ گاندھی جی کی فوج کا ہراول دستہ جو گجرات میں تھا اُس کے بہت سے ارکان جو حکومت کے مظالم سے عملاً محفوظ رہ گئے تھے اپنے محبوب رہنما کا آخری دیدار دیکھنے کے لیے آئے تھے۔

ایک اتنے بڑے رہنما کی موجودگی اور اُن کے دوستوں، پیرووں اور مداحوں کی وجہ سے ماحول میں جو شان پیدا ہو گئی تھی اُس سے سرکاری وکیل ایڈوکیٹ جنرل اسٹرانجم اور جج مسٹر بروس فیلڈ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

مقدمہ کی کارروائی بہت سادہ تھی۔ کیوں کہ گاندھی جی نیز مسٹر بینکر نے جو اخبار ینگ انڈیا کے طابع کی حیثیت سے گاندھی جی کے ساتھ گرفتار کر لیے گئے تھے، بغاوت کے جُرم کا اعتراف کر لیا۔ چنانچہ مقدمے کی دلچسپی کا سارا مرکز بس گاندھی جی کا متوقع بیان اور اُنھیں سُنائی جانے والی سزا تھی۔ گاندھی جی نے اپنے معمول کے مُطابق پیروکار وکیل اور جج کو اُس قابلِ تعریف خوش اخلاقی اور تکلف پر جو اُن لوگوں نے برتا تھا مبارکباد دینے کے بعد وہ بیان پڑھ کر سُنایا جو وہ اپنے ساتھ جیل سے تیار کر کے لائے تھے۔

بیان اس طرح شروع ہوا:" غالباً میرا فرض ہے کہ ہندوستانی نیز انگریزی پبلک کو جس کی تشفی کے لیے یہ کارروائی عمل میں لائی گئی ہے سمجھا دوں کہ میں سچّے قسم کے وفاشعار اور حامیِ موالات و معاونت کے بجائے اب ایک کٹر قسم کا انحراف پسند اور تارکِ موالات بن گیا ہوں۔" اس مقصد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے گاندھی جی نے جنوبی افریقہ اور پھر ہندوستان میں اپنے کارناموں اور پھر حکومت سے تعاون اور وفادارانہ خدمت کے اُن متعدد افعال کا مختصر سا بیان دیا جو وقتاً فوقتاً وہ انجام دیتے چلے آئے تھے۔ زمانۂ حال کے متعلق ذکر کرتے ہوئے اُنھوں نے مختصر الفاظ میں عوام کے افلاس، ناجائز اور تباہ کُن قسم کی طلبِ منفعت، غیر مُلکی حکومت کی خرابیوں رولٹ ایکٹ اور آخر میں پنجاب اور خلافت ایجیٹیشن کا حوالہ دیا۔

اُن کے تحریری بیان کا ایک حصّہ ایسا ہی جیسے کسی اشتراکی کا بیان ہو۔ گاندھی جی نے ہندوستان میں کاتنے اور بُننے کی صنعتوں کی تباہی کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا۔" برطانیہ کی آمد سے پہلے ہندوستان کی لاکھوں جھونپڑیوں میں کاتنے اور بُننے کا کام کیا جاتا تھا، جو اس کے زرعی وسائل کی کمی کو بقدرِ ضرورت پورا کر دیتا تھا۔ پارچہ بافی کی یہ صنعت جو ہندوستان کی زندگی قائم رکھنے کے لیے نہایت ضروری تھی، انگریزوں ہی کے بیان کے بموجب نہایت حیرت انگیز، بے رحمانہ اور انسانیت سوز طریقے سے تباہ کر دی گئی۔ شہر کے رہنے والوں کو کیا خبر کہ ہندوستان کے نیم فاقہ کش عوام کس طرح رفتہ رفتہ بے جان ہوتے جا رہے ہیں۔ اُنھیں یہ کیا معلوم کہ اُن کی ذلیل راحتیں اس دلالی کا پتہ دیتی ہیں جو اُنھیں غیر ملکی لوٹ کھسوٹ کے صلے میں ملی ہے اور یہ کہ یہ فائدے اور یہ دستوری عوام ہی کا خون چوس کر حاصل کی جاتی

ہے۔ وہ اسے کیا جانیں کہ ہندوستان میں جو حکومت بذریعۂ آئین قائم کی گئی ہے وہ عوام سے بیجا فائدہ اُٹھانے کی خاطر چلائی جاتی ہے بہت سے دیہاتوں میں صرف ہڈی اور چمڑا رکھنے والے لوگوں کی ایسی بھی مثال کھُلی آنکھوں سے نظر آتی ہے جس کی صحیح تشریح نہ سوفسطائی استدلال سے کی جاسکتی ہے نہ الفاظ کی شعبدہ گری سے نہ اعداد و شمار کے اقتباسات سے۔ مجھے اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر واقعی خدا موجود ہے تو انگلستان اور ہندوستان دونوں جگہوں کے شہری باشندوں کو انسانیت کے خلاف اس جرم کا جواب دہ ہونا پڑے گا جس کی تاریخ میں کوئی اور مثال نہیں مل سکتی۔"

مگر یہ خیالی تصویر گاندھی جی کی مقدس تعلیمات اور سیاسی پروپیگنڈے کے وسیع اور بنجر ریگستان میں چند اُن واقعاتی تنقیدوں کی مثالوں میں ایک ہی جو کہیں کہیں بکھری نظر آتی ہیں اور اُن کی سیاسی جد وجہد کسی حد تک بھی پہلے یا بعد کو بمشکل اس سے رنگین یا متاثر ہوئی۔ روئداد ختم ہوگئی اور جج کو اپنا فیصلہ سُنانا تھا۔ گاندھی جی پر جس جُرم میں مقدمہ چلایا گیا اُس کا مرتکب و مجرم ٹھہرانے میں جج کو کوئی دقت نہیں تھی۔ اُس نے چھ سال کی سزا سُناتے ہوئے لوکمانیہ بال گنگا دھر تلک آنجہانی کی سزا کا حوالہ دیا جو اُن کو اسی طرح کے ایک مقدمے میں دی گئی تھی۔ آخر میں گاندھی جی کو مختصر سا جواب دینے کی جو اجازت دی گئی تھی اُس کے دوران میں اُنھوں نے اس موازنہ کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا "چونکہ آپ نے لوکمانیہ بال گنگا دھر تلک کے مقدمے کی یاد تازہ کر کے میری عزت افزائی فرمائی ہے اس لیے میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ میں اسے انتہائی قابلِ فخر عنایت اور اعزاز سمجھتا ہوں کہ اُن کے نام کے ساتھ میرا نام لیا جائے۔" عدالت میں جو مرد اور عورتیں جمع تھیں اُن میں سے ہر ایک کو الوداع کہنے کی گاندھی جی کو اجازت دی گئی اور اُس کے بعد بہت سے مرد و عورت جو اس زبردست لیڈر کی اتنی لمبی سزا سے بے حد متاثر ہوئے تھے زار و قطار رو رہے تھے کہ اتنے میں اُنھیں سابرمتی جیل پہنچا دیا گیا۔

کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ حکومتِ برطانیہ نے جو پورے سال بھر بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ عرصے تک بغاوت اور ترکِ موالات کے متعلق اُن کے پُرزور پروپیگنڈے دیکھتی اور برداشت کرتی رہی آخر اس منزل پر پہنچ کر جبکہ سیاسی جد وجہد سے وہ قطعاً دست بردار ہو چکے تھے یکایک اُنھیں گرفتار کر لینا کیوں ضروری سمجھا۔ اس کی بہت سی تشریحیں کی جا سکتی ہیں۔ مگر میں اپنے کو اس بات کا یقین کرنے پر مجبور پاتا ہوں کہ برطانوی حکومت کو گاندھی جی کے اس حقیقی شغف کا علم تھا جو اُنھیں برطانوی تعلقات کے ساتھ تھا اس لیے ایسے موقع پر جبکہ وہ اپنی ذلت آمیز سپراندازی کے باعث اپنے اہلِ وطن کے دلوں میں اس بلند مقام سے محروم ہو چکے تھے جو انھیں پہلے حاصل تھا، حکومت نے چاہا کہ اُنھیں پھر اسی اعلیٰ مقام پر فائز کر دیا جائے۔

اِکیانوَواں باب

گاندھیت کا رَدِّعمل

منظرِ سیاست سے گاندھی جی کا ہٹنا تھا کہ ملک کے طول و عرض میں اُن کے اکثر اصول اور پروگرام کے خلاف ایک ذہنی بغاوت شروع ہوگئی۔ مہاراشٹر پارٹی اور بنگال پارٹی کے لوگوں میں جنہوں نے سنہ ۲۰ء کے کلکتہ والے اجلاس میں ترکِ موالات کے پروگرام کی بڑی شد و مد سے مخالفت کی تھی، بے اطمینانی کی آگ سلگ ہی رہی تھی۔ بھانہ کے مقام پر مہاراشٹر صوبائی کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے مسٹر جیکار نے گاندھی جی کے اِس کٹر مسلک (ترکِ موالات) کے خلاف پہلی صدائے احتجاج بلند کی، احمد آباد کانگریس کے موقعہ پر اس آواز میں اور تیزی پیدا ہو گئی۔ مہاراشٹر پارٹی نے جو اب ملک کے تمام غیر مطمئن عناصر کی حمایت پاکر مزید طاقت حاصل کر چکی تھی یہاں تک کیا کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس منعقدہ ۲۴ر فروری سنہ ۲۲ء میں گاندھی جی کے خلاف مذمت کے ووٹ کی تحریک کر دی اور ان لوگوں نے مل کر ایسی چالوں کا ایک مکمل نقشہ تیار کیا جس سے گاندھی جی کے یراودا جیل پہونچتے ہی اُن کے مسلک کو بساطِ سیاست سے خارج کر دیا جائے۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں جو ۶ر و ۸ر جون کو لکھنؤ میں منعقد ہوا اس مقصد کے لئے پہلا اقدام عمل میں آیا: کمیٹی میں گذشتہ اجلاس کے پیش کئے ہوئے لائحہ عمل کی رفتار پر اظہارِ طمانیت کیا گیا اور اس عام احساس کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ چونکہ حکومت نے اپنی استبدادی پالیسی کو انتہائی ناروا طریقوں سے جاری رکھا ہے لہٰذا ملک کو کسی نہ کسی نوعیت کی سول نافرمانی شروع کرنیکا مشورہ دینا چاہیے حسب ذیل قرارداد منظور کی گئی:-

"اِس مسئلہ پر کہ آیا کسی نوع کی سول نافرمانی شروع کی جائے یا اُس سے مشابہ کوئی دوسرا طریق کار اختیار کیا جائے کمیٹی کے دوسرے اجلاس میں جو ۱۵ر اگست کو کلکتہ میں ہونے والا ہے مزید غور و خوض کیا جائے۔

"اسی اثنا میں جناب صدر سے درخواست کی جائے کہ وہ چند افراد کو نامزد کرکے اُنھیں اختیار دیں کہ وہ ملک کا دورہ کرکے صورتِ حال کا جائزہ لیں اور آیندہ اجلاس میں اپنی رپورٹ پیش کریں"

اِس قرارداد کے مطابق حکیم اجمل خاں صاحب قائم مقام صدر کانگریس نے ورکنگ کمیٹی کے اُن اراکین سے جو ۹ر جون کے اجلاس میں موجود تھے مشورہ کرکے ایک کمیٹی بنائی جو اُن کے علاوہ حسب ذیل حضرات پر مشتمل تھی:-

پنڈت موتی لال نہرو، مسٹر سی راجگوپال اچاریہ۔ ڈاکٹر ایم، اے انصاری۔ مسٹر وی، جی پٹیل۔ سیٹھ جمنا لال بجاج (جن کی جگہ بعد میں مسٹر کستوری رنگا آئنگر شامل کر لئے گئے تھے) اور سیٹھ چھوٹانی۔

اس کمیٹی نے سارے ملک کا دورہ کیا، مختلف صوبوں کے اکثر ممتاز کانگریسی کارکنوں کی تحریری و زبانی شہادتیں حاصل کیں اور بالآخر ۳۰ر اکتوبر سنہ ۲۲ء کو رپورٹ مکمل کرکے اس پر اپنے دستخط کر دئے۔

کمیٹی باتفاق رائے اس نتیجہ پر پہنچی کہ "ملک اس کے لئے تیار نہیں ہے کہ سول نافرمانی کی کوئی عام اور ہمہ گیر تحریک شروع کی جا سکے۔ لیکن اِس نے یہ سفارش کی کہ "صوبائی کانگریس کمیٹیوں کو اختیار دیا جائے کہ وہ چند شرائط کے ماتحت ایک محدود قسم کی

سول نافرمانی کی منظوری دے سکتی ہیں"۔

کمیٹی نے کونسل میں داخلہ کے پیچیدہ موضوع پر اپنی سفارشات شایع کرکے بحث و مباحثہ کا اچھا خاصہ طوفان کھڑا کرلیا اس مسئلہ پر کمیٹی کے اراکین میں خود اختلاف تھا اور دونوں طرف پلہ برابر پڑتا تھا۔ حکیم اجمل خاں صاحب، پنڈت موتی لال نہرو اور سٹر وی۔ جی پٹیل اُس کٹر رویّہ کے خلاف تھے جو کونسلوں کے بارے میں اختیار کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے حسب ذیل سفارشات پیش کیں:۔

"کانگریس اور خلافت کمیٹیاں گیا کے اجلاس میں (جو دسمبر سنہ ۲۲ء کے آخری ہفتہ میں ہونے والا تھا) اس کا اعلان کریں کہ اس امر کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ لیجسلیٹو کونسل کی پچھلی دور کی کارگذاریوں نے خلافت کے معاملے میں یا پنجاب میں جو مظالم ہوئے تھے ان کی تلافی اور جلد سوراج حاصل کرنے کی راہ میں شدید رکاوٹیں پیدا کردی ہیں نیز یہ کہ عوام کو بہت سے آلام و مصائب کا شکار بنادیا ہے، مناسب سمجھا جاتا ہے کہ ان دقتوں کا اعادہ روکنے کے لئے عدم تعاون اور عدم تشدد کے اصولوں پر سختی سے کاربند رہتے ہوئے حسب ذیل اقدامات عمل میں لائے جائیں۔

(۱) حامیانِ ترکِ موالات قضیۂ خلافت اور پنجاب کے مظالم کی تلافی اور سوراج کے فوری حصول کو اپنا مقصد بنا کر الکشن میں مقابلہ کریں اور اکثریت کی صورت میں کونسلوں میں داخل ہونے کے لئے پوری جد و جہد کریں۔

(۲) اگر حامیانِ ترکِ موالات اتنی کثیر تعداد میں منتخب ہوجائیں کہ بغیر اُن کے کورم نہ بن سکے تو وہ اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھنے کے بعد سب کے سب کونسل چیمبر سے ایک جماعت کی صورت میں باہر نکل آئیں اور پھر اس پورے دور میں کونسل کی کسی کارروائی میں کوئی حصہ نہ لیں۔

(۳) اگر حامیانِ ترکِ موالات ایسی اکثریت میں منتخب ہوں کہ اُن کے بغیر بھی کورم بن جاتا ہے تو وہ حکومت کی ہر کارروائی کی حتیٰ کہ بجٹ کی بھی مخالفت کریں اور صرف متذکرہ بالا مظالم کی تلافی اور سوراج کے فوری حصول کی تجویزیں پیش کرتے رہیں۔

(۴) نئی کونسلوں کا اجتماع جنوری سنہ ۲۴ء سے پہلے شروع ہونے والا نہیں ہے لہٰذا ہماری مزید تجویزیں یہ ہیں کہ سنہ ۲۳ء کا سالانہ اجلاس دسمبر کے آخری ہفتہ کے بجائے پہلے ہفتہ میں منعقد کیا جائے اور قطعی ہدایات جاری کرنے سے پہلے انتخابات کے پیش نظر اس مسئلہ پر پھر نظر ڈالی جائے"۔

اس کمیٹی کے دیگر تین ممبروں (ڈاکٹر انصاری۔ مسٹر راجگوپال اچاریہ اور کستوری رنگا آئنگر) کی سفارش یہ تھی کہ "کانگریس کے پروگرام میں کونسلوں کے مقاطعہ کے ہوتے ہوئے بھی کوئی تبدیلی نہ کی جائے"۔

اس طرح دونوں جانب پلہ برابر ہی معلوم ہوتا تھا۔ اتنے میں دیش بندھو۔ سی۔ آر داس جیل سے رہا ہوکر آگئے اور ایک تاریخی بیان کے سلسلے میں اُنھوں نے کونسلوں میں داخلہ کی نہایت مؤثر اور پرزور طریقہ پر حسب ذیل الفاظ میں تائید کی ہے۔

"اب تک ہم لوگ باہر سے کونسلوں کا مقاطعہ کرتے رہے ہیں۔ ہم نے اِس سلسلے میں بہت کچھ کامیابی بھی حاصل کی چنانچہ کونسلوں کا وقار گر گیا ہے تاہم ہماری اس کامیابی کے باوجود کونسلیں اب بھی باقی ہیں۔ اب کانگریس کا فرض ہے کہ کونسلوں کے اندر پہونچ کر اس سے زیادہ مؤثر طریقہ پر مقاطعہ کرے جتنا باہر سے کر رہی تھی۔

اصلاحی کونسلیں دراصل ایک نقاب ہے جو دفتری حکومت نے اپنے چہرہ پر ڈال رکھا ہے میں سمجھتا ہوں کہ ہم لوگوں کا یہ فرض یہ ہے کہ اس نقاب کو چاک کرکے رکھ دیں۔ اِن کونسلوں کا ختم کردینا ہی اِن کا صحیح مقاطعہ ہے۔

بہرحال ہم کو حکیم اجمل خاں صاحب۔ پنڈت موتی لال نہرو اور مسٹر پٹیل کی سفارشات کو مانتے ہوئے آخری فیصلہ سنہ ۲۳ء کی کانگریس تک ملتوی رکھنا چاہئے۔ لیکن اِن الکشنوں میں کھڑے ضرور ہونا چاہئے"۔

ایک طرف گاندھی اسکول والے پکّے ترک موالاتی تھے اور دوسری جانب ملک کے ممتاز ترین رہنماؤں کی قیادت میں وہ جماعت تھی جو کونسل میں داخلہ کی حامی تھی۔ دونوں میں اس نزاعی مسئلہ پر بڑی معرکہ آرا بحث وتمحیص کا بازار گرم ہی تھا کہ مذکورہ بالا کمیٹی کی رپورٹ پر غور کرنے کے لئے ۲۰ رنومبر ۱۹۲۲ء کو کلکتہ میں دیش بندھو، سی، آر، داس کی صدارت میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہوا اس مسئلے پر مسلسل کئی دن تک بحث ہوتی رہی اور فریقین نے نہایت آزادی و بے باکی سے ایک دوسرے پر خوب خوب حملے کئے آخر کار کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ اس مسئلہ کو گیا سشن تک کے لئے ملتوی کر دیا جائے۔

بابو راجندر پرشاد اپنے ینگ انڈیا جلد دوم، کے دیباچہ میں لکھتے ہیں "دسمبر کے مہینے میں کانگریس کا اجلاس گیا میں منعقد ہوا ظاہر ہے کہ جو مسئلہ خاص طور پر توجہ کا مرکز ہو سکتا تھا یہی کونسل میں داخلہ کا تھا۔ چونکہ اس نزاعی مسئلہ سے لوگوں میں کافی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ لہٰذا کانگریس میں کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی اور پانچ دن تک اجلاس ہوتا رہا۔ نتیجہ کے طور پر صرف اتنا بتا دینا کافی ہے کہ کمیٹی نے ایک زبردست اکثریت کی رائے سے کونسل میں داخلہ کی تجویز مسترد کر دی اور کونسلوں کے مقاطعہ کا مسلک برقرار رکھا اس سلسلہ میں یہ ایک خاص چیز ہے کہ ملک کے سب سے زیادہ بااثر اور معتمد رہنماؤں مثلاً دیش بندھو سی آر داس، پنڈت موتی لال نہرو، حکیم اجمل خاں نے اپنی پوری قوت سے کوشش کی کہ مروجہ لائحہ عمل میں تبدیلی کی جائے اور کونسلوں میں داخلہ کی ممانعت ختم کر دی جائے لیکن کانگریس نے ایک ایسے رہنما (مسٹر راج گوپال اچاریہ) کی بات مان لی جو نسبتاً نوخیز اور غیر معروف تھے اور اپنے مسلک سے ذرہ برابر ہٹنے کو تیار نہ ہوئے بہرحال اسے بھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ اس موقعہ پر جس چیز نے اتنے مقتدر رہنماؤں کے خلاف یک بارگی پانسہ پلٹ دیا وہ محض مسٹر راج گوپال اچاریہ کے استدلال کی مضبوطی ہی نہ تھی بلکہ گاندھی جی کی موافقت میں ایک شدید جذباتی کشش بھی کار فرما تھی جو اُن کے کٹر پیرؤوں کے لئے بے حد کارآمد ثابت ہوئی۔ گویا گاندھی جی جیل میں رہ کر اُس سے زیادہ قوی الاثر ثابت ہوئے جتنا کہ باہر رہ کر ہو سکتے تھے تاہم یہ جذبہ بھی اپنی اثر و قوت کے باوجود اُس کٹر جماعت کی کامیابی کا ضامن نہ ہو سکتا تھا۔ اس جماعت کے لوگ بھی صاف طور پر محسوس کر رہے تھے کہ کونسل پارٹی کے مؤثر مقابلہ کی یہی ایک صورت ہے کہ سول نافرمانی کی مہم شروع کرنے کا پھر اعلان کیا جائے۔ لہٰذا مسٹر راج گوپال اچاریہ کی تحریک پر ایک قرارداد منظور ہوئی کہ جلد سے جلد ملک کو سول نافرمانی کی مہم کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ صوبائی کانگریس کمیٹیوں کو تاکید کی گئی کہ ۳۰ راپریل تک رضاکاروں کی ایک معتدبہ فوج بھرتی کی جائے۔ میں بھی گیا کے اجلاس میں موجود تھا چونکہ میں نے اُس کٹر جماعت کے ایک منتظم خصوصی کی حیثیت سے کام کیا تھا لہٰذا میری نظر میں اس تجویز کی بڑی اہمیت تھی۔ میں نے تقریباً سال بھر سے کوئی سیاسی کام نہ کیا تھا اب شاید اُسی دن جس دن سول نافرمانی کمیٹی نے اپنی رپورٹ شائع کی مجھے ولبھ بھائی پٹیل نے اس بات کی دعوت دی کہ "اولڈ گارڈ" کی صف میں شامل ہو کر گاندھی پارٹی کو فنا ہونے سے بچانے کی جدوجہد کروں۔ میرے دل میں گاندھی جی کے لئے جو کچھ عزت اور محبت تھی وہ سب پوری قوت سے عود کر آئی جنوری ۱۹۲۳ء میں گجرات کی صوبائی کمیٹی نے مجھے ایک ذیلی کمیٹی کا معتمد خاص مقرر کر کے اس پر مامور کیا کہ گجرات کے اضلاع سے ایک ہزار رضاکاروں کی بھرتی کے لئے پوری قوت اور جوش و خروش سے کام کروں۔

ایک مرتبہ مجھ پر سیاست کا پھر وہی نشہ طاری ہو گیا۔ اور چھ ہفتے کے مسلسل دورے میں میرا لب و لہجہ برابر جارحانہ انداز اختیار کرتا گیا۔ میرے ساتھیوں نے مجھے متنبہ بھی کیا کہ تم جیل کا سامان کر رہے ہو مگر میں نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی بہرحال اُن کی تنبیہیں صحیح ثابت ہوئیں۔ سی، آئی، ڈی نے جس سے کہیں مفر نہیں، ہماری تمام تقریریں حکام تک پہنچائیں اور حکام نے ضروری سمجھا کہ میرے خلاف فوری کارروائی عمل میں لائی جائے چنانچہ دفعہ ۱۰۸ ضابطہ فوجداری کے ماتحت مجھے ایک نوٹس دیا گیا اور آئندہ ایک سال تک کے لئے نیک چلنی کی ضمانت طلب کی گئی۔ ۶ راپریل ۱۹۲۳ء کو مقدمہ کی سماعت ہوئی مطلوبہ ضمانت فراہم نہ کرنے اور پہلے سے زیادہ کھلے ہوئے الفاظ میں بغاوت و منافرت کی تبلیغ کرنے پر مجھے ایک سال کی سزائے محض کا حکم سنایا گیا اور میرا نام

اے کلاس میں رکھا گیا جو حال ہی میں وجود میں آیا تھا' اس سزا میں مجھے پہلے سابرمتی جیل پہنچایا گیا اور آخر میں یراودہ جیل جہاں میں نے "دنیا کے سب سے بڑے آدمی" کے ساتھ رہنے کی نادر سعادت حاصل کی!

باونواں باب

گاندھی جی کے ساتھ یراودہ جیل میں

سابرمتی جیل میں میرے چند ابتدائی دن کچھ زیادہ خوشگوار نہیں گزرے اگرچہ مجسٹریٹ نے مجھے اسپیشل ڈویژن میں رکھے جانے کا حکم دیا تھا لیکن مجھے ابھی چند حیرت انگیز سختیوں سے دوچار ہونا مقدر تھا جیل کے حکام نے کہا کہ جب تک حکومت کی طرف سے مجسٹریٹ کے حکم کی توثیق نہ ہو جائے میرے ساتھ سزائے محض کے معمولی قیدی ہی کا سا برتاؤ کیا جائے گا لہٰذا مجھے جیل کے معمولی کھانے ملنے لگے' دوپہر کا کھانا جس میں ہندستانی قسم کی روٹی (اگرچہ وہ بہت موٹی ہوتی تھی اور اس میں کنکر بھی کافی مقدار میں ہوتی تھی) اور دال میرے لیے کچھ ایسی ناموافق چیز نہ تھی۔ البتہ شام کا کھانا جس میں اسی قسم کی روٹی اور ترکاری کا شوربا ہوتا تھا میرے لیے انتہائی تکلیف دہ ہوتا تھا یہ اس قسم کی چیز ہوتی ہے کہ عادی مجرموں کو بھی حلق سے اتارنا محال ہو جاتا ہے' اس کے علاوہ جب مجھے پہلے ہی دن اس گرمی کے موسم میں چھ بجے کوٹھری میں بند کر دیا گیا تو میرا دل ڈوبنے لگا۔ مزید یہ کہ میں اس پورے یوروپین احاطے میں بالکل تنہا تھا سوائے اس کے کہ جیل کے چند وارڈر اور ملازم کبھی کبھی آتے رہتے تھے۔ ان تکلیف دہ حالات میں پڑ کر میں نے جلد ہی یہ عادت ڈال لی کہ اپنے ضمیر کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا تھا یا فکر و مطالعہ اور دعا و مناجات میں وقت گزار دیتا تھا۔

لیکن زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ یہ تمام معاملات درست ہو گئے' دو ہی دن کے بعد جیل کے سپرنٹنڈنٹ کی مہربانی سے مجھے پاؤ روٹی اور دودھ ملنے لگا' مشکل سے سات دن گذرے تھے کہ مجھے اپنے دوست دیال جی دسائی کی رفاقت بھی حاصل ہو گئی' حکومت نے جلد ہی قطعی احکام بھی نافذ کر دیے کہ ہمارے ساتھ اسپیشل ڈویژن کے قیدیوں کا برتاؤ کیا جائے' اس طرح ہمارے لیے احمد آباد سے کھانے پینے کا سامان بہ افراط آنے لگا' سابرمتی جیل کی مسلسل تنہائی میں میں نے چند نہایت زریں لمحات مسٹر دیال جی کی صحبت میں بسر کیے کبھی ہم دونوں اپنا سادہ کھانا پکانے کھانے کا لطف اٹھاتے تھے اور کبھی مختلف مسائل پر تبادلہ خیالات کیا کرتے تھے۔

میں اپنے اس نئے مسکن و ماحول کا عادی ہو چلا تھا بلکہ اسے ایک حد تک پسند کرنے لگا تھا کہ یکبارگی ۱۴ مئی ۲۳ء کی شام کو مجھے اپنے مختصر سے سامان کے ساتھ سفر کی تیاری کا حکم دیا گیا۔ جیل سے باہر نکلتے ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ میرا تبادلہ یراودہ جیل کے اسی احاطے میں کیا جا رہا ہے جہاں گاندھی جی کو رکھا گیا ہے' دوسرے دن دوپہر کے وقت جب اس ویران احاطہ کے طول و عرض پر آفتاب اپنی بصارت ربا تمازت کے ساتھ چمک رہا تھا مجھے مہاتما گاندھی کے پاس لایا گیا۔

میں نے نہایت ادب و احترام کے ساتھ جھک کر اپنے رہبر اعظم کو سلام کیا انھوں نے خوش ہو کر مسکراتے ہوئے مجھے دیکھا اور میری صحت اور سابرمتی جیل کے متعلق سوال کرنے لگے اس کے بعد انھوں نے ایک تیسرے ساتھی سے میرا تعارف کرایا جن کا نام مسٹر منظر علی تھا یہ ایک مسلمان وطن دوست تھے جنھیں رنگون جیل سے یراودہ جیل میں منتقل کر دیا گیا تھا۔

جب میں اس نئے ماحول میں رہنے سہنے لگا تو میں نے اس نمایاں فرق کو محسوس کیا جو سابرمتی جیل کے یوروپین احاطے اور یہاں کے ذلیل مثلث نما احاطے میں نظر آرہا تھا اس کی تنگیں کوٹھریوں میں جس کے فرش پر گوبر لیپا ہوا تھا ہم لوگ مویشیوں کی طرح رکھے گئے تھے سیاہ پتھر کی اونچی اونچی دیواروں کے کونے میں یہ کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں اور یہ سیاہ دیواریں ہر وقت ہماری آنکھوں میں کھٹکتی رہتی تھیں۔ اس مثلث کے تیسرے طرف خاردار تاروں کا جنگلا بنا ہوا تھا اور اگرچہ اس کے اندر سے ہمارے قدم باہر نہیں جا سکتے تھے تاہم ہماری نظریں اس سے گذر کر اس وسیع اندرونی احاطے کو دیکھ سکتی تھیں جس کے ایک طرف یوروپین احاطہ تھا دوسری طرف قید تنہائی والی کوٹھریاں تھیں اور تیسری طرف وہ کشادہ سڑک تھی جو جیل کے پھاٹک سے جیل کے احاطوں کی طرف جاتی تھی اس نئے ماحول میں بڑی وحشت ہوتی تھی اور اتنی مختصر سی جگہ میں اکٹھا رہنے کے سبب ہم لوگ خود ایک دوسرے کے لیے تکلیف کا باعث ہو رہے تھے اس چیز نے گاندھی جی کی رفاقت کی خوشی کو بھی بہت کچھ پامال کر رکھا تھا۔ گاندھی جی کی عادت تھی کہ وہ لکڑی کی کھڑاویں پہن کر احاطے میں ٹہلتے تھے سنگین فرش پر چلنے سے ایک کرخت قسم کا شور پیدا ہوتا تھا جس سے میری دماغی کوفت اور بڑھ جاتی تھی۔ مجھے اور بھی زیادہ حیرت ہوئی جب ان تمام چیزوں کے باوجود گاندھی جی نے فرمایا کہ یہ احاطہ جس میں کہ وہ سال بھر سے رہنے کے عادی ہو چکے تھے "کافی آرام دہ ہے۔ اور میری ضرورت کی تمام چیزیں نیز دماغی غذا اور روحانی تربیت کے جملہ سامان موجود ہیں" انھیں اپنا معمولی کھانا بھی یعنی بکری کا دودھ اور پھل وغیرہ ملتے تھے اور چرخہ بھی ساتھ تھا۔ مختلف موضوع پر کتابوں کا بھی ایک اچھا خاصہ ذخیرہ تھا ایک لوہے کا پلنگ معہ اچھے خاصے بسترے کے استراحت کے لیے مہیا تھا۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ مختصر سا احاطہ سارا کا سارا ان کے استعمال کے لیے حاضر تھا انھیں بعض سیاسی قیدیوں کو دیکھنے اور کبھی کبھی ان سے تھوڑی بہت گفتگو کرنے کے مواقع بھی حاصل تھے جو جیل کے کانٹے دار جنگلے کے سامنے والے کشادہ میدان سے ہو کر ایک احاطے سے دوسرے احاطہ میں آیا جایا کرتے تھے۔

بہرحال اس معاملے میں گاندھی جی کے احساسات سے واقف ہونے کا موقعہ مجھے اس وقت ملا جب انھوں نے مجھے پہلے پہل اس جیل میں اپنی ابتدائی تنہائیوں کے قصے سنائے۔ جس شام کو وہ جیل میں پہنچے تھے انہیں صرف چرخہ ہی نہیں بلکہ بکری کے دودھ اور پھل سے بھی جس کے علاوہ وہ اور کچھ نہ کھا سکتے تھے اور جسے وہ اپنے ساتھ لائے تھے محروم کر دیا گیا تھا اس کے علاوہ انھیں بالکل عام قیدیوں کی طرح یہ ذلت بھی برداشت کرنی پڑی کہ پانچ ہی بجے شام سے انھیں کوٹھری کے اندر بند کر دیا جاتا تھا۔ بستر میں انھیں صرف دو کمبل ملے تھے جن پر وہ اپنی سفید چادر ڈال لیتے تھے۔ کتابوں سے تکیہ کا کام لیتے تھے اور یراودہ جیل پہنچنے کے دوسرے ہی دن جب صبح کے وقت مسٹر بینکر کو ان کے پاس سے جدا کر لیا گیا تو انھیں ایسی ہی تکلیف ہوئی جیسے کسی ماں کو اپنے اکلوتے بچہ سے بچھڑ جانے سے ہوتی ہے۔

ان میں سے بعض چیزیں جلد ہی دُرست ہونے لگیں جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے جلد محسوس کر لیا کہ اگر گاندھی جی کو روزانہ چرخہ چلانے کو نہ ملا تو ان کے لیے فاقہ کے برابر ہوگا نیز یہ کہ بکری کے دودھ اور پھل کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتے۔ لہٰذا اُن کا کھانا اور چرخہ انھیں صبح ہی دے دئے گئے۔ اس کے بعد جیل کے حکام نے انتظام کر دیا کہ روزانہ صبح کو جیل کے احاطے ہی میں کچھ بکریاں لا کر دوہ دی جایا کریں تاکہ انہیں کافی مقدار میں دودھ مل جایا کرے۔ بستر بھی حسب ضرورت جلد ہی مل گیا۔ شام کو کمرہ بند کر دیے جانے والا مسئلہ البتہ ذرا دیر میں حل ہوا بہرحال سات دن کے بعد یہ انتظام بھی ہو گیا کہ ان کی کوٹھری دن کی طرح رات کو بھی کھلی رہنے لگی، وہ جیل کے پرسکون فضا میں شام کو چہل قدمی بھی کر لیتے تھے رات کو اور صبح تڑکے چاند تاروں سے مزین آسمان کے نیچے اپنی پوجا پاٹ بھی کر لیتے تھے۔ غرض کہ چند ہی دنوں میں

ساری دقتیں دور ہوگئیں۔

تھوڑے ہی دنوں میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ پچھلے سال گاندھی جی نے چند اور باتیں بھی افسران جیل اور حکومت سے لڑ کر طے کرائی تھیں معمولی سزا یافتہ ہونے کی بنا پر انھیں تین مہینے کے اندر ایک ملاقات اور ایک خط بھیجنے ایک خط منگانے کا حق تھا۔ ان کا پہلا ہی طویل خط جو انھوں نے ۱۴ اپریل ۱۹۲۲ء کو حکیم اجمل خاں صاحب کے نام لکھا تھا اس بنا پر حکومت کی طرف سے واپس کر دیا گیا کہ اس میں سیاسی معاملات اور جیل کے حالات پر تبصرہ کیا گیا تھا، اس پر گاندھی جی نے خط لکھنے یا منگانے کے استحقاق سے بالکل دست برداری دے دی اور اس کے بجائے ایک اور ملاقات کی اجازت لے لی اس طرح اب تین مہینہ میں ایک ملاقات کے بجائے وہ دو ملاقاتوں کے مستحق ہوگئے۔

اس میں بھی شروع شروع میں کچھ دقتیں ہوئیں، ان کے سب سے چھوٹے بیٹے دیوداس گاندھی نے ایک مرتبہ جب یہ دیکھا کہ جیل کا سپرنٹنڈنٹ آرام سے کرسی پر بیٹھا ہے اور اس کے سامنے گاندھی جی کو کھڑا رکھا گیا ہے تو ان سے ضبط نہ ہوسکا اور وہ بری طرح رو پڑے۔ گاندھی جی اور حکام کے درمیان اس بات پر بھی نزاع رہی کہ وہ اپنے اعزا اور احباب سے سیاسی معاملے پر یا اُن معاملات پر جن کا عوام سے تعلق ہے کیوں گفتگو کرتے ہیں، اس اعتراض پر گاندھی جی نے دھمکی دی کہ میں ملاقاتوں کا سلسلہ یک لخت منقطع کر دوں گا اس پر گورنمنٹ دب گئی اور انھیں ان وقتی ملاقاتوں کے موقعہ پر ہر قسم کے گفتگو کی پوری آزادی دے دی گئی جس دن میں ان کے احاطے میں داخل ہوا ہوں اسی کی شام کو گاندھی جی نے اپنا روزانہ کا معمول بیان کیا اور کہا کہ اگر پسند کرو تو تم بھی اس میں شریک ہو جاؤ گاندھی جی روزانہ چار بجے تڑکے اٹھتے تھے اور دس پندرہ منٹ میں ہاتھ منھ دھو کر پوجا پاٹ پر بیٹھ جاتے تھے اور سنسکرت میں بھگوت گیتا کے کچھ اشلوک (متبرک گیت) پڑھتے تھے اور اس کے بعد کچھ ہندی اور گجراتی کے بھجن گاتے تھے اس کے بعد تقریباً دو گھنٹہ تک سنسکرت کی فلسفیانہ کتاب اپنشد وغیرہ اور ایک گھنٹہ تک گیتا کے اشاریہ کا مطالعہ کرتے، اتنے میں سات بج جاتے تھے اور دودھ والا آکر ان کے تاملوٹ میں بکری کا ڈیڑھ سیر گرم گرم دودھ ڈال دیتا تھا اس میں وہ نارنگی اور میٹھے لیموں کا عرق ملا کر پی لیتے تھے۔ اس کے بعد ہی جیل کا سب انسپکٹر ان کی خیریت دریافت کرنے آجاتا اور ان کے آرام و تکلیف بلکہ اپنے نجی و خانگی معاملات پر گفتگو کرتا تھا جیسے کوئی اپنے دوست سے یا بیٹا اپنے باپ سے گفتگو کرتا ہے، اس کے بعد مسلسل تین گھنٹے تک گاندھی جی چرخہ کاتتے تھے گیارہ بجے غسل کرتے تھے اور پھر متفرق چیزوں کے مطالعہ میں مشغول ہو جایا کرتے تھے۔ ایک بجے ٹھیک آدھ گھنٹے کے لیے سو جایا کرتے تھے سو کر اٹھتے تو ہمارے دوست مسٹر علی سے اردو کا سبق لیتے تھے، تین بجے اپنا دوسرا اور آخری کھانا کھا لیتے تھے جس میں دودھ اور پھل ہوتا تھا۔ پھر تھوڑی دیر تک لوگوں سے بات چیت کرتے رہتے تھے، چار بجے سے سات بجے شام تک پھر پڑھتے تھے۔ سات بجے سے تقریباً ایک گھنٹہ تک اس مختصر سے احاطے میں تفریح کرتے تھے اور آٹھ بجے پوجا پاٹ کر کے سو جایا کرتے تھے۔

اب اس نظام اوقات میں بہت سی مدیں ایسی تھیں جن کا میں عادی نہ تھا یا مجھے ان سے رغبت نہ تھی، اگرچہ میں سویرے اٹھتا ہوں تاہم چار بجے تڑکے اٹھنے کا عادی نہیں ہوں اور نہ اتنے سویرے میں نے کبھی پوجا پاٹ کی تھی۔ اس کے علاوہ سوت کاتنے کے بجائے بیت کا کام مجھے زیادہ پسند تھا جس کو میں نے سابرمتی جیل میں شروع کیا تھا تاہم میں اس عجیب ماحول میں گاندھی جی کا ساتھ دیتا تھا اور بہت سنجیدگی کے ساتھ محسوس کرتا تھا کہ میں اپنے زندگی کے کچھ آزمائشی لمحے گذار رہا ہوں بلکہ میں اسے اپنا فرض اور اپنے لیے باعث سعادت سمجھتا تھا کہ نہایت استقلال اور جانفشانی کے ساتھ ان کی اتباع کروں لہٰذا میں نے دوسرے ہی دن سے پوجا پاٹ میں ان کا ساتھ دینا شروع کیا۔ اگرچہ چند ہفتے میں نے بیت کا کام جاری

رکھنے میں اپنی ذاتی آزادی کو دخل دیا لیکن گاندھی جی کے بار بار کے اس تقاضے پر کہ حسب مقدرت سوت ضرور کاتو میں نے آخر کار سپر ڈال دی میں اپنے دل میں کہتا تھا کہ مجھے گاندھی جی کے فیضان کے ماتحت ستیہ گرہ کی چکی میں اپنے کو پس جانے دینا چاہیئے اس کے بعد میں صحیح طور پر اس قابل ہوں گا کہ میں اس مسلک کے متعلق تجربات کی بنا پر کوئی ذاتی رائے دے سکوں گا۔ باقی حیثیتوں سے میں نے فکر و مطالعہ کا وہ مشغلہ جسے میں نے سابرمتی جیل میں شروع کیا تھا جاری رکھا۔ یرواده جیل پہنچ کر میں نے جو روحانی تربیت حاصل کرنی شروع کی تھی اس میں مختلف مذہبی فلسفیانہ اور دیگر موضوعات پر ہندی مرہٹی گجراتی اور انگریزی کی کثیر التعداد کتابوں سے اس ذخیرہ سے جو گاندھی جی نے اپنی کوٹھری کی لائبریری میں جمع کر رکھا تھا۔ بڑی مدد ملی۔ میری کوٹھری کا دروازہ بھی رات کو کھلا رہتا تھا جو کھانا میرے لیے گاندھی جی تجویز کر دیا کرتے تھے وہ بھی ملنے لگا۔ گویا یراوده جیل میں جسمانی، ذہنی، اور روحانی دعوت کا اچھا خاصہ انتظام ہو گیا اور مجھے یہ توقع ہونے لگی کہ میں جس وقت جیل سے نکلوں گا ستیہ گرہ اور چرخے کے عظیم الشان مسلک کا جس کو اس دکھ بھری اور طوفان زدہ دنیا میں رائج کرنے کے لیے گاندھی جی پیدا ہوئے ہیں اچھا خاصہ داعی ثابت ہوں گا۔

ترپن واں باب

گاندھی جی نے زہر چوس لیا

گاندھی جی سے میری ابتدائی گفتگو قدرتاً اس وقت کے سیاسی حالات کے خاص خاص مسائل پر رہی۔ گیا کے اجلاس میں اور نیز اس کے بعد کے حالات میں سے دو چیزیں میرے ذہن پر خاص طور پر مسلط ہو گئی تھیں پہلی چیز تو اکالی سکھوں کا وہ حیرت انگیز، دلیرانہ، اور منظم ایثار تھا جس کا انھوں نے ایک انوکھی قسم کی ستیہ گرہ کی شکل میں اپنے بدکردار پروہتوں کے خلاف، اور ضمناً حکومت کے خلاف جو ان کی حمایت کر رہی تھی مظاہرہ کیا تھا۔ سیاہ پوش اکالی مردوں اور عورتوں کا کرپان لگائے ہوئے اور مذہبی گیت گاتے ہوئے گیا کے اجلاس میں جلوس بنا کر گشت کرنے کا نظارہ اب تک میری آنکھوں میں سمایا ہوا تھا، دوسری چیز ستیہ گرہ کے متعلق وہ قرارداد تھی جو کانگریس کے آخری اجلاس میں منظور ہوئی تھی اور اس کا میرے ذہن پر نمایاں طور پر مسلط ہونا ایک فطری امر تھا کیوں کہ رضاکاروں کی بھرتی ہی کے جرم میں مجھے گرفتار کر کے جیل بھیجا گیا تھا اس سلسلہ میں جو چیز میرے لیے خاص طور سے تکلیف دہ ثابت ہوئی وہ یہ خیال تھا کہ ولبھ بھائی پٹیل جیسے ذمہ دار لیڈر نے مجھے علمی مشاغل سے باہر نکال کر اور سیاسی ماحول میں لگا دینے کے بعد میری سرگرمی اور سزایابی کو ایسے الفاظ میں سراہا جس سے تعریف نہ کرنا ہی بہتر تھا۔ قدرتاً میری یہ خواہش تھی کہ ان دونوں مسئلوں پر گاندھی جی سے کھل کر بات چیت کروں اور ان کی تائیدی رائے سے تقویت حاصل کروں

لیکن اکالیوں ہی کے مسئلے پر جب گاندھی جی سے گفتگو کی تو میرے ولولے سرد ہو کر رہ گئے۔ گاندھی جی کہنے لگے

کہ میں نے سکھ مذہب، کے بارے میں نیز سکھوں کی مذہبی مہمات کے بارے میں کافی کچھ پڑھا ہے اور ذاتی تجربہ کی بنا پر بھی اکالیوں سے واقف ہوں لیکن میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ ان کی جدوجہد ستیہ آگرہ کی سطح سے بہت نیچے ہے کیوں کہ اس میں شک نہیں ہے کہ جس وقت وہ بظاہر نہایت سکون کے ساتھ اپنے سینوں پر گولیوں، تلواروں اور نیزوں کی بوچھار روک رہے تھے، اس وقت بھی اُن کے دلوں میں تشدّد ضرور جاگزین تھا جس کثیر تعداد میں یہ لوگ ننکانہ یا اپنے دوسرے مقدس مقامات کی طرف مارچ کر رہے تھے اُسی سے ظاہر ہوتا تھا کہ کسی نہ کسی شکل میں تشدد کا جذبہ اُن کے سینوں میں چھپا ہوا ہے۔ اس مخالفانہ فیصلہ کو سُن کر میں نے گاندھی جی سے اس سلسلہ میں مسٹر سی۔ ایف اینڈریوز جیسے عظیم المرتبت انسان کی اُن فیاضانہ مدح سرائیوں کا تذکرہ کیا جو اُنھوں نے اکالیوں کے اس مظاہرہ کو دیکھ کر کی تھیں اور بتایا کہ موصوف نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ یہ باتمکنت لوگ اپنی مسلسل جدوجہد کے دوران میں پٹتے تھے اور ہلاک ہوتے تھے۔ مگر انتقام کی ذرہ برابر کوشش نہ کرتے تھے۔ گاندھی جی ان تمام باتوں کو اور اس کے علاوہ اور بہت کچھ جو میں کہتا گیا سنتے گئے لیکن اُن کی جرأت و مردانگی کی گرمجوشی سے تعریف کرتے ہوئے بھی اپنے اُس فیصلہ پر جمے رہے اور ایسی نیم مصافی تحریک کو اپنی درویشانہ دعاؤں سے سرفراز فرمانے پر رضامند نہ ہوئے۔

اس کے بعد گیا کانگریس کی ستیہ آگرہ والی قرارداد اور مستقبل قریب میں ستیہ آگرہ کی مہم جاری کرنے کے قرینہ پر گفتگو کرتے ہوئے فرمانے لگے۔

۱۔ سوراج حاصل کرنے کے لیے اس وقت سول نافرمانی کی کوئی عام تحریک نہیں شروع ہونی چاہیے کیوں کہ ہم ابھی اس پر عمل پیرا ہونے اور قائم رہنے کے اہل نہیں ہیں۔

۲۔ جو لوگ اور حیثیتوں سے اس کے اہل ہیں وہ البتہ دوسرے مخصوص معاملات پر ستیہ آگرہ کر سکتے ہیں اگرچہ اس کا بھی مقصد محض ایثار کی رسم کو زندہ رکھنا ہی ہے۔

۳۔ درد راجلو جیسے افراد کا ستیہ آگرہ کرنا یقیناً مبارک اقدام ہے اگر وہ سیاسی غلامی کی زنجیروں کو اپنے لیے قطعاً ناقابل برداشت محسوس کریں۔

۴۔ اس بات پر اُنھوں نے مجھ سے کامل اتفاق کیا کہ جن لیڈروں نے ستیہ آگرہ کا عہد کر لیا ہے اُنھیں یہ ایثار ضرور کرنا چاہیے خواہ اُن کا یہ عہد کسی غلط اندازہ ہی پر کیوں نہ مبنی رہا ہو۔

اس صورت سے اُنھوں نے گویا مسٹر پٹیل اور راج گوپال آچاریہ جیسے لیڈروں کے رویہ سے اظہار اختلاف کیا جنھوں نے گیا کانگریس میں لمبے چوڑے وعدوں کے باوجود جنگ کو آخری منزل تک جاری رکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ گاندھی جی کا یہ خیال ضرور تھا کہ موجودہ حالات میں عوام کو اس شورش میں نہیں لانا چاہیے۔

ان باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ جو رویہ اُن کا جیل پہنچنے سے قبل تھا اس سے ابھی تک گاندھی جی سرِمو ہٹنے کے لیے تیار نہ تھے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ محض اتنا ہی معلوم ہوتا تھا کہ اُس وقت سے اب تک میں اُنھوں نے جو کچھ دیکھا سُنا ہے اُس کی بنا پر وہ پہلے سے زیادہ مضبوطی سے اپنی رائے پر جمے ہوئے تھے بلکہ ستیہ آگرہ کے تمام شرائط اور سوراج کے نکتہ کے تمام مضمرات کے متعلق وہ پہلے سے بھی زیادہ باریک بیں اور محتاط ہو گئے تھے۔

ایک ایسی اتفاقی صورت پیدا ہو گئی کہ ہمیں اس مسئلہ پر زیادہ وضاحت سے گفتگو کرنی پڑی، گاندھی جی کو قبل از وقت رہا کیے جانے کی افواہ غیر معمولی طور پر گشت کرنے لگی مسٹر مہادیو ڈیسائی کے ایمار سے مسز گاندھی نے حال ہی کی ملاقات میں گاندھی جی سے اس اطلاع کا ذکر کرتے ہوئے دریافت کیا تھا کہ فوری رہائی کی صورت میں ملک کو کس نوعیت کا پیغام دیں گے۔ لہٰذا یہی مسئلہ موضوع گفتگو بن گیا، اور گاندھی جی اپنی رہائی کے موضوع پر شرح وبسط کے ساتھ اظہارِ خیال کرتے رہتے تھے۔

وہ کہتے تھے کہ میری انتہائی خواہش تو یہ ہے کہ میرے رہائی کے احکام سوراج پارلیمنٹ کی طرف سے نافذ ہوتے۔ اس کے برعکس مجھے

اس سے سخت نفرت ہے کہ میں ایک غیر مضرت رساں اور غیر متوقع انسان سمجھ کر آزاد کر دیا جاؤں بیماری کی بنا پر رہا ہونا بھی مجھے پسند نہیں ہے۔" پھر میں نے اُنھیں ایک اور مسئلہ پر چھیڑا۔ میں نے پوچھا کہ فرض کیجیے کہ یک بیک جنگ چھڑ جائے یا اور کوئی بین الاقوامی پیچیدگی پیدا ہو جائے اور آپ کو اس شرط پر رہا کیا جائے کہ ایسے نازک موقع پر آپ حکومت کو کسی طرح پریشان نہ کریں تو آپ کہاں تک پسند کریں گے؟ اپنی مخصوص عادت کے مطابق اُنھوں نے اس سوال پر سکوت اختیار فرمایا اور کوئی جواب نہ دیا۔

اس تمام گفتگو کے دوران میں اتنا ضرور صاف طور پر ظاہر ہوتا تھا کہ گاندھی جی اپنی قبل از وقت رہائی کے متعلق کوئی بات چیت سُننا پسند نہیں کرتے۔ کسی اور وجہ سے نہیں تو کم از کم اسی وجہ سے سہی کہ ابھی عوام کے سامنے پیش کرنے کے لیے وہ کوئی مناسب پیغام نہیں تیار کر سکے تھے۔ میں نے بہرحال دریافت کیا کہ آپ کون کون سی اہم باتیں یہاں سے ہندوستان کے مضطرب عوام کے سامنے پیش کریں گے۔ اس سوال پر میں جو کچھ بھی اُن سے اخذ کر سکا حسبِ ذیل ہے:-

"سول نافرمانی کی عام تحریک کے لیے جو شرائط میں نے مقرر کیے ہیں اُن میں سے ایک ایک کے پورا ہونے پر میں پہلے سے بھی زیادہ اصرار کروں گا۔ ایک مرتبہ بردولی میں ان شرائط کے مکمل طور پر پورے نہ ہونے پر میں نے چشم پوشی کر کے جو غلطی کی ہے اس کا اعادہ نہیں ہونے دوں گا۔

سوراج کا جو مثالی خاکہ میرے ذہن میں ہے وہ ینگ انڈیا کے اوراق میں بکھرا پڑا ہے اس سے پہلے یہ عالم تھا کہ مجھے ایک دھندلا سا نقشہ نظر آ رہا تھا، لیکن اب تمام چیزیں میری نظر کے سامنے روشن ہو گئی ہیں۔ اگرچہ میں آیندہ سوراج کے مذہبی نہیں بلکہ حقیقتاً سیاسی نصب العین پر زیادہ زور دوں گا تاہم میں مغربی طرز کی یونیورسٹیوں اور ہائی کورٹوں پر جو اتنا زیادہ روپیہ خرچ کیا جاتا ہے اس کی ضرور مذمت کروں گا جیسا کہ پہلے بھی میں نے بیرونی طرز کی عدالتوں، اسکولوں اور کونسلوں کی مخالفت کی تھی۔ لہٰذا میں یقیناً بابو بھگوان داس کے حسب منشا، اس سوراج کا ایک سادہ دستور اساسی ضرور تیار کروں گا جس کا خاکہ میرے ذہن میں ہے بہرحال یہ ایسا نہیں ہوگا جس سے کسی کو صدمہ پہنچے یا میرے سیاسی متبعین کو ناگوار معلوم ہو کیوں کہ جیسے سنسکرت میں کہاوت ہے " سچ بات ہمیشہ میٹھی ہوتی ہے اگرچہ اس کا حلق کے نیچے اُتارنا دشوار ہوتا ہے" اس قسم کا ایک دستور مرتب کرنے کے بعد ممکن ہے میں یہاں تک کروں کہ کانگریس کے سامنے اسے رائے عامہ حاصل کرنے کی غرض سے پیش کروں اور اگرچہ مجھے ان لوگوں کی علیحدگی جو اس سے اختلاف رکھتے ہیں رنج کا باعث ضرور ہوگی، تاہم میں انھیں لوگوں کی رفاقت پر قناعت کروں گا جو اس سے متفق ہوں اور سچے سپاہیوں کی طرح عدم تشدد کی زرین شاہراہ پر میرے پیچھے چلنے کا حتمی عہد کریں گے۔

سب سے اخیر میں چرخہ کی بحث چھڑی۔ سال بھر تک برابر ۳ گھنٹہ یومیہ چرخہ کاتنے کا یہ اثر تھا کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ چرخہ کے شیدائی ہو گئے تھے اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ ان کا شغف پہلے ہی سے اتنا زیادہ تھا کہ اس میں کسی اضافہ کی گنجایش نہ تھی۔ اس کے متعلق ان کے عقائد میں اتنی پختگی ہو گئی تھی کہ وہ اس کی موافقت میں گیتا کے بہت سے بند اور ابواب کا اقتباس پیش کیا کرتے تھے۔ گاندھی جی کہا کرتے تھے کہ "چرخہ سے کاتے ہوئے سوت کے ہر تار میں ہم کو رام اور کرشن کی تصویر نظر آنی چاہیے۔"

یہاں پہنچ کر میں نے چاہا کہ اُن کی نظر کو واقعاتی دنیا کی طرف پھیر سکوں، چنانچہ میں نے اُنھیں یہ الم انگیز خبر سُنائی کہ سارے گجرات میں چرخے بند ہو گئے ہیں۔ اُنھیں سخت حیرت اور کلفت ہوئی کیوں کہ اب تک اُنھیں اس کی اطلاع نہ تھی۔

لیکن واقعات خواہ ہمالیہ ہی کے برابر کیوں نہ ہوں اُس عقیدت میں جو اُنھیں چرخہ سے ہو گئی تھی تزلزل نہیں پیدا کر سکتے تھے۔ اس کے فوراً ہی بعد اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ جتنا ہو سکے چرخہ کاتتے جاؤ کیوں کہ ہندوستان کے افلاس کا یہی بہترین علاج ہے۔

اِدھر اُدھر کے کسی رسالہ میں اُنھوں نے دیکھا تھا کہ دیہاتوں کے ابتدائی مدارس میں نظام تعلیم درست کرنے کی کوشش ہو رہی ہے، اس سے وہ بے حد خوش تھے اور کہتے تھے مجھے اس کی کوئی پروا نہ ہوگی اگر ہمارے کالج بند ہو جائیں لیکن ابتدائی تعلیم کے معاملات

اپنے اختیار میں رکھنا لازمی ہے کیوں کہ ان ہی درس گاہوں کے ذریعہ چرخہ کے کام کو ترقی دی جاسکتی ہے۔

بہرحال مجھ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا کیوں کہ میری سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا کہ جیل کے احاطہ میں چرخہ کات کر یا بردولی جیسے بارونق مقام پر ابتدائی مدارس قائم کر کے ہم آخر کیوں کر مانڈوی کے کالی براج یا پانچ محل کے بھیلوں کا افلاس دور کرسکتے ہیں۔

اگرچہ ان تمام باتوں سے میں قطعاً قائل نہ ہوا تاہم ایک ایسی اتفاقی صورت واقع ہوگئی جس سے مجھے گاندھی جی کی روح کی گہرائیوں کا مطالعہ کرنے کا ایک موقع ملا۔ ان دنوں ہمارے جیل میں ایک حبشی وارڈر تھا جو شمالی لینڈ کا رہنے والا تھا۔ گزشتہ جنگ میں عرب سے گرفتار کر کے لایا گیا تھا۔ عدن اس کا نام تھا۔ ایک مرتبہ شام کے وقت اُس کے ہاتھ میں کسی بچھو نے ڈنک مار دیا۔ اُس نے چلانا شروع کیا۔ گاندھی جی فوراً اُس کے پاس پہنچ گئے اور اُسے تسلی دینے لگے۔ زخم کے متعلق صحیح حالات معلوم کرنے کے بعد گاندھی جی نے ایک دوسرے وارڈر کو اسپتال روانہ کیا مگر اُنھوں نے ڈاکٹر کے آنے تک دوا کا انتظار نہ کیا بلکہ پہلے ایک چاقو منگوایا تاکہ زخم میں نشتر دیکر زہر خارج کر دیں۔ لیکن چاقو بہت گندا تھا۔ اُنھوں نے سوچا کہ وقت ضائع کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ لہٰذا زخم کے اردگرد کا حصہ پانی سے دھو دیا اور لب لگا کر زہر کو چوسنا شروع کیا۔ جب تک اُنھوں نے یہ کام ختم نہیں کر لیا، ہماری اور مسٹر علی کی سمجھ میں بھی نہیں آیا کہ وہ کیا کر رہے ہیں، زہر چوس چکنے کے بعد اُنھوں نے اُسے تھوکنا شروع کیا۔ عدن کو آرام محسوس ہونے لگا۔ اس محبت بھرے ایثار کی پوری داد دینے کے لیے یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ اس زمانے میں اُن کے دانت سے خون آرہا تھا اور اُنھیں جیل میں ایک طویل علالت سے حال ہی میں افاقہ نصیب ہوا تھا۔

ہماری جیل کی زندگی تمام تر خشک و بے نمک نہ تھی گاندھی جی کبھی کبھی قصداً اور اکثر بلا ارادہ اُس میں کچھ مزاح کی چاشنی پیدا کرتے رہتے تھے۔ پھلوں کے متعلق گاندھی جی کا جو رویہ تھا اُس سے بھی ہم لوگ کافی محظوظ ہوتے تھے۔ گاندھی جی اپنی بیوی سے پھل لانے کو منع کیا کرتے تھے مگر جیسا کہ ایک خدمت گزار بیوی کا فرض ہے وہ ہمیشہ اس حکم کو نظرانداز کر دیتی تھیں۔ جب کبھی وہ پھل لاتی تھیں گاندھی جی کو اُس کے قبول کرنے میں بہت تردد ہوتا تھا کیوں کہ اُن کا خیال یہ تھا کہ جیل کے باہر سے جو مزید پھل آتے ہیں وہ ایک قسم کا سامانِ تعیش ہے اور جیل کی سخت اور سادہ زندگی سے یہ چیز مناسبت نہیں رکھتی۔ شروع شروع میں تو وہ اُنھیں بالکل ہی قبول نہیں کرتے تھے مگر بعد میں پسیج گئے تھے اور پھلوں کو لے تو لیتے تھے مگر اُنھیں سیدھے جیل کے اسپتال بھیج دیتے تھے۔ ہوتے ہوتے جب میں وہاں پہنچا تو اُس وقت تک وہ اپنے رویّہ میں اور بھی تبدیلیاں پیدا کر چکے تھے، اب وہ پورا پارسل رکھ لیتے تھے اور نہایت فیاضی کے ساتھ اپنے ساتھ کے قیدیوں کو وارڈروں کو اور جیل کے بعض اہل کاروں کو جن سے اُن کا دوستانہ ہوگیا تھا تقسیم کر دیتے تھے، اس کے علاوہ پھلوں کی ایک معتدبہ تعداد خود اپنے مصرف میں لانے میں بھی اُن کو کوئی تکلف نہیں ہوتا تھا، یہ تو نہیں ہے کہ میں گاندھی جی کی ان متقیانہ احتیاطوں سے یا ان پابندیوں سے ہوشیاری کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کی ترکیبوں سے واقف نہ تھا لیکن مجھے یہ دیکھ کر ضرور لطف آتا تھا کہ جیل کی تنہائیوں میں بھی تو ہمانہ پابندیوں نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا مگر یہ اپنی تیر بہ ہدف خوش تدبیریوں سے کس مزے میں ان سب سے عہدہ برآ ہو جاتے ہیں جس سے اُن کے تمام متعلقین کو مسرت و اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔

چوّنواں باب

رمضان - عید - اخبارات

میں اپنی توقع سے زیادہ خوش نصیب ثابت ہوا کیوں کہ جہاں گاندھی جی کو پورے سال کا زمانہ ان تنگ و تاریک کوٹھریوں میں بسر کرنا پڑا تھا ہماری پارٹی کے لوگ وہاں پہنچنے کے بعد ایک ہفتہ کے اندر ہی یورپین احاطہ میں منتقل کر دیے گئے۔

پُرانے احاطہ کے بعض محبوب ترین واقعات کا ذکر کر دینا البتہ ضروری ہے، میں رمضان کے مہینہ میں یراودا جیل میں پہنچا تھا وہ زمانہ جب دیندار مسلمان اپنا سالانہ روزہ رکھا کرتے ہیں مہاتما کی تحریک پر ہمارے رفیق مسٹر علی نے پورے مہینہ کا روزہ رکھا اُس روزہ کے اختتام کے بعد عید الفطر کا تیوہار منایا جاتا ہے، دین دار مسلمان اُس وقت تک روزہ شکنی نہیں کرتے جب تک اس مہینہ کے اختتام پر نیا چاند نہ دیکھ لیں۔

ہم پُرانے جیل خانے ہی میں تھے کہ عید کا دن آیا، اگرچہ بظاہر تعجب خیز معلوم ہوتا ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ گاندھی جی نے ایک کٹر ہندو ہونے کے باوجود مسٹر علی اور دیگر ہمسایہ مسلم قیدیوں کے ساتھ عید منانے میں اچھا خاصہ ساتھ دیا۔ وہ سارے دن اُن مسلمان قیدیوں سے۔ جو خاردار جنگلے سے گزرتے ہوئے نظر آتے تھے، عید کی مُبارکباد لینے دینے میں مشغول رہے۔ مسٹر علی کو مبارکبادیں اور دعائیں دینے میں وہ اور بھی فیاضی سے کام لیتے رہے اتنے میں شام ہوگئی۔ نیا چاند چند لمحوں کے لیے درختوں کے اوپر فضا میں معلق اور جیل کی سنگین دیواروں کو تکتا ہوا نظر آتا رہا۔ مسٹر علی سے زیادہ گاندھی جی اُسے دیکھنے کے مشتاق معلوم ہوتے تھے" بہرحال جس وقت چاند کی جھلک دکھائی دی گاندھی جی کی مسرت کی کوئی حد نہیں معلوم ہوتی تھی، مارے خوشی کے یہ عالم تھا کہ گاندھی جی چاند کا نظارا اور مکمل نظارہ کرنے کے شوق میں جنگلے سے باہر ہو گئے اور مسرت انگیز لہجہ میں مسٹر علی کو پکارنے لگے وہ بھی پہنچ گئے اور فوراً ہی ہم سب لوگ کھلے ہوئے احاطہ میں نئے چاند کا دُھندلا سا حُسن دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے، چند ہی لمحے گزرے تھے کہ چاند درختوں کے پیچھے غائب ہو گیا۔

میں نے بہت قریب سے سیاسی پلیٹ فارم پر گاندھی جی کی ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں کا مشاہدہ کیا تھا میرے ذہن میں بلند ترین سیاسی رہنماؤں اور عالموں سے لے کر پست ترین طبقہ کے مسلمانوں تک سے اُن کی مواخات اور بھائی چارہ کے واضح نقوش موجود تھے۔ مگر اس وقت اتنے پر جوش طریقہ پر اُن کا عید منانا اپنے ہمسایہ مسلم قیدیوں کو عید کی مبارکبادیں دینا اور پھر نیا چاند دیکھ کر اس درجہ مسرور ہونا یہ سب ایسی چیزیں تھیں کہ ہندو مسلم اتحاد کا جو روحانی تصور اُن کے ذہن میں تھا اُس کا اتنا صحیح اندازہ میں کبھی پہلے نہ کر سکا تھا، کیونکہ مجھے ان چیزوں سے یہ اندازہ ہوا کہ بت پرستی اور دیگر رسوم و فروعات کو حذف کر کے اُنھوں نے ایک نئے قسم کے ہندو مذہب کی تشکیل کی ہے۔ جسے اسلام کے اصل جوہر کے ساتھ ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔ گویا ایسی صورت ہو گئی تھی کہ دونوں مذہبوں کے ماننے والے اپنے مذہبی تیوہار کے موقع پر ایک دوسرے کے ساتھ برادرانہ حیثیت سے شریک ہو سکتے تھے۔

لیکن ہر شے کی اصلیت اُس کے نتیجہ ہی سے معلوم ہوتی ہے اور بعد کے تلخ تجربات نے کافی واضح کر دیا ہے کہ اس قسم کے روحانی تصورات

ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں کے جوڑنے میں کس درجہ بے کار ثابت ہوئے ۔ مُرورِ ایام نے اسے بھی کافی واضح کر دیا ہے کہ مذہب اور ذات پات کے اختلاف کے باوجود ہندوستان کے بظاہر غیر متجانس عوام میں اگر کوئی اتحاد ہو سکتا ہے تو اُس کی صرف یہ صورت ہے کہ اُن کے درمیان مشترکہ اقتصادی سیاسی اور دیگر دنیاوی مفاد کی بناء پر معقول مفاہمت ہو جائے ۔

زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ جیل کے سپرنٹنڈنٹ میجر جونس ایک مرتبہ سہ پہر کے قریب ہمارے احاطہ میں دوڑے ہوئے آئے اور بہت خوش ہو کر گاندھی جی سے کہنے لگے "میں ابھی مہابلیشر (حکومت بمبئی کے گرمائی مستقر) سے آیا ہوں اور یہ خوش خبری سُناتا ہوں کہ مجھے گورنمنٹ نے اجازت دے دی ہے کہ آپ کو میں یورپین احاطے میں منتقل کر دوں" ہم لوگوں کو تو اس سے بڑی خوشی ہوئی مگر گاندھی جی پر کوئی خاص اثر نہیں معلوم ہوتا تھا وہ کہنے لگے "یہ بات ہے ! اچھا حکومت کی اگر یہی مرضی ہے تو ہم لوگ بہت خوشی سے اُس احاطے میں منتقل ہو جائیں گے"۔ میجر جونس نے فوراً جواب دیا" مگر یہ اُس صورت میں ہے کہ آپ اس نئی جگہ کو دیکھ لیں اور وہاں جانا پسند کریں" کچھ اور دو چار باتیں کرنے کے بعد میجر جونس واپس ہو گئے ۔ گاندھی جی نے اُس نئی جگہ کو جا کر دیکھنے کی کوئی فکر نہیں کی کیوں کہ وہ اس تبادلہ کو محض گورنمنٹ کا حکم سمجھتے تھے ۔ لہٰذا میں اور مسٹر علی یورپین احاطہ کو دیکھنے گئے اور ہمیں ایسا معلوم ہوا کہ جیل میں گویا جنت اُتر آئی ہے دوسرے ہی دن ہم وہاں منتقل ہو گئے ۔ ہماری پُرانی کوٹھریوں کے برعکس اس نئے احاطہ کے چاروں طرف ایک چوڑی اور بلند دیوار تھی لیکن یہ احاطہ بہت کشادہ تھا اور اس میں ایک اچھا خاصہ باغ بھی تھا جس میں انواع و اقسام کے پھل پھول تھے اگلے برسات میں ہم نے ان سے کافی فائدہ اُٹھایا ۔ احاطہ کے دونوں طرف بیس بیس کمروں کی دو قطاریں تھیں جو زمین سے تقریباً دس فٹ بلند کرسی پر تعمیر کیے گئے تھے یہ کمرے کافی ہوادار تھے اگرچہ ہر کمرہ میں ایک ہی ایک دروازہ تھا لیکن کمروں کے دونوں جانب یہاں سے وہاں تک بہت کشادہ برآمدہ بنا ہوا تھا جو تقریباً دس فیٹ چوڑا رہا ہوگا ۔ گاندھی جی اس میں سے چار کمروں پر قابض ہو گئے پہلے کمرہ میں اُنھوں نے اپنا کتب خانہ اور غسل خانہ وغیرہ رکھا دوسرا سونے کا کمرہ بنایا تیسرا کاتنے کا چوتھے میں روئی پُرانے چرخے اور روئی دُھننے کے اوزار وغیرہ رکھتے تھے اُس کے بعد کے دو کمرے میں نے لیے اور اسی قطار کے بالکل آخر کا کمرہ مسٹر علی نے لیا ۔ اس قطار کے سارے کمرے ہم ہی لوگوں کے تصرف میں تھے اور ہم لوگوں کو ایک دوسرے سے بات چیت کرنے کی شب و روز مکمل آزادی تھی لیکن بارکوں میں جو یورپین اور اینگلو انڈین قیدی تھے اُن سے البتہ بات چیت کرنے کی سخت ممانعت تھی ۔ اُن لوگوں کے ساتھ معمولی قیدیوں کا سا برتاؤ ہوتا تھا جیل کا معمولی کام دیا جاتا تھا اور جو خاص غذا اُن لوگوں کے لیے مقرر ہے وہ ملتی تھی لیکن شام کو جب ہم چہل قدمی کو نکلتے تھے تو اُن سے ملنے کا کافی موقع رہتا تھا خصوصاً اُس وقت جب وہ جیل کی لائبریری میں آتے تھے جو ہماری بارک کے پشت پر واقع ہوئی تھی ۔

ایک دن میں نے گاندھی جی سے بڑی گرم جوشی سے پوچھا کہ "اُن پرانے کمروں سے انھیں آپ یقیناً بہت زیادہ پسند کرتے ہوں گے" اُنھوں نے اپنے خاص انداز میں جواب دیا "ہاں ، اُن کمروں سے تو یہ اچھے ہیں لیکن میں اُنھیں میں رہنے کو ترجیح دیتا اور اس نقل سکونت پر صرف اس لیے راضی ہو گیا کہ میجر جونس کے الفاظ کا اگرچہ بظاہر یہ انداز نہ تھا تاہم میرے خیال میں وہ ایک سرکاری حکم کی حیثیت رکھتے تھے بہرحال گاندھی جی کی یہ منطق میری سمجھ میں بالکل نہ آئی شاید یہ وجہ رہی ہو کہ اُس پُرانے ماحول کے جس میں وہ سمجھتے تھے کہ چھ سال گزارنے ہیں گاندھی جی عادی ہو چکے تھے یا شاید یہ وجہ رہی ہو کہ پُرانی جگہ زیادہ ذلیل اور خستہ حال تھی جو صحیح معنوں میں ستیہ آگرہی قیدیوں کے لیے موزوں تھی یا پھر یہ وجہ رہی ہو کہ اپنے تمام خرابیوں کے باوجود اُس کا محل وقوع ایسا تھا کہ جب اُس احاطہ سے اُن کے محبوب متبعین گزرتے تھے تو گاندھی جی انھیں دیکھ سکتے تھے اور ان کی عام حالت اور جیل کی فضا سے نسبتاً زیادہ ربط قائم رکھ سکتے تھے لیکن جیل لائبریری سے کتابیں لینے کی ضرورت بہانے سے سیاسی اور معمولی قیدی ہمارے اس احاطہ میں بھی آ جاتے تھے اور گاندھی جی واقعی اُس وقت بے حد خوش ہوتے تھے جب لائبریری جاتے ہوئے یہ لوگ ہمارے کمرے کے پاس سے گزرتے تھے اور گاندھی جی کو اُن سے صاحب سلامت کا موقع مل جاتا تھا ، اگرچہ احاطہ کی تیس فٹ بلند دیواروں نے بیرونی دنیا سے ہم کو کافی بے تعلق بنا دیا تھا ، لیکن جیل کی باہر کی دنیا سے تھوڑا بہت ربط قائم رکھنے کی صورتیں بھی

تھیں ہمارے نئے احاطہ اور جیل کی بیرونی دیوار کے درمیان دس بیس فٹ فاصلہ تھا، یہ بیرونی دیوار ایک ایسی عام شاہ راہ سے ملی ہوئی تھی جو پونا سے مختلف اہم شہروں اور تیرتھوں تک جاتی تھی، لہٰذا ہمیں موٹروں کے چلنے کی، بیل گاڑی کے گھنٹوں کی، راہ گیروں کے گانے کی بلکہ مندروں کے گھنٹوں کی آوازیں سُنائی دیتی رہتی تھیں، دو ایک مرتبہ تو ہم کو پنڈھار پور کے جانے والے ہزارہا جاتریوں کے بھجن سننے کا بھی اتفاق ہوجاتا تھا جس سے ہم بہت محظوظ ہوتے، دوسری طرف بہت سے سیاسی قیدی تھے جن کے اور ہمارے درمیان صرف ایک دیوار حائل تھی ہمارے بعض وارڈر دیوار سے ملے ہوئے اونچے اونچے درختوں پر چڑھ کر اُن قیدیوں کو دیکھ بھی لیتے تھے جو دوسری طرف مقید تھے اُنھیں قیدیوں میں مسٹر ساورکر بھی تھے۔ کبھی کبھی یہ وارڈر اُن قیدیوں کے متعلق بعض باتیں بھی ہم سے بتادیا کرتے تھے۔ صبح شام میں جب میں احاطہ کے میدان میں ٹہلتا رہتا تھا تو بعض وقت کسی سیاسی قیدی کے کمرہ سے ہندوستان کے قومی ترانہ کا ولولہ انگیز نغمہ بھی سُنائی دے جاتا تھا جس کو سُن کر دل میں مسرت کی ایک لہر دوڑنے لگتی تھی۔

ہمارے پاس جیل سے باہر کی دنیا سے بھی ربط رکھنے کے ذرائع موجود تھے۔ ہمارے ہندوستانی ڈاکٹر صاحب جو اپنے روزمرہ کی گشت کے سلسلہ میں تمام دوسرے قیدیوں سے بھی ملتے تھے اُن لوگوں کے حالات و مصائب کی اطلاع ہم کو دیتے رہتے تھے ہم کو اخبار بھی ملتے تھے مگر دو ایک ہندوستانی رسالوں کے علاوہ اور کسی اخبار کی اجازت نہ تھی، لہٰذا مجھے بڑی حیرت ہوئی جب ایک روز میرے دوست مسٹر علی نے انگریزی اخباروں کا ایک بنڈل مجھے دیا اور کہا کہ اسے پڑھ کر جلا دینا بہرحال گاندھی جی کو ہرگز نہ دکھانا اگرچہ یہ ضرور ہے کہ تم ان اخباروں سے حاصل کی ہوئی خبریں جب اُنھیں سُناؤ گے تو بہت خوش ہوں گے۔ اس کے بعد مجھے غیر متعین وقفہ کے بعد مولانا حسرت موہانی سے جو شمالی ہند کے بہت بڑے مسلمان شاعر ہیں اخباروں کے بنڈل مل جایا کرتے تھے۔ چوں کہ مولانا کو خطرناک سیاسی قیدی سمجھا جاتا تھا اس لیے اُنھیں کال کوٹھری میں رکھا گیا تھا۔ ان کے کمرہ سے اکثر چاقو، لکھنے کا سامان اور اخبار وغیرہ برآمد ہوتے رہتے تھے اور اس جرم میں اُنھیں سخت سزائیں ملتی رہتی تھیں، لیکن ان تمام سزاؤں کے ہوتے ہوئے اور سب سے بالکل علیحدہ رکھے جانے کے باوجود وہ کسی نہ کسی طرح اخبار کا انتظام کر ہی لیتے تھے اور سُرخ اور نیلی پنسل سے نشان لگا لگا کر ہمارے پاس بھیج دیتے تھے کہ نشان زدہ حصّوں کو گاندھی جی کو دکھا دیا کریں۔

میں جتنی مرتبہ اخبار پڑھتا تھا اُتنی ہی مرتبہ جاکر گاندھی جی کو تمام خبریں سُنا دیا کرتا تھا، جنھیں وہ بہت دل چسپی کے ساتھ سنا کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ مولانا حسرت موہانی کی اخبار منگانے کی ان ترکیبوں اور ہوشیاریوں پر بہت ہنسا کرتے تھے۔ اور اُن کی ہمت و جرات کی بڑی تعریف کیا کرتے تھے۔ اگرچہ اُن کے متشددانہ انقلاب کے نظریہ سے گاندھی جی کو اختلاف تھا، چوں کہ یہ سلسلہ کچھ عرصہ تک جاری رہا لہٰذا مجھے اس کے معلوم کرنے کا بڑا اشتیاق تھا کہ ایک طرف تو گاندھی جی کا وہ نظریہ کہ جیل کے قواعد کی پوری پابندی کی جائے اور دوسری طرف ہمارے چوری چھپے اخبار حاصل کرنے کی فیاضانہ رواداری، آخر گاندھی جی ان دونوں میں کیوں کر مطابقت پیدا کرتے ہیں۔ لہٰذا میں نے ایک مرتبہ اس مسئلہ پر اُن سے گفتگو کی جس کا اُنھوں نے اپنے اسی خاص انداز کے مطابق حسبِ ذیل لفظوں میں جواب دیا "میں جیل کے حکام سے بتا چکا ہوں کہ میرے پاس مختلف ذرائع سے جن میں اخبار بھی شامل ہیں خبریں پہنچتی رہتی ہیں اور ایسی خبروں کو اپنے تک پہنچنے سے میں روک نہیں سکتا" اس طریقے سے ہمارے ہوشیار رشی قول و فعل کے نمایاں تضاد میں اکثر نہایت کامیابی کے ساتھ مطابقت پیدا کر لیا کرتے تھے۔ اور اپنے پوپلے مُنھ کے ایک ضیابار تبسم میں سب کچھ چھپا لے جاتے تھے۔

پچپن واں باب!

گاندھی جی نے چکّی چلائی

اِس نئے ماحول نے ہماری زندگی کی طرز وروش میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا کی تاہم مجھے یہ ضرور محسوس ہوتا تھا کہ میرے سینے سے کوئی بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا ہے لہٰذا میں زیادہ خوش وخرّم رہا کرتا تھا اور اُس عمدہ باغ اور کشادہ میدان کی وجہ سے میں کچھ ایسی چیزیں فراہم کرنے میں کامیاب ہوگیا جن سے جیل میں ہماری زندگی زیادہ آرام سے گزرنے لگی۔

جیل کے عمال تک ہم سب کی رسائی تھی لیکن یہ قریب قریب مسلمہ امر تھا کہ ہماری چھوٹی سے چھوٹی ضرورتوں کے متعلق بھی مسٹر گاندھی ہی بات جیت کیا کریں کیوں کہ اسی عرصہ میں میجر جونس نے گاندھی جی کو اس کی اجازت دے دی تھی کہ اُس احاطہ کے اپنے تمام رفیقوں کے کھانے کا ٹکٹ وہ خود ہی بنوایا کریں بلکہ اُن کے لیے مناسب کام بھی وہ خود ہی تجویز کیا کریں تاکہ حسبِ ضوابطِ جیل مہینے میں دو دن کی معافی ہوجایا کرے۔ لہٰذا مسٹر علی اور میں اپنی ضرورتوں کی اطلاع پہلے گاندھی جی کو دیتے تھے اور وہ یا تو اُنھیں حکام تک پہنچا دیتے تھے یا ہم کو اِس کی اجازت دے دیتے تھے کہ براہِ راست حکام سے گفتگو کرلیں لیکن اگر اُس کی کسی مد کو اُنھوں نے مسترد فرمادیا تو پھر ہماری یہ جرأت نہیں تھی کہ اُس کے متعلق ایک لفظ بھی عمال سے کہہ سکیں۔

گاندھی جی کی یہ دوستانہ خدمت میرے بہت کام آئی۔ سابرمتی جیل میں میں اسی کو اپنی خوش قسمتی سمجھتا تھا کہ حسبِ خواہش ہر قسم کا سامانِ خورونوش اپنے خرچ سے منگانے کا انتظام ہوگیا تھا، لیکن یہاں گاندھی جی کی وجہ سے تمام ضروری چیزیں سرکاری خرچ سے مل جایا کرتی تھیں تاہم وہ بعض ضروری چیزوں کی منظوری صرف اس بناء پر نہ دیتے تھے کہ اُنھوں نے اور مسٹر بنکر نے اُس کے بغیر پورا سال گزار دیا تھا مثلاً وہ روٹی کاٹنے کی چھری کے متعلق کوئی توجہ صرف اس بناء پر نہ کرتے تھے کہ اُنھیں بڑی دقتوں کے بعد روٹی کاٹنے کے لیے ایک جیبی چاقو کے استعمال کی اجازت ملی تھی اس کے علاوہ شروع میں مجھے مکھن کے بجائے دودنے میں گھی مل جایا کرتا تھا قدرتاً مجھے روٹی کاٹنے کی چھری اور مکھن کے لیے زیادہ اصرار ہوا اور آخر کار میں نے گاندھی جی کو اس پر رضامند کرلیا کہ اس کے متعلق براہِ راست حکام سے گفتگو کرنے کی اجازت دیں۔ جیل کے حکام نے فوراً ہم لوگوں کو یہ سب سہولتیں فراہم کردیں۔ خوش قسمتی سے میرے لیے رات کو یا صبح تڑکے کام کرنے کے واسطے تقریباً بن مانگے روشنی کا بھی انتظام ہوگیا جیسے گاندھی جی کے لیے ہوا تھا۔ گو اُن کے لیے حکومتِ ہند سے اس بارے میں خاص احکام آئے تھے۔ ان تمام جدتوں اور برآمدہ میں سونے کی سہولت کے باعث سابرمتی جیل یا پُرانے احاطہ کی بہ نسبت یہاں کی زندگی بہت زیادہ ہنسی خوشی اور آرام سے گزرنے لگی۔

مئی کے آخر میں مجھ پر ملیریا کا ہلکا سا حملہ ہوا۔ لہٰذا مجھے سیر بھر کے بجائے ڈیڑھ سیر دودھ ملنے لگا۔ اور اگرچہ میں نے بہت جلد پھر پوری غذا کھانی شروع کردی تاہم اس زائد دودھ کا استعمال اخیر تک برابر جاری رکھا اور یہ گاندھی جی کی مضرا اجازت کے بغیر نہیں ہورہا تھا۔ اسی طرح مجھے پورا دوہ جیل کے قیام کے پورے دوران میں غسل کے لیے گرم پانی ملتا رہا۔ اگرچہ یہ بھی میری بیماری

کے زمانے میں شروع ہوا تھا۔ اس تھوڑے دن کے بخار ہی کے سبب سے مجھے مچھر دانی بھی مل گئی تھی جو راحت کا ایک مزید سامان تھی۔ ظاہر ہے کہ اس ساز و سامان کی فراہمی پر میں ایسی راحت کی زندگی گزارنے لگا جیسی اس سے پہلے کبھی نہیں گزاری تھی۔ اور اس نے مجھے ایک حد تک آرام پسند بھی بنا دیا تھا۔ اُس کا پورا اثر مجھے اُس وقت محسوس ہوا جب میں جیل سے باہر نکلا اور اپنے پُرانے طریقہ کی زندگی گزارنی شروع کی۔

لیکن گاندھی جی نے جہاں میرے لیے یہ تمام سامان فراہم کیا وہیں اس سے زیادہ انہماک کے ساتھ مجھے اُنھوں نے جسمانی محنت کے ایسے ڈھرّے پر لگا دیا کہ جس پر میں کبھی کاربند نہ ہوا تھا۔ اپنی ہدایتوں سے اور ہدایتوں سے زیادہ اپنی ذاتی مثال سے وہ مجھے چار بجے تڑکے اُٹھنے کی ترغیب دیتے تھے۔ کچھ دن تو میں طبعاً اُن کی اتباع کرتا رہا مگر تھوڑے ہی دنوں میں یہ صورت ہو گئی کہ سونے کی حالت میں عبادت کی مقدس ساعت کا تصور کابوس بن کر میرے دل و دماغ پر مسلط رہنے لگا۔ لہٰذا میں نے عقب والے برآمدہ میں گاندھی جی سے تقریباً پچاس گز فاصلے پر اپنا بستر اجمایا۔ یہاں سوا ایک وارڈ کے جو صبح آجاتا تھا اور کسی کی رسائی نہ تھی۔ مگر وارڈ کو مہاتما کی طرح زبردستی جگا دینے کی قدرت تو تھی نہیں۔ اگرچہ تھوڑے ہی دنوں میں میں نے گاندھی جی کے ساتھ پوجا میں شریک ہونا بند کر دیا تھا۔ تاہم جیل کے زمانے میں تقریباً برابر سویرے اُٹھ جاتا تھا۔ ہاں اس میں بہت زیادہ پابندی نہیں رہ گئی تھی۔ وقت بے وقت ناغہ ضرور ہو جاتا تھا۔ اپنے اس زبردست رشی کی ہمراہی میں چند ہفتوں کی شام کی چہل قدمی اور صبح کی پوجا نے میرے دماغ میں مسیحی خانقاہوں اور بدھ مت کے دھاروں کا جو تلازم پیدا کر دیا تھا۔ وہ روزمرّہ کی پوجا میں شرکت بند کر دینے اور صبح خیزی کی پابندی ختم کر دینے کے بعد بھی زائل نہ ہوا۔

ایک مرتبہ جب ہم لوگ اس کشادہ چمن میں چہل قدمی کر رہے تھے میں نے گاندھی جی سے کہا کہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ہم پر قرونِ وسطیٰ کی خانقاہی فضا محیط ہو گئی ہے۔ یہ تقابل اُنھیں پسند آیا اور اُنھوں نے راہبوں کے ٹراپسٹی سلسلہ پر تفصیلی بیان شروع کر دیا جس سے جنوبی افریقہ میں اُن کی ملاقات ہوئی تھی کہنے لگے "جب کوئی راہب اس سلسلہ میں داخل ہوتا ہے تو وہ تمام عمر خاموش رہنے کی قسم کھاتا ہے۔ یہ لوگ سویرے دو بجے اُٹھ بیٹھتے ہیں اور طلوعِ آفتاب تک عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔ عموماً باغوں میں اپنے ہاتھ سے محنت کر کے کماتے ہیں کیونکہ بعض خاص مستثنیات کے علاوہ اُنھیں باہر کی دنیا میں آنے جانے کی ممانعت رہتی ہے۔ یہ لوگ مذہبی کتابوں کا مطالعہ بھی کرتے ہیں، اپنی مختصر ضروریات کا اظہار یہ لوگ اشاروں کے ذریعہ کرتے ہیں اور صرف راہبِ اعلیٰ کو یہ حق رہتا ہے کہ اس سلسلہ کے راہبوں سے یا باہر کے آنے والے زائرین سے بات چیت کرے" اِن باتوں سے مجھے بہت آسانی سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ گاندھی جی ان راہبوں کی سادہ اور پیمانوں اور پابندیوں سے گھری ہوئی زندگی کو کتنا پسند کرتے ہیں کیوں کہ اپنی زندگی میں بھی وہ مختلف قسم کے پیمانوں کی پابندی کی بڑی قیمت سمجھتے تھے۔

اسی زمانہ میں ایک قدرے حیرت انگیز اتفاق ایسا ہوا جس سے ٹراپسٹی راہبوں کی یاد اُن کے ذہن میں اور تازہ ہو گئی۔ صبح چار بجے اُٹھنے کی حد سے زیادہ احتیاط برتنے میں ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ بہت ہی پہلے جاگ اُٹھے۔ چوں کہ ہم لوگوں کے پاس کوئی گھڑی نہ تھی اور جیل کے گھنٹوں کے بجنے کے درمیانی وقفہ میں کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ کیا وقت ہے، ہم لوگ بہت سنجیدگی سے دعا و مناجات میں مصروف ہو گئے۔ لیکن جب پوجا ختم کر چکے تو گھنٹے نے تین بجائے۔ لہٰذا ہم اور مسٹر علی تو پھر چارپائی پر جا کر سو رہے مگر گاندھی جی نہیں سوئے بلکہ کتابوں کے مطالعہ میں مشغول رہے اور صبح اُسی باقاعدگی کے ساتھ اپنے معمولات میں منہمک ہو گئے۔ شام کو البتہ جب ہم لوگ کھانے پر جمع ہوئے تو دیکھا کہ گاندھی جی کی آنکھیں سُرخ ہیں۔ جب میں نے اُن سے کہا کہ رات کو تو بالکل ٹراپسٹری راہبوں ہی کی سی حرکت ہوئی جن کا آپ نے چند دن پہلے ذکر کیا تھا تو اس پر وہ بہت زوروں میں ہنسے۔

مگر ہمارے دوست مسٹر علی نے کہا کہ اسے مذاق میں نہیں ٹالنا چاہیے اگر گاندھی جی اس ڈر سے کہ کہیں سویرے کی پوجا نہ

چھوٹ جائے صبح خیزی کی فکر میں یہی کرتے رہے کہ جب آنکھ کھل گئی اُٹھ بیٹھے تو اُن کی صحت برباد ہو جائے گی لہٰذا اُنھوں نے اس موضوع پر گفتگو شروع کی کہ حکام سے گھڑی یا الارم فراہم کرنے کی درخواست کیوں نہ کی جائے لیکن گاندھی جی نے یہ کہکر کہ ہم قیدی ہیں ہمیں اس قسم کے اسباب راحت کا سوال نہیں کرنا نہیں چاہیے اس تجویز کو بالکل مسترد کر دیا۔ مگر مسٹر علی اپنی بات پر جمے رہے یہاں تک کہ آخر کار گاندھی جی اس پر رضامند ہو گئے کہ ریت گھڑی کے لیے کہنے میں چنداں مضائقہ نہیں۔ مگر فوراً ہی ہماری سمجھ میں آگیا کہ ریت گھڑی سے کوئی نتیجہ نہ ہوگا کیوں کہ اس سے یہ تو پتہ چل ہی نہیں سکتا کہ کے بجے ہیں۔ لہٰذا یہ قصہ ختم ہو گیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی ہم نے گاندھی جی سے یہ وعدہ بھی لے لیا کہ اگر آنکھ کھل جائے تو وہ چارپائی پر بیٹھے رہیں اور جب تک چار بجے کا گھنٹہ نہ سُنائی دے پوجا پاٹ کے لیے نہ اُٹھیں۔

روزانہ کی جسمانی محنت نے میرے ذہن میں خانقاہیت کے احساس کو اور شدید کر دیا تھا۔ میں نے بید کا کام شروع کر دیا تھا اور گھنٹہ دو گھنٹہ اس میں مشغول رہتا تھا۔ لیکن چکّی کا کام کرنے والوں کو کام پورا نہ کرنے پر سزائیں ملتی رہنے کی اطلاعیں مجھے برابر ملتی رہتی تھیں، مجھے بھی شوق ہوا کہ ذرا میں بھی چکّی چلا کر دیکھوں کیسا کام ہے۔ اس سے یہ بھی ہوگا کہ مجھے اپنے کھانے بھر کے لیے اپنے ہی ہاتھوں کا پسا ہوا آٹا مل جایا کرے گا۔ گاندھی جی نے میرے اس خیال کی بہت گرم جوشی کے ساتھ تائید کی۔ کیوں کہ اُنھوں نے جنوبی افریقہ میں کافی دنوں چکّی پیسی تھی اور اب بھی اپنے سن وسال کے باوجود بہت خوشی خوشی میرے اس نئے کام میں ہاتھ بٹانے کو تیار تھے۔ لہٰذا گاندھی جی کی استدعا پر داروغہ جیل نے تھوڑے ہی دنوں میں ہمارے نفیس اور کشادہ برآمدہ میں ایک چکّی گڑوادی۔

جس دن میں نے پہلے پہل یہ انوکھا کام شروع کیا تو مجھے ایک بڑی تعجب خیز چیز نظر آئی یعنی یہ کہ چکّی کے چند پھیرے چلانے کے بعد میری تو سانس پھول گئی اور میں تھک کر بے دم ہو گیا مگر گاندھی جی آدھ گھنٹے تک برابر چلاتے رہے۔ بعد میں اُنھوں نے بتایا کہ اس میں طاقت کا زیادہ دخل نہیں ہے بلکہ مشق کی بات ہے اور یہی سبب تھا کہ نسبتاً کم زور ہونے کے باوجود وہ بہت دیر تک چکّی چلا سکتے تھے۔

گاندھی جی کی حوصلہ افزائیوں سے میں نے اس کام کو برابر جاری رکھا۔ تھوڑے دنوں میں اتنا عادی ہو گیا کہ روزانہ چالیس منٹ تک چکّی چلا لیا کرتا تھا۔ اور میری جیل کی زندگی کا یہ ایک مستقل عنصر بن گیا۔ میں جیل سے باہر نکلنے کے بعد اپنی چکّی چلانے کی انوکھی مشق کا بہت فخر کے ساتھ اپنے احباب سے تذکرہ کیا کرتا تھا جس پر اُنھیں بہت حیرت ہوتی تھی۔

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے گاندھی جی کے چند دلچسپ اقوال کا ذکر کر دینا بہت مناسب ہوگا جو اُنھوں نے اپنے عظیم الشان مسلک عدم تشدد اور دنیا کے مذاہب کے متعلق کہے تھے۔ مذہبی و سیاسی مباحثوں کے دوران میں جو ہمیشہ ہوتے رہتے تھے گاندھی جی نے فرمایا۔ "ہمیں عیسائیت کو اُس کے تمام تر محاسن کے ساتھ دیکھنے کا کتنا اتفاق ہوا یا اسلام ہی کو اُس کی بلند ترین صورت میں ہم نے کتنے دن دیکھا ایک کو دو ہزار سال تک، دوسرے کو ساڑھے تیرہ سو برس تک۔ لیکن حیات ارضی کی اس لامتناہی مدّت میں ان چند صدیوں کی کیا حقیقت ہے۔ یہی صورت ہندو مت اور بدھ مت کی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان اس عدم تشدد کو جو تمام مذاہب کا جوہر رہا ہے قبول نہ کرے۔ لیکن دنیا ــــ یہاں وہ عدم تشدد کی جگہ چرخہ پر آ گئے ــــ اسے ضرور قبول کرے گی۔ اگر یہ فی الحقیقت امن و صداقت کا نشان ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بالآخر تشدد کے ذریعہ ہندوستان والے سوراج حاصل کر لیں اور اس طرح حاصل کی ہوئی آزادی موجودہ غلامی سے یقیناً بہتر ہوگی۔ لیکن میرے نزدیک اس کے کوئی خاص معنی نہیں ہوں گے اور ہندوستان اس قابل نہیں ہوگا کہ موجودہ طوفان زدہ اور آفت رسیدہ دنیا کو کوئی پیغام دے سکے۔"

چھپّنواں باب

گاندھی جی کپڑے کی ملیں بند کرا دیں گے

ہم میں سے اکثر نے جیل میں داخل ہوتے ہی سیاست کا روپ قریب قریب چھوڑ دیا اور ابتدائی زمانہ میں چند بار گاندھی جی سے سیاسی موضوع پر جو گفتگو ہوئی وہ ہوئی مگر اس کے بعد ہماری گفتگو کے موضوع بہت مختلف قسم کے غیر سیاسی مضامیں ہوتے تھے۔ مثلاً مذہب، فلسفہ، سماجی اصلاح، تجزیہ، تاریخ وغیرہ وغیرہ۔

یہ ضرور تھا کہ باہر سے بعض وقت جو اتفاقی چیزیں سننے میں آجاتی تھیں اُن سے ہم میں پھر ایک جوش پیدا ہو جاتا تھا۔ مئی ۱۹۲۲ء کے اخیر میں ہم کو کسی طرح خبر ملی کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک جلسہ منعقد ہونے والا ہے تاکہ سوراج پارٹی کے لیے اس کی گنجائش نکالی جائے کہ اس کے افراد آنے والے انتخابات میں مقابلہ کے لیے کھڑے ہو سکیں۔

اس خبر سے گاندھی جی کے سکون میں کوئی فرق نہ واقع ہوا کیوں کہ اُن کو یقین تھا کہ اُن کی رہائی کا وقت آنے تک میں سوراج پارٹی خود اپنی غلطی کا احساس کر کے بھٹکے ہوئے فرزند کی طرح پھر عدم تعاون کے پنجگانہ زرین اُصول کی طرف واپس آچکی ہوگی۔ بہرحال اس کا تو اُنھیں پورا اطمینان تھا ہی کہ ملک میں چرخہ کے پروپیگنڈا میں کوئی خاص کمی نہیں واقع ہوگی۔ اُنھوں نے مسٹر ہنومنت راؤ اور میرے دوست مسٹر بینکر کی مثال دے کر کہا کہ آخر یہ لوگ اتنی دنوں کے انفعال انگیز مصائب کے تجربات حاصل کرنے کے بعد اب کھدر کے کام پر جس کے ساتھ دیگر سماجی ادبی اور سیاسی مشاغل بھی شامل ہیں رجوع ہوئے یا نہیں۔

اس کے بعد وہ ملک کے طول و عرض میں چرخوں کا ایک جال پھیلانے کی بہت سی اسکیموں پر مفصل گفتگو کرتے رہے۔ ان کی خواہش تھی کہ مخلص اور تجربہ کار آدمی ملیں جو دد باد اور مانڈوی جیسے فلاکت زدہ علاقوں میں جا کر بس جائیں اور غریب ترین طبقہ میں چرخہ کا پرچار کریں انھیں طویل مدتوں کی ادائگی والے قرضہ جات حاصل کرنے کا بھی اختیار ہونا چاہیے۔ یہ لوگ کاشتکاروں کو اس بات پر آمادہ کریں گے کہ یا تو خود روئی کی کاشت کریں یا باہر سے منگوا لیں۔

غریبوں کو روئی، چرخہ، اور روئی دُھننے کے اوزار قرض پر دیے جائیں اور کتائی کی مزدوری اُن کے حساب میں مجرا کر دی جایا کرے۔ ابتدائی منازل میں اس کوشش کے سلسلہ میں اگر کچھ مالی خسارہ بھی ہو تو کوئی حرج نہیں۔ کتائی کی مزدوری بڑھا دی جائے تاکہ زیادہ تعداد میں لوگ اس طرف راغب ہوں کاتنے والوں کو اس کی ترغیب ضرور دی جائے کہ وہ کھدر پہنا کریں مگر ابتدائی زمانہ میں اسے کوئی لازمی شرط نہ قرار دیا جائے۔

پھر بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ ایسے فلاکت زدہ حلقوں میں جب اتنی کثیر مقدار میں کھدر تیار ہوگا تو اسے خریدے گا کون۔ ظاہر ہے کہ نیم عریاں بھیل یا فاقہ کش کالی پرجا اسے خریدنے سے رہے۔ یہ لوگ اپنی ضرورت کے لیے مل کا سستا کپڑا خریدنا زیادہ پسند کریں گے۔ لہٰذا گاندھی جی کے اس واہمہ کے پورے ہونے کی کوئی سبیل نہیں کہ ان علاقوں کو "خود کفیں" بنا دیا جائے۔ لامحالہ کاتنے

والوں کو کافی حد تک متوسط اور خوش حال طبقوں کا محتاج ہونا پڑے گا اور یہ محتاجگی روزمرہ بڑھتی جائے گی۔ لیکن آخر متوسط اور خوش حال طبقہ یہ زحمت کیوں مول لے گا کہ ناہموار سوت کا موٹا کھدر خریدے جب کہ اس سے بہت کم قیمت پر احمد آباد اور بمبئی کی ملوں کے بنے ہوئے کپڑے دستیاب ہو سکتے ہیں؟

میں نے اس مسئلہ کے ہر پہلو پر خود کافی غور کیا مگر مجھے ہندوستان کی موجودہ اقتصادی زندگی میں چرخہ کی کوئی گنجایش نظر نہیں آئی اور مجھے یقین ہو گیا کہ گاندھی جی کی پراچینی اقتصادیات ہی کے ساتھ چرخہ قائم رہ سکتا ہے۔ مگر اس زمانہ میں جب کہ ملک کے غیر ترقی یافتہ طبقے بھی آئے دن نت نئی مشینوں کی یورش سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے، اس سلک کے فروغ پانے کا کیا امکان ہے۔ اور اگر گاندھی جی کا "ہند سوراج" میں پیش کیا ہوا نقشہ ہی موجودہ حالات میں مرتب نہیں ہو سکتا تو ایک چرخہ ہی کیونکر ایسی زمین میں فروغ پا سکتا ہے جو ریلوں اور کارگاہوں کے بارے بوجھل ہو رہی ہے۔

لہٰذا چند ہی دنوں کے بعد میں نے اس موضوع پر گاندھی جی سے سوالات کا نیا سلسلہ چھیڑ دیا۔ "کیا چرخہ کے رواج کو عام کرنے کے لیے آپ کے نزدیک یہ اشد ضروری نہیں ہے کہ ہندوستانیوں کی پوری نفسیات میں ایک انقلاب پیدا کیا جائے؟" انھوں نے جو کچھ جواب دیا وہ کم و بیش یہ تھا: "اگر مشینری کی یورش زندگی کے دوسرے شعبوں پر ہوتی رہے تو مجھے چنداں فکر نہیں ہے لیکن کوئی مشین کپاس کو کپڑا تیار ہونے تک کی کسی منزل میں نہ چھوئے" "ہندوستان کے لاکھوں غریب اگر نجات پا سکتے ہیں تو اُس کی یہی واحد صورت ہے"۔ اس کے بعد اُنھوں نے اس کا ذکر شروع کیا کہ "بہت سے یورپین ممالک نے شکر اور نیل کی خانگی صنعتوں کو بڑی بڑی رقمیں خرچ کر کے فروغ دینا شروع کیا ہے بلکہ پُرانی خانگی حرفتوں مثلاً اسکاچ ٹوئیڈ وغیرہ کو بھی ترقی دینے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ وہ باہر کی تجارتی مسابقت کے باوجود قائم رہ سکیں کیا انگلستان نے خود ڈھاکہ اور مرشدآباد کی عمدہ ململ اور ریشم کا نہایت بے دردی کے ساتھ مقاطعہ نہیں کیا" اس جواب نے میرے لیے اور بہت سی نئی مشکلات پیدا کر دیں کیوں کہ اس قسم کی امداد عموماً ایک معینہ مدت کے لیے صرف اس خیال اور اس توقع سے دی جاتی ہے کہ یہ صنعتیں تھوڑے دن میں بازار میں بیرونی مال سے برابر کا مقابلہ کر سکیں۔

میں نے کہا "فرض کیجیے کہ ہم کھدر کے کاروبار کو فروغ دینے کے لیے پندرہ بیس یا تیس سال تک روپیہ برابر خرچ کرتے جائیں اور کروڑوں روپیہ خرچ کر دیں۔ کیا آپ مستقبل میں کسی ایسے زمانے کا تصور کر سکتے ہیں کہ یہ محبوب صنعت کاروباری اصول پر آپ منظم ہو جائے کہ ہندوستانی ملوں کے بنے ہوئے کپڑوں سے مقابلہ کر سکے۔"

اس موقع پر ایک عجیب بات ہوئی۔ اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ اور غالباً آخری مرتبہ گاندھی جی نے صاف لفظوں میں اعتراف کیا کہ "کھدر کے مسئلہ کے اس خاص پہلو پر میں نے کبھی غور نہیں کیا"۔ اس کی وجہ اُنھوں نے یہ بیان کی کہ "چوں کہ میں عموماً لوگوں کا مذاق بدلنے میں منہمک رہا اس لیے مسابقت کے سوال پر زیادہ غور نہیں کر سکا لہٰذا مجھے کچھ وقت ملنا چاہیے۔"

دوسرے ہی دن شام کے وقت اُنھوں نے میرے سوال کا جواب دیا۔ میرے اصل سوال کا جواب نفی میں تھا۔ کیوں کہ انھوں نے فرمایا کہ "یہ تو کہا ہی نہیں جا سکتا کہ بیس سال کے بعد کھدر، مل کے کپڑوں کا مقابلہ کر سکے گا"۔ اس جواب کو سُن کر انسان یہ سمجھ سکتا ہے کہ کھدر کا مسئلہ گویا ہمیشہ کے لیے حل ہو گیا۔ مگر گاندھی جی کے لیے یہ صورت نہ تھی اور اس خوف سے کہ مبادا اُن کی صاف گوئی شکست کے مرادف سمجھی جائے اُنھوں نے کھدر کی گرتی ہوئی عمارت کو سنبھالنے کی کوشش میں عجیب عجیب دلائل پیش کرنے شروع کر دیے جو نہ پہلے سننے میں آئے تھے اور نہ کبھی اس کے بعد، مثلاً:۔

"سوراج حاصل کرنے کی صرف یہی صورت ہے کہ سودیشی کا پرچار اور برطانوی مال کا مقاطعہ مکمل طریقہ پر کیا جائے۔ لہٰذا جب تک آزادی نہ حاصل ہو کھدر کو فروغ دینے کے لیے جو کچھ بھی خرچ کرنا پڑے کم ہے۔

سوراج حاصل ہونے کے بعد اگر مجھے جمہوریۂ ہندیہ کا صدر یا وزیر اعظم بنا دیا جائے تو میں کھدر کی نوزائیدہ صنعت کو قائم رکھنے اور ترقی دینے کے لیے حسب ذیل طریق کار اختیار کروں گا:۔

(۱) تمام بدیشی کپڑوں کی درآمد غیر مشروط طریقہ پر بند کر دوں گا۔

(۲) ہندوستانی ملوں کو سوتی کپڑے تیار کرنے سے قطعاً روک دوں گا۔

(۳) بدیسی اور مل کے بُنے ہوئے کپڑوں کا جتنا کچھ بھی ذخیرہ ملک میں ہوگا اُسے دوسرے ملکوں کو روانہ کردوں گا۔

(۴) اس طرح ہر قسم کی مسابقت کا دروازہ بند کرنے کے بعد ہندوستان کی تمام کپڑوں کی ملوں کو قومی سرمایہ قرار دے دوں گا۔ اس کے بعد یا تو انھیں اُکھڑوا دوں گا یا کسی دوسرے مصرف کے لیے کارآمد بنوا دوں گا تاکہ بھارت کے مقدس ملک میں کوئی مشینری روئی یا سوت کو چھوکر اُسے نجس نہ کر سکے۔"

اس دلیرانہ اور دُور رس منصوبہ نے مجھے بالکل ہکا بکا کر دیا۔ بہرحال میں تے دو چار منٹ میں اپنے ہوش و حواس درست کر کے ان سے دریافت کیا کہ کیا آپ جیل سے رہا ہونے کے بعد اپنے ان خیالات کو نشر کرنے کا بھی ارادہ رکھتے ہیں۔ کیوں کہ میں نے سوچا کہ آیندہ صرف اُن لوگوں کو گاندھی جی کا اتباع کرنا چاہیے' جو قوم کی نشاۃ ثانیہ کے متعلق گاندھی جی کے ان وہمی منصوبوں سے ہمدردی رکھتے ہوں۔

گاندھی جی کا جواب جیسا کہ اس قسم کے موقعوں پر عموماً ہوا کرتا ہے، بہت مبہم تھا۔ اُنھوں نے فرمایا کہ میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا کیونکہ میں دوسرے سیاسی رہنماؤں کی طرح اپنے تمام مقاصد اور طریق کار کے متعلق قبل از وقت جامع اور مانع اعلان کرنے کا قائل نہیں لہٰذا میں اپنے منصوبوں کے ضروری حصوں کو حسب موقع جیسے جیسے کام کے سلسلے میں ضرورت پڑتی جائے گی بالاقساط شائع کرتا جاؤں گا۔

دس سال ہو چکے کہ گاندھی جی نے جیل کی تنہائی میں کھدر کی صنعت کو فروغ دینے کا یہ عجیب و غریب منصوبہ مجھ سے بیان کیا تھا لیکن اب تک اس منصوبے کی تفصیلات کی کوئی قسط اُنھوں نے پیش نہیں کی۔ ہندوستان میں پچھلے پچاس سال کے اندر پارچہ بافی کی صنعت نے جو کچھ ترقی کی ہے اُس کو تباہ کرنے کا منصوبہ اگرچہ اُن کے ذہن میں اب بھی موجود ہے۔ لیکن اُن کی "سدیشی اور مقاطعہ کی مہم" نے ہندوستان میں بہت سی ملوں کا اور اضافہ کر دیا ہے اور مل چلانے والوں کی منفعت میں بھی کافی ترقی ہوگئی ہے۔

چھپنواں باب (الف)

ہم نے اپنے دماغ سے سیاست کا خیال نکال دیا تھا اور اپنی گفتگو میں اس کا ذکر تک نہیں آنے دیتے تھے لیکن گاندھی جی کے ذہن سے یہ چیز نہیں نکلتی تھی۔ شروع شروع میں تو انھیں اپنی ذات کے لیے چند مراعات حاصل کرنے کے سلسلے میں کئی بار جیل کے حکام سے لڑنا پڑا۔ اس میں کئی مہینے لگ گئے۔ اس کے بعد اپنے ساتھ کے قیدیوں کی آرام و آسایش کے لیے اُنھیں ہمیشہ حکام سے کچھ نہ کچھ حجت کرنی پڑتی تھی۔ اس کے علاوہ ملک کی سب سے بڑی قومی جماعت کے رہنبر اعظم ہونے کی حیثیت سے گاندھی جی یروداجیل کے دوسرے سیاسی قیدیوں کے ساتھ (جن کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی تھی) جو کچھ عام برتاؤ ہوتا تھا یا جو خاص سزائیں دی جاتی تھیں اُن سے بھی بے تعلقی نہیں برت سکتے تھے۔

جیل میں معمولی ترک موالاتی قیدیوں کی تعداد تو اس وقت کچھ زیادہ نہ تھی لیکن ملشی پیٹا ستیہ گرہیوں کی تعداد اور اہمیت البتہ روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ یہ ستیہ گرہ اس بنا پر شروع کی گئی تھی کہ ٹاٹا الکٹرک کمپنی ملشی پیٹا کے باشندوں کے مکانات لے کر ایک قریبی دریا میں بند باندھنا چاہتی تھی۔ جیسے ہی ٹاٹا کے منصوبے کا لوگوں کو علم ہوا سارے مہاراشٹر میں حب الوطنی کے جذبات انتہائی طور پر مشتعل کر دیے گئے اور مقامی اور صوبائی لیڈروں کی ایک خاص ستیہ گرہ کمیٹی بنائی گئی، تاکہ اگر تمام دلائل اور درخواستوں کے باوجود ٹاٹا کمپنی اپنے ارادوں سے باز نہ آئے تو غیر جارحانہ مدافعت کی مہم شروع کر دی جائے۔ اگرچہ اس کمیٹی نے اپنے پروپیگنڈا یا گفت و شنید یا مہم کی کسی منزل پر بھی نیشنل کانگریس سے رجوع نہیں کیا۔ تاہم صرف اس بنا پر کہ اس کمیٹی نے سول نافرمانی کا حربہ استعمال لیا تھا۔ سارے ہندوستان میں اس کا چرچا ہو گیا۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ بہت سے لوگوں نے تو اسے کانگریس تحریک ہی کا ایک شاخسانہ سمجھا۔

یہ قیدی مہینوں سے یرادوا جیل میں آرہے تھے لیکن اُن کا مسئلہ کچھ بہت ٹیڑھا اور پریشان کن سا تھا۔ کیونکہ ان کی مہم اگرچہ سیاسی حیثیت رکھتی تھی۔ تاہم نہ اسے کانگریس نے تسلیم کیا تھا اور نہ اس کی منظوری دی تھی لہٰذا ان ستیہ گرہی قیدیوں کی باغیانہ حرکتوں سے برہم ہو کر حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ ان کے ساتھ ہر حیثیت سے بالکل جرائم پیشہ لوگوں مثلاً چوروں اور قاتلوں کا سا برتاؤ کیا جائے۔ چونکہ ان قیدیوں میں اچھی حیثیت کے اور پڑھے لکھے لیڈر اور نوجوان بھی شامل تھے۔ لہٰذا یہ ملشی پیٹا ستیہ گرہی یرادوہ جیل کی ساری شورشوں کا مرکز بن گئے۔

فروری ۱۹۲۵ء کا مہینہ تھا کہ اس ملشی پیٹا قضیہ میں گاندھی جی کو دخیل ہونا پڑا۔ اس زمانے میں وہ پُرانے احاطہ میں رہتے تھے۔ ایک دن اُنھوں نے سُنا کہ ان میں سے بعض قیدیوں کو کوڑے کی وحشیانہ سزا دی گئی ہے۔ گاندھی جی صحن میں کھڑے ہوئے تھے جب اُنھوں نے دیکھا کہ چار یا پانچ قیدی ٹاٹ کے کپڑے پہنے ہوئے (بظاہر درد کے مارے) جُھک کر چل رہے ہیں۔ اس منظر نے اُن کے شبہات کو یقین سے بدل دیا۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ سزائیں صرف اس جرم پر دی گئی ہیں کہ ان لوگوں نے چکی پیسنے سے انکار کر دیا ہے۔ یا مقررہ مقدار میں آٹا نہیں پیسا۔ اس خبر نے گاندھی جی کو فکر مند کر دیا۔ اس لیے نہیں کہ یہ بڑے اچھے لوگ تھے اور انھیں ناحق کوڑے لگائے گئے، بلکہ اس لیے کہ ان قیدیوں نے جیل کے قواعد کی خلاف ورزی کر کے اس اعلیٰ مسلک یعنی ستیہ گرہ کو بدنام کر دیا تھا۔

گاندھی جی کو جو کچھ کرنا تھا اس کے متعلق وہ جلد ایک فیصلہ پر پہنچ گئے۔ اُنھوں نے طے کیا کہ قیدیوں سے ملنے کی اجازت حاصل کی جائے۔ اور انھیں اس پر آمادہ کیا جائے کہ جیل کے افسران جو حکم دیں اُس کی پابندی کریں تاکہ آئندہ ایسے المناک واقعات کا اعادہ نہ ہو سکے۔ مگر میجر جونس نے گاندھی جی کی یہ درخواست منظور نہ کی، اگرچہ وہ گاندھی جی کے نظریہ سے تھوڑی بہت ہمدردی ضرور رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اگر گاندھی جی اپنے منصوبے میں کامیاب ہو جاتے تو جیل کے نظم و نسق قائم رکھنے میں میجر جونس کو سہولتیں پیدا ہو جاتیں۔ لہٰذا گاندھی جی نے اس موقع پر۔ جیسا کہ وہ تمام اتفاقی صورتوں میں کرتے ہیں۔ ایک دوسری ترکیب سوچی اور اشارتاً اُس شریف میجر کو بھی اپنی ترکیب سے آگاہ کرنے کے بعد اُنھوں نے مسٹر جے رام داس کو (جنھیں دو سال کی سزا ہوئی تھی اور قریب ہی کے کمرے میں رہتے تھے) آواز دی اور اپنے احاطہ کی طرف بلایا۔ گو اس میں اُن حدود سے تجاوز ہونے کا بھی خطرہ تھا جو اُن کے لیے مقرر تھے۔ مسٹر جے رام داس نے گاندھی جی سے ملاقات کی۔ اگرچہ کچھ فاصلہ ہی سے۔ اور اپنے وفادار متبعین کے ذریعہ اُن کا پیغام ملشی پیٹا کے قیدیوں تک پہنچا دیا۔ میرے خیال میں تو اس غیر معمولی طریق کار نے اُن برافروختہ قیدیوں کے قلب پر کوئی سکون آفریں اثر نہیں پیدا کیا۔ لیکن اتنا معلوم ہے کہ اس کے بعد چار مہینے تک کسی اور ہنگامہ کی خبر نہیں ملی۔

لیکن اس مہم کو سر کرنے میں ایک بڑی نازیبا صورت پیدا ہو گئی جیل کے سپرنٹنڈنٹ کو گاندھی جی نے پہلے سے اپنے اس

ارادہ سے آگاہ کر دیا تھا کہ وہ جے رام داس سے بات چیت کریں گے۔ اس اطلاع میں یہ چیز بھی مضمر تھی کہ اس سلسلہ میں رام داس ان مقررہ حدوں کو پار کر کے آئیں گے اور گویا قانون کی خلاف ورزی کریں گے، اس سب کے باوجود سپرنٹنڈنٹ نے جے رام داس کو اس خلاف ورزی قانون کی باضابطہ سزا دی یعنی انھیں مجرم گردانا گیا۔ اور ایک ہفتہ کی قید تنہائی کی سزا دی گئی۔ گاندھی جی نے جب یہ سُنا تو بہت پریشان ہوئے، اس کے متعلق اُنھوں نے میجر جونس سے گفتگو بھی کی۔ مگر اس خلیق اور شیریں زباں افسر نے آسانی کے ساتھ سمجھا دیا کہ "جب جیل کا وارڈر اس جُرم کو باضابطہ میرے علم میں لایا تو باوجود دلی ہمدردی کے میں مقررہ سزا دینے پر مجبور تھا" اتنے پر سارا معاملہ ختم ہو گیا۔ لیکن حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اخباروں میں یہ چیز شائع ہو گئی کہ جے رام داس کو جو سزا دی گئی اُس کے کفارہ کے طور پر گاندھی جی نے اپنے کو بغیر کسی ملکی سزا کے خود سے ایک ہفتہ تک کمرہ میں بند رکھ کر قید تنہائی کی سزا بھگتی۔

ستاونواں باب

رامائن کا بیان

میں نے یہ عزم کر لیا تھا کہ جیل کے قیام کے دوران میں ہندستان کی رزمیہ اور دوسری قدیم کتابیں ضرور پڑھوں گا۔ چوں کہ میرے لیے سنسکرت زبان میں پڑھنا بہت دشوار تھا میں نے اسی پر قناعت کی کہ ان کے موجودہ دیسی زبانوں میں جو ترجمے ہیں اس کو پڑھوں۔ "مہابھارت" اور "شری مدبھگوت گیتا" میں نے گجراتی زبان میں پڑھی "اپنشد" کے اس نسخے کا جس پر شری سنکراچاریہ کی سنسکرت زبان میں تفسیر ہے مرہٹی زبان میں پروفیسر تھانو نے مشرح ترجمہ کیا ہے میں نے اسی پر ترجمہ پر اکتفا کی۔ رامائن جس کا شاعر اعظم تلسی داس نے ہندی زبان میں منظوم ترجمہ کیا ہے مجھے گاندھی جی نے دی دوسری کتابیں بھی وہی دیتے تھے۔ تلسی داس کی رامائن کے گاندھی جی بے حد مداح تھے۔ چند سال پیشتر کمبھ میلا کے موقع پر جب ان سے سوال کیا گیا تھا کہ دنیا کی سب سے اچھی کتاب کون سی ہے تو انھوں نے بلا تامل رامائن کا نام لیا تھا۔ گاندھی جی کو اس زبردست کتاب سے جس قدر شغف تھا وہ مجھے معلوم تھا لہٰذا میں نے اس کتاب کو پڑھنا شروع کیا۔ لیکن اگرچہ گاندھی جی کے عطا کردہ لغت سے بھی مدد لیا کرتا تھا تاہم یہ کتاب پوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آتی تھی اس کی پہلی فصل جس کو بال کھنڈ کہتے ہیں اور جس میں رام اور ان کے بھائیوں کے بچپن کا ذکر ہے خصوصاً بہت مشکل سے سمجھ میں آتی تھی ایک طویل گفتگو کے دوران میں گاندھی جی نے اپنے چند ذاتی اور خاندانی واقعات بتانے شروع کیے کہ تلسی داس کے رامائن سے انھیں کیوں کر اتنی دلچسپی ہو گئی۔

اس قصے کو انھوں نے اپنے دادا اُتم چند گاندھی کے تذکرہ سے شروع کیا جو ریاست پوربندر کے وزیر اعظم تھے (گاندھی جی پوربندر ہی میں پیدا ہوئے تھے) جیسا ان صوبوں میں عموماً ہوا کرتا ہے اُتم چند گاندھی جنھیں اُتا گاندھی کہتے تھے ایک مرتبہ معتوب ہو گئے اور اُنھیں پوربندر چھوڑ دینا پڑا۔ گاندھی جی کے آبائی مکان پر جو پوربندر میں ہے ان گولیوں کے نشانات اب تک موجود ہیں جو ریاست کی فوج کی طرف سے چلائی گئی تھیں یہاں سے بھاگ کر انھوں نے کٹھیانہ میں پناہ لی اور نواب صاحب جوناگڈھ کے پاس جا کر انھیں بائیں ہاتھ سے سلام کیا۔ جب وجہ پوچھی گئی تو انھوں نے فرمایا کہ میرا داہنا ہاتھ پوربندر کے لیے وقف ہو چکا ہے "نواب صاحب نے پوچھا" مگر وہاں کے راجہ سے تو تمہارا جھگڑا ہو گیا ہے" انھوں نے جواب دیا۔ "ہاں یہ ٹھیک ہے لیکن میں نے اپنی زندگی کے اتنے سال ان کی ملازمت میں بھی تو گزارے ہیں"

وہ جوناگڑھ میں ملازم ہو گئے اور کئی سال وہاں عزت و ناموری کے ساتھ ریاست کا کام کرتے رہے یہاں تک کہ پوربندر کے راجہ نے خوش ہو کر انھیں واپس بلا لیا۔

گاندھی جی کے والد کرم چند۔ گاندھی نے بھی اسی ریاست میں ملازمت شروع کی۔ بعد میں راج کوٹ کے

پولیٹکل ایجنٹ کی درخواست پر ان کی خدمات ایجنسی کورٹ کے اسیسر کی حیثیت سے راج کوٹ میں منتقل کر دی گئیں۔ وہ جلد ہی ترقی کر کے راج کوٹ کے دیوان ہو گئے۔ ایک مرتبہ ایجنٹ نے والی راج کوٹ کی شان میں کچھ نازیبا الفاظ کہے اس پر انھوں نے ایجنٹ کی سخت مخالفت کی جس سے وہ بہت برہم ہو گیا اور کہنے لگا "تم میری مخالفت کرتے ہو حالانکہ میری ہی مہربانی کا نتیجہ ہے کہ تم ریاست کے دیوان ہو گئے ہو" انھوں نے جواب دیا کہ کچھ بھی ہو مگر میں راجہ کا ملازم ہوں اور ان کی شان میں کوئی نازیبا الفاظ نہیں سن سکتا۔ پولیٹکل ایجنٹ اس پر بہت غصہ ہوا اور ان کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ لیکن کرم چند اپنی بات پر اڑے رہے اور بعد میں رہا کر دئے گئے۔ جب ان سے کہا گیا کہ آئندہ احتیاط رکھیں تو انھوں نے بہت دلیری سے جواب دیا "جو کچھ میں نے اب کیا ہے وہی آئندہ بھی کروں گا۔"

کیا گاندھی جی کی اسی عادت میں کہ خواہ کتنا ہی زبردست خطرہ کیوں نہ ہو، حق پر دلیری اور سختی کے ساتھ جمے رہیں گے کافی حد تک موروثی اثر کارفرما نہیں ہے؟

انھیں کے ایک مورث اعلیٰ تھے جنھوں نے پوربندر میں رام جی کا مندر بنوایا تھا۔ ان کے چچا دن بھر اسی میں رہتے تھے اور صرف سونے کے لیے گھر میں آتے تھے۔ ان کے والد اور بڑھے ہوئے تھے۔ وہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں شب و روز اسی مندر ہی میں رہتے تھے اور انھیں نے اس مندر میں تلسی داس کی رامائن پڑھوانے کا سلسلہ جاری کیا تھا لدھا رام شاستری نامی ایک برہمن تھے جو نہایت خوش الحانی سے رامائن پڑھتے تھے اور اس کی مفصل شرح بھی بیان کرتے جاتے تھے۔ گاندھی جی کو ہندوستان کی اس زبردست مذہبی کتاب سے جو شغف ہے اس کی شروعات نوعمری ہی کے زمانہ میں یہیں سے ہوئی تھی ضمناً گاندھی جی نے ایک دلچسپ کرامت کا بھی قصہ سنایا لدھا رام مذکور کو کئی سال سے کوڑھ کی بیماری تھی۔ اس زمانہ میں وہ بیلیشر کے مندر میں رہا کرتے تھے جو پوربندر سے تقریباً دس میل کے فاصلہ پر تھا۔ بیماری سے نجات پانے کے لیے یہ بیل کی ان پتیوں کا جو شیو جی کے مورتی پر پوجا کے وقت چڑھائی جاتی تھیں اپنے جسم پر لیپ لگایا کرتے تھے اور دن بھر رام کا نام جپتے رہتے تھے کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ انھیں پتیوں کے لیپ اور رام نام کے جاپ نے ان کا کوڑھ دور کر دیا۔ اس طرح سے لدھا رام کو رام جی سے اور تلسی کے رامائن سے بیحد عقیدت ہو گئی۔

جب گاندھی جی ولایت سے بیرسٹر ہو کر راج کوٹ واپس آئے انھوں نے ان کتابوں سے اپنا شغف اور بڑھا دیا انھوں نے ایک برہمن کو رکھ لیا جو روزانہ شام کو ان کے بچوں اور خاندان کے دیگر افراد کو تلسی داس کی رامائن پڑھایا کرتا تھا۔ اس وقت گاندھی جی کو رامائن کی ابتدائی دونوں فصلیں بہت مشکل معلوم ہوتی تھیں لہٰذا انھوں نے برہمن سے کہا کہ ان کو جلدی جلدی پڑھ کر آگے بڑھو۔

جنوبی افریقہ کے قیام کے دوران میں انھوں نے تیسری مرتبہ اس کتاب کی طرف توجہ کی اس زمانہ میں وہ خود رامائن پڑھ کر اپنے ٹالسٹائے فارم کے لوگوں کو سنایا کرتے تھے اس کتاب کی قدر و قیمت کے متعلق گاندھی جی کا اتنا اچھا خیال قائم ہوا کہ انھوں نے "انڈین اوپی نین" میں گجراتی زبان میں اس کا خلاصہ شائع کیا۔

رامائن کی پہلی اور دوسری فصلوں کے متعلق گاندھی جی نے جو رائے قائم کی تھی اس میں رفتہ رفتہ تبدیلی پیدا ہو گئی۔ اس موضوع پر جب مجھ سے ان سے جیل میں گفتگو ہوئی تو انھوں نے اعتراف کیا کہ دنیائے ادب میں 'بال کھنڈ' اور 'اجودھیا کھنڈ' سے زیادہ شیریں کوئی چیز نہیں ہے۔ جب میں نے خود دوسری فصل کا مطالعہ کیا تو مجھے بھی گاندھی جی کی رائے سے اتفاق کرنا پڑا۔ رام اور کوشلیا کا حیرت انگیز مکالمہ پڑھنے کے بعد تو بالکل آنسو نہ ضبط کر سکا اور بے اختیار رو پڑا۔ جب میں نے گاندھی جی سے اس واقعہ کا ذکر کیا تو انھوں نے فرمایا کہ جس وقت رام اپنے ماں سے جدا ہوتے ہیں اس کا بیان پڑھ کر تو انسان آنسو کو روک

ہی نہیں سکتا۔ انھوں نے اس کا بھی صاف لفظوں میں اعتراف کیا کہ اُس حصّہ کو پڑھ کر پہلے جس بے اختیاری سے اُن کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے تھے اب وہ صورت نہیں رہی۔

تلسی رامائن کی ایک نظم لفظ "ست سنگھ" پر ختم ہوتی ہے جس کے معنے ہوئے "صحبت نیکاں" گاندھی جی نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ صحبت نیکان' کے تخیل میں اچھے خیالات کا تصور بھی شامل ہے "ست سنگھ" اپنے معنی کے اعلیٰ مدارج میں گرو یا مرشد صادق کی مریدی کے مرادف ہی۔ گاندھی جی نے اسی سلسلہ میں فرمایا کہ مجھے خود ایک سچے گرو کی تلاش ہے ایک زمانہ میں ایسا محسوس کرتا تھا کہ شاید راج چند شاعر ہی وہ سچے گرو ہیں جن کی مجھے تلاش تھی لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اس معیار پر پورے نہیں اترتے۔

میں نے پوچھا کہ پھر وہ گرو کب تک آپ کو ملیں گے؟ گاندھی جی نے جواب دیا "جب مجھ میں ان کی صحبت سے فیض حاصل کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے" میں نے کہا "جب تک آپ کو وہ گرو نہ ملیں، لوگ کیا کریں"

گاندھی جی نے کہا "اس وقت تک لوگ صرف اسی پر قانع رہیں کہ مذاہب عالم کی مقدس کتابوں میں جو اچھے خیالات اور بلند نصب العین بکھرے پڑے ہیں ان سے وابستہ رہیں"

ہندستان کی مذہبی نشاۃ ثانیہ' کا ذکر کرتے کرتے سسٹر نویدتا، کا ذکر آگیا۔ نئی نسل کے دوسرے ہندستانیوں کی طرح میرے دل میں بھی موصوفہ کی تصانیف پڑھ کر انکا بڑا احترام پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن گاندھی جی نے بہت غیر متوقع طور پر اس کی شدید مخالفت کی اور کہنے لگے کہ میں دو مرتبہ ان سے ملا ہوں ایک مرتبہ کلکتہ میں خود ان کے مکان پر اور دوسری مرتبہ بمبئی میں مسٹر پادشاہ کے یہاں۔ کلکتہ میں تو اس پر انہیں بڑی حیرت ہوئی تھی کہ سسٹر نویدتا انگریزوں کی پوری نسل کو برا بھلا کہہ رہی تھیں اور بمبئی میں جو چیز ان کے لیے باعث تکلیف ہوئی وہ یہ تھی کہ وہ مسٹر پادشاہ کی بوڑھی ماں کو ہندو بنانے کی کوشش کر رہی تھیں مسٹر بادشاہ کی بوڑھی ماں نے یہ جواب دیا تھا کہ تم تو خود بھی اسی مذہب میں نئی نئی آئی ہو۔ مجھ ضعیفہ کو اس مذہب میں جو ابھی چند ہی سال کا ہے لانے کی کوشش کے کیا معنی ہیں۔

اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کر رہا ہے تو بس یہی اتنا تھا جو میں گاندھی جی سے رام کرشن و ویکانند کی ساری تحریک کے متعلق اخذ کر سکا۔ اگرچہ وہ اس سلسلہ کے لوگوں کی سخت نفس کشی اور رہبانیت کے مداح ضرور تھے مگر ذرا محتاط اور محدود تعریف کرتے تھے سسٹر نویدتا کی ذات کے خلاف اُن کے دل میں جو ایک تعصب سا پیدا ہو گیا تھا اس کے علاوہ اور وجوہ بھی تھے جو اس تحریک کی زیادہ مداحی میں مانع ہوتے تھے۔ چونکہ گاندھی جی بھگتی کے جذباتی مسلک کے پیرو تھے اس لیے اس نئی فلسفیانہ مذہبی تحریک کی (جس کی بنا گنگا کے کنارے ڈالی گئی تھی) پوری قدر نہ کر سکتے تھے۔

اٹھاون واں باب

غذا کے لیے جنگ

گاندھی جی تمام دنیا میں ایک درویش اور سیاست داں کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن وہ اس سے زیادہ کچھ اور بھی ہیں، کیوں کہ انھیں غذائیات اور امراض کے فطری طریقۂ علاج کے ماہر ہونے کا بھی دعویٰ ہے۔ اس پر انھوں نے ایک رسالہ بھی تصنیف کیا ہے لہٰذا وہ ہماری صحت کی دیکھ بھال کچھ اس طرح کرتے تھے جیسے مائیں اپنے بچوں کے لیے کرتی ہیں اور غذا اور دوا کے متعلق مشورے بھی دیتے رہتے تھے۔

اس موضوع پر اکثر ہم لوگوں میں بڑی دلچسپ گفتگو ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ شام کے وقت دودھ کی غذا پر گفتگو شروع ہو گئی۔ ان حالات کا تذکرہ میں کر ہی چکا ہوں جن کے ماتحت ۱۹۱۹ء کی بیماری کے بعد گاندھی جی نے بکری کا دودھ پینا شروع کر دیا تھا اگرچہ وہ دودھ کو ایک قسم کی لحمی غذا قرار دے کر اس کے استعمال سے ہمیشہ کے لیے پرہیز کرنے کا عہد کر چکے تھے۔ اب بھی اگرچہ وہ بکری کے دودھ استعمال کرتے تھے تاہم اسے قطعاً پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ مجھے اس کا پورا یقین ہے کہ دودھ کا کوئی نہ کوئی ایسا بدل ضرور دریافت کیا جا سکتا ہے جو اتنا ہی سریع الہضم ہو اور اتنی ہی غذائیت بھی رکھتا ہو۔ انھوں نے فرمایا۔ میں پہلے مونگ پھلی کھایا کرتا تھا مگر اب نہیں ہضم کر سکتا۔ مجھے بڑی مسرت ہوتی اگر میں اپنی تمام عمر کسی ایسی چیز کی دریافت کے لیے تجربہ کرتا رہ جاتا جو دودھ کی طرح غذائیت رکھتی ہو اور اس سے بھی زیادہ زود ہضم ہو۔ غالباً مونگ پھلی سے یا اور کسی قسم کے پھل یا گری سے اس طرح کی چیز ضرور تیار کی جا سکتی ہے۔ میں خود اپنے جسم پر تجربات کی مشق کرتا لیکن کسی نہ کسی طرح میرے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ میری زندگی کا خاص مقصد ستیہ گرہ ہے (ستیہ گرہ کے لغوی معنی حق پر جمے رہنے کے ہیں جس میں یہ بھی شامل ہے کہ تمام سیاسی اور اقتصادی مسائل کا تصفیہ پُر امن طریقہ پر کیا جائے) اور میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنی ساری زندگی اسی کی تبلیغ کے لیے وقف کر دوں گا۔ لہٰذا اب امید نہیں رہی کہ میں خود اس جنم میں دودھ کا کوئی بدل تلاش کر سکوں۔

پس گاندھی جی کی تمام جد و جہد کا مقصدِ اصلی سوراج نہیں بلکہ ستیہ گرہ تھا اور ستیہ گرہ میں ان کے نزدیک چرخہ کا مسلک ناگزیر طور پر شامل ہے۔ چرخہ کا چکر ان کے تخیل میں امن و صداقت کے توام اصولوں کا مجسمہ نظر آتا ہے۔ لہٰذا ایک مرتبہ پھر جیل کی تنہائیوں میں گاندھی جی اور ہندستان کے سیاسی روشن دماغوں کے درمیان اختلاف مقصد کی کشمکش کا نقشہ میری نظر کے سامنے آ گیا۔ گاندھی جی ہندستان اور اس کی سیاسی آزادی کے پورے مسئلہ کو ستیہ گرہ کے اصول کا ایک تجربہ سمجھتے ہیں، اور اس کے برعکس سیاسی ہند نے ستیہ گرہ کو قومی آزادی حاصل کرنے کے مختلف ذرائع میں سے محض ایک۔ غالباً سب سے بہتر — ذریعہ سمجھا تھا۔

میں غذائیت کے موضوع کی طرف پھر رجوع ہوتا ہوں۔ میرا ہاضمہ درست کرنے کیلئے تو گاندھی جی اپنی سادہ دوائیں تیار کرتے اور دیتے ہی رہتے تھے مگر انھیں قدرتاً مسٹر علی کے متعلق زیادہ تشویش تھی۔ اُن کا خون خراب تھا اور ان کے نحیف و نزار جسم پر عرصہ سے دانے نکلتے رہتے تھے۔ گاندھی جی انھیں اس بیماری سے نجات دلانا چاہتے تھے لہٰذا انھوں نے مسٹر علی پر غذائیات اور فطری علاج کا تجربہ شروع کیا۔ اور ایسے انہماک و مستعدی سے شروع کیا کہ یہ علاج "خانگی معالجہ" کی حد سے گذر کر سیاسیات کی سرحدوں میں پہنچ گیا۔

گاندھی جی نے مسٹر علی کے لیے پہلا نسخہ یہ تجویز کیا کہ وہ اپنے سر کے بال منڈوا دیں۔ اس نسخہ کو تجویز کرنے میں ظاہر ہے کہ گاندھی جی کو کوئی تردد نہ ہو سکتا تھا کیوں کہ وہ خود سر منڈاتے تھے۔ البتہ سر کے بیچوں بیچ میں تھوڑے سے بال (چوٹیا) چھوڑ دیتے تھے۔ جب یہ ہو گیا تو گاندھی جی نے کہا کہ اس چکنے سر پر کھٹے لیموں کا عرق اور زیتون کا تیل لگایا کرو۔ جب کئی روز تک یہ سلسلہ جاری رہا تو مسٹر علی نے سر میں سوزش آمیز درد کی شکایت کی مگر اس پر ان سے کہا گیا کہ صبر سے کام لو۔ گاندھی جی نے مسٹر علی کو یہ بھی مشورہ دیا کہ اگر جلد اچھے ہونا چاہتے ہو تو نمک کا استعمال ترک کر دو۔

بہر حال ان ترکیبوں سے کوئی افاقہ نہ ہوا۔ لہٰذا گاندھی جی نے کہا کہ دال ترکاری وغیرہ بند کر دو اور صرف روٹی۔ دودھ۔ اور تازہ پھلوں کا استعمال کرو۔ مسٹر علی رضامند ہو گئے۔

میجر جونس سے کہا گیا کہ ان کے راشن میں اسی کے مطابق تبدیلی کر دی جائے۔ میجر جونس دودھ کی مقدار بڑھا دینے پر تو فوراً راضی ہو گئے مگر پھل دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ گاندھی جی کو صرف طبی ضروریات کے ماتحت پھل ملتا ہے۔ مگر گاندھی جی مصر رہے کہ نہیں پھل ضرور ملنا چاہیئے کیوں کہ زیادہ مقدار میں دودھ استعمال کرنے پر بطور مصلح کے پھلوں کا استعمال ضروری ہے۔ اس پر میجر جونس نے جواب دیا کہ "اگر مسٹر علی ٹھنڈا دودھ استعمال کریں تو پھلوں کی ضرورت نہیں ہوگی" گاندھی جی نے فوراً بات پکڑ لی اور کہنے لگے "اچھا تو میں بھی کل سے پھل بند کر دوں گا اور ٹھنڈا دودھ استعمال کرنا شروع کر دوں گا"۔ یہ سن میجر صاحب کو ذرا تشویش ہوئی اور انھوں نے گاندھی جی سے اصرار شروع کیا کہ آپ کی صحت ویسے ہی خراب ہے آپ کے لیے پھلوں کا استعمال جاری رکھنا اشد ضروری ہے مگر گاندھی جی اپنی بات پر اڑے رہے اور کہنے لگے "کوئی ہرج نہیں میرے لیے تو بہت دلچسپ چیز ہوگی کیوں کہ اس سے مجھے صرف دودھ پر زندہ رہنے کا تجربہ حاصل کرنے کا موقع مل جائے گا اور اس قسم کے تجربہ کا خیال مجھے پہلے ہی سے تھا"

لہٰذا گاندھی جی نے روزانہ صرف دو سیر ٹھنڈے دودھ پر گذارا کرنے کا خطرناک تجربہ شروع کر دیا۔ مسٹر علی نے اپنی غذا بدستور جاری رکھی۔ جیسا ہم لوگوں کو اندیشہ تھا ایک ہی ہفتہ میں ان کا وزن ۱۰۴ پونڈ کے بجائے ۱۰۱ پونڈ رہ گیا۔ اب میجر جونس بھی دبے لیکن گاندھی جی نے ان سے کہا "اگر آپ کی اجازت ہو تو میں ابھی اس تجربہ کو جاری رکھنے کے لیے تیار ہوں کیوں کہ صرف تین پونڈ وزن گھٹنے سے مجھے کوئی تولیش نہیں ہے"۔ لیکن میجر جونس طے کر چکے تھے اور کہنے لگے "نہیں صاحب میں اس خطرناک تجربے کے جاری رہنے کی ذمہ داری لینے کے لیے قطعاً تیار نہیں ہوں۔ آپ پھلوں کا استعمال پھر شروع کیجئے مسٹر علی کو بھی حسب خواہش پھل دے جائیں گے"۔ اس طرح گاندھی جی نے اپنی بات منوالی۔

اگرچہ یہ بات ناقابل قبول معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت یہی ہے کہ یہ زبردست مہاتما گاندھی جی۔ طبیعتاً پُرخوری کی طرف مائل رہتے ہیں اور چوں کہ انھوں نے رفاہ عام اور ذاتی خدمات کے لیے اپنے جسم کو شدید مشقتوں کا آلۂ کار بنا لینے کا تہیہ کر لیا ہے۔ اس لیے وہ متعدد پیمانوں اور قسموں کے ذریعہ اپنی بے قابو کر دینے والی خواہش غذا کی حد بندی کر کے اپنے اوپر راہبانہ انضباط عائد رکھنا چاہتے ہیں۔

مجھے تو ان کے ساتھ جیل میں رہنے سے پہلے ہی گاندھی جی کے کھانے کی مقدار پر بڑی حیرت ہوا کرتی تھی۔ مثلاً مجھے یہ دیکھ کر

بڑا تعجب ہوا کرتا تھا کہ جس زمانہ میں وہ محض پھل پر زندگی گذارتے تھے اس وقت بے شمار کیلے اور کثیر مقدار میں مونگ پھلی کھا ڈالتے تھے۔ ندیا دیں کیڑا ستیہ گرہ کے موقع پر میں انھیں اتنی روٹیاں اور اتنی کثیر مقدار میں دال اور چاول کھاتے دیکھتا تھا کہ مجھے حیرت ہو جاتی تھی۔ اور اس کا تو انھوں نے اپنی آپ بیتی میں بھی اعتراف کیا ہے کہ بہت زیادہ مقدار میں گیہوں کا دلیا کھا لینے کی وجہ سے انھیں ایسی پیچش ہو گئی تھی کہ اس نے گاندھی جی کو تقریباً موت کے دروازے ہی پر پہنچا دیا تھا۔

لہٰذا مجھے اس کے کہنے میں باک نہیں ہے کہ غذا کے متعلق مسلسل تجربے۔ فہرست طعام میں شدید تبدیلیاں اور خود اپنی تجویز کی ہوئی اشیار کا اتنی کثیر مقدار میں استعمال، یہی سب چیزیں اس ضعف و انحطاط کا باعث ہوئیں جو پچھلے چودہ سال سے ان کے جسم پر طاری ہے۔

اب ہم گاندھی جی کی جیل کی عادات اور اُن کے اعترافات کا ذکر کرتے ہیں۔

غالباً اپنے خاندان کے راج کوٹ والے قصوں کے سلسلے میں انھوں نے ایک پروہت کی پُرخوری کے معرکوں کا تذکرہ کیا تھا جس کو سُن کر ہنستے ہنستے ہم لوگوں کے پیٹ میں بل پڑ گیا تھا۔ گاندھی جی بتاتے تھے کہ یہ شخص ——— میں اس کا نام بھول گیا ہوں ——— جب کسی بڑی دعوت کے لیے مدعو کیا جاتا تھا تو دو دن پہلے سے کھانا پینا چھوڑ دیتا تھا ظاہر ہے کہ اس کے بعد حیرت انگیز مقدار میں لڈو اور گھی ہضم کر جاتا تھا۔

جب ہم لوگ اور خود گاندھی جی بھی، اس پروہت اور اس قسم کے دوسرے پروہتوں کے ان کرتبوں پر خوب جی کھول کر ہنس لیے تو گاندھی جی نے اچانک اُسی روشنی میں اپنے کو دیکھنے کی کوشش کی اور کہنے لگے کہ "لیکن مجھے اس بیچارے نادان برہمن پر ہنسنے کا کیا حق ہے، کیا میں خود کھانے کے معاملے میں بے اعتدالی کا مجرم نہیں ہوں۔ میں خود اتوار کی برت کی کسر پوری کرنے کے لیے صبح کو دُگنی مقدار میں کھانا نہیں کھا لیتا؟" یہاں پہنچ کر ہم لوگوں کی گفتگو نے ذرا سنجیدہ رنگ اختیار کر لیا۔

اس سلسلہ میں میں گاندھی جی کے اتوار کے برت کے متعلق تھوڑی سی تفصیل پیش کر دوں گا جس کے شروع ہونے کے پہلے صبح کے وقت اچھی خاصی پُرلطف دعوت رہا کرتی تھی؛ ہندوؤں کے رسم و رواج کے مطابق کم از کم ۳۶ گھنٹہ کا روزہ ہونا چاہئے لیکن اس کے برخلاف گاندھی جی ہفتہ میں ایک دن چوبیس گھنٹہ کا روزہ رکھتے ہیں جیسا کہ سب کو معلوم ہے۔ ہفتہ میں ایک دن وہ خاموش بھی رہتے ہیں۔ جیل میں یہ دونوں کام عموماً ایک ہی دن میں کر لیے جاتے تھے اور گاندھی جی کو اس میں سہولیت ہوتی تھی کہ اتوار کو روزہ بھی رکھیں اور خاموش بھی رہیں لہٰذا اتوار کو وہ صرف ایک مرتبہ یعنی سات بجے صبح کھانا کھاتے تھے اور سارے دن چرخہ کاتتے رہتے تھے یا پڑھتے رہتے تھے۔

لیکن ان کی اتوار کی فہرست طعام ذرا غیر معمولی ہوتی تھی۔ جیسا میں پہلے لکھ چکا ہوں وہ روزانہ ڈیڑھ سیر دودھ پیتے تھے اور کچھ سنگترے اور لیمو کھاتے تھے۔ اتوار کے روز دودھ اور پھلوں کی مقدار تو وہی رہتی تھی لیکن خشک توس کا اضافہ کر لیا جاتا تھا تاکہ دن بھر کوئی خاص تکلیف نہ ہو۔ یہی اتنا نہیں، مسز گاندھی اکثر ان کے پاس گول پیڑی بھیجا کرتی تھیں۔ یہ ایک قسم کی گیہوں کی روٹی تھی جسے مکھن اور بکری کا دودھ ڈال کر پکایا جاتا تھا۔ اسے وہ خاص طور پر اتوار کے لیے محفوظ رکھتے تھے اور میں بطور میر مطبخ کے اس قسم کی چند روٹیاں پانی میں پکا لیتا تھا تاکہ وہ ایک طرح کا نرم نرم اور گرم حلوا بن جائے اس پر گاندھی جی بری طرح ٹوٹتے تھے۔ لہٰذا گاندھی جی نے اپنے اتوار کے کھانے کے متعلق جس بے اعتدالی کا اعتراف کیا ہے اس میں زیادہ مبالغہ نہیں ہے لیکن اس اعتراف کا بھی اتوار کے کھانے کی مقدار یا اقسام پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا تھا۔

ایک دن گاندھی جی کے پاس تازہ انجیروں کا ایک پارسل آیا ——— ان کے پاس دور و نزدیک سے مختلف قسم کے پارسل آتے رہتے تھے۔ اس میں کچھ انجیر بالکل سڑ گئے تھے اور کچھ سڑنا شروع ہوئے تھے۔ جب ہم لوگ شام کے کھانے

پر بیٹھے تو مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ گاندھی جی نے سب سے زیادہ سڑے ہوئے انجیروں کو کھانے کے لیے منتخب کیا کیوں کہ اُن کا خیال تھا کہ یہ صبح تک بالکل کھانے کے قابل نہ رہ جائیں گے۔ میں اس انتخاب پر کوئی اعتراض کرنے کی جرأت تو نہ کر سکا لیکن اظہار تعجب ضرور کیا۔ گاندھی جی نے کہا "یہ مجھے نقصان نہیں کرے گا" اور بالکل سڑے ہوئے حصوں کو کھرچ کر پھینک دیا باقی کھا گئے۔

صبح کو ۷ بجے کے قریب جب میں نے دیکھا کہ گاندھی جی خلاف معمول بستر پر اوڑھے لیٹے پڑے ہوئے ہیں تو مجھے بڑی حیرت و کلفت ہوئی۔ گاندھی جی نے اپنی کمزور آواز میں فرمایا "سڑے ہوئے انجیر نقصان کر گئے۔ آدھی رات کے بعد میری طبیعت خراب ہو گئی اور قے نیز دیگر ذرائع سے اس کے اخراج کی کوشش کے باوجود مجھے بہت اذیت دہ درد ہوتا رہا"۔

دو ایک روز میں گاندھی جی کی طبیعت ٹھیک ہو گئی۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ انجیر کا ایک اور پارسل آیا اس میں کے انجیر نسبتاً بہتر تھے حسب معمول گاندھی جی نے مجھ سے شام کے کھانے پر پارسل کھلوایا۔ ان میں سے تھوڑے سے میں نے گاندھی جی کو پیش کیے لیکن انھوں نے مذاق کے انداز میں آنکھ جھپکا کر کہا "نہیں شکریہ یہ میرے لیے نہیں ہے۔ اپنی گذشتہ غلطی کے کفارے کے طور پر میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ جب تک جیل میں رہوں گا انجیر نہ کھاؤں گا" مہاتما کے اس زبردست ایثار سے ہم تھوڑے سے محفوظ ہوئے لیکن بہرحال ہم نے ان سے اصرار کیا کہ یہ بہت عمدہ قسم کے انجیر ہیں تھوڑے بہت تو کھائیے۔ مگر گاندھی جی اپنی بات پر جمے رہے اور ہمیں اس لذیذ پھل سے جسے گاندھی جی نے اس فیاضی سے ہمارے سپرد کر دیا تھا پورے طور پر مستفیض ہونے کے لیے ان ۔۔۔۔ کی طرف سے زیادہ اصرار کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔

میں اس باب کو ختم کرنے سے پہلے ایک آخری اور نہایت درد ناک واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں کچھ ایسے اسباب کی بنا پر جن کا ذکر اگلے باب میں تفصیل کے ساتھ کیا جائیگا جیل کے سپرنٹنڈنٹ کی ایک کاروائی کے خلاف جسے وہ نہایت مستبدانہ حرکت سمجھتے تھے انھوں نے ایک قسم کا نیم فاقہ شروع کیا۔ چار ہفتہ تک وہ صرف دودھ پر گزر کرتے رہے ان کا وزن ۱۰۲ پونڈ سے گھٹ کر ۶۷ پونڈ رہ گیا آخر میں وہ کرنل مرے سپرنٹنڈنٹ جیل اور اپنے ساتھیوں کے متعدد اصرار سے پھر راضی ہو گئے اور پھلوں کا استعمال شروع کر دیا۔

لیکن اب وہ دوسری حد پر پہنچ گئے۔ کرنل مرے کی تجویز سے انھوں نے پھل اور دودھ کے علاوہ خشک توس اور تھوڑا سا مکھن کھانا شروع کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا کمزور جسم اس بار کو برداشت نہ کر سکا اور وہ اس منحوس بیماری کا شکار ہو گئے۔ جو پراوداجیل کی گوشہ نشینی چھوڑ کر التہاب زائدہ کے اپریشن کیلئے سیسون اسپتال میں ان کے شہرہ آفاق ورود کا باعث ہوئی۔

انیسواں باب

حکومت سے کامیاب جنگ

جیل کے حکام سے گاندھی جی کی جو سب سے زبردست جھڑپ ہوئی تھی اب میں اس کا بیان شروع کرتا ہوں۔
جون ۱۹۲۳ء کے آخری دنوں کا ذکر ہے، ایک دن گاندھی جی بیٹھے چرخہ چلا رہے تھے۔ ایک وارڈر نے آکر اطلاع دی کہ ملشی پیٹا قیدیوں میں سے چھ کو سپرنٹنڈنٹ نے بید کی سزا دی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں ان کے پاس پہنچا تو وہ حسب معمول چرخہ چلا رہے تھے مگر بشرہ سے دلی تکلیف اور اضطراب کے آثار نمایاں تھے۔ قیدیوں کو بید لگنے کا ذکر انھوں نے مجھ سے بھی کیا۔ جلد ہی روزمرہ کے مطابق ہمارے ڈاکٹر مسٹر مہتا بھی آگئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب اس بید زنی کے واقعہ کا ذکر کرنے کے لیے بہت بے چین ہیں۔ گاندھی جی نہایت صبر سے سنتے رہے اور جب ڈاکٹر صاحب اپنی بات ختم کر چکے تو انھوں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا "اس معاملے کے متعلق مزید تحقیقات کیجیے، اور جلد سے جلد پورے واقعہ کی مکمل تفصیلات سے مجھے مطلع کیجیے"۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی فوراً ہم لوگوں کی طرح سمجھ لیا کہ گاندھی جی کو اس واقعہ سے سخت صدمہ پہنچا۔
ان کے چہرے کی شکنیں اور ان کی خشم گیں آنکھیں صاف ظاہر کر رہی تھیں کہ وہ مکمل تحقیقات ہی پر بس کرنے والے نہیں ہیں بلکہ اس معاملے میں کوئی موثر اقدام بھی ضرور کریں گے ڈاکٹر صاحب اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کر کے بغلیں جھانکنے لگے اور گاندھی جی سے بہت مقدس وعدے کر کے فوراً واپس چلے گئے۔
جب ڈاکٹر صاحب نے شام تک کوئی اطلاع نہیں دی تو گاندھی جی نے فوراً سپرنٹنڈنٹ جیل کے نام ایک خط لکھا اور بید کی سزا کے متعلق تفصیلات چاہیں۔ صبح ہی میجر جونس اور انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات گاندھی جی کے پاس آئے۔ حسب معمول گاندھی جی تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے، اور نہایت ادب کے ساتھ اس واقعہ کی پوری تفصیلات کے لیے درخواست کی سپرنٹنڈنٹ صاحب نے اپنے طرز عمل کا جواز کافی تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔ ملشی پیٹا قیدیوں نے اکادشی کے روز یعنی اساڑھ کے دوسرے پاکھ کی پہلی تاریخ کو برت رکھنے کی اجازت چاہی۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے اس شرط پر اجازت دے دی تھی کہ تمام دن کا کام پورا کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ بھوک کے باعث بعض لوگ اپنا کام پورا نہیں کر پائے۔ اس بنا پر انھیں کچھ ہلکی سزائیں دی گئیں۔ اس خبر کو سن کر چھ ملشی پیٹا قیدیوں نے ان سزاؤں کی بربریت پر احتجاجاً بھوک ہڑتال شروع کر دی تھی میجر صاحب کے نزدیک اس قسم کی حرکت ایک صریحی بغاوت کے مرادف تھی جسے جیل کے حکام ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے لہٰذا میجر صاحب مجبور ہوئے کہ بید زنی کی انسدادی سزا دے کر اس بغاوت کو ختم کیا جائے۔
اس جواب کا گاندھی جی پر جو اثر ہوا اس کا مطالعہ کافی دلچسپ ہوگا۔ اگر سپرنٹنڈنٹ کی بیرحمی پر گاندھی جی کو غصہ نہ آتا تو گویا وہ انسان ہی نہیں تھے لیکن ان کی توجہ محض افسر کے جرم پر نہ تھی بلکہ ستیہ گرہی قیدیوں کی بے ضابطگی پر شاید انھیں

کچھ زیادہ اضطراب تھا کیوں کہ ان کے خیال میں ان دوستوں کی شرافت کا تقاضہ یہ تھا کہ جیل میں جو کچھ کام انھیں دیا گیا تھا اسے پورا کر سکتے اسکا تو انھیں اعتراف تھا کہ بیرت رکھنے والا قیدی اپنا کام آسانی سے پورا نہیں کر سکتا لیکن .... اس کے باوجود وہ اسے زیادہ بہتر سمجھتے تھے کہ وہ چکی میں لگا رہے خواہ اس حالت میں وہ بے ہوش کیوں نہ ہو جائے یا مر ہی کیوں نہ جائے بہ نسبت اس کے کہ کام نہ پورا کرنے پر سزا پائے۔ پھر اگر جیل کے قواعد کی خلاف ورزی کرنے پر ہلکی یا بھاری سزائیں ملیں بھی تو کیا۔ یہ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوا۔ مہاراشٹر کے ان جنگجو اور خشم ناک سپاہیوں کو ایک مزید باغیانہ حرکت پر مجبور کر دیا گیا۔ جب ان کے چند ساتھیوں کو بید کی سزا دی جا چکی تو ان کے بعض لیڈروں نے بھوک ہڑتال کر دی ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا تھا یہاں تک کہ ہماری اطلاع کے مطابق چند ہی دنوں میں ان میں سے تیرہ ۱۳ قیدیوں کو حکومت کے خلاف بھوک ہڑتال کرنے پر قید تنہائی کی سزا دی گئی اور ہمارے احاطہ کے باہر ہی کوٹھریوں میں بند کر دیا گیا۔ اس قسم کی اطلاعیں ہمیں روز بروز ملتی جا رہی تھیں اور ہر تازہ خبر گاندھی جی کو پہلے سے زیادہ فکرمند کر دیتی یہاں تک کہ جو کچھ اس سلسلہ میں انھیں کرنا تھا اس کا انھوں نے فیصلہ کر لیا اور مجھے اور مسٹر علی کو مشورت کیلئے اپنے کمرے میں طلب کیا جون کی ۲۹ تاریخ کو ہم لوگ اس عجیب و غریب کانفرنس کے لیے اکٹھا ہوئے۔

گاندھی جی نے حسب ذیل استدلال پیش کیا۔

"اس وقت ایک ہی سوال ہے جو مجھے پریشان کر رہا ہے۔ اگر دیویداس کو یا با (ان کی اہلیہ) کو اسی قسم کی سزا کے سلسلہ میں علٰحدہ علٰحدہ کوٹھریوں بند کر دیا جاتا تو میں کیا کرتا؟ میں سپرنٹنڈنٹ سے اس بات پر خفا نہ ہوتا کہ اس نے بید کی سزا کیوں دی۔ ان لوگوں کی ہمدردی میں برت بھی نہ رکھتا، لیکن آخر کیا میں بالکل چپ چاپ بیٹھا رہتا؟ میں جانتا ہوں کہ میں یہاں جیل کی حالت درست کرنے کے لیے نہیں آیا اور بحیثیت ستیہ گرہی ہونے کے میرا یہ فرض بھی نہیں ہے کہ میں یہاں کوئی ہنگامہ برپا کر دوں۔ لیکن بہرحال ان سب باتوں کے باوجود مجھے انسانیت سے تو دست بردار نہیں ہونا ہے۔ نہ میں اس ذمہ داری کو نظر انداز کر سکتا ہوں جو مجھ پر خادم انسانیت ہونے کی حیثیت سے عائد ہوتی ہے۔ ان حالات میں میں اپنا یہی فرض سمجھوں گا کہ اگر میرے خیال میں میرا لڑکا اپنی نادانی کی وجہ سے کسی اذیت میں مبتلا ہو گیا ہے۔ تو دلائل و براہین کے ذریعہ اس کو سمجھانے کی کوشش کروں۔ کم از کم اتنا فرض مجھ پر ضرور عائد ہوتا ہے۔ اور حکومت کا فرض ہے کہ وہ مجھے اس سلسلہ میں آسانیاں بہم پہنچائے۔

لیکن اگر گورنمنٹ مجھے ان دوستوں سے ملنے کی اجازت نہ دے؟ اس حالت میں میرے سامنے ایک راستہ رہ جائے گا ——— فاقہ کشی کر کے جان دے دوں، اگر میں قید میں نہ ہوں تو کوئی شورش برپا کر سکتا ہوں لیکن یہاں جیل میں تو میرے پاس ہی ایک علاج ہے کہ فاقہ کشی کر کے جان دے دوں مگر اس کا مقصد حکومت کی مخالفت نہیں ہوگا بلکہ سپرنٹنڈنٹ کی مخالفت بھی نہیں ہوگا — یہ تو محض اپنے روحانی کرب کو تسکین دینے کی ایک صورت ہے کیوں کہ میں اپنے دوستوں کی اذیت کو بے بسی کے ساتھ دیکھ بھی نہیں سکتا۔

اس قسم کا عجیب و غریب استدلال اور اس کی بنا پر انھوں نے جو طریق کار تجویز کیا تھا اسے سن کر ہم پر ایک سکوت کا عالم طاری ہو گیا اور ہم نے اس مسئلہ پر ان سے تھوڑی بہت بحث کرنی چاہی ہمیں تو گاندھی جی کا یہ فعل کوہ کندن و کاہ برآوردن کے مرادف معلوم ہوتا تھا۔ ہم یہ سمجھتے تھے کہ گاندھی جی کو فاقہ کی موت جیسا زبردست حربہ کسی اور بہتر مقصد کے لیے اٹھا رکھنا چاہیئے۔ حسب معمول گاندھی جی نے ہماری باتوں کو نہایت صبر و سکون کے ساتھ سنا مگر اپنے فیصلہ میں کسی تبدیلی پر رضامند نہ ہوئے۔

کانفرنس ختم کرنے کے بعد گاندھی جی نے فوراً ایک خط گورنر بمبئی کے نام لکھا۔ اور اسے سپرنٹنڈنٹ کی معرفت روانہ کردیا اس مسئلہ کے متعلق مذکورہ بالا نہج پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے بعد انھوں نے حکومت سے دو واضح درخواستیں کی تھیں اول یہ کہ انھیں ان قیدیوں سے ملنے کی اجازت دی جائے تاکہ وہ سمجھا بجھا کر ان کی بھوک ہڑتال ختم کرادیں اور ممکن ہو تو انھیں کے ساتھ رہنے کی بھی اجازت دی جائے تاکہ ایسے واقعات پھر نہ رونما ہوں۔ دوئم یہ کہ سپرنٹنڈنٹ سے بید کی سزا دینے کا اختیار سلب کرلیا جائے۔ تاوقتیکہ حکومت سے یا کسی جیل کمیٹی سے جو اس غرض سے بنادی جائے پہلے سے منظوری نہ لے لی جائے۔ اگرچہ حکومت کو گاندھی جی نے فاقہ کرکے جان دینے کی صاف طور سے دھمکی نہیں دی مگر اتنا ضرور لکھ دیا تھا کہ اگر ایک ہفتہ کے اندر اندر کوئی تشفی بخش جواب نہ موصول ہوا تو ممکن ہے کہ وہ کسی ایسے اقدام پر مجبور ہوں جو ان کی منشا کے خلاف حکومت کے لیے اضطراب کا باعث بن جائے۔

قیدیوں کی بھوک ہڑتال جاری رہی۔ ایک ہفتہ سے زیادہ گذر گیا۔ گاندھی جی اس مسئلہ پر سپرنٹنڈنٹ سے اور کبھی کبھی انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات سے دوستانہ مباحثے بھی کرتے رہے۔ ان پر بظاہر اضطراب کے کوئی آثار نہ تھے۔ لیکن دل کی گہرائیوں میں یقیناً ایک طوفان امنڈ رہا تھا۔

دس دن گذر گئے مگر حکومت کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کررہا تو جولائی کے شروع میں اتوار کا دن تھا جب گاندھی جی نے ہم لوگوں کو بتایا کہ اب مزید انتظار ناممکن ہے اور حکومت کے نام ایک مختصر سا خط روانہ کیا جس کا مضمون یہ تھا کہ اگر ۲۴ گھنٹے کے اندر ان کی درخواست منظور نہ کی گئی تو وہ منگل کی صبح سے۔ پانی اور نمک کے علاوہ تمام چیزیں کھانا پینا بند کردیں گے۔ دوشنبہ کی صبح کو سپرنٹنڈنٹ نے یہ اطلاع ٹیلیفون کے ذریعہ حکومت کے دفتر میں پہنچادی۔ اب دونوں خط گورنر بمبئی کے سامنے پیش ہوے۔ انھوں نے گاندھی جی کو براہ راست کوئی پیغام بھیجنے کی زحمت تو نہیں گوارا کی مگر سپرنٹنڈنٹ کو ہدایت کی کہ جہاں تک ممکن ہو گاندھی جی کو کم از کم ۲۴ گھنٹے تک اور اپنا فاقہ ملتوی کرنے پر آمادہ کیا جائے کیوں کہ حکومت اس معاملہ پر گاندی جی سے گفت وشنید کا ارادہ رکھتی ہے سپرنٹنڈنٹ صاحب شام کو اس کار مفوضہ کی انجام دہی کے لیے دوڑے ہوئے ہمارے احاطہ میں آئے اس وقت وہ معمول سے کچھ زیادہ بے چین ومضطرب نظر آتے تھے۔ انھوں نے گاندھی جی سے کہا "حکومت آپ کی درخواست پر غور وخوض کے ساتھ توجہ کررہی ہے اور اس مسئلہ میں آپ سے گفت وشنید بھی کرنا چاہتی ہے۔ کیا ایسی حالت میں آپ اپنا فاقہ ملتوی نہیں کردیں گے؟ گاندھی جی تو موقعہ شناسی اور حکمت عملی میں یکے استاد ہیں۔ انھوں نے فوراً سوال کیا "کیا گورنر نے نجی طور پر مجھ سے یہ درخواست کی ہے؟" میجر جونس نے نفی میں جواب دیتے ہوئے کہا "مگر میں بہت ممنون ہوں گا اگر آپ اپنا فاقہ ملتوی کردیں گے"۔ حسب معمول نہایت حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے گاندھی جی نے اپنی ایک شرط پیش کردی کہ اگر سپرنٹنڈنٹ صاحب اسے منظور کرلیں تو وہ ان کی بات مان لیں گے اور اپنا فاقہ ملتوی کردیں گے۔

"میجر جونس کیا آپ اس صورت میں میرے ہمنوا ہوجائیں گے اور قیدیوں سے ملنے کی اجازت کے لیے میں نے جو درخواست کی ہے اس کی آپ اخلاقی تائید کریں گے؟"

اس قسم کی درخواست سُن کر حیرت اور کسی قدر برافروختگی کے عالم میں میجر صاحب چند منٹ تک برآمدہ کے سنگین فرش پر ٹہلتے رہے اور اس کے بعد بولے:-

"یہ تو یقیناً ناممکن ہے۔ ملازم سرکار ہونے کی حیثیت سے حکومت کے خلاف آپ کی کسی لڑائی میں ظاہر ہے کہ میں کوئی تائید نہیں کرسکتا"

گاندھی جی نے جواب دیا "اچھا تو کل صبح سے میرا فاقہ شروع ہو جائے گا"
اس جواب پر جھنجھلا کر میجر صاحب نے کہا۔
"گاندھی جی آپ جانتے ہیں جو دوڑتا ہے .... "گاندھی جی نے کہا "ہاں وہی خطرہ بھی مول لیتا ہے اور میں اس خطرہ کو مول لینے کے لیے تیار ہوں"
یہ جواب سُن کر میجر صاحب احاطہ سے باہر چلے گئے۔

گاندھی جی نے رات کے وقت اس فاقہ کے لیے جسے وہ سمجھتے تھے کہ طویل فاقہ ہوگا آخری تیاریاں شروع کیں۔ انھوں نے طے کیا کہ فاقہ کے دوران میں زیادہ تر ہندوؤں کی مذہبی کتابیں پڑھیں گے۔ اور جہاں تک ہو سکے گا تاریخی ادبی یا دیگر متفرق کتابوں کے پڑھنے سے احتراز کریں گے۔ مگر اردو کا مطالعہ جاری رکھیں گے۔ اگر اور کسی خیال سے نہیں تو کم از کم اس نظر سے کہ صحابۂ رسولؐ کے متعلق مولانا شبلی کی تصنیف پڑھ ڈالیں اس کے علاوہ عہد عتیق کا مطالعہ بھی جاری رکھیں گے۔ اور شروع کے دنوں میں یعنی جب تک ضعف کے سبب سے بالکل صاحب فراش نہ ہو جانا پڑے چرخہ بھی کاتتے رہیں گے۔

وہ یہ بھی جانتے تھے کہ انھیں صبح ہی سے ہم لوگوں سے علحدہ کر لیا جائے گا لہٰذا ہم لوگوں نے کچھ کتابیں ان کو دیں کچھ ان سے لیں اور اس جدائی کے لیے آخری تیاریاں مکمل کر لیں۔

گاندھی جی نے اپنے قول کے مطابق چار بجے صبح سے فاقہ شروع کر دیا وہ روزمرہ صبح کے وقت گرم پانی میں کھٹا لیموں ملا کر پیتے تھے۔ آج نہیں ملایا۔ اپنے مقررہ پوجا پاٹ کے بعد چارپائی پر لیٹے لیٹے کتابیں پڑھتے رہے۔ جب ہم لوگ صبح ۷ بجے کے قریب ملے تو فاقہ شروع ہو جانے کے آثار حقیقی طور پر نمایاں تھے جنھیں دیکھ کر ہمارے دلوں پر ایک شدید غم و ہراس کی کیفیت طاری ہوگئی۔ گاندھی جی کے ناشتہ کے لیے جو پھل ان کی چارپائی کے قریب رکھے رہا کرتے تھے آج وہ نظر نہ آئے۔ نہ وہ ٹین کا تام لوٹ نظر آیا جس میں وہ روزانہ دودھ والے سے بکری کا گرم گرم دودھ لیا کرتے تھے۔ لیکن خود ان کے چہرہ بشرے میں کوئی نمایاں فرق نظر نہ آتا تھا اور وہ اسی طرح خوش و خرم متبسم ضعیف العمر گاندھی جی دکھائی دے رہے تھے جیسے پہلے تھے۔

تھوڑی دیر میں وہیں دودھ والا بھی آگیا۔ ہاتھ کے ایک ہلکے سے اشارہ سے گاندھی جی نے اسے واپس کر دیا۔ دودھ والے دو تھے۔ ان میں سے ایک بڈھا قیدی تھا جو روزانہ صبح آکر گاندھی جی کو جھک کر سلام کیا کرتا تھا۔ فاقہ کی حیرت انگیز خبر سُن اُسے بہت اذیت ہوئی کیونکہ اتوار کو بھی جب گاندھی جی چوبیس گھنٹے کا برت رکھتے تھے تو بھی وہ دودھ بدستور لیتے رہتے تھے اس بڈھے دودھ والے کے پاس دودھ لے کر واپس جانے کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ چند ہی منٹ گزرے تھے کہ میجر جونس اپنے ہمراہ چند سارجنٹ سب انسپکٹر، اور دودھ والوں کو لیے ہوئے اس احاطہ میں داخل ہوئے۔ معمولی صاحب سلامت کے بعد سپرنٹنڈنٹ نے دودھ والوں کے واپس کر دئے جانے پر تعجب کا اظہار کیا۔

گاندھی جی نے کہا "میں نے تو صبح چار ہی بجے سے فاقہ شروع کر دیا ہے" سپرنٹنڈنٹ نے ذرا زیادہ نرم اور معذرت آمیز لہجے میں کہا "کیا آپ اسے ملتوی نہیں کریں گے" اس موقعہ پر سپرنٹنڈنٹ کی نیک نامی معرض خطر میں تھی اُدھر وہ سوچتے تھے کہ اگر گاندھی جی کو ایک دن کے لیے فاقہ ملتوی کرنے پر آمادہ نہ کر سکے تو بڑی سبکی ہوگی۔

گاندھی جی نے نہایت خندہ پیشانی سے جواب دیا "میں اب بھی اپنا فاقہ ملتوی کرنے کو تیار ہوں مگر اس کے لیے جو شرط ہے وہ آپ جانتے ہی ہیں"

سپرنٹنڈنٹ صاحب کئی منٹ تک بہت متفکر رہے اور چند لمحوں کے لیے ان کے نخوت و تمکنت کا سارا جذبہ ان کے چھوٹے سے دماغ میں جوش کھانے لگا۔

اچھا تو آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں بحیثیت انسان کے اس معاملہ میں آپ کی تائید کروں یہی نا!"

گاندھی جی نے جواب دیا بس یہی اتنا"

سپرنٹنڈنٹ نے گاندھی جی کا فاقہ ملتوی کرانے کا پورا یقین رکھتے ہوئے کہا "اچھا مجھے منظور ہے" گاندھی جی نے کہا "اچھا تو میں ابھی فاقہ توڑ دوں گا۔ مجھے وہ دودھ دیدیجئے بلکہ جو میں نے کل نہیں منگوائے تھے انہیں ابھی منگوا دیجئے"

مجلس فوراً برخاست ہو گئی اور گاندھی نے جب فاقہ شکنی شروع کی تو اس احاطے کے تمام قیدیوں دودھ والوں بھنگیوں وارڈروں اور دیگر کارکنوں کے چہرے متبسم ہو گئے۔

اسی سہ پہر کو حکومت نے مسٹر گریفتھس انسپکٹر جنرل پولیس کو متعین کیا کہ گاندھی جی سے اس موضوع پر گفت و شنید کریں۔ یہ گفت وشنید دوسرے ہی دن طمانیت بخش نتائج کے ساتھ ختم ہو گئی۔ حکومت نے گاندھی جی کو اس کی اجازت دے دی کہ وہ بھوک ہڑتال کرنے والے قیدیوں سے ملاقات کریں۔ اور اس کو بھی منظور کر لیا کہ حکومت کی خاص سابقہ منظوری کے بغیر بید کی سزائیں نہ دی جائیں گی۔

اسی زمانہ میں ایک مرتبہ میں اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے مسٹر گریفتھس کے پاس سے گذرا انھوں نے مجھ سے قید ہونے کی وجہ دریافت کی اور میرے قد و قامت پر نظر ڈالنے کے بعد بولے۔

"رہائی کے بعد تم مجھ سے ملنا۔ تم بہت اچھے پولیس افیسر ثابت ہو سکتے ہو"

میرے متعلق ذرا ان کی توقعات ملاحظہ کیجئے!

اس دردناک ناٹک کے آخری حصہ کا تماشا لائبریری کے کمرہ میں کیا گیا جو ہمارے احاطے کے پشت پر تھا۔ مسٹر گریفتھس کے ساتھ انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات اور میجر جونس بھی تھے۔ گاندھی جی کو بہت اعزاز کے ساتھ بٹھایا گیا۔ اس کے بعد بھوک ہڑتال کرنے والوں کے دو لیڈروں کو جو تیرہ دن کے فاقہ سے نیم جان ہو چکے تھے وارڈروں کے کندھوں پر لائبریری میں لایا گیا جیسے ہی انھیں فرش پر بٹھایا گیا انھوں نے اپنے کو فوراً اس زبردست مہاتما کے قدموں پر ڈال دیا اور مہاتما نے فاقہ کشی پر انھیں لعن طعن شروع کی۔

"اچھا تو موت کی پوری تیاری کر لی ہے"

انھوں نے جواب دیا "مرنا آسان تھوڑا ہی ہے" اس کے بعد گاندھی جی بھوک ہڑتال کا فلسفہ بیان کرتے رہے انھیں نہایت آسانی سے یہ سمجھا دیا کہ بید کی سزا ملنے پر احتجاجاً بھوک ہڑتال کرنا بالکل مہمل حرکت ہے اور ان عقیدت مند قیدیوں کو بغیر کسی زحمت کے اس پر آمادہ کر لیا کہ اسی وقت اسی جگہ گاندھی جی والا بکری کا تھوڑا تھوڑا دودھ پی کر فاقہ توڑ دیں۔

اس کے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ تمام افسران اس منظر کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ غالباً ان میں سے جس شخص کو سب سے زیادہ اذیت وکلفت ہوئی وہ میجر جونس تھے۔ جن کی حیثیت اس جگہ ایک انتہائی شریر کردار کی تھی۔ شاید پہلی مرتبہ میجر صاحب نے محسوس کیا کہ انھوں نے شائستہ اور دلیر انسانوں کو مفسد اور جرائم پیشہ سمجھنے میں کتنی بڑی غلطی کی ہے۔ جب یہ لوگ اٹھے تو اس نادم میجر نے ان لوگوں سے ہاتھ ملایا اور کہا۔

"تم لوگوں کو جو کچھ اذیت بھگتنی پڑی اس پر مجھے نہایت افسوس ہے" ان قیدیوں کیلئے جو سپرنٹنڈنٹ سے اس قسم کی معذرت کے الفاظ سننے کی آس لگائے ہوئے تھے ان الفاظ نے زخم پر مرہم کا کام دیا۔

کئی ہفتوں کے ہنگامے کے بعد یراودا جیل میں امن و امان قائم ہو گیا۔ لیکن اس کا ایک عجیب نتیجہ ہوا جس کی بنا پر ہم لوگوں کو کئی ہفتوں تک اور تھوڑی سی تشویش رہی۔ جیل کی شورش کی خبر کسی طرح اخباروں میں پہنچ گئی اور سپرنٹنڈنٹ پر تنقیدوں کی

بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ حکومت نے بھی جیل کے نظم و نسق کے سلسلہ میں غفلت اور تساہل برتنے کے الزام میں سپرنٹنڈنٹ کو آڑے ہاتھوں لینا شروع کیا۔ کیوں کہ مٹی پیٹا قیدیوں کے ساتھ جو کچھ سلوک ہوا تھا اس کی خبر آخر گاندھی جی تک کیسے پہنچی۔ اس تمام لعن طعن اور تنقید و تنقیص سے برافروختہ ہو کر میجر جونس نے تہیہ کر لیا کہ ہمارے احاطہ کو دوسرے تمام احاطوں سے مکمل طور پر بے تعلق کر دیا جائے ہمارے وارڈروں کو نہ دوسرے احاطوں میں یا جیل کے دفتروں میں یا روزمرہ کے کام کے سلسلہ میں آنے جانے کی جو کچھ تھوڑی بہت اجازت تھی وہ بھی ختم کر دی گئی۔ اب ان سب وارڈروں اور قیدی ملازمین، بلکہ ہمارے حجام تک کو حکم دیا گیا کہ وہ اسی احاطہ میں سویا کریں بہر حال ایسی صورت پیدا کر دی گئی کہ ہمارے احاطہ کو جیل کے دوسرے حصوں سے قطعاً بے تعلق کر دیا گیا تاکہ باہر کی کوئی خبر ج یا افواہ ہمارے احاطہ میں نہ پہنچنے پائے۔

تمام وارڈروں اور قیدی ملازموں نے یہ ساری پابندیاں قبول کر لیں لیکن ہمارے حجام نے اس کے خلاف شدید احتجاج کیا اور جب اس نے دیکھا کہ افسران اس کی چیخ و پکار کی کوئی شنوائی نہیں کرتے تو اس نے کام چھوڑ دینے کا تہیہ کر لیا۔ اور کہا کہ اب میں احاطہ میں کسی کے بال نہیں بناؤں گا۔ اس پر سپرنٹنڈنٹ نے یہ سزا دی کہ سات دن کے لیے اسے کوٹھری میں بند کرا دیا۔ احاطے کے لیے دوسرا قیدی حجام مقرر کیا گیا اس نے جب اپنے پیشرو کا قصہ سُنا تو وہی صورت اختیار کر لی اور اپنے کو عارضی طور پر پاگل ظاہر کرنے لگا اس کو بھی دوسری کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔

یہ پیہم سزائیں گاندھی جی کے لیے ناقابل برداشت تھیں اور انھوں نے حسب معمول ان تمام واقعات کی اخلاقی ذمہ داری اپنے سر لیتے ہوئے یہ تہیہ کیا کہ ان دونوں حجاموں کو جو بے رحمانہ سزا دی گئی ہے اس کے خلاف احتجاجاً وہ بال بنوانا ترک کر دیں گے۔ چونکہ وہ سر پر بال بھی نہیں بڑھنے دینا چاہتے تھے لہٰذا انھوں نے سپرنٹنڈنٹ سے ایک قینچی کی درخواست کی۔ جب میں نے اس مسئلہ پر ردّ و قدح کی تو انھوں نے حسب معمول نہایت آسانی سے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ جنوبی افریقہ کی جیلوں میں ہر شخص کے بال قینچی ہی سے کترے جاتے ہیں کیونکہ وہاں جیل کے اندر استروں کی اجازت ہی نہیں ہے۔ گاندھی جی نے مسٹر علی کو بھی سر اور چہرے کے بال قینچی ہی سے کٹانے پر رضامند کر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بال تو ایک بھی نہ صاف ہوا مگر ٹھڈی اور گالوں پر کئی جگہ خراش البتہ آگئی۔ بلکہ گاندھی جی کی کھوپڑی پر بھی جس کے بال بہت ترشے ہوئے تھے قینچی کچھ زیادہ کامیابی کے ساتھ کام نہ کر سکی۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ اب گاندھی جی کو اس نمایاں ناکامیابی کا احساس ہوا۔ سپرنٹنڈنٹ نے حسب معمول اصرار کیا کہ گاندھی جی ٹھیک ٹھکانے سے داڑھی وغیرہ منڈوالیں آخر کار گاندھی جی رضامند ہو گئے۔ چونکہ اس نئے حجام نے پہلے والوں کا سا رویہ نہیں اختیار کیا لہٰذا اس سلسلہ میں ہم لوگوں کو مزید زحمتیں نہیں اُٹھانی پڑیں۔

ان تمام واقعات کے دوران میں ظاہر ہے کہ اس بات کو گاندھی جی نے قطعاً نظر انداز کر دیا تھا کہ ان انوکھی پابندیوں کے وجود خواہ کچھ بھی ہوں اور اگر قینچیوں سے کام چلا بھی لیا جائے تو بھی حجام کو نصف درجن ملازموں اور وارڈروں کے بال تو بنانے ہی پڑیں گے۔

ساٹھواں باب

اکتوبر ۱۹۲۳ء میں میجر جونس کی جگہ کرنل مَرے سپرنٹنڈنٹ جیل ہو کر آ گئے تھے۔ ان نئے کرنل صاحب نے انڈمان جیل میں بڑا نام پیدا کیا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ اُنھوں نے بنگال کے شیروں کے بل نکال دیے تھے۔ عام قیدی انھیں بکری صاحب کہا کرتے تھے۔ کیونکہ یہ اُن پر خفیہ نظر رکھنے کے لیے بکری کی طرح چپکے چپکے احاطہ میں داخل ہوا کرتے تھے۔

ہمارے تیسرے ساتھی مسٹر علی کو شمالی ہندوستان میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ کیونکہ اسی اکتوبر میں وہ رہا کیے جانے والے تھے تھوڑے ہی دنوں میں ایک نئے مسلمان قیدی مسٹر عبدالغنی ہمارے احاطے میں لا کر رکھے گئے۔ یہ روزنامہ خلافت کے ایڈیٹر تھے اور بغاوت کے جرم میں سزا پائی تھی۔ ان کی رفاقت سے خوش تو ہم سب لوگ تھے مگر گاندھی جی کو خاص طور پر مسرت تھی کیوں کہ مسٹر علی کے منتقل ہو جانے سے ان کی پڑھائی کا جو سلسلہ منقطع ہو گیا تھا اس کو وہ اب پھر سے جاری کر سکتے تھے۔

حسبِ عادت گاندھی جی نے مسٹر عبدالغنی سے مشورہ کر کے ان کے کھانے کا ٹکٹ بھی خود تیار کیا اور اسے نئے سپرنٹنڈنٹ کے سامنے پیش کر دیا۔ کرنل مَرے نے کافی غور و خوض کرنے کے بعد اسے منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کی دلیل بہت صاف تھی۔ وہ یہ کہ "اسپیشل ڈویژن کے قیدیوں کے لیے گورنمنٹ نے جو رقم منظور کی ہے۔ میں اس سے ایک پیسہ زیادہ خرچ کرنے کا روادار نہیں۔ لہٰذا میں صرف اتنے ہی کی منظوری دے سکتا ہوں جتنا ضابطہ کے اندر ہو۔ مسٹر غنی کو بہر حال اس کی اجازت ہو گی کہ وہ اپنے خرچ سے جو کچھ فاضل چیزیں منگوانا چاہیں منگوا لیں"۔

ان الفاظ کو سُن کر گاندھی جی بہت برہم ہو گئے۔ اور کہنے لگے "آپ سے پہلے کے افسران ہمیشہ ہمارے طے کیے ہوئے راشن کو منظور کر لیا کرتے تھے۔ اگر آپ ہمارے اور ہمارے نئے رفیق کے درمیان کوئی امتیاز کرنا چاہیں تو ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے" کرنل نے کہا۔ "آپ کی صحت خراب ہے۔ اس لیے آپ کو خاص قسم کا راشن ملتا ہے، اور میں اپنے پیشرو کے مقرر کیے ہوئے راشن میں تبدیلی تو نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن میں اپنے اختیار سے کسی نئے قیدی کے لیے ضابطہ سے باہر کوئی رقم خرچ کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں"۔

ان الفاظ سے گاندھی جی کو بہت تکلیف ہوئی کیونکہ ان کو یقین تھا کہ انھیں جو راشن مقرر کیا گیا ہے وہ کسی طبی ضرورت کے لحاظ سے نہیں بلکہ ان کی عادات کی مناسبت سے ہے۔ لہٰذا انھوں نے تہیہ کر لیا کہ پھل وغیرہ کا استعمال ترک کر کے صرف دودھ پر گزارہ کریں گے۔ لیکن اس تجربہ کو انھوں نے دو ہفتہ کے لیے ملتوی کر دیا تاکہ اِس وقت تک انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات کے قطعی احکام بھی آ جائیں۔ آخر کار گورنمنٹ کو باقاعدہ اطلاع دے کر گاندھی جی نے یہ انتہائی خطرناک اور اہم تجربہ شروع کر دیا۔

ہمارے اندیشے جلد ہی صحیح ثابت ہونے لگے۔ ایک ہی ہفتہ میں گاندھی جی کا وزن ایک سو چار پونڈ سے گھٹ کر ایک سو ایک پونڈ رہ گیا۔ مسٹر غنی کے راشن کے متعلق تو سپرنٹنڈنٹ صاحب اپنے احکامات پر اڑے رہے۔ لیکن گاندھی جی کو نہایت قیمتی اور لذیذ پھل پیش کر کر کے ان کو اپنا فیصلہ بدلنے کی ترغیب دیتے رہے۔ گاندھی جی نے جواب دیا کہ "ایسی حالت میں جبکہ میرے ایک ساتھی کو ناکافی دودھ اور شکر ملنے کے باعث بھوکے رہنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ میں پھل کھانے کا کوئی خیال بھی اپنے دل میں کیوں کر لا سکتا ہوں"۔

سپرنٹنڈنٹ نے اس سے زیادہ کچھ کرسکنے کے متعلق معذوری کا اظہار کیا اور واپس چلے گئے۔

چار ہفتے کے اندر اندر گاندھی جی کا وزن گھٹ کر ۹۷ پونڈ رہ گیا۔ اپنے ممتاز قیدی کی روزافزوں کمزوری کو دیکھ کر کرنل مرے کو بہت زیادہ تشویش ہونے لگی اور انھوں نے اور زیادہ اصرار شروع کیا کہ گاندھی جی پھر پھل کھانے پر راضی ہو جائیں۔ جب دیکھ کہ گاندھی جی اپنی جگہ سے ہلنے والے نہیں تو انھوں نے گاندھی جی کو اس پر راضی کرلیا کہ تھوڑی سی روٹی کھا لیا کریں۔ اس نئے راشن نے ان کا وزن دس پونڈ بڑھا دیا۔ لیکن جلد ہی یہ ہوا کہ روٹی انھیں ہضم نہیں ہوتی تھی۔ چھٹا ہفتہ ختم ہوتے ہوتے وہ بہت کم زور ہو گئے۔ اور صرف ۹۶ پونڈ وزن رہ گیا اب ہم لوگ بھی بہت ڈرے۔ ہم سب نے مل کر گاندھی جی کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اب تجربہ کے حدود ختم ہو چکے اور بغیر مزید تاخیر کے انھیں پھلوں کا استعمال شروع کر دینا چاہیے۔ انھوں نے ہم لوگوں کو نہایت نرم الفاظ میں تسکین دے دی اور کہا کہ ۹۰ پونڈ بھی وزن رہ جائے تو اس وقت تک تشویش کی کوئی بات نہیں۔

اسی اثنا میں بعض مہربان دوستوں نے گاندھی جی کے پاس پھلوں کی ایک ٹوکری بھیجی۔ گاندھی جی نے چپکے سے وہ ٹوکری ہم لوگوں کے حوالے کردی۔ ہم لوگوں نے کہہ دیا کہ اگر آپ نہیں کھائیں گے تو ہم بھی نہیں کھائیں گے۔ لہٰذا گاندھی جی نے اس میں سے ایک پھل لے کر کھا لیا۔

ایک ہفتہ اور گزرا۔ ایک دن صبح کے وقت جب میں ان کے پاس گیا تو انھوں نے چارپائی پر لیٹے لیٹے مجھ سے کہا: "مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے اس تجربہ کے حدود ختم ہو چکے۔ آج صبح جب میں پانی کا لوٹا اٹھانے لگا تو میرے ہاتھ کانپ گئے لہٰذا میں نے طے کرلیا ہے کہ پھر پھل کھانا شروع کردوں۔ اسی سہ پہر کو مسز گاندھی نے بھی ان سے ملاقات کی۔ ان سے گاندھی جی نے چھ ہفتہ کی اس نیم فاقہ کشی کے تمام حالات بالتفصیل بیان کیے جیسا کہ ایک ہندو عورت کو کرنا چاہیے، مسز گاندھی نے گھٹنے ٹیک کر ان سے بے حد منت سماجت کی کہ فوراً پھلوں کا استعمال پھر شروع کر دیں۔ اس سلسلہ میں اُنھوں نے کرنل مرے سے بھی ملاقات کی اور اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا "میرے[۵] شوہر ہمیشہ شرارت"

دوسرے دن صبح کے وقت گاندھی جی نے نہایت دلیری کے ساتھ کرنل مرے سے اپنی شکست کا اعتراف کرلیا۔ یہ بڑا تلخ گھونٹ تھا جو گاندھی جی کو اپنے حلق کے نیچے اُتارنا پڑا۔ اب تک ان کے اس قسم کے کسی عزم کو اتنی شدید ناکامی کا منھ نہیں دیکھنا پڑا تھا۔ کرنل صاحب تو اپنی جگہ سے ذرہ برابر بھی نہیں ہلے۔ انھوں نے مسٹر غنی کے راشن میں ایک تولہ دودھ یا شکر کا اضافہ بھی نہیں کیا، مگر گاندھی جی مجبور ہوئے کہ اپنے پھلوں کی ٹوکری پھر طلب کریں۔ کرنل مرے نے مزید پیش قدمی کی۔ اور گاندھی جی کو نہایت احتیاط کے ساتھ یہ سمجھایا کہ آپ کو اپنی خطرناک کمزوری کو دور کرنے کے لیے اپنے راشن میں مزید اضافہ کرنا چاہیے۔ گاندھی جی اس پر رضامند ہو گئے کہ نصف پاؤنڈ روٹی اور ایک اونس شہد روزانہ صبح کھا لیا کریں گے۔ اس صورت سے فاقہ کے اختتام پر روز مرہ کی اچھی خاصی دعوت کا انتظام ہو گیا۔

نئی غذاؤں کو استعمال کرتے ہوئے دو ہفتے بھی مشکل سے ہوئے ہوں گے کہ گاندھی جی ایک نہایت منحوس بیماری میں مبتلا ہو گئے۔ ۵ جنوری ۱۹۲۳ء کا واقعہ ہے کہ صبح میں نے اپنے وارڈر گنگا با کو بہت سا پانی گرم کرتے ہوئے دیکھا۔ اس نے بتلایا کہ گاندھی جی پر لرزہ کی سی کیفیت طاری ہے۔ میں فوراً دیکھنے کے لیے دوڑ گیا۔ وہ چارپائی پر خاموش لیٹے ہوئے تھے۔ جب میں نے حال دریافت کیا تو بہت دھیمی آواز میں بولے "رات بھر میرے پیٹ میں نہایت شدید درد رہا ہے، ایک لمحہ کے لیے بھی نیند نہیں آئی میں نے دست آور دوائیں بھی کھائیں اور قے کرنے کی بھی کوشش کی مگر کوئی افاقہ نہیں ہوا۔"

۵۔ "My husband always mischief"

دوسرے دن صبح ہوتے ہوتے درد جاتا رہا۔ تیسرے دن بخار بھی اُتر گیا۔ دو ایک دن کے بعد گاندھی جی رو بصحت نظر آنے لگے لیکن چند ہی دنوں میں تکلیف پھر عود کر آئی۔ پیٹ کا درد رفتہ رفتہ ایک نازک جگہ پر سمٹنے لگا۔ سسون ہسپتال سے کرنل میڈک نے آکر معائنہ کیا اور یہ تشخیص ہوئی کہ التہاب زائدہ کے آثار ہیں۔

۱۲ جنوری کو جب میں گاندھی جی کی چارپائی کے قریب گیا تو اُنھوں نے دھیمی آواز سے میرے کان میں کہا "یہ درد مزمن ہوتا جارہا ہے مجھے اندیشہ ہے کہ ہسپتال نہ جانا پڑے" میں نے ڈاکٹر مہتا سے اس کا ذکر کیا، انھوں نے کرنل مرے سے بات چیت کی، کرنل کو بھی گاندھی جی کی نازک حالت دیکھ کر تشویش ہوگئی تھی۔ انھوں نے ٹیلیفون پر کرنل میڈک سے گفتگو کی۔ ہم لوگوں کو گاندھی جی سے جدائی کے آثار نظر آنے لگے۔ انھوں نے اپنی کتابوں، کپڑوں، چرخہ اور سوت وغیرہ کے متعلق مفصل ہدایات قلمبند کرائیں اور دوسرے تمام معاملات سہ پہر تک کے لیے ملتوی کر دیے۔

تھوڑی ہی دیر میں جیل کے بہت سے اہلکاروں کو لیے ہوئے کرنل میڈک آ پہنچے اُنھوں نے گاندھی جی کا باضابطہ معائنہ کیا اور فیصلہ کیا کہ انھیں التہاب زائدہ کے اپریشن کے لیے فوراً ہسپتال لیجایا جائے۔ تھوڑی دیر میں ہم نے ان کے موٹر کی آواز بھی سُنی جو ہمارے پھاٹک پر آکر رُکا۔ ہم سب مل کر گاندھی جی کو چارپائی سمیت موٹر کے پاس لائے۔ موٹر کے گدّے پر ان کے تکیے وغیرہ سب لگا دیے گئے تھے۔ گاندھی جی نہایت پھرتی سے اس پر جا بیٹھے۔ موٹر چلا تو احاطہ کی پوری آبادی، یورپین قیدی وارڈر، قیدی ملازم، جیل کے اہلکاران کو رخصت کرنے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ گاندھی جی اُن سب لوگوں سے صاحب سلامت کرتے ہوئے ہسپتال کے لیے روانہ ہو گئے۔

اسی روز آپریشن ہوا اور کامیاب ہوا۔ جلد ہی گاندھی جی اچھے ہو گئے۔ اور حکومت نے اپنی حکمتِ عملی سے اسی بیماری کے بہانے انھیں فروری ۱۹۲۴ء کے شروع میں رہا بھی کر دیا۔ حالانکہ چھ سال کی سزا ہوئی تھی جس کے ختم ہونے میں ابھی قریب قریب پورے چار سال باقی تھے۔

اکسٹھواں باب

کانگریس کونسلوں کے داخلہ کی موافقت میں

اب مجھے نہایت اختصار کے ساتھ سنہ ۱۹۲۳-۲۴ء کے خاص خاص واقعات کا خلاصہ پیش کر دینا ہے، تاکہ جیل سے رہا ہونے کے بعد گاندھی جی کو جن سیاسی حالات سے دوچار ہونا پڑا، اس کی صحیح اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکے۔

یاد ہوگا کہ گیا کے اجلاس کے موقعہ پر کونسل میں داخلہ کے مسئلہ پر مسٹر سی آر داس اور پنڈت موتی لال نہرو کانگریس کو اپنا ہمنوا نہیں بنا سکے تھے، ینگ انڈیا جلد دوم کے دیباچہ میں بابو راجندر پرشاد لکھتے ہیں "بہرحال کانگریس کی کامیابی کے ساتھ یہ نزاع ختم نہیں ہوئی تھی، دیش بندھو داس، پنڈت موتی لال نہرو اور دوسرے لیڈروں نے جو کونسل میں داخلہ کے موافق تھے، اپنی ایک پارٹی بنائی تھی، اور اس کا نام کانگریس۔ خلافت سوراج پارٹی رکھا تھا، اس پارٹی کے پروگرام میں جس مطالبہ کو سب سے زیادہ نمایاں حیثیت دی گئی تھی وہ کونسلوں میں داخلہ کے متعلق تھا، کہا جاتا تھا کہ یہ پارٹی لیجسلیٹیو کونسل اور اسمبلی کی ممبری کے لئے اپنے امیدوار نامزد کریگی یہ لوگ جب منتخب ہو جائیں گے تو ملک کی طرف سے حکومت کے سامنے اس کے جائز مطالبات پیش کریں گے، اور زور دیں گے کہ مناسب میعاد کے اندر حکومت ان کو منظور کرے اور عملی جامہ پہنا دے، اگر یہ مطالبات نہ منظور کئے گئے تو یہ پارٹی حکومت کی ہر کارروائی میں مزاحمت کرے گی، اور اپنی اس پالیسی کو مسلسل اور مستقلاً جاری رکھ کر کونسل کے ذریعہ حکومت کرنا ناممکن بنا دیگی، اور ایسی صورت میں اس پارٹی کا کوئی ممبر کسی عہدہ کو قبول نہیں کرے گا، دوسرے مطالبات کا مقتضا یہ تھا کہ میونسپل ڈسٹرکٹ اور لوکل بورڈوں پر قبضہ کر لیا جائے، مزدور طبقہ کی تنظیم کی جائے برطانوی مال کا مقاطعہ کیا جائے، ایشیائی ممالک کا ایک وفاق قائم کیا جائے کانگریس کے تعمیری پروگرام ——— سودیشی کھدر، ترک منشیات اچھوت ادھار، قومی تعلیم، پنچایت کے ذریعہ مقدمات کے فیصلے ——— میں کانگریس کی تائید و مدد کی جائے۔

اس خوف سے کہ مبادا کانگریس کا دو فرقوں میں منقسم ہو جانا (یعنی ایک غیر تبدیلی پسندوں کا طبقہ جو کٹر طریقہ پر ترکِ موالات کے ابتدائی پروگرام کا حامی تھا، اور دوسرے تبدیلی پسندوں کا، یعنی جدید سوراج پارٹی کے اراکین) سارے کام ہی نہ بند کر دے، آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے جنوری سنہ ۲۳ء میں یہ طے کیا کہ کونسل کے متعلق ساری بحث و نزاع اس وقت تک کے لئے ملتوی کر دی جائے، جب تک کہ سول نافرمانی کی مہم کا مسئلہ نہ طے ہو جائے۔

بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ غیر تبدیلی پسند اپنی تمام جذبات پرستانہ کوششوں کے باوجود رضاکاروں کی بھرتی کے سلسلہ میں کرتے تھے، سول نافرمانی کی مہم شروع کرنے کے کچھ زیادہ خواہشمند نہ تھے۔ ایک اتفاقی صورت ایسی پیدا ہو گئی جس سے ان کو اپنی قوت یکجا کرنے اور اپنی جماعت کے گرتے ہوئے اقتدار کو سنبھالنے اور فروغ دینے میں بہت مدد ملی۔

پہلے سے طے شدہ اسکیم کے مطابق ۳۰ اپریل کو ناگپور کے چند مقامی لیڈروں نے سیٹھ جمنا لال بجاج کی قیادت میں ایک جلوس کی صورت میں

جھنڈا لے کر شہر اور سول لائن کا گشت کرنے کا ارادہ کیا، حکومت نے اپنے وقار کی روایات کے تقاضے کے مطابق جلوس کو سول اسٹیشن کے حدود میں داخل ہونے کی ممانعت کر دی۔ اب لیڈروں کے پاس سوا اس کے کوئی چارہ کار نہ تھا، کہ اس حکم کی خلاف ورزی کریں، جلوس کے چند لوگوں کی گرفتاری نے تحریک کا زور اور بڑھا دیا، صوبۂ متوسط نیز ہندوستان کے دور و دراز گوشوں تک سے رضاکار ٹوٹ پڑے، مختلف صوبوں بلکہ شہروں کے درمیان اس نئے میدان جنگ میں بڑی بڑی فوجیں بھیجنے کی مسابقت شروع ہو گئی، تقریباً دو مہینے کے اندر اندر دو ہزار آدمی گرفتار و سزایاب ہو گئے۔

اب سوراج پارٹی والے ایک عجیب تذبذب و کش مکش میں مبتلا ہو گئے، اگر غیر تبدیلی پسندوں کے ساتھ مل کر حکومت کے چیلنج کا جواب نہیں دیتے تو سارے ہی قوم کی نظر میں مردود ٹھہرتے ہیں، اگر مں کر جیل جاتے ہیں تو اس نئی پارٹی کا اور آئندہ انتخابات میں کونسلوں پر قبضہ کرنے کے پروگرام کا کیا حشر ہوگا، مسٹر وٹھل بھائی پٹیل عین موقع پر ناگپور پہنچے اور ایک مفاہمت کے ذریعے جو دونوں فریق میں با عزت مفاہمت سمجھی گئی، اس گتھی کو سلجھا دیا، جب مئی کے اخیر میں بمبئی آل انڈیا کانگریس کا اجلاس ہوا تو سوراجیوں کو ایک نمایاں کامیابی حاصل ہوئی، یہ طے ہو گیا کہ ووٹروں میں کونسلوں کے مقاطعہ کے متعلق کوئی پروپاگنڈہ نہ کیا جائے گا، اس پر غیر تبدیلی پسندوں نے کانگریس کی ورکنگ کمیٹی سے استعفےٰ دیدیا اور ان کی جگہ سوراجی لیڈر آ گئے۔ اس صورت سے غیر تبدیلی پسندوں کو جنھیں پچھلی کانگریس میں بہت کامیابی ہوئی تھی، اس مرتبہ شکست کھانی پڑی اور کانگریس کی مجلس انتظامیہ سے الگ ہو جانا پڑا۔

جولائی میں آل انڈیا کانگریس کا اجلاس پھر ناگپور میں ہوا، ستیاگرہ کی مہم ختم ہو چکی تھی، سول نافرمانی کا مسئلہ بھی تمام لوگوں کے نزدیک ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا تھا، تبدیلی پسندوں کے پاس اب نہ کوئی سیاسی پروگرام رہ گیا تھا نہ حکومت سے پُر امن جنگ کرنے کی خواہش رہ گئی تھی، لیکن سوراج پارٹی والے کانگریس کی تازہ منظوری کے لئے بغیر نومبر ۲۳ء کے انتخابات میں کھڑے نہیں ہو سکتے تھے، لہذا کمیٹی نے طے کیا کہ کانگریس کا ایک خاص اجلاس دہلی میں منعقد کیا جائے۔

یہ خاص اجلاس مولانا ابوالکلام آزاد کی زیر صدارت ۱۵ ستمبر کو منعقد ہوا۔ مولانا محمد علی جو حال ہی میں جیل سے رہا ہو کر آئے تھے اس وقت غیر تبدیلی پسند پارٹی کے روح رواں تھے، دوسری طرف مسٹر داس اور پنڈت موتی لال نہرو سوراج پارٹی کے علمبردار تھے، کانگریس نے باتفاق رائے یہ تجویز منظور کر لی، کہ کانگریس کے وہ افراد جن کا ضمیر یا مذہبی احساس مانع نہ ہو۔ بحیثیت امیدوار کھڑے ہو سکتے ہیں، اور کونسل میں ووٹ دے سکتے ہیں اس صورت سے سوراج پارٹی نے کانگریس سے محض کونسلوں میں داخلہ ہی کی منظوری نہیں لے لی، بلکہ ووٹ حاصل کرنے کے لئے کانگریس اور گاندھی جی کے وقار سے فائدہ اٹھانے کی صورت پیدا کر لینے میں بھی کامیاب ہو گئی، اسی کے ساتھ ساتھ کانگریس کو اس پر بھی آمادہ کر لیا گیا کہ وہ ترک موالات کے پروگرام پر اپنی عقیدتمندی کا اعادہ کرے تاکہ آئندہ کبھی سول نافرمانی کی مہم شروع کرنے کی ضرورت پڑے تو قوم کو آمادہ کیا جا سکے۔

اس موقعہ پر ان ہندو مسلم مناقشات کا حوالہ دیدینا ضروری ہے، جو گاندھی جی کے قید ہو جانے کے بعد ہی ۱۹۲۲ء کے وسط میں شروع ہو گئے تھے، سول نافرمانی کی زبردست محاربانہ تحریک کے یکبارگی ختم ہو جانے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حکومت نے فرقہ دارانہ جماعتوں اور لیڈروں کے ذریعے ان کے متعصب متبعین کے درمیان تصادم کرا دینا چاہا، وہی مذہبی تعصبات اور جذبات جنھیں کانگریسی لیڈروں نے ۲۰ء سے ۲۲ء تک حکومت کے خلاف ایک مشترکہ جنگ کے لئے ابھار رکھا تھا، اب آپس کی سر پھٹول میں کام آنے لگے۔

دہلی کانگریس کے بعد ہی لیجسلیٹیو کونسل اور اسمبلیوں کے انتخابات کا زمانہ آ گیا، سوراجیوں نے کامیابی کے لئے اپنی پارٹی نیز کانگریس کے متحدہ وسائل کا پورا فائدہ اٹھایا، صوبہ متوسط اور بنگال میں ان کی ایک فیصلہ کن اکثریت ہو گئی، اور دوسرے صوبے کی

کونسلوں میں نیز انڈین لیجسلیٹیو اسمبلیوں میں انھیں کافی تعداد میں جگہیں مل گئیں اور کسی جگہ بھی کوئی اکیلی پارٹی ان کی پارٹی سے بڑی نہیں تھی
دسمبر ۱۹۲۳ء میں کانگریس کا سالانہ اجلاس کوکناڈا میں منعقد ہوا۔ مسٹر محمد علی صدر تھے، کونسل کے داخلے کے متعلق کانگریس نے
تقریباً دہلی ہی کے ریزولیوشن برقرار رکھے اور تعجب کی بات یہ ہے کہ سہ گانہ مقاطعہ کا مقدس ضابطہ بھی برقرار رکھا گیا۔
یہ بھی بہت اہم ہے کہ کانگریس کے سامنے یہ مسئلہ پھر پیش ہوا کہ اس کے بنیادی مسلک میں ترمیم کرکے ہندوستان کی تمام سیاسی جدوجہد
کا نصب العین "مکمل آزادی" قرار دیا جائے لیکن سوراجیوں اور غیر تبدیلی پسندوں کی اکثریت نے اس کو مسترد کر دیا۔
مسلمان ممبروں سے ایک عارضی اور وقتی معاہدہ کرکے مسٹر داس نے بنگال لیجسلیٹیو کونسل میں اپنی مستقل اکثریت قائم کرلی تھی۔ اس
صورت سے بنگال میں نیز صوبہ متوسط میں سوراج پارٹی کے لوگ بجٹ کو مسترد اور وزراء کو برخاست کر دینے میں کامیاب ہو گئے۔
تاہم حکومت کا چلنا ناممکن نہیں ہوسکا، کیونکہ دستور کی رو سے گورنر کو کافی اختیارات حاصل تھے، کہ وہ وزیروں کے بغیر بھی صوبہ کا
نظم و نسق چلاتا رہے، سوراجیوں کی سب سے زبردست اور قابل دید لڑائی وہ تھی جو لیجسلیٹیو اسمبلی میں ہوئی، اس اسمبلی کا افتتاح ۳۰ جنوری
سنہ ۱۹۲۴ء کو لارڈ ریڈنگ نے دہلی میں کیا تھا، سوراجیوں نے آسانی سے انڈی پنڈنٹ پارٹیوں کو ملا کر اسمبلی میں اپنی مستقل اکثریت قائم کرلی تھی۔
پنڈت موتی لال نہرو نے ایک ریزولیوشن کے ذریعہ یہ مطالبہ کیا کہ ایک گول میز کانفرنس طلب کی جائے جو ہندوستان میں مکمل ذمہ دار
حکومت قائم کرنے کے لئے ایک اسکیم تیار کرے، اس ریزولیوشن پر زبردست معرکہ آرائیاں ہوئیں، پورے تین دن تک مباحثہ کا بازار گرم
رہا، ۷۶ ووٹ موافقت میں آئے اور ۴۸ مخالفت میں، ریزولیوشن پاس ہوگیا، اس ایوان کے تقریباً تمام منتخب ممبروں نے ریزولیوشن
کی موافقت ہی میں ووٹ دئے۔
قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ فروری ۱۹۲۴ء کے شروع میں سزا کی میعاد کے ختم ہونے سے بہت پہلے ہی گاندھی جی یرودا جیل سے
رہا کر دئے گئے۔ روبصحت ہونے کے ساتھ ہی اُنھوں نے ایک بیان شایع کیا، کہ وہ اب بھی سہ گانہ مقاطعہ (بشمول مقاطعہ کونسل)
کے حامی تھے، میدان سیاست میں گاندھی جی کی اس اچانک مداخلت نے سوراجیوں کے لئے اسمبلی میں بہت نازک صورت حال
پیدا کر دی، بہر حال انہوں نے کسی طرح گاندھی جی کو اس پر آمادہ کرلیا، کہ کسی قطعی فیصلہ پر پہنچنے تک وہ سوراجیوں کو بدستور اسمبلی میں
اپنا کام جاری رکھنے دیں۔
اس زمانہ میں حکومت کو اسمبلی میں شکست پر شکست ہو رہی تھی پنڈت نہرو نے بجٹ کے ابتدائی تین مطالبات کو مسترد کرنے کی
تحریک پیش کی اسمبلی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ اس قسم کی تجویز پاس ہوگئی، اسی طرح فائی نینس بل پیش کرنے کی اجازت ۶۰ اور ۵۷ ووٹ
کے فرق سے مسترد کر دی گئی، اس کے علاوہ حکومت کی شدید مخالفت کے باوجود سوراجیوں کی یہ تجاویز اسمبلی میں پاس ہوگئیں کہ
سنہ ۱۸۱۸ء کے ضابطہ نمبر ۳ کو منسوخ کر دیا جائے جنوبی افریقہ کے کوئلہ پر برابر کا محصول عائد کیا جائے اور سکھوں کے معاملہ میں
ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی جائے، اسمبلی میں نمایاں کامیابیوں سے سرشار ہوکر اپریل کے شروع میں پنڈت نہرو گاندھی جی سے ملنے
کیلئے جوہو (بمبئی کے ساحلی مضافات میں ایک مقام ہے) تشریف لے گئے، کئی ہفتہ تک گفت و شنید کا سلسلہ جاری رہا۔ پنڈت جی چاہتے
تھے کہ سوراج پارٹی کے لوگ کونسل میں جو کچھ جد وجہد کر رہے ہیں گاندھی جی اس کی پوری تائید اور حمایت کریں، برعکس اس کے
گاندھی جی اپنے سہ گانہ مقاطعہ (اسکول عدالت کونسل) سے ذرہ برابر ہٹنے پر تیار نہ تھے، اور انہوں نے سختی کے ساتھ پنڈت جی سے
کہہ دیا کہ وہ مع اپنی پارٹی کے کونسلوں کو چھوڑ دیں ورنہ کانگریس کی مجلس انتظامیہ سے علیحدہ کر دیا جائے گا۔
گفت و شنید کے اس طویل سلسلہ کا کوئی فیصلہ کن نتیجہ نہ برآمد ہوا، اور دونوں پارٹیوں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے آئندہ اجلاس میں جو
بمقام احمد آباد جون سنہ ۱۹۲۴ء کے آخری ہفتہ میں منعقد ہونے والا تھا، معرکہ آرائیوں کی تیاری شروع کر دی۔

باسٹھواں باب

گاندھی جی رُوٹھ پڑے

گاندھی جی نے ۳ر اپریل ۱۹۲۳ء سے ینگ انڈیا کی اڈیٹری کا کام شروع کر دیا تھا، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اہم جلسے کے پہلے ہی ہم لوگوں کو اس اخبار کے ذریعے اندازہ ہونے لگا تھا کہ کانگریس کے کام کے متعلق اب ان کا منصوبہ اور لائحہ عمل کیا ہوگا،

گاندھی جی نے اس اخبار کے پہلے ہی نمبر کے افتتاحیہ مقالہ میں ظاہر کر دیا تھا کہ ان کے مسلک میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، اور اسی پرانے طریق کار کو اب بھی وہ اتنی ہی شدت کے ساتھ صحیح سمجھ رہے تھے، انہوں نے لکھا تھا کہ "میرے پاس کوئی نیا پیغام بھی نہیں ہے جسے میں ناظرین کے سامنے پیش کرسکوں، نہ کوئی نیا پروگرام ہے، میں اسی پرانے پروگرام کو اگر پہلے سے زیادہ نہیں تو اتنا ہی صحیح اور نتیجہ خیز اب بھی سمجھتا ہوں"

گاندھی جی کانگریس کی تنظیم کے متعلق جو کچھ کرنا چاہتے تھے اس کے متعلق اپنی راہ عمل متعین کرنے میں البتہ انھیں تھوڑا سا وقت لگا، انہوں نے کانگریس کی گذشتہ دو سال کی تاریخ یعنی اس زمانہ کے حالات کا جب وہ جیل میں تھے، بعجلت تمام مطالعہ کیا زیادہ تر معلومات انہوں نے غیر تبدیلی پسند پارٹی کے ان افراد سے حاصل کیں، جو ان کے پکے معتقدین میں سے تھے، اس کے علاوہ پنڈت موتی لال اور سوراج پارٹی کے دوسرے لیڈروں سے گفت وشنید کے دوران میں بھی انہوں نے تمام سیاسی حالات کا پورے اطمینان کے ساتھ جائزہ لے لیا۔

جیسا کہ مشہور ہے گاندھی جی اپنے خیالات پر جمے رہنے والے لوگوں میں سے ہیں، گذشتہ دو سال کے دوران میں چار گھنٹہ یومیہ چرخہ کاتنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گاندھی جی کانگریس کو سوت کاتنے کا ایک ادارہ بنا دینے پر تلے بیٹھے ہیں، ان کا استدلال بہت صاف وسادہ تھا، سیاسیات میں اب بھی ان کے ٹیپ کا بند عدم تشدد اور عدم تعاون تھا، ملک تو بے چین تھا کہ عدم تعاون کی بناء پر کوئی سیاسی تحریک شروع کی جائے اور گاندھی جی پہلے سے بھی زیادہ اس پر مصر تھے کہ لوگوں کے دل ودماغ میں عدم تشدد کا جوہر اتار دیں، عدم تشدد کے بغیر عدم تعاون ان کے نزدیک اخلاقی جرم اور خودکشی کے مرادف تھا، وہ کہتے تھے کہ اس وقت فضا میں ہر طرف ذہنی اور اخلاقی تشدد کا زہر پھیلا ہوا ہے جیسا کہ آئے دن کے ہندو مسلم فسادات سے ظاہر ہے اور فضا کو اس زہر سے پاک کرنے کے لئے چرخہ سے زیادہ کوئی چیز کارآمد نہیں ہوسکتی۔

اسے بھی وہ فراموش نہیں کرسکتے تھے کہ پچھلی گرفتاری کے وقت ان کی حیثیت کانگرس کے آمر ناطق کی سی رہی ہے۔ یہ سب صحیح ہے کہ فروری ۱۹۲۲ء کی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسہ میں انھیں بہت زبردست طوفان سے دوچار ہونا پڑا تھا، اور مخالفین نے یہاں تک سر اٹھایا تھا کہ ان کی بردولی والی پسپائی پر ان کے خلاف مذمت کا ووٹ بھی پاس کر دیا تھا، لیکن وہ اس طوفان کا بہت کامیابی سے مقابلہ بھی کر چکے تھے، لہذا انہوں نے سوچا کہ گویا جادو کے زور سے ان تمام غلطیوں اور شرارتوں کا جو ان دو سال کے دوران میں کی گئی ہیں ازالہ

کر کے اب کانگریس کی اُلجھی ہوئی ڈور کو پھر سے سلجھا دیا جائے اور اس کی صورت یہ ہے کہ کانگریس کی مجلس انتظامیہ میں صرف وہ مقدس لوگ رہیں جو گاندھی جی کے پکے مقلد ہوں اور جواب بھی مقاطعہ کی اسکیم پر اتنا ہی پختہ عقیدہ رکھتے ہوں، کانگریس کی تنظیم کے متعلق اپنے احتسابی مقالہ میں جس سے ازمنۂ وسطےٰ کے عیسائی مصنفین کی سوفسطائیت اور متکلمانہ موشگافیوں کی یاد تازہ ہوتی تھی، گاندھی جی نے فرمایا:- "ینگ انڈیا مورخہ ۲۹ مئی ۱۹۲۴ء" کانگریس کی مجلس انتظامیہ میں کوئی ایسا شخص نہیں ہونا چاہیئے جو خطاب یافتہ ہو، یا کسی سرکاری اسکول میں ماسٹر ہو یا وکالت کر رہا ہو، یا لیجسلیٹیو کونسل اور اسمبلی کا ممبر ہو، یا بدیشی یا اسی ملک کے ملوں کا کپڑا پہنتا ہو، یا ایسے کپڑوں کی تجارت کر رہا ہو"۔

دوسرے ہی ہفتہ میں انہوں نے لوگوں کے حلق میں ایک اور تلخ گھونٹ اتارنے کی کوشش کرتے ہوئے تحریر فرمایا:- "لہٰذا میری تجویز یہ ہے کہ ہر منتخب ممبر مہینہ کے آخر میں خود اپنے ہاتھ کا کاتا ہوا سوت بھیجا کرے جس میں کم از کم ۱۰۰ تولہ کی ہموار اور اچھے کتے ہوئے سوت کی دس پنڈیاں ضرور ہوں ہر مہینہ کی ۱۵ تک سکرٹری کے پاس یہ سوت پہنچ جانا ضروری ہے اور جو اس مقدار میں سوت نہیں بھیجے گا اسے مستعفی سمجھ لیا جائے گا"۔ ۱۹ جون ۱۹۲۴ء کو گاندھی جی نے ایک قدم اور آگے بڑھایا، انہوں نے اپنی ان تجاویز کے مسودوں کا ایک سلسلہ شائع کرنا شروع کیا جنھیں وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سامنے پیش کرنے والے تھے چرخہ سے ان کی والہانہ محبت جس پیمانہ پر پہونچ چکی تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ جبراً چرخہ کاتنے کی تجویز کو سرفہرست رکھا گیا تھا، اس منزل پر پہنچ کر چرخہ کو کسی فوری یا آئندہ کی مہم سے قطعاً بے تعلق کر لیا گیا تھا) ان کے تیسرے ریزولیوشن کا مقصد یہ تھا کہ تمام انتخابی مجالس سے سوراجی ممبروں کو جو کونسل کے ممبر ہو گئے ہیں ہٹا دیا جائے اگرچہ جو کچھ انہوں نے (سوراجیوں) نے کیا تھا وہ بالکل دہلی اور کوکناڈا کی تجاویز کے ماتحت کیا تھا، اپنے آخری اور چوتھے ریزولیوشن میں انہوں نے ایک بنگالی انقلابی کے ہاتھوں ایک برطانوی افسر مسٹر ڈے کے مقتول ہونے پر اظہار افسوس کیا تھا۔ ان تمام تجاویز سے مسلح ہو کر گاندھی جی نے سوراج پارٹی کو اپنے (خود گاندھی جی کے) منتخب کئے ہوئے میدان جنگ میں قوت آزمائی کرنے کا چیلنج دیدیا۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اس تاریخی اجلاس میں جو احمد آباد کے میونسپل ہال میں ۲۴ء میں منعقد ہوا تھا، مجھے بھی موجود ہونے کا شرف حاصل تھا، ورکنگ کمیٹی کی منظوری حاصل کر چکنے کے بعد گاندھی جی نے جلسہ کے سامنے اپنا پہلا ریزولیوشن پیش کیا جو جبراً چرخہ کاتنے کے سلسلہ میں تھا، گاندھی جی جب اپنی تجاویز پیش کر چکے تو سوراجی ممبران نے مسٹر داس اور پنڈت نہرو کی قیادت میں، گاندھی جی کی تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے نہایت پُرجوش اور فصیح و بلیغ تقریروں کا طوفان برپا کر دیا، انہوں نے دیکھ لیا کہ اس تجویز کے تعزیری دفعہ میں سوراجیوں کو کانگریسی نظام کے ہر اقتدار و قوت کی جگہ سے ہٹانے کی ایک کھلی ہوئی آمرانہ خواہش کارفرما ہے، اس پر گاندھی جی اپنے تاثرات کے متعلق لکھتے ہیں:" آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی کارروائیوں نے میرے ذہن میں دہلی اجلاس کا جو میری گرفتاری کے پہلے منعقد ہوا تھا نقشہ پیش کر دیا، جو صورت دہلی میں پیش آئی تھی وہی یہاں بھی میرا انتظار کر رہی تھی"۔

لیکن مسٹر داس اور پنڈت نہرو ۱۹۲۲ء کے مخالفین سے ایک قدم اور آگے بڑھ گئے تھے، انہیں معلوم تھا کہ اپنے وطن میں گاندھی جی ضرور اکثریت کی تائید حاصل کر لیں گے اور جیت جائیں گے، لہٰذا انہوں نے اس کی دھمکی دی کہ قبل اس کے کہ ان کے اخراج کا نادرشاہی حکم نافذ کیا جائے وہ جلسہ سے واک آؤٹ کر جائیں گے، چونکہ گاندھی جی پر اس کا کوئی اثر نہ پڑا، لہٰذا قبل اس کے کہ چرخہ والے ریزولیوشن پر ووٹ لئے جائیں تمام سوراجی یک جماعت ہو کر جلسہ سے باہر آ گئے۔

میں چونکہ کٹر قسم کا غیر تبدیلی پسند تھا، لہٰذا میں اپنی جگہ پر بیٹھا رہا، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس جلسہ میں کوئی زبردست قومی ڈرامہ ہونے والا ہے، اس زبردست واک آؤٹ پر تمام غیر تبدیلی پسند حضرات ہکا بکا رہ گئے اور ہر شخص اپنے دل میں سوچتا تھا کہ داس اور نہرو جیسے سورما وطن دوستوں کو نیشنل کانگریس سے نکال دینے پر آخر ملک کیا کہے گا، لیکن کسی میں یہ جرأت نہ تھی کہ ان جذبات کا

اظہار بھی کر سکے' جلسے نے ووٹ کی کارروائی شروع کی، چرخہ کی تجویز ۶۷ اور ۳۷ ووٹوں کے فرق سے پاس ہو گئی۔
لیکن گاندھی جی بھی بہت دل شکستہ ہو گئے اور انہوں نے جلسہ کی کارروائی ملتوی کر دی تاکہ مسٹر داس اور پنڈت نہرو سے بھی طور پر ان تجاویز کے متعلق گفتگو کریں۔

سارے دن گفت وشنید کا سلسلہ جاری رہا نتیجہ جو کچھ ہونا تھا وہ بھی ظاہر ہی تھا، داس اور نہرو کو علیحدہ کرنے کے بعد کانگریس قرون وسطےٰ کے چرخہ کاتنے والوں کی ایک مذہبی جماعت ہو کر رہ جاتی، دوسری طرف یہ تھا کہ اگر گاندھی جی کی مقناطیسی شخصیت سے کانگریس محروم ہو جاتی تو سارے ملک میں اس کا سکہ نہیں چل سکتا تھا، لہذا کانگریس اپنے اندر غیر تبدیلی پسند گاندھی پرستوں اور تبدیلی پسند سوراجیوں' دونوں کی گنجائش نکالنے پر مجبور تھی، دہلی اور کوکناڈا کی طرح پھر دونوں پارٹیوں نے گویا زندہ رہو اور زندہ رہنے دو کے مقولے پر عمل کیا، سوراجیوں نے چرخہ کاتنے والے اصول کو اس شرط کے ماتحت مان لیا کہ وہ تعزیری دفعہ جس کی رُو سے چرخہ نہ کاتنے والوں کو عہدوں سے نکال دینے کی تجویز تھی، حذف کر دی جائے' یہ لوگ ہمہ گانہ مقاطعہ کے اصول کو بھی ماننے پر آمادہ ہو گئے' بشرطیکہ سوراج پارٹی کے ان ممبروں کو جو دہلی اور کوکناڈا کے ریزولیشنوں کے ماتحت کونسلوں میں داخل ہوئے تھے، کونسلوں کے مقاطعے کے سلسلہ میں کسی بد عہدی کا مرتکب نہ سمجھا جائے، اس طرح دونوں پارٹیوں کے لئے تقریباً وہی پہلے کی سی صورت قائم رہ گئی، گاندھی جی کو یہ تسکین تھی کہ انہوں نے جبراً چرخہ کاتنے والے اصول کو کانگریس کمیٹی سے منوا لیا، ان دونوں تجاویز کے متعلق جب سمجھوتہ ہو چکا تو انھیں کمیٹی کے سامنے پیش کیا گیا، اور دونوں پارٹیوں کے اتفاق رائے سے یہ تجاویز پاس ہو گئیں۔ لیکن گاندھی جی کا دل جانتا تھا کہ انھیں کیوں اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی اور پے در پے شکستوں کا مُنہ دیکھنا پڑا" پہلے ریزولیشن میں جو کہ چرخہ کاتنے کے متعلق ہی، تعزیری فقرات نہیں رہ گئے" میری اس سلسلہ کی شکستوں میں یہ پہلی شکست ہے، تیسرا ریزولیشن جس کا تعلق پنجگانہ مقاطعہ سے ہے، اس میں میری اصلی شکست ہوئی"۔
(ینگ انڈیا مورخہ ۳ر جولائی ۱۹۲۴ء)

لیکن گاندھی جی کی داستانِ ہزیمت یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ مسٹر ڈے کے سیاسی قتل کی مذمت کا جو ریزولیشن گاندھی جی نے پیش کیا تھا، اس پر بڑی معرکہ آرائی ہوئی مسٹر داس نے اس تجویز میں ایک ترمیم پیش کی تھی جس میں بنگال کے انقلاب پسندوں کے جذبات اور خیالات کا بھی قدرے پاس کیا گیا تھا، بہرحال ان کی یہ ترمیم ۸ ۷ اور ۰ ۷ ووٹوں کے فرق سے نامنظور ہو گئی اور گاندھی جی کا اصلی ریزولیشن پاس ہو گیا" گوپی ناتھ سنہا والا ریزولیشن اور بھی زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوا، اس وقت کی تقریریں اور ان کے نتائج اور اس بعد کے منظر نے پوری طور پر میری آنکھیں کھول دیں میں سمجھتا ہوں کہ اس ورکنگ کمیٹی میں مسٹر داس کو فتح ہوئی، اگرچہ بظاہر وہ آٹھ ووٹ سے ہار گئے" ۸ ۴ رائے دہندوں میں ان کا ستر آدمیوں کی تائید حاصل کر لینا بھی میری نظر میں بڑی معنی خیز چیز تھی .... اس ریزولیشن نے میری شکست مکمل کر دی"۔ (ینگ انڈیا مورخہ ۳ ر جولائی ۱۹۲۴ء)

یہ سلسلہ وار غیر متوقع ہزیمتیں گاندھی جی کے لئے یقیناً ناقابل برداشت تھیں ان کے جیسے بلند مرتبہ کا سیاسی لیڈر دو برس سزا بھگت کر اور ایک مہلک بیماری سے نجات حاصل کر کے کانگریس کے جلسے میں پہلے پہل شریک ہوتا ہے، ایسی حالت میں بالکل بجا طور پر اسے اس قسم کی .... ذلت آمیز شکستوں کے بجائے کامیابی ہی کامیابی کی توقع ہونی چاہئے تھی۔ لیکن اب بھی ان کا پیمانۂ ذلت لبریز نہیں ہوا تھا، انہوں نے اپنے بعض معتمد باز مقلدوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اُنھیں اسی طرح اس دفعہ کی زد سے بچا لیں گے مگر جیسے ہی اُنہوں نے استثنا کی تجویز پیش کی، خود مقلدین میں سے لوگوں نے مخالفت کی بوچھار شروع کر دی ان میں سے ایک نے صدر سے کہا کہ یہ تجویز ضابطہ کے خلاف ہے اور صدر نے اسے خارج کر دیا۔

اس اہم قصہ کا بقیہ حصہ خود گاندھی جی کے الفاظ میں سنیئے: "اس کے بعد میں اپنے دل کی گہرائیوں میں ڈوب گیا، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ گویا خدا ان لوگوں کی معرفت مجھ سے یہ کہہ رہا ہے کہ ارے احمق! تو اب ناقابل برداشت ہوگیا ہے، اب تیرا وقت ختم ہوچکا، میں نے ہندوستانی میں ایک مختصر سی تقریر کرتے ہوئے ان لوگوں کو اپنا خون شدہ دل چیر کر دکھانے کی کوشش کی، مجھے رونا مشکل سے آتا ہے رونے کا موقعہ بھی آتا ہے تو میں آنسو پی جاتا ہوں لیکن اس وقت دلیری کے ساتھ ضبط کرنے کی تمام کوششوں کے باوجود میں برداشت نہ کرسکا اور رو پڑا...... میں یہ دیکھ کر رو رہا تھا کہ میری بُری طرح شکست اور ذلت ہوئی ہے۔"

ترسیٹھواں باب

ذلیل مفاہمت

مجھے امید ہے کہ ناظرین معاف کریں گے اگر میں تھوڑی دیر کے لئے رک کر ان سیاسی واقعات کے متعلق اپنے تاثرات کا ذکر کردوں، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی ریاکارانہ مفاہمت نے مجھے ایک شدید کوفت میں مبتلا کردیا تھا اور میں ایسا محسوس کر رہا تھا کہ شاید گجرات کے کانگریسی نظام سے مجھے اپنا رہا سہا تعلق بھی ختم کرکے ان سات اہم سالوں کے بعد احمد آباد کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہنا پڑے گا۔

۱۳ مارچ ۲۴ء کو جیل سے باہر آنے کے بعد چند ہی مہینوں میں مجھے بھی جیل سے آئے ہوئے دوسرے لوگوں کی طرح ایک قسم کی مجنونانہ زود حسی کے دورے شروع ہوگئے تھے، ہر طرف سے مختلف قسم کے تصورات اور تاثرات آ آکر میرے دماغ کو بوجھل کر رہے تھے، لیکن ان سے جیسے ہی مجھے رفتہ رفتہ نجات ملنے لگی۔ میں نے اپنے ادبی اور علمی مشاغل کو شروع کردیا، میں نے گجراتی میگزین "یگ دھرم" کی ادارت بھی اپنے ذمہ لے لی، گذشتہ سال کے سیاسی واقعات کا جائزہ لینے کے بعد میں نے اس انتشار و پستی کی پوری اہمیت محسوس کرلی جو گیا کانگریس کے بعد سے واقع ہو رہی تھی، گاندھیت کی تحریک نے جو سیاسی کجراہی اختیار کرلی تھی اسے دیکھ کر میرے اندر سیاسی اضطراب کی جو آگ سُلگ رہی تھی اور جس میں وقتاً فوقتاً شعلے بلند ہوتے رہتے تھے، (مثلاً ۱۹۲۰ء میں جب نوجیون کی سب اڈیٹری سے مستعفی ہوا یا ۱۹۲۱ء میں جب میں نے گجرات کی صوبائی کانگریس کمیٹی کے مہتمم کے عہدہ سے استعفےٰ دیا،) وہ سوراجی تحریک کا جائزہ لینے کے بعد پھر بھڑک اُٹھی۔

اب بھی جیل کی زندگی کا وہ ایک سال ایک ڈراؤنے خواب کی صورت میں مجھے کچھ دن تک پریشان کرتا رہا، ان توہمات سے متاثر ہوکر میں نے گاندھی جی کو ایک مثالی پیکر بلکہ دیوتا سمجھنا شروع کیا، میرے احباب کا اصرار تھا کہ میں اپنی جیل کی زندگی کے تاثرات قلم بند کرکے میگزین میں شایع کروں، میں نے گاندھی جی کی جیل کی زندگی اور ان کی وہاں کی لڑائیوں پر مضامین کا ایک سلسلہ شایع کرنا

شروع کیا، میرے دل و دماغ کی گہرائیوں میں جو ایک شدید ہیجان برپا تھا، اس کے اثرات ان مضامین میں نہیں ظاہر ہونے پائے یہاں تک کہ گاندھی جی کے آشرم کے نہایت کٹر لوگوں نے بھی اِن مضامین کو بہت پسند کیا، حالانکہ اس میں شک نہیں کہ اِن تمام مضامین میں طنز و تشنیع کی ایک لطیف اور نازک سی لہر شروع سے اخیر تک ضرور موجود تھی۔

جیل کی زندگی کے سلسلہ میں جو کچھ کرب و کوفت باقی رہ گئی تھی، اس سے اس طرح سبکدوش ہونے کے بعد میں اس پر مستعد ہوا کہ سوراج پارٹی کے سیاسی فلسفہ کا تجزیہ کروں پورے ایک سال کی سیاسی خموشی کے بعد میں نے اس قسم کے کام میں ہاتھ لگایا تھا، لہٰذا مجھے بہت احتیاط سے قدم اٹھانے کی ضرورت محسوس ہوئی، میں نے سوچا کہ اس مسئلہ پر ایک پکّے غیر تبدیلی پسند کی حیثیت سے نہیں، بلکہ ایک محقق کی حیثیت سے نظر ڈالوں، قدرتاً میرے مضامین سے بعض احباب کو سخت حیرت و استعجاب ہوا، کچھ دبی زبان میں چہ می گوئیاں بھی شروع ہوئیں، میرا طرز استدلال بالکل صاف و سادہ تھا، میں نے پوری سوراجی تحریک کو ترکِ موالات کے کٹر عقیدے کے خلاف ہندوستان کے تعلیم یافتہ سیاستدانوں کی بغاوت قرار دیا، کانگریس کو اور ملک کو تعمیری پروگرام اختیار کر لینے کی ترغیب دی گئی تھی جس میں وہ جادو والا چرخہ بھی شامل تھا، اور انہیں چیزوں کو پُر امن بغاوت کے راستے پر چلنے کے لئے نشان راہ بتایا گیا تھا، اب بغاوت کا تصور ہی خواہ اُسے سول نافرمانی کے لئے یا خاموش مقاومت کے لئے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا گیا تھا، ناگپور کے طوفان کے اثرات بھی باقی نہیں رہے تھے، لہٰذا چرخہ کاتنے کا پروگرام خواہ کتنا ہی مفید اور ضروری کیوں نہ ہو، جب سیاسی جد و جہد سے بالکل الگ کر لیا جائے گا، تو لامحالہ اسے محض انسانی خدمت ہی کے ذیل میں جگہ مل سکتی ہے، میں نے لکھا تھا کہ دو سال تک گاندھی جی کے مسلک ترک موالات پر چل کر اور اس کی بے حاصلی سے مایوس ہو کر لیڈروں نے کونسلوں کو توڑنے کا وہی پروگرام اختیار کیا جس کا خاکہ مسٹر داس نے ستمبر سنہ ۱۹۲۰ء میں کلکتہ میں پیش کیا تھا، اس وقت گاندھی جی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ قوم کو اپنے طور پر لے جا کر حکومت کے خلاف صف آراء کر دیں گے، اس پر مسٹر داس اور ان کی سوراج پارٹی کے رفقاء نے اس مسیح لڑکی ایسی عقیدتمندی کے ساتھ اتباع کی کہ دنیا حیرت میں رہ گئی لیکن یہ زبردست مہم سر دست ناکام ہو چکی تھی، اور اب جب کہ ترکِ موالات ہی کو عین مقصود قرار دیا جا رہا تھا اور اُسے شاستر کی حیثیت دی جانے لگی تو سیاستداں طبقہ اس انوکھی قسم کی راسخ الاعتقادی سے علیٰحدہ ہو کر حکومت پر حملہ کرنے کے لئے کوئی معقول راستہ تلاش کرنے لگا۔

میں جس زمانہ میں سوراج پارٹی کی حکمت عملی کا غیر جانبدارانہ تجزیہ و مطالعہ کرنے میں مصروف تھا اسی زمانہ میں میں نے یہ خبر سُنی کہ گاندھی جی چرخہ کاتنے کو ضروری چیز قرار دینے کی تجویز کر رہے ہیں میں نے اس افواہ کو نظر انداز کر دیا۔ لیکن جلد ہی ایسی صورت پیدا ہو گئی کہ مجھے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی، جبری طور پر چرخہ کاتنے اور سوراج پارٹی والوں کو کانگریس سے نکالنے کے متعلق ان کے مضامین دیکھ کر میں مبہوت ہو گیا، مجھے یاد ہے کہ ان میں کا ایک مضمون ڈاکٹر سمنت مہتہ نے اور میں نے ساتھ پڑھا تھا، ہم دونوں آدمیوں نے اس موضوع پر بہت بے تابی کے ساتھ اور کافی دیر تک گفتگو کی اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ سیاسی صورت حال کے متعلق ہمارے جو کچھ خیالات ہیں ان کی بناء پر اب ہم اپنی اس ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتے، کہ ہمیں گاندھی جی کی اِن تجاویز کی براہ راست مخالفت کرنی چاہیئے جن کے ذریعہ وہ کانگریس کو ازمنۂ وسطےٰ کے مقدس چرخہ کاتنے والوں کی ایک جماعت بنا دینا چاہتے ہیں۔

میں جانتا تھا کہ کس قسم کا خطرہ مول لے رہا ہوں سنہ ۱۹۲۱ء میں مجھے گاندھی جی کے مقربین کی ایک جماعت سے نسبتاً معمولی مسائل پر جنگ کرنی پڑی تھی لیکن اب خود اس زبردست لیڈر سے مقابلہ تھا، اب ہمارے راستے الگ ہوتے نظر آتے تھے، میرے سامنے دو ہی صورتیں تھیں، یا تو میں اکثریت کی رائے کی قربان گاہ پر اپنے خیالات کی بھینٹ چڑھا دوں، اور گجرات کی اس مقدس برادری کا ایک غیر مطمئن اور مایوس رکن بنا رہوں یا اپنے سات سال کے مخلص رفیقوں کے سب و شتم کا نشانہ بنوں، اور اپنی

سیاسی ترقی کے تمام راستے مسدود کر لوں، میں نے ضمیر کی آواز پر لبیک کہنے کو ترجیح دی اور احمد آباد کے مقدس شہر اور گجرات کے خوبصورت صوبہ کو خیرباد کہہ کر نیا میدان عمل تلاش کرنے کا تہیہ کر لیا۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسہ نے میری رہی سہی امیدیں بھی ختم کر دیں۔ میں گاندھی جی کو کٹر نظریہ پرست اور سوراجیوں کو بے اصولے قسم کے مصلحت پرست سمجھتا تھا، ایک چرخہ کا شیدائی تھا تو دوسرا کونسلوں کا، ایسی حالت میں تصادم ناگزیر تھا اگر ان دونوں میں سے کسی ایک پارٹی کو بھی فیصلہ کن اکثریت کی تائید حاصل ہو گئی ہوتی یا ایک نے دوسرے کو اپنا ہمنوا بنا لیا ہوتا تو دونوں کے لئے عزت کا باعث ہوتا، لیکن یہ سارا کھیل ایک ذلیل قسم کی مفاہمت پر ختم ہوا تھا، گاندھی جی اس پر رضامند ہو گئے کہ سوراجیوں کو کونسلوں میں رہنے دیا جائے اگرچہ اس رضامندی پر وہ بہت بددل تھے، دوسری طرف سوراجیوں نے چرخہ کاتنے کی تجویز کو مان لیا اگرچہ وہ نجی طور پر کھلے بندوں اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے، میں ان لیڈروں کی مناظرانہ بازی گری کا اپنے پرانے پنڈتوں کی منطقی موشگافیوں کے کرتبوں سے مقابلہ کیا کرتا تھا، جو اپنی ساری اختراعی قوت اس میں صرف کر دیتے تھے، کہ پرانی کتابوں کی عبارات میں کسی نہ کسی طرح کچھ نئے معنی پہنائے جائیں۔

بہرحال گاندھی جی اور مسٹر داس دونوں نے بغیر کسی دقت کے تحریک ترک موالات کی پرانی گاڑی پر اپنے اپنے مال لاد دئے، اور اب دونوں ایک ہی انجن کو لے کر دو مختلف سمتوں میں چلانے پر راضی ہو گئے، دونوں کے متبعین سوفسطائی معرکہ آرائی میں منہمک ہو گئے، متعصب ہندو اور مسلمان رہ رہ کر ان دونوں کو اپنی آتشبازی کا تماشہ دکھاتے رہے،

اگر اس وقت میں مارکس اور لینن کے نظریہ سے واقف ہوتا تو میں ان متضاد عناصر کو زیادہ صحیح تناظر میں دیکھ سکتا، احمد آباد کے اس ڈرامہ میں جتنے نمایاں کردار تھے وہ سب وفاشعار اور اطاعت گذار قسم کے لوگ تھے لہٰذا سوسائٹی کے سرمایہ دار (متوسط) طبقہ کے غیر تنخواہ یافتہ حمائتی کے طور پر یہ تمام اعتدال پسند لوگ کام کرتے رہے، چرخہ کو ہر مرض کی دوا قرار دیکر گاندھی جی نے چاہا کہ کسان طبقہ کی ابدی غلامی کی زنجیریں ان کے طبقاتی دشمنوں یعنی تجار، مہاجن بل کے مالکان اور دلالوں کے رحم و کرم سے وابستہ کر دیں تاکہ ان غریبوں کو کبھی بغاوت کرنے کی نوبت نہ آئے، سوراج پارٹی والے کونسلوں کے مقاطعے کے جیکاروں کو ختم کرنے میں بالکل حق بجانب تھے کیونکہ اب عوام کی باغیانہ قوت اور جذبے کو آئینی کارروائیوں کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ملتا تھا، لیکن ان کا کبھی غریب عوام سے یہ وعدہ بھی فریب ہی فریب تھا کہ یہ لوگ کونسلوں میں جا کر اپنی چالوں سے کونسلوں کو توڑ دینگے اور اس طرح حکومت کی مشنری معطل ہو کر رہ جائے گی لہٰذا ظاہری اختلاف کے باوجود یہ دونوں پارٹیاں اپنے سرمایہ دارانہ نظریہ میں اور اس عقیدہ میں کہ موجودہ نظام صحیح ہے مکمل طور پر متحد تھیں اور چونکہ اب دونوں نے شیطانی نظام حکومت کو تباہ کرنے کے انقلابی نعرے ترک کر دئے تھے، لہٰذا ان کے اصلاحی نظریہ نے ایسے سرمایہ داروں کے ساتھ بھی اتحاد کی راہیں کھول دیں جو کانگریس میں شامل نہ تھے۔

گاندھی جی کو بھی سوراج پارٹی سے اپنے بنیادی اتحاد کا اعلان کرنے میں دیر نہیں لگی، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسہ کے دوسرے ہی دن گاندھی جی نہایت تپاک اور دوستانہ انداز میں پنڈت موتی لال نہرو سے ملے تاکہ ان تند و تیز مناقشوں اور مباحثوں کے تلخ اثرات محو ہو جائیں چند ہی دنوں کے بعد جب وہ پھر پنڈت جی سے ملے تو انہوں نے فرمایا کہ اگر اس منزل پر سوراج پارٹی کے لوگ کونسلوں کو چھوڑ دیں تو یہ بڑی تباہ کن چیز ہوگی نیز یہ کہ جہاں تک آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا تعلق ہے پہلے کی بہ نسبت اب سوراجیوں کی پوزیشن کہیں زیادہ مضبوط ہے، جب پنڈت جی نے گاندھی جی کو یاد دلایا کہ ابھی حال ہی میں آپ سوراجیوں کو قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ غلط راستہ پر چل رہے ہیں تو گاندھی جی نے فوراً جواب دیا ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ ایک بیان تو مستقل ہے اور اصول پر مبنی ہے دوسرا صرف موجودہ حالات کے لئے ہے اور تجربہ پر مبنی ہے پنڈت جی کونسلوں کی مہم کے بارے میں گاندھی جی کی مکمل اخلاقی تائید حاصل کر لینے پر بے حد مسرور تھے، ادھر گاندھی جی کچھ نئے نئے قواعد مرتب کر رہے تھے تاکہ اس کے ذریعہ کانگریس کے جہاز کو ترک موالات کی بھنور سے نکال کر ایسے راستہ پر لے چلیں کہ چرخہ کی آفاق گیر سلطنت قائم ہو جائے۔

اگلے باب میں ہم بیان کریں گے کہ گاندھی جی کیونکر بعجلت تمام انقلاب دشمنی کا محاذ قائم کرنے پر اتر آئے۔

چونسٹھواں باب

چرخہ کی خدمت

اپنی انتہائی کوششوں کے باوجود گاندھی جی اس پر قادر نہ ہو سکے کہ ترکِ موالات اور مقاطعہ کے مسلک کے ساتھ ساتھ سوراجیوں کی کونسل والی پالیسی کو اپنے دل میں جگہ دے سکیں، انہوں نے چاہا تھا کہ غیر مقدس سیاسی کارکنوں کو کانگریس کی ہر اقتدار والی جگہ سے برطرف کر دیں، مگر اس میں انھیں بُری طرح ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا، گاندھی جی کو یہ بھی توقع نہ تھی کہ آئندہ چل کر اس محال کو ممکن بنا لیں گے، کیونکہ سوراجی ایک جماعت ہو کر کانگریس سے الگ ہو جانا زیادہ پسند کریں گے، بہ نسبت اس کے کہ اس میں ذلیل ہو کر رہیں، اور اگر یہ نکل گئے تو کانگریس اپنے چرخے والے پروگرام کی مکمل سیاسی عریانی کو پبلک کی نظروں میں ظاہر کر دے گی، لہٰذا گاندھی جی کے دل میں یہ خلجان بڑھتا ہی رہا آخر کار اُنہوں نے دلیری کے ساتھ تہیہ کر لیا کہ اگر کافی تعداد میں چرخے چل جائیں تو وہ ترکِ موالات کے نام نہاد مسلک کو خیرباد کہنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔ ان کا استدلال بظاہر منطقی حیثیت سے بالکل درست تھا، کانگریس کے بہترین لیڈروں کو کونسلوں میں جانے کی اجازت دیدینے کے بعد کونسلوں کے مقاطعہ کے کیا معنی رہ جاتے ہیں؟ اگر ایسے زمیندار اور تاجر پیشہ لوگ جو کانگریس کمیٹیوں میں ہیں برابر سرکاری عدالتوں میں مدعی اور مدعاعلیہ بن کر مقدمہ بازی کرتے رہے، تو عدالتوں کے مقاطعہ میں کیا رہ گیا؟ یا ان خلاف ورزی کرنے والوں کو کانگریس سے علیحدہ کیا جائے یا مقاطعہ کے مسلک کو جس میں ہزاروں رخنے پیدا ہو چکے ہیں باضابطہ خیرباد کہہ دیا جائے، چونکہ پہلی صورت ناممکن ہو چکی تھی، لہٰذا گاندھی جی نے تہیہ کیا کہ مقاطعہ کے پروگرام کو باضابطہ طور پر دفن کر دیا جائے۔

لیکن گاندھی جی لین دین میں بہت پکے ہیں، وہ بغیر کچھ لئے ہوئے کوئی چیز نہیں دے سکتے لہٰذا انہوں نے اپنی اس نئی تجویز کو ایک زبردست شرط کے ساتھ مشروط کر دیا، احمد آباد والی قرارداد میں تو محض کانگریس کمیٹی کے ممبروں ہی پر چرخہ کاتنے کا فریضہ عائد کیا تھا۔ لیکن اب گاندھی جی کی خواہش تھی کہ کانگریس کے لاکھوں ممبروں میں سے ہر ایک کو مجبور کیا جائے کہ وہ روزانہ چرخہ کاتے اور کانگریس کے دفتر میں ہر مہینہ ایک معینہ مقدار میں سوت بھیجتا رہے، مختصراً یہ کہ اگر سوراجی اس پر رضامند ہو جائیں کہ عین کانگریس کے دستور میں چرخہ کاتنے کی جبری شرط کو داخل کر لیا جائے تو وہ مقاطعوں کو ملتوی کر دیں گے، گویا اب نئی کانگریس کا نعرۂ جنگ مقاطعہ یا ترکِ موالات یا سول نافرمانی یا خاموش مقاومت نہیں ہوگا بلکہ سوفی صدی چرخہ ہوگا،

اس صورت سے گاندھی جی نے ایک وار میں دو شکار کرنا چاہا، اول تو یہ کہ رکنیت کی اس نئی شرط کے ذریعے کھدّر کی صنعت کو سوگنا ترقی ہو جائے گی، دوسرے یہ کہ اب وہ اعتدال پسندوں اور آئین پرستوں کی بھی معاونت حاصل کر سکیں گے، جو محض ترکِ موالات کے پروگرام سے ڈر کر الگ ہو گئے تھے، شاید گاندھی جی خود بھی اس کو نہیں محسوس کر سکے، کہ وہ اس طرح کانگریس کو سرمایہ داروں اور متوسط طبقہ کے لوگوں بلکہ زمینداروں اور والیان ملک کے ساتھ چرخہ کی توہمانہ بنیاد پر وابستہ کر کے انقلاب دشمنی کے محاذ کو تقویت پہونچا رہے ہیں۔

اپنے دماغ میں یہ فیصلہ کر لینے کے بعد انھوں نے سوچا کہ آئندہ کے لئے بھی زمین صاف رکھی جائے، چنانچہ انہوں نے ۱۰ر جولائی ۱۹۲۴ء کو ینگ انڈیا میں "ایک پروگرام" کے عنوان سے اس موضوع پر بحث چھیڑتے ہوئے تحریر فرمایا:-

"احباب نے مجھ سے خواہش کی ہے کہ کوئی ایسا ہمہ گیر لائحہ عمل تجویز کروں جس میں راجہ مہاراجہ غیر تبدیلی پسند، اعتدال پسند، انڈی پنڈنٹ وکالت پیشہ حضرات، اینگلو انڈین، اور دوسرے تمام لوگ بھی سب کے سب شریک ہو سکیں ...... سب سے زیادہ موثر اور سب سے زیادہ تیز رفتار پروگرام جو میں تجویز کر سکتا ہوں وہ کھدر کی تنظیم، ہندو مسلم اتحاد کی ترقی اور اچھوت ادھار ہے، مجھے پختہ یقین ہے کہ اگر یہ تین چیزیں حاصل ہو جائیں، تو ہم بغیر ذرہ برابر وقت کے سوراج حاصل کر سکتے ہیں، .... لہٰذا اگر سارا ملک اس سہ گانہ لائحہ عمل کو قبول کرلے تو میں ایک سال کے لئے ترک موالات اور سول نافرمانی کو ملتوی کر دینے کا مشورہ دینے کے لئے تیار ہو جاؤں گا۔"

ان مقدمات کو طے کرنے اور پارٹی کے لیڈروں پر اس کے رد عمل کا مطالعہ کرنے کے بعد گاندھی جی نے حسب ذیل مفصل تجاویز پیش کیں (ینگ انڈیا مورخہ ۱۱ ستمبر ۱۹۲۴ء)۔

(۱) کانگریس کو ۱۹۲۵ء کے اجلاس تک کے لئے بدیشی کپڑوں کے مقاطعہ کے علاوہ ہر قسم کا مقاطعہ ملتوی کر دینا چاہیئے۔

(۲) کانگریس کو تابع تجویز اول سلطنت کے مالوں کا مقاطعہ منسوخ کر دینا چاہیئے۔

(۳) کانگریس کو اپنی تمام سرگرمیاں ہاتھ کے کاتے ہوئے اور بُنے ہوئے کھدر کے پرچار اور ہندو مسلم اتحاد کے حصول تک محدود کر دینی چاہئیں، البتہ ہندو ممبران کو اس میں اچھوت ادھار کا بھی اضافہ کر لینا چاہیئے۔

(۴) چار آنہ فیس والی شرط رکنیت منسوخ کر کے اس کی جگہ یہ شرط رکھی جانی چاہیئے کہ ہر ممبر روزانہ آدھ گھنٹہ چرخہ کاتے اور کم از کم دو ہزار گز سوت اپنے ہاتھ کا کتا ہوا کانگریس کو ماہ بماہ بھیجتا رہے، چرخہ کاتنے کی شرط رکنیت کی یہ نادر تفصیل دیکھ کر ہم لوگوں کو گاندھی جی کے اصل مقصد کے متعلق کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہ رہی۔ آخری دونوں مدوں کے متعلق تو زبانی خدمت سے زیادہ کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لہٰذا اب گویا چرخہ ہی اس نئی عمارت کا خاص رکن قرار پایا، جب ہر طرف سے اس نئی شرط پر طعن وتنقید کی بوچھار ہونے لگی تو انہوں نے حسب ذیل انداز میں اس کی وکالت شروع کی (ینگ انڈیا مورخہ ۱۶ اکتوبر ۲۴ء)۔

"چرخہ کاتنا ایک رضاکارانہ ایثار کی حیثیت سے تو ٹھیک ہے۔ لیکن شرط رکنیت کی حیثیت سے یہ عذاب جان ہو جاتا ہے، یہی اعتراض ہے جو میں اپنی تجویز کے خلاف سنتا ہوں .... مگر کیوں؟ اگر روپے کے متعلق کوئی شرط عاید کی جا سکتی ہے تو کام کی شرط کیوں نہیں عائد کی جا سکتی؟ اگر ترک منشیات کی انجمن اپنے ارکان سے یہ مطالبہ کرے کہ وہ منشیات قطعاً نہ استعمال کریں، تو کیا یہ عذاب جان ہوگا؟ کیا فرانس میں جہاں فنونِ حرب کی تربیت کو قومی وجود کے لئے ناگزیر سمجھا جاتا ہے، اگر لوگوں سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ ہتھیار چلانے کی مشق کریں تو کیا یہ عذاب جان ہوگا؟ ہندوستان کی قومی مجلس اگر چرخہ کاتنے اور کھدر بننے کو جو ایک قومی ضرورت ہے۔ شرطِ رکنیت قرار دے تو اس میں عذاب جان ہونے کا کیا سوال ہے؟"

لیکن یہ تشبیہات صحیح نہ تھیں کانگریس محض ایک قومی انجمن نہ تھی جو ہر اچھے اور فائدہ مند کام کو اختیار کرنے کے لئے آزاد ہو، کانگریس کوئی مذہبی یا تہذیبی یا انسان دوستانہ یا اقتصادی ادارہ نہیں ہے، کانگریس کے نظام کا ایک خاص مقصد تھا، اور وہ یہ کہ ہندوستان میں خود مختار حکومت قائم کی جائے، یعنی غیر ملکی اقلیت کے ہاتھوں سے سیاسی اقتدار چھین کر عوام کے نمائندوں کے ہاتھ میں دیدیا جائے دوسرے شعبوں میں چرخہ جو کچھ بھی کرامت دکھا سکے یا نہ دکھا سکے لیکن اس میں ذرہ برابر اس کا شائبہ بھی نہ تھا کہ برطانوی حکمرانوں کو اس کے ذریعہ اقتدار سے محروم نہیں کیا جا سکتا، اور گاندھی جی کے عقل دشمن پرستاروں کے علاوہ کوئی ذی ہوش انسان مہاتما جی کے اس خیال کی ہمنوائی نہیں کر سکتا کہ بدیشی کپڑے کا مقاطعہ خود بخود اہل برطانیہ کے دلوں کو اتنا پاکیزہ کر دیگا کہ وہ چیز جو انگریزوں کو اس امر سے مانع ہے کہ ہندوستانی معاملات کو ہندوستانی نقطۂ نظر سے دیکھ سکیں دور ہو جائے گی، حسب عادت وہ شاخ کو درخت سمجھ بیٹھے اور جدید علم الاقتصاد کی لاعلمی کے باعث لنکاشائر تجارت کے ذریعہ حاصل شدہ قلیل نفع اور سامراج کے اس دلو صد وہن میں فرق نہ کر سکے جو ہندوستان کے کروروں انسانوں کی محنت کی طرح سہل الحصول مشقت اور سرزمین کی کثیر المقدار خام پیداوار سے ناجائز انتفاع کی بے شمار سبیلیں

نکال لیتا۔

اب ہم پھر اپنا سلسلۂ بیان شروع کرتے ہیں۔ سوراج پارٹی والے گاندھی جی کی زود حسی کا احساس کرتے ہوئے زیادہ پس و پیش کے بغیر شرط رکنیت کی اس توسیع پر رضامند ہونے کو تیار ہو گئے، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ کونسلوں میں اپنی شدید مہم کو جاری رکھنے کے لئے انہیں کانگریس اور گاندھی جی کے نام سے فائدہ اٹھانے کی کچھ نہ کچھ قیمت دینی چاہیئے، لیکن آخر وہ کانگریس کی تمام مساعی کو کھدر کے پرچار، ہندو مسلم اتحاد کی ترقی اور اچھوت ادھار تک محدود کرنے کے لئے کیونکر تیار ہو گئے؟ وہ اس رہنمائے اعظم سے برابر کا سودا کرنا چاہتے تھے، چرخے کے معاملہ میں وہ گاندھی جی کو پوری آزادی دینے کے لئے تیار تھے تاکہ ان کو بھی اپنے کونسل پروگرام کے لئے باعزت طریقے سے کانگریس میں گنجائش نکل آئے۔

ایک سیاسی حادثہ نے ایک بار پھر اس کا موقعہ دیدیا کہ کانگریس اپنے اندرونی مناقشات کو رفع کر دے۔ ۲۵ اکتوبر سنہ ۲۴ء کو لارڈ ریڈنگ وائسرائے ہند نے ایک ایسا آرڈی ننس جاری کر دیا جس سے رولٹ ایکٹ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی، اس آرڈی ننس کی رُو سے لوگوں کو صرف شبہ کی بناء پر بغیر کسی وارنٹ یا مقدمہ کے گرفتار اور قید کر دیا جا سکتا تھا، اس پر جلد ہی عملدرآمد بھی شروع ہو گیا، اور بنگال میں بہت سے لوگ گرفتار کر لئے گئے جن میں مسٹر سبھاش چندر بوس بھی تھے، یہ اس وقت کلکتہ کارپوریشن کے چیف اگزیکٹو آفیسر تھے، اسی زمانہ میں گاندھی جی کلکتہ تشریف لے گئے وہاں پہنچ کر انھیں پورے طور سے یقین ہو گیا کہ "اگرچہ یہ ممکن ہے کہ گرفتار شدہ لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہوں جن میں حکومت شکنی کے رجحانات ہوں، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان میں سے اکثریت سوراج پارٹی والوں کی ہے۔ اگر گورنمنٹ کا یہ کہنا صحیح ہو کہ مزاجیوں کی جماعت بہت بڑی ہے، تو یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ حکومت نے خاص طور پر صرف سوراجیوں ہی پر کیوں ہاتھ ڈالا ہے؟" گورنمنٹ نے باغیانہ دہشت انگیزی کا سر کچلنے کے بہانے سوراج پارٹی پر جو بنگال کی سب سے بڑی جماعت تھی اور جس نے کلکتہ میونسپلٹی کے نظم و نسق پر پورا قبضہ کر لیا تھا، اور جو وہاں سے وزارتی حکومت ختم کر دی تھی، نہایت خونخوارانہ حملہ کر دیا تھا، اس واقعہ سے گاندھی جی کی رگِ حمیت پھڑک اٹھی اور انہوں نے غیر تبدیلی پسند کے وکیل کی حیثیت سے سوراج پارٹی کے لیڈران یعنی مسٹر داس اور پنڈت موتی لال نہرو کے ساتھ ۱۶ر نومبر سنہ ۱۹۲۴ء کو ایک نیا سیاسی معاہدہ کیا۔

ان تینوں لیڈروں کے دستخطوں سے ایک مشترکہ بیان شایع ہوا جس کے دو حصے تھے۔ پہلے حصہ میں کچھ تمہیدی عبارات میں دونوں پارٹیوں کے متحدہ سیاسی نصب العین کو بیان کیا گیا تھا، اور دوسرا حصہ عملی پروگرام سے تعلق رکھتا تھا، اس میں اک ایسی تجویز کا بیان تھا جسے دونوں پارٹیاں تسلیم کرکے بلگام کانگریس میں پاس کرنے والی تھیں۔ پہلے حصہ میں لیڈروں نے کانگریس کے خاص مقاصد اور دونوں پارٹیوں کے فوری اتحاد کی ضرورت کا ذکر کرنے کے بعد تشدد و استبداد کے اس نئے دَور پر بہت زیادہ زور دیا تھا جس کا ہدف در اصل کوئی تشدد پسند جماعت نہ تھی۔ بلکہ بنگال کی سوراج پارٹی تھی، نیز اس اہم ضرورت پر زور دیا گیا تھا کہ تمام پارٹیوں کا تعاون حاصل کرکے قوم کی پوری طاقت کے ساتھ حکومت کے استبداد کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک متحدہ محاذ پیش کرنا چاہیئے، عملی حصہ میں ایک عجیب نئی بات پیدا کی گئی تھی، ترکِ موالات کے پروگرام کو ملتوی کرنے، چرخہ کاتنے کو شرط رکنیت قرار دینے اور سہ گانہ تعمیری لائحہ عمل اختیار کرنے کی سفارش کرنے کے بعد لیڈروں نے لکھا۔ "صوبائی لیجسلیٹیو کونسلوں اور اسمبلیوں میں سوراج پارٹی کانگریس کی طرف سے اور کانگریسی ادارہ کے ایک جزو کی حیثیت سے اپنا کام جاری رکھے گی۔ اور اس کام کے لئے خود قواعد و ضوابط مرتب کرے گی، اور فنڈ جمع کرنے اور اسے خرچ کرنے کا بھی خود ہی انتظام کریگی"۔

اس معاہدہ پر تبصرہ کرتے ہوئے گاندھی جی لکھتے ہیں (ینگ انڈیا مورخہ ۱۳ر نومبر ۲۴ء) "اس معاہدہ کی رُو سے سوراجیوں اور غیر تبدیلی پسندوں کی حیثیت یکساں اور برابر کی ہو جاتی ہے .... یہ مسلّم ہے کہ ان میں سے کوئی پارٹی بھی دوسری کی مدد کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی" اور اپنی اس قلابازی کے اور بہت سے وجوہ کو بیان کرنے کے بعد اپنی خاص دلیل اس طرح پیش کی "آخری چیز یہ ہے کہ بنگال آرڈی ننس اسی کا زور دیتا ہے کہ غیر تبدیلی پسند سوراج پارٹی والوں کی جتنی زیادہ سے زیادہ مدد کر سکتے ہوں کریں"۔

اپنی سپراندازی کی حدود متعین کرنے کے بعد گاندھی جی نے اپنی زبردست کامیابیوں پر بھی اس طرح زور دینا شروع کیا۔ "چرخہ والی شرط تسلیم کر ہی لی گئی ہے، میں چاہتا تھا کہ ہر کانگریسی دو ہزار گز سوت ہر مہینہ کاتا کرے جب تک کہ بیماری یا اسی قسم کی اور کوئی مجبوری نہ ہو۔ اور

ہر موقعہ پر کھدر کا استعمال زیادہ سے زیادہ کیا جائے۔ اسے ہلکا کرکے یوں کر دیا گیا ہے کہ تمام سیاسی موقعوں پر کھدر ضرور پہنا جائے اور کسی دوسرے سے بھی بلا خاص عذر کے سوت کتوا لیا جائے تو کچھ ہرج نہیں"۔

پہلے تو خود ہمارا اشتر پارٹی کو چرخہ کاتنے یا کھدر پہننے کو شرط رکنیت قرار دینے ہی میں بہت آئینی دقتیں تھیں .... لہذا ان کے نقطۂ نظر سے یہ ایک زبردست کامیابی ہے، کہ سوراج پارٹی والوں نے چرخہ کاتنے اور کھدر پہننے کو شرائط رکنیت میں شامل کر لیا ہے اگرچہ اس کی شکل کسی قدر بدل دی گئی ہے۔

اس ذلیل لین دین کی بنیادی وجہ بھی ظاہر تھی دونوں پارٹیاں خاموش مقاومت کے نام نہاد انقلابی پروگرام کو باضابطہ ترک کرکے انقلاب دشمنی کے محاذ پر صف آراستہ ہونے پر آمادہ ہوگئیں، گاندھی جی تو اس خیال سے آمادہ ہوئے کہ کھدر کی صنعت کو ترقی دے کر بھوکوں کے لئے کھانا اور ننگوں کے لئے کپڑا فراہم کرسکیں گے، اور سوراجی اس خیال سے کہ دھواں دھار نعروں اور جے کاروں کے ذریعے آئینی مزاحمت کرتے رہیں گے، یاد رکھنا چاہیئے کہ دونوں پارٹیاں اپنے رفاہ عام اور آئینی مزاحمت کی سرگرمیوں کو برطانوی سامراج کے اندر ہی جاری رکھنا چاہتی تھیں اور ان میں سے کوئی بھی زمینداروں مالکان کارخانہ اور متوسط طبقوں کی مالی اور سیاسی امداد کے بغیر کسی نام نہاد کامیابی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی، لہذا دونوں کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اپنی سرگرمیوں کے رجعت پسندانہ رجحانات پر سفید کھدر کا مقدس لبادہ اوڑھائے رکھیں تاکہ ان کے کثیر التعداد متبعین ——— وطن دوست طلباء اور نوجوان، کسانوں، مزدوروں، اور متوسط طبقہ کے غریب لوگوں ——— کی عقیدتمند نظریں ان رجحانات کے اصلی رنگ پر نہ پڑ سکیں۔

گاندھی جی نے سوراجیوں کے مطالبات کو جس حد تک ممکن تھا پورا کرنے میں اپنا تمام زور صرف کر دیا، مگر بنگال کے ان چند محبان وطن کی ایسی اپیلوں کی طرف جو زرا زیادہ انقلابی قسم کی تھیں اُنہوں نے کوئی توجہ نہیں کی، وہ لوگ بجا طور پر اس پر زور دے رہے تھے کہ آزادی اور مکمل آزادی ہی ہمارا نصب العین ہے، اور کانگریس کے مندوبین سے اس بات کی اپیل کرتے تھے کہ وہ سوراج کے مفہوم کو متعین کرکے اسے دول متحدۂ ہند کی وفاقی جمہوریت قرار دیں، کانگریس سے اُنہوں نے یہ بھی درخواست کی کہ وہ اپنے مسلک سے "پُرامن اور جائز" کے الفاظ حذف کر دے، تاکہ ہندوستان کے اس واحد قومی نظام جماعت میں ہر خیال کے لوگ بغیر کسی دقت کے شریک ہوسکیں نیز یہ کہ کانگریس برطانوی مالوں کے مقاطعہ کا پروگرام اور مزدوروں اور کسانوں کی شکایات کے ازالے اور ان کی اقتصادی فلاح اور اخلاقی بہبود کے لئے اُنکی تنظیم کرنے میں مدد کرنے کے پروگرام کو اختیار کرلے، گاندھی جی نے اس کا اعتراف تو لیا کہ اس اپیل میں جن خواہشات کا اظہار کیا گیا ہے وہ صرف دستخط کنندگان کے خیالات نہیں ہیں بلکہ بہت سے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے خیالات ہیں۔ مگر اس کے باوجود مکمل آزادی کے تاریخی اصول کو سختی کے ساتھ مسترد کر دیا۔" دستخط کنندگان کے ذہن میں آزادی کا جو مفہوم ہے وہ یہ ہے کہ بہرقیمت اور بہر حیثیت سے انگلستان سے تعلقات منقطع کر لئے جائیں۔ مگر میں اس قسم کے قطع تعلق کو ہندوستان کی آزادی اور ترقی کے لئے ضروری نہیں سمجھتا، قطع تعلق کا بار انگریزوں پر ہونا چاہیئے"۔ گویا قطع تعلق یا غلامی کے قائم رہنے کا مسئلہ اس قسم کا ہے جو ظالم اور مظلوم کے درمیان لفظی جنگ اور بحث و مناظرے سے طے ہو سکتا ہے۔ قطع تعلق یا مسلح آزادی کے خیال سے گاندھی جی لرز اٹھے اور رضاکارانہ انحصار باہمی کے تصور سے اپنا دل خوش کرنے لگے، یہاں بھی ان کی سمجھ میں یہ نہ آیا کہ دنیا کی حکومتوں کے درمیان جو رضاکارانہ انحصار باہمی کے معاہدے ہوتے ہیں اس قسم کا معاہدہ بھی آزاد ہندوستان ہی کرسکتا ہے، شیطانی نظام حکومت کا یہ پکا دشمن اتنا پست ہوگیا کہ اس نے سوراج کی یہ تعریف کی کہ "ہندوستان کی وہ حیثیت جس کے کسی خاص موقعہ پر یہاں کے لوگ خواہشمند ہوں"۔ جہاں تک "پرامن اور جائز" ذرائع کا تعلق ہے، گاندھی جی نے کہا کہ "اگرچہ یہ میری مرضی کے بہت خلاف ہوگا تاہم میں خود اس کی تجویز کروں گا کیونکہ کانگریس میں ایسے بھی بہت سے لوگ شامل ہوگئے ہیں جو صداقت اور عدم تشدد کی ضرورت کے قائل نہیں، برطانوی مال کے مقاطعہ کا قصہ انہوں نے یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ یہ قطعاً ناقابل عمل ہے، مزدوروں اور کسانوں کی امداد والی تجویز کو انہوں نے بہت سراہا لیکن کہا کہ اس کو عملی جامہ

پہنانا بہت خطرناک اور وقت طلب بات ہی، بہرحال ان تمام مباحث کو انہوں نے حسب معمول اپنے اس ٹیپ کے بند پر ختم کیا کہ تمام محبان وطن کھدر کو فروغ دینے میں لگ جائیں، یہ ایسا پروگرام ہی جس سے تمام کام کرنے والوں کی قوت میں نشوونما ہوگا،

گاندھی جی کے خوش کن دلائل کے باوجود تاریخ کا فیصلہ یہی ہی کہ بنگالی دوستوں کا نظریہ بالکل درست تھا، کیونکہ حکومت کی تباہ کن سختیوں نے کانگریس کو ۱۹۲۷ء میں پھر اس کے بعد اور واضح طور پر ۱۹۲۹ء میں مکمل آزادی کا اعلان کرنے پر مجبور کر دیا، اگرچہ اس کے بعد سے گاندھی جی اپنی جدت طرازیوں کا پورا زور صرف کر کے ان سادہ الفاظ میں برابر پیچ در پیچ معنی پہناتے رہے۔

گاندھی جی سیاسی حیثیت سے اس درجہ مفلوج ہو چکے تھے، اور چرخہ کی آواز سے ان پر ایسی نیند طاری ہو چکی تھی کہ اس زار شاہی حکم کا بھی ان پر صرف اتنا اثر ہوا کہ تھوڑی دیر کے لئے چونک پڑے، اور سوراج پارٹی سے ایک نیا معاہدہ کر کے صلح کر لی۔

گاندھی جی کا ۱۹۲۴ء کا بقیہ قصہ بہت صاف اور سادہ ہے، دسمبر ۱۹۲۴ء میں بلگام میں جو کانگریس کا اجلاس ہونے والا تھا، اس کی صدارت کے لئے منجملہ اور لوگوں کے ان کا نام بھی تجویز کیا گیا، لیکن انہوں نے اس پیش کش کو قبول کرنے میں عجلت سے کام نہیں لیا، کئی مہینہ تک تو وہ اس سلسلہ میں بہت سے شبہات اور مشکلات کا اظہار کرتے رہے، لیکن سوراج پارٹی والوں سے معاہدہ ہوتا تھا، کہ انہوں نے فوراً اعلان کر دیا کہ میں اس انتخاب کو منظور کرتا ہوں۔

بلگام کانگریس میں جو کچھ فیصلہ ہونا تھا وہ پہلے ہی سے معلوم تھا کانگریس نے ایک قرارداد کے ذریعے کلکتہ کے معاہدہ کی توثیق کر دی، اور ترک موالات اور پنچگانہ مقاطعہ کو باضابطہ ملتوی کر دیا، سوراج پارٹی کو معہ اس کے کونسل پروگرام کے کانگریس کی غالب جماعت کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا اور گاندھی جی کو اختیار دیدیا گیا کہ وہ کل ہند چرخہ سنگھ کا افتتاح کر کے اپنی پسندیدہ خانگی صنعت کی سارے ملک میں تنظیم کریں۔

ہم کو گاندھی جی کے خطبۂ صدارت کا تفصیلی جائزہ لینے کے لئے چنداں توقف کی ضرورت نہیں ہی، انہوں نے اپنے اس بلند منصب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تحریک ترک موالات کے شروع سے اس وقت تک کے حالات کا جائزہ لیا اور نہایت ناقابل قبول اور غیر معقول الفاظ میں اپنے اس لئے بے جان پروگرام یعنی ہندو مسلم اتحاد، کھدر کا پرچار، اور اچھوت ادھار کے متعلق اپنے وہی فرسودہ دلائل بیان کرتے رہے، اس سے بڑھ کر یہ کہ سوراجیوں کے ساتھ انہوں نے جو معاہدہ کیا تھا اس کی اور چرخہ کاتنے کو شرط رکنیت قرار دینے کی متفقہ توثیق کے لئے اپنے دلائل پیش کرتے رہے۔

جہاں تک حقیقی سیاست کا تعلق ہی جسے دنیا سیاست سمجھتی ہی اس سارے خطبہ میں اس کا شائبہ تک نہ تھا، بنگال آرڈی ننس کے متعلق خطبہ کے اخیر میں چند فلسفیانہ فقرے کہہ کر اس قصہ کو سرسری طور پر ختم کر دیا گیا تھا، سوراج اسکیم کے متعلق گاندھی جی کی گفتگو نے البتہ سیاسی قدر و قیمت کے اعتبار سے واقعی ایک انوکھی چیز پیش کی ہی۔

"مقصود کار تو ہم جانتے نہیں میرے لئے تو صرف طریق کار ہی کا جاننا کافی ہی، میرے فلسفۂ حیات میں مقصود کار اور طریق کار باہم متبادل الفاظ ہیں لیکن میں عرصہ سے بابو بھگوانداس کے اس نظریہ کا قائل ہو گیا ہوں جو انہوں نے پبلک کے سامنے پیش کیا ہی، یعنی یہ کہ پبلک کو مبہم نہیں بلکہ واضح طور پر یہ جاننا ضروری ہی کہ ان کا مقصود کار کیا ہی .... خوشی کی بات ہی کہ آل پارٹی کانفرنس کی طرف سے اس کام کے لئے ایک کمیٹی بنا دی گئی ہی۔ اور ہم امید کرتے ہیں کہ وہ کمیٹی کوئی ایسی اسکیم پیش کر سکے گی جو ہر پارٹی کے لئے قابل قبول ہو۔ یہ کمیٹی اس کانفرنس کی طرف سے مقرر ہوئی تھی جو مسز اینی بیسنٹ کی تحریک پر اوران کے اعتدال پسند ادارۂ نیشنل ہوم رول لیگ کے ماتحت فروری ۱۹۲۴ء میں منعقد ہوئی تھی، میں اسکے غور و خوض کے لئے حسب ذیل نکات پیش کرتا ہوں۔

(۱) رکنیت کے لئے کسی خاص پوزیشن یا ملکیت کی شرط نہ رکھی جائے بلکہ کوئی ہاتھ کا کام رکھا جائے جیسے کانگریس میں ہی ....

(۲) تباہ کن جنگی اخراجات ختم کر دئے جائیں۔

(۳) دادرسی کے ذرائع ارزاں ہونے چاہئیں اور اسی کے پیش نظر اپیل کی آخری عدالت لندن کے بجائے دہلی میں ہونی چاہئیے۔

(۴) آبکاری اور دیگر منشیات کے ذریعہ جو مالیانہ وصول ہوتا ہی اسے ختم کر دیا جائے۔

(۵) سول اور ملٹری ملازمتوں کی تنخواہیں گھٹا کر انھیں ملک کی عام حالت کے مناسب کر دیا جائے۔

(۶) صوبوں کی پھر سے حد بندی ہونی چاہئے، جو زبان کے اعتبار سے ہو، اور ہر صوبہ اپنے اندرونی نظم ونسق اور نشو ونما کے لئے حتے المقدور مکمل طور پر آزاد وخود مختار ہو۔

(۷) ایک کمیشن مقرر کیا جائے جس کے ذریعے سے بیرونی ممالک کے تمام اجاروں کا جائزہ لیا جائے اور کمیشن جن اجاروں کے متعلق سمجھے کہ وہ جائز طور پر حاصل کئے گئے تھے، ان کی حفاظت کی پوری ضمانت دی جائے۔

(۸) ہندوستان کے والیان ریاست کو اس بات کی ضمانت دی جائے کہ ان کی موجودہ حیثیت علیٰ حالہٖ قائم رہے گی اور اس میں مرکزی حکومت کسی قسم کی مداخلت نہ کرے گی، بشرطیکہ ان ریاستوں کے باشندوں کو یہ حق دیدیا جائے کہ وہ خود مختار ہندوستان میں حسب خواہش منتقل ہو سکیں گے۔

(۹) تمام ظالمانہ اختیارات منسوخ کر دئے جائیں۔

(۱۰) ملازمت کے اعلےٰ سے اعلےٰ عہدے ہر اس شخص کو دئے جا سکیں جو اس کا اہل ہو، سول اور ملٹری ملازمتوں کے امتحانات ہندوستان میں ہوں۔

(۱۱) بشرط باہمی رواداری ہر مذہب وملت کے پیروؤں کو پوری مذہبی آزادی حاصل ہو۔

(۱۲) ایک مقررہ میعاد کے اندر ہر صوبہ کی حکومت مجالس قانون ساز اور عدالتوں کی سرکاری زبان وہی قرار دی جائے۔ جو اس صوبہ میں بولی جاتی ہو پر یوی کونسل کی زبان ہندوستانی ہو۔

لیکن اس سارے مقالہ کا اصلی زہریلی حصہ اخیر کا تھا، اپنے اس بلند منصب سے فائدہ اٹھائے بغیر گاندھی جی نہ رہ سکے انہوں نے مکمل آزادی کے مدعیوں پر چوٹ کرتے ہوئے نہایت دل جمعی کے ساتھ فرمایا: "اگر حکومت برطانیہ کا وہی مدعا ہے جو کچھ وہ ہم سے کہہ رہی ہے، اور اگر وہ واقعی دیانتداری کے ساتھ ہم کو مساوات کے درجہ پر لانا چاہتی ہے تو اس سے تعلقات منقطع ہو جانے کی بہ نسبت یہ کہیں زیادہ بڑی کامیابی ہے، بہرحال اب ۱۹۲۱ء کا باغی اس پر اتر آیا کہ برطانوی وعدوں کے فرضی دعوؤں پر بھی اسے یقین ہونے لگا، اس سے بھی بدتر یہ کہ مہاتما جی اس کو بھول گئے، کہ سامراجی انگلستان اور مظلوم ہندوستان کے درمیان کوئی مساوات ہو سکتی ہے، تو وہ ایسی ہی مساوات ہے جو شیر اور بکری کے درمیان ہو سکتی ہے بس یہ ہے کہ بکری شیر کے پیٹ کے اندر رہے گی باہر نہیں۔

گاندھی جی کے تباہ کن تبدیلی مسلک کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے مذکورہ صدر بارہ جواہر پاروں کا تفصیلی جائزہ لینا کچھ زیادہ کار آمد ثابت نہیں ہوگا، اگرچہ کوئی شخص بھی ان ضمانتوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا، جو انھوں نے سرمایہ داروں اور والیانِ ریاست کو دینا چاہا ہے، کیونکہ اگر ہندوستان پر بیرونی حکمرانوں کے ایجنٹوں ہی کی حکومت رہتی ہے اور اس ملک پر بیرونی افواج کا قبضہ رہنا ہی ہے تو اس قسم کے دستور کی تفصیلات خواہ کچھ ہی ہوں ہمارے کس کام کی۔ برطانوی سیاست نے تو مصر کی آزادی کا باضابطہ اعلان بھی کر دیا ہے لیکن اس کے باوجود برطانوی سامراج کے جان لیوا پنجوں کے نیچے یہ ملک مکمل طور پر مفلوج پڑا ہے۔

گاندھی جی کا یہ خطبہ صدارت برسوں تک ان کی اس آخری سیاسی خواہش کی نمائندگی کرتا رہا ہے، دوسرے کانگریسی لیڈروں کے برخلاف انہیں صدارت کی کرسی پر پہنچنے کے پہلے ہی آمرانہ قوت حاصل ہو چکی تھی جیل سے نکلنے کے بعد انہوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اپنی ساری قوت سماجی اصلاح کے تعمیری کاموں میں صرف کر دیں گے، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے احمد آباد والے اجلاس میں اُن کو جس سبکی ورسوائی کا منہ دیکھنا پڑا تھا اس کی بناء پر انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ تقریباً سیاسی زندگی سے بالکل علیحدہ ہو جائیں گے۔ لیکن گاندھی جی جیسا سختہ کار سیاسی آدمی اس دل چسپ میدان کو اتنی جلدی چھوڑ کر نہیں بھاگ سکتا تھا۔ کلکتہ کے معاہدہ لے

ان کے لئے راہ کھول دی تھی، انہوں نے سوراجیوں کو اس ذلیل چرخہ والی شرط کے ماننے پر بہ قیمت دیگر راضی کر لیا تھا کہ کانگریس میں ان کا سیاسی اقتدار بڑھ جائے گا، یہ کہنا بھی غالباً مبالغہ نہ ہوگا کہ سوراجیوں نے گاندھی جی کو صدارت کی گدی اس خیال سے پیش کر دی تھی کہ وہ اس بلند مقام سے نہایت تزک و احتشام کے ساتھ اس کا اعلان کر دیں کہ وہ آئندہ کئی سال تک عملی سیاست سے بالکل الگ رہیں گے۔

پینسٹھواں باب

فرقہ وارانہ پیچیدگیاں

میں سرسری طور پر ان فرقہ وارانہ فسادات کا ذکر کر ہی چکا ہوں جو گاندھی جی کے جیل جانے کے بعد رونما ہونے لگے تھے۔ اب میں ان تازہ واقعات کے متعلق جو کوہاٹ کے المناک قصے پر منتہی ہوئے اور جنھوں نے ستمبر ۱۹۲۴ء میں گاندھی جی کو اکیس۲۱ دن کے غیر معمولی برت پر مجبور کیا۔ گاندھی جی کے تاثرات کا ذرا تفصیلی جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ چند ماہ تک واقعات کی رفتار کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد گاندھی جی نے مئی ۱۹۲۴ء کے اختتام کے قریب ایک مفصل مضمون لکھ کر اپنے دل کا بخار نکالا۔ جیسا کہ انھوں نے خود صاف طور پر اعتراف کیا ہے "مسلمان عموماً غنڈہ ہوتا ہے اور ہندو بزدل ہوتا ہے۔" اس طریقہ سے گویا انھوں نے مسلمانوں کو جنگجو ہونے اور فرقہ وارانہ فسادات میں پہل کرنے کا ملزم قرار دیا۔ اس کے بعد کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اگر ہندو لیڈروں نے گاندھی جی کی خلافت تحریک کو ان تمام مصائب کی جڑ قرار دیا۔ اس کے جواب میں گاندھی جی نے فرمایا:-

"مجھے اب بھی اپنے کیے پر کوئی ندامت نہیں۔ اگر میں کوئی غیب دان ہوتا اور جو واقعات رونما ہوئے اس وقت ان سب کی پیش بینی بھی کر سکتا تو بھی میں خلافت کے ہنگامہ میں ضرور شریک ہوتا۔ دونوں فرقوں کے درمیان اس وقت تعلقات کی جو کشیدگی ہے اس کے باوجود دونوں کو اس تحریک سے فائدہ ہوا۔ عوام کی بیداری ان کی تربیت کا ایک ضروری جُز تھی۔ یہ چیز فی نفسہٖ ایک زبردست منفعت ہے۔ میں کسی قیمت پر بھی لوگوں کو پھر سُلا دینا نہیں پسند کروں گا۔ ہماری دانشمندی کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہم اس بیداری کو صحیح راستے پر لگا دیں۔"

تو کیا تشدد کی ان تمام بدمستیوں کا الزام ان بیدار شدہ عوام پر عائد ہوتا ہے؟ کیا کروڑوں ہندو مسلمان کسان جو صلح و آشتی کے ساتھ دوش بہ دوش اپنی کھیتی باڑی میں مشغول تھے یا شہر کے مزدور اور دکان دار جو دوستانہ طریقے پر اچھے ہمسایوں کی حیثیت سے امن وامان کے ساتھ اپنے اپنے کاموں میں مشغول تھے ان سب پر یک بارگی مذہبی تعصب کا ایک ایسا بھوت سوار ہو گیا کہ وہ خواہ مخواہ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے لگ گئے؟ پھر کیا ان بلووں کی ذمہ داری جو عموماً شہروں تک محدود رہتے تھے بدنام غنڈوں کے سر عائد کی جا سکتی ہے؟ گاندھی جی نے ان تمام سوالوں کا جواب زوردار نفی میں دیا اور سارا الزام دونوں فرقوں کے پڑھے لکھے لیڈروں پر عائد کیا:-

"غنڈوں کو مورد الزام ٹھیرانا محض غلطی ہے، وہ اس وقت تک کوئی شرارت نہیں کرتے جب تک کہ ہم ان کے لیے کوئی ایسی فضا نہ پیدا کر دیں۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں شہزادے کی آمد پر بمبئی میں جو کچھ ہوا اُسے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ بیج ہم نے بوئے اور فصل غنڈوں نے کاٹی، ہمارے ہی آدمی ان کی حمایت کر رہے تھے۔ ملتان اور سہارنپور وغیرہ میں جو کچھ ہوا اس کی ذمہ داری معزز مسلمانوں پر (سب کے سب نہیں) عائد کرنے میں مجھے قطعاً کوئی تکلف نہیں ہے۔ اور اسی طرح کٹارپور اور آرہ میں جو کچھ ہوا مجھے معزز ہندوؤں کو اس کا ذمے دار ٹھیرانے میں کوئی تردد نہیں ہے۔"

اِس طرح گاندھی جی نے صرف معزز آدمیوں کو نہیں بلکہ "اپنے آدمیوں کو" فرقہ وارانہ فساد پیدا کرانے کا ملزم ٹھیرایا۔ اور چونکہ وہ خود مسلمانوں پر جارحانہ اقدام کا الزام عائد کر چکے تھے لہٰذا اصل ذمہ داری اُن ذی اثر مسلمان کارکنوں پر وارد ہوتی تھی جو خلافت کی مہم میں ان

کے ماتحت کام کر چکے تھے۔ اگر اُنھیں فسادات کی اخلاقی ذمہ داری اصلی مجرموں کے سر سے ہٹا کر پس پردہ اس کی تحریک کرنے والوں پر عائد کرنے میں کوئی تردد نہیں تھا تو اُن لوگوں کو بھی اس کا حق تھا کہ وہ ساری ذمہ داری خود انھیں (گاندھی جی) کے سر تھوپ دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس چیز نے ان فتنوں کے لیے زمین تیار کر دی تھی وہ عام بیداری نہ تھی بلکہ بیداری کے محرکات تھے ہندستان نے بیرونی حکومت سے آزاد ہونے کے لیے ایک جائز اور بالکل حق بجانب جنگ شروع کی تھی، لیکن اس کی بنیاد ابتدا ہی سے غلط اور فتنہ انگیز چیزوں پر رکھی گئی تھی۔ جیسا کہ ناظرین کو یاد ہوگا گاندھی جی نے "ملک گیر ترک موالات" کا طریق کار اس غرض سے پیش کیا تھا کہ خلافت کے سلسلے میں جو ناانصافیاں ہوئی ہیں ان کی تلافی ہو سکے۔ اس وقت گاندھی جی پنجاب کے مظالم جیسا کھلا ہوا مسئلہ بھی اس مقدس مہم کے ساتھ شامل کرنے کو تیار نہ تھے اور سوراج جیسے بنیادی مسئلے کو تو کلکتہ کانگرس کے موقع پر اپنی تجویز کے مسودے میں شامل کر کے گاندھی جی نے گویا بڑی عنایت کی تھی۔ اگرچہ موخر الذکر مسئلے ضرور شامل کر لئے گئے تھے لیکن گاندھی جی نے کوشش کر کے لوگوں کے خیالات، جذبات، احساسات، اور تعصبات کا مرکز خلافت ہی کے مسئلے کو بنائے رکھا۔ ساری فضا مسلمانوں کی مذہبی تقریروں اور خطبوں سے گونج رہی تھی۔ قرونِ وسطیٰ کے مولاناؤں اور مقدس مُلاؤں نے اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر دقیانوسی توہمات اور تعصبات کو انتہائی حد تک اُبھار دیا۔ اس زبردست ہنگامے کی ساری قوتِ متحرکہ مشتعل عوام میں تفرقہ جوئی کے رجحانات اور اندھے تعصبات کو فروغ دیتی رہی جب تک اس شدتِ جوش کا رُخ حکومت کی طرف رہا بظاہر یہ کارآمد چیز بھی نظر آتی رہی لیکن جیسے ہی اس تحریک کو روکنے کا حکم دیا گیا اسی جوش و غضب کا رُخ ہمسایوں کی طرف پھر گیا اور جنگ آزادی نے خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لی۔ گاندھی جی نے ۱۹۲۱ء میں جو بیج بویا تھا اس نے ۱۹۲۳ء میں اور اس کے بعد ایک زہریلے درخت کی صورت اختیار کر لی۔

اُنھیں ہندوؤں کے تفریقی تعصبات کو برانگیختہ کرنے میں بھی کوئی پس و پیش نہیں ہوا۔ اسی تحریک میں اُنھوں نے تحفظِ گاؤ کا مسئلہ بھی ٹھونس دیا۔ بردولی کے قصے کے بعد اُنھوں نے لکھا کہ "عوام کانگرس میں اس لیے شامل ہوئے ہیں کہ وہ خلافت اور گائے کا تحفظ کرنا چاہتے ہیں۔ مسلمان سے خلافت کے امداد کی توقع ختم کر دو وہ کانگرس کو خیرباد کہہ دے گا۔ اگر ہندو سے کہہ دو کہ وہ کانگرس میں رہ کر گائے کی حفاظت نہیں کر سکتا تو ایک ہندو بھی کانگرس میں نہ رہ جائے۔" بدقسمتی سے مسلمانوں کی ذہنیت تو ضرور خلافت سے وابستہ ہو چکی تھی لیکن ہندو ذہنیت کی یہ تشخیص بالکل لغو ہے۔ کوئی ذی ہوش آدمی یقین نہیں کر سکتا کہ کروروں ہندو جو کانگرس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے تھے ان کے دل میں اس قسم کی تحریک رہی ہو کہ ہم لوگ مسلمانوں کے چھرے سے گائے کو محفوظ رکھنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ تاہم گاؤکشی کے مسئلے کو اکثر ایک سیاسی مسئلے کی حیثیت سے پیش کیا جاتا رہا۔ ہندوؤں کے مذہبی جنون کو اس امید پر زندہ رکھا جا رہا تھا کہ خلافت کی نام نہاد جنگ میں برادرانہ شرکت کا انعام انھیں یہ ملے گا کہ ہندوستان میں گاؤکشی بند ہو جائیگی۔ یہ توقعات پوری نہ ہوئیں۔ اب اگر ہندوؤں کے جذبات مجروح ہوئے، اور فرقہ دارانہ فسادات کا باعث بنے تو اس کی بھی اصل ذمہ داری گاندھی جی ہی پر عائد ہوتی ہے۔ جب تک وہ میدان میں پہنچیں پہنچیں سیاسی جنگ تو ختم ہو چکی تھی لیکن ان کے بوئے ہوئے منحوس بیج البتہ بارآور ہو رہے تھے اور زہریلی فصلیں خوب زوروں پر کاٹی جا رہی تھیں۔ مگر گاندھی جی حسب دستور خود فریبی کے جوش میں اپنے کرتوتوں کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ جس قضیۂ خلافت کی اُنھوں نے اِتنی زوروں میں حمایت کی تھی اس کے متعلق حال ہی میں جو کچھ حالات رونما ہوئے تھے ان کی طرف سے بھی وہ آنکھیں بند کئے رہے۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ سیاسی اور دُنیاوی آزادی کے مقابلے میں نہ صرف یہ کہ مذہبی محرکات کو برطرف کر دیا گیا تھا بلکہ فاتح مصطفےٰ کمال پاشا نے قسطنطنیہ سے خلافت کا قصہ ہی بالکل ختم کر دیا تھا حالانکہ ہندستان کے کج رو مسلمان خلافت کو بچانے کے لیے برابر سر دھنتے رہے۔ یہ سارا تماشا گاندھی جی کی آنکھوں کے سامنے ہوا تھا اور اس کو سمجھنا اور اس سے سبق لینا کچھ دشوار نہ تھا۔ روحانی دقیانوسیت پر دُنیاوی

قوت کی برتری، ایک خیالی مذہبی سلطنت پر جدید طرز کی جمہوریت کی فوقیت، اور شکستہ حال توہم پرستی پر جارحانہ وطن دوستی کا تفوق، خود پائے گاہِ خلافت میں ثابت ہو چکا تھا۔ مگر گاندھی جی نے اس سے نہ کوئی سبق سیکھا اور نہ پرانا خیال ترک کیا نہ انھیں اپنے کرتوتوں پر کوئی ندامت تھی نہ ان کے خیالات میں کسی اصلاح کی گنجائش نظر آتی تھی۔ فرقہ دارانہ گتھی کے سُلجھنے کی ایک ہی صورت رہ گئی تھی۔ اس ساری مصیبت کا باعث محض یہ تھا کہ مذہبی جذبات اور توہمات پر نہایت مجنونانہ طور پر زور دیا گیا تھا۔ اس میں بیحد تباہ کن رجحانات پوشیدہ ہوتے ہیں، انھیں کے باعث انسان انسان کے درمیان تفریق ہو جاتی ہے، مذہبی افکار و اعمال کے اثرات اقلیم روحانیت میں کتنے ہی سود مند کیوں نہ ہوں لیکن مادی اور سیاسی معاملات کے متعلق ہمیشہ مادی اور سیاسی ہی طریقہ پر جنگ ہونی چاہئے۔ ہندوستان کی سیاسی جنگ آزادی کی بنیاد یہ ہونی چاہئے کہ یہاں کے کروروں مختلف المذاہب افراد کو ان کی فاقہ کشی کا احساس دلایا جائے اور ان سے بتایا جائے کہ تم کو جلبِ منفعت کا ذریعہ بنالیا گیا ہے۔ گاؤکشی اور مسجد کے سامنے باجا بجانے وغیرہ کے قسم کے سوالات کو غیر متعلق اور خارج از بحث قرار دے کر نظر انداز کر دینا چاہئے۔

اس مُلک کے کروروں فلاکت زدہ انسانوں کے حقیقی اتحاد کا مظاہرہ جس میں ہر مذہب و ملت کے لوگ شامل تھے مشکل نہ تھا۔ کیا ہندو اور مسلمان زمیندار دونوں مل کر ہندو مسلمان کسانوں کا خون نہیں چوس رہے ہیں۔ کیا سود خوار مہاجن اور حکومت کے وحشیانہ استحصال نے ہندو اور مسلم کسان دونوں کو یکساں طور پر ہمیشہ کے لیے دیوالیہ نہیں کر دیا ہے؟ کیا شہروں اور قصبات کے مزدوروں کی زندگی بلا قید مذہب و ملت مالکانِ مِل کے متحدہ مظالم کے باعث جانوروں سے بدتر نہیں ہو گئی ہے؟ کیا کونسلوں اور سرکاری دفاتر کی جگھوں کے متعلق سیاسی اختلافات کا اثر دونوں فرقوں کی آبادی کے ایک بہت ہی ناقابلِ لحاظ اقلیت تک محدود نہیں ہے؟ بہر حال یہ مرکزی حقیقت اپنی جگہ پر اٹل ہے کہ ہر فرقہ کے عوام ہندستان کے زبردست قید خانے میں مقید ہیں اور ایک بیرونی حکومت ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں کے والیانِ مُلک، زمینداروں، بڑے بڑے تاجروں، اور مہاجنوں کے عملی تعاون کے ذریعے ان پر وحشیانہ مظالم کر رہی ہے۔ اور انھیں اپنی لوٹ کھسوٹ کا آلۂ کار بنائے ہوئے ہے۔ ان حالات میں ایک نکتہ رس قومی لیڈر فاقہ کش اور فلاکت زدہ انسانوں کے چہروں پر سے اختلافِ ملت و مذہب کی نقاب اُتار کر پھینک دیتا اور پراگندہ دل و دماغ میں ایک حقیقی اور مستقل اتحاد کا احساس پیدا کر دیتا جس میں پوجا پاٹ اور قربانی جیسے چھوٹے چھوٹے اور طفلانہ قضیوں کی گنجائش نہ ہوتی۔

لیکن گاندھی جی نے اس قسم کے تجزیوں کی کوئی کوشش ہی نہیں کی۔ جو لیڈر دونوں فرقوں کے درمیان اقتصادی اور سیاسی اتحاد کے متعلق دو چار لفظ بھی نہ کہہ سکا اور اس پر دو چار سطریں بھی نہ لکھ سکا اس کے سیاسی دیوالیہ پن کو دیکھ کر بس حیرت ہی ہوتی ہے۔ خواہ اُنھوں نے بالقصد ایسا نہ کیا ہو لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ملوکیت کے بچھائے ہوئے دام میں گرفتار ہو گئے اور ایسے مسائل کی اہمیت اور پیچیدگیوں پر زور دیتے اور اس کو بڑھا چڑھا کر دکھاتے رہے جو حقیقی معنوں میں نہ مذہبی تھے اور نہ اخلاقی۔ جن کو خواہ مخواہ اُبھار اُبھار کر غیر محتاط مولوی اور پنڈت اپنا کام نکالتے تھے۔ ان نئی مُشکلات کا جو کچھ حل اُنھوں نے تجویز کیا وہ بھی تشخیص ہی کی طرح دقیانوسی تھا۔ ان کے مشورے کو مختصراً یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے نہایت عجز و انکسار کے ساتھ دونوں قوموں سے درخواست کی کہ اپنے عبادات اور قربانیوں کے حقوق کے متعلق اپنے قلوب کو بدل ڈالیں۔ مہاتما جی اس کو بھول گئے کہ ان تمام نزاعات کا دلدل صرف سیاسی چٹان کے دھنس جانے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔

مہاتما جی کی آواز پر کسی نے کان نہیں دھرا۔ ۱۹۲۲ء کے موسمِ خزاں میں فرقہ دارانہ فسادات اور خوں ریزیوں کی بھرمار شروع ہو گئی۔ ان میں سب سے زیادہ افسوسناک واقعہ وُہ ہے جو کوہاٹ میں رونما ہوا۔ یہاں متعصب مسلمانوں نے بہت سے ہندوؤں کو قتل کر ڈالا اور نہایت جگر خراش اور وحشیانہ سفاکی کے ساتھ ان کے گھروں میں آگ لگادی۔ اس واقعے نے گاندھی جی کا پیمانۂ صبر لبریز کر دیا۔ ۱۸ ستمبر کو گاندھی جی نے حسب ذیل الفاظ میں اکیس دن کے برت کا اعلان کر دیا "حال کے واقعات میرے لیے بے حد ناقابل برداشت ثابت ہوئے میری مایوسیاں اس سے بھی زیادہ ناقابل برداشت ہیں۔ میرا مذہب مجھے یہ سکھاتا ہے کہ اگر کسی

ایسی آفت کا سامنا ہو جائے جسے انسان دور نہ کرسکے تو اسے برت رکھنا چاہیئے اور دعا کرنی چاہیئے۔ میں نے اپنے عزیزترین لوگوں کی خاطر ایسا کیا ہے۔ بظاہر میری کوئی تحریر یا تقریر دونوں فرقوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں کارگر نہیں ثابت ہو سکتی۔ ....
میں ادب کے ساتھ تمام قوموں کے سربرآوردہ حضرات کو نیز انگریزوں کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ ایک جگہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور اس ننگِ مذہب و ننگِ انسانیت مناقشہ کو کسی طرح ختم کریں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ گویا خدا ہی کو اس کے تخت سے برطرف کر دیا گیا ہے۔ آئیے ہم سب لوگ مل کر اُسے پھر سے اپنے دِلوں میں بسالیں۔"

اس برت نے قدرتاً سارے ملک میں ایک زبردست سنسنی پیدا کر دی۔ فوراً ہی دہلی میں ایک اتحاد کانفرنس منعقد کی گئی، جس میں صرف ہندوؤں اور مسلمانوں ہی کے نمائندے نہیں شریک تھے بلکہ عیسائیوں کی طرف سے ہندوستان کے اسقفِ اعظم اور نیز دوسرے فرقوں کے نمائندے بھی شریک تھے۔ کئی دِنوں کے مسلسل غور و خوض کے بعد کانفرنس نے متعدد ریزولیوشن پاس کیے جن میں مصالحت کے اصول اور مذہبی اختلافات مثلاً تبدیل مذہب، مسجد کے سامنے باجا بجانا، محرم کے جلوس، گاؤکشی وغیرہ کے باعث جو جھگڑے پیدا ہوتے ہیں اُنھیں طے کرنے کے لئے تفصیلی ہدایات بیان کی گئی تھیں۔ تمام تفصیلی تجاویز کا خلاصہ پہلی ہی تجویز میں بیان کر دیا گیا تھا جو حسب ذیل ہے:-

"یہ کانفرنس مہاتما گاندھی کی فاقہ کشی پر انتہائی الم و اضطراب کا اظہار کرتی ہے، اس کانفرنس کی محکم رائے ہے کہ ضمیر و مذہب کی مکمل آزادی بے حد ضروری ہے۔ یہ کانفرنس کسی فرقے کی بھی عبادت گاہوں کی بے حُرمتی اور تبدیل مذہب پر لوگوں کو کسی قسم کی اذیت پہنچانے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے، نیز کسی کو تبدیل مذہب پر مجبور کرنے اور دوسروں کے حقوق کو پامال کرکے اپنے مذہبی رسومات کو ادا کرنے کو بھی نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔"

کانفرنس نے چھ لیڈروں پر مشتمل ایک مرکزی قومی پنچایت بھی بنائی جس کے صدر گاندھی جی مقرر کئے گئے۔ اور انھیں پندرہ ممبران تک کے اضافہ کرنے کا اختیار دیا گیا۔ اس کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ حال میں جتنے فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ہیں اُن کی تفتیش کرے اور تمام جھگڑوں کو ختم کرانے کی کوشش کرے۔

بہرحال یہ پنچایت صرف کاغذہی کاغذ پر رہی۔ برت اور کانفرنس اور اس کی تجاویز سب کچھ تھوڑے ہی دنوں میں بھلا دی گئیں اور لوگوں میں پھر وہی کشت و خون شروع ہو گیا۔ اس کے بعد بھی بہت سے شہروں اور قصبوں میں نہایت زبردست فسادات رونما ہوتے رہے۔ لیکن ہمارے ہوشیار سنیاسی نے پھر کوئی برت نہیں رکھا۔

چھیاسٹھواں باب

والیانِ مُلک سے اتحاد

کاٹھیاواڑ سیاسی کانفرنس کی صدارت کرنے کے لیے گاندھی جی بلگام سے تقریباً بالکل براہ راست اپنے وطن کی طرف روانہ ہوئے۔ جیسا کہ اُنھوں نے اپنے خطبۂ صدارت کے پہلے ہی جملے میں کہا تھا۔ اس کانفرنس کی صدارت انھیں اس وقت پیش کی گئی تھی جب کہ ۱۹۲۱ء میں تحریک ترک موالات اپنے شباب پر تھی۔ اس لئے کانفرنس منعقد کرنے والوں کی نیت اور منشا کا آسانی سے اندازہ ہو جاتا ہے۔

جیسے برطانوی ہندوستان کے عوام برطانوی حکومت کے مظالم کا شکار ہو رہے تھے اسی طرح گاندھی جی کے صوبہ کے غریب کسان بھی جاگیرداروں کی وحشیانہ خودمختاری اور بے جا محاصل کی جبرستانی سے پسے جا رہے تھے۔ کانفرنس کے لیڈروں کو پوری توقع تھی کہ برطانوی سامراج کا یہ زبردست دشمن انھیں کوئی نیا پیغام دے گا ان کے دل میں سیاسی آزادی کی نئی اُمنگ پیدا کرے گا، اور کاٹھیاواڑ کے قزاق جاگیرداروں کی غلامی سے نکلنے کی کوئی نئی سبیل بتائے گا۔

مگر گاندھی جی نے تین سال بعد صدارت کی۔ ۱۹۲۵-۱۹۲۸ء کا سورما درویش اب چرخے کا امن کوش پیغمبر بن چکا تھا، لہٰذا جنگجو کاٹھیاواڑیوں کی ساری سیاسی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔

گاندھی جی نے کس مقصد سے اس کانفرنس کی صدارت کی؟ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ ریاستوں کی رعایا تو غلام در غلام ہے۔ کیا گاندھی جی اس وقت جیمس کنوٗلی کے اس مقولے کے قائل تھے کہ محکوموں کی قومی آزادی کا اندازہ اس مُلک کے مظلوم ترین طبقات کی آزادی سے لگایا جانا چاہیے؟ کیا یہ مسیح اعظم اپنے اعزا اور اقربا کے پاس اس خیال سے گیا تھا کہ انھیں زارشاہی حکومت اور خون چوسنے والے ظالموں کی وحشیانہ لوٹ کھسوٹ کے خلاف کسی ستیہ گرہی مہم میں ان کی قیادت کرے؟ اگر وہ لوگ اس قسم کی جنگ کے اہل یا خواہشمند نہیں بھی تھے تو کیا گاندھی جی نے انھیں صدیوں کی گراں خوابی سے بیدار کرنے کی کوئی کوشش کی؟ یا جاگیرداری حکومت کی بے شمار بُرائیوں کو جس میں قرونِ وسطیٰ کے غارتگروں کی جبرستانی اور عہدِ نو کے سرمایہ داروں کی جوع بے پایاں دونوں چیزیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ کیا انھوں نے ان چیزوں کی اصلی بھیانک شکل ان غریبوں کے سامنے پیش کی؟

ہرگز نہیں۔ انھوں نے کانفرنس کی قیادت اس نہج پر کی کہ ان لوگوں کو جو ہدف انتفاع تھے منتفعین اور ان کے کارپردازوں اور کاسہ لیسوں کے ساتھ علانیہ ایک رشتۂ اخوت میں منسلک کر دینا چاہا۔ البتہ اتحاد کی اس پیشکش کو اُنھوں نے اس پر مشروط کر دیا تھا کہ یہ لوگ (جماعتِ منتفعین) چرخہ اور کھدر کو ساری خرابیوں کا واحد علاج مان لیں۔ گویا اُنھوں نے لُٹنے والوں کو یہ مشورہ دیا کہ اگر یہ قزاق صرف کھدر کی مقدس وردی پہن لیں اور چند لمحوں کے لیے چرخہ کات لیا کریں تو ان کے تمام دائمی جرائم سے چشم پوشی کی جائے اور انھیں برداشت کیا جائے۔

انھوں نے اپنے خطبہ کا نگرس کی "ہندوستانی ریاستوں کے معاملے میں عدم مداخلت" کی پالیسی کی حمایت سے شروع کیا۔ اس طرح اُنھوں نے ان تمام ظالمانہ اداروں کو "ریاست" کے خوش نما لفظ سے موسوم کر کے گویا اُن تمام عوام کو جو انتفاع کا شکار ہو رہے تھے ان جاگیردار آقاؤں کی ملکیت قرار دے دیا اور ظالموں اور مظلوموں کے متصادم اغراض کے کھُلے ہوئے تضاد پر برابر پردہ ڈالے رکھا۔

گاندھی جی نے اپنے ذہن میں مستقبل کا یہ نقشہ رکھا تھا۔ "میں نے اکثر یہ کہا ہے کہ برطانوی ہندوستان کی نجات کے ساتھ ساتھ ریاستوں کی نجات بھی ہوگی۔ برطانوی ہند کی آزادی کا مبارک دِن آئے گا تو ریاستوں میں حاکم و محکوم کے تعلقات ختم نہیں ہو جائیں گے بلکہ ہر خرابی سے پاک ہو جائیں گے۔ میرے ذہن میں سوراج کا مفہوم ملوکیت کو ختم کر دینا نہیں ہے نہ اس کے معنی سرمایہ داری کو ختم کر دینے کے ہیں۔ اندوختہ سرمایہ حکمرانی کی قوت کے مرادف ہے۔ میں سرمایہ اور محنت میں صحیح ربط پیدا کرنے کا حامی ہوں۔ میں ایک کا دوسرے پر تفوق نہیں چاہتا نہ ان دونوں میں مجھے کوئی بیر نظر آتا ہے، ہم میں امیر و غریب دونوں ہمیشہ رہیں گے لیکن ان کے آپس کے تعلقات میں البتہ تبدیلیاں ہوتی رہیں گی۔"

اس صورت سے ممتاز صدر نے نہایت وفاداری کے ساتھ ان آسمان سے اُترے ہوئے راجاؤں کے حقوقِ ملکیت کو بقیہ ہندوستان کی سیاسی آزادی کے بعد بھی قائم و دائم رکھنے کا عہد کر لیا۔ گزشتہ دس ہی بیس سال کی مدت میں کتنی ہی زبردست اور قدیم سلطنتیں تباہ ہو چکی تھیں۔ گاندھی جی کے دیکھتے دیکھتے زاروں، ہیپسبرگوں اور قیصروں کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ تاہم گاندھی جی کو اپنے لکھوکھا بھائیوں اور بہنوں کی زندگیوں کو ہمیشہ کے لیے ان جاگیرداروں کے رحم و کرم کے سپرد کرنے میں کوئی تکلف نہ

ہوا جو برطانوی حکومت کے پہلے ہر دسویں بیسویں سال حشرات الارض کی طرح پیدا ہوتے رہتے تھے۔ لیکن گاندھی جی کا یہ کہنا کہ وہ سرمایہ اور محنت یا حاکم و محکوم میں سے ایک کا دوسرے پر غلبہ نہیں چاہتے تھے۔ محض لفظی گورکھ دھندا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ آج سرمایہ داری محنت پر غالب ہے اور والیانِ ملک اپنی رعایا پر غیر مسئول اقتدار کے مالک ہیں، لہٰذا جو شخص موجودہ سیاسی اقتدار کے قائم رکھنے کا حامی ہے وہ لازمًا موجودہ ظلم و انتفاع کا بھی حامی ہے۔ لہٰذا صدر صاحب کے پیش نظر جو کچھ تھا وہ محض یہ تھا کہ چند ایسی تسکین دہ تبدیلیاں اور معتدل اصلاحات کا نفاذ ہو جائے کہ یہ مظلومین اپنے ظالموں کا جُو استقلاً برداشت کرنے کے لیے رضامند ہو جائیں۔

اب وہ آگے بڑھے اور نہایت برادرانہ انداز میں والیانِ ملک کو ان کی نجی زندگی اور طرزِ حکومت کی چند معمولی خرابیوں کی طرف توجہ دلائی۔ گاندھی جی نے ان لوگوں کی یورپ کی مسرفانہ سیر و سیاحت، مغرب کی اندھی تقلید، ان کے غیر محدود ذاتی اخراجات، اور ان کی مالیہ اور آبکاری کی پالیسی پر نرم لہجے میں کچھ مذمت بھی کی لیکن اس تنقید کے ختم کرتے ہی انھوں نے فورًا اپنے ذی اقتدار آقاؤں سے نہایت نرمی کے ساتھ معذرت بھی کر لی۔ ”میں نے ریاستوں کی تنقید محض تنقید کے طور پر نہیں کی، مجھے معلوم ہے کہ گاندھی خاندان تین پشتوں سے ان سے منسلک رہا ہے، میں نے خود تین ریاستوں کی وزارتیں دیکھی ہیں، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ متعلقہ ریاستوں سے میرے باپ اور چچا کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔ مجھے یقین ہے کہ میں امتیاز و تفریق کا احساس رکھتا ہوں، بہرحال میں ریاستوں کے محاسن ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔“

ظاہر ہے کہ عالی مرتبہ والیانِ ملک کی یہ ہلکی سی تنبیہ بھی گاندھی جی نے محض کانفرنس کے چند تند مزاجوں کے دباؤ سے کی تھی، باقی تو محض اس بات کا مذہبی خطبہ تھا کہ کاٹھیاواڑ کے فاقہ کش اپنے اندر بے خوفی اور رواداری اور شدائد برداشت کرنے کی آسمانی صفات پیدا کریں۔ یہ وعظ ان لوگوں کو دیا جا رہا تھا جو اس کے لیے بے چین تھے کہ اپنے بدترین دشمنوں کے خلاف کسی نہ کسی قسم کا اقدام شروع کریں اس ڈر سے کہ کہیں یہ مقدس وعظ جنگجو کاٹھیاواڑیوں کو زیادہ مایوس اور برافروختہ نہ کر دے انھوں نے اخیر میں وہی چرخے والا ٹیپ کا بند دُہرانا شروع کر دیا کیونکہ کھادی کے کام میں صرف یہی اتنا نہ تھا کہ حاکم و محکوم میں ہر قسم کے تصادم کے امکانات ختم ہو جائیں گے بلکہ ان کے آپس کے تعلقات بھی غالبًا خوشگوار ہو جائیں گے۔“ (ینگ انڈیا مورخہ ۱۵ جنوری ۱۹۲۵ء)

ہر کام کی اصل قیمت اس کے نتائج سے معلوم ہوتی ہے۔ اس کانفرنس کی قدر و قیمت کا اندازہ بھی اس کے نتائج ہی سے ہو سکتا ہے۔ گاندھی جی نے جو رائے قائم کی وہ حسب ذیل ہے:۔

”اس سیشن کا سب سے حیرت انگیز واقعہ وہ بیان ہے جو سر پربھاشنکر پٹّانی نے کیا ہے کہ جب تک بیماری کے باعث وہ بالکل معذور نہ ہو جائیں دن کا کھانا کھانے کے پہلے کم از کم آدھا گھنٹہ چرخا ضرور کاتیں گے .... انھیں مجلس مضامین میں خاص طور پر ایک مہمان کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا جب چرخہ والی تجویز منظور ہو گئی تو میں نے ممبروں کو دعوت دی کہ وہ اپنا نام چرخا کاتنے والوں میں لکھائیں .... سر پربھاشنکر کھڑے ہو گئے اور انھوں نے نہایت سنجیدہ لہجے میں مذکورہ بالا ریزولیوشن کا اعلان کیا، اس پر تالیاں بجنے لگیں .... مجھے امید ہے کہ دوسرے اراکین حکومت اور وزرا خود اپنی ذات کے نیز اپنے ماتحتوں کے مفاد کے لیے سر پربھاشنکر کے اس عظیم الشان بیان کی تقلید کریں گے۔“

یقینًا یہ نہایت ذِلّت انگیز حرکت تھی کہ کاٹھیاواڑ کی ایک اوّل درجہ کی ریاست کا ایک بلند مرتبہ وزیر اور تمام ریاستوں کا ایسا مشہور رفیق و معاون اس مجلس مضامین میں مدعو کیا گیا جس کو دراصل ایک ایسا خفیہ اجتماع ہونا چاہیے تھا جہاں حد سے زیادہ ستائے ہوئے عوام کی سیاسی شکایات پر کھلے بندوں بحث ہو سکتی۔ اس مقام پر دشمن کے ایک ایجنٹ کی موجودگی سے صرف یہی نتیجہ ہو سکتا تھا کہ جنگجو اراکین کے منہ بند ہو جائیں۔ گاندھی جی نے ریاست کے کاسہ لیس کا ناٹک دِکھا کر اور اس کی تعریف کا مطالبہ کر کے گویا زخموں پر نمک پاشی کی۔ ظاہر ہے کہ کانفرنس منعقد کرنے والوں کا منشا تو یہ تھا کہ اس زبردست

لیڈر کی بیش قیمت امداد واثر سے اپنی صفوں کو اپنے ہی طبقے کی جارحانہ قیادت میں منظم کریں اور اپنے ظالم دشمنوں کے خلاف ایک مسلح ناپذیر جنگ شروع کر دیں۔ گاندھی جی نے کانفرنس کو اس مشورے پر ختم کیا کہ یہ لوگ جو ظلم واستغلاع کے شکار بنے ہوئے تھے اپنے بدترین دشمنوں کی قیادت میں چرخے کے مقدس مسلک پر گامزن ہوں۔ گاندھی جی کو عوام کی خدمت کے لیے مدعو کیا گیا تھا اور انھیں عوام کو گاندھی جی نے دغابازی سے دشمنوں کے حوالے کر دیا۔

سڑسٹھواں باب

سرمایہ داروں اور آئین پرستوں سے اتحاد

جو کچھ گاندھی جی نے والیان ملک کے ساتھ کیا تھا وہی سرمایہ داروں اور بورژوا (متوسط) طبقہ اور ان کے سوراجی اور دیگر آئین پرست پیروؤں کے ساتھ کیا۔ عام انقلاب کا پروگرام تو مدت ہوئی ختم کر ہی چکے تھے۔ اب وہ پوری قوت سے اس طرف بڑھ رہے تھے کہ انقلاب دشمنی کے انتظامات مکمل کرلیں۔ یہ تو گاندھی جی کر نہ سکتے تھے کہ اپنے زبردست متبعین کو جس میں تخیل پرست نوجوان، شکارِ انتفاع کسان اور چھوٹے چھوٹے تاجر اور دکان دار بھی شامل تھے، مایوس کر کے علٰحدہ کر دیں ان تمام لوگوں کو انھوں نے اس طرح اپنے قدموں سے وابستہ رکھا کہ ان کی مسحور کن آنکھوں کے سامنے لڑائی کا خالی جھنڈا اور وردی جن کو وہ تمام جارحانہ مقاصد و پروگرام سے قطعاً عاری کر چکے تھے برابر ہلاتے رہے۔ اپنی پیہم تحریکوں کے اصل مقصد کی طرف سے ان لوگوں کی آنکھیں مکمل طور پر بند کر چکنے کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ اب سوراجیوں کو بھی بلکہ اعتدال پسندوں، آئین پرستوں جاہ طلبوں اور حکومت کے علانیہ حمایتیوں تک کو آغوش شفقت میں لیا جاسکتا ہے۔

اپنے پرانے اور بچھڑے ہوئے ساتھیوں کی تلاش وجستجو کے لئے جب وہ نکلے تو تھوڑی ہی دور چل کر انھیں راستہ مسدود نظر آنے لگا نومبر ۱۹۲۴ء میں جب آل پارٹیز کانفرنس کے موقع پر گاندھی جی نے مختلف سیاسی جماعتوں کے نمائندوں سے ملاقات کی تو انھوں نے طرح طرح کی مشکلات پیش کر دیں۔ گاندھی جی سوراج پارٹی والوں سے پہلے ہی معاہدہ کر کے انھیں کونسلوں میں کانگرس پارٹی کی حیثیت سے تسلیم کر چکے تھے۔ صرف نیشنل ہوم رول والوں نے جن کی قیادت ڈاکٹر بیسنٹ کے ہاتھ میں تھی "قریب قریب اس صورتِ حال کو تسلیم کر لیا جو میرے اور سوراج پارٹی کے مابین معاہدہ کی بنا پر پیدا ہوئی تھی، اور اب جس کی توثیق آل انڈیا کانگرس کمیٹی بھی کر چکی تھی"۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر بیسنٹ کی پارٹی نے کبھی انتخابات میں حصہ نہیں لیا تھا۔ لیکن لبرل اور انڈیپنڈنٹ پارٹی والوں نے "مسلک کے بارے میں نیز شرط رکنیت اور سوراج پارٹی کے ہاتھ میں تمام کونسل کے کام سپرد کر دینے کے بارے میں بہت سی مشکلات پیش کیں"۔ اگر ان پارٹیوں نے صرف چرخہ کاتنے والی شرط مان لی ہوتی تو گاندھی جی اپنا پورا زورِ طبع صرف کر کے کوئی نہ کوئی ضابطہ ایسا تیار کر لیتے جو کونسل کی تمام پارٹیوں کے لیے قابل قبول ہوتا۔ بہرحال کانفرنس کا صرف یہ نتیجہ رہا کہ ایک کمیٹی اس غرض سے مقرر کر دی گئی کہ اتحاد کے اسباب و وسائل پر غور وخوض کرے اور ۱۲ مارچ ۱۹۲۵ء کے پہلے پہلے کانفرنس کے پاس رپورٹ بھیج دے۔

کیا گاندھی جی کو سوراجیوں کی کونسلوں میں مزاحمت کرنے اور ان کو توڑنے کی مشہور چالیں بہت پسند آگئی تھیں؟ کیا ایک لمحہ کے لیے بھی انھیں اس کا یقین ہو گیا تھا کہ سوراجیوں نے عدم تعاون کی تحریک کو کونسلوں کے اندر جا کر دوسروں کی بہ نسبت زیادہ کارِ نمایاں انجام دیا

ہی؟ کیا اُنھوں نے رزم ہی لیجیے میں سہی کبھی لبرل اور انڈپنڈنٹ پارٹی والوں پر شیطانی حکومت سے تعاون کرنے کے سلسلے میں کسی قسم کی تنقید کرنے کی زحمت بھی گوارا کی؟ ان تمام سوالوں کا جواب یقیناً نفی میں ہے۔ آل پارٹیز کانفرنس کے متعلق اپنے مقالے میں ''ینگ انڈیا'' مورخہ ۲۷ر نومبر ۱۹۲۴ء انھوں نے ان تمام اہم مسائل پر نہایت ہوشیاری کے ساتھ مکمل خاموشی اختیار کر لی۔ انھوں نے کلکتہ کے معاہدے کی حمایت محض اس رسمی دلیل پر کی کہ ''اگر کانگرس ترکِ موالات کو ملتوی کر دیتی ہے تو سوراجیوں کا غالباً خود بخود غلبہ ہو جائے گا۔'' دوسری پارٹیوں کے سامنے اُنھوں نے یہ پیش کش رکھی کہ ''اگر وہ کچھ اور زیادہ چاہتے ہیں تو اس کے ملنے کی صرف یہ صورت ہے کہ کانگرس میں شریک ہو جائیں اور سوراجیوں کو سمجھا بجھا کر راضی کریں یا کانگرس کی رائے دہندہ جماعت کو ہموار کریں یا نئی رائے دہندہ جماعتیں بنالیں۔'' بہرحال اگر دوسری جماعتیں کانگرس کے ایوان میں داخل نہ ہوئیں تو اس میں گاندھی جی کا کیا قصور تھا وہ تو اپنی جیسی کر ہی چکے تھے۔

اس صورت سے گاندھی جی ایک عجیب چپقلش میں مبتلا ہو گئے۔ تخیلات کے اعتبار سے وہ اپنے کو بالکل اعتدال پسندوں یعنی بڑے بڑے سرمایہ داروں، زمینداروں، والیانِ ملک اور انگریزوں کے غیر منفعل کاسہ لیسوں اور حمایتیوں کا ہم خیال پاتے تھے، مگر ان کے ساتھ باضابطہ اتحاد کرنے کی راہ میں سوراجی حائل تھے۔ کیونکہ اگرچہ گاندھی جی سوراجیوں کی کونسل والی کارگزاریوں اور چالوں کو زیادہ وقعت کی نظروں سے نہ دیکھتے تھے مگر سوراجی ضرور یہ چاہتے تھے کہ کانگرسی لیڈروں کے زیر اثر جتنی بھی رائے دہندوں کی جماعت ہے اس پر اپنی مکمل اجارہ داری قائم رکھیں، اور سوراجیوں کے حدود میں قدم رکھے بغیر لبرل اور انڈپنڈنٹ پارٹی کے لوگوں کا کانگرس میں داخل ہونے کا امکان نہ تھا۔ چونکہ اس وقت اس عقدے کو حل کرنے کی سبیل نہ نکل سکی، لہٰذا گاندھی جی نے کچھ تو علی الاعلان اپنی تجویزوں کے ذریعے اور کچھ اپنی معنی خیز خاموشی سے سوراجیوں کی اس بارے میں حوصلہ افزائی کی کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ تن دہی کے ساتھ سرمایہ داروں اور آئین پرستوں سے اپنا اتحاد بڑھائیں اس صورت سے گاندھی جی نے لبرل اور انڈپنڈنٹ پارٹی والوں سے اور بالآخر خود حکومت سے اپنے لیے گفت و شنید اور تعاون کی راہ کھولنے کے واسطے سوراج پارٹی والوں کو آلۂ کار بنایا۔

سوراجیوں کی حکمت عملی اور چالوں میں ۱۹۲۵ء کے شروع ہی سے جو روز افزوں انحطاط شروع ہوا اس کا قدرے تفصیل کے ساتھ جائزہ لینا اس موقع پر بے محل نہ ہوگا۔

سوراج پارٹی کے بانی، مسٹر سی آر داس نے گیا کانگرس میں اپنے نئے پروگرام کا خاکہ تیار کرتے ہوئے واضح طور پر اس کا عہد کیا تھا کہ انھیں آبادی کے اٹھانوے فی صدی پامال اور مفلوک الحال عوام کو نجات دلانا ہے۔ اور گوروں کی نوکرشاہی ہٹا کر کالوں کی نوکرشاہی قائم کرنے کے خیال کی مذمت کی تھی۔ اُنھوں نے مزدوروں اور کسانوں کی تنظیم کو بھی اپنے پروگرام کا ایک ضروری جُز قرار دیا تھا اس کا بھی وعدہ کیا تھا کہ اگر سوراجی کونسلوں میں پہنچ گئے تو مسلسل اور مستقل مزاحمت اور کونسل شکنی کی پالیسی پر عمل کر کے گویا ''دشمن پر قریب سے حملہ کریں گے۔''

اب ذرا دیکھنا چاہیے کہ ان خوش آہنگ وعدوں کو کہاں تک پورا کیا گیا۔ نئی پارٹی کے پروگرام اور الکشن کے اعلان نامہ مجریہ ۱۹۲۳ء میں سوراج کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی تھی ''حکومت کے موجودہ نظام اور مشینری پر موثر اقتدار اور دستور مرتب کرنے کا حق'' یہ چیز بہت معنی خیز ہے کہ داس اور ان کے رفقا جنھوں نے بہت زور و شور کے ساتھ اصلاحات کو ناقص، غیر تسلی بخش، اور ناقابلِ قبول ٹھہرا کر مسترد کر دیا تھا، اب انھیں اصلاحات کی بنا پر قائم کیے ہوئے نظامِ حکومت کو سنبھالنے کے لیے تیار تھے۔ بشرطیکہ اس پر موثر اقتدار حاصل ہو جائے۔ اسی پارٹی کے (جو اٹھانوے فی صدی مفلوک الحال عوام کی فلاح و بہبود کی علم برداری کے لیے اُٹھی تھی) پروگرام کی ایک مد یہ بھی تھی ''نجی اور انفرادی جائدادوں کا تحفظ کرنا اور انفرادی دولت مندی کے نشو و نما میں معاونت کرنا۔'' بہرحال مظلوم کسانوں کو آئندہ منظم کرنے کے دعوے داروں نے ان کی تمام انفرادی قوتوں پر مہر لگا دی، اور گویا ہاتھ پاؤں باندھ کر انھیں گاندھی جی کی معرفت ان کے بدترین دشمنوں کے حوالے کر دیا۔ اس اعلان نامے میں قدیم زمینداروں

کا ذکر کیا گیا تھا جنھوں نے تاریخ ہند میں اپنے کارناموں سے کئی زریں ابواب فراہم کئے تھے اور اس کے بعد تحریر کیا گیا تھا کہ "یہ پارٹی زمینداروں سے صرف یہ اپیل کر سکتی ہے کہ وہ اپنے ان غیر تعلیم یافتہ بھائیوں کے شکوک و بدگمانیوں کو دور کردیں اور ان کو سمجھا دیں کہ جو لوگ سوراج کے لیے کوشاں ہیں وہ ایسی مجنونانہ حرکت کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ سوسائٹی کے ایک اہم طبقے کو بالکل ختم کر کے سینکڑوں برس کے پرانے سماجی نظام کی بنیادیں ڈھا دیں۔ یہ سچ ہے کہ ہماری پارٹی کسانوں کے ساتھ منصفانہ برتاؤ کی حامی ہے لیکن وہ انصاف بھی کیا انصاف ہوگا جس میں زمینداروں کے ساتھ ناانصافی کرنی پڑے۔"

اس کے علاوہ بہار پنچایت ایسوسی ایشن کے سکرٹری کو جواب دیتے ہوئے مسٹر داس نے فرمایا "میں زمینداروں اور کسانوں کے درمیان کسی قسم کا تصادم پسند نہیں کرتا .... جو کچھ بھی کرنا ہے سوراج حاصل کرنے کے بعد کیا جائے گا اور اس وقت بھی دونوں گروہوں کی رضامندی سے۔"

اس قلابازی کے وجوہ صاف ظاہر ہیں۔ گیا میں، نیز اس کے بعد، جتنی کچھ بھی انقلاب پسندی کی نمائشیں کی گئی تھیں ان کا مقصد حاصل ہو ہی چکا تھا۔ دانشمند سیاستدانوں اور ابھرتے ہوئے نوجوانوں کو بہلا ہی لیا گیا تھا۔ کانگرس بھی رام کی جا چکی تھی۔ اس طرح سے گویا اپنے تئیں اٹھانوے فی صدی عوام کا مسلّم نمائندہ ظاہر کر چکنے کے بعد سوراجیوں نے نیا سوانگ رچایا تاکہ ملک کے بقیہ دو فی صدی با اثر لوگوں کے ووٹ بھی حاصل ہو جائیں۔

لیجسلیٹو اسمبلی میں داخل ہونے کے بعد سوراج پارٹی والے اور زیادہ رجعت پسندی کی طرف جھکنے لگے۔ انڈپنڈنٹ پارٹی والوں کو جو سرمایہ دار اور بورژا (متوسط) طبقہ کے زیادہ زبردست حمایتی تھے، انھوں نے اس معاہدے پر اپنے ساتھ شامل کر لیا کہ جب تک نیشنلسٹ پارٹی (یعنی سوراجیوں اور انڈپنڈنٹ پارٹی والوں کی متحدہ جماعت) کے تین چوتھائی اراکین مزاحمت کی کسی پالیسی پر متفق نہ ہو جائیں اس وقت تک اس قسم کی کوئی پالیسی نہیں شروع کی جائے گی۔ سوراجیوں کے لیڈر، پنڈت موتی لال نہرو نے قومی مطالبہ کے متعلق اپنی ترمیم پیش کرتے ہوئے فرمایا "میں یہ نہیں کہتا کہ ذمہ دارانہ حکومت کی پوٹلی بنا کر ہمارے ہاتھوں میں دے دی جائے۔ ہم یہاں اپنے تعاون کی پیش کش کرنے آئے ہیں، اگر حکومت نے اس تعاون کو قبول کر لیا تو اسے معلوم ہوگا کہ ہم لوگ دراصل اسی کے آدمی ہیں۔" جو پارٹی "دشمن کے کیمپ میں پہنچ کر جنگ کرنا چاہتی تھی" وہ شروع ہی سے حکومت کے ساتھ گفت و شنید کی راہیں نکالنے میں مصروف ہو گئی تاکہ ایک شریفانہ مفاہمت کی صورت پیدا ہو جائے۔

بجٹ کے مالیہ والے حصّے کی ابتدائی چار مدوں کو مسترد کرنے کی تجویز پیش کرتے ہوئے سوراجی لیڈر نے کہا۔ "میری اس تحریک کا تارکین موالات کی کونسل شکنی کی پالیسی سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ یہ تو ملک کی جائز شکایات کی طرف توجہ مبذول کرانے کا ایک محض آئینی اور دستوری ذریعہ ہے۔" ان حالات میں ۱۹۲۳-۲۴ء کے سرکاری ریویو میں سوراجیوں کی حسب ذیل تحسین و تعریف پڑھ کر کسی حیرت و استعجاب کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی "بجٹ کے موقع پر اور نیز دوسرے اہم موقعوں پر سوراجیوں کا جو کچھ رویہ رہا ہے اس کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے آئینی مخالفت کا کام نہایت حسن و خوبی سے انجام دیا ہے۔ .... لہٰذا مستقل مزاحمت اور کونسل شکنی کے پروگرام کو ترک کر کے۔ جس پر وہ کسی زمانے میں بہت زور دیا کرتے تھے۔ یہ لوگ ایوان کی معمولی کارروائیوں میں نمایاں حصّہ لیتے رہے ہیں۔"

یہ مارچ کا قصّہ تھا۔ مئی کا مہینہ آتے آتے یہ متلوّن مزاج سوراجی آئینی مخالفت سے پھسلتے ہوئے عملی تعاون پر اتر آئے۔ اسی مہینے میں اسمبلی کا ایک خاص اجلاس اسٹیل انڈسٹری پروٹکشن بل پر غور و خوض کرنے کے لئے منعقد ہوا، مطلب یہ تھا کہ ٹاٹا اسٹیل کمپنی کا تحفظ کیا جائے۔ سوراجیوں نے جو گورنمنٹ کی ہر کارروائی میں رکاوٹ ڈالنے کا وعدہ کر کے آئے تھے بلا تکلف اس بل کی موافقت میں ووٹ دیے۔ اس کے علاوہ پانچ سوراجی ممبروں نے جس میں پنڈت موتی لال نہرو اور مسٹر وٹھل بھائی پٹیل بھی شامل تھے اس کمیٹی

کی ممبری قبول کرلی جو ٹنڈ کورہ بالا بل پر غور و خوض کرنے کے لئے مقرر کی گئی تھی اور اس طرح سے گورنمنٹ کے ساتھ برضا و رغبت تعاون شروع کر دیا۔ مسٹر پٹیل نے ایک ترمیم پیش کی کہ اس تحفظ کا اطلاق صرف ان صنعت گاہوں تک محدود کر دیا جائے جس میں کم از کم دو تہائی سرمایہ ہندوستان کا ہو۔ یہ ترمیم منظور ہوگئی اور بل میں شامل کر لی گئی۔ مفلوک الحال عوام کے مفاد کی علم برداری کرنے والوں نے ہندوستانی سرمایہ داروں کے مفاد کی اس طرح خدمت انجام دی۔ مگر جب مسٹر ایم۔ این۔ جوشی نے اس مضمون کی ایک ترمیم پیش کی کہ اس تحفظ سے "ٹاٹا کمپنی کو جو کچھ فائدہ ہوگا اس کے عوض میں اس کمپنی کے مزدوروں کی "کم از کم اُجرت" مقرر کر دی جائے" تو سوراجیوں کو اس ترمیم کو مسترد کرنے میں ذرہ برابر بھی تکلف نہ ہوا۔

اگست ۱۹۲۴ء میں مسٹر داس نے پریس کو ایک اہم بیان دیا جس میں صوبجاتی خود مختاری کے مطالبے کا اعادہ کرنے کے بعد اُنھوں نے فرمایا "لیکن لیجسلیٹو اسمبلی میں کچھ نہ کچھ اقتدار ضرور ہونا چاہیئے۔ یہ سوال کہ کتنا اقتدار ہو گول میز کانفرنس میں بحث و نظر کے بعد طے ہو سکتا ہے۔" لہٰذا "موثر اقتدار" جس کا الیکشن کے اعلان نامے میں مطالبہ کیا گیا تھا گھٹ کر "کچھ نہ کچھ اقتدار" رہ گیا اور اِس "کچھ نہ کچھ اقتدار" کی تعیین کے لیے بھی گفت وشنید کا دروازہ کھُلا رکھا گیا۔

مسٹر داس نے اپنے بیان کے اخیر میں حکومت کو متنبہ کیا کہ "میں آئینی ترقی کا اس سے کہیں زیادہ حامی ہوں اور حکومت شکنی کے بڑھتے ہوئے رجحانات کا اس سے کہیں زیادہ دُشمن ہوں جتنا حکومت مجھے سمجھ سکتی ہے ۔ . . . . . . اس وقت مُلک میں حکومت شکنی کی تحریک حکومت کے اندازہ سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ پھیل رہی ہے ۔ . . . . . میں امید کرتا ہوں کہ جلد از جلد برطانیہ اور ہندوستان میرے بتائے ہوئے نہج پر ایک دوسرے کے قریب آجائیں گے اور آپس میں اتحاد کرلیں گے۔"

اس صورت سے مسٹر داس نے کھُلے بندوں یہ تجویز کی کہ برطانوی ملوکیت اور ہندوستانی بورژوا طبقہ متحد ہو کر انقلابی تحریک کی بڑھتی ہوئی رَو کو ــــــ جسے وہ غلط طور پر حکومت شکنی سے موسوم کر رہے تھے ـــــ روکیں۔ بنگال گورنمنٹ نے اس قسم کی تحریکات کو دبانے کے لیے جو متشددانہ قوانین جاری کیے ان کی حمایت میں مسٹر داس کے اس بیان سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔

۱۹۲۵ء کے شروع ہی میں ہر طرف یہ قیاس آرائیاں ہونے لگیں کہ اگر موجودہ دو عملی نظام میں تھوڑی بہت ترمیمیں کر دی جائیں تو شاید سوراج پارٹی والے عہدے قبول کرلیں گے۔ ان لوگوں کے وزارت قبول کرنے کا سوال صرف دو ہی صوبوں میں تھا۔ بنگال اور صوبہ متوسط میں ـــــ یعنی جہاں نیشنلسٹ پارٹی والوں کو کام چلانے کے لائق اکثریت حاصل تھی۔ مارچ کے اخیر میں چند مسلمان سوراجیوں نے پریس کو ایک ایسا بیان دیا جس سے مترشح ہوتا تھا کہ مسٹر سی آر داس بنگال میں وزارت قائم کرنے پر آمادہ ہیں۔ سوراجی لیڈر نے فوراً ہی ایک جوابی بیان شائع کیا کہ "میں حکومت سے باعزت شرائط پر تعاون کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

اپریل ۱۹۲۵ء کے شروع میں لارڈ برکن ہیڈ وزیر ہند نے ہندستان کی صورت حال پر ایک تقریر کی جس سے مفاہمت کے امکانات مترشح ہوتے تھے۔ مسٹر داس نے برکن ہیڈ کی تقریر کے متعلق ۱۳ اپریل کو پٹنہ سے ایک بیان شائع کیا اور اس میں یہ اعتراف کرتے ہوئے کہ "مزید گفت وشنید کے لیے فضا موافق ہوگئی ہے" فرمایا کہ "جب تک میری تجویز کے مطابق چل کر حکومت کچھ آگے نہ بڑھے میرے لیے کسی پیش قدمی کی گنجائش نہیں ہے۔" یہ تجویز کیا تھی؟ "صوبائی خود مختاری اور مرکزی حکومت میں کچھ نہ کچھ اقتدار خواہ سر دست وہ مرکزی حکومت برطانوی وائسرائے اور برطانویوں اور ہندوستانیوں کی مخلوط کونسلوں پر ہی کیوں نہ مشتمل ہو۔" اس صورت سے سوراجی اعلان نامے میں جس "موثر اقتدار" کا مطالبہ کیا گیا تھا وہ غیر محسوس طریقے پر گھٹتے گھٹتے "کچھ نہ کچھ اقتدار" ہو گیا۔ لیکن اس کو بھی سوراجی لیڈر نے تعاون کی ضروری شرط کی حیثیت سے نہیں قائم رکھا

بلکہ آگے چل کر اس سے بھی دستبرداری دے دی، کیوں کہ نہایت معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ گورنر بنگال سے عرصہ تک خفیہ گفت وشنید کرنے کے بعد مسٹر داس ان شرائط پر قومی وزارت بنانے کے لیے تیار ہوگئے کہ پولیس کے علاوہ باقی تمام صوبائی شعبے ہندستانی وزیروں کو دے دیے جائیں اور تمام سیاسی قیدی رہا کر دیے جائیں۔

گاندھی جی نے خود شیر بنگال پر برکن ہڈ کی تقریر کی حیرت انگیز فسوں کاری کی تصدیق کی ہے۔ ینگ انڈیا مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۲۵ء میں انھوں نے تحریر فرمایا کہ "مجوزہ آل پارٹیز کانفرنس کے متعلق مسٹر داس نے کہا کہ ابھی ہمیں کانفرنس نہیں کرنی چاہیے۔ مجھے لارڈ برکن ہڈ سے بہت توقعات ہیں۔ وہ بہت زور دار آدمی ہیں اور میں ایسے آدمیوں کو پسند کرتا ہوں۔ وہ اپنی تقریر میں جتنا بڑا آدمی معلوم ہوتا ہے دراصل اتنا نہیں ہے۔ اگر ہم اس موقع پر کوئی جلسہ کرتے ہیں تو موجودہ صورت حال کے متعلق کچھ نہ کچھ اظہار خیال ضرور کرنا پڑے گا اور میں یہ نہیں چاہتا کہ سر دست وہ جو کچھ دینے پر آمادہ ہوں ہم اس سے کچھ زیادہ مطالبہ کرکے ان کو کسی قسم کی مزاحمت میں مبتلا کریں۔" گاندھی جی نے ان سے صاف صاف بتا دیا کہ "مجھے تو اس کی توقعات بالکل نہیں ہیں" اور کہا "ہم پہلے کبھی اتنے کم زور نہ تھے جتنے آج ہیں، اور کم زور کو انگریز کچھ نہیں دیتا۔" مسٹر داس نے اپنے بستر مرگ سے یہ جواب دیا "نہیں میرا دل کہتا ہے کہ ہمیں کوئی نہ کوئی زبردست چیز ملنے والی ہے۔" افسوس، ان کے مقدر میں نہ تھا کہ وہ اس "بڑی چیز" کو دیکھ لیتے جو فوراً ہی ہندوستان کو ملی، اگرچہ وہ اس سے بالکل ہی مختلف تھی جس کی مسٹر داس بڑی آرزوؤں کے ساتھ توقع کر رہے تھے۔

ہمیں مسٹر سی آر داس کے آخری سیاسی افکار و اعمال پر تنقید کرنے کی ضرورت نہیں۔ ۱۶ جون ۱۹۲۵ء کو ان کا اچانک انتقال ہو گیا۔ بہر حال ان تمام واقعات سے جو سبق حاصل ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔ بے شک یہ دیش بندھو کی سیاسی طباعی اور آتش بیانی ہی تھی جس نے سوراج پارٹی میں شروع شروع میں ایک انقلابی روح پھونک دی تھی اور ملک کے روشن خیال سیاستدانوں اور آزادی پسند نوجوانوں کو ان کا پیرو بنا دیا تھا۔ اس نئی پارٹی نے جب دیہاتوں اور قصبوں کے مزدوروں کی تنظیم و ترقی کی کوشش کے وعدے کیے تو ان لوگوں نے بھی اسے خوش آمدید کہا۔ تھوڑے دن کے لیے ہندستان والوں کے دل میں امیدیں پیدا ہو گئیں کہ یہاں کی نئی کونسلوں میں بھی آئری پارلیمنٹ کی سی صورتیں پیش آئیں گی اور ملک میں لینڈ لیگ والے ہنگامے کی قسم کی سی چیز رونما ہوگی۔ لیکن یہاں تو جن تلواروں پر ناز تھا وہی جھوٹی نکلیں۔ مستقل مزاحمت و تخریب کے علمبردار آئینی مخالفت کی پُرامن راہوں پر چل پڑے۔ مذمت کے ووٹوں کو بھی گفت وشنید اور مفاہمت کی تجویز سمجھا جانے لگا۔ قومی مطالبے کو نہایت ذلت آمیز طریقے پر صرف اس ڈر سے گھٹا دیا گیا کہ حکام کو زحمتیں نہ ہوں اور مطالبات کہیں اتنے بلند نہ نظر آئیں کہ حکام کو انھیں تسلیم کرنے میں تردد ہو۔ مزدوروں اور کسانوں کو منظم کرنے کا دشوار گزار راستہ ترک کرکے زمینداروں اور سرمایہ داروں سے نفع بخش تعاون کی راہ اختیار کر لی گئی۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ دیش بندھو جیسا سورما اس قسم کی سٹھیائی ہوئی باتوں پر اتر آیا ہے کہ اگر گاندھی جی جیسے انسان کی ناقابل تردید شہادت نہ موجود ہوتی تو اس قسم کے جذبات و خیالات کو دیش بندھو کی طرف منسوب کرنا تو درکنار ہم یہی سمجھتے کہ کسی نے ان کو ذلیل کرنے کے لیے یہ باتیں ان کی طرف منسوب کر دی ہیں ——— اس وقت ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ سوراج پارٹی وجود میں آنے کے ڈیڑھ ہی سال کے اندر اندر ابتری اور پستی کے کتنے گہرے غار میں گر چکی تھی۔

سوراج پارٹی جیسے جیسے پست ہوتی جاتی تھی اس کی تائید وحمایت میں گاندھی جی کا شغف و انہماک بھی بڑھتا جاتا تھا۔ ۱۹ جولائی کو انھوں نے اس پارٹی کے نئے لیڈر پنڈت موتی لال نہرو کو اپنے جدید فیصلے کی یوں اطلاع دی: "لارڈ برکن ہڈ کی تقریر سے جو صورت حال پیدا ہوگئی ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ سوراج پارٹی کے اثر و اقتدار کو بڑھایا جائے۔۔۔۔

یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ کانگرس ..... ایک غالب سیاسی جماعت ہو جائے .... میں ارادہ کرتا ہوں کہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے جلسے میں یہ تجویز پیش کروں کہ کانگرس کی تمام مشینری آپ کے تصرف میں دے دی جائے۔" مہاتما جی کی ان لمبی چوڑی تعریفوں اور اشربادوں نے پنڈت نہرو کا دِل اور بڑھا دیا۔ اب وہ تعاون کی شاہ راہ پر اور بھی لمبے لمبے قدم اُٹھانے لگے۔ وزیر ہند کی حوصلہ فرسا تقریر نے بھی جس سے سوراج پارٹی کے سابق لیڈر کی ساری توقعات پر پانی پھر گیا تھا، پنڈت جی پر یہ اثر نہ ڈالا کہ وہ بائیں جانب جھکتے۔ جولائی میں اُنھوں نے اسکین کمیٹی کی رکنیت بھی قبول کر لی جو اس غرض سے مقرر کی گئی تھی کہ ہندستان میں برٹش سینڈھرسٹ کے نمونے کی ایک فوجی تربیت گاہ قائم کرنے کے امکانات پر غور وخوض کرے۔ دوسرا قدم مسٹر وٹھل بھائی پٹیل نے اُٹھایا جو سوراج پارٹی کے بڑے ہنگامہ دراغوش رکن سمجھے جاتے تھے۔ اگست میں اُنھوں نے لیجسلیٹو اسمبلی کی صدارت قبول کر لی اور اس کے بعد ایک تقریر کی جس کا اقتباس ذیل میں درج ہے:۔

"میں صرف اس وجہ سے اس عہدے۔ کے امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہوا کہ میرے خیال میں اس طریقے پر میں ہندستان کی زیادہ خدمت کر سکوں گا۔ سوراجیوں کو تخریبی نقاد کہا جاتا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی تعمیری صلاحیت اہلیت بھی ثابت کر دکھائیں ...... اب آج سے میری حیثیت ایک پارٹی ممبر کی نہیں ...... اگر وائسرائے صاحب چاہیں گے تو میں دن میں دس بار حاضری دوں گا اور سرکاری حکام مجھ سے جس قسم کی امداد و معاونت چاہیں لے سکتے ہیں۔"

ستمبر ١٩٢٥ء میں لیجسلیٹو اسمبلی کے شملہ والے اجلاس میں قومی مطالبہ پھر پیش کیا گیا یہ وہ موقع تھا کہ موڈی مین کمیٹی کی رپورٹ پر بحث و مباحثہ ہو رہا تھا۔ یہ کمیٹی قومی مطالبے کے پہلے ریزولیوشن کے پاس ہونے کے قبل ہی اس غرض سے مقرر کی گئی تھی کہ وہ اس کا جائزہ لے کہ اصلاحی دستور کس طرح چل رہا ہے اور اگر اس میں کسی ترمیم کی ضرورت نظر آئے تو اس کے لئے بھی سفارشات پیش کرے۔ اس سلسلے میں سوراج پارٹی کے ریزولیوشن کا طرۂ امتیاز یہ تھا کہ اس نے دستور میں کسی قسم کی تبدیلی کا مطالبہ نہیں کیا، اس میں چند اصلاحات کی ایک اسکیم ضرور شامل تھی جس کے لیے کہا گیا کہ اس پر گول میز کانفرنس یا کوئی اور کمیٹی جو لیجسلیٹو کونسل کے مشورے سے وائسرائے بہادر مقرر کر دیں غور وخوض کرے۔ اس طریقہ سے دستور کو تباہ کرنے والوں نے اصلاحات کے لیے شاہی کمیشن کا راستہ صاف کر دیا۔

چند ہی ہفتے میں صوبہ متوسط کے سوراج پارٹی کے لیڈر مسٹر تامبے نے گورنمنٹ کی اگزیکٹو کونسل کی ممبری کا عہدہ قبول کر لیا۔ سوراج پارٹی کی کونسل نے اس فعل کی مذمت کی اور اس کی بنا پر ممبروں میں شدید اختلافات شروع ہو گئے۔ لیکن اکتوبر ١٩٢٥ء میں جب آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا جلسہ ہوا تو اس نے ایک لمبے چوڑے ریزولیوشن کے ذریعے چرخے والی شرطِ رکنیت میں کچھ ترمیمات کر دیں اور ایک اور ریزولیوشن پاس کر کے سوراج پارٹی کو جو اس وقت اپنے انتشار اور پستی کی آخری حددں کو پہنچ چکی تھی کانگرس کے اندر ایک بلند مقام پر لا بٹھایا۔

سوراجیوں کی یہ رنگ رلیاں ہر شخص نے دیکھیں اور اس پر کونسل کے اندر اور باہر خوب خوب تنقیدیں بھی ہوئیں۔

سوراجیوں کے ایک ریزولیوشن کی تائید کرتے ہوئے ستمبر میں مسٹر جناح نے گورنمنٹ سے کہا: "کیا حکومت کا منشا یہ ہے کہ پنڈت موتی لال نہرو جب تک وائسرائے کے تخت کے سامنے گھٹنے ٹیک کر التجا نہ کریں گے شاہی کمیشن نہ مقرر کیا جائے گا؟ آخر اتنے دِن سے پنڈت جی اسمبلی میں کرتے کیا رہے ہیں، کیا وہ برابر تعاون نہیں کرتے رہے ہیں؟" ہوشیار پنڈت نے ان باتوں کی کوئی تردید نہیں کی۔

ایک غیر محتاط سوراجی، دیوان چمن لال، نے جنھیں اپنی انتہا پسندی پر بڑا ناز تھا اسی مباحثہ کے دوران میں کہا "سوراج پارٹی نے حقیقتاً لبرل فیڈریشن کے پروگرام کو اس لیے قبول کر لیا ہے کہ ملک اپنے مطالبات میں متحد نظر آئے۔

لبرل پارٹی کے ایک اخبار نے اس سے بھی پہلے سوراج پارٹی کے رویے کا خلاصہ ان الفاظ میں پیش کیا تھا "سوراج پارٹی والے زینہ بہ زینہ اور منزل بہ منزل تخریب کی بلندیوں سے اُتر کر، تعاون سے انحراف، کے ہموار راستوں پر آ گئے اور اس کے بعد انھوں نے رفتہ رفتہ ہمدردانہ تعاون کو اپنے پروگرام کا اصول بنا لیا۔" (بنگالی مورخہ ۲۲ جولائی ۱۹۲۵ء) آیئے، اخیر میں یہ بھی دیکھ لیں کہ ہمارے سامراجی آقاؤں نے حقیقت حال کو کس نظر سے دیکھا: "اب اس وقت جب کہ ہندوستان صبر و سکون کے راستوں کی طرف رُخ کر رہا ہے ہمارے لیے یہ ثابت کر دکھانا بہت ضروری اور اہم ہے کہ آئین پرستی اور تعاون ہی کے ذریعے مقصد بہتری کی جا سکتی ہے۔ (پانیر، مرگ جین)

اب سوراجی لیڈر نے کارخانہ داروں اور سرمایہ داروں کے ساتھ مکمل اور دلی اتحاد کی طرف پوری توجہ صرف کرنی شروع کی اور اس طرح گویا اپنی پالیسی کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ مزاحمت کے مسلک سے سب سے پہلی مرتبہ وہ اس موقع پر ہٹے ہیں جب ٹاٹا اسٹیل پروٹکشن بل پیش ہو رہا تھا۔

۱۹۲۵ء کے شروع میں اس قسم کی ناخوشگوار افواہیں اڑنے لگی تھیں کہ مالکانِ مل نے سوراجیوں کے خزانے مالا مال کر کے ان سے پورا وعدہ لے لیا ہے کہ روئی کے محصول کی منسوخی کی تائید کریں گے۔ ستمبر ۱۹۲۹ء میں کاروبار کی تباہ کن سرد بازاری کے عذر پر تقریباً ڈیڑھ لاکھ مزدوروں کی اجرت میں بیس فی صدی کی تخفیف کے علاوہ ساڑھے گیارہ فی صدی کی مزید تخفیف عائد کی جا رہی تھی، حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ آدھی سے زیادہ ملیں اچھا خاصا منافع کما رہی تھیں۔ مزدوروں کے جھگڑوں کو محصول کی منسوخی کے لیے ایک بہانہ بنا لیا گیا۔ بمبئی کے مالکانِ مل نے پنڈت نہرو کے اعزاز میں ایک عصرانہ دیا اور انجمن کے صدر نے سوراجی لیڈر کا شکریہ ادا کیا کہ ان کی پارٹی نے اسمبلی میں اس صنعت کے لیے بہت قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ پنڈت نہرو نے جواب میں کہا "میں مالکانِ مل کو یقین دلاتا ہوں کہ جب کبھی بھی اس صنعت پر غیر ملکی یا ناجائز مسابقت کے باعث آنچ آنے لگے گی ہم لوگ اسی طرح اس کی حمایت کریں گے۔" مگر ان غریب مزدوروں کی تباہ حالی پر پنڈت جی کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا جنھوں نے ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۱ء تک مسلسل تین سال خون پسینہ ایک کر کے اپنے آقاؤں کو اصل سرمایہ پر سو فی صدی سے زیادہ نفع دلوایا تھا۔

سوراجیوں کی ان حرکتوں کو دیکھ کر گاندھی جی کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ اگرچہ وہ خود بڑے تارک الدنیا ہیں لیکن ملکیت کے محاسن کا طبعاً اچھا خاصا ادراک رکھتے ہیں۔ وہ سرمایہ کی عزت کرتے ہیں خواہ وہ والیانِ ملک کے پاس ہو یا مل والوں کے پاس یا زمینداروں کے پاس یا تاجروں کے پاس۔ وہ منتفعین اور مظلومین کے مفاد کی علم برداری صرف اسی طرح کر سکتے ہیں کہ ان کے اور ان کے بدترین دشمنوں کے مفاد کو ایک کر دکھائیں۔ ایک وہ زمانہ بھی تھا کہ غیر تبدیلی پسند جماعت کا یہ زبردست لیڈر سوراجی پالیسی کی ناکامی پر بغلیں بجاتا لیکن اب ۱۹۲۵ء کے آخر میں جب یہ صورت تھی کہ سوراجی اپنے ابتدائی پروگرام کو مکمل طور پر ترک کر کے پیچھے ہٹنے لگے تھے تو یہی لوگ گاندھی جی کے خاص معتمد علیہ بن گئے تھے۔ دیش بندھو داس میں تو خیر کچھ ایسی چیزیں تھیں جو بڑے بڑے سورماؤں اور سچائی پر مرمٹنے والوں میں ہوتی ہیں مگر پنڈت نہرو کے مزاج میں کافی انفعال و اثر پزیری کی صلاحیت تھی۔

لیکن کانپور کے سالانہ اجلاس کے موقع پر پنڈت نہرو اور ان کے گروہ کو بڑی دقت کا سامنا پڑ گیا سوراجیوں کے انحراف کے کافی چرچے ہو چکے تھے۔ ان لمبی چوڑی ڈینگوں پر جو چند ہی مہینوں میں ہوا ہو گئی تھیں دشمن خوب بغلیں بجا رہے تھے غیر تبدیلی پسندوں نے جو ترک موالات کے محاسن پر اپنے لیڈر سے بھی کہیں زیادہ ایمان رکھتے تھے اس پر بہت چیخ پکار مچائی کہ سوراجیوں نے کانگرس کے مقدس نام پر حکومت کے ساتھ مکمل تعاون برتا ہے۔ سوراج پارٹی کے لوگ لیڈروں کی ابن الوقتی پر بے حد برہم ہو رہے تھے۔ اس کے علاوہ عوام کو بھی سوراجیوں کی خیانت و غداری کا اچھا خاصا احساس ہو گیا تھا۔ یہ لوگ کونسلوں میں گئے تو اس نیت سے تھے کہ نوکر شاہی کے چہرے کی نقاب تار تار کر دیں گے لیکن ہوا یہ کہ خود انھیں کے چہروں کی نقاب اتر گئی اور مزاحمت و تخریب کے مدعی اچھے خاصے زمانہ ساز اور حکومت کے معاون نظر آنے لگے اور اب تو گویا یہ لوگ اچھی خاصی جاہ طلبی، کمیشنوں کی ممبری،

اور اچھے اچھے عہدوں کے حصول کی راہ پر گامزن تھے۔

ظاہر ہے کہ پردہ فوراً قبل از وقت چاک ہو گیا تھا اور عوام کی نظروں کے سامنے پس منظر کا ضرورت سے زیادہ حصہ آ گیا تھا۔ اب یہ فکر ہوئی کہ اس وہم فریب کو پھر سے درست کیا جائے سادہ لوح عوام کی آنکھوں پر ذرا اور تیز قسم کے سحر کی ضرورت تھی۔ اللہ اچھے والے رشی اور سوانگی وکیل کانپور روانہ ہوئے کہ وہاں نیشنل کانگرس کے اجلاس میں آواز ملا کر ایسی نغمہ سرائی کریں کہ عوام کی بیدار ہوتی ہوئی محاربانہ روح پر ایک بار پھر خواب طاری ہو جائے

اڑسٹھواں باب

کانپور میں ملمع کاری اور سابرمتی پہنچ کر سپر اندازی

حرکیات سیاسی کے سنگین قوانین کے ماتحت سوراج پارٹی برابر دائیں جانب جھکتی چلی گئی۔ چونکہ سوراج پارٹی ایک عام انقلابی تحریک یعنی ترک موالات کی خاکستر سے پیدا ہوئی تھی اور اس کا مقصد یہ تھا کہ آئینی مزاحمت کے حربے کو بھی آزمالے لہٰذا خود اس جماعت میں ایسے افراد پیدا ہو گئے جو سرمایہ دار اور اوسط اعلیٰ طبقہ کے مفاد کے لیے برطانوی سامراج کی طرف علانیہ دست مفاہمت بڑھانے لگے۔ ان ایجابی تعاون پسندوں کے دلائل نہایت واضح تھے۔ جب مسٹر تامبے نے ایگزیکٹو کونسل کی ممبری قبول کر لی اور اس پر سوراجی لیڈروں نے لعن طعن شروع کی تو مسٹر جیکار اور مسٹر کیلکر نے جو اس ردعمل کے پیدا کرنے میں پیش پیش تھے کھلم کھلا سرکشی شروع کی اور اس سلسلے میں چند نہایت معقول سوالات پیش کیے: "مسٹر پٹیل کے صدر ہونے میں اور مسٹر تامبے کے ایگزیکٹو کونسل کے ممبر ہونے میں کیا فرق ہے اور ان دونوں کے درمیان حد فاصل کیا ہے؟ اگر منتخب کمیٹیوں اور سرکاری کمیشنوں کی ممبری کر کے حکومت کے ساتھ تعاون کرنا غلطی نہیں ہے تو وزیر بن کر تعاون کرنے میں کیا غلطی ہے"؟ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اگر تم اس شدید قسم کی صلح ناپذیر مخالفت کے راستے سے ہٹ ہی چکے ہو تو چند قدم اور آگے بڑھ کر ہم لوگ قوم و ملک کی تعمیری خدمت کیوں نہ کریں؟۔ ان لیڈروں نے محسوس کیا کہ ان کے ساتھ خواہ مخواہ زیادتی کی گئی ہے۔ لہٰذا انھوں نے سوراج پارٹی کے کونسلوں سے استعفیٰ دے دیا اور سوچا کہ کانپور کانگرس کے موقع پر زیادہ موثر جنگ کریں گے۔

لیکن اس لڑائی میں جوڑ برابر کی نہ تھی۔ سوراجیوں کا پلہ بہت بھاری تھا۔ اس موقع پر تحریک ترک موالات کے پیغمبر اعظم نے سوراجی پروگرام کی کرم خوردہ اور سڑی ہوئی نعش پر فوراً اپنا سفید کھدر کا مقدس لبادہ ڈال دیا کیونکہ وہ اور اس کی دست آموز کانگریس کمیٹی نے تو پہلے ہی پنڈت نہرو اور ان کی پارٹی سے وعدہ کر لیا تھا کہ کانگرس کی ساری مشینری ان کے تصرف میں دے دی جائے گی۔ اب ضرورت صرف یہ رہ گئی تھی کہ اوسط ادنیٰ طبقے کی انتہا پسندی اور عوام کی خوش اعتقادی پر کس طرح پورا اقتدار قائم رکھا جائے اس مقصد کو گاندھی نہرو کمپنی نے خواہ مخواہ کی زبانی ڈینگیں مار مار کر اور طرح طرح کے لایعنی کرتب دکھا دکھا کر نہایت قابلیت کے ساتھ انجام دیا۔

کانپور کانگریس میں حسب ذیل اہم سیاسی فیصلے ہوئے۔

(۱) سوراج پارٹی کی پارلیمنٹری پالیسی کی مکمل طور پر حمایت کی جائے۔

(۲) دوسری سیاسی جماعتوں یعنی داہنے بازو والی جماعتوں کو بلا قید مسلک و عقیدہ کانگرس میں شریک ہونے کی دعوت دی جائے۔

(۳) کامن ویلتھ آف انڈیا بل کی حمایت کی جائے (اس کا مسودہ ڈاکٹر بیسنٹ اور ان کے اعتدال پسند رفقا نے تیار کیا تھا اور اسی کو ڈیڑھ سال

پہلے سوراج پارٹی والے مسترد کر چکے تھے)

(۴) قومی تحریک کا نصب العین درجہ نو آبادیات یعنی سلطنت برطانیہ کے ماتحت خود مختارانہ حکومت کا حصول قرار دیا جائے۔

(۵) اگر حکومت قومی مطالبے کو مسترد کر دے تو سوراجی ممبروں سے کہا جائے کہ وہ اپنے عہدوں سے مستعفی ہو جائیں۔

(۶) آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا ایک خاص اجلاس طلب کیا جائے جو سارے مُلک کے لیے ایک لائحہ عمل مرتب کرے جس میں ۱۹۲۶ء کے انتخابات اور عام سول نافرمانی کے متعلق رائے عامہ کو تیار کیا جائے۔

(۷) اگر حکومت کی طرف سے کوئی باوقار اور دیانت دارانہ اقدام ہو تو کانگرس کی پالیسی فوراً بدل دی جائے۔

(۸) چرخے والی شرط رکنیت کو تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ برقرار رکھا جائے۔

اب ذرا اس پر نظر ڈالنی ہے کہ گاندھی جی خود اپنے کیے دھرے کو کس نظر سے دیکھتے تھے۔ قدرتاً سب سے پہلے انھوں نے اپنی محبوب شرط رکنیت والی مد پر نگاہ ڈالی۔ "یہ تو صاف ظاہر ہے کہ سوراجی کھدر بھی نہیں ترک کریں گے اور رائے دہندگان پر اپنا اقتدار بھی قائم رکھیں گے۔" (ینگ انڈیا مورخہ ۷ رجنوری ۱۹۲۶ء) گویا گاندھی جی اس خیال کو پسند کرتے تھے کہ سوراجیوں نے جیسے ان کے نام سے فائدہ اُٹھایا ہے اسی طرح آنے والے الیکشنوں میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے چرخہ اور کھدر سے بھی فائدہ اُٹھائیں بہر حال کانپور کانگرس کی ساری کارروائیوں کے اندر جس چیز کی سب سے زیادہ کارفرمائی نظر آرہی تھی وہ آنے والے الکشن جیتنے کی خواہش تھی۔

گاندھی جی نے لکھا تھا "کونسل والے ریزولیشن کا معاملہ بہت تفصیل طلب ہے۔" ہونا بھی یہی چاہیئے تھا ورنہ سیدھے سادے عوام معاملات کی اصل حقیقت سے آگاہ نہ ہو جاتے۔ تجویز کی اس شق کا، کہ اگر قومی مطالبہ نہ منظور کیا گیا تو کانگرسی ممبران اسمبلی سے واک آؤٹ کر جائیں گے، بڑا ڈھنڈھورا پیٹا جا رہا تھا۔ مگر کیا اس کے پہلے بھی متعدد بار قومی مطالبے کو مسترد نہیں کیا جا چکا تھا؟ کیا ان موقعوں پر سوراج پارٹی نے کسی قسم کی انتقامی کارروائی کی تھی؟ یہی اِتنا نہیں، بلکہ کیا اس حقیقت سے بھی اِنکار کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مطالبات کو صرف اپنے سامراجی آقاؤں کی منظوری کی امید میں کونسلوں میں نیز کونسلوں سے باہر برابر گھٹاتے چلے گئے؟ جتنا ہی اُنھیں ٹھکرایا جاتا تھا اتنا ہی وہ گرتے جاتے تھے۔ اب اس قسم کی باتوں میں کیا رکھا تھا کہ اگر گورنمنٹ نے اب کی بار مسترد کیا تو ہم کوئی کارروائی کریں گے۔ سیاسی دیانتداری اور معقولیت و شائستگی کا تقاضا تو یہی تھا کہ جب گورنمنٹ نے پہلی مرتبہ قومی مطالبے کو مسترد کیا تھا سوراج پارٹی والے واک آؤٹ کر کے چلے آتے یا پھر مزاحمت اور تخریب کی پالیسی پر شدت کے ساتھ عمل پیرا رہتے جیسے آئرستان والوں نے کیا تھا۔ ایک مرتبہ موقع کو ہاتھ سے دے دینے اور اپنے پرچم کو سرنگوں کر چکنے کے بعد انھوں نے چاہا کہ محض لفاظی اور ڈینگوں کے ذریعے آئندہ کے متعلق وعدے کر کر کے اپنا کھویا ہوا وقار پھر حاصل کریں۔ بہر حال اُنھوں نے سوچا کہ عوام کی نظروں میں پھر معزز ہونے کے اس آخری موقع سے فائدہ اُٹھائیں اور کسی نہ کسی طرح الکشن جیت لیں۔

اب مسٹر گاندھی نے ایجابی تعاون پسندوں کی بغاوت کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا "سطحی نظر سے دیکھنے والے سوراج پارٹی میں اس تفرقے کو ایک نامبارک چیز سمجھیں گے...... لیکن یہ ہرگز کوئی خراب چیز نہیں ہے کہ ہم اپنے بنیادی اختلافات کا جرأت و دیانت کے ساتھ اظہار کر دیں...... اور اگر لوگ ایک دوسرے کے احترام کا خیال رکھیں اور دیانتداری کے ساتھ اپنے خیالات کو پیش کرتے رہیں تو یہی بہت کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔" یاد رہے کہ اس موقع پر ایجابی تعاون پسندوں کے انحراف پر انھوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا اور نہ تو "براہ راست حکومت کی آغوش میں پہنچ جانے" کے مسلک کی تردید اور ترک موالات کے مقدس مسلک کی تائید میں ایک لفظ کہا حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ ایجابی تعاون پسندوں کی پیش کی ہوئی ترمیم کانگرس کے اجلاس میں مسترد ہو چکی تھی تاہم ان سے گفت و شنید کے لیے قصداً دروازے کھولے رکھے گئے تھے۔

جہاں تک کونسلوں سے واک آؤٹ کرنے کی دھمکی کا تعلق ہے گاندھی جی نے اس کی حقیقت یوں کھول دی "یہ حکومت کے لیے ایک کھلا ہوا نوٹس ہے اور رائے دہندوں کے لیے بھی اس بات کا کھلا ہوا اشارہ ہے کہ انھیں سوراج پارٹی سے کیا توقعات رکھنی چاہئیں۔" گویا مہاتما جی کی نظر میں بھی واک آؤٹ کا مقصد محض اتنا تھا کہ الکشن کے کارکنوں، اور چھوٹے طبقے کے رائے دہندوں کے انتہا پسندانہ رجحانات

کو کسی طرح بہلا کر اپنا کام نکالا جائے۔

سب سے زیادہ اہم گاندھی جی کے وہ الفاظ ہیں جو انھوں نے سول نافرمانی والی تجویز کے متعلق کہے۔ "یہ سول نافرمانی پر جو کچھ زور دیا گیا ہے وہ میرے خیال میں بالکل مناسب ہے۔ کوئی قوم اس وقت تک ترقی کی راہ پر آگے نہیں بڑھ سکتی جب تک اس کے پاس کوئی ایسا حربہ نہ ہو جس کے ذریعے وہ اپنی خواہشات کو منوا سکے۔ سول نافرمانی کے مسلک کے اعادہ کے معنی یہ ہیں کہ قوم کے نمائندے مسلح بغاوت کو صحیح نہیں سمجھتے۔ ہو سکتا ہے کہ سول نافرمانی ابھی بہت دور ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسے لوگ جتنا دور سمجھ رہے ہیں حقیقتاً اس قدر دور نہ ہو، بہر حال وقت کا سوال اس سلسلے میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ اصل چیز جو کچھ ہے وہ غیر جارحانہ مقاومت کی اسپرٹ ہے۔" یہ چیز تو صاف ہو ہی گئی کہ وہ فرد واحد جس سے عام سول نافرمانی کی مہم شروع کرنے کی توقع کی جا سکتی تھی حال میں یا مستقبل قریب میں اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ بہر حال اس ریزولیشن نے لڑائی کے دن قریب لانے کے سلسلے میں کچھ نہ کیا، برعکس اس کے ستیہ گرہی پیغمبر کا ارادہ یہ تھا کہ اس ریزولیشن کے ذریعے انقلابی تحریک کے بڑھتے ہوئے زور کو دبا دیا جائے۔ لیکن آخر کونسل کے جھگڑے اور الکشنوں کے کرتبوں کے بیچ میں اس قسم کا غیر متعلق ریزولیشن لایا ہی کیوں گیا؟ ظاہر ہے کہ پنڈت نہرو کا یہ ارادہ ہرگز نہ تھا کہ وہ لڑائی کا بگل بجا دیں گے، یہ بھی ظاہر ہے کہ ان کا دل جیل کے بجائے کونسل میں داخل ہونے کے لیے زیادہ بے چین تھا۔ اصل حقیقت وہی ہے جو بیان کی جا چکی، یعنی عوام کے ذہن میں ۲۲-۱۹۲۰ء کی لڑائی کا پورے ساز و سامان کے ساتھ نقشہ پیش کر دینا تھا تاکہ کونسل میں سوراجیوں کی غداری کے نقوش مٹ جائیں۔ اور الکشنوں میں شاندار کامیابی کا راستہ صاف ہو جائے۔

بہر حال کانپور کانگرس کے سارے پروگرام اور پالیسی کا ماحصل صرف یہی تھا کہ ہم پچھلے گناہوں کی تلافی کے لیے کونسل سے اس بیکار زمانہ میں واک آؤٹ کر دیں گے مگر اس کے بعد پھر کونسلوں میں جا داخل ہوں گے۔ گاندھی جی خود تو کونسلوں سے دور رہے مگر آشیرباد دیتے رہے گاندھی جی اور سوراجیوں نے متحد ہو کر ایجابی تعاون پسندوں کو شکست ضرور دے دی مگر گفت و شنید کے لیے دروازہ کھلا رکھا۔ کانپور میں تو کوئی سمجھوتہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ وہاں یہ ڈر تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جاہل عوام، جنھیں ایک رشی اور ایک زبردست سیاستدان کے متحدہ کرتبوں سے دامِ تزویر میں پھانسا گیا ہے بھڑک کر بھاگ نکلیں۔

اب موجودہ ضروریات کے لیے ملمع کاری مکمل ہو چکی تھی مگر کانگرس کا جلسہ ختم ہوتے ہی یہ قلعی اسی طرح اُڑنے لگی جیسے سورج نکلتے ہی شبنم کے قطرے بھاپ بن کر اُڑ جاتے ہیں۔ ۱۹۲۶ء کے شروع ہوتے ہی سوراج پارٹی نے رفتہ رفتہ اس بلند منصب سے جو اُس نے کانگرس کے موقع پر اختیار کیا تھا پستی کی طرف آنا شروع کیا۔ سالانہ تماشہ کامیابی کے ساتھ ختم ہو ہی چکا تھا لہٰذا انھوں نے آہستہ آہستہ اپنی ناٹک والی پوشاک اور اس کے ساز و سامان کو اُتارنا شروع کیا، دائیں بازو کے ممتاز اراکین نے مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں سے اس نیت سے استعفیٰ دیدیا کہ ایجابی تعاون کے پروگرام پر از سرِ نو منتخب ہونے کی کوشش کریں گے۔ سوراجی لیڈروں کو زبردست چرکہ لگا۔ انھوں نے دیکھا کہ یہ لوگ اگر از سرِ نو منتخب ہو جاتے ہیں تو پارٹی پروگرام میں ترمیم و تنسیخ ضروری ہو جائے گی۔ لہٰذا سوراج پارٹی کے دونوں بازوؤں کے لیڈروں کے درمیان دہلی کی فرحت بخش فضا میں گفت و شنید کا سلسلہ شروع ہوا۔ اسمبلی کے سرمائی اجلاس کے دوران میں سوراجیوں نے شروع سے اخیر تک کسی قسم کی مزاحمت کی پالیسی پر عمل نہ کیا تھا کیونکہ وہ بجٹ کے موقع پر اسمبلی سے واک آؤٹ کرنا چاہتے تھے۔ بجٹ پر ۴ مارچ کو بحث شروع ہوئی۔ ۶ اور ۷ مارچ کو دہلی میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا اجلاس ہوا اور سوراجی ممبران کو کانپور ریزولیشن پر عمل درآمد کرنے کے لیے قطعی احکام نافذ کیے گئے۔ بجٹ کے تفصیلی مطالبات ۸ مارچ کو پیش ہوئے۔ جب محاصل درآمد کی التوا کے متعلق مسٹر جناح کی تحریک ایک زبردست اکثریت کی رائے سے مسترد کر دی گئی تو پنڈت موتی لال اس ایوان میں اپنی آخری تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ انھوں نے فرمایا کہ "باعزت تعاون کے لیے جو شرائط آنجہانی مسٹر داس نے پیش کی تھیں انھیں حکومت نے حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا۔ سوراجیوں نے ڈھائی سال تک اصلاحات کو چلایا اور انتہائی ذلت برداشت کی، ہندوستان کے کتنے سورما جیل میں بند ہیں۔" اخیر میں انھوں نے حکومت کو متنبہ کیا کہ اگر اس کی یہی بے اعتنائی رہی تو وہ دیکھے گی کہ ملک کے طول و عرض میں خفیہ انجمنوں کا ایک جال بچھ گیا ہے۔ تقریر ختم

کرنے کے بعد وہ اپنے تمام متبعین کے ساتھ کونسل سے اُٹھ کر باہر چلے آئے -

ضمناً ہم اس موقع پر ایک پرلطف واقعہ نقل کرتے ہیں جو عین سوراجی ذہنیت کا نمونہ ہے - سوراجیوں کے واک آؤٹ کے بعد سر الگزینڈر موڈی مین نے حکومت کی طرف سے ایک مختصر سی جوابی تقریر کی - اس کے بعد اسمبلی کے صدر مسٹر وی جی پٹیل نے ایک ہنگامہ خیز اعلان کے بعد اجلاس کو ملتوی کر دیا - انھوں نے فرمایا "چوں کہ اس ایوان کی سب سے مضبوط پارٹی یہاں سے واک آؤٹ کر کے چلی گئی ہے لہٰذا اب اسمبلی کی وہ نمائندہ حیثیت نہیں رہی جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی رو سے ہونی چاہیے - اب یہ امر حکومت کے لیے قابلِ غور ہے کہ آیا اسمبلی جاری رکھی جائیگی یا نہیں" اخیر میں انھوں نے حکومت کو متنبہ کیا کہ کسی اختلافی قانون کو نہ پیش کرے ورنہ وہ مجبور ہوں گے کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی رو سے انھیں جو ہنگامی اختیارات حاصل ہیں ان کو کام میں لا کر ایوان کو غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دیں -

اس نمائشی شور و شغب کا تماشا دکھا چکنے کے بعد صدر صاحب کو دوسرے ہی دن پسپائی میں بھی کچھ تردد نہ ہوا - پہلے تو انھوں نے اس کا یقین دلایا کہ ان کا مقصد ایوان کے کسی رکن پر چوٹ کرنا نہ تھا اور اس کے بعد فرمایا کہ "میرا مقصد صرف اس امر پر زور دینا تھا کہ حکومت کو عوام کے نمائندوں کی کمی تعداد کا فائدہ اُٹھا کر بہت زیادہ نزاعی مسائل سامنے نہیں لانے چاہییں - بلکہ صرف انھیں کارروائیوں پر اکتفا کرنی چاہیے جو نظم و نسق کے لیے ضروری ہوں - میں اتنا اور کہنا چاہتا ہوں کہ غور و فکر کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اپنے اختیارات کے بارے میں مجھے کچھ نہیں کہنا چاہیے تھا، نہ ایسے الفاظ استعمال کرنے چاہیے تھے جس سے یہ مفہوم نکالا جا سکے کہ میں حکومت کو کسی قسم کی دھمکی دے رہا ہوں بلکہ مجھے اس کا انتظار کرنا چاہیے تھا کہ واقعات کس نہج پر چلتے ہیں اور اس کے بعد اپنی راہِ عمل متعین کرنی چاہیے تھی"

آئندہ الیکشن میں کامیاب ہونے اور سوراجیوں کے ووٹ سے پھر صدر بننے کے لیے خود جناب صدر کو اس قسم کے ڈھونگ رچانے پڑے -

دہلی اجلاس کے بعد ایجابی تعاون پسند پارٹی کے لوگ ایک نئی چال چلے انھوں نے ۳ اپریل کو بمبئی میں اس مقصد سے ایک کانفرنس منعقد کی کہ اعتدال پسندوں اور انڈیپنڈنٹ پارٹی والوں کو ملا کر ایک نئی نیشنل پارٹی بنائی جائے - اس کانفرنس میں سر تیج بہادر سپرو، مسٹر محمد علی جناح، پنڈت مالوی، اور مسٹر جیکر نے شرکت کی، ایک انڈین نیشنل پارٹی کی تشکیل عمل میں آ گئی اور اس کا مقصد یہ قرار پایا کہ "سوراج یا اس قسم کی مکمل ذمہ دارانہ حکومت جیسی سلطنت برطانیہ کی نو آبادیات میں قائم ہے جلد سے جلد ہندوستان میں بھی قائم کی جائے اور اس میں اقلیتوں اور پس ماندہ قوم کے حقوق کے تحفظ کا انتظام رہے" قرار پایا کہ یہ پارٹی آزادی کے ساتھ حسبِ ضرورت لیجسلیٹو اسمبلی میں ایجابی تعاون کے ساتھ کام کرنے کے لیے تمام جائز اور پر امن ذرائع (جن میں عام سول نافرمانی یا عام عدمِ ادائگیِ محاصل شامل نہیں ہیں) استعمال کرے گی - مسٹر جیکار نے اس نئی تنظیم میں اس وقت تک شرکت نہیں کی جب تک کہ ان کی پارٹی نے اس پر غور و خوض نہیں کر لیا -

سوراجی اس حربہ کی تاب نہ لا سکے اور انھوں نے گھٹنے ٹیک دیے - پنڈت نہرو جو سیاسی آتش بیانی میں بڑے اُستاد تھے - انتہائی چپقلش میں پڑ گئے اور عجیب عجیب متضاد باتیں کرنے لگے پہلے تو انھوں نے اس قسم کی چوٹیں کیں کہ اس پارٹی کو محض سوراجیوں کے مقابلے کے لیے وجود میں لایا گیا ہے پھر اور طرح طرح کے فقرے چست کرتے رہے کہ ابھی تو یہ ذرات کا ڈھیر ارضیاتی نشو و نما کی پہلی ہی منزل میں ہے وغیرہ وغیرہ - غرضکہ اس قسم کے طعن و تضحیک سے پنڈت جی نے نئی پارٹی کے بعض لوگوں کو اپنی طرف ملانا شروع کیا - آخر کار یہ طے ہوا کہ سوراج پارٹی کے دونوں بازوؤں کے لیڈروں کا ایک مشترکہ جلسہ ۲۱ اپریل ۱۹۲۶ء کو بمقام سابرمتی گاندھی جی کے آشرم میں منعقد کیا جائے اور اتحاد کی سبیل نکالی جائے - اس جلسے میں پنڈت نہرو، مسٹر نائیڈو، لالہ لاجپت رائے، مسٹر جیکار، ڈاکٹر مونجے، اور مسٹر کیلکر نیز خود مہاتما گاندھی شریک تھے - سابرمتی میثاق پر دستخط کرنے والوں نے بشرط منظوری آل انڈیا کانگریس کمیٹی اس بات پر اتفاق کیا کہ فروری ۱۹۲۴ء کے قومی مطالبہ کے جواب میں حکومت کا جو کچھ رویہ رہا ہے اسے جہاں تک صوبوں کا تعلق ہے اس شرط پر قابلِ اطمینان سمجھا جا سکتا ہے کہ "وزرا کو اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے ضروری اختیارات، ذمہ داریاں، اور حقوق دے دیے جائیں" مطلوبہ اختیارات کی تعیین کانگریسی ممبران کونسل پر چھوڑ دی گئی جس کے لیے ضروری تھا کہ اپنے فیصلوں کی توثیق اس کمیٹی سے کرائے جو مسٹر جیکار اور پنڈت موتی لال نہرو پر مشتمل تھی -

اُنہتّرواں باب

تعمیری تعاون سے مکمل آزادی کی طرف

اب ایجابی مصلحت پرستی کے آگے ہتھیار ڈال دینے کے لیے میدان صاف ہوچکا تھا۔ سوراجی لیڈروں نے سابرمتی معاہدے کو خاموشی سے نظرانداز کردیا تھا، لیکن سابرمتی والی غدارانہ ذہنیت اب بھی کارفرما تھی۔ کانپور کانگریس میں ساری پالیسی اور جوڑ توڑ کا محور الکشن ہی تھا۔ مگر اب الکشن ختم ہوچکے تھے۔ مدراس کے علاوہ باقی ہر جگہ سوراجی نمایاں طور پر کم زور ثابت ہوچکے تھے اور ایجابی تعاون پسندوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ وزارتیں بھی بن چکی تھیں۔ ایجابی تعاون پسندوں نے اپنے ہم خیال ممبران کونسل کی تائید وحمایت سے صوبہ متوسط میں وزارت کے عہدے قبول کرلیے تھے۔ مگر سوراجیوں کو مدراس میں جہاں اُن کی فیصلہ کن اکثریت تھی، ایسی وزارت سے سابقہ تھا جسے وہ اگلے سال آسانی سے توڑ سکتے تھے، یہ بھی ایک کھُلا ہوا راز تھا کہ بمبئی نیز اور صوبوں میں سوراجیوں نے اگر نئی وزارتوں کی تشکیل میں عملاً کوئی مدد نہیں دی تو کم از کم معناً انھیں چُپ چاپ تسلیم ضرور کرلیا تھا۔

اب اسمبلی میں خصوصاً صوبائی اسمبلی میں، کانگریسی ممبروں کا کیا فرض تھا؟ اس وقت ان کے سامنے یہ سوالات تھے کہ آیا انھیں سنہ ۱۹۳۱ء کے جاڑوں کی طرح پھر واک آؤٹ کرنا چاہیے؟ یا سوراج پارٹی والی مسلسل مستقل اور شدید مزاحمت" کی پالیسی اختیار کرنی چاہیے' یا خود اعتمادی اور رفع شر کے مقدس پردے میں خاموشی کے ساتھ ایجابی تعاون پسندوں کی پالیسی کا شکار ہوجانا چاہئے، سب سے بڑھ کر یہ کہ آیا انھیں ہر قیمت پر نئی وزارتوں کو تباہ کردینے کی کوشش کرنی چاہیے یا عملاً ایجابی تعاون پسندوں اور نیشنلسٹ کانگریسیوں کی ہم نوائی کرتے ہوئے تعمیری کام اور قومی ترقی کے مقدس نام پر نئی وزارتوں کی امتیازی طور پر حمایت کرنی چاہیے؟

کانگریس نے حسب ذیل ریزولیوشن پاس کرکے ان تمام سوالوں کا جواب دے دیا:

"کانگریس اپنی اس قرارداد کا اعادہ کرتی ہے کہ اسمبلی میں اور مختلف کونسلوں میں کانگریسی ممبروں کی عام پالیسی یہ ہوگی کہ ہر ایسی کارروائی کے متعلق جس سے قوم کی صحیح نشوونما مقصود ہو خود اعتمادی سے کام لیں اور ہر اس کاروائی کی، خواہ سرکاری ہو یا غیر سرکاری، جو سوراج کی راہ میں قومی ترقی کی مزاحم ہو، پُرزور مخالفت کریں۔ مجالس قانون ساز میں کانگریسی ممبروں کو بالخصوص چاہیے کہ

(۱) جب تک آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی رائے میں گورنمنٹ کی طرف سے قومی مطالبے کا تسلی بخش جواب نہ مل جائے اس وقت تک وزارت یا حکومت کا دیا ہوا کوئی عہدہ نہ قبول کریں، اور اگر دوسری پارٹیاں وزارتیں قائم کرنا چاہیں تو اس کی مخالفت کریں۔

(ب) تابع دفعہ (د) حکومت کے مصارف کے لیے کوئی رقم اس وقت تک منظور نہ ہونے دیں اور نہ بجٹ پاس ہونے دیں جب تک حکومت کی طرف سے قابلِ اطمینان جواب نہ مل جائے یا جب تک آل انڈیا کانگرس کمیٹی کوئی حکم نہ دے۔

(ج) ایسے تمام قوانین کی جن کے ذریعہ دفتری حکومت اپنے پنجے مضبوط کرنے چاہے تجاویز پاس نہ ہونے دیں۔

(د) قومی زندگی کی صحیح نشوونما ملک کے لیے اقتصادی، زراعی، صنعتی، اور تجارتی ترقی، نیز شخصی آزادی اور تقریر، اجتماع، اور پریس کے تحفظ کے لیے اور نتیجتاً دفتری حکومت کو برطرف کرنے کے لیے تجاویز اور بل پیش کرتے رہیں اور ان مقاصد کے لیے جو کارروائی کی جائے اس کی تائید و حمایت کرتے رہیں۔

(ح) کسانوں کی حالت درست کرنے کے لیے ایسی کارروائیاں کرتے رہیں جن کے ذریعے کسانوں کا حق ملکیت مقرر ہو جائے اور اُن کی فلاح کے لیے اور دوسرے وسائل نکل آئیں۔

(و) زمینداروں اور کسانوں، نیز سرمایہ داروں اور مزدوروں کے زرعی اور صنعتی حقوق کا بالعموم تحفظ کیا جائے اور اُن کے درمیان منصفانہ بنیادوں پر صحیح ربط قائم کیا جائے۔

کان پور اور گوہاٹی کے ریزولیوشنوں کی اسپرٹ اور چالوں میں جو نمایاں فرق ہوا اسے سرسری نظر سے بھی دیکھ کر ہر شخص محسوس کر سکتا ہے۔ مگر خود اعتمادی اور حکومت کے مظالم کی مقاومت کے بلند بانگ نعرے اس پستی کے گڑھے کو نہیں چھپا سکتے تھے جہاں کانگرس گر چکی تھی۔

حکومت تو برابر قومی مطالبے کو ٹھکرا رہی تھی مگر کانگرس اب واک آوٹ کا سوانگ مسترد کر چکی تھی۔ اگر ۱۹۲۶ء کے سرمائی اجلاس میں کانگرسی ممبروں کے لیے کونسلوں کی تمام کارروائیوں سے یوں اچانک قطع تعلق کر لینا ضروری تھا تو پھر ۱۹۲۷ء میں کیا بات تھی کہ اس کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی؟ بہر حال یہ چیز دلچسپ ہے کہ کانگرس کے سامنے کسی نے یہ سوال پیش ہی نہیں کیا۔ نہ کسی نے اس کے جواب دینے میں اپنا وقت ضایع کرنا مناسب سمجھا۔ وجہ یہ تھی کہ ہر شخص اپنی جگہ پر اتنا سمجھ رہا تھا کہ اس تمام شور و شغب کا جو اصل مقصد تھا وہ پچھلے الکشن میں حاصل ہی ہو گیا۔ اب اس قسم کی چیزوں کے اعادہ کی کیا ضرورت رہی!

واک آوٹ کا قصہ یوں ختم کر دینے کے بعد کانگرس کو ایجابی تعاون کے دلدل میں دو چار قدم اور آگے چلے جانے میں کوئی دقت نہ تھی، مگر اس ڈر سے کہ پس پردہ جس قسم کی شرم ناک اور ذلیل چالیں چلی جا رہی ہیں کہیں وہ منظرِ عام پر واضح طور پر نہ دکھائی دینے لگیں اس پستی کی طرف بہ تدریج اور آہستہ آہستہ قدم اُٹھائے گئے۔ اس سلسلے میں ضرورت محسوس ہوئی کہ وزارتی عہدوں سے انکار کر دیا جائے اور اگر دوسری پارٹیاں وزارت بنانے لگیں تو اُن کی مخالفت کی جائے۔ لیکن یہ سب غیر مشروط طریقے پر نہیں کرنا تھا۔ شرط یہ تھی کہ اگر حکومت کی طرف سے قومی مطالبے کا تسلی بخش جواب نہ ملا تب یہ صورت اختیار کی جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ شرط کس قدر مضحکہ خیز تھی۔ کانگرسی لیڈر اچھی طرح جانتے تھے کہ آئندہ چند ماہ کے اندر اندر اس کی ذرہ بھر بھی توقع نہیں ہے کہ حکومت اس سلسلے میں کسی قسم کا نیا اقدام کرے، لہذا اس دفعہ کو ایک مشروط طریقے پر پیش کرنا ہی اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ یہ شرط محض اس لیے رکھی گئی تھی کہ وزارتوں کے قیام کے سلسلے میں کانگرسی ممبر مختلف صوبوں میں جو کچھ امداد کرنے والے تھے یا خاموشی اختیار کرنے والے تھے اس پر پردہ پڑا رہے۔

اسی طرح حکومت کے مصارف کے لیے رقمیں نامنظور کرنے یا بجٹ کو مسترد کرنے کی تجویزیں بھی مشروط رکھی گئیں۔ مزید برآں انھیں دفعہ (د) کے تابع رکھا گیا، جس کے معنی یہ تھے کہ کانگرسی ممبروں کو کونسلوں کے ذریعے گاندھی جی کے پسندیدہ تعمیری پروگراموں کو چلانے کی ترغیب دی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اگر آپ کو تعمیری شعبوں کے لیے زیادہ رقمیں منظور کرانے کے لیے جدوجہد بھی کرنی ہے تو آپ بجٹ کو یا مصارف حکومت کی رقموں کو غیر امتیازی طور پر اور کلیتاً مسترد نہیں کرانا چاہیں گے۔ اس صورت سے گویا یہ دفعہ، پہلی دفعہ کو کالعدم کر دیتی ہے۔ رقوم مصارف کی نامنظوری کا نعرہ بھی اس لیے بلند کیا گیا تھا کہ نئی کونسلوں کی روزمرہ کی کارروائیوں میں اطمینان کے ساتھ خوب پُرزور اور مستقل طور پر عملی تعاون برتا جا سکے۔

آخری دونوں دفعات یقیناً انتہائی ریاکارانہ تھیں جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں صنعتی کارخانوں کے مالکوں اور سرمایہ داروں کے ساتھ سوراجیوں نے پہلے ہی سے ایک خبیث قسم کا معاہدہ کر رکھا تھا۔ اس کے باوجود انھیں یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آئی کہ ہم مزدوروں اور کسانوں کے حقوق کا تحفظ کریں گے۔ مطلب محض یہ تھا کہ اُن کی انقلاب دشمن سرگرمیوں پر پردہ پڑا رہے۔ مزدوروں اور اُن کے سرکاری اور غیر سرکاری آجروں کے درمیان جتنے بھی بڑے بڑے جھگڑے ہوئے اس میں کانگرس نے کبھی کسی قسم کا حصہ نہیں لیا۔ اگر مزدور طبقہ اپنی موجودہ بدحالی سے تنگ آکر اُسے دور کرنے یا اس میں مزید اضافہ روکنے یا اپنی حقیر اجرت میں اضافہ کرانے یا مزید تخفیف کو روکنے کے لیے کبھی ہڑتال پر مجبور ہوا ہے تو اس قسم کی ہڑتالوں کی تحریک تو درکنار کانگرس کے دولت مند لیڈر کبھی اُن کی حمایت میں بھی زبان تک ہلانے کے روادار نہیں ہوئے۔ نہ کبھی انھوں نے کسی ہڑتال فنڈ میں ایک پیسہ چندہ دیا۔ البتہ کھدر کی قربان گاہ پر ہر سال لاکھوں روپے ضرور پھونکے جاتے تھے۔ اس سب کے باوجود بھی کانگرسی لیڈروں کی بے حیائی دیکھیے کہ کانگرس کے ہر اجلاس میں نہایت ڈھٹائی کے ساتھ مزدوروں کی تنظیم اور مزدوروں کے حقوق کے مقدس راگ الاپا کرتے تھے حالاں کہ دل میں یہی طے کیے رہتے تھے کہ سال بھر تک ان غریبوں کے ساتھ سوا غداری کے اور کچھ نہیں کرنا ہے۔

یہاں اس اہم نکتے کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کہ پنڈت نہرو نے اس اجلاس میں تعمیری کام کے متعلق جو ریزولیوشن پاس کیا تھا اُس میں سول نافرمانی کے بارے میں بھول کر بھی کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ اس جعلی اور بناوٹی نعرے کا جو مقصد تھا وہ الکشن کے موقع پر حاصل ہو ہی چکا تھا لہٰذا اب اس کے اعادے کی کیا ضرورت تھی۔ اب نہ کسی واک آؤٹ کی ضرورت رہی نہ سول نافرمانی کی ترغیب کی کوئی حاجت رہ گئی۔ اب تو محض یہی رہا کہ کونسلوں میں جم کر بیٹھ جاؤ تاکہ آسانی کے ساتھ وزیروں کی حمایت اور حکومت سے لین دین ہو سکے، البتہ اپنے چہروں پر آئینی مخالفت کی ہلکی سی نقاب ضرور ڈالے رہو اور جب تک تمھارا نصیب یاوری کر کے تمھیں کونسلوں میں نہ پہنچا دے اس وقت تک حسبِ توفیق چرخہ کاتتے رہو۔ گویا گوہاٹی کانگرس نے جو ذلیل اور شرم ناک پیغام دیا معنوی حیثیت سے اس کا ماحصل بس یہی اتنا تھا۔

ظاہر ہے کہ ردِ عمل پوری وضاحت کے ساتھ رونما ہو چکا تھا۔ لفظوں کی بنائی ہوئی نقاب تار تار ہو چکی تھی لیکن اس سیاسی پسپائی کو کسی نہ کسی طرح چھپانا بھی ضروری تھا۔ کھدر اور چرخہ پھر آڑے آیا۔ کیا مہاتما نے خود اپنی سنہ ۱۹۲۴ء کی انقلاب دشمن پسپائی پر یہی پردہ نہیں ڈالا تھا۔ اس کے بعد البتہ چرخے والی شرط کو نرم کر دیا گیا تاکہ بڑے بڑے سیاسی لیڈروں کے لیے گنجائش نکل آئے۔ کھدر کی وردی کو محاربانہ سیاست کے

نشان کے طور بہت کار آمد طریقے پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ ابھی تک یہی قانون تھا کہ اسے خاص خاص موقعوں پر ضرور پہنا جائے۔ موقعوں کی تعیین افراد کے ضمیر پر چھوڑ دی گئی تھی اس صورت میں سوراجیوں میں اور ایجابی تعاون پسندوں اور نیشنلسٹ پارٹی کے درمیان جن کی زمانہ ساز سیاسی چالیں بھی تقریباً بالکل اسی قسم کی ہوتی تھیں اشتباہ کا کافی اندیشہ رہتا تھا لہٰذا گئوہاٹی کانگرس نے ہر کانگرسی کے لیے عادتاً ہاتھ کا کتا بُنا کھدر پہننا لازمی قرار دے دیا۔

پھر گاندھی جی کا بھی خیال تھا۔ کھدر کی شرط کا اور سخت کر دیا جانا ان کے لیے یقیناً بہت مسرت کا باعث تھا۔ اس طرح سے سوراجیوں کو ایک مرتبہ اور گاندھی جی کی اشیرباد مل گئی۔ گاندھی جی نے کانگرس کے کھلے اجلاس میں صرف دو تجویزوں پر تقریر کی پہلی تجویز تو انھوں نے سوامی شردھانند کے قتل کے متعلق پیش کی اور دوسری جنوبی افریقہ کے ہندستانیوں کے متعلق جس کے سلسلے میں انھوں نے جنوبی افریقہ کی گول میز کانفرنس کا بیان شروع کر دیا جو افریقہ کے ہندستانیوں کی حیثیت کے متعلق گفت و شنید کرنے کے لیے منعقد ہوئی تھی اور جس کے استقبال کا خوش گوار کام خود گاندھی جی نے انجام دیا تھا اور اس کے لیے ہدایت و برکت کی دُعائیں مانگی تھیں۔

کانگرس کا اس وقت جن مسائل سے سابقہ تھا اُن کے متعلق البتہ گاندھی جی مُنہ میں گھونگنیاں ڈالے بیٹھے رہے اور ایک لفظ نہ کہا۔ لیکن ضرورت ہی کیا تھی وہ تو اپنے کو اور اپنی ساختہ پرداختہ کانگرس کو دیش بندھو داس کے انتقال کے بعد ہی سے پنڈت موتی لال نہرو کے سپرد کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے نہایت محنت و جاں فشانی سے چرخے کے کشادہ جھنڈے کے نیچے سارے رجعت پسندوں، سرمایہ داروں سرکاری جاہ پرستوں، اور خوشامدیوں کو جمع کر ہی دیا تھا۔ اب اگر کانگرس کا وہ پختہ رنگ اُترتا جا رہا تھا تو انھیں اس کے لیے فکر مند ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ انھیں کی کوششوں کی بدولت اب. بیسنٹ پارٹی والے، ایجابی تعاون پسند، ، بلکہ نیشنلسٹ پارٹی والے بھی کانگرس کے پلیٹ فارم پر اونچی اونچی کرسیوں پر براجمان ہو چکے تھے۔ خود اُنھیں کے مقدس آشرم میں سابرمتی معاہدے پر دستخط ہوئے تھے۔ بہر حال آنے والے الیکشنوں کی ہنگامی ضروریات کے ماتحت اگرچہ اگلے اجلاس میں کانگرس کو گئوہاٹی کے فیصلوں کو مسترد کرنا پڑا، لیکن یہ واقعہ ہی کہ گاندھی جی خود ان فیصلوں سے بہت کافی مطمئن تھے۔ ظاہر ہی کہ جب وہ خود اور اُن کے غیر تبدیلی پسند رفقا تعمیری پروگرام کو باہر رہ کر چلا سکتے تھے تو اس میں حرج ہی کیا تھا کہ کانگرس والے اسی پروگرام کو کونسلوں کے اندر رہ کر چلائیں!

مگر واقعات کی رفتار نے گئوہاٹی ریزولیوشنوں کے تمام مضمرات کو اُبھار کر ظاہر کر دیا۔ کانگریسیوں کو خاص طور پر ہدایت کر دی گئی تھی کہ اگر دوسری پارٹیاں وزارت بنانے لگیں تو ان کی مخالفت کریں مگر وہی کانگرسی تھے کہ بیشتر صوبوں میں وزارتوں کے ساتھ دلی تعاون برت رہے تھے۔ مگر اُن کے پاس اچھا خاصا عُذر یہ تھا کہ خواہ وہ کتنا ہی چاہیں اقلیت میں ہونے کے باعث ان کے بس کی چیز نہیں ہی کہ وزارت کو توڑ دیں۔ لہٰذا اب ان کے سامنے صرف یہ صورت رہ گئی کہ گئوہاٹی ریزولیوشن کی بقیہ دفعات کے تحت تعمیری کاموں میں تعاون کریں۔ ایجابی تعاون پسندوں نے اپنے ہم خیال ممبران کی علانیہ حمایت سے صوبہ متوسط میں عہدے قبول کر لیے تھے۔ مگر ان کے قول و فعل میں کوئی ایسا تضاد

نہ تھا، جو کچھ وہ سالہا سال سے کہتے آئے تھے اب اسی پر عمل کر رہے تھے۔ مدراس کے سوراجیوں کے پاس البتہ اپنی تعاون پسندانہ چالوں کے لیے کوئی عُذر نہ تھا۔ ان کو پکّے کانگرسی ہونے کا بھی دعویٰ تھا اور کونسل میں ان کی فیصلہ کن اکثریت بھی تھی۔ وہ حکومت کی قائم کی ہوئی وزارت کو توڑ سکتے تھے حقیقت یہ ہے کہ وہ تو مدراس میں دو عملی نظام کو ختم کرکے وہی کارنامے دکھا سکتے تھے جو مسٹر داس نے بنگال میں دکھائے تھے لیکن اُن کے ذلیل طرزِ عمل نے جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ کانگرس کے صدر مسٹر سری نواس آئنگر کے ایما سے اختیار کیا گیا تھا ایسی شرم ناک صورت پیش کی کہ ہندستان کے تمام کانگرسی حلقوں میں اس کی نظیر نہ تھی۔

۱۶ رمئی ۱۹۲۷ء کو جب بمبئی کانگرس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہؤا تو کونسلوں میں کانگرس کے رویہ کا مسئلہ سامنے آیا۔ کمیٹی نے پوری توجہ سے اس معاملے پر غور و خوض کیا اور ایک اصول پر اتفاق کیا جس کی بنا پر لیجسلیٹو اسمبلی اور کونسل کی کانگرس پارٹیوں کو حسب ذیل ہدایات روانہ کی گئیں:۔

تمام اسمبلیوں اور کونسلوں کی کانگرس پارٹیوں کو ورکنگ ہدایت کرتی ہے کہ گَوہاٹی کانگرس کے ریزولیوشن نمبر ۵ دفعہ (الف) کے ماتحت ان کا فرض یہ ہے کہ جہاں کہیں ممکن ہو دو عملی نظام کو نہ چلنے دیں۔ لیکن اگر ان کی رائے میں کسی خاص وزارت کو توڑنے سے نوکر شاہی یا کسی دشمن پارٹی کو تقویت پہنچنے کا اندیشہ ہے تو اس حالت میں اُن پر وزارت شکنی کا فریضہ نہیں عائد ہوگا۔ نیز ہر دو ایوان کی کانگرس پارٹیوں کے لیے مناسب ہوگا کہ متذکرہ بالا ریزولیوشن کی دفعات (ج)، (د)، (ھ) اور (و) میں بیان کیے ہوئے پروگرام اور پالیسی کو کام یاب بنانے میں دوسری پارٹیوں کے ساتھ تعاون کریں۔

اس قسم کا قانون بنا لینے کے بعد ورکنگ کمیٹی کو یہ باور کرنے میں کوئی دقت نہ رہی کہ مدراس کانگرس پارٹی نے کوئی ایسا فعل نہیں کیا جسے کانگرس کے اصل مقصد یعنی حصول سوراج کے یا گَوہاٹی ریزولیوشن کے خلاف سمجھا جا سکے۔ ورکنگ کمیٹی نے مدراس کے سوراجیوں کی براءت ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ اتنا اور اضافہ کر دیا کہ مدراس کونسل پارٹی کانگرس اور ہندستان کے شکریہ کی مستحق ہے کیوں کہ اس نے نوکر شاہی کو رجعت پسند غیر برہمن پارٹی کے ساتھ اتحاد کرکے تقویت نہیں پہنچنے دیا۔

پورے ایک سال کے بعد سابرمتی کے غدارانہ منصوبے خود کانگرس کے صدر کے ہاتھوں پورے ہو گئے۔ کانگرس کی صفوں میں اتحاد ضرور پیدا ہو گیا مگر عزت و ناموس کی بھینٹ چڑھانے کے بعد! مجالس قانون ساز میں مستقل اور بے دردانہ مخالفت کا وہ اصول جسے مسٹر داس نے قائم کیا تھا نہایت بے غیرتی کے ساتھ حلوے مانڈے کے عوض فروخت کر دیا گیا۔ کل جن لوگوں نے جنگجو سیاسی کارکن کی حیثیت سے کام کیا تھا، آج وہی بزدلی، دغابازی اور ریاکاری کا مجسمہ نظر آ رہے تھے! کان پور میں جو ہلکا سا نقاب باقی تھا وہ تو خیر پہلے ہی تار تار ہو چکا تھا مگر گَوہاٹی میں جو ایک خفیف سی جالی رہ گئی تھی، سو اب اس کی بھی دھجیاں اُڑ گئیں اور صورتِ حال اپنی شرم ناک عریانی کے ساتھ سامنے آ گئی۔

ترک موالات، سول نافرمانی۔ اور مزاحمت و تخریب کے مدعی ذلت و انحطاط کی ایسی پستی میں کبھی نہیں گرے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کانگرسی زوال کی انتہا تھی۔

جب زوال اپنی حد کو پہنچ چکا تو ایک بار بجلی کا ایسا کڑکا ہؤا کہ سارا ہندستان ہل گیا!

۸ر نومبر ۱۹۲۷ء کو وائسرائے نے سر جان سائمن کی صدارت میں ایک کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا۔ وائسرائے نے کمیشن کے مقاصد کو بالتفصیل بیان کیا اور کہا کہ اس موضوع پر ہندستان کی رائے معلوم کرنے کے لیے برطانوی پارلیمنٹ کا ارادہ ہے کہ مرکزی مجالس قانون ساز کے ذریعے ایک جوائنٹ سلکٹ کمیٹی مقرر کرائے جو اپنی رائے اور تجاویز کو کمیشن کے سامنے پیش کرے۔

اصلاحات کے لئے اس کمیٹی کے تقرر نے جس میں سب برطانوی اراکین تھے، ہندستان کی سیاسی فضا میں ایک اچھا خاصا طوفان برپا کر دیا۔ ہندستان کی تمام سیاسی جماعتوں نے، بشمول کانگرس اور لبرل، حکومت کے اعلان کا جو کچھ جواب دیا وہ ایک لفظ "مقاطعہ" تھا۔ ۱۰ر نومبر کو کانگرس کے صدر نے ایک بیان شایع کیا اور سارے ملک کو کمیشن کا ہر منزل اور ہر صورت میں مقاطعہ کرنے کا ذیل کے الفاظ میں مشورہ دیا:-

"اس اعلان نے ہندستان میں جو حیرت انگیز اتحاد رائے پیدا کر دیا ہے اس سے مجھے بے حد خوشی ہے۔ ہمارے لیڈروں نے اپنی ذمہ داری کو پوری طرح محسوس کر لیا ہے۔ اور اس اصول پر عمل کیا ہے کہ لیڈر کا کام مستقبل کا انتظام کرنے کی بجائے رائے عامہ کو متحد و مستحکم کرنا ہے۔ حکومت برطانیہ نے باشندگانِ ہند اور وطن دوست کارکنوں کو جس قسم کا اہانت آمیز چیلنج دیا ہے اس کا مناسب جواب کے لیے ایک فوری اور قطعی اقدامِ عمل کی ضرورت ہے .... گویا حکومت برطانیہ نے ہندستان کے تمام زن و مرد کو یہ چیلنج دیا ہے کہ اگر وہ ہمت رکھتے ہیں تو کمیشن کا مقاطعہ کریں۔

گورنمنٹ کا یہ بیان کہ اگر ہمارا معاملہ مضبوط ہے تو ہم کمیشن اور جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی سے اُسے منوا سکتے ہیں ہماری خوش گمانیوں پر ایک اچھی خاصی چوٹ ہے۔ آخر اب کس قسم کی شہادت کی ضرورت ہے اور کیا فیصلہ سنایا جا سکتا ہے؟ لیجسلیٹو اسمبلی میں دو مرتبہ یہ مطالبہ پیش کیا جا چکا ہے کہ ہمیں مکمل ذمہ دارانہ حکومت دی جائے اور اگر گول میز کانفرنس یا کسی اور مجلس کے ذریعہ دونوں قوموں کے درمیان دوستانہ طور پر ہندستان کے نئے دستور کے شرائط طے کر لیے جائیں۔ کانگرس کا مطالبہ موجود ہے۔ ساری سیاسی جماعتوں کا اور پورے ملک کا سوراج کا مطالبہ موجود ہے۔ چوں کہ حکومت برطانیہ چاہتی ہے کہ ہم سوراج لینے کی اہلیت کا مظاہرہ کریں لہٰذا اس سلسلے میں سر دست جو فیصلہ کن شہادت ہم پیش کر سکتے ہیں وہ یہی ہے کہ اس کمیشن کا ہر پہلو اور ہر حیثیت سے مکمل اور غیر مشروط مقاطعہ کیا جائے۔"

چند ہی دنوں کے بعد لبرل اور نیشنلسٹ پارٹی نے بھی جس میں سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر محمد علی جناح بھی شامل تھے کمیشن کے مقاطعہ پر حسب ذیل الفاظ میں زور دیا:-

"ہم اس صریحی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ کمیشن میں ہندستانیوں کا نہ شامل کیا جانا ایک بنیادی ناانصافی ہے۔ یہ تجاویز کہ مجالس قانون ساز کی کمیٹیوں کو کمیشن کے سامنے اپنی رائے پیش کرنے اور اس کے بعد جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی سے گفت و شنید کرنے کی اجازت دی جائے گی صورت حال کے لیے بالکل ناقص اور ناکافی ہے۔ جب تک کوئی ایسا کمیشن نہ مقرر کیا جائے جس میں برطانوی اور ہندستانی مدبرین مساویانہ حیثیت سے شریک ہوں، اس وقت تک ہم اصولاً موجودہ کمیشن کے کام میں کسی قسم کا حصہ نہیں لے سکتے۔"

سارے ملک میں تنفر اور برہمی کی ایسی آگ بھڑک اٹھی کہ سالہا سال سے اس قسم کا منظر دیکھنے میں

نہیں آیا تھا۔ بڑے بڑے جلسے اور جلوس، پُرجوش اور طوفانی تقریروں کا دور دورہ ہوگیا۔ اسی ہنگامے کے موقعہ پر ۱۹۲۷ء کے بڑے دنوں میں ڈاکٹر انصاری کے زیر صدارت مدراس میں کانگرس کا بیالیسواں سالانہ جلسہ منعقد ہوا۔

مدراس کانگرس میں مقاطعہ کا جو ریزولیوشن پاس ہوا اس کے عملی دفعات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک عام شورش کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے مجبور ہو کر کانگرسی لیڈروں نے کیوں کر اپنے سیاسی محاذ کو از سر نو ترتیب دیا۔

"(ا) یہ کانگرس تمام باشندگانِ ہند سے اور تمام کانگرسی اداروں سے مطالبہ کرتی ہے کہ جس دن کمیشن ہندستان میں وارد ہو، عام مظاہرے کئے جائیں، دوسرے یہ کہ زبردست پروپیگنڈے کے ذریعہ رائے عامہ کو اس نہج پر منظم کیا جائے کہ ہندستان کی ہر خیال کی سیاسی جماعتیں مؤثر طور پر کمیشن کا مقاطعہ کریں۔

(ب) یہ کانگرس ہر ہندستانی مجالس قانون ساز وغیرہ کے غیر سرکاری ممبروں سے مطالبہ کرتی ہے کہ نہ تو وہ کمیشن کے سامنے کسی قسم کی شہادت دیں نہ کسی طرح نجی یا پبلک طور پر ان کے ساتھ تعاون کریں۔ نہ کسی ایسی دعوت میں شریک ہوں جو کمیشن کے ممبروں کو دی جائے۔

(ج) یہ کانگرس ہندستانی مجالس قانون ساز کے غیر سرکاری ممبروں سے مطالبہ کرتی ہے کہ (۱) اس کمیشن سے مل کر اگر کوئی کمیٹی بنائی جائے تو نہ اس قسم کی تقرری کے متعلق رائے دیں اور نہ اس کی رکنیت قبول کریں اور (۲) کمیشن کے کام کے سلسلے میں جو تحریک یا تجویز یا مطالبہ رقم پیش کیا جائے اس کو مسترد کرنے کی کوشش کریں۔

(د) یہ کانگرس مجالس قانون ساز کے غیر سرکاری ممبروں سے یہ بھی مطالبہ کرتی ہے کہ یہ لوگ اسمبلی اور کونسل کے اجلاسوں میں صرف اس حد تک شرکت کریں جہاں تک جگہوں کے گھیرے رکھنے کے لیے ضروری ہو یا مقاطعہ کو مؤثر اور کامیاب بنانے یا کسی وزارت کو ناکام کرنے یا کسی ایسی کارروائی کی مخالفت کرنے کے لیے جسے کانگرس ورکنگ کمیٹی ہندستان کے مفاد کے منافی سمجھتی ہو شریک ہو سکتے ہیں۔

(ہ) یہ کانگرس ورکنگ کمیٹی کو اس کا اختیار دیتی ہے کہ وہ مقاطعہ کو مؤثر اور کامیاب بنانے کے لیے دوسری جماعتوں سے گفت و شنید کر سکتی ہے اور ان کا تعاون بھی حاصل کر سکتی ہے۔

اس صورت سے کانگرس نہ صرف اس بات پر مجبور ہوئی کہ اپنی توجہ کونسلوں کی چالوں کے بجائے ملک کی عام شورش اور پروپیگنڈے کی طرف مبذول کرے بلکہ اسے اپنی کونسل والی پالیسی میں شدید تبدیلی کرنی پڑی۔ اگر ہم مذکورہ بالا ریزولیوشن کی دفعات (ب)، (ج) (و) (د) کا اسی موضوع پر پچھلی کانگرس کے ریزولیوشن کی دفعات سے موازنہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اس زبردست سیاسی ہنگامہ کے باعث اب تعمیری تعاون کا سارا قصہ یکایک ختم کر دیا گیا بلکہ یہاں تک کہ کونسل کی تمام سرگرمیوں کو انتہائی طور پر کم کر کے صرف اتنا رہنے دیا جتنا کونسلوں میں جگہ گھیرے رکھنے کے لیے ضروری تھا۔ اب نہ وہ قومی زندگی کی صحیح نشو و نما اور ملک کے حقیقی مفاد کی ترقی کے نام پر تعاون کرنے کی ہدایات تھیں اور نہ کسانوں اور مزدوروں کی زبون حالی دور کرنے کے ریاکارانہ عذر پر وزیروں اور نامزد کیے ہوئے ممبروں سے معاملہ کرنے کی چالیں تھیں اب تو یہ تھا کہ جہاں تک ممکن ہو کونسلوں کے اندر جاؤ نہیں، اور اگر جاؤ تو صرف اس ضرورت سے کہ حکومت اور کمیشن کی مشینری کو معطل کرنا ہے۔ یہ پیغام تھا جو مدراس کانگرس نے دیا۔ ظاہر ہے کہ اس میں اور گوہاٹی کے نکمے اور بزدلانہ

پیغام میں کتنا زمین آسمان کا فرق تھا!

یہی اتنا نہیں، بلکہ کانگرس نے ہندو مسلمانوں اور سکھوں کے سیاسی اتحاد پر ایک طویل قرار داد بھی منظور کی۔ علاوہ بریں بروسیلز کے مقام پر فروری ۲۷ء میں ملوکیت دشمن کانگرس نے جو ملوکیت دشمن لیگ قائم کی تھی اسے خوش آمدید کہا گیا اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اس فیصلہ کی توثیق کی گئی کہ سامراج کے خلاف جدو جہد کے سلسلے میں کانگرس متذکرہ بالا لیگ کی ہمنوائی کرے۔ کانگرس نے اہلِ چین کو بھی ان کی آزادی کی اس جدو جہد پر گرم جوشی کے ساتھ مبارک باد پیش کی اور اپنی پوری ہمدردی کا اظہار کیا۔ کانگرس نے ہندستان اور مشرقی سمندروں میں برطانیہ کی جنگی تیاریوں کے خلاف بھی ایک ریزولیوشن پاس کیا وہی کانگرسی لیڈر جو چند ماہ پیشتر جنرل اداری کی بہادرانہ جدو جہد پر جو انھوں نے جمہوریہ ہندیہ کے نام پر جاری کر رکھی تھی لب کشائی کرتے ہوئے جھجکتے اور جی چراتے تھے اب قانون اسلحہ کے خلاف ناگ پور کی ستیہ گرہی تحریک کے لیڈر اور ان کے متبعین کو ان لوگوں کی زبردست وطن دوستی اور ایثار پر مبارک باد دینے لگے اور ان کی بھوک ہڑتال پر جس کا اب پچھترواں دن تھا، نہایت گہری ہمدردی کا اظہار کرنے لگے۔

لیکن سب سے زیادہ قابلِ قدر مکمل آزادی والا ریزولیوشن تھا جس کے باعث ہندستان کی سیاسی تاریخ میں مدراس کانگرس ایک یادگار کی حیثیت سے زندہ رہے گی پنڈت جواہر لال نہرو نے یہ تجویز پیش کی کہ "کانگرس اس کا اعلان کرتی ہو کہ باشندگانِ ہند کا نصب العین مکمل قومی آزادی ہو"۔ یاد رہے کہ ۱۹۲۱ء میں احمد آباد کانگرس کے موقع پر مولانا حسرت موہانی نے جب پہلے پہل یہ ریزولیوشن پیش کیا تھا تو انھیں دو سال قید بامشقت کی سزا ہوئی تھی۔ مگر گاندھی جی کی مخالفتوں کا بھلا ہو کہ کانگرس نے اس وقت یہ تجویز مسترد کر دی تھی۔ اس کے بعد سے کانگرس کے مختلف اجلاسوں میں متعدد بار یہ مسئلہ پیش ہوا مگر کبھی کوئی معتدبہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اب جو حکومت نے خالص برطانوی کمیشن مقرر کر کے کانگرسی لیڈروں کو اس بری طرح ذلیل کیا تب جا کر ان لوگوں نے آزادی کا نصب العین اختیار کیا۔

تو کیا مدراس میں کانگرسیوں کے دل و دماغ میں واقعی کوئی انقلاب پیدا ہو گیا تھا؟ کیا انھوں نے حکومت سے دستوری آزادی کے چیتھڑوں کے لیے سوداگرانہ لین دین اور بنیا والی ذہنیت ختم کر دی تھی؟ کیا وہ جمہوریہ ہندیہ کے مکمل اقتدار کے لیے اپنے سفینے جلا کر ہرچہ بادا باد پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے؟ مدراس کانگرس کے حسب ذیل ریزولیوشن سے صحیح اندازہ ہو سکتا ہو کہ ان لوگوں کے دماغ میں کس حد تک انقلاب پیدا ہوا تھا۔ یہ رزولیوشن اس وقت پاس ہو جب کہ آزادی والی قرار داد نہایت زور شور کے ساتھ منظور کی جا چکی تھی:۔

"ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کی اس عام خواہش کے پیشِ نظر کہ متحدہ طور پر سوراجی دستور حکومت کا خاکہ مرتب کیا جائے"، اور ان تمام مسودات اور تجاویز پر غور کرنے کے بعد جو ورکنگ کمیٹی کے گشتی مراسلات کے جواب میں موصول ہوئی ہیں، یہ کانگرس ورکنگ کمیٹی کو اختیار دیتی ہو کہ حسب ضرورت اپنے ممبروں کی تعداد میں اضافہ کر کے اور دوسری سیاسی، تجارتی، فرقہ وارانہ، اور مزدور جماعتوں کی طرف سے نامزد کی ہوئی کمیٹیوں کو اپنے ساتھ شریک کر کے ہندستان کے لیے ایک سوراجی دستور حکومت کا خاکہ تیار کرے، اور اسے مارچ تک میں، دہلی میں منعقد ہونے والے اجتماع خصوصی کے سامنے پیش کرے جو آل انڈیا کانگرس

کمیٹی اور متذکرہ بالا دیگر سیاسی اداروں کے لیڈروں اور نمائندوں اور مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز کے منتخب ممبروں پر مشتمل ہوگا۔

اچھا اب دیکھنا یہ ہو کہ آخر کانگرس کو یک بارگی اس کی کیا ضرورت محسوس ہوئی کہ اسی موقعہ پر ہندستان کا ایک مکمل دستور حکومت مرتب ہو جائے۔ وجہ ظاہر ہو کہ سائمن کمیشن کانگرسی لیڈروں کو نظر انداز کر کے مقرر کر دیا گیا تھا لہذا یہ محض اس کے مقاطعہ پر قانع نہ تھے بلکہ کچھ دخل در معقولات بھی کرنا چاہتے تھے۔ لیڈروں میں سے بیشتر وکیل پیشہ تھے ہی ذہنیت یہ تھی کہ اگر ہم کمیشن کے پاس نہیں پھٹک سکتے تو کم از کم خود اپنے طور پر ہی ایک دستور مرتب کر لیں تاکہ ضرورت کے وقت کام آئے۔ معلوم نہیں ہوا کا رُخ کیا ہو ممکن ہو ہمیں گفت و شنید ہی کرنی پڑے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم عین موقع پر سوتے ہوئے پائے جائیں۔ بہر حال ہمیں تو خداوندانِ شملہ اور روائٹ ہال کے سامنے پیش کرنے کے لیے اپنا مسودہ تیار ہی رکھنا چاہیے ! ۔ لہذا یہ ریزولیوشن اس لیے پاس کیا گیا کہ آئندہ گفت و شنید اور اس کے بعد تعاون کی گنجائش باقی تو ہے۔

اس ریزولیوشن کے الفاظ پر نظر ڈالنے سے اس قیاس کی تصدیق ہو جاتی ہو۔ انسان سمجھ سکتا ہو کہ مکمل آزادی کی تجویز پاس کر دینے کے بعد کانگرس اگر اس قسم کی کوئی کارروائی کرے گی تو وہ جمہوریۂ ہندیہ کے دستور کی ترتیب ہوگی، لیکن متذکرۂ بالا تجویز کے ماتحت ورکنگ کمیٹی کو جمہوریہ ہندیہ کے بجائے سوراجی حکومت کا دستور مرتب کرنے پر مامور کیا گیا۔ ہندستان کی ساری سیاسی جماعتوں کا جن میں لبرل، نیشنلسٹ، بلکہ انتہائی رجعت پسند اور خوشامدی بھی شامل تھے 'سوراج' ہی نعرۂ جنگ تھا۔ سوراج ہی کا لفظ خود کانگرسی دستور میں بھی منقوش تھا، اور اسے مکمل آزادی کے لفظ سے خاص طور پر اس لیے بدلا گیا تھا کہ اپنے ابہام کے باعث یہ درجہ نوآبادیات کے مرادف سمجھا جا سکتا تھا۔ ظاہر ہو کہ کانگرسی لیڈر کا مقصد یہی تھا کہ درجۂ نوآبادیات کو بہت دھوم دھام سے سامنے کے دروازے سے نکال باہر کیا جائے اور چور دروازے سے پھر اندر داخل کر لیا جائے۔

اگر یہی مقصد نہ تھا تو ورکنگ کمیٹی کو اس پر کیوں مامور کیا گیا تھا کہ دوسری جماعتوں کی نام زد کی ہوئی کمیٹیوں کے تعاون سے نیا دستور مرتب کرے ؟ اور پھر اس دستور کو ایک ایسے اجتماع کے سامنے پیش کرنے کے کیا معنی تھے جس میں دوسری جماعتوں کے نمائندے اور مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز کے منتخب ممبر بھی ہوں گے ؟ یہ چیز تو عام طور پر مشہور تھی کہ دوسری جماعتیں اور مجالس قانون ساز کے غیر کانگرسی اراکین درجۂ نوآبادیات سے بھی فروتر چیز پر مطمئن ہو جائیں گے۔ ایسی غیر متجانس کمیٹی یا اجتماع کے تیار یا منظور کیے ہوئے دستور میں صرف وہی چیز ہو سکتی ہو جو تمام جماعتوں کے مطالبات میں قدرِ مشترک ہو۔ کانگرس کے متعلق یہ بھی سمجھنا پڑتا ہو کہ اس قسم کی آل پارٹیز کانفرنس میں جتنا لغو اور رکیک دستور تیار ہوگا اس پر وہ ادب و احترام کے ساتھ غور کرنے کا بھی ارادہ رکھتی تھی۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہو کہ پنڈت جواہر لال نہرو نے جو اس وقت ہندِ جدید کے ولولوں اور امیدوں کا مرکز بن رہے تھے اس صورتِ حال کو کس نظر سے دیکھا۔ ۲۸ دسمبر کو کانگرس پنڈال میں جمہوری کانگرس کی صدارت کرتے ہوئے انھوں نے صورتِ حال کا خلاصہ ان الفاظ میں پیش کیا :۔

"بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب انڈین نیشنل کانگرس نے اپنا نصب العین مکمل آزادی قرار دے لیا ہو تو اب جمہوری کانگرس کی کیا ضرورت ہو .... کانگرس نے آزادی کی تجویز ضرور پاس کر دی ہو مگر پھر بھی پروپیگنڈے

کے لیے اور ان لوگوں کو جن کے ذہن میں حریت وجمہوریت کا کوئی صحیح مفہوم نہیں ہی، اپنے ہم خیال بنانے کے لیے ایک نئے ادارے کی ضرورت ہی۔ کانگرس نے آزادی کا جو ریزولیوشن پاس کیا ہی اس کا مقصد یہ ہی کہ انگریز ہندستان سے چلے جائیں۔ اس نئے ادارے کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ اس ریزولیوشن کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جو کچھ کرنے کی ضرورت ہو اس پر زور دے .... تحریک ترک موالات کی ناکامی کے بعد سے کانگرس برابر متوسط طبقے بابوؤں والی سیاست اختیار کرتی گئی اور عوام سے دور ہوتی گئی .... اب عوام کو اس کی ضرورت تھی کہ کوئی ایسا ادارہ بنائیں جو کانگرس کو اصل مقصد سے نہ ہٹنے دے اور ملک کو محض جمہوری ہی نہیں بلکہ صحیح جمہوری نصب العین کے لیے بھی تیار کرے۔" (دی انڈین رجسٹر)

مگر کانگرس تو اپنے جہاز کو پستیوں ہی میں پھنسا کر تباہ کر دینے کا تہیہ کر چکی تھی!

گاندھی جی نے اس موقع پر مکمل آزادی کے رزولیوشن کا، جس کی سالہا سال سے وہ کامیابی کے ساتھ مخالفت کرتے چلے آئے تھے، کیوں کر سواگت کیا؟ سارے ملک میں لوگوں کو عام طور پر معلوم تھا کہ بجی گفتگو میں انھوں نے اس رزولیوشن کی تعریف میں کافی بخل سے کام لیا اور اسے لوگوں کی نظریں میں ناکارہ ٹھہرانے کی کافی کوشش کی۔ لیکن گورنمنٹ کا ایک خالص برطانوی کمیشن مقرر کر دینا ایسے جوش وخروش کا باعث ہو گیا کہ "ہند جدید" کے نعرہائے جنگ کے سامنے گاندھی جی زیادہ مضبوطی کے ساتھ جم نہ سکے۔ اس کے علاوہ یہ کہ اگر گاندھی جی آسمانِ سیاست کے اس نئے ستارے کے پرستار نہ تھے تو کم از کم نوجوان نہرو کی سیاسی طباعی وفطانت سے ضرور متاثر تھے۔ اور یہی نہرو آزادی والی تجویز کے روحِ رواں تھے۔ لہذا گاندھی جی نے سوچا کہ سیاسی میدان میں آتے ہی ان کا شکست کھا جانا ٹھیک نہ ہوگا۔ غالباً انھوں نے اس تجویز کو جوانی کی ترنگ سمجھتے ہوئے ہنس کر ٹال دینا ہی زیادہ قرینِ مصلحت سمجھا۔ گویا یہ خیال کیا کہ خیر آج تمھارا موقع ہی جو کچھ کرتے ہو کرو، کل پھر میں سب کچھ درست کر لوں گا۔ ظاہر ہی کہ کانگرس کی کٹر پارٹی کے لیڈر موتی لال نہرو جو آگے چل کر سوراجی دستور کے مرتب بھی بننے والے تھے اور نئی جمہوری پارٹی کے لیڈر جواہر لال میں تصادم ہونا ناگزیر ہی۔ اس وقت گاندھی جی باپ بیٹوں —— بڈھے جو درجۂ نوآبادیات لینے کے لیے آمادہ تھے اور نئی پود کے لوگ جو جمہوریہ ہندیہ کے لیے تڑپ رہے تھے —— کے درمیان بیچ بچاؤ کرنے کے لیے کود پڑیں گے اور پھر شاید دونوں کے ہاتھ سے اقتدار کی باگ چھین کر اپنے قبضے میں کر لیں گے۔

وہ وقت آیا، اور دونوں کے اندازے سے بہت پہلے آیا۔ گاندھی جی دسمبر ۱۹۲۸ء میں کلکتہ کانگرس کے موقع پر یکایک میدانِ سیاست میں آدھمکے۔

سترّواں باب

گاندھی جی سلطنت کی حمایت کے لئے گوشۂ تنہائی سے باہر نکلتے ہیں

۱۹۲۸ء کے شروع ہی سے واقعات لحظہ بہ لحظہ تیزی کے ساتھ متغیر ہو رہے تھے۔

۲ر فروری کو لارڈ اروِن نے لیجسلیٹو اسمبلی کے دہلی سیشن کا افتتاح کرتے ہوئے ایوان سے سائمن کمیشن کے ساتھ تعاون کرنے کی اپیل کی۔ سوراج پارٹی کے لوگ شروع شروع میں رزروبینک بل کی مخالفت کرنے کے لیے پوری تعداد میں اسمبلی میں شریک ہوتے تھے۔ لیکن نسبتاً غیر اہم معاملات پر مباحثوں کے دوران میں نہیں آیا کرتے تھے۔ ۱۱ر فروری کو ورکنگ کمیٹی کی طرف سے مفصل ہدایات دی گئیں کہ اسمبلی میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں شرکت کی جائے مگر اس کی کارروائیوں میں کم سے کم حصّہ لیا جائے۔

۳ر فروری کو سائمن کمیشن ممبئی میں وارد ہوا۔ اس دن سارے ہندوستان میں قومی ہڑتال منائی گئی۔ ہر جگہ نہایت زبردست جلوس اور جلسوں کے ذریعے مکمل مقاطعہ پر زور دیا گیا۔ اُسی روز ممبئی۔ مدراس اور کلکتہ میں عوام اور پولیس کے درمیان تصادم بھی ہوئے۔ تمام بڑے شہروں میں لوگوں نے "سائمن، واپس جاؤ" لکھے ہوئے جھنڈوں اور پوسٹروں کی خوب نمائش کی۔

کمیشن ممبئی سے روانہ ہو کر براہ راست دہلی پہنچا۔ مگر چونکہ کانگرسی لیڈروں نے مقاطعہ میں اتنی شدت اختیار کی تھی کہ اس میں سوشل ملاقات کو بھی شامل کر لیا تھا لہٰذا کمیشن اور کانگرس کے ممبروں کی آپس میں ملاقات نہیں ہو سکی۔

۱۶ر فروری کو لالہ لاجپت رائے نے لیجسلیٹو اسمبلی میں ایک ریزولیوشن کے ذریعے اعلان کیا کہ "چونکہ اس ایوان کے نزدیک سائمن کمیشن کی ہیئت ترکیبی اور اسکیم قطعی ناقابل قبول ہیں لہٰذا اسمبلی کو اس کمیشن سے کسی حیثیت سے اور کسی منزل پر کسی قسم کا واسطہ نہیں ہوگا۔" مسلمان ممبروں کی طرف سے کمیشن کی حمایت میں ایک جوابی ریزولیوشن ۶۸ اور ۶۲ ووٹوں کے فرق سے پاس ہو گیا۔

۱۶ر فروری کو سرجان سائمن نے اپنی یہ تجویز شائع کی کہ ان کی صدارت میں ایک مشترک آزاد کانفرنس ہو، جس میں کمیشن کے سات برطانوی اراکین اور ہندوستان کی مجالس قانون ساز کے منتخب کیے ہوئے سات ممبر شامل ہوں۔ اس خوف سے کہ کہیں ہندستان کے سادہ لوح عوام اس نظر فریب استدلال سے دھوکے میں نہ آجائیں کانگرسی لیڈروں نے سرجان سائمن کی تجویز کے شائع ہونے کے دو ہی تین گھنٹہ کے اندر اندر حسب ذیل بیان شائع کر دیا:-

"سرجان سائمن نے آج کے بیان میں جس طریق کار کی تجویز کی ہے اس پر ہم لوگوں نے کافی توجہ کے ساتھ غور و خوض کر لیا ہے۔ لیکن جن اصولوں کی بنا پر ہم نے کمیشن کی ہیئت ترکیبی اور اس کی پالیسی پر اعتراضات کیے ہیں وہ اپنی جگہ پر بدستور باقی رہتے ہیں۔ ان حالات میں ہم کو اپنے فیصلے پر قائم رہنا چاہیے اور کسی حیثیت سے اور کسی منزل پر کمیشن سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہیے۔"

اسی اثنا میں کانگرس ورکنگ کمیٹی نے مسلم لیگ، لبرل پارٹی اور ایجابی تعاون پسند گروہ کو، نیز دوسری فرقہ وارانہ جماعتوں اور تجارتی انجمنوں کو، آل پارٹیز کانفرنس کے پہلے اجلاس میں ہندستان کے جدید دستور کا خاکہ مرتب کرنے کے لیے شریک ہونے کی دعوت دی۔

۱۲ر فروری کو دہلی میں کانفرنس کا جلسہ ہوا، جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں، سب سے پہلا سوال جس پر کانفرنس میں گفتگو شروع ہوئی، یہ تھا کہ کس مقصد کے تحت دستور مرتب کیا جائے۔ تجویز ہوئی کہ درجہ نوآبادیات کے اصول پر دستور کا خاکہ تیار کیا جائے۔ بعض ممبروں نے اعتراض کیا کہ کانگرس

طے کرچکی ہے کہ ہندستان کا نصب العین مکمل آزادی ہے، اور اس سے فروتر کوئی مقصد سامنے نہ رکھا جائے۔ ظاہر ہے کہ کانفرنس کی جتنی پارٹیوں نے نمائندگی کی تھی وہ سب کی سب اس حد تک جانے کو تیار نہ تھیں۔ لہٰذا اب یہ تجویز ہوئی کہ کوئی ایسا اُصول وضع کیا جائے جس میں دونوں نظریوں کو سمویا جاسکے ۔ ۔ ۔ ۔ مکمل ذمہ دارانہ حکومت کی تجویز منظور کرلی گئی، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی طے ہوا کہ جو لوگ آزادی کے حامی ہوں اُنھیں پورا اختیار رہے گا کہ اپنے مسلک کے مطابق پروپگنڈا کرتے رہیں نیز دوسرے طریقوں پر جو کچھ کرنا چاہیں کرتے رہیں۔

اس طرح سے پہلی جنگ جو درجہ نو آبادیات کے کثیر التعداد ماننے والوں اور مکمل آزادی کے قلیل التعداد مگر زوردار حامیوں کے مابین ہوئی تھی، ختم ہوگئی۔ "مکمل ذمہ دارانہ حیثیت" کے وکیلانہ اُصول سے کوئی مطلب نہ حل ہوا اور ایک شدید بے چینی برابر قائم رہی۔ بلکہ سال کے اندر کئی مرتبہ اس میں زبردست اشتعال بھی پیدا ہوتا رہا۔

کانفرنس نے صوبوں کی اور جماعت رائے دہندگان کی ازسرِ نو تقسیم و تسہیم اور نشستوں کی تخصیص کے بارے میں بھی ایک ریزولیوشن پاس کیا۔ ۲۲ر فروری کو کانفرنس نے دستور کی تفصیلات تیار کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کردی اور اسی پر کانفرنس ختم ہوگئی۔

۱۹ر مئی کو بمبئی میں اس کانفرنس کا دوسرا اجلاس ہوا اور قرار پایا کہ زیر صدارت پنڈت موتی لال نہرو ایک کمیٹی مقرر کی جائے جو سر تیج بہادر سپرو، سر علی امام، مسٹر پردھان، مسٹر شعیب قریشی، مسٹر سوبھاش چندر بوس، مسٹر ایم۔ ایس۔ اینے، مسٹر جیکار، مسٹر ان۔ ایم جوشی، اور سردار منگل سنگھ پر مشتمل ہو۔ یہ کمیٹی یکم جولائی سے پہلے پہلے ہندستان کے دستورِ حکومت کے اُصول متعین کرے اور فرقہ وارانہ اتحاد کے بارے میں مدراس کانگرس نے جو ریزولیوشن پاس کیا ہے اُس کو اور اُسی کے ساتھ مختلف فرقہ وارانہ جماعتوں کے پاس کیے ہوئے ریزولیوشنوں کو خاص طور پر پیش نظر رکھے۔ اس کمیٹی نے وہ مشہور نہرو رپورٹ تیار کی جس کا بیان ہم آگے چل کر کریں گے۔

کانگرس کے بورژوا طبقے کے وکلا ہندستان کا دستورِ جدید مرتب کرنے میں مصروف تھے اور اسی زمانہ میں غریب مزدور اور کسان اپنے ظالم آجروں اور حکومت کے خلاف کئی مقام پر موت و زیست کی جنگ چھیڑ چکے تھے۔

ہندستان کا سرکاری مسودہ نگار لکھتا ہے "اشتراکی پروپگنڈے اور اثرات نے جو خصوصاً بعض بڑے شہروں کے کارخانوں کے مزدوروں میں پھیلے ہوئے تھے حکام کو پریشان کردیا تھا۔ اس سال بہت سی ہڑتالیں ہوئیں جن میں سے "ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل ملز جمشید پور" ایسٹ انڈین ریلوے، اور بنگال کی فورٹ گلوسسٹر جوٹ ملز کی ہڑتالیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ تقریباً ۳۳ فی صدی ہڑتالوں میں مزدور کامیاب رہے اور انھوں نے مراعات حاصل کرلیں۔ ان سب میں زبردست ہڑتال وہ تھی جو بمبئی کے کپڑوں کی ملوں میں ہوئی تھی۔ یہ ہڑتال ۲۶ر اپریل سے ۱۶ر اکتوبر تک جاری رہی۔ مزدوروں کو ساڑھے تین کروڑ روپیہ اُجرت کا خسارہ ماہوار اور کاروبار کے نقطۂ نظر سے تقریباً بیس لاکھ کام کے دن ضائع گئے۔ یقیناً ہندستان کے مزدوروں نے ایسی زبردست جدوجہد اب تک کبھی نہیں کی تھی۔ کانگرس سیکرٹری نے بھی ۱۹۲۸ء کی رپورٹ میں " فاقہ کشی اور حکومت اور آجروں کی طرف سے ہر قسم کے دباؤ کے باوجود نہایت یکجہتی اور استقلال کے ساتھ ہڑتال جاری رکھے جانے " کی تصدیق کی ہے (ہندستان ۲۹-۱۹۲۸ء میں) بمبئی کے مل ہڑتال کے تقریباً ساتھ ہی ساتھ بردولی میں عدم ادائگی محاصل کی مہم بھی جاری تھی۔ بردولی کی ستیہ گرہ تحریک جسے وہاں کے کسانوں نے مسٹر ولبھ بھائی پٹیل کی قیادت میں شروع کیا تھا حکومت کے استبداد کے مقابلہ میں منظم اور پُرامن مقاومت کے نتیجہ خیز ہونے کا بیّن ثبوت ہے۔ کسانوں نے تعلقہ کی جدید لگان بندی کی مخالفت کی، اور کہا کہ یہ لگان بندی بغیر تفتیش و تحقیق کے کی گئی ہے اور موجودہ حالات کے بالکل برعکس ہے۔

جب سہولت سے عرض و معروض کرکے کام نہ چلا تو کسانوں نے ۲۴ر اپریل کو ستیہ گرہ شروع کردی اور لگان دینے سے انکار کردیا۔ حکومت تشدد پر اُتر آئی اور کسانوں کے مویشی اور آراضیاں مٹّی کے مول قرق کرنا شروع کردیا۔ لیکن کسان جمے رہے اور ہار ماننے پر کسی طرح تیار نہ ہوئے۔ آخر کار وہ اپنی متحدہ اور منظم قوت کے مظاہرے میں کامیاب ہوئے اور حکومت کو ان کا تفتیش کا مطالبہ تسلیم کرنا پڑا ۔ ۔ ۔ ۔ اس ستیہ گرہ کی کامیابی سے سارے مُلک کے کسانوں کو بے حد مسرت ہوئی۔" (کانگرس رپورٹ)

تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ نے افسر متعلقہ کی سفارشات کو غلط ٹھہرایا۔ حکومت بمبئی نے کمیٹی کی سفارشات منظور کر لیں اور اس طرح کسانوں کی پوری جیت ہوگئی۔

اسی سال، اس سے بھی زیادہ انتہا پسندانہ مہم برما میں شروع ہوئی۔ چاول اور خام پیداوار کا بھاؤ برابر گرتا جا رہا تھا مگر اس کے باوجود حکومت نے برما کے کسانوں پر ایک نیا محصول عائد کر دیا۔" برما کے بعض اضلاع میں عدم ادائگی محاصل کی مہم شروع کر دی گئی۔ .... ہر قصبے میں تحصیل محاصل کی مقاومت کے لیے مقامی انجمنیں بنائی گئیں ...... بہت سے مقامات پر تشدد، حملہ، اور قتل کی وارداتیں ہوئیں۔ کئی جگہ پولیس پر بھی حملہ کیا گیا۔ اِن اضلاع میں حکومت نے امدادی پولیس اور فوج بھیج دی اور سیکڑوں دیہاتوں کی انجمنوں کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ تھاراودی ضلع میں تحریک نے انقلابی صورت اختیار کر لی۔ (ہندستان ۲۹-۱۹۲۸ء کا سرکاری تبصرہ)

ہندستان ہی کے ایک صوبے میں یہ اہم واقعات رونما ہو رہے تھے، مگر ان سب کی طرف سے آنکھ بند کر کے آل پارٹیز کانفرنس کی مقرر کردہ کمیٹی پنڈت موتی لال نہرو کے زیرِ ہدایت، اپنے دستور کے متعلق بحث و مباحثہ میں مصروف رہی۔ نہرو رپورٹ ۱۰ اگست کو شائع ہوگئی۔ اس پر آٹھ آدمیوں کے دستخط تھے، جن میں سے پنڈت نہرو نے کانگرس کی طرف سے، سر تیج بہادر سپرو نے لبرل پارٹی کی طرف سے، مسٹر علی امام نے (جو کبھی گورنر جنرل ایگزیکٹیو کونسل کے ممبر بھی رہ چکے تھے) مسلمانوں کی طرف سے، اور سردار منگل سنگھ نے سکھوں کی طرف سے دستخط کئے تھے۔ پریس اور پلیٹ فارم ہر طرف سے رپورٹ کی تعریفیں شروع ہوگئیں کہ یہ رپورٹ ہندستان کی تمام نمایاں جماعتوں کی متحدہ کوشش کا نتیجہ اور اس میں بہترین دستوری اسکیم پیش کی گئی ہے۔ اس رپورٹ کو حکومت کے چیلنج کا جواب قرار دیتے ہوئے بھی بہت سراہا گیا۔ لارڈ برکن ہڈ وزیر ہند نے متعدد بار ہندستان سے اس کا مطالبہ کیا تھا کہ کوئی ایسا دستور مرتب کر کے پیش کیا جائے جس پر اس ملک کے تمام لوگ متفق ہوں۔

ہم اس فرقہ وارانہ معاہدے کا تفصیلی جائزہ نہیں لینا چاہتے جو مختلف فرقوں کے درمیان بڑی مشکلوں اور لین دین والی حجتوں کے بعد طے ہوا تھا؛ نہ ہمیں اعلانِ حقوق اور دیگر آئینی طمطراق کا جائزہ لینا ہے جو ان ہوشیار وکیلوں نے اپنے خطِ غلامی پر پردہ ڈالنے کے لیے تیار کیا تھا، کیونکہ یہ کمیٹی انتہائی بے غیرتی اور ڈھٹائی سے "مکمل ذمہ دارانہ حکومت" سے بھی ایک قدم پیچھے ہٹ کر پھر اسی ذلیل "درجہ نو آبادیات" کی سطح پر اُتر آئی۔ اور اس کی حمایت میں حسب ذیل استدلال پیش کیا۔

"دہلی میں ایک ذومعنی فقرہ ـــــ مکمل ذمہ دارانہ حکومت ـــــ صرف اس لیے استعمال کیا گیا تھا کہ 'مکمل آزادی' اور 'درجہ نو آبادیات' کے درمیان، قطعی اور فیصلہ کن انتخاب کی صورت نہ پیش آئے۔ لیکن کمیٹی نے محسوس کیا کہ جب تک یہ مسئلہ واضح نہ ہو جائے دستور کے بنیادی اُصول بھی مشکل سے متعین کیے جا سکیں گے۔ موجودہ حالات میں، جب کہ مختلف جماعتوں کے تعاون سے دستور مرتب کرنا تھا "درجہ نو آبادیات" ہی کا انتخاب کیا جا سکتا تھا ... لہٰذا کمیٹی کے بیشتر ممبروں کا خیال تھا کہ اُنھیں جس انداز سے دستور بنانے پر مامور کیا گیا ہے اُس کا تقاضا یہی ہے کہ "مکمل ذمہ دارانہ حکومت" کا دستور "درجہ نو آبادیات" کے دستور کے نمونے پر تیار کیا جائے۔ بحیثیت کمیٹی کے ہمارے اس فیصلے کا مطلب محض یہ ہے کہ صرف اِنھیں بنیادوں پر زیادہ سے زیادہ اتفاقِ رائے حاصل ہو سکتا تھا۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ کسی کانگرسی نے انفرادی طور پر یا خود کانگرس نے اپنے 'مکمل آزادی' کے نصب العین سے دستبرداری دے دی ہے، یا اس کو کسی طرح پست کر دیا ہے۔ جو لوگ اس نصب العین کے حامی ہیں ان کا یہ حق بدستور قائم رہتا ہے کہ وہ اس کے لیے اپنے طور پر کوشش کرتے رہیں۔"

یہ طرزِ استدلال اتنا ذلیل اور تکلیف دہ ہے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، کانگرس کے فتنہ پردازوں نے 'مکمل آزادی' والے ریزولیوشن سے جل کر یہ ترکیب نکالی تھی کہ سادہ لوح نوجوانوں کو آل پارٹیز کانفرنس کے جال میں پھنسا کر زک دی جائے۔ اس نظر فریب اسکیم کی آڑ میں وہ اُنھیں لبرل پارٹی والوں، اعتدال پسندوں، زمینداروں، اور سرمایہ داروں سے پھر ملا جانا چاہتے تھے جنھیں ملک کی بڑھتی ہوئی انقلابی رَو نے کانگرس سے نکال باہر کر دیا تھا۔ اب اس ہوشیار پنڈت نے رجعت پسندوں کو ملا کر پسپائی کی ترکیب،

نکال لی، اور کانگرس کو مکمل آزادی کے بجائے "تاج برطانیہ کے سائے میں درجۂ نو آبادیات" کی راہ پر لا ڈالا۔ آل پارٹیز کانفرس کے چوتھے اجلاس میں بمقام لکھنؤ ۲۸ر اگست ۱۹۲۸ء کو نہرو رپورٹ پیش کی گئی۔ راجہ صاحب محمود آباد نے، جو صوبہ کے سب سے بڑے اور دولتمند زمینداروں میں سے ہیں، کانفرنس کا استقبال کیا۔ یہ کانفرنس قیصر باغ بارہ دری میں منعقد ہوئی۔ ڈاکٹر انصاری صدر تھے۔

اس اجلاس کا اہم ترین ریزولیوشن پنڈت مالویہ نے حسب ذیل الفاظ میں پیش کیا:-

"جن سیاسی پارٹیوں کا نصب العین "مکمل آزادی" ہے ان کی آزادی فکر و عمل پر کسی قسم کی پابندی عائد کیے بغیر یہ کانفرنس اعلان کرتی ہے

(۱) ہندستان میں ذمہ دارانہ طرز حکومت کا قیام ہونا چاہیے۔ یعنی ایسی حکومت، جس کی ہیئتِ انتظامیہ عوام کی منتخب کی ہوئی مجلس قانون ساز کے سامنے جواب دہ ہو اور اس مجلس کو کامل اختیارات حاصل ہوں۔

(۲) یہ طرز حکومت کسی حیثیت سے خود مختار نو آبادیات کی حکومت سے فروتر نہ ہو۔"

پنڈت جواہر لال نہرو، مدراس کانگرس کی مکمل آزادی کی قرارداد پر سختی سے جمے رہے اور انھوں نے نہرو رپورٹ کے مرتب کیے دستور نو آبادیات کی مخالفت کی۔ اس سلسلے میں انھوں نے ایسے افراد کی طرف سے جو سختی کے ساتھ ہندستان کی مکمل آزادی کے حامی تھے ایک خاص بیان پڑھ کر سنایا۔ پہلے انھوں نے یہ بتایا کہ وہ اور ان کے متبعین اس محدود دستور کو جو درجۂ نو آبادیات کے طرز کا ہے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اس کے بعد کہا:-

"ہم لوگوں نے یہ طے کیا ہے کہ اس کانفرنس کے کام میں کسی طرح مزاحم نہ ہوں گے، مگر اس معاملے میں غور و فکر کے بعد ہم جس رائے پر پہنچے ہیں اس کو ضبطِ تحریر میں ضرور لانا چاہتے ہیں، اور جہاں تک درجۂ نو آبادیات کے تسلیم کرنے کا تعلق ہے اس ریزولیوشن سے اپنے آپ کو بے تعلق رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم اس ریزولیوشن میں کسی قسم کا حصہ نہیں لیں گے، نہ کوئی ترمیم پیش کریں گے نہ ووٹ دیں گے۔"

اصل ریزولیوشن پر جب رائے طلب کی گئی تو کسی نے بھی مخالفت نہ کی، اور ریزولیوشن پاس ہوگیا، چند اہم مسئلوں پر متعدد دیگر قراردادیں منظور کی گئیں اور نہرو کمیٹی کو اس پر مامور کیا گیا کہ دستور کو ایک بل کی صورت میں مرتب کرے۔ ۳۱ر اگست کو یہ کانفرنس ختم کردی گئی۔

اس کانفرنس میں جن لوگوں نے آزادی کے متعلق متذکرہ صدر بیان پیش کیا تھا انھیں لوگوں نے اسی روز لکھنؤ ہی میں آزادیِ ہند لیگ قائم کی۔

۱۱ر اکتوبر کو سائمن کمیشن پھر بمبئی میں وارد ہوا اور سارے ملک کا دورہ کرنا شروع کیا۔ ۱۲ر اکتوبر کو یہ کمیشن پونا پہنچا جہاں مکمل ہڑتال اور ایک لاکھ آدمیوں کے مخالفانہ مظاہروں، اور "سائمن واپس جاؤ" کے نعروں سے کمیشن کا استقبال کیا گیا۔ اسی قسم کے مظاہرے ۳۰ر اکتوبر کو لاہور میں بھی ہوئے۔ پولیس نے مجمع منتشر کرنے کے لیے لاٹھی چارج شروع کیا اور حملے کے لیے لالہ لاجپت رائے کو جو جلوس کی قیادت کر رہے تھے خاص طور پر تاکا۔ لالہ صاحب بری طرح مجروح ہوئے اور ۱۷ر نومبر کو فوت ہوگئے۔ اگرچہ گورنمنٹ نے پولیس افسروں کے رویہ کو بہت کچھ ملمع سازی کے ذریعہ الزام سے بچانا چاہا اور ظاہر کیا کہ لالہ جی طبعی موت مرے ہیں مگر ہندستان کے لوگوں کو پورا یقین تھا کہ وہی چوٹ اس زبردست محبِ وطن اور قوم کے معتمد خادم کی موت کا باعث ہوئی اور اس سورما نے ملک کی خاطر جان دی۔

اسی اثنا میں ۳ر نومبر ۱۹۲۸ء کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا ایک جلسہ آل پارٹیز کانفرنس لکھنؤ کے فیصلوں پر غور و خوض کرنے کے لیے دہلی میں منعقد ہوا۔ پہلے لالہ لاجپت رائے کی مردانہ وار موت پر ایک ریزولیوشن پاس ہوا۔ اس کے بعد مسٹر سری نواس آئنگر نے حسب ذیل تجاویز پیش کیں:-

"(۱) آل انڈیا کانگرس کمیٹی گاہیہ جلسہ مدراس کانگرس کے فیصلے کا اعادہ کرتا ہے اور اسی پر قائم ہے کہ باشندگانِ ہند کا نصب العین

مکمل آزادی ہے، نیز یہ کہ اس جلسہ کی رائے میں اس وقت تک سچی آزادی نہیں حاصل ہوسکتی جب تک برطانیہ سے تعلقات منقطع نہ کرلیے جائیں۔

(۲) یہ کمیٹی فرقہ وارانہ اختلافات کو حل کرنے کے متعلق نہرو کمیٹی کی سفارشات کو جس پر لکھنؤ آل پارٹیز کانفرنس نے اتفاق کیا ہے منظور کرتی ہے۔

(۳) یہ کمیٹی تہ دل سے نہرو کمیٹی کے اراکین کو ان کی جانفشانی، حُب الوطنی، اور دُور اندیشی پر مبارکباد پیش کرتی ہے اور کانگرس کے مکمل آزادی والے ریزولیوشن کو علیٰ حالہ قائم رکھتے ہوئے اس رائے کا اظہار کرتی ہے کہ نہرو کمیٹی کی سفارشات سیاسی ترقی کی راہ میں ایک زبردست اقدام کی حیثیت رکھتی ہیں اور یہ کمیٹی اپنے کو ان کی تفصیلات کا پابند کیے بغیر عمومی حیثیت سے ان سفارشات کو منظور کرتی ہے۔"

یہ کھلا ہوا راز تھا کہ یہ ریزولیوشن تحریکِ آزادی کے علمبرداروں (مسٹر آئنگر اور پنڈت جواہر لال نہرو) اور درجۂ نوآبادیات کے حامیوں (پنڈت موتی لال نہرو اور ان کے بااثر متبعین کے درمیان ایک شدید کشمکش کا نتیجہ تھا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آزادی کے علم بردار کانگرس کا رُخ ذمہ دارانہ حکومت اور درجۂ نوآبادیات کی طرف سے ہٹا کر پھر مکمل آزادی کی طرف پھیر دینے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ آزادی کے مبہم الفاظ کے مفہوم کو "برطانیہ سے مکمل قطع تعلق" کہہ کر واضح کیا گیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ کامیابی حقیقی نہیں بلکہ نمائشی تھی، کیونکہ اس ریزولیوشن میں بھی وہی لین دین اور سمجھوتے والی ذہنیت کارفرما تھی۔ لہٰذا اس کی خود نفیضی بھی ناگزیر تھی، ورنہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی جو نہرو رپورٹ کے بنیادی اصول یعنی درجۂ نوآبادیات ہی کو مٹانے کی خواہاں تھی نہرو رپورٹ کے مرتبین کو ان کی "جانفشانی، حب الوطنی، اور دوراندیشی پر" جس کا نتیجہ محض مہمل اور بے معنی قسم کی ایک لاطائل عمارت کھڑی کر دینے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا کیونکر مبارکباد پیش کرسکتی تھی اگر نہرو کمیٹی نے بنیاد ہی غلط رکھی تھی تو اس ساری عمارت کی تعمیر میں جتنی کچھ بھی محنت صرف کی گئی وہ سب کی سب غلط ہے۔ مگر آزادی پرستوں کے دل و دماغ میں نہرو جنتا کے وقار و اقتدار کا خوف کچھ اس طرح سمایا کہ وہ اس ریزولیوشن کی پہلی دفعہ میں مکمل آزادی کے مسلک کو پھر سے قائم کرنے کے بعد خود ہی اپنی اس بے باکی پر گھبرا گئے اور انھوں نے تیسری دفعہ میں اس رجعت پسند کمیٹی کو جس نے ایک بے ڈھنگی اسکیم بنا کر ہندستان کی سیاسی ترقی کے قدم پیچھے ہٹا دیے تھے، تعریفوں کی بوچھار کر کے معناً اس مسلک سے دست برداری دے دی۔

متعدد ترمیمیں پیش ہوئیں اور واپس لے لی گئیں، پنڈت موتی لال نہرو نے نہایت بلفاظی سے یقین دلایا کہ ان کے عقیدے میں کسی قسم کا تزلزل نہیں ہے۔ اس کے بعد مسٹر آئنگر کا ریزولیوشن بغیر کسی مخالفت کے پاس ہوگیا۔

اس ریزولیوشن سے بعض حریت پسند تو غیر مطمئن تھے ہی، مگر پنڈت موتی لال نہرو بھی اس ریزولیوشن پر بہت گرم رہے تھے۔ پنڈت جی اپنے بیٹے اور اُن کے متبعین سے سیاسی سوجھ بوجھ میں بہت بڑھے ہوئے تھے۔ اُنھوں نے دیکھا کہ کانگرس کے ریزولیوشن کے اندر سلطنتِ برطانیہ سے مکمل قطع تعلق، کا فقرہ آجانا کافی خطرناک چیز ہے۔ رپورٹ کی تعریف میں جو کچھ الفاظ کہے گئے تھے ان کا انداز کچھ ایسا مربیانہ تھا جس سے ان کے تمکنت کو ٹھیس سی لگی۔ وہ تو اس کے متمنی تھے کہ درجۂ نوآبادیات کی چٹان پر اُنھوں نے جو آئینی عمارت تیار کی ہے اس کی ہر حیثیت سے دلی تائید و حمایت کی جائے۔ لہٰذا دلی کی مخالفت ان پر بہت گراں گزری، لیکن اس وقت انھوں نے مدبرانہ مصلحتوں کی بنا پر اس طوفان کے مقابلے میں دب جانا ہی مناسب سمجھا ——— جلد ہی اُنھیں مزید قوت کے ساتھ پھر اُبھرنا تھا!

پنڈت موتی لال نہرو ۱۹۲۸ء کے دسمبر میں ہونے والے اجلاس کے صدر منتخب ہوئے تھے۔ انھوں نے دہلی میں ایک کمیٹی سے کہا تھا کہ "مجھے چند ہی ہفتوں میں دو گھوڑوں پر بیک وقت سواری کرنی ہے اور جب تک میں یہ نہ سمجھ لوں کہ میں دونوں کو اپنے قابو میں رکھ سکوں گا اس وقت تک ایسا نہیں کروں گا۔" اس کا مطلب بالکل صاف تھا۔ وہ اس بات کا تہیہ کرچکے تھے کہ دہلی میں جو کچھ ہوا سو ہوا، لیکن کلکتہ کانگرس کی مجلسِ مضامین اور خود کانگرس سے اپنی تیار کی ہوئی بیش قیمت دستاویز پر ضرور مہر تصدیق

ثبت کرانی ہے۔لیکن دقت یہ تھی کہ دہلی کمیٹی ہی کلکتہ کی مجلس مضامین بننے والی تھی۔ یہ کیونکر ہوسکتا تھا کہ وہی کمیٹی جس نے ان کی رپورٹ کی تعریف میں اتنا بخل سے کام لیا تھا اب ان کے قابو میں آجائے۔ ہوشیار پنڈت نے ہر طرف نظر دوڑائی کہ کلکتہ میں اسی قسم کی ذلت سے بچنے کے لیے کیا صورت نکالی جائے۔ جلد ہی ان کے ذہن میں بات آگئی اور وہ سمجھ گئے کہ سارے ہندوستان میں ایک ہی آدمی ہے جو مجلس مضامین میں بھی اور کانگرس کے کھلے اجلاس میں بھی ان کی مشتبہ اقلیت کو یقینی اکثریت میں بدل سکتا ہے — وہ گاندھی جی تھے —
گاندھی جی محض سیاسی حیثیت سے نہیں بلکہ نجی حیثیت سے بھی اس کام کو خوب انجام دے سکتے تھے، کیونکہ ان کی محبت و عزت دونوں کے دل میں تھی، اور وہی باپ بیٹوں میں صلح بھی کرا سکتے تھے۔ کانگرس کے ہونے والے صدر نے گاندھی جی سے اپیل کی کہ اس موقع پر وہ اپنے گوشۂ تنہائی سے باہر تشریف لائیں اور اس آڑے وقت پر ان کی مدد کریں۔ گاندھی جی حسب دستور اپنے سیاسی مقلدین اور نجی دوستوں کے ساتھ وفاشعاری کے جذبہ سے متاثر ہو کر فوراً ۲۶ر دسمبر کی مجلس مضامین میں شرکت فرمانے کی غرض سے کلکتہ روانہ ہوگئے۔

اب ہم تھوڑی دیر کے لیے توقف کر کے اس کا جائزہ لینا چاہتے ہیں کہ اس زمانے میں کانگرس کی سرگرمیوں سے گاندھی جی کا کس قدر تعلق تھا۔ ۱۹۲۶ء میں گوہاٹی کے مقام پر جو اجلاس ہوا تھا۔ وہی آخری اجلاس تھا جس میں گاندھی جی نے عملاً حصہ لیا تھا لیکن اس موقع پر بھی انھوں نے بس دو ریزولیوشن پیش کیے تھے، جن میں سے ایک سوامی شردھانند کے قتل کے متعلق تھا اور دوسرا مشرقی افریقہ کے مسئلے کے متعلق۔ باقی انھوں نے سوراجیوں کی پُرپیچ چالوں کی اخلاقی حمایت کرنے پر اکتفا کی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۲۷ء میں مدراس کے اجلاس میں بھی شریک ہوئے تھے۔ وہاں کانگرس نے آزادی کی وہی قرارداد پیش کی تھی جس کی گزشتہ کئی سال سے گاندھی جی برابر مخالفت کرتے چلے آئے تھے، لیکن گاندھی جی نے اس تجویز کو کھلے اجلاس میں مسترد کرانے کی ذرہ برابر کوشش نہیں کی کیونکہ حکومت نے خالص برطانوی کمیشن مقرر کر کے ایسی صورت پیدا کر دی تھی کہ گاندھی جی کی مخالفت کارگر نہ ہوتی۔ وہ اپنی خود عائد کردہ عزلت نشینی سے اس کام کے لیے بھی باہر نہ نکلے کہ مختلف فرقوں کے درمیان مصالحت کے کام میں جس سے انھیں بڑی دلچسپی رہا کرتی تھی، کوئی حصہ لیں۔ ۱۹۲۸ء میں متعدد بار آل پارٹیز کانفرنس کے جلسے ہوئے مگر گاندھی جی نے اس میں شرکت نہیں کی۔ البتہ یہ کیا کہ جب ہندستان کے خام کارانِ سیاست نہرو رپورٹ کی تعریف کا راگ الاپنے لگے تو انھوں نے بھی آواز ملانی شروع کی اور اس طرح گویا پنڈت جی کو کلکتہ کانگرس کی کرسی صدارت پر پہنچا دیا۔ اس وقت گاندھی جی کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ انھیں رشی، تارک الدنیا درویش، اور بے لوث قسم کا ماہر سیاست سمجھا جا رہا تھا —— ایسے بے لوث انسان کہ جب انھوں نے دیکھا کہ ملک ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کے لیے تیار نہیں ہے تو اپنی تمام شان دار کامیابیوں کے باوجود انھیں میدان سیاست سے کنارہ کش ہونے میں بھی کوئی تردد نہ ہوا۔ پھر یہ کہ وہ کسی خاص پارٹی کے آدمی نہیں، ان میں پارٹی بندیوں کے جذبات و تعصبات کا نام و نشان نہیں، جو راستہ انھیں صحیح نظر آتا ہے اسی پر چل کر ملک کی مخلصانہ خدمت کرنے کے علاوہ اور کوئی جذبہ نہیں رکھتے۔ بہرحال اس فضا میں گاندھی جی نے کانگرس کی مجلس مضامین میں نزول اجلال فرمایا۔

جو کچھ وہ کرنے والے تھے ظاہر ہی تھا، نہرو رپورٹ پر دہلی میں جو ناپسندیدہ ریزولیوشن پاس ہوا تھا اس کو ختم کرا کے ایسا ریزولیوشن پاس کرانے کے لیے جس میں اس رپورٹ کی مکمل تائید و تعریف ہو، گاندھی جی پنڈت نہرو کے ساتھ دل و جان سے متحد ہو گئے۔ پہلا معرکہ مجلس مضامین میں ہوا۔ گاندھی جی اور پنڈت موتی لال نہرو نے چھ اور پانچ ووٹوں کے فرق سے یہ معرکہ سر کر لیا۔ اب دوسری منزل کے لیے بھی راستہ صاف ہو گیا تھا لہٰذا گاندھی جی نے درجۂ نوآبادیات پر حسب ذیل ریزولیوشن پیش کر کے معرکہ آرائی کی ابتدا کر دی:-

"یہ کانگرس آل پارٹیز کمیٹی کے پیش کیے ہوئے دستور پر غور و خوض کرنے کے بعد اس کا خیر مقدم کرتی ہے، اسے ہندستان کے سیاسی اور فرقہ وارانہ مسائل کے حل کرنے کے سلسلے میں ایک زبردست امداد تصور کرتی ہے، کمیٹی کے ممبروں کی اتحاد رائے پر مبارکباد پیش کرتی ہے اور مدراس کانگرس کی منظور شدہ قرارداد آزادی پر قائم رہتے ہوئے اس دستور کو سیاسی ترقی کی جانب ایک عظیم الشان

اقدام سمجھتے ہوئے اُسے قبول کرتی ہے خصوصًا اس وجہ سے کہ ملک کی اہم جماعتوں نے اس پر اتفاق کیا ہے۔

اگر برطانی پارلیمنٹ نے ۳۱ دسمبر ۱۹۳۰ء تک اس دستور کو منظور نہ کر لیا تو کانگرس اس کی پابند نہ رہ جائے گی اور ملک کو یہ مشورہ دے کر کہ حکومت کو کسی قسم کی امداد نہ دی جائے اور نہ کوئی محصول دیا جائے دوبارہ پُرامن ترک موالات کی مہم شروع کر دے گی۔

صدر کو اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ اس تجویز کی ایک نقل مع اس رپورٹ کے ایک نسخہ کے بغرض کارروائی مناسب وائسرائے کے پاس روانہ کر دیں۔

کسی حیثیت سے بھی یہ تجویز لوگوں کو آزادی کے نصب العین کا پروپیگنڈہ کرنے میں مزاحم نہیں ہوگی تاوقتیکہ رپورٹ کی سفارشات کو قبول کرنے میں یہ پروپیگنڈہ حارج نہ ہو۔"

اس ریزولیوشن پر شدید مباحثے کے دوران میں گاندھی جی نے مجلس مضامین میں اپنی تشریف آوری کے وجوہ حسب ذیل الفاظ میں ارشاد فرمائے:۔

"ڈاکٹر ستیابی نے مجھ سے دریافت کیا ہے کہ مجھے سوراج پارٹی اور پنڈت موتی لال نہرو سے اتنی محبت کیوں ہو گئی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ محبت نہیں بلکہ مجھے اس پیارے رفیق سے عشق ہے۔ پنڈت موتی لال نہرو نے مجھے لکھا تھا کہ تم نے میرے سر پر کانٹوں کا تاج رکھوا دیا ہے اب آ کر دیکھو کہ اس نے میرے سر پر کتنے زخم پیدا کر دیے ہیں اور ان زخموں میں سے تم بھی کچھ حصہ لو۔ اس موقع پر جب کہ قوم ایک نازک مرحلہ سے گزر رہی ہے اُن کو صدارت پر مجبور کرنے کے بعد اگر میں جواب میں یہ نہ کہتا کہ "ہاں جس تاریخ کو کہو گے آؤں گا اور جب تک اجازت نہ دو گے واپس نہ ہوں گا" تو اپنے نزدیک میں قوم کے ساتھ بیوفائی کا مجرم ٹھہرتا۔"

اس ریزولیوشن کو پیش کرتے ہوئے گاندھی جی نے کمیٹی کے سامنے جو تقریر کی اس کے چند جواہر پارے ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں:۔

پہلے تو اُنھوں نے دہلی ریزولیوشن کو یہ کہہ کر ختم کرنا چاہا کہ

"میں آپ لوگوں کو اپنا شریکِ راز بناتے ہوئے یہ بتا دوں کہ صدر نے خود اس کو محسوس کیا کہ دہلی کی قرارداد نظرثانی کی محتاج ہے۔ ہم میں سے چند لوگوں نے اس پر غور و خوض کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ دہلی کی قرارداد متناقض بالذات ہے۔ لہٰذا ہم نے کوشش کی کہ ایک درمیانی راہ نکالی جائے اور ایسی قرارداد تیار کی جائے جو نہرو رپورٹ کو منظور کرنے کی خواہش اور دیانت داری کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکے، اور وہ قرارداد یہ ہے جو میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔"

اس کے بعد اُنھوں نے نہرو رپورٹ کی مکمل اور غیر مشروط منظوری کے لیے وکالت شروع کی:۔

"میں یہی تجویز کروں گا کہ ہر کانگرسی کو چاہیے کہ نہرو رپورٹ کو اسی جذبہ کے ساتھ منظور کرے جس جذبہ کے ساتھ سارے ہندوستان نے شائع ہوتے ہی اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ میں آپ لوگوں کو یہ واقعہ بھی یاد دلانا چاہتا ہوں کہ جس وقت یہ شائع ہوئی ہے اس وقت [illegible] قوم نے نہایت گرم جوشی سے اس کا خیر مقدم کیا ہے۔ یہاں تک کہ ہمارے معترضین اور مخالفین نے بلکہ بیرونی لوگوں نے بھی جن کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی اس کی بہت تعریف کی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو یقینًا کہہ سکتے ہیں کہ ہم اس رپورٹ کو منظور نہیں کریں گے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اگر جلد بازی سے کام لے کر ہم اس نتیجے پر پہنچے تو یہ کچھ اچھی بات نہ ہوگی . . . . . ورکنگ کمیٹی ہی کے ایما سے آل پارٹیز کانفرنس وجود میں آئی، ایسی صورت میں جب تک کوئی بہت قوی دلائل نہ ہوں کیا وجہ ہے کہ رپورٹ نہ منظور کی جائے۔ یقینًا منظور کی جانی چاہیے۔"

آخر اس نہرو اسکیم کا اصل جوہر کیا تھا؟ گاندھی جی خود جواب دیتے ہیں "درجۂ نوآبادیات"۔ لہٰذا انھوں نے کمیٹی سے اس پر اصرار شروع کیا کہ درجۂ نوآبادیات کے بنیادی اُصول کو غیر مشروط طریقے پر تسلیم کیا جائے۔

"اس رپورٹ کے ٹکڑے نہیں کیے جا سکتے اس کی تو حیثیت ایک جسمِ واحد کی سی ہے . . . . . جیسا ڈاکٹر انصاری

نے کہا ہے اگر آپ اس رپورٹ کے مرکزی بحث پر حملہ کرتے ہیں تو گویا اس کے قلب ہی کو ماؤف کرنا چاہتے ہیں اور اس رپورٹ کا مرکزی بحث یقیناً وہی ہے جسے عام طور پر درجۂ نو آبادیات کہا جاتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ یہ ایک خطرناک غلطی ہوگی اگر ہم آزادی اور درجۂ نو آبادیات کو ایک دوسرے کا ندِ مقابل ٹھہرا کر یہ کہیں کہ درجۂ نو آبادیات میں ذلت اور سبکی ہے اور "آزادی" میں عزت و کامرانی کی جھلک ہے۔"

اس صورت سے گاندھی جی نے اپنے اس گہرے منصوبے کو پوری عریانی کے ساتھ ظاہر کر دیا۔ وہ کانگرس میں پنڈت موتی لال نہرو کے بلائے ہوئے آئے تھے۔ پنڈت جی دہلی والی قرارداد کو ناپسند کرتے تھے، بلکہ اس سے قطعاً متنفر تھے۔ گاندھی جی تہ دل سے اس کے مؤید تھے، لہٰذا وہ کانگرس میں تشریف لائے کہ نہرو رپورٹ اور اسی کے ساتھ لازماً درجۂ نو آبادیات کے بنیادی اُصول کی غیر مشروط منظوری کی وکالت فرمائیں۔ اُنھوں نے مدراس ریزولیوشن کے متعلق چند کلمات تحسین کہ کر گویا ان تلخ گولیوں پر شکر کی تہ لگا دی تاکہ آسانی سے حلق کے نیچے اُتر جائیں۔ انھیں اس کی بھی ضرورت محسوس ہوئی کہ اس اسکیم کی منظوری کے لیے دو سال کی مدت مقرر کر دی جائے اور نہ منظور ہونے کی صورت میں پُر امن ترک موالات بشمول عدم ادائگی محاصل کی دھمکی دے دی جائے تاکہ عوام الناس بھی آسانی سے اس قرارداد کو قبول کریں۔

جب گاندھی جی اپنا ریزولیوشن کمیٹی کے سامنے پیش کر چکے تو پنڈت جواہر لال نہرو اپنی ترمیم پیش کرنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ یہ ترمیم بالکل دہلی ریزولیوشن کے الفاظ میں تھی۔ اُنھوں نے "درجۂ نو آبادیات" کو ذیل کے چبھتے ہوئے الفاظ میں نہایت سختی کے ساتھ مسترد کیا :-

"ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ آئرستان کی طرح یہاں بھی یہ سوال پیدا ہوگا کہ ہمیں درجۂ نو آبادیات قبول کرنا چاہیے یا نہیں۔ آخر دوسرے ملکوں نے کیا کیا ہے؟

میرے علم میں دُنیا کا اور کوئی ملک ایسا نہیں ہے جس نے اِن حالات میں قصداً اور جان بوجھ کر درجۂ نو آبادیات کا نصب العین اختیار کیا ہو .... آپ جس نقطۂ نظر سے اس پر نگاہ ڈالیں گے، خواہ قومی وقار کے لحاظ سے خواہ مصلحت کے لحاظ سے، آپ محسوس کریں گے کہ درجۂ نو آبادیات قبول کر لینا انتہائی غلط اور احمقانہ حرکت ہوگی۔ جو کچھ اس وقت مُلک میں ہو رہا ہے آپ اس سے بے خبر نہیں ہیں۔ لالہ لاجپت رائے کی موت کا حال آپ کو معلوم ہے۔ جو کچھ لاہور اور لکھنؤ میں ہوا وہ بھی آپ جانتے ہیں۔ وائسرائے نے جس قسم کی ذِلت آمیز دھمکی دی ہے اس سے بھی آپ واقف ہیں ..... اگر قومی پرچم کو سرنگوں نہ کرنے کا کوئی موقع ہو سکتا ہے تو اس کا یہی وقت ہے جب کہ تخویف و تہدید کی اس درجہ گرم بازاری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت کا تصادم اتنا زیادہ ہندوستان اور انگلستان کا تصادم نہیں ہے بلکہ اصل میں دو مختلف قسم کے نصب العین کا تصادم ہے، اور آپ کے سامنے یہ سوال ہے کہ آپ اس میں سے کون سا نصب العین ملک کے سامنے رکھتے ہیں۔ یہ تصادم ملوکیت پرستی اور ملوکیت دشمنی کا ہے اور جب تک برطانیہ کے پاس اس کی سلطنت ہے آپ کو ایک لمحہ کے لیے بھی درجۂ نو آبادیات کا تصور تک نہیں کرنا چاہیے۔ درجۂ نو آبادیات کو منظور کر کے آپ دُنیا پر یہ ثابت کریں گے کہ آپ ملوکیت پرستی کی نفسیات کو قبول کر رہے ہیں۔"

اسی طرح برابر معرکہ آرائی جاری رہی۔ دو دن کے بعد گاندھی، نہرو اور دیگر خداوندانِ کانگرس نے محسوس کہ ان کی متحدہ قوت بھی اِس بیش قیمت قرارداد کو کانگرس میں منظور نہیں کرا سکے گی۔ گاندھی جی کی ساری سوفسطائیت کے باوجود مندوبین کی غالب اکثریت نے قرارداد اور نہرو رپورٹ کے وائسرائے کے پاس بھیجے جانے کی شدید مخالفت کی۔ اس کے علاوہ دو سال کی مدت، جس کے بعد ترک موالات کی مہم شروع کی جانے والی تھی، ان لوگوں کو بہت طویل معلوم ہوتی تھی۔ لہٰذا، ۲۸ دسمبر کی شب کو پنڈت نہرو نے گاندھی جی کو آدھی رات کے وقت جگایا اور خفیہ طور پر ان سے گفتگو کر کے ایک نئی قرارداد تیار کی۔ گاندھی جی ۲۸ دسمبر کو مجلس مضامین میں اپنے اس نئے ریزولیوشن کو پیش کرنے کی غرض سے تشریف لائے جس میں وائسرائے کے پاس رپورٹ اور ریزولیوشن کی قرارداد روانہ کرنے والی دفعہ حذف کر دی گئی تھی اور دو سال کے بجائے ایک سال کی مدت قرار دی گئی تھی جو ۳۱ دسمبر ۱۹۲۹ء کو ختم ہوتی تھی۔ اس کے باوجود حیرت کی بات یہ ہے کہ

اس نئے ریزدلیوشن کی تائید میں اُنھوں نے جو تقریر کی اس کا بیشتر حصّہ انھیں دفعات کو جو حذف کردی گئی تھیں باقی رکھنے کی تائید میں تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک مہاتما ہی کو اس کی اجازت مِل سکتی تھی کہ جن دفعات کو حذف کرنے کا ریزدلیوشن پیش کریں انھیں کی حمایت میں تقریر کریں۔

کیا گاندھی جی اب اس کے قائل ہوگئے تھے کہ نہرو رپورٹ کو وائسرائے کے پاس بھیجنا بالکل لایعنی اور قومی وقار کے منافی ہے؟ ہرگز نہیں، سُنئے کہ اُنھوں نے اس مسئلے پر مجلس مضامین میں کیا کہا:۔

"خوش اخلاقی کا تقاضا یہی ہے کہ ہم رپورٹ اور ریزدلیوشن کی ایک نقل وائسرائے کے پاس ضرور بھیجیں ......

اس دستور کو سائمن کمیٹی کے سامنے نہیں پیش کرنا ہے مگر بے شک یہ ایسی دستاویز ہے جسے وائسرائے اور حکومت کے سامنے غور و خوض کرنے کے لیے ضرور پیش کرنا چاہیے ...... اسی مقصد سے یہ تیار کی گئی ہے۔ اگر یہ نہ ہوا تو یہ ساری محنت اکارت جائیگی ......

اگر آپ واقعی کچھ کرنا چاہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ وہ نیتجہ خیز ثابت ہو تو میں آپ سے پھر کہوں گا کہ نہرو رپورٹ کو برطانوی ایوانِ حکومت اور وائسرائے کے سامنے غور و خوض کے لیے پیش کرنا ہوگا۔ اس کے مرتب کرنے والے جانتے تھے کہ یہی ہونا ہے۔ آپ بھی جانتے ہیں، میں بھی جانتا ہوں، اگر ہم اس کا اعتراف نہ کریں تو یہ ہماری کمزوری ہے۔ اگر وائسرائے اپنے بادشاہ اور اپنی قوم کی شایانِ شان نمائندگی کرتے ہیں تو وہ اس ریزدلیوشن کی طرف ضرور توجہ کریں گے اگرچہ اس میں وہ دفعہ نہیں رہ گئی ہے جسے میں رکھنا چاہتا تھا۔"

چنانچہ سارا بھانڈا پھوٹ گیا۔ گاندھی جی نے کانگرس کا سارا کھیل بگاڑ دیا۔ ان کے الفاظ سے صاف ثابت ہوتا تھا کہ اگرچہ کانگرس نے ظاہری طور پر بڑے زور شور سے سائمن کمیشن کا مقاطعہ کیا ہے مگر حقیقت میں شروع ہی سے اس کی یہ خواہش رہی ہے کہ حکومتِ برطانیہ کے سامنے پیش کرنے کی غرض سے ایک دستور مرتب کر کے حکومت کی آئینی سازشوں میں معاونت کرے۔ خود گاندھی جی کے الفاظ سے ثابت ہوگیا کہ یہ نمائشی مقاطعہ جس کا بڑا ڈھنڈورا پیٹا گیا تھا حقیقتاً ایک ڈھونگ اور فریب کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ معناً اُنھوں نے گویا حکومت کے ساتھ اس کی آئینی ریشہ دوانیوں میں —— چور دروازے کی طرف سے آکر —— تعاون کرنے کی وکالت فرمائی۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ اگر تم ایسی ڈھٹائی پر اُتر آئے کہ برطانیہ کی "آسمانی سلطنت" ہی سے قطع تعلق کرنے کو کہتے ہو تو پھر حکومت کی نگاہ کرم کے ملتجی ہو کر کوئی اسکیم کیوں کر پیش کر سکو گے! لہٰذا یہ کرو کہ گھٹنے ٹیک کر خداوندانِ سلطنت کے آگے جھک جاؤ اور درجۂ نوآبادیات کی بھیک طلب کرو!

گاندھی جی اس ضرورت کو بھی محسوس کرنے کو تیار نہ تھے کہ دو سال کے بجائے ایک سال کی مدت دی جائے۔ اپنے نئے ریزدلیوشن کے باوجود، وہ اب بھی یہی کہتے رہے کہ قوم کو اس زبردست جدوجہد کے لیے تیار کرنے کے واسطے کم از کم دو سال کی مدت ضروری ہے۔

"میں سوچتا تھا کہ جنگ کے لئے اپنی قوتوں کو متحد و منظم کرنے کے واسطے دو سال کی مدت کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اگر ہم کو حکومت سے جنگ کرنی ہی پڑی تو کم از کم ایک سال تو اپنی صفوں میں ضبط و نظم پیدا کرنے اور کانگرس میں ہزاروں کی تعداد میں ممبر بھرتی کرنے میں صرف ہو جائے گا۔ اس وقت ہمارا رجسٹر ممبران بالکل نمائشی اور فرضی ہے ...... ہم کو اپنے اندر خود اعتمادی اور جرأت پیدا کرنے اور فرقہ وارانہ اتحاد کا کام مکمل کرنے کے لیے ایک سال کی مدت اور درکار ہے۔"

تو کیا اگر سب اندیشہ حکومت نے حقارت کے ساتھ کانگرس اسکیم کو ٹھکرا دیا تو گاندھی جی ۱۹۲۰-۲۱ء کی طرح پھر سول نافرمانی اور عدم ادائگی محاصل کی مہم شروع کر دیں گے؟ گاندھی جی کا جواب سنیے:۔

"میرے بہت سے احباب آئے اور پوچھنے لگے کہ اگر میں نے ریزدلیوشن کی تائید کی ہے تو کیا میں قومی معاملات کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لوں گا۔ میں صاف طور پر اعتراف کرتا ہوں کہ یہ تنہا میرے بس کی بات نہیں ہے، ہاں اگر آپ لوگ میرے شرائط مان لیں گے اور یہ جُوا اپنے کندھے پر رکھنے کو آمادہ ہوں گے تو ضرور میں اس مہم کی قیادت کا بار اُٹھا لوں گا۔ مگر یہ جُوا اس سے کہیں زیادہ بھاری ہوگا جو ۱۹۲۱ء میں اُٹھانا پڑا تھا۔ اگر آپ لوگ ضبط و نظم کا ہدیہ پیش کر سکیں گے تو میرا یہ نحیف و نزار جسم ہر طرح حاضر ہے۔ جتنا کچھ ہو سکے گا

ضرور کردوں گا۔ مگر اس وقت تک آپ مجھ سے کوئی توقع نہیں کر سکتے جب تک آپ ان بے رحمانہ شرائط کو خود نہ تسلیم کرلیں"

حریت پسند جماعت نے اس نئے ریزولیوشن کو کس نظر سے دیکھا؟ مسٹر آئنگر چلتے ہوئے آدمی تھے اور کافی نرم خو بھی تھے، گاندھی جی نے اپنے شتر غمزوں سے اُنھیں حلقہ بگوش کرلیا۔ اس کے بعد ایک نہایت شاطرانہ چال یہ چلے کہ جب اُن کے اس ترمیم شدہ ریزولیوشن پر بحث و مباحثہ کا وقت آیا تو کچھ ایسی صورت پیدا کی کہ اس موقع پر پنڈت جواہر لال نہرو نہ رہیں۔ اور محض اتنے ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ آئندہ ضرورتوں کے پیش نظر خواہ مخواہ ان کی تعریفوں کا پُل باندھ دیا۔ تاکہ وہ ذرا نرم پڑ جائیں اور ان کی مخالفت میں وہ شدت نہ باقی رہے۔

"میں سوچتا ہوں کہ آپ لوگوں کو اس راز سے آگاہ کروں . . . وہ (جواہر لال) اس جوے کو اُتار پھینکنے کے لیے بُری طرح بے قرار ہیں۔ چوبیس گھنٹے اپنے ہم وطنوں کی تکالیف و شکایات کے خیال میں غرق رہتے ہیں۔ عوام کے تباہ کن افلاس کو دُور کرنے کے لیے ہر وقت بے چین رہتے ہیں۔ سرمایہ داروں سے، جو عوام کو ہدف انتفاع بنا کر ان کا خون چوستے رہتے ہیں، ملک پر حکومت کرتے ہیں اور اس میں لوٹ کھسوٹ اور استحصال کا بازار گرم کیے رہتے ہیں، وہ بے حد بیزار ہیں . . . میں آپ لوگوں سے صاف صاف عرض کردوں کہ وہ اس ریزولیوشن سے بھی، جسے میں پہلے والے ریزولیوشن کی جگہ پیش کر رہا ہوں مطمئن نہیں ہیں، . . . ان کے خیال میں یہ ریزولیوشن بھی اس سے بہت پست ہے جو وہ چاہتے ہیں۔ مگر وہ نہایت عالی ظرف واقع ہوئے ہیں۔ اور یہ نہیں چاہتے کہ خواہ مخواہ کسی قسم کی تلخ گفتگو کا موقع آئے۔ اس سے بچنے کے لیے اُنھوں نے خود ہی خاموشی اختیار کرلی ہے"

مگر سبھاش چندر بوس کی اس قسم کی کوئی تعریف و توصیف قطعًا نہ کی گئی۔ وہ اکیلے جنگ کرتے رہے۔ اخیر میں صدر صاحب نے خود اُن کی زبان بند کردی، اور گاندھی جی کا ترمیم شدہ ریزولیوشن مجلس مضامین میں ۱۱۸ اور ۴۵ ووٹوں سے پاس ہوگیا۔

سلطنت برطانیہ کے لیے گاندھی جی کی اس سال کی جنگ ۳۱ دسمبر ۱۹۲۸ء کو کانگرس کے کھلے اجلاس کے موقع پر اپنے آخری مراحل میں پہنچ گئی۔ کامیابی کے پورے تیقن کے ساتھ اُنھوں نے ایک مختصر سی تقریر کے بعد مجلس مضامین کا منظور کیا ہوا ریزولیوشن پیش کیا۔ مسٹر بوس نے پھر دہلی ریزولیوشن کے الفاظ میں اپنی ترمیم پیش کی۔ جو کچھ ہونا تھا پہلے ہی سے معلوم تھا۔ مسٹر بوس کی ترمیم ۹۷۳ اور ۱۳۵۰ ووٹوں کے فرق سے مسترد ہوگئی۔ اس کے بعد مہاتما کے ریزولیوشن پر علیحدہ سے ووٹ لیے گئے۔ "بندے ماترم" اور "گاندھی جی کی جے" کے فلک شگاف نعروں کے ساتھ ریزولیوشن پاس ہوگیا!

سول نافرمانی کی تجدید کے حربے سے گاندھی جی نے سلطنت برطانیہ اور ہندوستانی قوم، دونوں کے لیے دو رُخی جنگ کی جو ترکیب نکالی اُس کی پوری اہمیت پر اگلے باب میں بحث کی جائے گی۔

اٹھّواں باب

کلکتہ کانگرس

گاندھی جی نے خواہ مخواہ کلکتہ جانے کی زحمت نہیں اُٹھائی تھی۔ ان کے سامنے ایک خاص مقصد تھا اور اس کے حصول کے ذرائع بھی اُن کے ذہن میں متعین ہوچکے تھے۔

اس کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے کہ گاندھی جی نے کیا سوچ رکھا تھا اور اس کے حاصل کرنے کے لیے اپنے ذہن میں کیا نقشہ تیار کیا تھا ہمیں گزشتہ چند سالوں کے حالات پر نظر ڈالنی ہوگی۔

فروری ۱۹۱۹ء میں گاندھی جی کو پہلی مرتبہ ایک انقلاب انگیز صورت حال سے سابقہ پڑا تھا۔ سول نافرمانی کا نعرۂ جنگ ایجاد کرکے انھوں نے اس موقع کا کامیابی سے مقابلہ کرلیا تھا۔ لیکن پہلا ہی وار کرنے کے بعد انھوں نے فوراً پسپائی کا حکم دے دیا تاکہ حکومت برطانیہ کے لیے امن وامان قائم کردیا جائے۔

ہر سیاسی مسئلے کے متعلق گاندھی جی کا جو کچھ رویہ رہتا ہے بالکل اسی کے مطابق ۱۹۲۰ء میں بھی انھوں نے یہ کیا کہ صرف پنجاب اور خلافت کے قضیے کو اپنی تمام جنگ کا مرکز ٹھہرالیا۔ سوراج کا مسئلہ تو ستمبر ۱۹۲۰ء کے کلکتہ کانگریس میں محض ضمنی طور پر شامل کرلیا گیا تھا۔ اس زمانے میں وہ بہت جوش وخروش کے ساتھ اس قسم کی توقعات کا اظہار کیا کرتے تھے کہ وہ کروروں ہندوستانیوں کے، نیز برطانوی گورنروں کے، دل ودماغ میں ایک زبردست انقلاب برپا کردیں گے۔ عدم تشدد وعدم تعاون کے بلند آہنگ پروگرام نے قوم کو مسحور کردیا تھا۔ یہ پروگرام ترک خطابات سے شروع ہوکر عدم ادائگی محاصل پر ختم ہونے والا تھا۔ چونکہ گاندھی جی نے ایک سال کے اندر اندر سوراج دلانے کا وعدہ کیا تھا، لہٰذا ساری قوم اس امید میں تھی کہ ۳۱ دسمبر ۱۹۲۱ء کو سابرمتی ندی کے کنارے جمہوریہ ہندیہ کی پرچم کشائی کی جائے گی۔

قوم اس درجہ بیدار ہوئی کہ اس کے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ اس نے گاندھی جی کی آواز پر لبیک کہا اور بہت جلد آدمی (ایک کروڑ ممبر)، روپیہ (تقریباً پندرہ کرور) اور اسلحہ (ہزاروں چرخے) گاندھی جی کے قدموں پر ڈال دیے۔ اس جوش وخروش کے ساتھ اب تک کسی لیڈر کے حکم کی تعمیل نہ کی گئی تھی۔ لیکن یہ سپہ اعظم برابر حکومت سے جنگ کرنے کے مواقع ٹالتا رہا۔ آخر کار محض اس وجہ سے کہ حکومت نے گھبراہٹ میں کانگریس کی تمام رضاکارانہ جماعتوں کو خلاف قانون قرار دے دیا تھا، عوام اور حکومت میں جلد تصادم ہوگیا، ورنہ گاندھی جی کی ہرگز یہ مرضی نہ تھی۔ لیڈروں میں سے اکثر جیل میں بند کردیے گئے تھے۔ تقریباً تیس ہزار رضاکار جن میں سیکڑوں عورتیں بھی شامل تھیں فوراً مقید کرلیے گئے۔ سارے ملک میں کروروں غریب کسان عدم ادائگی محاصل کی مہم میں کود پڑنے کے لیے بے چین تھے۔ ہزاروں مزدور جو چائے کے کاشت کے سلسلے میں کام کررہے تھے نیز ریلوں، کانوں، اور کارخانوں کے مزدور بے حد متاثر تھے۔ احمد آباد کانگریس نے مکمل اختیارات گاندھی جی کے ہاتھ میں دے دیے تھے۔ پُرامن مگر کامیاب انقلاب کی امیدیں حد سے زیادہ بڑھادی گئی تھیں۔ لوگ پھولے نہ سماتے تھے۔ گاندھی جی فتیلے کو آگ دکھانے کے لیے بردولی تشریف لائے۔ مگر یہاں پہنچ کر انھوں نے جو کچھ کیا وہ ان کے ۱۹۱۹ء کے کرتوتوں سے بھی بدتر تھا۔ شمالی ہندستان میں کسی جگہ فساد رونما ہوگیا اور انھیں اس مہم کو جو مغربی ہندستان کے ایک چھوٹے سے علاقے میں شروع ہونے والی تھی روک دینا پڑا۔ انھوں نے اپنا الٹی میٹم، شاید قبل اس کے کہ وہ وائسرائے کے پاس پہنچ سکے، واپس لے لیا اور ایک وار بھی نہ کیا تھا کہ لڑائی ہار گئے۔ ساری قوم شرم ویاس میں ڈوب گئی۔ ایسی ذلت کبھی نہ ہوئی تھی۔ اس حرکت کے بعد محض بروقت گرفتار ہوجانے ہی سے گاندھی جی کی آبرو رہ گئی ورنہ انھیں ذلت ورسوائی کے وہ تلخ گھونٹ پینے پڑتے کہ باید وشاید۔

اب کم از کم دو باتوں کے متعلق کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ رہ گئی۔ اول یہ کہ گاندھی جی صرف یہ چاہتے تھے کہ سلطنت برطانیہ کے چوکھٹے کے اندر ہی حکومت کی مشینری کے پرزوں میں کچھ ردوبدل کرکے اُسے پھر سے درست کردیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اُن کی نوزائیدہ تحریک عدم تشدد وعدم تعاون، کا سارا مدعا محض یہ تھا کہ عام تعاون واطاعت کی ہموار سطح میں تھوڑے بہت چھوٹے چھوٹے سوراخ کرلیے جائیں تاکہ حکومت برطانیہ سے گفت وشنید اور لین دین کی گنجائش رہے۔

۱۹۲۴ء کے جاڑوں میں جب گاندھی جی جیل سے رہا ہوکر آئے تو انھیں ابتدا ہی میں پارلیمنٹری پارٹی سے سابقہ پڑا جو ابھی حال ہی میں بنی تھی۔ جون ۱۹۲۴ء میں سوراج پارٹی سے انھیں کچھ معمولی سی نوک جھونک کرنی پڑی مگر تھوڑے ہی دنوں میں اپنی بدگمانیوں اور ہزیمتوں کو برداشت کرکے انھوں نے سوراج پارٹی سے معاہدہ کرلیا تھا۔ بلگام کانگریس کی صدارت کرنے کے بعد نمائشی طور پر سیاست سے

کنارہ کشی اختیار کرلی، اس لیے نہیں کہ اپنے چرخے کے پروگرام میں مشغول ہو جائیں بلکہ اس لیے کہ ملک کی تمام رجعت پسند اور قدامت پرست قوتوں کی مدد سے انقلاب دشمنی کا محاذ قائم کریں۔ انھوں نے باشندگان ریاست کی کانفرنس میں بھی صدارت فرمائی جس کا منشا محض یہ تھا کہ ان کی عام سیاسی سرگرمیوں کا بھی سر کچل دیں اور وہاں کے پُرجوش کارکنوں کو کھدر کے پروگرام میں لگا کر انھیں ظالم حکمرانوں کا معاون بنا دیں۔ انھوں نے براہ راست راجاؤں، نوابوں، اور ان کے وزیروں، اور پٹھوؤں سے اپیل کی کہ چرخے کے مسلک کی اشاعت کریں۔ کونسلوں کے سلسلے میں بھی وہ محض سوراجیوں سے اتحاد کرلینے پر قانع نہ رہے، بلکہ دوسرے آئین پرستوں مثلاً لبرل اور سرمایہ دار جماعتوں کو بھی دعوتِ تعاون دینے لگے۔ مکمل ترکِ موالات کا یہ زبردست علم بردار اب اتنی پستی پر اُتر آیا کہ اُس نے اپنے پسندیدہ تعمیری پروگرام کو آگے بڑھانے کے لیے حکومت برطانیہ سے نیز دیگر نام نہاد سرکاری اداروں سے بھی نہایت منت و لجاجت سے تعاون کی التجائیں کرنی شروع کر دیں۔

ادھر تو انھوں نے راجاؤں، زمینداروں، سرمایہ داروں اور خواص سے یعنی انھیں لوگوں سے جنھیں وہ غریبوں کا خون چوسنے والا قرار دے کر ہدفِ ملامت بنا چکے تھے، اتحاد کرلیا اور اُدھر کروڑوں مفلوک الحال اور مظلوم کسانوں اور مزدوروں کی دردانگیز اور مسلسل چیخ و پکار کی طرف سے کانوں میں تیل ڈال لیا۔ اگر صوبجاتِ متحدہ کے کسان اپنے خون آشام آقاؤں کے خلاف اُن سے کچھ اپیل کرتے تھے تو وہ سختی کے ساتھ کہہ دیتے تھے کہ موتی لال نہرو اور کانگرس کمیٹیوں کو ثالث بنا کر معاملہ طے کرلو، حالاں کہ ان کانگرس کمیٹیوں پر زمیندار طبقہ کا بہت کچھ اثر تھا۔ ملک میں چاروں طرف کارخانوں میں، کانوں میں، ریلوے میں پیہم ہڑتالیں ہو رہی تھیں۔ اگر ہڑتال کرنے والے گاندھی جی سے کچھ درخواست کرتے تھے تو وہ ایسے شرائط پر امداد و سرپرستی کے لیے آمادگی ظاہر کرتے تھے جو بالکل ناممکن العمل ہوتی تھیں۔ اور جب وہ غریب اپنے مزدور طبقے کے لیڈروں کی قیادت میں جنگ کرنے پر مجبور ہوتے تھے تو گاندھی جی یا مزدوروں کی حمایت کے مدعی سوراج پارٹی والے کوئی اُن غریبوں کی حمایت میں زبان ہلانے کا بھی روادار نہیں ہوتا تھا۔

بہرحال دُنیا آگے بڑھ رہی تھی۔ یہاں تو گاندھی جی اپنی فرضی انقلاب آرائیوں کے کرتب دکھانے میں مصروف تھے اُدھر آئری انقلاب پسند حیات و موت کی ایک زبردست جنگ میں منہمک تھے کہ اپنے چھوٹے سے ملک میں حکومت برطانیہ کی مشینری کا ایک ایک کل پُرزہ چکنا چور کر کے رکھ دیں۔ بالآخر انھوں نے لائڈ جارج، اور چرچل جیسے لوگوں سے جبراً ایک آزاد ریاست کا دستورِ حکومت حاصل کر ہی لیا، لیکن اس کے باوجود بھی آئری جمہوریت پرست اپنے اُن احباب واعزا سے برسرِ پیکار تھے جو برطانیہ کے بنائے ہوئے دستورِ حکومت پر مفتون ہو گئے تھے۔ گاندھی جی تو اپنے چرخے کے گھوڑے پر سوار ہو کر ملک بھر میں تفریح فرما رہے تھے مگر ملک کے ذہین اور سمجھدار لوگ آئری جد و جہد سے سبق حاصل کرنے اور اس پر غور و خوض کرنے میں مصروف تھے۔ ابھی آئری جد و جہد کی صدائے بازگشت ختم نہ ہوئی تھی کہ چینی انقلاب کا شور ہندُستان کے اُبھرتے ہوئے نوجوان روشن دماغوں کو صلائے بیداری دینے لگا۔ چین کے پینتالیس کروڑ انسان، صدیوں کی گراں خوابی سے بیدار ہو رہے تھے۔ جمہوریہ چین کا قیام ۱۹۱۱ء ہی میں ہو چکا تھا۔ مگر اب بھی برطانوی امریکی اور جاپانی سامراج اپنی اجارہ داریوں اور فوجی نوآبادیات کے ذریعے جو ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی تھیں غارت گری اور تاخت و تاراج کا سلسلہ جاری کیے ہوئے تھے۔ گزشتہ چند سالوں سے البتہ سان یت سین کی قائم کی ہوئی کو۔مین۔تانگ پارٹی نے روس کی سویٹ حکومت کے نمائندوں کی مدد سے چین کے کروڑوں مزدوروں اور کسانوں کو بیدار اور منظم کرنا شروع کر دیا تھا۔ ۱۹۲۶ء کے شروع میں ان لوگوں کے متحدہ حملے نے مغرور انگریزوں کو اپنی ہانکو کی اجارہ داری سے دستبردار ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد ہی اور جگہوں پر بھی اُنھیں مسلسل پسپا ہونا پڑا۔ ہندُستان کا بیدار مغز طبقہ بہت بے چینی سے ان خبروں کو سُن رہا تھا۔ لوگ حیرت و استعجاب سے کہتے تھے کہ گاندھی جی کی اتنے عرصے کی قیادتِ مطلقہ کے دوران میں ہم لوگ ایک انگریز کو بھی ملک سے باہر نہ نکال سکے، حالاں کہ اتنے ہی زمانے میں آئرستان اور چین کے لوگوں نے ایسی حیرت انگیز کامیابی حاصل کرلی۔

سائمن کمیشن کے تقرر سے جس میں سب انگریز ہی انگریز تھے، اس باغیانہ جوش وخروش کو اور تقویت حاصل ہوگئی۔ لبرل اور سوراجی۔ خواص اور عوام سب کے سب مقاطعے کی مہم شروع کرنے کے لیے دوش بدوش کھڑے ہو گئے اور زبردست جلوسوں کی صورت میں گشت کرنے لگے۔ تھوڑے ہی دن میں پنڈت جواہر لال نہرو بھی اپنا یورپ کا دورہ ختم کرکے ہندستان واپس آگئے۔ اُنھوں نے لندن، برلن اور ماسکو میں اشتراکیت کا درس حاصل کیا تھا اور عوام میں انقلاب برپا کرنے کی ترکیبوں سے بھی واقفیت بہم پہنچالی تھی۔ وہ ۱۹۲۷ء کی مدراس کانگرس میں اس عزم کے ساتھ شریک ہوئے کہ برطانوی سامراج کی قوتوں کے خلاف جو ہندستان میں اپنے قدم جمائے ہوئے ہیں ایک نیا محاذ قائم کریں۔

اُن کی ابتدائی کامیابیاں بے حد امید افزا تھیں۔ اُنھوں نے کانگرس کو اس پر آمادہ کرلیا کہ سامراج کے خلاف یورپ میں جو لیگ قائم ہوئی ہے اُس کی ہم نوا ہو جائے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ چین کو مبارکباد دینے اور زبردست سامراجی طاقتوں کے شرانگیز مقاصد کی ملامت کے متعلق زوردار قراردادیں اُنھیں کی ایما سے منظور ہوئی تھیں۔ مکمل آزادی کے نصب العین کے لیے کانگریس کی تائید حاصل کرلینا یقیناً اُن کی ایک شاندار کامیابی تھی۔ اُنھوں نے اِتنے ہی پر بس نہیں کی بلکہ جمہوری کانگرس کی صدارت بھی کی اور حاضرین کو سمجھایا کہ عوام میں جمہوری ذہنیت پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، گاندھی جی نے ہوشیاری سے اس غیر متوقع طوفان کے سامنے ماتھا ٹیک دیا۔ مگر یہ سیاست برتی کہ کانگرس کے پرانے گرگوں کے ساتھ ایک آل پارٹیز کانفرنس بنانے میں اس توقع پر شامل ہوگئے کہ اس کانفرنس کی محنتوں کا جو کچھ نتیجہ برآمد ہوگا اس کے باعث اُن کے لیے فضا ایسی موافق ہو جائے گی کہ وہ پھر اُسی نقشے کی طرف لوٹ سکیں گے جسے اُنھوں نے نہایت جانفشانی سے تیار کیا تھا۔

نوجوان نہرو کی پارٹی نے بھی جلد ہی آزادی کے اِس نئے مسلک کی تشریح وتوضیح شروع کردی۔ جیسا کہ گاندھی جی نے ۱۹۳۰ء کی کانگرس میں بیان کیا تھا کانگرس کے دستور میں سوراج کی مفہوم کی تعریف وتعیین نہیں کی گئی تھی تاکہ حسب موقع اس کی تاویل "اندرون سلطنت" یا "بیرونِ سلطنت" جیسی ضرورت ہو بعد میں کرلی جائے۔ آزادی کے نصب العین نے کانگریس کو پابند کردیا کہ وہ ایک ایسے آزاد دستور کے لیے جدوجہد کرے جو برطانوی پنجوں کی گرفت سے بالکل باہر ہو۔ اس قسم کے تمام مباحثوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کردینے کے خیال سے نئی پارٹی نے چاہا کہ آزادی کے مفہوم کو "برطانیہ عظمیٰ سے مکمل قطع تعلق" قرار دے کر متعین کرلیا جائے اب اگر آزادی برطانوی اقتدارِ اعلیٰ کے ماتحت مطلوب نہیں ہے تو پھر ہندوستان کے عوام کو اپنے ملک میں غیر مشروط اور مکمل اقتدار ملنا چاہیے۔ گویا اقتدار چوٹی کے چند افراد کے ہاتھ سے منتقل ہوکر بالکل عوام کے ہاتھ میں آجانا چاہیے۔ محض یہی نہیں بلکہ آئری انقلاب سے سبق حاصل کرکے اس نئی پارٹی نے لازمی طور پر اس کا بھی عہد کیا کہ اقتصادی اور سماجی مساوات کی بنیاد پر ہندوستانی سوسائٹی کی ازسرِنو تشکیل کی جائے۔ اس ملک کو مٹھی بھر راجاؤں، نوابوں، کارخانہ جات کاشت کے برطانوی مالکوں، اور ہندوستانی زمینداروں کی ملکیت نہیں، بلکہ یہاں کے اُن کروروں افراد کی ملکیت ہونا چاہیے جو محنت مزدوری کرتے ہیں۔ ہر قسم کی پیداوار کے وسائل، ان کی تقسیم اور تبادلہ، معدنیات، کارخانے، بینک، ریلوے غرض کہ ہر چیز پر بجائے چند برطانوی اور ہندوستانی افراد یا کمپنیوں کے کروروں عوام کی نمائندہ قومی حکومت کا اختیار وقبضہ ہونا چاہیے۔

لہٰذا اب 'آزادی' اور 'درجۂ نوآبادیات' کی بحث محض ایک سیاسی نظریہ یا فلسفیانہ خیال آرائی کی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ دستور نوآبادیات کو آزادی کی راہ کی عارضی منزل بھی نہیں قرار دیا جاسکتا۔ دونوں کے راستے بالکل جُدا جُدا ہیں۔ جو لوگ موجودہ سماجی اور اقتصادی نظام کو جس میں زمین، کارخانے، اور بینک وغیرہ ذاتی ملکیت ہوتے ہیں، قائم رکھنا چاہتے تھے وہ طبعاً اس کے خواہش مند تھے کہ تاج برطانیہ کے سائے میں مزدور پیشہ افراد کی جمعیت کو بہ دستور ہدفِ انتفاع بنائے رکھا جائے، بلکہ ممکن ہو تو اس قسم کی جلب منفعت کو اور ترقی دے دی جائے۔ برعکس اس کے، جو لوگ چاہتے تھے کہ عوام کو ان کے مظالم سے نجات دلا کر اقتدارِ اعلیٰ ان کے ہاتھوں میں دے دیا جائے، وہ اس پر مُصر تھے کہ بیرونی حکومت کے ظالمانہ اقتدار سے مکمل طور پر رہائی مِل جائے تاکہ پورے سماجی نظام کو منقلب کرکے مظلوموں کے مفاد کے مطابق اس کی ازسرِنو تشکیل کی جائے۔ طرفین کے اس بنیادی اختلاف کو کلکتہ کانگرس کے موقع پر مسٹر نمبکار نے ایک ترمیم پیش کرکے اور تقویت دے دی۔ موصوف نے نہرو رپورٹ

کوحسب ذیل وجوہ کی بنا پر قطعاً ناقابل قبول قرار دیا :-

"(۱) مجوزہ اسکیم درجۂ نو آبادیات کے قیام کے ذریعے بورژوا (متوسط) طبقے کو برطانوی سامراج سے مفاہمت کا موقع دیتی ہے جس کے باعث حاصل شدہ حقوق، زمینداری، جاگیرداری اور سرمایہ داری کا تحفظ اور عوام کے مفاد کی قربانی بہ دستور جاری رہیگی۔

(۲) والیان ملک کے حقوق کو تسلیم کرکے یہ اسکیم ایک ایسے ظالمانہ طرز حکومت کو دوام بخشنا چاہتی ہے جو لازماً موجودہ جلب منفعت کو جاری رکھیگی۔

(۳) غیر ملکی سرمایہ ہندستان کے وسائل یعنی آدمیوں اور مادی چیزوں پر تصرف کرکے جس طرح جلب منفعت کرتا ہے اُس کو یہ اسکیم تسلیم کرتی ہے اور اس کا تحفظ کرتی ہے۔

(۴) یہ اسکیم ذاتی اور نجی جائدادوں کی ملکیت کے حقوق تسلیم کرنے اور ان کے قیام کی ضمانت کرتی ہے جو قابل اعتراض ذرائع سے حاصل کی گئی ہیں اور اس طرح عوام کو ہمیشہ ہدف انتفاع بنائے رکھنا چاہتی ہے۔

(۵) یہ اسکیم بیرونی قرضہ جات کی ادائگی کی ضمانت کرتی ہے۔

(۶) یہ اسکیم ملک کی مسلح فوجوں کو ایک ایسی کمیٹی کے زیر اقتدار رکھ کر جس میں ابتداءً کچھ برطانوی افسر بھی ہوں گے، ملک کے عوام کو اپنے تحفظ کے پیدائشی حقوق سے محروم کرتی ہے۔

(۷) یہ اسکیم شہنشاہ کے نامزد کیے ہوئے گورنر جنرل اور گورنر کو انتظامی اختیارات، نیز حق نامنظوری دینے کی تجویز کرتی ہے جو عوام کو اُن کے پیدائشی حق حکومت سے محروم کرنے کے مرادف ہے۔

لہٰذا کانگرس یہ اعلان کرتی ہے کہ اس کا نصب العین مکمل قومی آزادی حاصل کرنا ہے جو سامراج سے آزاد، سیاسی، اقتصادی، اور سماجی مساوات کی بنیادوں پر قائم ہو۔"

یہ سب کچھ جو ہو رہا تھا گاندھی جی کے لیے نہایت کلفت و اذیت کا باعث تھا۔ ایک زمانہ ایسا بھی ضرور تھا کہ وہ سارے ملک میں انقلابی بنے پھرتے تھے اور انھوں نے عوام کو "رام راج" اور "دھرم راج" کا معتقد بنا کر انھیں اپنے پیچھے لگا لیا تھا۔ مگر اب وہ زمانہ نہیں تھا۔ اب ملک میں ایک نئی پارٹی وجود میں آگئی تھی ـــــ ایسی پارٹی جو جمہور ہند کے لیے اقتدار مطلق حاصل کرنے کا عہد کر چکی تھی۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ اس پارٹی کا کوئی اثر نہ ہو، مدراس میں اس نے ابتدائی کامیابی حاصل ہی کرلی تھی۔ یہ پارٹی نومبر ۱۹۲۸ء میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی دہلی میں نہرو رپورٹ کی بھی دھجیاں اُڑا چکی تھی اور برطانیۂ عظمیٰ سے مکمل قطع تعلق کے بارے میں اپنے ریزولیوشن پر اکثریت کی تائید بھی حاصل کر چکی تھی۔ گاندھی جی دیکھ رہے تھے کہ موجودہ نظام کو برقرار رکھنے میں میں نے عمر بھر جتنی کچھ جد و جہد کی ہے وہ سب ان نوجوانوں کی نئی پارٹی کے ہاتھوں خاک میں ملا چاہتی ہے۔ مسٹر نمبکار کو تو اشتمالی کہ کر مردود ٹھہرایا جاسکتا تھا۔ مسٹر ایس۔ آئنگر کے سامنے کوئی مبہم سا ضابطہ پیش کرکے اُنھیں بِلا لیا جاسکتا تھا۔ مگر مسٹر جواہرلال نہرو جو کچھ کہتے تھے واقعی وہی کرنا بھی چاہتے تھے۔ اب اگر وہ اپنے اس مطالبے میں کہ سلطنت برطانیہ سے مکمل طور پر تعلقات منقطع ہوجائیں اور ہندستان کے عوام کے ہاتھوں میں اقتدار اعلیٰ منتقل کردیا جائے، کانگرس کو پہلے کی طرح اپنا ہم نوا بنا لیتے ہیں تو گاندھی جی کو وائسرائے ـــــ بلکہ وزیر اعظم برطانیہ ـــــ سے مبہم حقوق اور چھوٹی چھوٹی مراعات کے متعلق گفت و شنید کرنے کی گنجائش کہاں باقی رہتی ہے۔ نیز یہ کہ اگر جواہرلال نہرو کو اس کا موقع دے دیا جاتا ہے کہ وہ کانگرس کو اشتراکی نصب العین ـــــ لوگوں کے حاصل شدہ حقوق کی مکمل تباہی ـــــ کا پابند بنالیں تو گاندھی جی کو اس کی گنجائش کہاں رہ جائیگی کہ وہ والیانِ ریاست، زمینداروں اور تعلقہ داروں سے اس قسم کا لین دین کرسکیں کہ تم ہمارے چرخے کے پروگرام میں مدد دو ہم تمہارے ان حقوق کو جو تمھیں اپنی رعایا کی ذات و زمین پر حاصل ہیں تسلیم کرتے رہیں گے۔ اس کے علاوہ یہ کہ گاندھی جی اُن دولت مند تاجروں اور کروڑپتیوں کو جو اُنھیں اپنے طبقاتی مفاد کا زبردست حامی سمجھے ہوئے تھے کیا مُنہ دکھاتے اگر وہ کانگرس کو اس کا موقع دے دیتے کہ وہ اِن سرمایہ داروں کے بجائے ان کے کارخانوں کے کروڑوں غلاموں کے ہاتھ میں اقتدار دے دے۔

معاملہ بالکل صاف تھا۔ گاندھی جی کی عمر بھر کی کمائی غارت ہو رہی تھی۔ ان کی ساری عمر موجودہ نظام حکومت کے قیام و استحکام کی کوشش

کرتے گزری تھی، خواہ جنوبی افریقہ میں ہو یا ہندوستان میں۔ جنگ بوئر کے موقع پر وہ یونین جیک کی خدمت میں مصروف رہے۔ اگر زولوں نے گورے چمڑے والوں کے جگر خراش مظالم سے تنگ آکر بغاوت کی تو اُنھیں اپنے اور اپنے متبعین کی خدمات کو ظالم حکومت کے دست تصرف میں دیدینے میں کوئی باک نہ تھا۔ اُن کا عدم تشدد کا عقیدہ بھی اُنھیں جنگ میں برطانیہ کے لیے ایک لڑنے والی فوج کی تنظیم میں سرگرم عمل ہونے سے مانع نہ ہوا۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ تحریک ترک موالات شروع کرنے کے سلسلے میں بطور الٹی میٹم جو خط اُنھوں نے وائسرائے کو بھیجا تھا (۲۲ رجون ۱۹۲۰ء) اسی میں اپنے اس غیر متزلزل عقیدے کا اظہار کیا تھا کہ وہ موجودہ زمانے کے تمام دستوروں میں سب سے بہتر برطانوی دستور حکومت کو سمجھتے ہیں۔ اگر ۱۹۲۲ء میں اُنھیں وائسرائے کی کوٹھی میں براجمان ہونے کے بجائے جیل میں بند ہونا پڑا تو اس میں گاندھی جی کا قطعاً کوئی قصور نہ تھا۔ بہرحال اس قید و بند نے اُن کے مزاج میں کسی قسم کی تلخی یا برطانوی نظامِ حکومت سے کسی قسم کی منافرت نہیں پیدا کی۔ چار سال تک چرخے کر انقلابِ ذہنی کی کوشش کرتے کرتے غالباً ان کے دِل میں تاجِ برطانیہ سے تعلقات استوار رکھنے کے جذبات میں کچھ اور زیادہ شدت و استحکام پیدا ہو گیا ہو گا۔ جیسے جیسے ان کے قدم جمتے جاتے تھے اور فضا میں حرارت پیدا ہوتی جاتی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ اُسی مناسبت سے وہ سلطنت برطانیہ کو اور زیادہ اپنا ملجا و ماویٰ سمجھتے جاتے تھے، اور ان کا یہ خیال ترقی کرتا جاتا تھا کہ اگر اندرونی امن اور بیرونی حملوں سے حفاظت کی کوئی صورت ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ برطانیہ کے دامن سے وابستہ رہا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ اُنھوں نے "شیطانی نظامِ حکومت" کے خلاف بہت تلخ و تند الفاظ بھی استعمال کیے تھے مگر یہ دراصل اس دل میں بسی ہوئی "ملوکیت پرستی" کے محض ظاہری نقاب ہی تھے۔ اب جو اُنھوں نے نئی پارٹی کے صور کی آواز سُنی تو بے حد گھبرائے کیونکہ وہ محسوس کر رہے تھے کہ نئی پارٹی عزمِ صمیم کر چکی ہے کہ برطانوی سامراج کو سرزمین ہند سے جڑ سے اُکھاڑ پھینکا جائے۔ یہ دیکھ کر کہ اس تباہ کاری کی زد میں وہ زبردست سرمایہ دار طبقہ —— راجگان، زمینداران، مالکانِ مل اور کروڑپتی —— بھی آرہا ہے جو ان کے پسندیدہ سماجی نظام کا سب سے زبردست پشت پناہ ہے تو وہ اور بھی بدحواس ہو گئے۔

اگر مسٹر جواہر لال نہرو کلکتہ کانگریس میں کامیاب ہو جاتے تو گاندھی جی کو قومی مجلس سے ہمیشہ کے لیے کنارہ کش ہو جانا پڑتا۔ عمر ہا عمر کی جمی ہوئی چٹانیں ریزہ ریزہ ہو جاتیں نہ مقدس ژولیدہ بیانیوں کی گنجائش رہتی نہ فرضی بغاوت کے نعروں کی —— مذہبی ضوابط کی جگہ وقت کے سنگین حقائق کی کارفرمائی ہوتی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ نمائشی زور شور والے الٹی میٹموں کی گنجائش نہ رہتی جن کے ذریعے ذلیل سمجھوتے اور غلامانہ لین دین ہو سکتی۔ گاندھی جی نے سوچا کہ اس وقت چُوکے تو گئے، پھر موقع نہیں آنے کا۔ لہٰذا فوراً کلکتہ روانہ ہو گئے —— محض سامراجی قزاقی کی نہیں بلکہ جاگیرداروں کے مظالم کی، زمینداروں کے استحصال کی، اور سرمایہ داروں کے ناجائز انتفاع کی خدمت و حمایت کے لیے!

ایک خطرہ اور تھا جو غالباً زیادہ شدید قسم کا تھا۔ آزادی کے نظریہ کے مفہوم میں عوام کی تنظیم اور عوام کی معرکہ آرائی کے اصلی انقلابی پروگرام کے عناصر بھی شامل تھے۔ اگر نئی پارٹی واقعی عزم کر چکی ہے کہ اقتدار اعلیٰ کو تاجِ برطانیہ سے منتقل کر کے ہندوستان کے کروڑوں عوام کے ہاتھوں سپرد کر دینا ہے، تو اس کے لیے ناگزیر ہے کہ اس قسم کا کوئی پروگرام تیار کرے جس کے ذریعے حق قانون سازی اور حکومت کی ذمہ داری متوسط اور متوسط ادنیٰ طبقوں سے نکل کر اُن کروڑوں عوام کے ہاتھوں میں آجائے جو کھیتوں، کارخانوں، اور صنعت گاہوں میں محنت و جفاکشی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ گاندھی جی کا امن پسندانہ پروگرام، جو بظاہر ترک موالات لیکن حقیقتاً سچی اطاعت کا پروگرام تھا، غریب کسانوں، کاروباریوں، اور دوکانداروں کو محض مسحور کرنے کے لیے تھا۔ لیکن اگر کروڑوں عوام جان پر کھیل کر کوئی ایسی جنگ شروع کر دیتے ہیں جس میں مفاہمت و مصالحت کی گنجائش ہی نہیں اور جو محض بیرونی غلبہ ہی سے نہیں، بلکہ اندرونی لوٹ کھسوٹ سے مکمل نجات کے لیے، اور اونچے طبقے والوں کے بجائے خود اپنے ہاتھ میں قوتِ اقتدار کی باگ رکھنے کے لیے، لڑی جائے، تو یقیناً ایسی جنگ کی قیادت خود اُنھیں عوام کے ہاتھ میں ہو گی۔ لہٰذا اس نئے پروگرام کی دو ہی شکلیں ہو سکتی ہیں۔ کروڑوں کسان عدم ادائگی لگان و محاصل کی مہم شروع کر دیں۔ اور کارخانوں، صنعت گاہوں، کانوں، اور کارخانہ جات کاشت کے مزدور غیرملکی اور ملکی منتفعین کے خلاف عام ہڑتال کر دیں، موقع و ضرورت کے لحاظ سے جنگ کی آئندہ تفصیلی شکلیں خود بخود متعین ہوتی جائیں گی۔

یہ نیا پروگرام محض نظری خیال آرائی تک محدود نہیں رہا۔ ۱۹۲۸ء کے تیز رفتار واقعات میں اس کی جھلک نظر آہی چکی تھی۔ اسی سال بمبئی کے کپڑے کی ملوں میں پہلی عام ہڑتال شروع ہو چکی تھی جو محض مزدوروں کی بےمثل جسارت و جانبازی کی بدولت کانگرس کی بے رحمانہ سرد مہری اور حکومت کے خونخوارانہ جبر و تشدد کے باوجود مسلسل چھ مہینے تک جاری رہی۔ مالکان مل اور حکومت کے متحدہ حملوں نے اُنھیں مجبور کر دیا تھا کہ اپنی حفاظت کے لیے خود اپنی فوج منظم کریں۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اُن کے عزم و استقلال نے اُن کے آقاؤں کو، نیز گورنمنٹ کو، گفت و شنید کا سلسلہ جاری کرنے اور ان کی جائز شکایات کے متعلق تفتیش کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اکتوبر میں یہ ہڑتال ختم ہو گئی، مگر اس نے ایک زبردست نظیر قائم کر دی۔ عملی سیاسیات میں ایک شہر نہیں بلکہ تمام شہروں کی ہڑتال کو مزدوروں کی جنگ آزادی کے ایک موثر حربے کی حیثیت سے جگہ ملتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

برما کے دیہاتی باشندوں نے آراضیات کے متعلق حکومت سے نمایاں قسم کی جد و جہد شروع کر دی تھی۔ یہ مہم حکومت کے حد سے بڑھے ہوئے محاصل کی عدم ادائگی سے شروع کی گئی تھی، لیکن حکومت کی طرف سے شدید فوجی حملوں کے باعث برما کے مایوس کسان ایک قسم کی باقاعدہ جنگ پر اُتر آئے تھے۔ مشرق بعید کے صوبوں میں کافی بڑے رقبے میں یہ لڑائی تیزی سے پھیلتی چلی گئی اور چاول پیدا کرنے والے اضلاع کے جنگلوں اور مرطوب مقامات میں برابر ہمت و استقلال کے ساتھ جاری رہی۔

اسی قسم کی بے اطمینانی و برافروختگی کی لہر ۱۹۳۰ء میں بھی اس ملک کے سارے کسانوں میں دوڑ گئی کہیں برما کی یہ چنگاری سارے ملک کے بارود خانے کو آگ نہ لگا دے؟ صرف کانگرس لیڈروں کی منافقت اور دورنگی ہی کے باعث یہ انتہائی مظلوم کسان پچھلے سالوں خاموش رہ گئے تھے مگر تھوڑے تھوڑے دنوں کے بعد حکومت کی طرف سے مالگذاری کا بندوبست بدلتا رہتا تھا۔ یہ چیز سارے گجرات میں نیز اور صوبوں میں بھی کسانوں کو اُبھارنے میں بہت معین ثابت ہوئی۔ گاندھی جی کی رضامندی سے مسٹر وٹھل بھائی پٹیل بردولی گئے کہ اس ناگزیر شورش کو ایک چھوٹے سے علاقے ہی تک محدود کر دیا جائے۔ مطلب یہ تھا کہ اس قسم کے ہنگامے پھیلنے نہ پائیں۔ اسی بنا پر سوامی کمارنند نے کلکتہ کانگرس کے مجلس مضامین میں بردولی کی مہم کو ایک حوصلہ فرسا ناکامی سے تعبیر کیا تھا۔

مہاتما گاندھی کی خوش قسمتی تھی کہ جب وہ منظر پر پہنچے تو ان واقعات کو بڑی اہمیت کی نظروں سے دیکھا جا رہا تھا۔ بردولی کی ناقابل اعتنا کامیابی کو اتنا کچھ بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا تھا کہ جیسے کسی عصر آفریں فتح کا ذکر کیا جاتا ہے۔ بمبئی کے مزدوروں کی جنگ البتہ بعض بعض جگہ مناسب نا محرم دیکھی جا رہی تھی۔ لیکن کھدر پوش نمائندوں کی اکثریت اسے نسبتاً معمولی واقعہ سمجھتی رہی، اور اس کے نتیجہ خیز ہونے کے متعلق مشکوک تھی۔ کیا جنگجو ہڑتالیوں نے پولیس اور فوج کے قاتلانہ حملوں کی مدافعت میں اپنے ہاتھوں اور ڈنڈوں کو استعمال نہیں کیا؟ یہ صریحاً عدم تشدد کے مقدس مسلک کے خلاف ہے! اور کیا جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس جیسے انتہا پسند لیڈروں نے بھی ہڑتالیوں کی محض زبانی تائید و حمایت پر اکتفا نہیں کی؟ کیا ان لوگوں نے بھی ہڑتالیوں کی مدد کے لیے ایک پیسہ چندہ کیا ہے؟ اس موضوع پر کانگرس میں ریزولیوشن ضرور پاس ہونا چاہیے مگر بس اس سے زیادہ کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ برما والی بغاوت کے متعلق، جو ان میں سب سے زیادہ اہم واقعہ کی حیثیت رکھتی تھی، پیچھے بیٹھنے والوں میں کچھ سرگوشیاں ہو رہی تھیں "یقیناً یہ نہایت شاندار اور زبردست جد و جہد ہے، مگر ہے تو آخر ایک طرح کی مسلح بغاوت ہی، اور کانگرس کے امن پسندانہ مسلک کے بالکل ہی خلاف طریقہ پر چلائی جا رہی ہے" لہٰذا اسے قابل تقلید مثال کے بجائے خطرہ کا ایک نشان سمجھا جا رہا تھا۔

گاندھی جی یہ دیکھ کر بہت مسرور تھے کہ اُن کے اصول حیات —— عدم تشدد —— کے متعلق لوگوں کی خوش عقیدگی میں کوئی فرق نہیں واقع ہوا اگر بعض لوگ اسے محض ایک سیاسی چال کی حیثیت سے اختیار کیے ہوئے ہیں تو بھی کوئی ہرج نہیں۔ آخر یہ تھوڑے سے ٹر ٹر کرنے والے لوگ بھی کم از کم اس مسلک کے ظاہری شعائر کا تو لحاظ رکھتے ہی ہیں . . . . کھدر کی سفید وردی پہنتے ہیں! یہی بہت ہے۔ گاندھی جی اپنی قدرت آفرینیوں کے ذریعے ان محکم اور غیر متغیر بنیادوں پر ہر قسم کی عمارت تیار کر سکتے تھے۔!

اب ہم اصل کام کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

اس وقت گاندھی جی کو دو کام کرنے تھے۔ اول تو یہ کہ "مکمل آزادی اور پھر برطانیہ سے قطع تعلق" کے خطرناک نصب العین کے بجائے پھر سے "درجۂ نوآبادیات" کا نصب العین اختیار کر لیا جائے۔ دوسرے یہ کہ چین جیسے بیرونی ممالک کی، نیز اسی ملک میں بمبئی کے ہڑتالیوں، بنگال کے انقلاب پسندوں اور برما کے باغیوں کی پیش کی ہوئی نظیروں کی طرف سے عوام کے اثر پذیر دماغوں کو ہٹا کر اپنی طرف مائل کر لیا جائے۔ ان دونوں کاموں کو شدید مخالفت کا سامنا کر کے انجام دینا تھا۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کاموں کا بیک وقت انجام دے لینا کسی لیڈر کے لیے بھی خواہ وہ کتنا ہی ہوشیار اور ممتاز کیوں نہ ہو ناممکن ہے۔ لیکن کیا شری رام چندر جی نے اُس آسمانی کمان کو نہیں توڑ دیا تھا جسے دوسرے بڑے بڑے بلوان راجہ ذرہ برابر موڑ بھی نہ سکے تھے۔ بہرحال گاندھی جی کے لیے سب کچھ ممکن تھا، جو کسی سے نہ بن پڑتا ہو وہ گاندھی جی کر دکھائیں!

کانگرس ایک مرتبہ "سلطنت برطانیہ سے مکمل قطع تعلق" کا عہد کر چکی تھی۔ اب اس کے بعد دسمبر ۱۹۲۸ء میں پھر سے "درجۂ نوآبادیات" کو بحیثیت نصب العین منوا لینا یقیناً کارے دارد تھا۔ خود گاندھی جی محسوس کر رہے تھے کہ "درجۂ نوآبادیات" اور "مکمل آزادی" کے مسئلہ پر یوں سیدھے سیدھے انھیں کامیابی نہیں ہو سکیگی۔ اگر واضح طور پر یہ مسئلہ عوام کے سامنے رکھ دیا گیا تو انھیں "خطِ غلامی" پر "منشورِ آزادی" کو ترجیح دینے میں کوئی تکلف نہ ہوگا۔ لہٰذا گاندھی جی اس ضرورت کے احساس پر مجبور ہوئے کہ اصل بحث پر حشو و زوائد کی کافی تہیں چڑھا دی جائیں۔ اس کے لیے انھوں نے انتہائی مستعدی اور چالاکی سے کام لے کر یہ کیا کہ اپنی اصلی قرارداد کے ساتھ مندرجہ ذیل دفعات کا دُم چھلا لگا دیا جن کا مفاد یہ تھا کہ اگر حکومت نے دو سال کی معینہ مدت میں نہرو رپورٹ کو منظور نہ کر لیا تو پُرامن ترک موالات کی مہم شروع کر دی جائے گی۔ گاندھی جی نے سوچا کہ اس طرح حکومت کے خلاف ایک نئی مہم کا جھنڈا بلند کر کے کانگرس کو "درجۂ نوآبادیات" کا نصب العین تسلیم کرنے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے ورنہ اور کوئی صورت نہیں۔

اس قسم کے ریزولیوشن کا پیش ہونا ہی اُن کثیر التعداد مندوبین میں سے بیشتر افراد کے لیے جو "مکمل آزادی" کا عہد کرنے کے لیے کلکتہ میں جمع ہوئے تھے، ایک عجیب اضطراب و سراسیمگی کا باعث ہوگیا۔ اس سال کے کانگرسی جلسوں میں اس کا خواب و خیال تک نہ تھا کہ کوئی ایسا الٹی میٹم پیش کیا جائیگا اور اگر حکومت نے نہ مانا تو ایک نئی مہم شروع کر دی جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ مندوبین کی اکثریت غلامی کے اس تلخ گھونٹ کو حلق سے اُتارنے پر رضامند نہ تھی مگر گاندھی جی تو کہہ رہے تھے کہ نہرو رپورٹ خود ہی قوم کو سندِ آزادی عطا کرتی ہے، یقیناً صحیح ہی، کیونکہ مسٹر جواہر لال نہرو اور مسٹر سبھاش چندر بوس کو بالکل آزادی تھی کہ سارے ملک میں غیر مشروط آزادی کا پورے زور و شور سے پروپگنڈا کریں مگر حکومت کے خلاف پُرامن بغاوت کی قیادت گاندھی جی کے سوا کون کر سکتا ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ پرلے درجے کے انتہا پسند لیڈروں نے بھی گاندھی جی سے اس چار سال کی مدت میں بارہا اس کی التجائیں کی تھیں کہ وہ گوشۂ عزلت سے باہر تشریف لائیں اور حکومت کی روز افزوں قوتوں کے مقابلے میں ایک عام مہم کی قیادت کریں؟ گاندھی جی کی ۱۹۲۰-۲۱ء کی ساری کامیابیوں اور فتوحات کا نقشہ نئی آب و تاب کے ساتھ لوگوں کی نظروں کے سامنے پھر گیا۔ پچھلے چار سال کا خود پرست خبطی، اب ایک مقدس مجاہد نظر آنے لگا۔ بزدلی کی ذلیل پسپائی فراموش کر دی گئی۔ لوگ سوچنے لگے کہ یہی گاندھی جی تو ہیں جنھوں نے احمد آباد کانگرس کے موقع پر لارڈ ریڈنگ جیسے بیٹھک باز انسان کو گفت و شنید کا سلسلہ شروع کرنے پر مجبور کر دیا تھا پھر یہ کہ آخر یہی گاندھی جی تو ہیں جنھوں نے ملک کو فتح و کامرانی سے قریب قریب ہم کنار کر دیا تھا!

ایک مقدس جنگ کے خواب نے بہتیرے مندوبین کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا اور ان کے ہاتھوں سے سیاسی اصول کا مضبوط دامن چھوٹ گیا۔ گاندھی جی نے اُسے بالکل واضح طور پر بتا دیا تھا کہ اگر ان کو اس مہم کی قیادت کے لیے کہا گیا تو وہ صرف اسی صورت میں کر سکیں گے کہ اُن کے شرائط بخوشی تسلیم کر لیے جائیں۔ اس ہونے والی جنگ کی سپہ سالاری منظور کرنے کے لیے گاندھی جی قیمت کیا طلب کر رہے تھے؟ "درجۂ نوآبادیات" —— حکومت برطانیہ —— پر ایمان! —— مندوبین نے سوچا "چلو دے دیں، مگر گاندھی جی کو اچھی طرح پابند کر لیں کہ موقع پر قیادت سے گریز نہ کر سکیں" تاہم دو سال کی مدت بہت ہی ناقابلِ برداشت سی معلوم ہوتی تھی۔ معلوم نہیں اتنے زمانے میں کیا کچھ ہو جائے۔ مندوبین نے سوچا کہ اس ندرت طراز درویش کے لیے بھاگ نکلنے کی کوئی راہ نہ رہنے دیں لہٰذا انھوں نے گاندھی جی کو مجبور کیا کہ مدتِ معینہ دو سال کے بجائے ایک سال رکھی

جائے۔ گاندھی جی نے بادل ناخواستہ منظور کر لیا۔ اس طرح سے سول نافرمانی کے نفیس دانے دیکھ کر بیشتر مندوبین درجہ نو آبادیات کے دام میں گرفتار ہو گئے۔

اسی ریزولیوشن نے گاندھی جی کے لیے دوسرے کام کی انجام دہی کی بھی راہیں کھول دیں۔ کانگرس والوں کا بلکہ ساری قوم کا دماغ ضرورت سے زیادہ عرصے تک بیرونی انقلابات اور اندرونی ہنگاموں پر غور و فکر کرنے کے لیے آزاد رہا تھا۔ جس کی وجہ سے ان میں کسی ایسے جارحانہ پروگرام کی تڑپ پیدا ہو گئی تھی جو جلد سے جلد ان کے لیے نئی زمین اور نیا آسمان پیدا کر دے۔ مگر جیسے ہی گاندھی جی نے ایک نئی مہم کی امید دلائی فوراً ان کی ساری توجہات اسی کو دہر مرض کی دوا سمجھنے پر مرکوز ہو گئیں۔ برما، چین یا آئرستان کے سے مسلح ہنگامے صریحاً غلط، بمبئی وغیرہ کی سی جارحانہ ہڑتالیں بالکل مہمل،۔ جسمانی، سماجی، ذہنی، اخلاقی، غرض کسی قسم کا تشدد، خواہ دشمنوں کے درندگانہ حملوں کی مدافعت ہی میں کیوں نہ ہو، قطعاً لایعنی۔ ہندوستان کے مقدس سماجی نظام کے ارکان اعظم یعنی زمینداروں اور والیان ملک کے خلاف عدم ادائگی محاصل کی مہمیں محض بے کار، تمام ناپاک انقلابی طریقوں کے مقابلے میں گاندھی جی نے اپنی عدم تعاون، سول نافرمانی، اور عدم ادائگی محاصل سرکاری کی رزق برق اسکیم پیش کی تھی۔ مگر ان زبردست حربوں کا استعمال عدم تشدد کے بیش قیمت اصول کے ماتحت ہی ہونا ضروری تھا! تمام غیر اخلاقی اور ناپاک قوانین توڑو۔ کسانوں سے عدم ادائگی محاصل کی زبردست مہمیں شروع کراؤ۔ مگر ایسے شرائط و حالات کے ماتحت اور اتنے محدود پیمانے پر کہ خیالی، لفظی، عملی، کسی قسم کے تشدد کی چھاؤں تک نہ پڑنے پائے۔ اپنے علاوہ اور کسی کی ہڈی نہ توڑو، کسی کا خون نہ بہاؤ۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ امن و امان —— لوگوں کے حاصل شدہ حقوق اور سلطنت برطانیہ کے قیام و دوام میں حکومت کے ساتھ تعاون کرو!

اس نئی جنگ نے اور گہرے پہلوؤں پر نہ مندوبین نے کوئی سوال کیا نہ کسی قسم کا بحث مباحثہ ہوا۔ اس ہونے والی مہم کی قیادت منظور کر لینے پر کانگرس کی تمام جماعتیں یک زبان ہو کر گاندھی جی کی تعریف و تحسین کرنے لگیں۔ کانگرس ایک بار پھر دام تزویر میں پھنس گئی! اس بڈّھ قسم کے ہنگامے کا مقصد محض یہ تھا کہ حکومت سے چند چھوٹی چھوٹی مراعات حاصل کر لی جائیں، اور اصلی انقلابی تحریکوں کا سر کچل دیا جائے۔ مگر انتہا پسند اور اعتدال پسند دونوں اپنی حماقت سے یہ سمجھ بیٹھے کہ اس کا مقصد ایک زبردست سلطنت کے پنجہ سے آزادی چھیننا ہے!

گاندھی جی کی کامیابی مکمل ہو گئی۔ انھوں نے ایک وار میں دو شکار کر لیے۔ پینتس کروڑ انسانوں کے نمائندوں کا سارا جوش و خروش ٹھنڈا کر دیا گیا تاکہ ساری قوم پانچ کروڑ غیر ملکیوں کی آہنی زنجیروں میں جکڑی رہے۔ کھدر پوش سیاسیین کے بے مغز سروں پر اس منحوس نعرۂ جنگ کا جادو چڑھا دیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ کانگرس پر ایک رجعت پسندانہ نصب العین اور ایک انقلاب دشمن طریق کار پھر سے مسلط کر دیے گئے۔ مندوبین کو ناک پکڑ کر پھر اسی جگہ لا کھڑا کیا گیا جہاں وہ ستمبر ۱۹۲۰ء میں تھے۔ آٹھ سال کا درمیانی وقفہ تقریباً نظر انداز کر دیا گیا عوام کے دلوں میں نئی امیدوں کی شمعیں روشن کر دی گئیں۔ خوش قسمتی سے کانگرس میں گاندھی جی کو پورے ایک سال کے لیے آزاد کر دیا گیا تھا کہ وہ اچھی طرح اپنے ہتھیار سج لیں، اور حکومت سے خوب اطمینان سے سودا بھی چکا لیں۔ اب اگلے باب میں ہم گاندھی جی کی نئی ارتقاً اور ۱۹۲۹ء کے نتیجہ خیز واقعات کا جائزہ لیں گے۔

بہتّروال باب

گفت وشنید

واقعات نہایت سرعت سے اپنی منتہا کی جانب بڑھ رہے تھے۔ تین چیزیں خاص طور پر نمایاں تھیں۔ اول یہ کہ انقلاب نے اب اور شدت کے ساتھ سر اُٹھایا تھا اور اب اس کی زد محض حکومت پر نہ تھی بلکہ اس وحشیانہ انتقاع پر بھی تھی عوام جس کا شکار ہو رہے تھے۔ دوسرے یہ کہ حکومت اس نئے حملے کا جواب انتہائی تشدد اور استبداد سے دے رہی تھی۔ تیسرے یہ کہ برما کے ہزاروں باشندے برطانوی گولیوں کا نشانہ بن رہے تھے۔ ہندوستان کے طول وعرض پر انتہائی سفاکانہ جبر و تشدد کا دور دورہ تھا۔ ان حالات میں کانگریس کے آرام پسند لیڈر برطانوی وائسرائے کے ساتھ بیٹھ کر درجہ نوآبادیات اور سلطنت کے اندر مساویانہ حقوق پر بحث آرائیاں کر رہے تھے۔

۱۶ دسمبر ۱۹۲۸ء کو انقلابیوں کی ایک جماعت نے لاہور میں ایک برطانوی پولس افسر مسٹر آئی۔ پی سانڈرس کو گولی ماردی کئی مہینے کے بعد قانونی کارروائی کے دوران میں سرکاری گواہ نے بیان کیا کہ لوگوں کا خیال تھا کہ لالہ لاجپت رائے پر اسی افسر نے وہ حملہ کرایا ہے، جو اُن کی موت کا باعث ہوا، لہذا لوگوں نے انتقاماً اسے مار ڈالا، اس قتل کے سلسلے میں لاہور میں بے تحاشا گرفتاریاں شروع کردی گئیں۔ ڈاکٹر انصاری اور چند دیگر ممتاز لیڈروں نے ۷ جنوری ۱۹۲۹ء کو ایک بیان شائع کیا جس میں طالب علموں کی اس بے محابا گرفتاری اور وحشیانہ اذیت دہی پر شدت کے ساتھ احتجاج کیا گیا تھا۔

۲۸ جنوری کو لارڈ اردن وائسرائے ہند نے لجسلیٹو اسمبلی کے سرمائی اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے ہندوستان کی صورت حال پر مفصل تبصرہ فرمایا پچھلے سال کے آخری حصہ میں بہت سے اہم جلسوں کے انعقاد اور مباحثوں کی گرماگرمی میں جو تند و تیز الفاظ استعمال کئے گئے اس کا ذکر کرنے کے بعد انھوں نے فرمایا۔

"لہذا ایسے موقع پر جبکہ طرفین میں اعتماد کی موجودگی بہت ضروری ہے، اور آپس میں باعزت طریقہ پر تبادلہ خیالات کرنا بہت اہم ہے، میں صاف طور پر دیکھ رہا ہوں کہ جب تک یہ صورت نہ ہو ——— اور اس کے ہونے کا کوئی امکان نہیں معلوم ہوتا۔ کسی مصالحت کا نتیجہ سوا مضرت کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس مصالحت کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ سارے ملک میں سول نافرمانی اور بدنظمی کا دور دورہ ہو جائے۔ یہ بالکل یقینی ہے کہ خواہ کتنی ہی گفت وشنید اور بحث ومباحثہ ہو اگر فریقین عناد و بدگمانی کے جذبہ سے متاثر ہو کر اس کام کو انجام دینا چاہیں تو کوئی کارآمد نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

میرے لئے یہ توقع بھی دشوار ہے کہ ہندوستان کے سیاسی افکار پر خواہ مخواہ کی بدگمانی کے جو بادل چھائے ہوئے ہیں وہ میری کسی تقریر سے چھٹ جائیں گے۔ مگر میں اس اسمبلی سے اور اس کی معرفت سارے ہندوستان سے پھر ایک بار کہتا ہوں کہ ۱۹۱۷ء کا یہ اعلان کہ اہل برطانیہ وہ سب کچھ کریں گے جو ایک قوم دوسری قوم کی مکمل سیاسی ارتقا میں مدد پہونچانے کے لئے کر سکتی ہے، اب بھی اپنی جگہ پر ایک پختہ عہد کی حیثیت سے قائم ہے۔ اور آیندہ بھی قائم رہے گا۔ نیز یہ کہ اس عہد کی کبھی بے حرمتی نہ کیجائیگی ——— چونکہ قول کے بہ نسبت عمل کو عموماً زیادہ نتیجہ خیز چیز سمجھا جاتا ہے لہذا میں اتنا اور کہوں گا کہ اگر مجھے یقین ہوتا کہ اہل برطانیہ اس معاہدے

سے دست کش ہو گئے ہیں تو آج میں آپ کے سامنے گورنر جنرل کی حیثیت سے یہاں نظر نہ آتا۔"

اس طرح سے تاج برطانیہ کے نمایندے نے نہایت مدبرانہ انداز میں کانگریس کے کلکتہ والے رزولیشن کو مسترد کر دیا۔ مگر اس تقریر سے کانگریس کے صدر پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بلکہ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اُنھوں نے ۲۹ رجنوری کو فرمایا "گفت وشنید کا دروازہ ہنوز بند نہیں ہے۔ باعزت طریقے پر آزادانہ تبادلۂ خیال کے لئے اب بھی کافی وقت ہے بشرطیکہ اس کی خواہش بھی ہو"

۳ رفروری کو بمبئی میں یہ افواہ پھیل گئی کہ بروودہ میں کوئی پُل بن رہا ہے اور اس پر بلی چڑھانے کے لئے پٹھان لوگ بچوں کو پکڑ پکڑ کر لے جا رہے ہیں۔ ان افواہوں سے مشتعل ہو کر ہندو مزدوروں نے پٹھانوں پر حملہ کر دیا۔ اُدھر بہت سے مسلمان، پٹھانوں کی حمایت پر آ گئے اور ایک زبردست فساد شروع ہو گیا، جو ۱۲ رفروری تک قائم رہا۔ سرکاری رپورٹ کے مطابق اس میں ۱۳۷ جانیں تلف ہوئیں اور ۸۳ ۷ آدمی مجروح ہوئے۔ لیکن یہ نام نہاد فرقہ وارانہ فساد، اصل میں مزدوروں کی بے چینی کے باعث نمودار ہوا تھا۔ گورنمنٹ کے ہوم ممبر نے اکرے رارلے صورت حال کا تجزیہ حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے:۔

"جیسا کہ اس ایوان کے اراکین کو معلوم ہے، بمبئی کے مزدور طبقے میں کچھ عرصے سے ایک بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی...... جو واقعات موجودہ فساد کا باعث ہوئے، انکی ابتدا اس ہڑتال سے ہوتی ہے جو ۷ ردسمبر کو اشتراکی لیڈروں کی قیادت میں تیل کی کمپنیوں میں ہوئی تھی ان کمپنیوں نے ہڑتالی مزدوروں کی جگہ جنمیں اکثر ہندو تھے، پٹھانوں کو کام پر لگا لیا تھا۔ اسکی وجہ سے پٹھانوں اور ہڑتالیوں میں کئی مرتبہ جھگڑے ہوئے۔ ۱۸ رجنوری کو اس عناد کے باعث جو پٹھانوں اور مل کے مزدوروں میں پیدا ہو چکا تھا مل والوں نے "ینو چا نال کے تین پٹھان چوکیداروں کو جان سے مار ڈالا" ان واقعات کو اُن کے صحیح تناظر میں دیکھنے کے لئے اتنا یاد رکھنا ضروری ہے کہ یہ تیل کی کمپنیاں تقریباً سب کی سب برطانوی ہیں اور برطانوی ایجنٹوں ہی کے ذریعہ چلائی جاتی ہیں۔ انھیں لوگوں نے ہڑتال کو ناکامیاب بنانے کے لئے ہڑتالی مزدوروں کی جگہ پٹھانوں کو بلایا تھا۔ لہذا مزدوروں کی اس ابتدائی بے اطمینانی اور اُس کے بعد کے جگر خراش فسادات کی ذمہ داری اخیر میں برطانوی تجار اور برطانوی حکومت ہی پر عاید ہوتی ہے۔

۴ رفروری کو حکومت نے "پبلک سیفٹی بل"، کو جو پہلی مرتبہ ایک ووٹ سے مسترد کی جا چکی تھی دوبارہ پیش کیا۔ اس بل کے پیش کرنے کے وجوہ بیان کرتے ہوئے ہوم ممبر نے کہا "یہ مسودہ جس اُصول کے ماتحت تیار کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ اس قانون کے ذریعہ گورنمنٹ غیر ملک سے آئے ہوئے اشتراکیوں یا نام نہاد اشتراکیوں کی مفسدانہ حرکات کا سدباب کر سکے...... ملک کے کارخانوں میں ناخواندہ اور جاہل مزدوروں کو اشتعال دے کر کلکتہ اور بمبئی میں ہلچل پیدا کی جاتی تھی۔ مزید برآں نہایت سرگرمی سے یہ کوشش کی جاتی تھی کہ ملک کے نوجوانوں کی تمام تحریکوں کو اشتراکیت کی راہ پر لگا دیا جائے"، اس کے بعد اُنھوں نے ان زبردست بدامنیوں کا تذکرہ کیا جو خونی ہڑتالوں، خونخوار حملوں، اور دوسرے شرمناک واقعات پر مشتمل تھیں اور جو پچھلے چند ماہ میں بمبئی اور کلکتہ کے صنعتی علاقوں میں رونما ہوئی تھیں۔

اس مسودہ پر تادیر نہایت جوش وخروش کے ساتھ مباحثہ ہوتا رہا۔ دیوان چمن لال نے ہوم ممبر کے جواب میں فرمایا کہ "یہ مسودہ گذشتہ اجلاس میں پیش کیا گیا تھا مگر منظور نہیں کیا گیا، چار ماہ گذر گئے مگر اب تک سماج کے تباہ و برباد ہو جانے کی قسم کی کوئی چیز رونما نہیں ہوئی ہے" پنڈت موتی لال نہرو نے اس بل کو ہندوستانی قومیت اور انڈین نیشنل کانگریس پر ایک صریح حملہ قرار دیا۔ اور اس کو ہندوستانی غلامی بل اور تحفظ نوکر شاہی بل سے موسوم کیا۔ اس مسودہ کی دوسری خواندگی کثرت آرا سے منظور ہو گئی۔ ۲ راپریل کو اسمبلی کے صدر مسٹر پٹیل نے ایک بیان میں گورنمنٹ سے یہ مطالبہ کیا کہ یا تو اس مسودہ کو میرٹھ والے مقدمے کے فیصل ہونے تک ملتوی کر دیا جائے یا اگر اسے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے تو میرٹھ والے مقدمے کو واپس لے لیا جائے۔ اور پھر اس مسودہ کے متعلق کارروائی شروع کی جائے۔ اُنھوں نے اس کی وجہ یہ بتلائی کہ یہ مسودہ قانون اور وہ مقدمہ جو ۳۱ ملزموں کے خلاف دائر کیا گیا ہے دونوں کی اصل بنیاد ایک ہی ہے۔ چونکہ گورنمنٹ نے ان میں سے کوئی صورت منظور کی لہذا صدر نے مختتم طور پر اس مسودہ کو بے ضابطہ قرار دے کر مسترد کر دیا۔ (۱۱ راپریل) بہرحال گورنمنٹ نے

پبلک سیفٹی بل کے ہم معنی ایک آرڈیننس جاری کردینے پر اکتفا کی۔

"ٹریڈ ڈسپیوٹ بل" (مسودہ قانون تنازعات تجارتی) ایک دوسرا خوفناک حربہ تھا جو گورنمنٹ نے ہندوستان کے مزدوروں کی تحریک کے سیلاب کو روکنے کے لئے ایجاد کیا تھا۔ یہ بل جو "تجارتی تنازعات کی تفتیش اور تصفیہ" کے لئے وضع کیا گیا تھا تین حصوں پر مشتمل تھا۔ سرکاری نمائندے نے بیان کیا (۱۱ر فروری) کہ "پہلا حصہ تجارتی تنازعات کی تفتیش اور تصفیہ کے لئے مقامی عدالتیں قائم کرنے کے متعلق ہے۔ دوسرے حصے میں ان مزدوروں کے لئے جو ماہوار اجرت پر ایسے کاموں میں لگے ہیں جن کا تعلق پبلک کے مفاد و ضروریات سے ہے پہلے سے اطلاع دئے بغیر ہڑتال کر دینا قانونی جرم قرار دیا گیا ہے اور اس جرم میں اعانت کرنے والوں کے لئے سخت سزائیں تجویز کی گئی ہیں۔ . . . آخری حصہ غیر قانونی ہڑتالوں اور در بندیوں کے متعلق ہے۔ مگر صرف ان ہڑتالوں اور در بندیوں پر عاید ہوتا ہے جن میں مندرجہ ذیل دو باتیں پائی جائیں۔ اول یہ کہ ہڑتال یا در بندی کا مقصد صنعت متعلقہ میں تجارتی جھگڑے بڑھانے کے علاوہ کچھ اور ہو، دوسرے یہ کہ ہڑتال یا در بندی کا مقصد گورنمنٹ پر براہ راست یا بالواسطہ دباؤ ڈالنا یا لوگوں کو اذیت دینا ہو۔ اگر یہ شرطیں پائی جائیں تو ہڑتال یا در بندی غیر قانونی ہے" بغیر کسی اختلاف کے یہ مسودہ منتخب کمیٹی کے پاس بھیج دیا گیا۔

آیئے اب تھوڑی دیر کے لئے کانگرس کی سرگرمیوں کا جائزہ لیں۔ اسمبلی میں وائسرائے کی تقریر کے کچھ ہی دنوں بعد ۳ر اور ۴ر فروری کو دہلی میں کانگرس ورکنگ کمیٹی کے ممبران کا اجتماع ہوا۔ ان عقل کے پتلوں پر اس تمام طعن و تشنیع کا ذرہ برابر اثر نہ ہوا کہ ملک کی رہبری ہی کے خیال سے اس مسئلہ پر کوئی رزولیوشن پاس کریں۔ انھوں نے بہت سا وقت چھوٹی چھوٹی چیزوں اور گاندھی جی کی بدیسی کپڑوں کے مقاطعہ کی بیش بہا اسکیم پر غور کرنے میں ضائع کر دیا کمیٹی کے رزولیشن سے اس بات کا بیّن ثبوت ملتا ہے۔ اگر اس ثبوت کی واقعتاً کوئی ضرورت ہے ——— کہ خداوندان کانگرس کے دماغ ملک کی آزادی اور غلامی کے اہم مسائل سے اتنے بیگانہ ہو گئے تھے بلکہ اس پُر تکلف رزولیوشن سے بھی جو انھوں نے کلکتہ کانگریس میں پاس کیا تھا ایسے بے خبر ہو گئے تھے کہ یہ لوگ پہلے کی طرح اب بھی تعمیری پروگرام کا وہی راگ الاپتے جا رہے تھے۔ گاندھی جی کی مقاطعہ کی اسکیم درحصل محض چرخہ کے مسلک کی پرزور اشاعت کا ایک بہانہ تھی کمیٹی نے گاندھی جی کی اسکیم کو صرف سرسری طور سے منظور کر لیا اور تفصیلات کو آئندہ کے لئے چھوڑ دیا۔ دہلی میں ۱۷ سے ۱۹ر فروری تک ورکنگ کمیٹی کا پھر اجلاس ہوا۔ اس مرتبہ اور زیادہ طویل اور مفصل قرار دادیں منظور کی گئیں۔ جن میں بدیشی کپڑوں کے مقاطعہ پر لمبی چوڑی اور باقاعدہ تجاویز پاس کی گئیں۔ بدیشی کپڑے کے علاوہ اس پر بھی زور دیا گیا کہ منشیات و مسکرات کے انسداد کا پروپگنڈا کیا جائے اور تعجب تو یہ ہے کہ کشتی، قواعد، لکڑی کے کھیل، نیز دوسرے قومی کھیلوں کے متعلق بھی رزولیوشن پاس ہوئے مگر ظاہر ہے کہ مرکز ثقل اور کہیں تھا۔ اس وقت کانگریسی لیڈر قوم کو ایک منظم جدوجہد کے لئے تیار کرنے کی بہ نسبت اس میں زیادہ منہمک تھے کہ وائسرائے سے گفت و شنید کی کوئی سبیل نکالی جائے۔ اس گندم نما جو فروشی کا حال عوام کو اسوقت معلوم ہوا جب صدر کانگریس مسٹر پٹیل نے ۱۹ر فروری کو وائسرائے کے اعزاز میں ایک عصرانہ دیا اور اس میں گاندھی جی، پنڈت موتی لال نہرو اور پارٹی کے دوسرے لوگوں کو مدعو کیا۔ ان بڑے لوگوں میں جو گفتگو ہوئی اس کو پردۂ راز میں رکھا گیا، لیکن لوگ سمجھتے تھے کہ کلکتہ کانگریس اور بمبئی کے فرقہ وارانہ فسادات ہی کے متعلق گفت و شنید ہوئی ہوگی۔

کلکتہ کے پولس کمشنر کے حکم امتناعی کے باوجود بدیشی کپڑوں کے ڈھیر میں آگ لگانے کے جرم میں ۴ر مارچ کو گاندھی جی مع چند اور لوگوں کے گرفتار کر لئے گئے۔ قومی کانگرس کی قیادت کی باگ اپنے ہاتھ میں لیتے ہی انھوں نے ضروری سمجھا کہ بدیشی کپڑوں کے مقاطعہ کو تقویت دینے کے لئے پھر وہی غیر ملک کے سوتی، اونی اور ریشمی کپڑوں کی ہولی کا تماشا شروع کیا جائے۔ ان گرفتاریوں نے عارضی طور پر مقاطعہ کی مہم کو اور تقویت دیدی۔ حکومت پر اس تمام قصہ کا جو کچھ اثر ہوا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ چند ہی دنوں کے بعد گاندھی جی رہا کر دئے گئے۔ تاکہ برما کے دورہ پر جا سکیں اور اس کے بعد ان پر ایک روپیہ جرمانہ کیا گیا!

۸ر اپریل کو لیجسلیٹو اسمبلی میں عوام کی نشستگاہ سے دو بم پھینکے گئے اور ریوالور کے دو فائر ہوئے۔ ساری کارروائی درہم برہم

ہو گئی - یہ واقعہ عین اس وقت ہوا جب ٹریڈ ڈسپیوٹ بل (مسودہ قانون تجارتی تنازعات) پاس ہو چکا تھا اور صدر پبلک سیفٹی بل (مسودہ قانون تحفظ عوام) پر اپنا فیصلہ سنانے کے لئے کھڑے ہونے والے تھے - بموں کے ساتھ سرخ رنگ کے کتابچے بھی پھینکے گئے تھے جن کے سرورق پر "ہندوستان کی اشتراکی جمہوریت کی فوج" لکھا ہوا تھا - دو نوجوان - بھگت سنگھ و بٹوکیشر دت نامی، جو اس وقت بالکل غیر معروف تھے، واقعہ کے فوراً ہی بعد گرفتار کر لئے گئے

دہلی میں ۱۲ رجون کو ان کا مقدمہ ہوا اور دونوں کو حبس دوام کی سزا دی گئی

۲۴ و ۲۵ رمئی کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس منعقدہ بمبئی میں جو رزولیوشن پاس ہوئے اُن سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ بم کے واقعہ نے کانگرسی لیڈروں کی توجہ انقلاب کے مسئلہ کی طرف کس حد تک مبذول کرائی - ملک کے عام سیاسی حالات اور سیاسی تنظیم کے متعلق جو خاص رزولیوشن گاندھی جی نے پیش کیا اس کے اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں -

"حکومت کے اس ملک گیر ظلم و تشدد کے پیش نظر، جس کے لئے ورکنگ کمیٹی کے ممبر مسٹر سمبا مورتی نیز دیگر قومی کارکنوں کی گرفتاری، اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے ممبروں، مزدوروں کے لیڈروں، اور ان کارکنوں کی جن پر میرٹھ میں مقدمہ چل رہا ہے، بے تحاشا گرفتاری اور ان کے ساتھ وحشیانہ بدسلوکی، خواہ مخواہ کی خانہ تلاشیاں اور پنڈت سندرلال کی کتاب "بھارت میں انگریزی راج" کی بے سبب ضبطی، جیسے واقعات کافی ثبوت ہیں ...... آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی رائے ہے کہ قوم کو اس طرز عمل کی مقاومت کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے اور چونکہ اس وقت تک قوم گیر مقاومت نہیں ہو سکے گی جب تک کانگرسی ادارہ کی قابل اطمینان بنیادوں پر از سر نو تشکیل و تنظیم نہ ہو جائے (اس کے بعد رزولیوشن میں اس قسم کی تفصیلات درج ہیں کہ گاؤں سے لے کر صوبہ تک کے مختلف کانگرسی اداروں کے لئے ۳۱ راگست ۱۹۲۹ء تک کم از کم کتنے ممبر بھرتی کر لینا ضروری ہے -)

جو صوبائی ادارہ ۳۱ راگست ۱۹۲۹ء تک اپنے کو اس معیار تک نہ پہونچائے گا اُسے کمیٹی تسلیم نہیں کرے گی -

ورکنگ کمیٹی کو اختیار ہو گا کہ اگر کوئی ادارہ اُس کی یا آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی ہدایات پر جو وقتاً فوقتاً بھیجی جاتی رہیں گی، عملدرآمد نہ کرے تو اُسے خارج کر دے"

گاندھی جی نے اپنی خطابت کا بیشتر زور اس تعزیری دفعہ کا جواز ثابت کرنے پر صرف کیا جو انھوں نے اصل رزولیوشن کے ذیل میں لگا رکھی تھی - اسمبلی میں بم پھٹنے کے متعلق یا اُن زبردست ہڑتالوں کے متعلق جو سارے ملک میں زور شور سے جاری تھیں ایک لفظ بھی نہ کہا سنا گیا - برعکس اس کے، وائسرائے کے اعلان پر جو انھوں نے اسمبلی کی میعاد میں توسیع اور انتخابات کے غیر معین التوا کے بارے میں صادر فرمایا تھا، بڑی اہمیت کے ساتھ توجہ دی گئی - پنڈت موتی لال نہرو بحیثیت صدر ایک بیان دے چکے تو آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے ایک رزولیوشن کے ذریعہ ورکنگ کمیٹی کو اختیار دیا کہ وہ ملک کے مفاد کے پیش نظر، مرکزی اور صوبائی مجالس قانون سازی کی کانگرس پارٹیوں کے طرز عمل کے بارے میں جو طریق کار چاہے اختیار کرے -

اس قرارداد کے ماتحت صدر نے ۱۰ رجون کو ایک بیان شائع کیا جسکا اقتباس ذیل میں درج ہے:

"کانگرس کی قرارداد جو یہ مطالبہ کرتی ہے کہ مجالس قانون ساز سے اجتناب کیا جائے وہ کوئی منفرد اقدام نہیں ہے بلکہ مکمل آزادی اور ۱۹۳۰ء سے عدم تعاون کے متعلق کلکتہ اور مدراس کی قراردادوں، نیز گاندھی جی کی اس قرارداد کے ماتحت ہے جو انھوں نے کانگرس کی از سر نو تنظیم و تشکیل کے بارے میں منظور کرائی تھی - سرکاری اعلان کانگرس کو زک دینے کی اسکیم کا پہلا قدم ہے اور اس کا منشا یہ ہے کہ معمولی سیاسی ارتقا کی راہیں بھی مسدود کر دی جائیں - مگر زیادہ سے زیادہ شر ہمارے لئے زیادہ سے زیادہ خیر کا باعث ہو گا، کیونکہ اس سے ناگزیر تصادم کی ساعت قریب تر ہو جائے گی - اس وقت جبکہ معاملات

اس نازک مرحلہ پر پہونچ گئے ہیں، ساری قوتوں کو اصل مقصد پر —— جس کے لئے کونسلیں قطعاً کارآمد نہیں ہیں —— مرکوز کردینا ضروری ہے۔"

اس طرح سے کانگریس پالیسی کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ مبہم رکھا گیا تاکہ آیندہ حسب موقع اس میں تصرف کی گنجائش باقی رہے۔ اسی اثنار میں انگلستان میں نئے انتخابات ہوئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کی قیادت میں لیبر (مزدور) پارٹی کی حکومت قائم ہوگئی۔ چونکہ ایک طرف بنگال اور پنجاب کے انقلابیوں نے دوسری طرف صنعتی علاقوں میں منظم مزدوروں کی ہڑتالوں نے ہندوستان کے حالات کو بہت خطرناک بنادیا تھا لہٰذا ۲۹ جون کو لارڈ ارون ہندوستان سے روانہ ہوئے کہ لیبر پارٹی کے وزراء سے گفت وشنید کرکے کوئی ایسی سبیل نکالیں جس سے بغیر کچھ دئے دلائے لوگوں کا جوش وخروش ٹھنڈا کردیا جائے۔

۲۸ ستمبر کو لکھنؤ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ جتندر ناتھ داس اور ریورنڈ وزایا کی موت نے ملک میں جتنی زبردست ہلچل مچادی تھی، اسکا اندازہ اسوقت ہوا جب پنڈت موتی لال نہرو نے بحیثیت صدر حسب ذیل رزولیوشن پیش کرکے جلسہ کی کارروائی شروع کی:

"آل انڈیا کانگریس کمیٹی آنجہانی جتندرناتھ سین اور ریورنڈ وزایا کے جذبہ ایثار اور اس زبردست پامردی واستقلال پر جس کا ثبوت اُنھوں نے اپنے محبوب نصب العین پر قربان ہوکر دیا ہے، اظہار آفریں کرتی ہے۔"

مگر اس کمیٹی نے ملک کے روزافزوں انقلابی بے چینی کو فرو کرنے کی غرض سے یہ مشورہ دیا کہ "جن لوگوں نے اپنے اوپر یہ ایثار عاید کررکھا ہے وہ بھوک ہڑتال ختم کردیں، خصوصاً ان امور کے پیش نظر کہ ان میں کے دو آدمی اپنی جانیں قربان کرچکے ہیں اور آخری وقت پر حکومت نے بھی بھوک ہڑتال کرنے والوں کے تقریباً تمام مطالبات تسلیم کرلئے ہیں۔"

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اس جلسہ کا خاص مقصد یہ تھا کہ لاہور کانگریس کے لئے صدر کا انتخاب کیا جائے۔ ویسے تو گاندھی جی منتخب ہوگئے ہوتے کیونکہ دس صوبائی کمیٹیوں کے ووٹ (بشمول پنجاب) گاندھی جی کو ملے تھے تین سے ولبھ بھائی پٹیل کو تین سے پنڈت جواہرلال نہرو کو اور ایک کا مسٹر ان۔ سی۔ کیلکر کو، مگر قبل اس کے کہ لاہور کانگریس کی مجلس استقبالیہ باضابطہ انکو صدارت کے لئے منتخب کرتی، گاندھی جی نے جواہرلال نہرو کے حق میں اس اعزاز سے دست برداری دیدی۔ یکم اگست کو "ینگ انڈیا" میں انھوں نے اس کے حسب ذیل وجوہ بیان کئے۔

"میں جانتا ہوں کہ میں واقعات کی رفتار کے ساتھ ساتھ نہیں چل رہا ہوں۔ میرے اور نئی پود کے لوگوں کے درمیان ایک قسم کا خلا ہے۔" لکھنؤ میں پھر لوگوں نے نجی گفتگو میں نیز کمیٹی کے جلسہ میں اُن سے اصرار کیا کہ آپ ملک کے عطا کردہ اعزاز کو قبول کیجئے، مگر وہ حسب معمول اپنے فیصلہ پر جمے رہے۔ اُنھوں نے یہ ضرور بتایا کہ میں یکم جنوری ۱۹۳۰ء کی جنگ سے گریز نہیں کروں گا اور کانگریس کے کام کے سلسلے میں پروگرام اور اسکیم وغیرہ بنانے میں ہرممکن مدد دوں گا۔ مسٹر ولبھ بھائی پٹیل کو صدر بنانے کی تجویز بھی ختم ہوگئی کیونکہ اُنھوں نے شکریہ کے ساتھ، اس اعزاز کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ اخیر میں صرف پنڈت جواہرلال نہرو کے نام کی تجویز وتائید ہوئی اور وہ بغیر کسی مخالفت کے منتخب ہوگئے۔

اس کے بعد اکتوبر کے اخیر میں وائسرائے بہادر ہندوستان واپس آگئے اور اپنا وہ لفظی طمطراق والا بیان شائع کیا جس میں گول میز کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز کا خاکہ پیش کرنے کے بعد اُنھوں نے ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے متعلق حسب ذیل خیالات کا اظہار کیا تھا۔

"سرجان سائمن کی تجویز تھی کہ جب آئینی کمیشن اور ہندوستان کی مرکزی کمیٹی کی رپورٹ تیار ہوچکے، اس پر غور وخوض ہوجائے اور وہ شائع کردی جائے تو اس کے بعد —— مگر جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی کی منزل سے پہلے —— اس کی ضرورت ہوگی کہ اسی

کانفرنس منعقد کی جائے جس میں ملک معظم کی حکومت برطانوی ہندوستان اور ریاستوں کے نمائندوں سے ملکر قطعی تجاویز کے لئے زیادہ سے زیادہ اتفاق رائے حاصل کرسکے۔ اس کے بعد ملک معظم کی حکومت کا فرض ہوگا کہ وہ ان تجاویز کو ایوان حکومت میں پیش کرے .... میرا خیال ہے کہ ملک معظم کی حکومت کو اس رائے سے کامل اتفاق ہے۔

اگست ۱۹۱۷ء کے اعلان میں برطانوی پالیسی کا نصب العین یہ بتایا گیا تھا کہ ہندوستان کو رفتہ رفتہ سلطنت برطانیہ کے ایک اہم جزو کی حیثیت سے ذمہ دارانہ حکومت قائم کرنے کے خیال کو پیش نظر رکھ کر خود مختارانہ اداروں کی تدریجی ترقی کا انتظام کیا جائے ...... اس کے علاوہ سلطنت کے وزرائے متعدد بار اسکا اعلان کیا ہے کہ حکومت برطانیہ کی خواہش ہے کہ رفتہ رفتہ ہندوستان، سلطنت برطانیہ کے اندر درجہ نوآبادیات کا مساویانہ منصب حاصل کرلے۔ لیکن ان شکوک وشبہات کے پیش نظر جنکا اظہار برطانیہ عظمیٰ میں اور ہندوستان میں دونوں جگہ کیا گیا ہے کہ ۱۹۱۹ء کا قانون نافذ کرنے میں حکومت برطانیہ کے رویّہ کی کیا تاویل کی جائے، میں ملک معظم کی حکومت کی طرف سے اس امر کو واضح کردینے کا مجاز ہوں کہ اُن کی نظر میں یہ چیز ۱۹۱۷ء کے اعلان میں مضمر ہے کہ ہندوستان کی آئینی ترقی ــــ اس اعلان کے مفہوم میں ــــ کا فطری نتیجہ درجہ نوآبادیات کا حصول ہے۔"

یکم نومبر کو وہ تمام سیاسی رہنما جو نہرو رپورٹ کے بانی تھے وائسرائے کے اعلان پر غور وخوض کرنے کے لئے مسٹر دی۔ جی۔ پٹیل صدر اسمبلی کے مکان پر جمع ہوئے۔ جن لوگوں نے اس کانفرنس میں شرکت کی ان میں گاندھی جی، پنڈت موتی لال نہرو، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، سر تیج بہادر سپرو، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا محمد علی اور مسٹر جے۔ ام سین گپتا بھی تھے۔

کانفرنس نے گاندھی جی، سر تیج بہادر سپرو اور پنڈت جواہر لال نہرو سے ایک بیان کا مسودہ تیار کرنے کے لئے کہا جو شائع کیا جانے والا تھا۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنا اپنا مسودہ پیش کیا۔ کانفرنس نے گاندھی جی کا مسودہ منظور کرلیا، البتہ اس میں سر تیج بہادر سپرو کی بعض تجویزوں کو بھی شامل کرلیا گیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو پہلے تو اختلاف کرتے رہے اور اس پر دستخط کرنے پر رضامند نہ تھے مگر پھر بہت سمجھانے بجھانے سے اُنھوں نے بھی دستخط کردئے۔ دہلی منشور، آل پارٹیز لیڈروں کی طرف سے شائع ہوا۔ اسمیں پہلے تو اس خلوص کی جو اعلانات سے مترشح ہوتا تھا نیز حکومت برطانیہ کی طرف سے ہندوستان کی رائے عامہ کو رضامند کرنے کی خواہش کی تحسین تھی اور اس امید کا اظہار تھا کہ ہم لوگ ہندوستان کے لئے اس کی ضروریات کے مطابق درجہ نوآبادیات کا خاکہ تیار کرنے کی کوشش میں حکومت برطانیہ کے ساتھ تعاون کرسکیں گے، یہ بیان کیا گیا تھا کہ:-

"ہم لوگ مجوزہ کانفرنس کی کامیابی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ

(ا) پرسکون فضا پیدا کرنے کے لئے ترقی کی پالیسی اختیار کی جائے۔

(ب) سیاسی قیدیوں کے لئے عام معافی کا حکم نافذ کردیا جائے۔

(ج) ترقی پسند سیاسی اداروں کی معقول نمائندگی کا انتظام کیا جائے اور انڈین نیشنل کانگرس کو اس قسم کا سب سے بڑا ادارہ ہونے کی حیثیت سے غالب نمائندگی دی جائے۔

"وائسرائے نے ملک معظم کی حکومت کی طرف سے اپنے بیان میں درجہ نوآبادیات کے متعلق جو پیرا درج کیا ہے اس کے مفہوم کے متعلق بعض شکوک کا اظہار کیا گیا ہے۔ بہر حال ہمیں اُمید ہے کہ کانفرنس اس لئے نہیں منعقد ہوگی کہ وہ درجہ نوآبادیات ملنے کے وقت کے متعلق گفت وشنید کرے بلکہ اس لئے ہوگی کہ ہندوستان کے لئے دستور حکومت کی اسکیم مرتب کرے۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ وائسرائے کے گرانقدر بیان کے مہمات ومضمرات کو سمجھنے میں ہم نے غلطی نہیں کی ہے۔"

بیان کے آخری حصہ میں لیڈروں نے اس اُمید ویقین کا اظہار کیا کہ "ملک کی حکومت میں (نئے دستور کے نفاذ تک) فیاضی اور کشادہ دلی سے کام کیا جائے تاکہ پبلک یہ محسوس کرے کہ آج ہی سے ایک نئے عہد کا آغاز ہوگیا ہے اور نیا دستور اسی حقیقت کا

حامل ہوگا"۔

وائسرائے کے بے معنی اعلان نے لیڈروں کو اس حد تک مسحور کر دیا! پنڈت جواہر لال نہرو ابھی تک مکمل آزادی پر مضبوطی کے ساتھ جمے ہوئے تھے مگر اب انھیں بھی درجہ نوآبادیات کا دستور حاصل کرنے کی کوشش پر رضامند کر لیا گیا۔ اس بیان کے الفاظ بھی اعتدال پسندوں کو شامل کرنے کے دیرینہ عذر پر بہت نرم کر دئے گئے۔

عین اسی موقع پر مسٹر سبھاش چندر بوس، ڈاکٹر کچلو اور مولانا عبدالباری نے جو اس منشور پر دستخط کرنے پر رضامند نہ ہوئے تھے ایک منشور اس کے خلاف شائع کیا جس میں انھوں نے اپنے اس پختہ یقین کا اظہار کیا کہ وائسرائے کے اعلان میں جیسا کہ وہ موجودہ صورت میں ہے، کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ہمارے لئے کسی گرمجوشی اور ولولہ کا باعث ہو سکے۔

اس کے بعد انھوں نے وائسرائے کے اُن دو اقوال کا جس میں انھوں نے (۱) ذمہ دارانہ حکومت کو درجہ نوآبادیات ٹھہرایا ہے اور (۲) حکومت برطانیہ اور برطانوی ہند اور ریاستہائے ہندوستان کے نمائندوں کی کانفرنس منعقد کرنے کا ذکر کیا ہے، حسب ذیل طریقہ پر جائزہ لیا:۔

"پہلے قول کے متعلق ہم ان لوگوں سے جنکے دلوں میں وائسرائے کے اعلان سے بہت ولولے پیدا ہو رہے ہوں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہے کہ درجہ نوآبادیات کب دیا جائے گا۔ بہر حال ہمارا صریحی مسلک مکمل آزادی ہے، اور ہم مکمل آزادی کو مستقبل بعید کا ایک نصب العین نہیں بلکہ اپنا فوری مقصد قرار دیتے ہیں، یہانتک کہ اگر ۳۱ر دسمبر ۱۹۲۹ء تک درجہ نوآبادیات مل جائے تب بھی ہم پامردی کے ساتھ مکمل آزادی ہی کے لئے جد و جہد کرتے رہیں گے۔ ہم نے انڈین نیشنل کانگرس کے پچھلے اجلاس میں انھیں خیالات کا اظہار کیا تھا اور ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ لاہور کے آئندہ اجلاس میں بھی اسی کا اعادہ کریں۔

دوسرے قول کے متعلق ہم محسوس کرتے ہیں کہ مجوزہ کانفرنس حقیقی معنوں میں 'گول میز کانفرنس' نہیں ہوگی اور ہم اپنے ہموطنوں سے استدعا کرتے ہیں کہ اس معزز نام سے اُسے نہ موسوم کریں۔ .... یہ بھی واضح طور پر نہیں پتہ چلتا کہ آیا یہ کانفرنس برطانوی حکومت اور ہندوستان کے قوم دوستوں ہی کی نمائندگی تک محدود رہے گی یا نہیں۔ نہ یہ معلوم ہے کہ آیا فریقین کے لئے اس کانفرنس کے فیصلے قطعی اور لازمی طور پر واجب التسلیم بھی ہونگے یا نہیں۔

اخیر میں ہم لوگ اپنے ہموطنوں سے استدعا کرتے ہیں کہ وائسرائے اور وزیر ہند کے مقدس بیانات سے گمراہ نہ ہوں اور لاہور کانگرس میں انھیں جس صورت حال کا لازماً مقابلہ کرنا پڑے گا اس کے لئے ملک کو تیار کرنے کی جد و جہد کرتے رہیں"۔

چند ہی ہفتوں کے اندر وہ تمام ولولے جو وائسرائے کے اعلان کے متعلق 'دہلی منشور' کی اشاعت سے مصنوعی طور پر پیدا کر دئے گئے تھے سرد پڑنے لگے۔ برطانوی ایوان حکومت میں ایک نہایت رجعت پسندانہ مباحثہ ہوا۔ اس کے بعد ہی وزیر اعظم اور مسٹر بالڈون کے درمیان ان مسائل پر جو کچھ خط و کتابت ہوئی تھی وہ شائع ہوگئی۔ ان دونوں باتوں نے لوگوں کے جذبات کا رُخ حکومت کی مخالفت کی طرف پھیر دیا۔ چونکہ اب تک اُن سوالات پر جو دہلی منشور میں اُٹھائے گئے تھے وائسرائے کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا تھا لہذا اس منشور پر دستخط کرنے والے لیڈروں کی ایک دوسری کانفرنس ۱۸ر نومبر کو الہ آباد میں منعقد کی گئی۔ اس کانفرنس میں کانگرس ورکنگ کمیٹی کے ممبر (بشمول گاندھی جی، مسٹر جواہر لال نہرو اور مسٹر سبھاش چندر بوس) اور دیگر جماعتوں کے تیس نمائندے شریک ہوئے۔ کانفرنس نے باتفاق رائے حسب ذیل قرارداد منظور کی:

"وائسرائے کے اعلان پر برطانوی ایوان حکومت میں حال میں جو بحث ہوئی ہے یہ کانفرنس اُس کو شک و اضطراب کی نظر سے دیکھتی ہے۔ تاہم یہ کانفرنس 'دہلی منشور' پر قائم رہنے کا فیصلہ کرتی ہے اور اُمید کرتی ہے کہ جلد سے جلد اسکا مکمل جواب ملے گا"۔

اسی کے ساتھ ورکنگ کمیٹی نے ایک اور قرارداد منظور کی کہ "دہلی میں کانگرس لیڈروں نے جو کارروائی کی ہے یہ کمیٹی اسکی

توثیق کرتی ہے۔ مگر واضح ہونا چاہئے کہ ضابطہ کی رو سے یہ توثیق محض انڈین نیشنل کانگرس کے اجلاس تک کے لئے محدود ہے"۔

۳۰ رنومبر کو ناگپور میں آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگرس کا دسواں اجلاس منعقد ہوا۔ پنڈت جواہر لال نہرو صدر تھے۔ کھلے اجلاس کے قبل صبح کے وقت مجلس انتظامیہ کا جلسہ ہوا۔ مسٹر دیش پنڈے، سکریٹری بمبئی گرنی کامگر یونین کی تحریک پر کمیٹی میں کثرت آرا سے ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں نہرو رپورٹ کو اس بنا پر مسترد کر دیا گیا کہ کمیٹی کی نظر میں اس رپورٹ کا منشا ہندوستان میں برطانوی شہنشاہیت کو قیام دوام بخشنا ہے۔ اس کے علاوہ وھٹلے کمیشن کے مقاطعہ پر زور دیا گیا۔

مسٹر ولس پنڈے نے ایک تجویز پیش کی کہ ٹریڈ یونین کانگرس کو پان پیسفک سکریٹریٹ سے ملحق کر دیا جائے۔ اس پر مسلسل دو گھنٹہ تک جوش و خروش کے ساتھ مباحثہ ہوتا رہا۔ اخیر میں کثرت آرا سے یہ قرارداد منظور کر لی گئی۔

اس قرارداد کی منظوری پر ٹریڈ یونین کانگرس کے اراکین میں چہ می گوئیاں ہونے لگیں کہ اس الحاق کے اثرات کیا ہونگے، کیونکہ پان پیسفک سکریٹریٹ کے متعلق کہا جاتا تھا کہ اس ادارہ پر کمیونسٹ انٹرنیشنل کا اقتدار ہے۔ وہ لوگ جو اس قرارداد کے مخالف تھے بہت برہم رہے۔

اسی روز سہ پہر کو اعتدال پسند مزدور لیڈروں نے جن میں مسٹر این۔ ایم۔ جوشی۔ مسٹر گری، مسٹر شیوراؤ، اور دیوان چمن لال شامل تھے تہیہ کر لیا کہ چونکہ اس ادارہ کو انتہا پسندوں اور اشتراکیوں نے مسخر کر لیا ہے لہذا اس سے علحدہ ہو جانا چاہئے۔ پہلی دسمبر کو جب عام جلسہ شروع ہوا تو صدر نے ان الگ ہونے والے اراکین کا بیان پڑھ کر سنایا۔ اس کے بعد یہ لوگ کانگرس سے علحدہ ہو گئے۔

۵ ار دسمبر کو مسٹر جمنا داس مہتا نے الہ آباد میں انڈپنڈنس کانفرنس کی صدارت کی۔ اس کانفرنس نے یہ قرارداد منظور کی کہ ہندوستان کا نصب العین فوری اور مکمل آزادی حاصل کرنا ہے نیز یہ کہ 'درجہ نوآبادیات' کا مقصد سرمایہ داری، زمینداری، اور جاگیرداری کی مدد سے شہنشاہیت کے پنجوں کو اور مضبوط کرنا ہے، اسی دن نوجوانان بمبئی کی کانفرنس نے بھی، جس کی صدارت مسز کملا دیوی چٹوپادھیہ نے کی تھی، یہ قرارداد منظور کی کہ ہندوستان کا نصب العین فوری اور مکمل آزادی ہے۔

۱۶ ار دسمبر کو لندن کانگرس کمیٹی نے ایک قرارداد منظور کی جس میں مسٹر سبھاش چندر بوس کی سیاسی بصیرت کی تحسین کی گئی تھی کہ وائسرائے کے اعلان کے ذریعہ جو دام بچھایا گیا تھا انھوں نے اسے دیکھ لیا۔ اس کے علاوہ اس قرارداد کے ذریعہ ان سے استدعا کی گئی تھی کہ لاہور کانگرس میں مکمل آزادی کے مسئلہ پر پوری قوت سے جدوجہد کریں۔

۲۳ ر دسمبر کو کسی نے یہ بے باکانہ حرکت کی کہ وائسرائے کے اسپیشل کو جس میں وہ اپنا جنوبی ہند کا دورہ ختم کر کے دہلی واپس ہو رہے تھے، بم کے ذریعہ اڑا دینا چاہا۔ کوئی مجروح نہیں ہوا کیونکہ بم جو ریل کی دونوں پٹریوں کے درمیان گاڑ دیا گیا تھا، اس وقت پھٹا جب اس جگہ سے چوتھا ڈبہ گذر رہا تھا اور وائسرائے کا سیلون دو ڈبہ پیچھے تھا۔ تفتیش ہوئی تو وہاں سے ایک چھوٹے برقی مورچہ (بیٹری) تک جو اسٹیشن سے تقریباً تین سو گز کے فاصلہ پر رکھا گیا تھا ایک تار پایا گیا۔

دہلی پہونچتے ہی وائسرائے نے گاندھی جی، پنڈت موتی لال نہرو، پریسیڈنٹ پٹیل، اور سر تیج بہادر سپرو سے ملاقات کی۔ ظاہر تھا کہ اس کانفرنس کا مقصد سوا اس کے کچھ نہیں تھا کہ ممکن موقع پر ایسی صورت پیدا کر دی جائے کہ لاہور کانگرس میں 'مکمل آزادی' کا اعلان نہ ہونے پائے۔ اس کانفرنس کا نتیجہ ایک سرکاری بیان میں حسب ذیل الفاظ میں ظاہر کیا گیا:

"گفتگو صرف لندن کی مجوزہ کانفرنس کے معاملات تک محدود رہی اور بتایا گیا کہ اس کانفرنس کے ہر ممبر کو پوری آزادی ہوگی کہ وہ جس قسم کی تجاویز چاہے پیش کرے اور جس حد تک کسی تجویز پر اتفاق ہوگا اسی مناسبت سے برطانوی رائے پر بھی اس کا اثر پڑے گا۔"

کانگرس کی طرف سے یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ جب تک ملک معظم کی حکومت پہلے سے اس کا یقین نہ دلا دے کہ اس کانفرنس کا

مقصد درجہ نوآبادیات کے لئے ایک دستور مرتب کرنا ہے اور ملک معظم کی حکومت اسکی حمایت کرے گی، کانگرس کی شرکت نہ مشکل ہوگی۔

ہز اکسلنسی نے واضح طور پر بتا دیا کہ کانفرنس کا مقصد یہ ہے کہ آخری تجاویز کے لئے جنھیں پارلیمنٹ کے سامنے پیش کرنا ہو زیادہ سے زیادہ اتحاد رائے حاصل کیا جائے مگر ہز اکسلنسی یا ملک معظم کی حکومت کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ کانفرنس کے کاموں کے بارے میں پہلے سے کوئی رائے ظاہر کریں یا پارلیمنٹ کی آزادی کو کسی طرح محدود کردیں۔ گفت وشنید ختم ہوگئی،،

اب گاندھی جی کے لئے بجز اس کے کوئی صورت نہ رہ گئی کہ لاہور کانگرس میں مکمل آزادی، اور نئے سال میں سول نافرمانی شروع کرنے کی تجاویز پیش کریں۔ کانگرس کے اس تاریخی جلسہ کی کارروائیوں کو ہم اگلے باب میں بیان کریں گے۔

تہتروال باب

کانگریس اجلاس منعقدہ کلکتہ کی گفت وشنید

اب آیئے ہم ۱۹۲۹ء میں کانگریس کی پالیسی کے تغیرات پر ایک نظر ڈالیں۔ پچھلے چند صفحات میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ گاندھی جی اس سال اپنی پوری قوت کے ساتھ کوشش کرتے رہے کہ کانگرس کے سامنے مکمل آزادی کی قرارداد نہ آنے پائے اور پرامن عدم تعاون کی تحریک بھی معرض التوا میں پڑ جائے۔ اگرچہ حکومت نے کانگرس کے اجلاس منعقدہ کلکتہ کی قرارداد کا واضح جواب کانگریس اور مزدور لیڈر کے رہنماؤں کے خلاف جارحانہ اقدام کرکے دیدیا تھا۔ تاہم گاندھی جی لارڈ اروِن سے مفاہمت پر تلے رہے فروری ۲۹ء میں کانگریس کے صدر مسٹر پٹیل نے وائسرائے کو گارڈن پارٹی دی۔ وہیں گاندھی جی نے وائسرائے سے گفت وشنید شروع کردی۔ جوں جوں دن گزرتے گئے گورنمنٹ کا رویہ سخت اور نمایاں ہوتا گیا۔ اب یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوچکی تھی کہ حکومت کسی حال میں ہندوستان کو درجہ نوآبادیات کا دستور بھی نہیں دینا چاہتی۔ اس کے باوجود کانگریسی رہنما حکومت کی آئندہ پالیسی کی طرف سے حسن ظن رکھتے تھے اور جھوٹی توقعات قائم کر رہے تھے۔ اس کے بعد لارڈ اروِن انگلینڈ روانہ ہوگئے۔ تاکہ وہاں پہنچ کر جدید مزدور پارٹی کی وزارت سے ساز باز کرکے ایسی راہ تلاش کی جائے جس کے ذریعہ ہندوستان کے ہنگامہ کو فرو کیا جا سکے۔ جولائی اور اگست تک ایک طرف بھگت سنگھ اور اسیران لاہور اور دوسری طرف اسیران میرٹھ کے مقدمات نے عوام کے جذبات اور احساسات میں ایک انقلاب پیدا کردیا۔ انقلاب زندہ باد کے نعرے ملک کے طول وعرض میں گونجنے لگے۔ ان امور کے باعث گاندھی جی وائسرائے کے متوقع بیان اور آئندہ گفت وشنید کے انجام کا صحیح اندازہ کرنے کے بعد نہایت ہوشیاری کے ساتھ ایک مستحکم بند باندھنے میں مصروف ہوگئے جس کے ذریعہ عوام کی انقلابی قوتوں کے سیلاب کو لاہور کانگریس میں آگے بڑھنے سے روک سکیں۔

وہ دیکھ رہے تھے کہ کانگریس کے آئندہ اجلاس میں آزادی کامل کی تحریک کو ایک معجزہ ہی روک سکتا تھا لیکن اگر انھوں نے ہندوستان کے لئے درجہ نوآبادیات ہی کو مکمل آزادی کا پروانہ قرار دیدیا تھا تو کیا اب ان کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ مکمل آزادی کا ایک گول مول فارمولا مرتب کرکے پیش کردیتے جس میں ایسی گنجائش رکھتے جس کی تعبیر یہ بھی ہوسکتی کہ ہندوستان دولت مشترکہ برطانیہ کا جزو رہے گا لیکن اس کے علاوہ ایک دقت اور تھی وہ بخوبی جانتے تھے کہ بائیں بازو کے لیڈر جواہر لال اور سبھاش چندر بوس کانگریس کے گزشتہ

اجلاس منعقدہ کلکتہ میں مکمل آزادی کو سلطنت برطانیہ سے مکمل انقطاع کے مرادف قرار دینے کے لئے بری طرح لڑے تھے اور یہ دونوں رہنما ۱۹۲۹ء میں نوجوانانِ وطن اور مزدور طبقہ میں بیحد مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ اور اگر یہ دونوں لاہور کانگریس کے پلیٹ فارم پر متحد ہو کر اٹھ کھڑے ہوتے تو اس وقت اسیرانِ لاہور اور میرٹھ کے دلیرانہ اقدام اور خاموش مظلومیت کے پیغام سے انہیں بہت مدد ملتی اور گاندھی جی کو اس موقع پر ایسی زک اٹھانی پڑتی کہ عمر بھر یاد رہتی۔ اس لئے گاندھی جی کو بجز اس کے اور کوئی چارہ کار نظر نہ آیا کہ بوس اور نہرو کے زبردست اتحاد کو توڑ دیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے وہ سال بھر تک نہایت تندہی سے کوشاں رہے اور بالآخر عجیب و غریب طریقہ پر کامیاب ہو گئے۔

ہم پچھلے صفحات میں دیکھ چکے ہیں کہ گاندھی جی، مسٹر سبھاش چندر بوس کو اپنے نقطۂ نگاہ پر لانے سے مایوس ہو چکے تھے اور اب نوجوان نہرو کی مبالغہ آمیز مدح کر کے ان کے دل و دماغ پر اپنا اثر بٹھا رہے تھے اور انہیں اپنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور اسی ترکیب سے مجلس مضامین کے ہنگامہ خیز بحث مباحثہ میں نہرو کو شرکت سے باز رکھ چکے تھے لیکن اب یہ مرحلہ درپیش تھا کہ گاندھی جی کی قرارداد کے سلسلہ میں مسٹر بوس نے جو ترمیم پیش کی تھی اس کی حمایت سے نہرو کو کس طرح باز رکھا جائے۔ اس قسم کی ترکیبیں گذشتہ موقعوں پر خواہ کتنی ہی بیش قیمت ثابت ہوئی ہوں مگر لاہور کی ہنگامہ خیز فضا میں ان چالوں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لئے گاندھی جی ایک اور زبردست چال چلے اور اپنی اعصاب شکن پریشانیوں کا واحد طریقہ علاج ڈھونڈھ نکالا یعنی مسٹر نہرو کو کرسی صدارت پر لا بٹھایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہی نہرو جو کل تک بائیں بازو کا ایک شعلہ آشام کارکن تھا میدانِ جنگ چھوڑ کر اپنے رفقاء کار سے الگ ہو گیا (جن کے ساتھ اگر یہ صورت نہ پیدا ہوتی تو ہر قیمت پر دوش بدوش لڑتا) اور اب اس کے سر پر سنگین ذمہ داری عاید ہو گئی تھی کہ کانگریس کے دونوں بازوؤں کے مابین کس طرح توازن قائم رکھا جائے۔ لہٰذا گاندھی جی نے پراونشل کانگریس کمیٹی اور لاہور استقبالیہ کمیٹی کی کثرت آراء سے پاس کئے ہوئے قرارداد کے خلاف محض اتنا ہی نہیں کہ کرسی صدارت نہیں قبول کی بلکہ پریس اور پلیٹ فارم سے اور نجی بحث مباحثوں اور پبلک جلسوں میں جواہر لال کے انتخاب کے لئے مسلسل پر زور پروپیگنڈا کرتے رہے، مسٹر ولبھ بھائی پٹیل کو بھی نہرو کے مقابلہ میں کھڑے ہونے سے باز رکھا۔ اور ستمبر ۱۹۲۹ء کے اخیر میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو راضی ہی کر لیا کہ وہ نوجوان نہرو کو لاہور کانگریس کا صدر منتخب کرے۔

اس دن سے نہرو میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہو گیا۔ حکومت کا اکتوبر کا اعلان ہندوستان کی قوم کو عموماً اور کانگریسی رہنماؤں کو خصوصاً دھوکہ دینے کی ایک کھلی اور کھلی چال تھی لیکن مسٹر گاندھی اور ان کے رفقاء فریب کھانے کے لئے آگے بڑھے۔ جواہر لال نہرو جو اب کانگریس کے صدر منتخب ہو چکے تھے ابتدا میں کچھ ہچکچائے لیکن صدارت کی نئی ذمہ داری جو ان کے کاندھوں پر ڈالی گئی تھی اپنا رنگ لائے بغیر نہ رہی۔ مسٹر نہرو کچھ دیر تک بین بین رہنے کے بعد غلط سمت میں کود گئے اور مسٹر بوس اور اپنے دوسرے رفقاء کار سے قطعی علیحدہ ہو گئے حالانکہ اگر یہ صورت حال نہ پیدا ہوئی ہوتی تو وہ انھیں رہنماؤں کے ساتھ رہ کر کانگریس کے پیش کردہ مغالطہ انگیز اعلان کی مخالفت کرتے۔

اس طرح گاندھی جی نے لاہور کانگریس کا میدان صاف کر لیا اس میں شبہ نہیں کہ گاندھی جی ایک ڈوبتے ہوئے انسان کی طرح ہر تنکے کا سہارا لینے کی کوشش کرتے رہے اور اجلاس شروع ہونے کے آخری لمحہ تک یہ سعی کرتے رہے کہ کانگریس خود ان کے پیش کئے ہوئے مبہم فارمولے کو بھی پاس نہ کر سکے۔ صدر کانگریس مسٹر پٹیل نے پھر وائسرائے سے گفت و شنید کے سلسلہ میں گاندھی جی کی مدد کی سو حسنِ قسمت کہ انھوں نے برگشتگی اور انحراف کی قطعاً کوئی گنجائش باقی نہ رہنے دی۔ لیکن خوش نصیبی سے گاندھی جی اس خطرے سے پہلے ہی آگاہ ہو چکے تھے اور اس کے مقابلہ کے لئے اپنے آپ کو مسلح کر چکے تھے جب وہ دلی سے لاہور کے لئے روانہ ہوئے تو انھیں اپنی کئی ماہ کی گذشتہ کوششوں کے کامیاب ہونے کا یقین ہو چکا تھا۔

لیکن اس تمام واد گہات کا علم کانگریس کے ان سیکڑوں مندوبین کو نہیں تھا جو نہایت جوش وخروش کے ساتھ بندے ماترم اور انقلاب زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے انھوں نے جواہر لال نہرو کا خطبہ صدارت پڑھتے وقت بڑے فلک شگاف نعروں سے استقبال کیا۔ باوجودیکہ جواہر لال کے صدارتی خطبہ کے الفاظ نہایت شرربار اور جنگجویانہ تھے لیکن وہ ہندوستانی سیاست کے حقیقی ہیملٹ (مضطرب الخیال) ثابت ہوئے۔ انھوں نے منشو ٹپلی پر پردہ ڈالنے کے لئے کہا کہ میں نہیں جانتا کہ ہم نے پہلے غلط کیا ہے یا صحیح ایک طرف تو انھوں نے ہندوستانی ریاستوں کو زمانہ قدیم کی ایک کہنہ یادگار سے موسوم کیا اور دوسری طرف یہ بھی کہا کہ کانگریس کے رہنما اس امر کے لئے آمادہ ہیں کہ والیان ریاست سے گفت وشنید کی کوئی ایسی راہ نکالی جاسکے جس کے ذریعہ ریاستوں کے نظام حکومت کو بدلنے کا عبوری دور بہت تیز اور انقلابی نہ ہو۔ اسی طرح انھوں نے جہاں مزدوروں اور کاشتکاروں کی مظلومیت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کانگریس پر یہ الزام لگایا کہ وہ اس مظلوم ومقہور طبقہ کے حقوق کی محافظت کے سلسلہ میں سرد مہری سے کام لیتی ہے وہاں یہ بھی کہا کہ کانگریس کے لئے بحیثیت جماعت یہ بہت مشکل ہے کہ مزدوروں اور کاشتکاروں کی حالت سدھارنے کے لئے جو اقتصادی پروگرام مرتب کیا گیا ہے اس کا پورا پورا ساتھ دے سکے۔ اس موقع پر اس امر کا بخوبی اندازہ ہوجائیگا کہ مسٹر نہرو اب اپنے سابقہ مقام سے کس قدر نیچے اتر آئے تھے۔ کیا یہ وہی جواہر لال نہرو تھے جنھوں نے ایک سال قبل یہ مطالبہ کیا تھا کہ مزدوروں اور کاشتکاروں کو اقتصادی پروگرام کے تحت منظم کرنا چاہئے اور یہ پروگرام آل انڈیا کانگریس کمیٹی مرتب کرے گی۔ اس کے بعد سے گورنمنٹ نے مزدوروں کے خلاف نہایت ظالمانہ قوانین پاس کرائے تھے، اور انکے بہترین رہنماؤں کو جیل کے تیرہ وتار کوٹھریوں میں بند کردیا تھا لیکن آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کے سابق صدر کے سامنے جب اپنے وطن کے لاکھوں اور کروڑوں مظلوم انسانوں کو ایک نئے مسلک اور نئے طریق کار سے مسلح کرنے کا موقع آیا تو وہ ہچکچانے اور پس وپیش کرنے لگے۔

اس سیاسی مسئلہ پر مسٹر نہرو کی برگشتگی نہایت شرمناک اور ناقابل معافی تھی۔ اگرچہ وہ اب بھی آزادی پر لمبی چوڑی تقریریں کرتے رہے، لیکن نہایت ہوشیاری کے ساتھ سلطنت برطانیہ سے مکمل انقطاع کی طرف ہلکا سا اشارہ بھی نہیں کیا۔ ہندوستان کی پہلی جمہوری کانگریس منعقدہ ۱۹۲۶ء (جسکا دوسرا اجلاس کبھی منعقد نہ ہوسکا) کا سابق صدر ہندوستان کی اشتراکی جمہوریت کے نصب العین کا تذکرہ تک نہایت مزے میں نظر انداز کرگیا۔ یہ فروگذاشتیں جو یقیناً گاندھی جی کے ایماء ومشورہ سے وجود میں آئی تھیں اور زیادہ ناقابل معافی معلوم ہوتی ہیں۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بھگت سنگھ اور اُن کے ساتھیوں نے اپنے آپ کو ہندوستانی سوشلسٹ ریپبلکن آرمی کا سپاہی ظاہر کرکے کیسے زبردست مظالم اور مصائب کا شکار بنالیا تھا۔ جب مسٹر نہرو نے اپنے بے مغز خطبہ صدارت کو انقلاب زندہ باد کے جنگی نعرہ پر ختم کیا ـــ سارا مجمع تحسین وآفریں کی صداؤں سے گونج رہا تھا ـــ تو انھوں نے ضرور محسوس کیا ہوگا کہ ان پرجوش نعروں سے وہ اپنی شرمناک سپر اندازی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کررہے تھے۔

آیئے اب کانگریس کی کارروائیوں کا جائزہ لیں۔ گاندھی جی اور انکی ساختہ پرداختہ مجلس مضامین نے بائیں بازو کے رہنماؤں کو خوش کرنے کے لئے صدر کو یہ اجازت دیدی کہ سب سے پہلے یہ تجویز پیش کی جائے کہ یہ جلسہ جتندر ناتھ داس اور پھونگی یو۔ وزیا کے زبردست ایثار وقربانی کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور انکے پس ماندگان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ نیز اس امر پر زور دیتا ہے کہ ہندوستان میں غیر ملکی حکومت ہی ان قیمتی جانوں کے تلف ہونے کی ذمہ دار ہے۔ ان انقلابی نوجوانوں کے حق میں جو اپنے آزادی وطن کے لئے زبردست شجاعت کا ثبوت دیتے ہوئے جاں بحق ہو چکے تھے اس قسم کی ایک رسمی تجویز پیش کرنے کے بعد (اور انکا تو ذکر ہی کیا جو میرٹھ رنگون اور لاہور اور کلکتہ کی جیلوں کی تیرہ وتاریک کوٹھریوں میں کس مپرسی

کے عالم میں پڑے ہوئے تھے، گاندھی جی نے غیر ملکی حکومت کے نمائندوں کے لئے اپنی بے پناہ ہمدردی کا اظہار حسب ذیل تجویز میں کیا۔

"یہ جلسہ وائسرائے کی اسپیشل کو بم سے اڑانے کی کوشش والے واقعہ کی سخت مذمت کرتا ہے۔ اور اپنے اُس عقیدہ کا اعادہ کرتا ہے کہ اس قسم کے اقدامات نہ صرف کانگرس کے مسلک کے خلاف ہیں۔ بلکہ ان سے قومی مفاد کو سخت نقصان پہونچتا ہے۔ یہ جلسہ وائسرائے اور اُنکی اہلیہ محترمہ اور اُنکے دیگر رفقار کو جن میں ملازمین بھی شامل ہیں اس خطرے سے بال بال بچنے پر مبارکباد دیتا ہے"

اس تجویز کے محرک یعنی گاندھی جی کی زبردست شخصیت بھی بہت سے مندوبین کو اس موقع پر پرزور مخالفت سے نہ روک سکی۔ سوامی گووندانند نے کہا۔ کہ عدم تشدد کا مسلک ان لوگوں پر نہیں ٹھونسنا چاہئے جو حصول آزادی کے سلسلہ میں مختلف ذرائع اور حکمت عملی پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر عالم نے اس تجویز کی مذمت کرتے ہوئے اسے غیر اہم ناموزوں اور مضرت رساں قرار دیا۔ اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ اس قسم کی تجویزوں سے حکومت کے ہاتھ مضبوط ہوتے ہیں۔ اور وہ معصوم انسانوں پر اور زیادہ ظلم کرتی ہے مسٹر راجہ نے اس کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ یہ تجویز کانگرس کے ملوکیت دشمن مسلک و نظریہ کے منافی ہے۔ کوماگاٹا مارو والے بابا گروت سنگھ نے کہا کہ اس تجویز کے معنی انگریزوں کو دھوکا دینا اور نوجوانان وطن کو اور زیادہ تشدد آمیز حرکات پر ابھارنا ہے۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ جب تک لارنس اور راوٹرم کے مجسمے ہیں وہ تلوار دکھاتے رہیں گے جس سے اُنھوں نے ہندوستان کو فتح کیا تھا اُس وقت تک ہندوستان کے نوجوانوں میں بھی تلوار نکالنے کا جذبہ ابھرتا رہے گا۔

ان تمام باتوں کے باوجود اس تجویز تہنیت کی ہلکی سی ترمیم بھی ۸۹۷ اور ۸۱۶ ووٹوں کے فرق سے مسترد ہوگئی۔ تاہم مخالفت میں اتنے کثیر التعداد ووٹوں نے گاندھی جی کے سیاسی اقتدار کو بڑا صدمہ پہنچایا۔ بہرحال ہوا وہی جو گاندھی جی چاہتے تھے۔

اب کانگرس کے ڈرامہ کا اصل اور اہم ایکٹ کا پردہ اٹھا اور مسٹر گاندھی نے پلیٹ فارم پر آکر مکمل آزادی کے سلسلہ میں حسب ذیل "شاندار" تجویز پیش کی:

"یہ جلسہ مجلس عاملہ کے منشور کی جو درجہ نوآبادیات کے متعلق وائسرائے کے اعلان مورخہ ۳۱ راکتوبر کے سلسلہ میں شائع ہوا ہے اور جس پر کانگرس اور دیگر جماعتی رہنماؤں کے دستخط ثبت ہو چکے ہیں تصدیق کرتا ہے۔ اور سوراج تحریک کے تصفیہ کے سلسلہ میں وائسرائے کی کوششوں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہے یہ جلسہ گاندھی ،، پنڈت موتی لال نہرو اور دیگر رہنماؤں کی وائسرائے سے ملاقات کے نتائج پر غور کرنے کے بعد یہ خیال کرتا ہے کہ موجودہ صورت حال میں مجوزہ گول میز کانفرنس میں کانگرس کی شرکت سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ اسی لئے یہ جلسہ گذشتہ سال کے اجلاس منعقدہ کلکتہ کی پاس شدہ تجویز کے پیش نظر یہ اعلان کرتا ہے کہ دستور کانگرس کی دفعہ میں لفظ "سوراج" کا مفہوم مکمل آزادی ہے اور نیز یہ کہ آج سے نہرو رپورٹ کی پوری اسکیم ختم ہو چکی ہے۔ اور اُمید کرتا ہے کہ اب تمام اراکین کانگرس اپنی ساری توجہ مکمل آزادی کے لئے وقف کردیں گے۔

حصول آزادی کے لئے ایک مہم کی تنظیم کے سلسلہ میں ابتدائی قدم اُٹھانے اور کانگرس پالیسی کو تبدیل شدہ مسلک کے ہم آہنگ بنانے کے لئے یہ جلسہ مرکزی و صوبائی مجالس قانون ساز اور سرکاری کمیٹیوں سے مکمل مقاطعہ کا فیصلہ کرتا ہے اور کانگرسی نیز دوسرے ہموطنوں سے جو قومی تحریک میں شامل ہیں مطالبہ کرتا ہے کہ وہ بالواسطہ یا بلا واسطہ آئندہ انتخابات میں حصہ نہ لیں اور موجودہ اراکین کانگرس کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ مجالس قانون ساز اور کمیٹیوں سے مستعفی ہو جائیں۔ یہ جلسہ قوم سے پرزور اپیل کرتا ہے کہ کانگرس کے تعمیری پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی پوری کوشش کریں اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی کو یہ اختیار دیتا ہے کہ جب وہ مناسب اور موزوں سمجھے وقت کے تقاضوں اور مصلحتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے سول نافرمانی کی تحریک شروع کرے

جبیں عدم ادائگی محاصل (خواہ مخصوص یا غیر مخصوص علاقوں میں ہو) بھی شامل ہو۔"
اب پھر مسٹر سوباس چندر بوس ہی کو (جو مسٹر نہرو کی تائید اور اعانت سے محروم ہو چکے تھے) گاندھی جی کی اس تجویز کے مقابلہ میں دوسری حسب ذیل تجویز پیش کرنی پڑی۔
"گذشتہ سال کلکتہ کانگرس کی پاس شدہ تجویز کے پیش نظر یہ جلسہ اعلان کرتا ہے کہ کانگرس کے مسلک میں سوراجیہ کے معنی مکمل آزادی کے ہیں جو برطانوی تعلقات سے مکمل علحدگی کے مرادف ہے۔
ہندوستان میں برطانوی شہنشاہیت اور اس کے ہندوستانی حامیوں کا خاتمہ کرنے اور مکمل آزادی حاصل کرنے کے لئے یہ جلسہ فیصلہ کرتا ہے کہ ایک طرف تو برطانوی شہنشاہیت کے بالمقابل اور متوازی ایک دوسری حکومت قائم کرنے کے پیش نظر سارے ملک میں آزادی کا زبردست پروپیگنڈا شروع کر دیا جائے۔ اور مزید براں دوسری طرف سول نافرمانی کی تحریک بھی شروع کر دی جائے جس میں عدم ادائگی محاصل اور عام ہڑتالیں شامل ہوں۔
مذکورہ بالا دوہرے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کیلئے یہ جلسہ فرزندان وطن سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ فوراً ملک کے نوجوانوں، مزدوروں، کاشتکاروں، اور دوسرے مظلوم طبقوں کو منظم کرنا شروع کر دیں۔ کانگرس کے نئے مسلک کے مطابق اور اس پروگرام پر پوری توجہ صرف کرنے کے خیال سے یہ جلسہ مرکزی و صوبائی مجالس قانون ساز سرکاری کمیٹیوں (بمقامی اداروں سے (جن میں پورٹ ٹرسٹ اور عدالتیں بھی شامل ہیں) مکمل مقاطعہ کا اعلان کرتا ہے اور اراکین کانگرس کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ آئندہ انتخابات میں حصہ نہ لیں۔ اور موجودہ مجالس قانون ساز کمیٹیوں اور انجمنوں کے تمام ممبران اپنی نشستوں سے مستعفی ہو جائیں اور تمام وکلاء اپنا پیشہ وکالت ترک کر دیں۔"
گاندھی جی اور مسٹر بوس کی تجویزوں میں جو گہرا فرق ہے وہ ظاہر ہے مسٹر بوس نے دراصل گاندھی جی اور کانگرس کو چیلنج دیا تھا کہ اگر وہ واقعی مکمل آزادی چاہتے ہیں تو کھل کر سامنے آجائیں اور دنیا کے سامنے حقیقی مقصد واضح کر دیں۔ اس نئے مسلک کی تمام پیچیدگیاں کانگرس کے گذشتہ سال کے بحث و مباحثہ میں بالکل واضح اور صاف ہو چکی تھیں۔ کیا پنڈت جواہر لال نہرو جو مدراس کانگرس (۱۹۲۷ء) میں تجویز آزادی کے بانی و محرک تھے تھوڑے ہی دن بعد جمہوری کانگرس کے سب سے پہلے اجلاس کی صدارت نہیں کر چکے تھے۔ کیا ۱۹۲۸ء میں بائیں بازو کے رہنما مکمل آزادی کو برطانیہ سے مکمل انقطاع کے مرادف نہیں سمجھتے تھے۔ اور درجہ نوآبادیات جیسے رجعت پسندانہ نظریہ کی سخت ترین مخالفت نہیں کرتے رہے تھے۔ یہ مسئلہ اب بالکل صاف ہو چکا تھا۔ گاندھی جی اور انکے پیرو اب بخوبی سمجھتے تھے کہ نوجوانان وطن مکمل آزادی سے کیا مراد لیتے ہیں گاندھی جی جب لاہور کانگرس کے پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے تو وہ یہ سمجھ چکے تھے کہ ملک میں سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے طبقہ کی ایک بہت بڑی اکثریت اب یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ ہندوستان کو ایک غیر ملکی حکومت کی زنجیروں سے آزاد کرانا ہے اور متحدہ ہندوستان میں ایک نئی جمہوریت کی بنا ڈالنی ہے۔ ہندوستان کے عوام کے دلوں کی اس آواز کی صحیح ترجمانی مسٹر بوس کر رہے تھے۔ لیکن ایک مرتبہ پھر گاندھی جی نے سارے معاملہ کو الفاظ کے گورکھ دھندے میں الجھا کر پس پشت ڈال دیا اور نوجوان رہنماؤں نے انھیں جس چپقلش میں مبتلا کر دیا تھا اس سے نکل گئے۔
تاریخ گاندھی جی پر کلکتہ کانگرس کی کھلی شکست کے مقابلہ میں انکے لاہور کانگرس کے رویہ پر زیادہ سخت فیصلہ لکھے گی۔ وہ بلاشبہ ایک سال قبل برطانوی شہنشاہیت کی حمایت میں زیادہ صاف دلی و صاف گوئی سے کام لے رہے تھے کیونکہ اس وقت وہ بالاعلان درجہ نوآبادیات کی تائید کر رہے تھے جس کے معنے ۳۵ کروڑ انسان کو ابداً چار کروڑ غیر ملکیوں کی غلامی میں جکڑے رکھنا تھا۔ اور لطف تو یہ کہ انھیں اس کے اعتراف سے کوئی عار بھی نہیں تھا۔ اس لئے عوام جانتے تھے کہ اس معاملے میں انکی کیا رائے ہے۔ اور ان سے کیا توقع رکھنی چاہئے۔ لیکن بھگت سنگھ کے مصائب و آلام، جتندر داس کی قربانی، اور اسیران میرٹھ کے قید و بند، اور عام ہڑتالوں کی آگ، جو ملک کے طول و عرض

میں پھیل چکی تھی۔ اور اپنے شفیق دیرینہ، لارڈ اردن کی طرف سے پے در پے جھڑکیوں اور حوصلہ شکن حالات کے پیش نظر اب جب ان کے لیے لاہور میں قوم کے مطالبہ آزادی کو ٹالنا قطعاً غیر ممکن ہوگیا تو وہ گندم نما جو فروشی پر اُتر آئے اور بدنیتی کی بنا پر یہ تہیہ کیا کہ دل میں کچھ ہو کم از کم زبانی آزادی ہی کی تبلیغ کی جائے۔ اُنھوں نے مکمل آزادی کی تجویز ضرور پیش کی مگر اس کی حمایت کے لئے دل سے تیار نہ تھے۔ وہ قومی جنگ کا نعرہ لگانے کے لیے آگے ضرور بڑھے لیکن دل سے وہی "اولڈ گارڈ" کے سپاہی بنے رہے۔ انھوں نے اپنے دل میں "مکمل آزادی" کے مسلک کو "درجہ نوآبادیات" کا مرادف قرار دے لیا تھا، اور واقعہ یہ ہے کہ جب وہ علی الاعلان "درجۂ نوآبادیات" کو "منشور آزادی" کہہ سکتے تھے تو انھیں "مکمل آزادی" کو بھی برطانیہ کی ماتحتی اور حلقہ بگوشی سے تعبیر کرنے میں کیا دقت ہوسکتی تھی! چنانچہ اُنھوں نے برطانیہ سے مکمل انقطاع کے مسئلے میں اپنی پُر فریب اور مغالطہ خیز خاموشی سے کام لیا اور مکمل آزادی کی تجویز پیش کر کے عوام سے نہایت پُرجوش نعرہائے تحسین حاصل کر لیے حالانکہ دل میں وہ اب بھی اُتنے ہی پکے ملوکیت پرست تھے!

ایک طرف تو اُنھوں نے اس نئی تجویز کے مقاصد کو اپنے مبہم الفاظ کی پیچیدگیوں میں اُلجھا کر نفسِ مسئلہ کو بالکل پس پشت ڈال دیا۔ (جس کا فائدہ اُنھوں نے بعد کو اُٹھایا) اور دوسری طرف مزدور ہڑتال کے طریق کار کو جس پر بائیں بازو کے رہنما بہت زور دے رہے تھے، نہایت بے باکی کے ساتھ قطعی طور پر مسترد کر دیا۔ ہر شخص یہ جانتا تھا کہ ۱۹۲۹ء کے واقعات کے بعد کانگرس کے لیے سوائے اس کے کوئی چارۂ کار نہیں تھا کہ مزدوروں کے اس حربے کو جو بین الاقوامی اہمیت اور شہرت کا حامل تھا مضبوط کرتی۔ دراصل عام ہڑتال ہی ایک ایسا حربہ تھا جس کے ذریعے عوام برطانوی حکومت کے اس چیلنج کا جو حکومت نے مزدوروں کے رہنماؤں کو گرفتار کر کے دیا تھا دنداں شکن جواب دے سکتے تھے۔ جیسا ہم پہلے واضح کر چکے ہیں، حکومت گاندھی جی کی تحریک سول نافرمانی شروع کرنے کی دھمکی سے اتنی زیادہ خائف نہ تھی بلکہ اصل چیز جس نے برطانیہ کے ہندوستانی سوداگروں کے اوسان خطا کر رکھے تھے وہ مزدوروں کی مسلسل بے اطمینانی تھی جس کے متعلق اندیشہ تھا کہ کہیں عام ہڑتال کی صورت نہ اختیار کر لے — لہٰذا مسٹر بوس نے — اگرچہ قدرے بے دلی کے ساتھ — اسی پر زیادہ زور دیا تھا۔ بہرحال اس کے متعلق کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ رہ گئی تھی۔ مگر گاندھی جی نے اس کے بارے میں ایک لفظ بھی کہنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ پنڈت جواہر لال نہرو کو مسندِ صدارت پر بٹھا کر اپنے ساتھیوں سے غدّاری پر آمادہ کر ہی چکے تھے۔ ایک سال قبل مسٹر بوس کی اس قسم کی تجویز پر ۱۳۵۰ کے مقابلہ پر ۹۷۳ ووٹ آئے تھے (میں آج یہ صورت تھی کہ مسٹر بوس کی اس تجویز کی رائے شماری کی بھی نوبت نہ آئی۔

ہم یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ ہم مسٹر بوس کو اس خالص انتہا پسندانہ تجویز پیش کرنے پر اپنی دلی خواہش کے باوجود مبارکباد نہیں دے سکتے۔ کیونکہ اگرچہ انھوں نے برطانیہ سے مکمل انقطاع کا نعرہ لگایا لیکن ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ ہندوستان میں ایک جمہوری حکومت قائم کرنے کے تاریخی مشن کا اعلان کر دیتے۔ اس کے علاوہ یہ کہ اگرچہ اُنھوں نے کانگرس کو حسب موقع عام ہڑتالیں کرانے کا مشورہ ضرور دیا لیکن اس تاریخی اور زبردست جنگی نعرہ پر پورا پورا زور نہ دے سکے، حالانکہ یہی وہ حربہ تھا جس نے ۱۹۰۵ء میں زارِ اعظم کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا اور انگلینڈ کے قدامت پسند مزدور طبقہ کو بھی ۱۹۲۶ء میں فتح سے تقریباً ہم آغوش کر دیا تھا۔ دراصل ایسی انقلابی تجویز جو قوم کی سیاسی اور اقتصادی نصب العین پر مبنی تھی اور جس کے حصول کے لیے ایسے پُر زور حربے درکار تھے۔ ان کی تحریک بھی مزدور طبقے ہی کے جوشیلے اور دلیر رہنماؤں کی طرف سے ہونی چاہیے تھی لیکن حکومت نے پہلے ہی ان کے تمام رہنماؤں کو میدانِ جنگ سے ہٹا کر میرٹھ کی جیلوں میں ڈال دیا تھا۔ بعض نہایت غیر اہم اور فروعی ترمیموں کے پیش اور مسترد ہونے کے بعد گاندھی جی کی تجویز پاس ہوگئی اور اس نے انقلاب زندہ باد کے نعروں کا کھوکلا پن ظاہر کر دیا جو دوران اجلاس میں پنڈال کے گوشے گوشے میں گونج رہے تھے۔ ڈاکٹر عالم نے گاندھی جی کی تجویز میں وائسرائے کے متعلق تحسینی فقرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ چونکہ ہماری یہ قرارداد آئندہ نسلوں کے لیے ایک منشور آزادی کی حیثیت رکھتی ہیں، لہٰذا اس میں غلامانہ ذہنیت کا شائبہ بھی نہ ہونا چاہیے۔ لیکن نام نہاد "منشور آزادی"، دراصل ایک فریب دمرب کے سوا کچھ نہ تھا!

چوہتّرواں باب

’نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن‘

گاندھی جی کی ریاکارانہ تجویز پر لفظ ’آزادی‘ کا اطلاق کرنا خود اس لفظ کی توہین ہے کیوں کہ یہ تجویز مجموعہ اضداد کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ تاریخِ عالم میں کوئی ایسی قوم بھی ملے گی جو ایک طرف تو مکمل آزادی کی جنگ کا بھی ادعا کر رہی ہو اور دوسری طرف ایک غیر ملکی حکومت کی محکومی اور حلقہ بگوشی پر بھی رضامند ہو۔ سوائے اس بدقسمت ہندستان کے جس کو ایک نقلی رشی اور دورِ جدید کے چانکیا نے مسحور کر رکھا ہے اور ایسا کون ملک ہوگا جسے ایک لمحہ کے لیے بھی یہ مغالطہ دیا جا سکتا ہو کہ سول نافرمانی جیسے حقیر اور مضحکہ خیز پروگرام یا عدم ادائگی محاصل جیسی تحریکوں کے ذریعہ جن پر ہزاروں پابندیاں بھی ہوں (خواہ وہ محدود علاقوں میں چلائی جائیں خواہ وہ غیر محدود علاقوں میں)، ملک آزاد کرایا جا سکتا ہے؟ کوئی نہیں۔ افراد یا قومیں جن میں واقعی آزادی کی صحیح لگن ہوتی ہے ان کے تیور اور جوہر کچھ اور ہی ہوتے ہیں، ان کے پاس لفظی گورکھ دھندوں اور کھوکھلی تدابیر کے سوچنے کا وقت نہیں ہوتا۔ وہ تو پورے تیقن کے ساتھ ہدفِ مقصود پر نظریں جما دیتے ہیں اور پھر تیر چلاتے ہیں۔ ان کا نشانہ کبھی خطا نہیں کرتا۔ نہ وہ پس و پیش کرتے ہیں نہ لڑکھڑاتے ہیں نہ ٹھٹک ٹھٹک کر سوچ بچار کرتے رہتے ہیں۔ وہ سورماؤں کی طرح ہرچہ باداباد کہہ کر بھرپور وار کرتے ہیں پھر آگے یا قسمت یا نصیب۔

سوادھن بھارت سنگھ (انجمن مظلومین سیاسی) منعقدہ ۲۸ دسمبر ۱۹۲۹ء —— کانگرس اجلاس کے ایک روز پہلے —— کی قراردادیں اور تقریریں تاریخ کا فیصلہ پہلے ہی سُنا چکی تھیں۔ یہ نئی جماعت ظاہرا سیاسی قیدیوں اور مظلوموں کی، ایک جماعت تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ سیاسی کارکنوں کے ساتھ حکومت کی بدسلوکی اور مظالم کو طشت از بام کرے اور اس سلسلے میں انڈین نیشنل کانگرس کی بے توجہی کو منظرِ عام پر لائے۔ اس میں شک نہیں کہ اس نئی جماعت کا مقصد مکمل سیاسی آزادی کے لیے مسلسل پروپیگنڈہ کرنا تھا۔ اور کانگرس کے نام نہاد سورماؤں کی خبر لینا بھی۔ لالہ ہنونت سہائے نے جو اس جماعت کے صدر تھے، ملک کے سیاسی حالات کے پیشِ نظر انقلابی نظریہ کی حسب ذیل الفاظ میں نہایت پُرزور ترجمانی کی:-

”کانگرسی اور سیاسی رہنماؤں کی سرگرمیاں گورنمنٹ کے اقدامات کے خلاف احتجاج بلند کرنے اور بعض زیادتیوں کی تلافی کرانے تک محدود رہی ہیں، دہلی کا حالیہ منشور صاف طور پر مظہر ہے کہ کانگرسی رہنما اب تک پرانی غلامانہ ذہنیت سے نجات نہیں پا سکے۔ میرا خیال ہے کہ گول میز کانفرنس جو خود حکومت کے انتخاب کردہ افراد پر مشتمل ہے ایک تحقیقاتی کمیٹی سے زیادہ اہمیت کی حامل نہ ثابت ہوگی اور اس سے کوئی خاص توقع وابستہ نہیں کی جا سکتی۔ یہ کانفرنس ایسے چند ریاستی مسئلوں کو سامنے لائے گی جو قومی تحریک کے لیے بجائے مفید ثابت

ہونے کے مُضر ثابت ہوں گے۔ اگر وہ اپنے وطن کی سربلندی چاہتے ہیں تو درجۂ نوآبادیات کی بجائے پُرامن ذرائع سے مکمل آزادی کے حصول کی دل و جان سے کوشش کریں۔"

جب اس کانفرنس کے انقلابیوں نے آزادی کی آواز بلند کی تھی تو ان کا مقصد ہندستان کی مکمل خود مختاری اور سلطنت برطانیہ کے قید و بند سے قطعی آزادی کا تھا۔ کیا گاندھی جی نے خود بار بار ۱۹۲۰ء میں اس بات کا اعادہ نہیں کیا تھا کہ وہ ہندستان کی آزادی چاہتے ہیں چاہے وہ سلطنت برطانیہ کے اندر رہ کر ہو یا اس سے علیحدگی اختیار کر کے۔ کیا گاندھی جی نے درجۂ نوآبادیات اور مکمل آزادی ـــــ بمعنی سلطنت برطانیہ سے مکمل انقطاع ـــــ کے درمیان، بھی کوئی راستہ چھوڑ دیا تھا؟ یہی وہ بنیاد تھی جس پر وہ ۱۹۲۱ء سے برابر مکمل آزادی کی تجویز کے خلاف جنگ کر رہے تھے لیکن اب ان کا سامنا ایک ناگزیر صورت حال سے ہو گیا تھا تو انھوں نے ایک فلسفیانہ موشگافی اور دقیقہ سنجی کی آڑ میں پناہ لی اور آزادی کے تصور کو موہوم اور مبہم بنا کر رکھ دیا اور کانگرس سے اپنے جدید بے معنی پیغام اور نعرے کا اعلان کرا کے اسے بھی نہایت ہی مضحکہ خیز اور قابل استہزا، تماشا بنا ڈالا۔

لاہور کانگرس کے اس ریاکارانہ اور جھوٹی تجویز کے سلسلے میں نقلی مخالفت کا ڈھونگ بھی رچایا گیا۔ اب ہم ۱۹۳۰ء کے ان متلون مزاج اور مذبذب اداکاروں کی طرف (اپنی) توجہ مبذول کرتے ہیں۔ لاہور کانگرس کی پالیسی اور پروگرام کی پیچیدگیاں مندوبین کانگرس اور دوسرے سیاسی لوگوں کی جو ملک کے ہر چہار طرف سے اس تاریخی اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے سمجھ میں نہ آئیں۔ انھوں نے تجویز آزادی کا بڑا پُرجوش خیر مقدم کیا تھا۔ انھیں اس امر کا یقین ہو گیا تھا کہ بالآخر کانگرسی رہنماؤں نے ہندستان کو غیر ملکی حکومت سے آزاد کرانے کا تہیہ کر لیا ہے۔ اس لیے انھوں نے سول نافرمانی اور عدم ادائیگی محاصل، کی تجاویز کا بھی نعرہ ہائے تحسین سے خیر مقدم کیا تھا۔ انھوں نے واقعی اس آواز کو آزادی کی پُرامن جنگ کا بگل سمجھا اور قومی جھنڈے کو سلامیاں دیں۔ اپنی سادہ لوحی سے انھوں نے یہ خیال قائم کر لیا کہ کانگرس اب کسی دوسرے کی نہیں ہو سکتی اور نہایت جوش و خروش کے ساتھ انقلاب زندہ باد کے نعرے لگائے۔ انھیں یقین ہو چکا تھا کہ ایک پُرامن انقلاب مُلک کے دروازے پر پہنچ چکا ہے۔

گاندھی جی نے عوام کے دلوں کی ان سلگتی ہوئی چنگاریوں کو بھانپ لیا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ فضا میں ایک عظیم الشان تلاطم برپا ہونے والا ہے اور وہ ان تمام علامتوں اور نشانیوں سے پوری طرح خبردار تھے لہٰذا انھوں نے کانگرس کی تجویز آزادی کی تشریح کرنی شروع کی اور ستیہ گرہ کے مقدس نام پر مسلح انقلاب اور مزدوروں کی شورش کے خلاف مستقل جنگ شروع کر دی۔ دوسری طرف انھوں نے کانگرس کے اندرونی حلقوں کے تیز مزاج اور جوشیلے افراد کو بھی ضبط و نظم کے نام پر خاموش کر دیا تاکہ سلطنت برطانیہ کے نمائندوں سے گفت و شنید اور مصالحت کی راہیں کھلی رہیں۔ لیکن وہ اسے بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ انقلاب کی ان طاقتوں کو روکے رکھنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ برطانوی اقتدار کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر ایک نقلی اور ریاکارانہ مہم نہ شروع کر دی جائے۔ یہ اقدام ہندستان کے کروڑوں انسانوں کے قلوب میں گھر کرے گا اور وہ (گاندھی جی) پھر قومی لشکر کے "سیناپتی" بن جائیں گے۔

اب آیئے ہم اوائل ۱۹۳۰ء کے تیز رو واقعات پر ایک نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ گاندھی جی نے دُنیا کے اخباروں کے لیے موٹی موٹی سرخیوں کی خبریں کیوں کر بہم پہنچانی شروع کیں۔

مجلس عاملہ کے انتخاب کے سلسلے میں پہلی جنوری کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا۔ گاندھی جی نے صدر کانگرس کو اپنی مرضی سے دس ممبروں کا ایک بلاک منتخب کرنے کے تجویز پیش کی۔ دائیں اور بائیں بازو کے مابین اس پر اختلاف ہوا۔ جب رائے شماری ہوئی تو گاندھی جی کی تجویز کے حق میں اٹھتر ووٹ آئے اور مخالفت میں صرف باسٹھ' بالآخر یہ فہرست کثرت آرا سے منظور ہوگئی۔ ۱۲ جنوری کو سیاسی مہم کے پروگرام کی تفصیلات پر غور و خوض کرنے کے لیے نئی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا۔ مجلس عاملہ کے لیے طے شدہ بات تھی کہ وہ مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز کے تمام اراکین کو نشستوں سے مستعفی ہو جانے کی اپیل کرے گی لیکن اس نے ایک اور سوانگ بنایا۔ مکمل آزادی کا پیغام ہندستان کے دور دراز گانوں اور قصبات تک میں پہنچانے کے لیے اعلان کیا گیا کہ ۲۶ جنوری کو یوم آزادی منایا جائے اور کانگرس کی طرف سے شائع کیے ہوئے اعلان کو ہر جلسہ میں پڑھا جائے اور حاضرین سے کہا جائے کہ ہاتھ اٹھاکر اس کی تصدیق و حمایت کا اعلان کریں۔ یہ قیمتی مشورہ دیتے وقت جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ گاندھی جی اور ان کی کمیٹی نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ منشور کے پڑھے جانے کے موقعہ پر کوئی تقریر نہ ہونے پائے۔ مطلب یہ تھا کہ آزادی کی جدوجہد کے اس اہم اور تاریخی موقعہ پر جب ہزاروں اور لاکھوں انسان اس فرمان کو سننے کے لیے جمع ہوں تو ایسی احتیاط برتی جائے کہ کوئی بات منہ سے نہ نکلے۔ جذبات برانگیختہ نہ ہوں کیوں کہ یہ چیزیں حاصل شدہ حقوق والوں کے روحانی امن و سکون کو برہم کرتی ہیں۔ صرف ایک مقررہ منشور پڑھا جائے اس کے بعد لوگ ٹھنڈے ٹھنڈے گھر چلے جائیں، اس طرح مسٹر گاندھی نے سال کے پہلے ہی دن سے لوگوں کا منہ بند کرنے کی ترکیب شروع کر دی۔

۳ جنوری کو پنڈت موتی لال نہرو نے بگل بجایا کہ لیجسلیٹو اسمبلی کے تمام کانگرسی ممبر فوراً مستعفی ہو جائیں۔

۶ جنوری کو پنڈت جواہر لال نہرو نے اپیل کی کہ ۲۶ جنوری کو آٹھ بجے صبح قومی جھنڈے لہرائے جائیں اور شام کو جلوس نکالے جائیں، جلسے ہوں اور یوم آزادی منایا جائے۔

ایک اہم واقعہ نے ہندستان کی اس نئی تحریک کے غیر ملکی حامیوں کے مقاصد پر زبردست روشنی ڈالی سنیٹر بلین نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے سینٹ میں حسب ذیل تجویز پیش کی۔

"دراں حالیکہ ہندستان کے باشندے آئینی طور پر حکومت خود اختیاری کی جدوجہد اور قومی آزادی کا مطالبہ کر رہے ہیں ممالک متحدہ امریکہ کا یہ سینٹ خود اپنی جنگ آزادی کے پیش نظر جس کے ذریعے اسے موجودہ جمہوریت حاصل ہوئی ہے ہندستان کے ساتھ پوری ہمدردی اور حریت و استخلاص وطن کی جدوجہد میں اس کی ہم نوائی کا اظہار کرتا ہے۔ یہ سینٹ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر کو اپنی آئینی حمایت کا یقین دلاتا ہے کہ جب کبھی وہ مناسب سمجھیں ہندستان کی خود مختاری و آزادی کو تسلیم کر لیں بلکہ سفارش کرتا ہے کہ اسے جلد از جلد تسلیم کر لیا جائے۔"

دراں حالیکہ ایک سچا امریکی شہری، خود مختاری اور جمہوریت پر زور دیتے ہوئے یہ کہہ رہا تھا کہ قومی آزادی کے تصور میں ان دونوں کا کتنا لگاؤ ہے مسٹر گاندھی نے اپنے لفظی جوڑ توڑ کے ذریعے اس قسم کے فضول تصورات کی طرف سے منہ موڑ لیا۔ ینگ انڈیا مورخہ ۹ جنوری میں کانگرس کے لاہور سیشن کا جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے کانگرس کے پرانے اور نئے مقاصد و مسلک کی حسب ذیل الفاظ میں تشریح کی:-

"کلکتہ کانگرس کی تجویز کے عین مطابق اور خود بخود نئے حالات کے پیدا ہونے کے باعث ۳۱ دسمبر ۲۹ء کی آدھی رات کو کانگرس نے درجۂ نوآبادیات کے بجائے مکمل آزادی کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ یہ بہت اچھا ہوا۔ کلکتہ کی تجویز

سے قطع نظر، سٹر بن کے یہ کہنے کے بعد کہ ہندستان میں درجۂ نوآبادیات عمل میں آچکا ہے، اب یہ اصطلاح کسی حالت میں قوم کے نظریہ کی ترجمانی نہیں کرتی۔ کانگرس کے سامنے درجۂ نوآبادیات کے معنی مکمل آزادی اور حکومت برطانیہ کے ساتھ اختیاری وابستگی کے تھے۔ (جیسی وابستگی باہمی مفاد کے لیے کسی اور قوم کے ساتھ بھی ہو سکتی ہے) اس کے علاوہ کچھ دنوں سے یہ بھی سُنا جا رہا ہے کہ آزادی "خلافِ قانون" ہے۔ اگر سوراج ایک مبہم لفظ تھا تو اب اس کے ابہام کو دور کرنے کے لیے اس لفظ کو "پورن سوراج" میں تبدیل کر دیا گیا ہے"۔

اس طرح گاندھی جی نے مکمل آزادی کو درجۂ نوآبادیات کے مرادف تعبیر کرکے خود اپنے آپ کو اور ساتھ ساتھ کانگرس کو بھی ذلیل کیا۔ اس تعبیر کے تو معنی یہ ہوئے کہ یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ غلامی کے جہنم میں آزادی کے جنت کی فضا ہے۔ اب آپ خود ہی خیال فرما سکتے ہیں کہ آئرستان کا ایک ریپبلکن یا امریکہ کا ایک سینٹر اس قسم کی پست ذہنیت کے غلط اجتہاد اور مغالطہ آمیزی پر کیا کہتا۔

گاندھی جی فرماتے ہیں "قرارداد کا مرکزی حصہ ملک کے نصب العین، اس کے حصول کے ذرائع اور طریق کار کی وضاحت کرتا ہے مگر کسی حال میں بھی یہ قرارداد کسی کانفرنس کے انعقاد کے منافی نہیں ہے۔ میں کم از کم ایک صورت ضرور بتا سکتا ہوں جس میں کانگرس حکومت کی کسی ایسی کانفرنس میں شرکت کر سکتی ہے۔ وہ صورت یہ ہے کہ حکومت برطانیہ قطعی طور سے کانگرس کو ایک خود مختار حکومت کی تشکیل اور اسکیم مرتب کرنے کی دعوت دے اور ایسی کانفرنس کے لیے اور جو کچھ شرائط ہیں اُنھیں بھی پورا کرے، تو مجھے یقین ہے کہ کانگرس کے رہنما اس میں شرکت کے لیے ضرور آمادہ ہو جائیں گے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اس قسم کی کوئی کانفرنس کسی نہ کسی مرحلے پر ہونی ضروری ہے۔

اس طرح گاندھی جی نے اپنی عشوہ طراز نگاہیں وائسریگل لاج کی طرف ڈالیں در آں حالیکہ وہ انتہا پسند طاقتوں کے ساتھ مل کر وطن کی قیادت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

پھر سول نافرمانی کے اہم مسئلے کی طرف رجوع کرتے ہوئے آپ نے فرمایا "میں یہ بخوبی جانتا ہوں کہ اس تحریک کی تمام تر ذمہ داریاں مجھ پر ہیں۔ لیکن مجھے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میں آج اس کے لیے فضا کو سازگار نہیں پاتا ہوں"۔

"وہ وقت ضرور آئے گا کہ جب ہم سفینہ سوزی کرکے ایک فیصلہ کن اور آخری جنگ لڑیں گے۔ لیکن موجودہ اراکین کانگرس کے طبعی رجحانات، اور اپنے داخلی اختلافات اور فرقہ وارانہ کشیدگیوں کی موجودگی میں کسی مؤثر اور غیر مضرت رساں فارمولے کا ڈھونڈھ نکالنا بہت مشکل ہے۔ کانگرس کی طرف سے سر دست سول نافرمانی شروع کرنا غیر ممکن معلوم ہوتا ہے۔ چند مہینوں کے بعد فضا کو جب پوری طور سے عدم تشدد کے معیار کے مطابق پاؤں گا اور کانگرس کے تعمیری پروگرام کی تکمیل ہو چکے گی تو میں ضرور ایک عام سول نافرمانی کی کام یاب جدوجہد شروع کر دوں گا"۔

آپ دیکھتے ہیں کہ اس موقعہ پر گاندھی جی ایک "غیر مضرت رساں اور کامل عدم تشدد کی فضا" تلاش کر رہے تھے تاکہ جنگ کو کام یابی کی حد تک لڑ سکیں، کام یابی کے معنی ـــ نئی گفت و شنید، نئے پیماں ـ اور سنہری زنجیریں!

اس اثنا میں گورنمنٹ کی جارحانہ کارروائی برابر جاری رہی۔ ۱۱ جنوری کو اسیرانِ میرٹھ میں سے اکتیس[۳۱] افراد کے خلاف مجسٹریٹ نے دفعہ ۱۲۱ الف ضابطہ فوجداری کی رُو سے ملک معظم کے خلاف بغاوت کا

جرم عائد کیا۔

۲۲ ؍جنوری کو مسٹر سوبھاش چندر بوس اور دوسرے گیارہ مشہور اراکین کانگرس کو بغاوت انگیز پروپگنڈہ کرنے کے جرم میں ایک ایک سال قید بامشقت کی سزادی گئی۔ یہ رہنما بظاہر تو صرف یوم مظلومینِ سیاسی منانے کے سلسلے میں جلوس کی قیادت کرنے اور ''انقلاب زندہ باد'' ''شہنشاہیت برباد'' لکھے ہوئے جھنڈے لگانے کے جرم میں سزایاب ہوئے تھے لیکن اصلیت یہ ہو کہ مسٹر بوس اور اُن کے رفقا کو کانگرس میں بائیں بازو کی قیادت کے جرم میں سزا ملی تھی۔ ان کا ناقابل معافی جرم یہ تھا کہ جب وہ آزادی کا لفظ زبان پر لاتے تھے تو اُس کا مفہوم وہی لیتے تھے جو عام طور پر دنیا لیتی ہو۔

۲۵ ؍جنوری کو وائسرائے نے مجلس قانون ساز کے سرمائی اجلاس کی افتتاحیہ تقریر کے موقعہ پر کانگرس کی تجویز آزادی اور سول نافرمانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔" دارالعوام کی حالیہ اور واضح خواہش کے مطابق ملک معظم کی حکومت اس بات کی متمنی ہو کہ برطانیہ عظمیٰ اور ہندستان کے درمیان جو پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں ان کا حل نکالا جائے اور سمجھوتے کی کوئی نہ کوئی راہ تلاش کی جائے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ میرے لیے یہ واضح کردینا بھی ضروری ہو کہ قانون اور امن کے قیام کے سلسلے میں مجھ پر اور میری حکومت کے سر پر جو ذمہ داریاں ہیں انھیں میں ہرطرح پورا کروں گا۔"

دوسرے ہی دن (۲۶ ؍فروری کو) تمام ہندستان میں جبرو تشدد اور اس توہین آمیز دھمکی کا جواب غیر معمولی جوش وخروش کے ساتھ یوم آزادی مناکر دیا گیا۔ جواہر لال نہرو نے پریس کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ" ملک کے طول وعرض سے جو اطلاعات آرہی ہیں وہ مظہر ہیں کہ ہندستان کے ہر طبقے نے یوم آزادی بڑے جوش وخروش کے ساتھ منایا ہو اور گانوؤں اور شہروں کے باشندوں نے اس آزادی کے مظاہرے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی ہو۔ بمبئی اور کلکتہ جیسے بڑے شہروں میں ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں فرزندانِ وطن جمع ہوئے اور آزادی کا عہد و پیماں کیا۔ اسی طرح گانوں اور قصبات میں عظیم الشان اجتماعات ہوئے اور قوم کی آواز ملک کے طول وعرض میں گونجنے لگی۔ وطن کے کروڑوں فرزندوں نے آزادی کے حلف نامہ پر دستخط کیے اور یہ تہیہ کرلیا کہ برطانیہ کے اس رابطہ کو جس نے ہرطرح پر ملک کو تباہ وبرباد کردیا ہو ہمیشہ کے لیے ختم کردیں گے۔ اب عہد نامہ پر دستخط ہوچکے ہیں۔ آزادی کا جھنڈا بلند ہوچکا ہو۔ اب جس کمیٹی نے بھی حلف اٹھایا ہو اسے ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے ارادے میں کمزوری نہیں پیدا ہونے دینی چاہیے اور ہرگز کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جس سے قومی جھنڈے کی توہین ہو۔"

بعد کے واقعات نے ہمیں بتایا کہ گُرو گاندھی اور ان کے چیلے دیر جواہر ہی سب سے پہلے افراد تھے جنھوں نے برطانیہ سے انقطاع کے مقدّس عہد و پیماں کو بھلایا اور ۳۱ ؍فروری کو وائسریگل لاج کے سامنے قومی جھنڈے کو سرنگوں کردیا۔

اب آیئے ہم کانگرس کے اس رنگین اور بوقلموں منشور کی طرف لوٹیں جو ارباب کانگرس کے ایما سے سارے ملک میں پڑھ کر سنایا گیا تھا اور منظور کیا گیا تھا۔

"ہمارا عقیدہ ہو کہ ہندستانیوں کا، نیز دُنیا کی اور تمام قوموں کا یہ پیدائشی حق ہو، جسے چھینا نہیں جاسکتا

کہ وہ اپنی محنتوں کا ثمرہ اور ضروریاتِ زندگی حاصل کرسکیں تاکہ ان کو اپنی ترقی کے پورے مواقع رہیں۔ ہمارا عقیدہ ہی کہ اگر کوئی حکومت لوگوں کو ان حقوق سے محروم کرتی ہی اور ان پر ظلم کرتی ہی تو لوگوں کو اس کا بھی حق ہی کہ وہ اسے بدل دیں یا ختم کردیں۔ ہندستان میں حکومت برطانیہ نے نہ صرف لوگوں کے حقوق آزادی سلب کرلیے ہیں بلکہ اپنی بنیاد ہی یہاں کے عوام کو ہدف انتفاع بنائے رکھنے پر قائم کی ہی اور ہندستان کو اقتصادی، سیاسی، تہذیبی، روحانی، غرض ہر اعتبار سے پامال کر رکھا ہی۔ لہذا ہمارا ایمان ہی کہ ہندستان کو برطانوی ربط منقطع کرکے 'پورن سوراج' یا 'مکمل آزادی' حاصل کرنی چاہیے۔"

اس کے بعد اس منشور میں بعض تفصیلات درج تھیں کہ اقتصادی، سیاسی نیز دیگر طریقوں پر کیوں کر ہندستان کو تباہ کیا گیا ہی۔ پھر آخر میں یہ نوٹ تھا:۔

"ہم اس حکومت کے سامنے جس نے ہمارے ملک کو ہر طرح تباہ و برباد کردیا ہی سر تسلیم خم کرنا ایک اخلاقی جرم اور دینی گناہ سمجھتے ہیں ہمیں یقین ہی کہ اگر ہم حکومت کے ساتھ رضاکارانہ تعاون کو منقطع کرلیں اور محاصل کی ادائگی روک دیں اور باوجود ظلم اور اشتعال انگیزی کے عدم تشدد کا دامن اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیں تو اس انسانیت سوز حکومت کا یقیناً خاتمہ ہوجائے گا۔"

یہ دراصل ان تاریخی اعلانوں کی جو مظلوم اور غلام قومیں عام طور پر اپنی جنگ آزادی شروع کرنے سے پہلے کرتی ہیں غلط اور جھوٹی تقلید تھی۔ مجھے الفاظ نہیں ملتے کہ میں اس ذہنیت پر اپنے احساسات شرم و ذلت کا اظہار کرسکوں ہر قوم جو اپنی خود مختاری اور آزادی کی جنگ میں مصروف ہو اپنے پیدائشی حق کے حاصل کرنے کے سلسلے میں اس قسم کی پیچیدہ اور لجاجت آمیز صفائی پیش کرنا اپنے ملی وقار کے منافی سمجھتی ہی۔ اب تک گاندھی جی کے سامنے حکومت خود اختیاری یا ہندستانی جمہوریت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ اور وہ "برطانیہ سے انقطاع" کی تحریک کی تائید کرنے کے گناہ کا کفارہ ادا کرنے کے لیے بے چین تھے اور اسی خیال کے پیشِ نظر انھوں نے چار دن کے اندر اندر (۳۰ جنوری) وائسرائے کو حکومت کے نقطہ نظر کی وضاحت پر اور فضا کو صاف کرنے پر مبارک باد دی اور کہا کہ اگر حکومت ہماری صرف گیارہ شرطوں کو مان لے تو ہم سول نافرمانی کی تحریک واپس لے لیں گے اور حکومت سے حقیقی تعاون کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ یہ شرائط حسب ذیل ہیں:۔

"(۱) مکمل انسداد مسکرات (۲) روپیہ کے تناسب میں ۱/۱۶ شلنگ کی تخفیف (۳) مال گزاری میں کم از کم پچاس فی صدی کی تخفیف اور اس پر مجلس قانون ساز کو اقتدار (۴) نمک کے ٹیکس کی تنسیخ (۵) فوجی اخراجات میں کم از کم پچاس فی صدی کی تخفیف (۶) آمدنی گھٹ جانے کے پیش نظر بڑے بڑے عہدوں کی تنخواہوں میں نصف یا اس سے کم کی تخفیف (۷) غیر ملکی کپڑوں پر محافظتی چنگی (۸) ساحلی آمد و رفت کے ریزولیشن بل کی منظوری (۹) سوائے ان قیدیوں کے جو قتل کے جرم میں ماخوذ ہوں تمام سیاسی قیدیوں کی رہائی اور تمام سیاسی مقدمات سے دست برداری اور ۱۹۱۸ء کے ریگولیشن نمبر ۳ سیکشن ۱۲۴ الف اور اس قسم کے تمام قوانین کی تنسیخ اور تمام سیاسی جلاوطنوں کو مراجعت وطن کی اجازت (۱۰) محکمہ خفیہ یا اس کے اقتدار کی تنسیخ (۱۱) ذاتی مدافعتوں کے لیے بندوقوں کے لیسنس کی اجازت۔

اگرچہ موجودہ ضروریات کی یہ کوئی جامع اور مانع فہرست نہیں ہی تاہم وائسرائے بہادر ہندستان کی انھیں معمولی مگر ناگزیر ضرورتوں ہی کو سردست پورا کردیں۔ اس کے بعد وہ سول نافرمانی کا نام تک نہ سنیں گے اور کانگرس نہایت خوشی سے ہر اس کانفرنس میں شرکت پر آمادہ ہوجائے گی جہاں اظہار خیال اور مطالبہ کی مکمل آزادی ہو۔"

ادھر گاندھی جی آزادی کے اہم مطالبہ کی تکہ بوٹی کر رہے تھے اور آخر میں ہتھیار ڈالنے کے لیے اپنی راہوں کو ہموار کر رہے تھے ادھر بائیں بازو کے کانگرسی رہنماؤں نے جی آئی پی ریلوے میں ایک عظیم الشان ہڑتال کرادی۔ یہ ہڑتال ۴ فروری کو شروع ہوئی لیکن چند ہی روز میں اس میں ۷۵ ہزار مزدور شامل ہو گئے اور اس کی آگ بمبئی، بھوپال، ناگ پور اور جھانسی تک پہنچ گئی۔ ریلوے کمپنی، نیچے طبقے کے ملازمین خصوصاً ہندستانیوں کے ساتھ نہایت بے انصافی کا سلوک کر رہی تھی۔ عوام کے سامنے اس ہڑتال کے سیاسی مقاصد کی وضاحت بھی کردی گئی۔ پنڈت جواہرلال نہرو (جو بیک وقت انڈین نیشنل کانگریس اور ٹریڈ یونین کانگریس دونوں کے صدر تھے) نے ہڑتال کی قیادت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ لے لینے کی اپیل کرتے ہوئے ریلوے یونین نے کہا کہ وہ جی آئی پی ریلوے کے مزدوروں کی ہمدردی میں ہندستان کے تمام ریلوے میں عام ہڑتال کا حکم دے دیں۔ یونین کی اپیل کے الفاظ حسب ذیل تھے:۔

"جی آئی پی ریلوے کے یہ مزدور اپنی حالت سدھارنے کے لیے جدوجہد نہیں کر رہے ہیں بلکہ ان کا منشا اپنے طبقے کو منظم کرنا ہے، وہ اپنے ملک کی آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں۔ ہندستان کے مزدوروں کا اقتصادی مسئلہ سیاسی جدوجہد سے علیحدہ نہیں ہو سکتا کیوں کہ اس ناقابل برداشت بدحالی کے اسباب دراصل غیر ملکی شہنشاہیت کے تسلط میں پوشیدہ ہیں۔ ہم آپ سے اپیل کرتے ہیں کہ اگر آپ واقعی اپنے آپ کو اشتراکی اور جمہوریت کا علمبردار کہتے ہیں اور دل سے مزدوروں اور کاشتکاروں کی بہتری چاہتے ہیں تو آگے بڑھیے اور ہندستان کے تمام ریلوے میں عام ہڑتال کی ایک آگ لگا دیجیے۔"

یہ اسی عام ہڑتال کی وبا تھی جس کی پیشین گوئی لندن ٹائمز کے نامہ نگار مقیم کلکتہ نے مہینوں قبل کی تھی اور اسے سول نافرمانی کے خطرے سے کہیں زیادہ خطرناک قرار دیا تھا۔ عام ہڑتال کے اس معرکتہ الآرا مہرہ کو مسٹر بوس نے لاہور کانگریس میں بساط سیاست پر لا کھڑا کیا تھا لیکن گاندھی جی اور ان کی غلامانہ ذہنیت رکھنے والی اکثریت نے اسے بڑی عجلت اور ناعاقبت اندیشی سے مسترد کر دیا تھا اب یہ امر ایک کھلا راز تھا کہ گاندھی جی نے سوشلسٹ ریپبلکن پارٹی کے رہنما مسٹر جواہر لال نہرو کو چالاکی سے صدارت کا تاج پہنا کر اپنی رجعت پسندانہ پالیسی کی حمایت کے لیے آمادہ کر لیا ہے۔ اس لیے یہ دیکھ کر کوئی تعجب نہیں ہوتا کہ پنڈت جی نے بائیں بازو کے مزدور رہنماؤں کی اپیل کو حسب ذیل مغالطہ آمیز الفاظ کے ذریعہ مسترد کر دیا۔

"میں آپ لوگوں سے اس معاملے میں متفق ہوں کہ اس قسم کی صنعتی تحریکیں اساسی طور پر سیاسی نوعیت رکھتی ہیں لیکن میں نہیں جانتا کہ ایک اوسط درجہ کا ہڑتالی اس نظریہ کا کہاں تک علم رکھتا ہے آپ لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ میں اپنے کاندھوں پر مختلف قسم کی ذمہ داریاں لے چکا ہوں۔ ان حالات کے پیشِ نظر مجھے تعجب ہے کہ آپ کس طرح مجھ سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ میں ان ذمہ داریوں کو بھلا دوں۔"

بہرحال اب یہ بالکل واضح ہو چکا ہے کہ اس اہم موقع پر مزدور رہنماؤں نے نہیں بلکہ خود پنڈت جواہرلال نہرو نے اپنی ذمہ داریوں کو بھلا دیا تھا۔ کیا انڈین نیشنل کانگریس کے نوجوان صدر نے ٹریڈ یونین کانگریس کی صدارت کا اعزاز اور اس کی ذمہ داری قبول نہیں کی تھی۔ اس دوطرفہ ذمہ داری کو قبول کرنے کے پیشِ نظر اور دونوں انجمنوں کے صدر ہونے کی حیثیت سے کیا ریلوے کی عام ہڑتالوں کی قیادت اُن کا فرض نہ تھا۔ اس سلسلے میں یہ امر خصوصاً یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ اسی قسم کی ہڑتال تھی جو ۱۹۰۵ء میں روسی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئی تھی۔ لہٰذا سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کی آڑ لے کر مزدوروں کی جدوجہد سے پہلوتہی کرنا اور معذرت پیش کرنا لغو اور لایعنی سی بات تھی۔

ریلوے کے مزدوروں کی اس عظیم الشان تحریک سے قطع نظر کرکے کانگریس کی مجلس عاملہ نے اپنے اجلاس مورخہ ۱۵ فروری منعقدہ الہ آباد میں سول نافرمانی شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا اور گاندھی جی اور دوسرے رہنماؤں کو جو عدم تشدد کو

جزوِ ایمان سمجھتے تھے اختیارات دے دیے کہ وہ لوگ جب مناسب اور موزوں سمجھیں اس تحریک کو شروع کردیں۔ مذکورہ تجویز کو سیاسی سے زیادہ مذہبی رنگ دیتے ہوئے گاندھی جی نے کہا کہ میں مجلس عاملہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے میری پوزیشن کی صحت وصداقت کو محسوس کیا۔ اس کے بعد حسب ذیل پیرایہ میں اس تجویز پر تبصرہ شروع کیا۔

"میں نے ایک نہایت زبردست ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لے لی ہے۔ میری "نافرمانی" بعض اوقات محبت کے لازمی تقاضہ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ خطرناک یہ ضرور ہے لیکن اس روزافزوں اور بڑھتے ہوئے تشدد سے زیادہ نہیں۔ خطرہ دراصل ایک صورت میں ہے اور وہ صورت یہ ہے کہ سول نافرمانی کے ساتھ ساتھ تشدد بھی ابل پڑے۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو پھر خدا ہی حافظ ہے۔ لیکن ایک مرتبہ یہ جنگ شروع ہوجائے گی تو بردولی کی طرح لوٹنے یا واپس ہونے کا کوئی سوال نہیں رہے گا اور تشدد چاہے کسی گوشے سے اٹھے آزادی کی یہ جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ اس جماعت کا ایک نمائندہ بھی زندہ رہے گا۔"

اس طرح لاہور کانگریس کی سول نافرمانی کی کم زور اور طفلانہ تجویز کی رہی سہی اہمیت کو بھی گاندھی جی نے قومی شورش کے اس اہم اور فیصلہ کن موقع پر ختم کردیا۔ عام ہڑتالوں کو تو وہ پہلے ہی سے مسترد کرچکے تھے عجیب و غریب بات تو یہ ہے کہ اس تاریخی موقع پر گاندھی جی اور مجلس عاملہ نے عدم ادائیگی محاصل کی تحریک کو پس پشت ڈال دیا۔ سب سے زیادہ غیر مناسب بات یہ تھی کہ سول نافرمانی کی اس واحد نوعیت سے (یعنی اجتماعی سول نافرمانی جس میں قوانین محصولات اور دیگر قوانین کی خلاف ورزی بھی شامل تھی) جس سے امید کی جاتی تھی کہ حکومت کے کل پرزوں پر کچھ اثر پڑے گا قصداً اور عمداً احتراز کیا گیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ گاندھی جی نے نہایت چالاکی کے ساتھ اس بے جان مجلس عاملہ کو اپنا آلۂ کار بنایا اور اس تحریک کو صرف ان لوگوں تک محدود کرکے جو عدم تشدد کو اپنا جزوِ ایمان مانتے تھے ساری اسکیم کو کھوکھلا کردیا۔ اس قسم کا عقیدہ یا ایمان ایک انفرادی مسئلہ تھا۔ سیاسی اور اس قسم کے دیگر معاملات میں پالیسی کو وسیع اور عام ہونا چاہیے تاکہ اس میں کثیر التعداد مرد وعورت بآسانی حصہ لے سکیں۔ المختصر گاندھی جی نے دراصل اس بات کی کوشش کی (اگرچہ ان کی یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی) کہ اپنی اس عزیز تحریک کو اصول پرست ستیاگرہیوں کے طبقہ تک محدود رکھا جائے اور اس طرح خود اپنے ہاتھوں اس کے پر کتر دیے تھے۔

اس کے بعد مجلسِ عاملہ کی تجویز نے گاندھی جی کو اس بات کا موقع دیا کہ وہ تحریک آزادی کا عقیدہ عدم تشدد کے نہج پر چلائیں اگرچہ خالص عملی پہلوؤں اور دوسرے مادی اسباب کی بنا پر اس قسم کی سیاسی اور صنعتی جدوجہد میں پُرامن طریقۂ کار استعمال کیے جاتے ہیں لیکن جب آپ اس قسم کے سیاسی تصادم میں عدم تشدد کو اپنے ایمان اور ضمیر کا لازمی اور ناگزیر جزو قرار دے دیتے ہیں تو گویا آپ دراصل سیاسی حدود سے نکل کر مذہبی حدود میں داخل ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ گاندھی جی نے اسی امر کی بنا پر بڑی مسرت کے ساتھ اس تجویز کو سیاسی سے زیادہ مذہبی جدوجہد کا فیصلہ قرار دیا تھا اور اب وہ اس فتح پر نازاں ہوسکتے تھے کیوں کہ بابو راجندر پرشاد کے الفاظ میں

احمد آباد کانگریس نے بھی جو گاندھی جی کی ایک سال کی پیہم مہم کے بعد ۲۱ دسمبر کو منعقد ہوئی تھی، صرف اس مشورہ پر قناعت کی کہ جب عوام "عدم تشدد کے طریقہ پر ہر طرح سے تیار ہوجائیں تو انفرادی اور اجتماعی سول نافرمانی کی تحریک شروع کی جائے" اور جیسا کہ گاندھی جی خود اپنے تبصرہ میں (جس کا حوالہ اوپر گزر چکا ہے) باردولی کی طرف اشارہ کرچکے ہیں۔ شاید اس موقع پر یہ یاد رکھنا کافی ہوگا کہ باردولی کے تین اور ذمے دار

لوگوں کو بھی عدم تشدد کو نہ صرف اپنے ایمان کا جزو بلکہ تمام مشکلات کا واحد علاج ماننا پڑا تھا (پنجاب، خلافت، سوراج) اور ہندستان کے اس کورکشیتر میں اجتماعی تحریک شروع کرنے کی یہی سب سے پہلی اور بنیادی شرط تھی۔

گاندھی جی اور ان کے سیاسی چیلوں کی آزمائش کے لیے ایک ایسی غیر معمولی شرط کیوں پیش کی گئی؟ اس کے اسباب کیا تھے؟ اس کا جواب بالکل آسان ہے۔ کیا گاندھی جی نے خود "بڑھتے ہوئے تشدد" کے خوف ناک عفریت کی طرف اشارہ نہیں کیا تھا اور سول نافرمانی کے ساتھ تشدد کے پھٹ پڑنے کے خطرناک امکانات کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ اگرچہ پہلے فقرے سے حکومت اور عوام دونوں کا تشدد مراد لے سکتے تھے لیکن دوسرا فقرہ گاندھی جی کے ذہنی رجحانات کی صحیح ترجمانی کر رہا تھا۔ وہ اب باردولی کی طرح کسی حال میں پیچھے نہیں ہٹ سکتے تھے اور نہ اس کی ہمت کر سکتے تھے۔ لیکن وہ ایک زیرک سیاست داں تھے اور اپنی پچھلی قلابازی سے ایک زبردست سبق حاصل کر چکے تھے۔ اس کے باوجود عام ہل چل اور جدوجہد کی طاقتوں نے نہایت عجیب وغریب دشوار اور خطرناک صورتیں اختیار کرلی تھیں۔ جب گاندھی جی مذکورہ بالا الفاظ قلم بند کر رہے تھے تو لاہور سنٹرل جیل میں بھگت سنگھ اور ان کے رفقا پنجاب کے جیلوں میں سیاسی قیدیوں کے ساتھ بدسلوکی پر بطور احتجاج بھوک ہڑتال کر رہے تھے۔ اُن لاکھوں افراد نے جن کی نگاہوں سے ہڑتال کی خبریں گزریں یقیناً اس کا وہی اثر لیا جو جیل کے اندر بیٹھ کر بھگت سنگھ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ جی آئی پی ریلوے کی عظیم الشان ہڑتال نے ہندستان کے عوام کے سامنے ہنگامہ زائی کی دل کش راہیں کھول دی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ریلوے کی ہڑتال نہایت پُرامن اور منظم طریقے پر چل رہی تھی لیکن اس کے باوجود یہ ہڑتال اور مزدوروں کی اس قسم کی تمام جدوجہد گاندھی جی کی نگاہوں میں ستیاگرہ کے صحیح راستے سے انحراف کے مرادف تھیں۔ اور کیوں نہ ہوتیں۔ آخر گاندھی جی بڑے بڑے تاجروں، مِل مالکوں، والیانِ ریاست اور زمین داروں سے بھی ہر قسم کے نجی سیاسی اور روحانی تعلقات رکھتے تھے۔ یہ انحراف ملک کے ہر چہار طرف روز بروز بڑھتا جا رہا تھا در آں حالیکہ سول نافرمانی کا عظیم الشان حربہ ۱۹۲۲ء کے موسم سرما سے لے کر آج تک باردولی کی مہم کے سوا گلدستۂ طاقِ نسیاں بنا رہا۔ دراصل یہی انحراف کا روز افزوں دائرہ اور انقلابی بغاوت کی بڑھتی ہوئی طاقتیں تھیں جو ہر لمحہ ہندستان کے لاکھوں اور کروڑوں مضطرب افراد کو اپنے سیلاب میں بہالے جانے کی دھمکی دے رہی تھیں اور یہی وجہ تھی کہ گاندھی جی نے اس تحریک کو انفرادی اور مذہبی نوعیت دے کر اس قدر محدود کر دیا تھا حالاں کہ لاہور کانگریس نے اسے ایک سیاسی تحریک قرار دیا تھا۔

اب آپ خود ہی اندازہ لگائیں کہ اس قسم کی انفرادی اور امن پسندانہ تحریک سے برطانوی فولادی زرہ بکتر پر کیا اثر پڑ سکتا تھا۔ حکومت کو اس قسم کی تحریک سے اس وقت تک کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا جب تک کہ گاندھی جی اور مجلس عاملہ کی پابندیوں اور شرطوں کی حرف بحرف تعمیل ہوتی رہتی۔ وہاں تو منشا ہی یہ تھا کہ انفرادی ستیاگرہ کے عقائد کی خشک ہڈیاں خوب صورت اور رنگین کپڑوں میں سجا کر پیش کی جائیں تو شاید ان پُرجوش نوجوانوں اور بھوکے اور مصیبت زدہ انسانوں کا طبقہ اس کی طرف متوجہ ہو جائے۔ لیکن کچھ ایسے بھی تھے جن پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ عدم تشدد کو جزو ایمان مانتے رہیں گے۔ وہ ضرور گاندھی جی کے قبل از وقت اور حد درجہ محتاط پابندیوں کی خلاف ورزیوں کے مرتکب ہوتے تاہم حکومت پر بھروسہ کیا جا سکتا تھا کہ عدم تشدد کی جنگ میں تشدد کا مظاہرہ کرنے والوں کو معقول اور مناسب سزا دے گی۔ اور اس اثنا میں ہندستان کے عوام کی بہت بڑی اکثریت کو ایک طرف بھگت سنگھ اور دت اور دوسری طرف اسیرانِ میرٹھ کے مسلک سے باز رکھا جا سکے گا۔ اس طرح لاکھوں انسان عدم تشدد کی ریشمی رسیوں میں بندھے بے دست و پائی کے عالم میں پولیس کی لاٹھیوں، بندوق بازوں کی گولیوں اور

جیل کے حکام کے رحم وکرم پر چھوڑے جا سکتے تھے اور اس اثنا میں حقیقی ستیاگرہ کی محدود صفوں سے یکے بعد دیگرے مظلوم انسانوں کی قربانی اس وقت تک ہوتی رہتی جب تک کہ اس کا ایک نمائندہ بھی زندہ رہتا۔

اس کے بعد؟ سارا ملک ایک وسیع جیل خانے میں تبدیل ہو گیا تھوڑا سا تنوع اس طرح ضرور پیدا ہو گیا کہ کئی ہزار آدمی شفاخانوں میں داخل ہو گئے۔ کئی سو گورستان جا پہنچے یقیناً یہ قومی خودکشی تھی جس میں ایک شرم ناک اطاعت بلکہ ایک روح فرسا ہزیمت کا کلنکی ٹیکا بھی لگا ہوا تھا۔

یہ تھا وہ عہد سعادت، جس کا گاندھی جی نے جنگی بگل بجاتے وقت وعدہ کیا تھا۔

لیکن گاندھی جی کے الفاظ کی باریک پیچیدگیاں اس وقت صرف تھوڑے ہی سے لوگوں کی سمجھ میں آئی تھیں اور وہ بھی بہت معمولی طور پر۔ عوام کی ایک بہت بڑی اکثریت یہی سمجھتی رہی کہ گاندھی جی نے اپنے آپ کو اور اپنے منتخب ساتھیوں کو اس مقدس جنگ میں بھینٹ چڑھا دینے کا تہیہ کر لیا ہے اور وہ نہایت جوش و خروش کے ساتھ اس الم ناک لیکن مقدس نظارے کے منتظر تھے جب گاندھی جی اور ان کے منتخب ساتھی برطانوی استبداد کے ہاتھوں قربان ہوتے اور ان لوگوں کی قربانی کو وہ اسی طرح دیکھتے جیسے ان کے باپ دادا ستی ہوتی ہوئی بیواؤں کو احترام و عزت کی نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے۔

اب گاندھی جی نے یہ محسوس کیا کہ وقت ضایع کرنے کا موقع نہیں ہے تصادم کے لیے دونوں جماعتیں مسلح اور منظم ہو رہی تھیں، بمبئی کے مزدور رہنماؤں نے تو جنگ شروع کرنے کا حکم بھی دے دیا تھا۔ بنگال کے نوجوانوں اور مزدوروں میں بے اطمینانی اور ہل چل کی ایک لہر دوڑ چکی تھی، لاکھوں کاشت کار اور رعیت یہ محسوس کر رہے تھے کہ مزدوروں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے وہ لوگ بھی عدم ادائگی محاصل کی منظم مہم کیوں نہ شروع کر دیں لیکن حکومت بھی ان چیزوں سے بے خبر نہ تھی۔

ستبدانہ قوانین، پولیس چوکیوں، فوجی اڈوں وغیرہ کا نہایت اہتمام کے ساتھ غیر معمولی پیمانے پر انتظام کیا جا رہا تھا تاکہ عوام کی شورش کا یہ سیلاب رکا جا سکے حکومت نے اس موقع پر اپنے اتحادیوں اور بھاڑے کے ٹٹوؤں کے احساس فرائض کو بھی اُبھارا۔ ممالک متحدہ میں فوراً زمینداروں کا ایک جلسہ طلب کیا گیا۔ اور جذبۂ انقلاب، تصور اشتمالیت (جو ملک میں آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا) اور کانگرس کے مسلک آزادی اور سرمایہ و ملکیت کے خلاف اس کے پروپیگنڈے اور معاندانہ رویہ کی سخت مذمت کی گئی۔ وائسرائے نے ایوانِ شہزادگان کے ایک جلسے میں ۲۵ فروری کو والیانِ ریاست کے سامنے بھی ایک مناسب "وعظ" کہا اور یہ بتایا کہ اس موقع پر سلطنت برطانیہ کے اُن پر کیا کیا حقوق ہیں اور اُن کے فرائض کیا ہیں۔

اب آسمان ابر آلود ہو چکا تھا اور افق کی جانب سے ایک زبردست طوفان کا سماں بندھ چکا تھا۔ بجلیاں چہار جانب کوند رہی تھیں اور تشدد کا دائرہ نہایت ہی مہیب شکل میں گاندھی جی کے حلقوم پر تنگ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اگر وہ اپنی پُرامن فوج کو حکومت اور عوام کی صف آرا طاقتوں کے درمیان لانا چاہتے تھے تو انھیں اقدام کے لیے تیار ہونا چاہیے تھا۔ اور اگرچہ چند ہفتے قبل انھوں نے کہا تھا کہ سول نافرمانی کے لیے ابھی فضا ساز گار نہیں ہے اور اس بنا پر انھیں وقت کے انتخاب کے لیے کافی موقع بھی دے دیا گیا تھا، لیکن اب موجودہ صورت حال کے پیش نظر بڑی سرعت سے اپنے نقشۂ جاں سپاری کو درست کر کے زبردست طمطراق کے ساتھ سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

پچھتّرواں باب

مبارزت یا معذرت

سول نافرمانی کے ایک "با اثر اور بے ضرر لائحہ عمل" کی دریافت کے لئے گاندھی جی دو ماہ تک خدا سے دعا کرتے رہے بالآخر تاریکی دور ہوئی اور فروری کے آخر میں ان کی رُوح پر ایک شعاع عظیم کا القا ہوا، بڑی جانکاہی اور جگر کاوی کے بعد وہ زبردست لائحہ عمل مرتب ہو گیا جو بھارت ورش کی قدیم سرزمین میں آسمانی آگ روشن کر دینے والا تھا۔

یہ لائحہ عمل کیا تھا؟ محض یہ کہ قوانینِ نمک کی خلاف ورزی کی جائے! اس طریقِ کار کے انتخاب کے متعلق گاندھی جی کی نیت کا جائزہ لینے اور فی نفسہ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے سے قبل اس خط پر جو ۲ مارچ ۱۹۳۰ء کو گاندھی جی نے مسٹر رینالڈس (ایک انگریز جو انجمن احباب کا رکن تھا) کے حوالے کیا تھا کہ وہ اسے اپنے ہاتھوں وائسرائے کو پہنچا دیا اور جس کی دنیا کے اخباروں میں اعلان مبارزت یا اطلاع تہدیدی کی حیثیت سے اشاعت ہوئی تھی غائر نظر ڈال لینی چاہیئے، کیونکہ یہ خط بلا شک وشبہ ایک اہم سیاسی دستاویز تھا، جو گاندھی جی نے اپنی گرفتاری وقوعہ ۴ مئی سے پہلے شایع کیا۔

دیکھنا یہ ہو کہ اس معاملہ میں گاندھی جی کے فرائض کیا ہو سکتے تھے؟ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ یہ تہدیدی اطلاع یا اعلانِ مبارزت جو کچھ بھی کہہ لیجئے، گاندھی جی نے اپنی ذاتی حیثیت سے نہیں بلکہ انڈین نیشنل کانگریس کے منتخب شدہ مختار کل کی حیثیت سے وائسرائے کے پاس بھیجی تھی، ہمیں یہ اچھی طرح یاد رکھنا چاہیئے کہ اگرچہ کانگریس کے اجلاس منعقدہ لاہور نے ضروری قیود کے ساتھ سول نافرمانی بشمولیت عدم ادائیگی محاصل (مخصوص علاقوں میں یا مختلف مقامات پر) کی تحریک کی ملک کو دعوت دینے میں اپنے سابقہ اجلاسوں منعقدہ ۱۹۲۰ء و ۱۹۲۱ء (کلکتہ، ناگپور، احمد آباد) کی تقلید کی، لیکن اِس اجلاس نے انفرادی شکایات مثلاً مسئلہ خلافت یا پنجاب یا کسی اور زیادتی کو بنیادی حیثیت دینے کی بجائے خاص طور پر تمام کانگریسیوں کو "اپنی تمام تر توجہ ہندوستان کے لئے مکمل آزادی حاصل کرنے کی طرف مرکوز کرنے" کی ترغیب دی، اس لئے یہاں اس امر کا جائزہ لینا مناسب ہے۔ کہ گاندھی جی نے اپنے اس مفروضہ اعلان مبارزت میں جو کہ اُنہوں نے برطانوی اقتدار کے نمائندہ مقیم ہند کے حوالے کیا کہاں تک اجلاس لاہور کے نظریات کے اصل و ماحصل کا لحاظ رکھا۔

اگرچہ ۲۶ جنوری کے منشور کانگریس نے کم از کم اس ایک جملے کو جگہ دینا ضروری سمجھا کہ ہندوستانیوں کو ——— خود مختارانہ جمہوریت کے قسم کی حکومت کا نہیں "وہ آزاد رہنے اپنی محنتوں کا پھل پانے اور سامان معیشت حاصل کرنے کا پیدائشی اور ناقابلِ انفکاک حق ہے تاکہ ان کو ترقی کے مواقع رہیں"۔

مگر گاندھی جی نے اس دقیق مسئلہ کے لئے ایک سطر کیا بلکہ چند الفاظ بھی لکھنا مناسب نہیں سمجھا، اس کی بجائے بہت بڑی بات جو وہ کر سکے یہ تھی کہ اپنے تمہیدی بیان میں صرف یہ لکھ دیا کہ "میں برطانوی حکومت کو ایک لعنت سمجھتا ہوں" اور وہ

بھی جملہ معترضہ کے طور پر قوسین میں"! کیونکہ انہوں نے اس پرتکلف الزام کی ساری چبھن اور زور کو فوراً ہی نہ صرف یہ لکھ کر دور کر دیا کہ میں ایک انگریز متنفس کو بھی یا اس کے کسی ایسے جائز مفاد کو جو اسے ہندوستان میں حاصل ہو نقصان پہنچانا نہیں چاہتا"، بلکہ یہ بھی لکھا کہ "میں انگریزوں کو زمین پر بسنے والی کسی دوسری قوم سے برا نہیں سمجھتا، حالانکہ یہ سب غیر متعلق ہفوات تھے، انڈین نیشنل کانگریس کی جانب سے شایع ہونے والے بیان کی اصلی غرض و غایت سیاسی حقائق کا اظہار ہو سکتی تھی، نہ کہ اخلاقی معیار کا بیان، ایک سیاسی دستاویز میں اس طرح کے جذباتی ہفوات کی آمیزش سے تو صرف اس کا اظہار ہوتا ہے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے متعلق جو بظاہر سخت حکم لگایا گیا ہے اس کے لئے معذرت پیش کی جا رہی ہے، واقعہ یہ ہے کہ پورا بیان شروع سے آخر تک اسی قسم کی خوشامدانہ اور کریہہ قسم کی معذرت طلبی سے بھرا پڑا تھا

اور یہ برطانوی حکومت ہندوستان کے لئے لعنت کیوں ہے؟ اس لئے نہیں کہ یہ فی نفسہ ایک قوم پر ہر لحاظ سے دوسری اجنبی قوم کے ناجائز اور غیر منصفانہ تسلط کے مرادف ہے اس لئے نہیں کہ برطانوی سلطنت کی عمارت ہندوستان میں جبر و فریب کے سہارے کھڑی کی گئی ہے، اور انھیں غیر مسیحی اور مذموم طریقوں کے ذریعے اسے قائم کیا جا رہا ہے۔ ہرگز نہیں، گاندھی جی نے دوسرے ممالک کے قومی آزادی کے علم برداروں کے برخلاف تمام تاریخی عواقب کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں، اُنھوں نے سنہ ۱۶۰۰ء پر جب کہ ایسٹ انڈیا کمپنی معرض وجود میں آئی تھی نظر نہیں ڈالی، نہ سنہ ۱۷۵۷ء پر بلکہ سنہ ۱۸۵۷ء کو بھی نظر انداز کر دیا، ان کے خیال میں ہندوستانی سیاست کی ابتداء دادا بھائی نوروجی اور نیشنل کانگریس سے ہوئی، گاندھی جی نے ان ہی کی فرسودہ روایات کو ایک نیا تاریخی دور سمجھ کر جاری رکھنے کی کوشش کی، یعنی ہندوستان میں برطانوی حکومت کو بنئے کے پلڑوں پر تولا اور فیصلہ اس لئے خلاف دیا کہ تول میں یہ حکومت پوری نہ اُتری، فرماتے ہیں:۔

"اور میں برطانوی حکومت کو لعنت کیوں سمجھتا ہوں؟ اس لئے کہ اس نے روز افزوں انتفاعی نظام کے ذریعے اور ایک ایسے تباہ کن حد تک کثیر المصارف فوجی اور مدنی سررشتہ انتظام کی بدولت جس کا بار ملک کبھی نہیں اٹھا سکتا، کروروں بے زبان انسانوں کو قلاش بنا دیا ہے، اس نے سیاسی حیثیت سے ہمیں غلام بنا دیا ہے، اس نے ہماری ثقافت کی بنیادوں میں گھن لگا دیا ہے اور اس کی ضبط اسلحہ کی حکمت عملی ہماری روحانی انحطاط کا باعث ہوئی ہے" اس کے صاف معنی تو یہ ہوئے کہ اگر ہندوستان کے باشندے چند گمراہ منتظمین کی "غیر انگریزی" پالیسی کی بدولت اقتصادی اور "روحانی" تباہی میں مبتلا نہ ہوتے تو ہندوستان برطانوی تاج میں ایک درخشندہ گوہر کی حیثیت سے ٹکے رہنے پر ہمیشہ قانع رہتا۔

سیاسی محکومی کی برائیوں کو دوکاندار کے گز سے ناپنے کا یہی طریقہ آزادی کے بلند نصب العین کو بے جان بنا دینے کے لئے نہایت صفائی کے ساتھ بروئے کار لایا گیا تھا، لیکن گاندھی جی اس سے بھی آگے بڑھے اور سوراج اور سواد حرم کے مقدس نام پر بغیر کسی مادی یا تجارتی غرض کے اپنی جانیں قربان کرنے والے کئی نسلوں کے تمام ہندوستانی سورماؤں کے ساتھ بے وفائی کرنے کے بعد گاندھی جی نے لاہور کانگریس کی تجویز آزادی کو باوجود اس کے کہ اسی تجویز نے انہیں موجودہ اعلان کرنے کا مجاز بنایا تھا، مندرجہ ذیل الفاظ میں تشریح کر کے لایعنی اور مضحکہ خیز بنا دیا، کہتے ہیں:۔

"دہلی کی ملاقات کی ناکامی کے بعد میرے اور پنڈت موتی لال نہرو کے لئے سوائے اس کے کوئی چارۂ کار نہ رہا۔ کہ اجلاس کلکتہ منعقدہ سنہ ۱۹۲۸ء کی اہم تجویز پر عملدرآمد کرنے کے لئے قدم اٹھائیں لیکن تجویز آزادی پر چوکنا ہونے کی کوئی بات نہیں۔ اسی لئے اگر "درجۂ نوآبادیات" کا لفظ جس کا آپ کے اعلان میں ذکر ہے، اپنے مسلمہ مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے۔ کیا ذمہ دار برطانوی مدبرین نے اس کا اقرار نہیں کیا ہے کہ "درجۂ نوآبادیات" فی الحقیقت آزادی کا دوسرا نام ہے؟ میرے لئے باعث اندیشہ یہ امر ہے کہ حکومت کے ذہن میں مستقبل قریب میں اس طرح کا درجہ نوآبادیات عطا کرنے کا کوئی ارادہ کبھی نہیں تھا"۔

اس طرح گاندھی جی نے تجویز آزادی کے متعلق جس کی اُنہوں نے بہت کشاں کشاں تائید کی تھی، وائسرائے کی خدمت میں عملاً اپنا معذرت نامہ پیش کر دیا، اور ہیر پھیر سے وائسرائے پر یہ الزام رکھا کہ انہوں نے گاندھی جی کے لئے کوئی ایسی گنجائش نہ چھوڑی۔ جس کو حیلہ بناکر گاندھی جی کانگریس کو اس بظاہر عاجلانہ فیصلہ کے اختیار کرنے سے باز رکھ سکتے، پھر انہوں نے نہایت مضطربانہ طور پر وائسرائے کو یقین دلایا کہ بہرحال یہ تجویز اتنی انقلابی نہیں ہے جتنی کہ یہ پہلی نظر میں معلوم ہوتی ہے جس طرح گاندھی جی نے کلکتہ کانگریس میں درجۂ نوآبادیات کو آزادی کا مرادف بتایا تھا، بعینہ اسی طرح اب انہوں نے آزادی کو درجۂ نوآبادیات کا مرادف ثابت کرنے پر کمر باندھ لی۔

لیکن گاندھی جی نے اپنے متزلزل قدم اس خطرناک ہوائی قصر کی بیچدار بلندیوں پر رکھے ہی تھے کہ وہ فوراً حسبِ عادت اپنی محبوب ترتخصیص پسندی کے دلدل میں کود پڑے، دوسرے الفاظ میں گاندھی جی نے آزادی کے غیر فانی نصب العین کی روح قبض کرلینے کے بعد اس کی لاش کے بھی ٹکڑے کرنے شروع کئے تاکہ اس کو ثابت کرنے کے لئے کہ ہندوستان کو حقیقتاً آزادی دی جارہی ہے، انہیں ٹکڑوں کو بطور استدلال کے پیش کرسکیں، اب آئیے ذرا ہم ایسے تنکوں پر نظر ڈالیں جن کے سہارے گاندھی جی نیچے اُتر آئے تھے اور جن کے ذریعہ وہ اس کو ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ہندوستانیوں کو آپ اپنے ملک پر حکومت کرنے کا ناقابل بحث اور قطعی حق حاصل ہے،

"حکومت ہند کے ممبر مالیات اٹھارہ پنس کے تناسب مبادلہ کو ایک امر منفصلہ قرار دیتے ہیں، یہ یک جنبش قلم اس تناسب نے کئی کروڑ روپیہ ہندوستان سے کھینچ لیا۔ .... نہ صرف لگان آراضی میں کافی حد تک کمی کرنی ضرورت ہے بلکہ شعبۂ مالگذاری کے سارے نظام پر اس طرح نظر ثانی کرنے ضرورت ہے کہ رعیت کی بھلائی مقدم قرار دیجائے۔ نمک پر جس کا استعمال زندہ رہنے کے لئے ضروری ہے اس طرح ٹکس لگا ہوا ہے کہ اس کا بوجھ سب سے زیادہ عوام ہی پر پڑتا ہے ـــــ شراب اور منشیات کی آمدنی بھی غریبوں سے وصول کی جاتی ہے۔

ہندوستان کی تباہ کاری کا قصہ اس بار دیں (ملکی قرضہ) کا تذکرہ کئے بغیر جو اس کے نام پر لیا جارہا ہے مکمل نہیں ہوسکتا ـــــ

اس طرح ہندوستان کے حق آزادی کو بڑے اطمینان کے ساتھ مشہور گیارہ نکات میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا تھا، ان نکات میں پنڈت جواہرلال نہرو بھی کراہت محسوس کئے بغیر نہ رہے، یہ خیال کرکے کہ ان نسبتاً معمولی تنقیحات کی کراہت خیز تکرار سے عوام کہیں متنفر نہ ہوجائیں گاندھی جی نے اپنی اس روداد سرائی میں تخصیص پسندی کے گڑھے میں اور گہرے گرکر ایک اچھوتاپن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ کہتے ہیں:-

"آپ اپنی تنخواہ ہی کو لیجئے، یہ ۲۱ ہزار روپے ماہانہ سے کچھ زائد ہے ـــــ وزیر اعظم برطانیہ کو پانچ ہزار پونڈ سالانہ یعنی موجودہ شرح مبادلہ کے مطابق پانچ ہزار روپے ماہانہ سے کچھ اوپر ملتے ہیں، آپ ہندوستان کی ۲ر یومیہ اوسط آمدنی کے مقابلہ میں سات سو روپے یومیہ لیتے ہیں، وزیر اعظم برطانیہ، برطانیہ عظمیٰ کی تقریباً دو روپے یومیہ آمدنی کے مقابلہ میں ایک سو اسی روپے یومیہ لیتے ہیں اس طرح آپ ہندوستان کی اوسط آمدنی کا پانچ ہزار گنا سے کہیں زائد لیتے ہیں، وزیر اعظم برطانیہ، برطانیہ عظمیٰ کی اوسط آمدنی کا صرف نوے گنا لیتے ہیں ـــــ میں گھٹنوں کے بل جھک کر آپ سے درخواست کرتا ہوں، کہ اس صورت حال پر غور فرمائیں ـــــ وہ نظام جو ایسے انتظام کا ذمہ دار ہو کھڑے گھاٹ پارہ پارہ کردئے جانے کا مستحق ہے ـــــ"

واقعی ایسا ہونا چاہئے۔ لیکن اسی طرح "گھٹنوں کے بل جھکنے" کی اور ایک قوم کی آزادی کے مقدس مسئلہ کو چند انتظامی اصلاحات خواہ یہ اصلاحات کتنے ہی دور رس اور مفید کیوں نہ ہوں) کی حد تک لاگرانے کی ذہنیت بھی کھڑے گھاٹ پارہ پارہ کردئے جانے کی مستحق ہے غریبوں کے مفاد کی حمایت میں گاندھی جی اپنے خوش کن الفاظ کے کتنے ہی پہاڑ کھڑے کردیں، ان کی یہ تاریخی حیثیت کہ

وہ ہندوستانی سرمایہ دار طبقہ کے زبردست حمایتی ہیں چھپ نہیں سکتی،
آخر کس طرح وائسرائے کی اس ہولناک تنخواہ میں تخفیف کی جائے، آزادی سے قطع نظر کس طرح ان بے بہا گیارہ نکات ہی کو منوایا جائے؟ کم از کم ایک مرتبہ گاندھی جی نے صحیح قیاس سے کام لیا، کہتے ہیں "یہ معاملہ بحث کے ذریعہ قائل معقول کرنے کا نہیں ہے اس کا انحصار طاقت کے تقابل پر ہے ———— ہندوستان کو لازمی طور پر ایسی طاقت پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ موت کے چنگل سے چھٹکارا حاصل کر سکے"۔
اس کے بعد گاندھی جی نے ان قوتوں سے بحث کی ہے جو اس وقت بروئے کار تھیں، اور اب بھی ہیں۔ ایک طرف حکومت کی طاقتوں کو کھڑا کیا گیا۔
"قایل ہو یا نہو، ہر حال میں برطانیہ ہندوستان میں اپنی تجارت اور مفاد کو اپنی پوری طاقت کے ساتھ بچائے گی"۔ اس کے بعد انقلاب پسند جماعت کا ذکر خیر ہے "۔ اسے ہم سب مانتے ہیں، کہ سر دست کتنی ہی غیر اہم اور غیر منظم کیوں نہ ہو تشدد پسند جماعت جڑ پکڑ رہی ہے اور اپنے وجود کو محسوس کرا رہی ہے"۔ لیکن چوں کہ گاندھی جی اس امر پر یقین رکھتے ہیں کہ "یہ کروڑوں بے زبان انسانوں کے درد کا حقیقی مداوا نہیں کر سکتی"۔ گاندھی جی نے محض ادعائی طور پر فرما دیا کہ "سوائے خالص عدم تشدد کے اور کوئی چیز برطانوی حکومت کے منظم تشدد کا مقابلہ نہیں کر سکتی"۔
اور عدم تشدد کی یہ فعال طاقت بھی برطانیہ کی مسلح قوت کے سامنے کیونکر اور کس امید سے صف آرا ہوگی، ۔ اس انوکھی طاقت کا مظاہرہ ظاہر ہے کہ سول نافرمانی کے ذریعہ ہوگا، اور یہ سول نافرمانی سر دست ستیاگرہ آشرم کے مکینوں تک محدود ہوگی لیکن بعد میں یہ ان تمام لوگوں پر حاوی ہوگی جو اس کی نمایاں پابندیوں کے ساتھ اس میں شریک ہونا پسند کریں"۔
لیکن کیا گاندھی جی کا مقصد اس طرح ایک پُر امن بغاوت یا کم از کم "قومی خروج" کی راہ نمائی کا تھا ایسا جس کی انہوں نے تحریک بار دولی کے آغاز کے موقعہ پر بظاہر حکومت کو مجبور کرنے کی نیت سے دھمکی دی تھی، یہ ضرور ممکن تھا مگر اس طرح کہ مثلاً سارا ہندوستان بالکل پر امن طریقہ پر حکومت اور زمینداروں کو لگان اور تمام محاصل ادا کرنے سے انکار کر دیتا، مگر گاندھی جی کا ہرگز یہ مقصد نہ تھا معصوموں کی قربانیاں اور ہزاروں بلکہ شاید لاکھوں کی جاں سپاری کا مقصد صرف "عدم تشدد کے ذریعہ انگریزوں کی قلبِ ماہیت کرنا تھا کہ اس طرح وہ اس زیادتی کو محسوس کریں جو انہوں نے ہندوستان کے ساتھ کی ہے"۔
یعنی گاندھی جی اپنے اس متصوفانہ ترکیب سے ایک سامراجی قوم بلکہ یوں کہنا چاہئیے کہ اس کے گھاگ قسم کے گورنروں کی قلب ماہیت کر کے گیارہ مطالبات منظور کرانا اور ہندوستان کی آزادی حاصل کر لینا چاہتے تھے!
اس لئے ظاہر ہے کہ طاقتوں کے حقیقتاً صف آرا رہونے کا کوئی سوال ہی نہ تھا کیونکہ گاندھی جی کی نام نہاد طاقت لوگوں کے جوش و خروش اور قوت عمل کو کسی قسم کی عسکری جنگ کی طرف رُخ نہ کرنے دیگی، اور نہ کسی صورت حکومت کی قوتوں سے متصادم ہوگی، بلکہ یہ ستیہ گرہی تو چپ چاپ حکومت کی قہرمانی کا شکار ہو کر اعدار کے ضمیر کی آواز سے جوان کے سنگین قلوب کے اندر دب کر شاید مر بھی چکی ہوگی، بزبان حال اپیل کریں گے، ایک کامیاب انقلاب برپا کر کے خواہ پُر امن ہی قسم کا کیوں نہ ہو یہ صورت پیدا کی جاسکتی تھی کہ حکومت کو جان کے لالے پڑ جاتے اور وہ قومی خروج کے علم برداروں سے مفاہمت پر مجبور رہوتی، مگر گاندھی جی نے اس کے تمام مواقع اور توقعات کا خاتمہ کر دیا۔ ستیہ گرہوں کو تو اس کے گروئے دراصل ایذا طلبی اور "ہل من مزید" کے نعروں اور سرنگونی کے ذریعہ سرفرازی کا درس دیا تھا، بہر حال اذیت و ذلت تو یقینی تھی مگر کامیابی سے خواہ مادی ہو یا روحانی، ہم آغوشی کے بجائے مغلوبیت و سپر اندازی ہی مقدر تھی
لیکن "ایک قوم جس نے دانستہ ایک دوسری قوم پر جو اس سے زیادہ کثیر التعداد اور کہیں زیادہ قدیم ہے، نیز ثقافت

کے اعتبار سے بھی اس سے کسی طرح کم نہیں ہے اپنا شکار بنا رکھا ہے "! اس کی تلبیہ ماہیت کرکے ہندوستان کو محکومیت سے نجات دلا دینے کا وعدۂ فردا بھی ایسا جرم تھا کہ اس کے لئے گاندھی جی کو معذرت و صفائی پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اس معذرت کا لب و لہجہ انتہائی خوشامدانہ اور پر تکلف تو ہونا ہی چاہئے تھا، فرماتے ہیں :-

"میں آپ کی قوم کے افراد کو نقصان پہنچانا نہیں چاہتا، میں ان کی اسی طرح خدمت کرنا چاہتا ہوں جس طرح اپنوں کی۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ میں نے ہمیشہ ان کی خدمت کی ہے۔ میں نے ۱۹۱۹ء تک تو بے تحاشا ان کی خدمت کی ہے لیکن جب میری آنکھیں کھلیں اور میں نے ترک موالات کی تشکیل کی اس وقت بھی مقصد ان کی خدمت ہی کرنا تھا، میں نے وہی ہتھیار استعمال کئے، جو میں نے بغایت انکساری کامیابی کے ساتھ اپنے خاندان کے عزیز ترین افراد پر استعمال کئے ہیں، اگر مجھے آپ کی قوم کے ساتھ اپنی قوم کے برابر ہی محبت ہے تو یہ امر زیادہ دن تک چھپا نہیں رہے گا "! ....

بے شک، چھپا نہیں رہا، ظاہر ہوا اور اچھی طرح ظاہر ہوا جس جس تحریک کی رہنمائی کا سہرا گاندھی جی کے سر رہا خواہ وہ افریقہ کی ہو یا ہندوستان کی بشمولیت اس تحریک کے جسے وہ اس وقت شروع کرنے والے تھے اس کے نتائج نے ساری دنیا پر اچھی طرح آشکارا کر دیا، کہ گاندھی جی نے اپنی قوم کے مفاد کے مقابلہ میں .... برطانوی سلطنت کے مفاد کی خدمت بہت زیادہ مؤثر طریقہ پر کی ہے۔

اس اخلاقی عذر طلبی کے بعد سیاسی مخلوبیت کا نمونہ سامنے آیا، کہتے ہیں یہ جو ہم برطانوی تعلقات منقطع کرنا چاہتے ہیں، اس کی غایت یہ ہے کہ جب اس قسم کی خرابیاں دور ہو جائیں گی تو راستہ صاف ہو جائے گا، اور دوستانہ گفت و شنید کی راہ کھل جائے گی، اگر ہندوستان کے ساتھ برطانوی تجارت حرص و آز سے پاک ہو جائے تو آپ کو ہماری آزادی تسلیم کرنے میں کوئی مشکل نہیں محسوس ہوگی، اس لئے میں آپ کو مؤدبانہ دعوت دیتا ہوں کہ ان خرابیوں کو دور کرکے ایک صحیح قسم کی کانفرنس کے لئے راستہ ہموار کر دیجئے ایسی کانفرنس جس میں دو ہم پلہ فریقین جو صرف رضاکارانہ مشارکت باہمی کے ذریعے نوع انسانی کی مشترک فلاح و بہبود کے متمنی ہوں سر جوڑ کر بیٹھ سکیں، اور جہیں باہمی امداد اور فریقین کے خاطر خواہ تجارت کے شرائط طے کر سکیں۔ گاندھی جی جیسے مرتبہ کے لیڈر کے متعلق اس کا گمان کرنا بھی ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ ایک قومی ادارہ کی تفویض کردہ امانت و ذمہ داری کے متعلق ایسا غدارانہ رویہ اختیار کر سکتا ہے، لاہور کانگریس کی واضح اور غیر مشروط قرار داد میں مبہم اور من مانی شرائط لگانے کی کوششیں جاری تھیں، گویا اس تاریخی تجویز کا مقصود حاصل ہو جائے گا، اگر انگریز موزوں قسم کے مدبرانہ الفاظ میں ہندوستان کی آزادی تسلیم کر لیں چاہیئے اسے نامعلوم مدت تک کسی حقیقی سیاسی دستور میں قلمبند بھی نہ کیا جائے اور یہ مغالطہ اس بدیہی واقعہ کے ہوتے ہوئے ہے کہ باوجود اس کے کہ مصر کی بھی آزادی کو تسلیم کئے ہوئے برسوں گذر گئے، یہ غریب ملک اب تک برطانوی مسلح طاقت و حکومت کے آہنی چنگل میں دبا پڑا ہے۔ گاندھی نے اسی پر بس نہ کی بلکہ قوم کے منشور آزادی کو چند بے حقیقت مراعات کے بے میل ڈھیر سے بدل لینے کی پیشکش کر دی، اس کی بھی ضرورت نہیں رہی کہ ان ذلیل مطالبات کو فی الواقعہ منظور ہی کیا جائے، اگر وائسرائے صاحب صرف اتنی معقولیت پسندی کا ثبوت دیدیں "کہ ان خرابیوں کے فوری دفعیہ کے لئے راستہ صاف کر دیں گے "! تو گاندھی جی مگن ہو کر اپنی چہیتی تحریک کے جس کے اختیار کرنے کی جانب گاندھی جی کو حوادثات وقت کشاں کشاں لئے جا رہے تھے۔ سارے نقشے پارہ پارہ کر دیں گے، اور لمبے لمبے ڈگ مارتے ہوئے سیدھے لندن کی راہ لیں گے تاکہ وہاں پہونچ کر گول میز کی ریت میں ہل چلائیں۔

بالآخر گاندھی جی نے ہندوستان کو برطانوی شہنشاہیت کے پھندے سے ازاد کرانے کے لئے اپنے خوجیانہ منصوبے پیش کر دئے کہتے ہیں: "لیکن اگر آپ ان برائیوں کو دور کرنے کی طرف راغب نہ ہو سکے اور میرا خط آپ کے دل پر کوئی اثر نہ کر سکا تو میں اس مہینے کی گیارہویں تاریخ کو آشرم کے ایسے رفقار کار کی معیت میں جنہیں میں ساتھ لے سکوں گا قوانین نمک کی خلاف ورزی کے لئے روانہ

ہو جاؤں گا، میں غریبوں کے نقطۂ نظر سے اس ٹیکس کو تمام دوسرے ٹیکسوں سے زیادہ غیر منصفانہ سمجھتا ہوں ——— میں جانتا ہوں کہ یہ آپ کے اختیار میں ہے کہ مجھے گرفتار کرکے میرے منصوبوں کو ناکام بنا دیں، مجھے امید ہے کہ میرے بعد لاکھوں آدمی اس تحریک کو ضبط و نظم کے ساتھ چلانے اور قانونِ نمک کی خلاف ورزی کے ارتکاب میں اپنے کو ایسے قانون کی تعزیروں کا ہدف بنانے کے لئے جس سے مجموعۂ قوانین کے صفحات ہرگز سیاہ نہ ہونے چاہئے تھے تیار ہو جائیں گے۔" اور اس کے بعد خاتمہ میں وہی لازمی اظہار معذرت "میری خواہش آپ کے لئے کوئی غیر ضروری پریشانی بلکہ جہاں تک میرے بس میں ہو، کسی قسم کی بھی پریشانی پیدا کرنے کی نہیں ہے اگر آپ اس نتیجہ پر پہنچیں کہ میرے خط میں کچھ جان ہے اور آپ ان معاملات پر گفت و شنید کرنے کی زحمت گوارا کریں گے تو اگر اس سلسلہ میں آپ کی یہ خواہش ہو کہ میں خط کی اشاعت ملتوی کر دوں تو میں آپ کا تار ملنے پر بڑی خوشی کے ساتھ اشاعت سے اجتناب کروں گا۔"

وائسرائے نے اس الٹی میٹم کا جواب صرف دو سطر کے ایک پیغام میں دیا اور لکھا کہ "مجھے یہ معلوم کرکے افسوس ہوا کہ آپ ایک ایسی راہِ عمل اختیار کر رہے ہیں جو یقیناً قانون کی خلاف ورزی کا باعث ہوگی اور جس سے امنِ عامہ خطرہ میں پڑ جائیگا" لیکن گاندھی جی کے پاس نمک کی مہم کو ملتوی کرنے کی کوئی معذرت نہ تھی، اس لئے انہوں نے ۵ مارچ کی صبح کو آشرم کی پُرامن فضا میں یہ اعلان کیا کہ رضاکاروں کا پہلا جتھا ۱۲ تاریخ کی صبح کو پیدل روانہ ہو جائے گا اور نیز یہ بھی بتایا کہ آشرم کے مکینوں میں سے صرف مردوں کو ساتھ لے جائیں گے اور ان چند عورتوں اور مردوں کو چھوڑ جائیں گے، جن کی موجودگی آشرم کے کاموں کے لئے ضروری ہے، قبل اس کے کہ ہم اس تاریخی اعلان کے بعد پیدا ہونے والے دل کش حالات کا جائزہ لیں، آئیے ایک لمحہ کے لئے گاندھی جی کے مقاصد کا تجزیہ کریں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ انہوں نے سول نافرمانی کے سلسلہ میں اپنی تمامتر توجہات صرف نمک کے قانون پر کیوں مرکوز کر دی تھیں، اس سلسلہ میں اگر کوئی شخص گاندھی جی کی باردولی میں قائم کردہ مثال کی طرف رجوع کرے تو بے جا نہ ہوگا، یہ امر مسلمہ تھا کہ ۱۹۲۲ء میں ہندوستان کے عوام میں بیداری پیدا نہیں ہوئی تھی، لیکن اس کے برخلاف ۱۹۳۰ء کے موسم سرما میں ملک کے طول و عرض میں جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ لوگ اپنے دلوں میں سرفروشی کے جذبات لئے سر دھڑ کی بازی لگا دینے کو تیار تھے، اس کے علاوہ اب مسائل بھی کہیں زیادہ اہم پیدا ہو گئے تھے اور ان کی مناسبت سے خطرہ بھی زیادہ بڑھ گیا تھا، اس لئے ہر شخص یہ توقع رکھتا تھا کہ اس سلسلہ میں آج سے آٹھ سال قبل جو حربے استعمال کئے گئے تھے اس مرتبہ ان سے کہیں زیادہ شدید اور زوردار حربے ایجاد کئے جائیں گے، لیکن ہمیں یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوتا ہے کہ:-

گاندھی جی نے پچھلے قائم کردہ معیار کے مقابلہ میں ساری تحریک کو ایک افسوسناک استہزا میں تبدیل کر دیا، لیکن اس کے باوجود اپنے سحر آگیں داؤں گھات اور فریب آمیز چال سے، سادہ لوح عوام الناس اور روشن خیال طبقہ کی ایک بڑی اکثریت کو اس کے کارآمد ہونے کا یقین دلا دیا، ایک ایسی پُرامن اور صلح پسند اجتماعی تحریک کی جو دفتری حکومت کو واقعات کا صحیح جائزہ لینے پر مجبور کر دے، صرف دو صورتیں ہو سکتی ہیں پہلی صورت تو یہ تھی کہ عدم ادائیگی محاصل کے ذریعہ حکومت کی مالی آمدنی کو بند کرایا جائے دوسری صورت یہ تھی کہ حکومت کے تمام صنعتی کارخانوں میں ایک وسیع اور عام ہڑتال شروع کر دی جائے جو بڑی بڑی ریلوے کمپنیوں اور دیگر اہم محکموں پر بھی محیط ہو۔ ہندوستان جیسے ملک میں پہلے حربہ کو وطن کے لاکھوں اور کروڑوں کاشتکار اور رعیت نہایت خوبی کے ساتھ استعمال کر سکتے تھے اور دوسرا حربہ بہادر اور منظم مزدوروں کے ہاتھوں میں نہایت خوفناک صورت اختیار کر سکتا تھا، یہاں یہ یاد رکھنا مفید ہوگا کہ ۱۹۰۵ء میں روسی انقلاب کی ابتداء حکومت کی ریلوے کمپنیوں کی ہڑتال ہی سے شروع ہوئی تھی اور پھر یہ آگ اتنی سرعت کے ساتھ پھیلی کہ جنوب سے لے کر قطب شمالی کے آخری سرے تک پہنچ گئی، یہاں تک کہ روسی دہقانوں نے بھی اپنے آبائی مالکوں اور زمینداروں کو مالگذاری دینے سے انکار کر دیا، ۱۹۲۲ء میں گاندھی جی نے بھی اسی صحیح جذبے اور نظریئے کے ماتحت باردولی تعلقہ کی رعایا کو مالگذاری اور دوسرے ٹیکس ادا کرنے سے منع کر دیا تھا، اگرچہ وہ اپنی عادت کے مطابق اخیر میں ہچکچانے اور پس و پیش کرنے لگے تھے، اس وقت جب کہ ہندوستان کے مزدور طبقہ میں پہلے کی نسبت کہیں زیادہ خود شعوری، بیداری، تجربہ کاری اور تنظیم پیدا ہو چکی تھی، مسٹر گاندھی سے یہ توقع کی جاتی

تھی کہ وہ عدم ادائگیٔ محاصل کی تحریک کے دوش بدوش حکومت کے تمام صنعتی کارخانوں میں بھی عام ہڑتال کا حکم دیدیں گے اور اگر وہ اس قسم کی وسیع اور ہمہ گیر ہڑتال کی قیادت مشکل سمجھتے تھے تو کم از کم ۱۹۲۲ء کی ادھوری عدم ادائگی محاصل کی تحریک دوبارہ شروع کردیں گے"۔

لیکن اب وہ حکومت کے نظام محاصل کو ہدف قرار دینے کی بجائے ایک ہلکے ہتھیار یعنی قانون نمک کی طرف کیوں رجوع کر رہے تھے۔ ایک غریب آدمی کے نقطۂ نگاہ سے محصول نمک بہ اعتبار نوعیت واقعی ایک سخت ظالمانہ محصول ہو لیکن اگر وزن اور اہمیت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اس کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ محصول نمک عوام کو صرف چند کروڑ روپوں سے محروم کرتا ہے لیکن دوسرے محاصل کاشتکاروں سے ان کی گاڑھی محنت سے کمائے ہوئے کروڑوں اور اربوں روپیہ کی رقم چھین لیتے ہیں، محاصل کی غارتگری جب ان کی روٹی ہی چھین لیتی ہے تو پھر نمک سے کیا فائدہ، نہ سیاسی حالات کی اقتضا اور نہ ان کے بیان کردہ دلائل تحریک نمک کے حق میں ان کی حماقت مآب ترجیح کا کوئی تشفی بخش جواب دیتے ہیں، لہذا آئیے اب ہم اس راز کو معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ آخر گاندھی جی نے اور چیزوں کے مقابلہ میں اس تحریک کو کیوں ترجیح دی، باردولی کی جدوجہد کے التوا سے لے کر آج تک انقلابی تحریکوں کے خلاف کیا ہم ان کے مسلسل داؤں گھات کا مشاہدہ نہیں کرتے ہیں، کیا انہوں نے اعتدال پسندوں، مل مالکوں والیان ریاست اور زمینداروں سے رابطۂ اتحاد قائم کرنے کی کوشش کرکے ملک کے سب سے اول درجہ کی سیاسی جماعت سے سیاسیات کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کا ارادہ نہیں کیا تھا، کیا انہوں نے نہ صرف ملک کے تشدد پسند انقلابیوں کی سرگرمیوں کی مخالفت میں ایک مسلسل جنگ کی تھی بلکہ ان سے کہیں زیادہ خطرناک اور زوردار مزدوروں کی مجاہدانہ تحریکوں کی پرزور مخالفت نہیں کی تھی۔ ۱۹۲۰ء میں کانگریس قطعی طور پر قرارداد آزادی پاس کرچکی تھیں اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی صحیح طور پر اسے برطانیہ سے مکمل انقطاع کے مرادف قرار دے چکی تھی، لیکن ان تمام امور کے باوجود کیا گاندھی جی نے ۱۹۲۸ء کے اجلاس منعقدہ کلکتہ میں پہنچ کر جلسہ کو مکمل آزادی کے عزیز مقاصد کا اعادہ کرنے سے اور اس سے وابستگی کا اظہار کرنے سے نہیں روکا تھا، کیا وہ ۱۹۲۹ء کے پورے سال برطانوی حکومت سے سمجھوتہ کرنے کی اضطراری کوششوں میں مصروف نہیں رہے تھے لیکن اب جب کہ وائسرائے کی مبہم بھڑکیوں نے ان کے لئے کوئی چارۂ کار نہ چھوڑا تو وہ تجویز آزادی کی حمایت کرنے لگے۔ ابھی لاہور کانگریس کی تجویز کی صدائیں فضا میں گونج ہی رہی تھیں کہ انہوں نے الفاظ کے ساتھ اپنی روایتی شعبدہ بازی پھر شروع کردی اور یہ کہنا شروع کردیا کہ آزادی کا پرجلال چہرہ در اصل اسی درجۂ نوآبادیات کی دوسری شکل ہے جس سے ہم اتنے دن سے واقف ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ اب یہ ایک نیا لباس پہن کر سامنے آئی ہے، اور کیا انہوں نے عام شورش کے سیلاب کو روکنے کے لئے تحریک سول نافرمانی کو چند مصنوعی پابندیوں کے ذریعے صرف ان لوگوں تک محدود نہیں کر دیا تھا، جو عدم تشدد کو جزو ایمان مانتے تھے اگر ہم اس سلسلہ میں تھوڑا اور غور کریں تو ہمیں مسٹر گاندھی کا قانون نمک کے خلاف ستیہ گرہ کرنے کا صحیح راز معلوم ہو جائے گا

صاف الفاظ میں تحریک نمک کا انفرادی ستیہ گرہ ایک بہت بڑا دھوکا تھا کہ جو ۱۹۳۰ء میں ہندوستان کے بہادر مزدور طبقہ کو غیر منظم اور مفلوج کرنے کے لئے ایجاد کیا گیا تھا، ٹھیک اسی طرح جس طرح ۱۹۲۲ء میں گاندھی جی نے زیادہ دیانتداری کے ساتھ عدم ادائگی محصول کا خوفناک حربہ حکومت کی طاقتوں کو غیر منظم اور مفلوج کرنے کے لئے اختیار کیا تھا، کیا انہوں نے وائسرائے کے نام جو خط لکھا تھا اس میں تشدد پر اعتماد رکھنے والی جماعت کے غیر منظم اور پرزور طاقت کا تذکرہ نہیں کیا تھا انہوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ "اب خاموش بیٹھنے کے معنے ان طاقتوں کو آزاد چھوڑ دینا ہے"، اب موصوف کی نگاہ میں انقلاب پسند جماعت کی بڑھتی ہوئی طاقت اس دور کے لئے فیصلہ کن ثابت ہوتی، کیونکہ برطانوی حکومت کا منظم تشدد ملک میں ایک عرصہ سے نمایاں اور عام ہو چکا تھا، اور انقلاب کی تمام طاقتوں کو یک قلم کچل ڈالنے کی کوششوں میں مصروف تھا، گاندھی جی نے اپنی ذکاوت و ذہانت کے ذریعے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اب بچے انقلابیوں کو ان کی راہ سے باز رکھنے کی کوشش سعی لاحاصل تھی، اگرچہ ان کی تعداد بہت کم تھی۔ لیکن ان کے موقت کارنامے اور غیر معمولی مصائب و آلام کے مقابلے روز بروز ملک کے پرجوش اور ناتجربہ کار نوجوانوں کے دلوں پر اپنا اثر بٹھا رہے تھے، اور حکومت و گاندھی دونوں کے لئے خطرناک بن رہے تھے، گاندھی جی ایسے تاثیر پذیر افراد کی ایک بہت بڑی تعداد کو "سول نافرمانی" "آزادی" اور "آخری جنگ" جیسے دلکش نعروں سے پھانس کر سمندر کے کنارہ نمک بنوانے کے لئے روانہ ہو رہے تھے۔

تاثیر پذیر نوجوان اور کاشتکاروں کی اس جماعت کو پھانس کر (جو عام طور پر ہر ملک میں انقلاب کے بنیادی عناصر ہوتے ہیں) گاندھی جی نے

بظاہر ایک بڑے زور شور کی تحریک شروع کی لیکن درا صل یہ حکومت کو کم سے کم نقصان پہنچانے کی ایک پر فریب چال تھی، البتہ عدم ادائگی محاصل کی اجتماعی تحریک اور اس کے ساتھ ساتھ سول نافرمانی (جس میں دفاتر محاصل اور پولس چوکیوں پر پُرامن حملے بھی شامل ہوتے) ان پُرجوش نوجوان اور بھوکے کاشتکاروں کے لئے ایک سنسنی خیز دل کشی کا باعث ہوتی لیکن "چورا چوری" کے گہرے سبق نے گاندھی جی کو باردولی کا حربہ استعمال کرنے سے رُوکا ان حربوں کو ہمارے "مقدس سیاست داں" نے اس لئے مسترد کر دیا کہ وہ ملک میں نہ صرف ایک تشدد آمیز بغاوت کا اظہار کرتے بلکہ معاشرتی انقلاب کی خوفناک طاقتوں کو بھی مشتعل کر دیتے جو زمینداروں اور سرمایہ داروں اور ساہوکاروں اور مل مالکوں کے مفاد کے لئے ایک بڑا خطرہ ثابت ہوتے اور ظاہر ہے کہ ان طبقوں کے مفاد مسٹر گاندھی کو بے حد عزیز تھے۔

گاندھی جی نے یہ دیکھا کہ قانون نمک کی خلاف ورزی کی تحریک کہیں نوجوانانِ قوم کے جوش اور ولولوں کو ابھارنے میں ناکام نہ رہے، اور اس پر غور کرنے لگیں کہ اتنی عظیم الشان طاقتوں کو قانون نمک جیسے حقیر اور معمولی مسئلہ کے خلاف استعمال کرنا کوہ کندن وکاہ برآوردن کا مصداق ہوگا، لہٰذا گاندھی جی نے اپنی صحافتی قابلیتوں اور سیاسی خوش تدبیری کے ذریعے اس تحریک پر ایک انقلابی اور اشتراکی رنگ چڑہانا شروع کیا، حالانکہ یہ اس سے بہت دور تھی، نمک کے اس نئے دیوتا کی شان میں جھوٹے اور مضحکہ خیز بھجن لکھے اور گائے گئے اور تھوڑی دیر کے لئے دوسرے تمام مسائل بُھلا دئے گئے، گاندھی جی اور ان کے وفادار چیلوں کے پیدا کردہ اس شور اور ہنگامے نے ناجائز طور پر نمک بنانا (جیسا کہ کبھی جائز طور پر کھدر تیار کرنا) سوراج حاصل کرنے کا واحد ذریعہ قرار دیدیا۔

اب مسٹر گاندھی کے سامنے سب سے زیادہ اہم بین الاقوامی نقطۂ نگاہ تھا، اگرچہ ایک چالاک سیاسی اداکار کے لئے جو بین الاقوامی تماشہ بینوں سے داد حاصل کرنا چاہتا ہے، یہ ضرور ہے کہ بھیس بدل بدل کر انوکھے اور نرالے انداز سے سامنے آئے۔

اس کے علاوہ بیرونی ممالک کے متوسط الحال اور نچلے طبقوں اور امراء وحکمران طبقوں سے (چاہے وہ برطانوی شہنشاہیت پرستوں کی پالیسی کے کتنے ہی مخالف کیوں نہوں) آپ کیسے توقع کر سکتے تھے کہ وہ لوگ عدم ادائگی محاصل اور معاشرتی بغاوت کی ایک ایسی اجتماعی تحریک سے ہمدردی کا اظہار کریں گے کیونکہ اگر اسی قسم کی تحریک خود ان کے ملک میں شروع ہوتی تو اسی طرح ان کے مفاد بھی خطرہ میں پڑ جاتے، اس سے قطع نظر گاندھی جی جانتے تھے کہ ان کے سامنے یہ تحریک ایک مخصوص ہندوستانی رنگ ہی میں آنی چاہیئے، کاشتکاروں کا ایک مظلوم طبقہ حکومت اور زمینداروں کے ظلم کے خلاف ہر جگہ آمادۂ بغاوت ہو سکتا ہے لیکن سوائے گمراہ اور فریب خوردہ ہندوستان کے اور کس ملک میں دنیا کے روشن خیال طبقہ کے لئے قانون نمک کی خلاف ورزی سے تفریح طبع کا سامان بہم پہنچایا جا سکتا تھا،

اسی وجہ سے مسٹر گاندھی نے اپنے سیاسی ذکاوت کے ذریعہ محسوس کیا کہ کنوئیں اور سمندر کے پانی سے ناجائز نمک بنانے کی فرسودہ تجویز اندرون ملک اور بیرون ملک دونوں میں کسی خاص اہمیت کی حامل نہ سمجھی جائے گی، باردولی کی تحریک عدم ادائگی محاصل تو بذات خود ایک اہم سیاسی تحریک تھی، گاندھی جی نے سوچا کہ باردولی کی آتشگیر اشیاء ہیں رات کی گاڑی سے پہنچ کر آگ لگانا تو ہیچ تھا، لیکن اس تحریک کے سلسلہ میں ریل گاڑی پر سوار ہو کر ڈانڈی پہونچنا مناسب نہیں، ہندوستان اور بیرونی ممالک کے عوام کی توجہ مبذول کرانے کے لئے نہ صرف اس کا طریقۂ کار خالص ہندوستانی ہونا چاہیئے، بلکہ اس پر عملدرآمد بھی انوکھے پیرایہ میں کرنا چاہیئے اس لئے انہوں نے اپنی حاضر دماغی پر پورا پورا زور دیا کہ کوئی ایسا نیا اور نرالا طریقہ نکل آئے جسے دیکھ کر دنیا ششدر اور حیران رہ جائے۔

لہٰذا گاندھی جی ذوالہامی طور پر یہ نقشہ تیار کیا کہ اپنے آشرم واقع احمد آباد سے ڈانڈی (ضلع سورت) تک جس کا فاصلہ تقریباً ایک سو پچاس میل تھا، پہنچنے کے لئے گجرات کے چار ضلعوں سے ہو کر گزرا جائے اس طریقہ پر ہندوستان کے عوام اور بیرونی ممالک کی سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کیجائے صرف حکومت ہند اور برطانوی استعمار پرست اس تحریک سے قطعی متاثر یا خائف نہیں ہوئے اور مسٹر گاندھی کا بھی یہی منشا تھا یہ تھا وہ معرکۃ الآرا اقدام (مارچ) اور اس کا نتیجہ! ٹائیں ٹائیں فش

چھہتّرواں باب

گاندھی جی نمک بنانے جاتے ہیں

سارا ہندوستان مہاتما کے سحر آفریں نغمے کی گت پر رقص کرنے لگا۔

قدرتاً صدر کانگرس پنڈت جواہرلال نہرو نے بھی سُر ملایا اور کروروں فرزندان و دختران وطن کو دعائے خیر کرنے اور مجاہدین حریت کو خدا حافظ کہنے کی تلقین فرمائی۔

اُسی روز یعنی ۷ر مارچ کو مسٹر ولبھ بھائی پٹیل نے اس مقدس جنگ میں پہلی قربانی پیش کی۔ ان کو برساد تعلقہ (گجرات) کے ایک گاؤں (راس) میں مجسٹریٹ کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے تقریر کرنے پر تین ماہ قید محض کی سزا ہو گئی۔ گاندھی جی کے حکم پر احمد آباد شہر میں مکمل ہڑتال کی گئی۔ ملیں بھی بند رہیں۔

سارے ملک میں اس قدر جوش و خروش برپا تھا کہ یہ آگ ہندوستان کے شمالی حصوں تک پہنچ گئی۔ گاندھی جی کے مارچ کے ایک روز پہلے پنجاب اور صوبہ سرحد کی کانگرس کمیٹیوں نے نیز شیرومنی اکالی دل نے رزولیوشن پاس کیے کہ مہاتما گاندھی جس مہم کو شروع کر رہے ہیں ہم لوگ اس کی پوری حمایت کریں گے۔

۱۱ر مارچ کو گاندھی جی نے اُن ہزاروں آدمیوں کے سامنے جو سابرمتی کے کنارے ان کی تقریر سُننے کے لیے جمع ہوئے تھے، باشندگان گجرات کے نام اپنا (بزعم خود) آخری پیغام دیا۔ لوگوں کو نصیحت کی کہ اگر میں اور میرے رفقا منزل مقصود تک پہنچنے کے پہلے ہی گرفتار ہو جائیں تو بھی تم لوگ نمک بنا کر عام سول نافرمانی کرتے رہنا۔ اس موقع پر بھی اُنھوں نے عدم تشدد کے متعلق انتہائی زور دیا اور کہا کہ جو لوگ اس جنگ میں شریک ہوں ان کو چاہیے کہ عدم تشدد کو ایک مذہبی عقیدہ سمجھ کر اس پر کاربند رہیں۔ دوسرے یہ کہ اُنھوں نے اپنے سہ گانہ مقاطعہ کے پروگرام کا خاکہ پھر سے لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ تیسری اور آخری چیز جو اُنھوں نے کہی وہ یہ تھی کہ جن لوگوں میں ہمت ہو وہ محاصل کی ادائگی سے بھی انکار کر دیں۔ بہرحال اس صورت میں بھی عدم تشدد کی مذکورہ بالا شرط لازمی رہے گی۔

جس دِن گاندھی جی یہ زبردست، مارچ شروع کرنے والے تھے وہ بھی آ ہی گیا (۱۲ر مارچ)۔ صبح کے وقت اپنے ۷۹ ستیہ گرہیوں کے ہمراہ گاندھی جی روانہ ہوئے کہ اب تخت یا تختہ۔ لاکھوں انسانوں کا جم غفیر آشرم کے باہر اور ایلس برج کے راستہ پر اس مہاتما کے آخری درشن کا منتظر تھا جس نے قسم کھائی تھی کہ ہندُستان کو آزاد کرائے بغیر گھر کا مُنھ نہ دیکھوں گا۔ اس کے علاوہ گاندھی جی کے گرفتار کیے جانے کی افواہیں بھی گشت کر رہی تھیں جن سے سارے شہر بلکہ پورے صوبے میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ راستے کے بیشتر مقامات کو جھنڈیوں اور پھول پتّیوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ پوجا پاٹ سے فارغ ہو کر ٹھیک ساڑھے چھ بجے گاندھی جی اس ٹھاٹ باٹ سے روانہ ہوئے کہ ماتھے پر تلک لگی ہوئی ہے، کمر پٹی میں گھڑی جھول رہی ہے، چند وفادار چیلے پیچھے پیچھے ہیں جن میں سے ہر ایک کا یہ عالم کہ* "رن مارنے نکلے ہیں، اک ہاتھ میں ڈنڈا ہے — اک ہاتھ میں کھدّر کا تھیلا نظر آتا ہے"

---

* ظریف لکھنوی کا شعر ہے:۔ آئے ہیں شب وعدہ اک ہاتھ میں آنچل ہے ۔ ایک ہاتھ میں طوطے کا پنجرا نظر آتا ہے

راستے میں متعدد مقامات پر پھول اور ناریل سے تواضع ہوئی اس جلوس کو دیکھ کر آنکھوں کے سامنے وہ نقشہ پھر جاتا تھا کہ گویا راجپوت آخری جنگ کے لیے روانہ ہو رہے ہیں، یا عورتیں اپنے شوہروں کی چتا پرستی ہونے جا رہی ہیں!

مہاتما کا گجرات کے دیہاتوں سے ہو کر گزرنا بہت کامیاب رہا جہاں کہیں مقام کرتے، ہزارہا آدمی شاہانہ خیر مقدم کرنے کے لیے حاضر ہوتے۔ اُنھوں نے آدمی اور روپیہ کے لیے اپیل کی۔ ہر طرف سے لبیک کی صدائیں بلند ہوئیں۔ دیہاتوں کے کتنے ہی مکھیا اور پٹیل اپنی اپنی ملازمتوں سے مستعفی ہو گئے۔

وائسرائے نے اُن کے الٹیمٹم (ینگ انڈیا مورخہ ۱۳ر مارچ) کا جو جواب دیا تھا اس پر بھی اسی زبردست مارچ کے دوران میں گاندھی جی نے تبصرہ کیا "میں نے گھٹنے ٹیک کر روٹی کی بھیک مانگی، جواب میں پتھر ملے...... مگر ابھی وقت نہیں آیا۔ وہ ایسی قوم کے فرد ہیں جس کا دل آسانی سے نہیں پسیجتا، جو منت سماجت سے کبھی قائل نہیں ہوتی، جو مادی قوت کے سوا کسی چیز کو خاطر میں نہیں لاتی، جو دم بخود ہو کر مرغا بازی کا پیچ دیکھ سکتی ہے...... جو لڑائی کے روح فرسا حالات سُن کر وجد میں آجاتی ہے۔ اب وہ شدائد و مظالم کی چپ چاپ اور غیر مزاحم برداشت پر بھی کان دھرے گی" گاندھی جی یہ خواب دیکھ رہے تھے! کیا ایسا ہی ہوا؟

اس زمانے میں گاؤں کے مکھیا اور پٹیل برابر مستعفی ہوتے رہے، خصوصاً اُن دیہاتوں کے جہاں سے گاندھی جی گزرتے تھے۔ اپنے استعفوں میں پٹیل لوگ لکھ دیتے تھے کہ چونکہ ہندستان کی قومی کانگرس نے اس حکومت کے خلاف، جو یہاں کے لوگوں کی اقتصادی، جسمانی اور اخلاقی حالت سے ناجائز انتفاع کرتی رہتی ہے، اعلان جنگ کر دیا ہے لہٰذا ایسی حکومت کے ساتھ تعاون کرنا ملک کے ساتھ غداری کے مرادف ہے۔ مگر جہاں یہ سب تھا وہیں یہ بھی ایک کھلا راز ہے کہ ان میں سے اکثر مکھیا اور پٹیل ایسے تھے کہ اُدھر گاندھی جی اُن کے گاؤں سے دو چار میل دور گئے اور ادھر اُنھوں نے اپنے استعفے واپس لے لیے۔

مگر یہ مشکل تھا کہ معاملات بے سود مارچ اور وقتی استعفوں ہی پر ختم ہو جائیں۔ اس مارچ کے دوران میں گاندھی جی نے "تخت یا تختہ" کا نعرہ بہت لگایا تھا اور لوگوں کے دل میں یہی بیٹھ چکا تھا، وہ اس پر تلے ہوئے تھے کہ گورنمنٹ سے سر دھڑ کی بازی لگا کر جیت لینا ہے، بغیر تشدد کے ہو سکے تو بہتر ہے ورنہ تشدد کے ساتھ سہی۔ جس انقلابی روح کو گاندھی جی امن و محبت کے ریشمی بندھنوں میں جکڑنا چاہتے تھے وہ بار بار اُبھر کر پولیس والوں کے ساتھ مار پیٹ اور کبھی کبھی اچھے خاصے بلووں کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔

اس قسم کا پہلا بلوہ ۱۹ر مارچ کو رنگون جیسے دور دراز مقام پر اس وقت ہوا جب مسٹر سین گپتا پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا جا رہا تھا۔ پولیس اور عوام کے مجمع میں جو عدالت کے باہر کھڑا تھا تصادم ہو گیا۔ دونوں طرف کے بہت سے آدمی مجروح ہوئے۔ اینٹ پتھر بھی چلے۔ اخیر میں مجمع منتشر کرنے کے لیے فوج بلائی گئی۔

گاندھی جی نے تحریک کا گلا گھونٹ دینے کے لیے اس پر ایسی پابندیاں عائد کی تھیں جن کا اکثر موقع پر ٹوٹ جانا ناگزیر تھا۔ مسٹر وٹھل بھائی پٹیل نے سچ کہا ہے کہ ۳۱-۱۹۳۰ء کی ساری مہم اسی حد تک کامیاب رہی جس حد تک کہ وہ گاندھی جی کے مقرر کردہ راستے سے الگ ہٹی۔

۲۱ر مارچ کو احمد آباد میں آل انڈیا کانگرس کا ایک اہم جلسہ اس غرض سے منعقد ہوا کہ ملک کی موجودہ صورت حال پر غور و خوض کیا جائے۔ اس کے بتانے کی تو ضرورت ہی نہیں کہ اس جلسہ نے یہ قرار داد منظور کی کہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی، مجلس عاملہ کے اس فیصلے کی توثیق کرتی ہے جس کی رو سے گاندھی جی کو سول نافرمانی شروع کرنے اور چلانے کا اختیار دے دیا گیا ہے۔ صوبائی کانگرس کمیٹیوں کو بھی اختیار دیا گیا کہ "وہ انھیں بھی سول نافرمانی کی نوعیت، تنظیم، و اجرا کے متعلق جو صورت انسب نظر آئے، اس پر عملدرآمد کریں"۔ مگر اس ڈر سے کہ مبادا کوئی صوبائی کمیٹی انتہا پسند اور جارحانہ اقدام نہ کر بیٹھے، آل انڈیا کمیٹی نے یہ بھی ہدایت کی

کہ شروع میں صرف نمک کے قوانین توڑنے پر توجہ مرکوز رکھی جائے۔

۲۳ مارچ کو نوجوانانِ گجرات کی ایک کانفرنس سورت میں منعقد ہوئی جس کے صدر مسٹر کے۔ اف۔ نریمان تھے۔ اُنھوں نے اور مسز کملا چٹو پادھیہ، مسٹر مہر علی، اور دیگر اصحاب نے بڑی دھواں دھار تقریریں کیں۔ مگر جتندر داس کی جاں سپاری پر تحسین و آفرین کی قرارداد منظور کرنے کے بعد اس نے بھی یہی فیصلہ کیا کہ مٹی یا کھاری پانی سے نمک بنا کر ہندستان کو مکمل آزادی حاصل ہو جائے گی۔ بہرحال غیر محسوس طریقے پر یہ کانفرنس ایسی گری کہ بالکل تماشہ بن کر رہ گئی۔

گورنمنٹ کو اس تحریک کے دور رس اور نادیدہ نتائج کے ڈر سے کسی حد تک اضطراب ضرور تھا اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے وہ اپنا ساز و سامان درست کر چکی تھی مگر یہ دیکھ کر البتہ خوش ہو رہی تھی کہ اس ہمہ گیر ہنگامہ کے سیلاب کو بالکل بے ضرر راستوں کی طرف لگا دیا گیا ہے۔ وائسرائے نے دہلی میں آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے موقع پر ایک خطبہ کے دوران میں "قانون شکنی (خصوصاً نمک کے قوانین توڑنے) کی تدبیریں نکالنے کے بے سود کام" کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے بہت کچھ دادِ فصاحت دی تھی۔ اُنھوں نے گاندھی جی کے اس مسلک پر بھی اظہار تاسف کیا کہ "عدم تشدد کے نام پر ہر قسم کی اذیتیں برداشت کرنے ہی سے ملک اپنی منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے" بہرحال اپنے دل میں یہ سوچ کر کہ یہ تمام اذیت دہا دکھا ہی اہل برطانیہ نہیں بلکہ ہندستانیوں کے حصّہ کی چیز ہے، اُنھیں اطمینان ہو گیا۔ گاندھی جی نے خود اپنے متبعین کو شروع ہی میں ہدایت کر رکھی تھی کہ اپنے علاوہ نہ کسی کا خون بہائیں نہ کسی کی ہڈّی توڑیں۔

گاندھی جی جب تک اپنے جاترا کی محبوب منزل تک پہنچیں پہنچیں مزدور تحریک بھی کافی اہمیت حاصل کر چکی تھی۔ کلکتہ میں گاڑی والوں کی ہڑتال میں سات آدمی مقتول اور اسّی مجروح ہوئے پولیس کے بھی کئی آدمی مقتول و مجروح ہوئے۔ یہ ہڑتال انوکھے قسم کی تھی۔ گاڑی والوں نے شہر کی اُن شاہراہوں پر جہاں سب سے زیادہ آمد و رفت رہتی ہے اپنی گاڑیاں لے جاکر کھڑی کر دی تھیں جس سے راستہ بالکل مسدود ہو گیا تھا۔ "چار پانچ موقعوں پر مجمع منتشر کرنے کے لیے متعدد بار آگاہ کرنے کے بعد پولیس کو "افراد" پر گولیاں چلانے کا حکم دیا گیا" (سرکاری رپورٹ)۔ یہ سارا قصّہ صرف اسی بنا پر پیدا ہوا تھا کہ بھینسا گاڑیوں کے بارے میں کچھ نئے قوانین نافذ کیے گئے تھے۔

آخر کار ۵ اپریل کو گاندھی جی نوساری پہنچ گئے جو ڈانڈی کے راستے میں آخری بڑا شہر پڑتا ہے۔ ایک مجمع کے سامنے تقریر کرتے ہوئے گاندھی جی نے فرمایا:۔ "جو کچھ میں چاہتا ہوں یا تو اُسے لے کر لوٹوں گا یا میرا جسم سمندر ہی میں بہتا ہوا نظر آئے گا۔" ظاہر ہے کہ گاندھی جی خوب جانتے تھے کہ اور تو جو کچھ بھی مل جائے، مگر مٹھی بھر نمک بنا کر آزادی ملنے والی نہیں، اور یہ بھی نہیں ہے کہ نمک بنانے کی مہم، میں جان جانے کا کوئی خطرہ تھا۔

نوساری ہی میں اُنھوں نے پارسیوں سے اپیل کی کہ شراب کی درآمد برآمد بند کر دیں اور عورتوں پر زور دیا کہ ترک مسکرات و منشیات کا کام اپنے ہاتھ میں لیں۔ مگر عورتوں سے جو کچھ اپیل کی گئی اس میں کچھ اور گہری باتیں بھی پنہاں تھیں۔ یاد ہو گا کہ گاندھی جی نے زبردستی عورتوں کو نمک والی مہم میں شریک ہو کر مارچ کرنے یا اور کسی قسم کا حصّہ لینے سے بالکل روک دیا تھا۔ جب گاندھی جی کی فاتحانہ روانگی کی خبریں سارے ملک میں گونجنے لگیں اور لوگوں کے ولولے اور جوش و خروش حد سے زیادہ بڑھنے لگے تو بمبئی اور گجرات بلکہ سارے ہندستان کی ممتاز خواتین نے بھی گاندھی جی کو دق کرنا شروع کیا کہ وہ بتائیں اس نئی تحریک میں عورتوں کو کیا اور کس طرح حصّہ لینا چاہیے۔ ان پیہم اور شدید اپیلوں سے پریشان ہو کر گاندھی جی نے نوساری میں ممتاز خواتین کا ایک فوری جلسہ طلب کیا جس میں مسز سروجنی نائڈو، مسز ہنسا مہتا، مس مٹھو بین پیٹٹ نیز دیگر معزز مستورات شریک ہوئیں۔ گاندھی جی کو بے حد اندیشہ تھا کہ کہیں عورتوں کی شرکت سے معاملات کچھ زیادہ نازک صورت نہ اختیار کر لیں۔ لہٰذا انھوں نے جلدی سے خواتین ہند کے لئے ایک خاص پروگرام تجویز کر کے اُنھیں حکم دیا کہ اس پر کاربند ہو جائیں۔ یعنی یہ کہ عورتیں یکسوئی کے ساتھ ترک مسکرات اور بدیشی کپڑوں کے مقاطعہ میں لگ جائیں۔ تمام مسکرات اور بدیشی کپڑوں کی خرید و فروخت کرنے والوں کو سمجھا بجھا کر راضی کریں کہ ان نجس چیزوں کی لین دین قطعاً بند کر دیں۔ ضرورت پڑے تو اس سلسلے میں شراب خانوں اور بدیشی کپڑوں کی دکانوں پر پکٹنگ بھی

کریں مگر منت سماجت کے ساتھ صلح و آشتی کے انداز میں۔ بہرحال سمندر کی طرف جاتے ہوئے آخری منزل پر پہنچ کر انھوں نے خواتین ہند کو یہی پیغام دیا تھا۔

اسی نِچے تُلے فیصلے کے ماتحت مسز ہنسا مہتا نے خواتین کی عارضی کمیٹی کی طرف سے جو بعد میں دیش سیوکی سنگھ بنا دی گئی تھیں حسب ذیل پرجوش اپیل شائع کی:۔

"بمبئی شہر میں شراب کی دوکانوں پر پکٹنگ کرنے کے لیے ڈھائی ہزار خواتین کی رضاکارانہ خدمات درکار ہیں۔ بمبئی میں شراب کی پانچ سو دوکانیں ہیں جن کے لیے ضرورت ہے کہ ہر دوکان پر چار خواتین دو دو گھنٹے کی ڈیوٹی دیں۔ لہٰذا دو ہزار خواتین باضابطہ پکٹنگ کے لیے اور پانچ سو فاضل رہنے کے لیے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کالج کی طالبات سے خاص طور پر استدعا کی جاتی ہے کہ وہ جلد سے جلد اپنے نام پیش کریں۔"

لوگ اس اپیل کا مضحکہ اُڑاتے تھے کہ بھلا ڈھائی ہزار کیا انھیں ایسی پچاس شادی شدہ ہندو عورتیں (ہندو لڑکیوں کی اکثر کم عمری ہی میں شادی ہو جاتی ہے۔ مسلمان عورتیں پردہ نشین ہوتی ہیں، پارسیوں کو کوئی ہمدردی نہیں) یا بیوائیں بھی کہاں، سے ملیں گی جو دِن دہاڑے کماٹی پورہ جا کر وہاں گھنٹوں شراب خانوں کے سامنے کھڑی رہیں گی اور شرابیوں کے بیہودہ مذاق برداشت کریں گی یا مول جی جیٹھا مارکیٹ میں جا کر مانچسٹر کے کپڑوں کی دوکانوں پر کھڑی ہو کر متمول لوگوں کے بے رحمانہ طنز و طعن سُنیں گی۔ مگر یہی معترضین اس وقت حیرت سے مُنہ تکتے رہ گئے جب اُنھوں نے دیکھا کہ چند ہی ہفتے میں پانچ سو خواتین — شادی شدہ، غیر شادی شدہ، بیوائیں، جن میں معتد بہ تعداد مسلمان اور پارسی مستورات کی بھی تھی — اور چند مہینوں میں ہزارہا خواتین اس نئی تنظیم میں شامل ہو گئیں۔ جو کچھ آج بمبئی میں ہوا وہی کل سارے ہندوستان میں ہوا، چند ہی ہفتوں میں ہندستان کے سارے صوبوں میں حتیٰ کہ دہلی، الہ آباد، ڈھاکہ، کلکتہ جیسے مقامات پر بھی جہاں پردہ کا اتنا زیادہ رواج ہے، خواتین کی بے حساب انجمنیں نمودار ہو گئیں اور نوبت باینجا رسید کہ مستورات حکومت کے خلاف اس پُرامن جنگ میں حصّہ لینے کا شرف حاصل کرنے میں تھوڑے ہی دنوں کے اندر اندر مردوں کی رضاکارانہ جماعت سے بھی سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگیں۔

اس بیانِ معترضہ کے بعد ہم پھر گاندھی جی کی طرف نظر ڈالنا چاہتے ہیں جو تھکے ماندے بلکہ قریب قریب بیمار ہو کر ۵ را پریل کو اپنے سفر کی آخری منزل پر پہنچ گئے۔ ڈانڈی میں ایسوشی ایٹڈ پریس کے نمائندہ نے ملاقات کی۔ گاندھی جی نے اگلے دن (۶ را پریل) کی اہمیت پر بہت زور دیا اور کہا کہ یہ توبہ و تزکیہ کا دن ہے۔ ساری قوم کو یہ وعظ دیا کہ برت اور پوجا سے قومی ہفتہ کی افتتاح کریں۔ لیکن ظاہر ہے کہ گاندھی جی نے سابرمتی سے ڈانڈی تک کی مسافت پا پیادہ اس لئے نہیں کی تھی کہ یہاں پہنچ کر برت رکھیں گے اور پوجا کریں گے۔ انھوں نے نہایت خوش تدبیری سے اپنے اس طویل سفر کا نظام اوقات کچھ اس صورت سے مرتب کیا تھا کہ جب تک ہم شروع کرنے کا وہ دن اور ہفتہ آئے جس پر ۱۹۲۹ء کے ہنگامہ خیز واقعات نے ساری قوم کی نظریں جما دی تھیں اس وقت تک وہ سارے ہندستان بلکہ دنیا کے تخیل کو مسخر کر چکیں۔

لیجیے اس مہتم بالشان کارنامے کی ساعت بھی آپہنچی! ۶ را پریل کو ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے گاندھی جی نے اپنے چیلوں سمیت سمندر کے کنارے پر ایک گڑھے سے تھوڑا تھوڑا قدرتی نمک اُٹھالیا! نمک کا قانون ٹوٹ گیا! ہزاروں آدمی اس رسم کو دیکھنے کے لئے جمع تھے۔ اس خاص انداز میں نمک کا قانون توڑ چکنے کے بعد گاندھی جی نے ایک بیان شائع کیا کہ جو شخص بھی قانون نمک کے ماتحت ماخوذ ہونے کا خطرہ مول لینے پر آمادہ ہو حسب مرضی جہاں مناسب سمجھے نمک بنا سکتا ہے۔

تو کیا گاندھی جی نے یکبارگی یہ فیصلہ کر لیا کہ جو شخص بھی یہ سیاسی خطرہ مول لینے پر آمادہ ہو، نمک کا قانون توڑ سکتا ہے خواہ وہ عدم تشدد پر بطور جزو ایمان یا بطور مقتضائے مصلحت ایمان رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو؟ کیا اب اس کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی کہ سول نافرمانی کرنے والے اُجلے کھدر کی وردی پہنے ہوں، اور اچھوت کے پاپ سے اپنا دل پاک کر چکے ہوں؟ سیاست کے ہنگامی تقاضوں کی بنا پر غالباً گاندھی جی نے اسے سردست مبہم ہی رہنے دینا مناسب سمجھا۔ شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ سارے ملک میں روز افزوں انقلابی جوش و خروش کے بڑھے ہوئے سیلاب نے اُنھیں مجبور کر دیا کہ اپنی اُن تقدس مآب شرائط کو خیرباد کہہ دیں جو اُنھوں نے بہت ٹھنڈے دل سے سوچ سمجھ کر عائد کی تھیں اور

سارے ہندستان کی سول نافرمانی کی طاقتوں کو تیاری کا حکم دے دیں۔

یہ چیز نہایت سبق آموز ہے کہ گاندھی جی کا حکم پہنچنے کے پہلے ہی کانگرس کے مقامی اور صوبائی لیڈر طے کر چکے تھے کہ اسی دن یعنی ۶ اپریل کو ہر جگہ نمک کا قانون توڑنے کی ستیہ گرہ کی جائے۔ بمبئی میں، ویرم گام (گجرات) میں، الہ آباد میں، کونٹائی (بنگال) میں، غرض ہر جگہ کانگرسی رضاکاروں نے نمک کا قانون توڑ کر اور سزا کے خواستگار ہو کر اس تاریخی دن کی اچھی خاصی شہرت دیدی اور گرفتاریوں اور قید و بند کا بازار گرم ہو گیا۔

مگر گاندھی جی پر حکومت نے ہاتھ نہیں ڈالا۔ گاندھی جی کو خود اُلجھن تھی کہ جو شخص خاص مجرم ہے اُسے نہ گرفتار کیا جاتا ہے نہ قید میں ڈالا جاتا ہے مگر اس کے سینکڑوں متبعین پر روزانہ پولیس چھاپہ مارتی ہے اور اُنھیں جیلوں میں بند کر دیتی ہے۔ اور سنیے۔ خود اُنھیں کے علاقہ کے رضاکار پولیس کے ہاتھوں پٹنے لگے۔ لوگوں کے قبضہ سے نمک چھیننے میں پولیس کو انتہائی تشدد برتنے میں بھی کوئی پس و پیش نہ ہوتا تھا۔ یہ بھی ایک ایسی نئی صورت پیدا ہو گئی تھی جس پر گاندھی جی نے کبھی پہلے غور نہیں کیا تھا۔ جب یہ ناگہانی صورت پیش آئی تو گاندھی جی کے پاس بجز اس کے کوئی چارہ کار نہ رہا کہ رضاکاروں سے کہیں کہ پولیس کے خلاف مقاومت کریں اور استقلال پیدا کریں اگر اور کسی وجہ سے نہ سہی تو اسی خیال کے ماتحت سہی کہ اس طرز عمل سے خود ان کی گرفتاری کے دن قریب تر آجائیں گے۔ قریب ہی کے ایک گاؤں (اٹ) میں مردوں اور عورتوں کی ایک جم غفیر کے سامنے جو ۸ اپریل کو وہاں اکٹھا ہو گیا تھا، گاندھی جی نے کہا کہ نمک نہ چھیننے پائے چاہے جان چلی جائے۔ مزید یہ کہ اگر ان کی مٹھی حقیقتاً ایک ستیہ گرہی کی مٹھی ہے جو خدائی قوت کی حامل ہوتی ہے تو اسے کوئی نہیں کھول سکتا، واقعہ یہ ہے کہ پولیس زیادہ تشدد اسی میں برتتی تھی کہ لوگوں کی مٹھیاں کھولے اور نمک لے لے۔ اخیر میں اُنھوں نے تمام لوگوں کو نصیحت کی کہ نمک اکٹھا کرو۔ اسے تقسیم کرو اور استعمال بھی کرو اور اس توقع کا اظہار کیا کہ سارے گجرات میں اسی کے مطابق عمل ہوگا۔

اب گویا مہاتما نے نمک ستیہ گرہ کی وہ شاہراہ جو اب تک پیچیدہ قسم کی پابندیوں سے گھری ہوئی تھی ہر کس و ناکس کے لیے کھول دی لیکن اس موقع پر بھی نہایت واضح طور پر ثابت ہو گیا کہ گاندھی جی اگرچہ بظاہر ایک اجتماعی تحریک کی رہبری کر رہے تھے مگر حقیقتاً عوام کی اس آگے بڑھتی ہوئی فوج کی عناں گیری مقصود تھی۔ مسٹر اَزکائل اپنی کتاب "سوراج یا سپر اندازی" میں لکھتے ہیں "اگرچہ زیادہ تیاری اور تنظیم نہ تھی، گاندھی جی نے سول نافرمانی روکنے کی تمام احتیاطی تدابیر بھی کرلی تھیں اور قوم کو شدید احکامات بھی نافذ کر دئے تھے کہ جب تک وہ (گاندھی جی) دیکھ نہ لیں کہ یہ صورت خود ان کے معاملے میں کن نتائج کی حامل ہوتی ہے اس وقت تک کوئی کارروائی عمل میں نہ لائی جائے۔ اس سب کے باوجود سارے ہندوستان میں یکبارگی قانون شکنی کا دور دورہ ہو گیا۔ ان لوگوں پر بھی جنھیں سیاسیات سے کبھی کوئی مس نہیں رہا تھا۔۔۔ دفتر کے کلرک، مختصر نویس، وکیل، ڈاکٹر، کسان، مزدور، مدرسوں کے بچے، عورتیں ۔۔۔ نمک بنانے کی دھن سوار ہو گئی۔ نہایت ولولہ انگیز اور المناک منظر تھا۔ ولولہ انگیز اس لیے کہ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ملوکیت دشمن انقلابی جذبات کتنے گہرے اور قوی ہیں ۔۔۔ المناک اس لئے کہ یہ ساری قوت اس روح فرسا طریقے پر نمک کے قانون جیسے حقیر اور مہمل مسئلہ پر ضائع ہو رہی ہے جس کے توڑنے سے کسی طبقاتی احساس کا اظہار نہیں ہو سکتا تھا نہ ملوکیت دشمنی میں اس کے کارآمد ثابت ہونے کے امکانات تھے۔"

رضاکاروں اور پولیس والوں کے درمیان تصادم ہونے لگا جو بعض اوقات بہت شدید ہو جاتا تھا۔ گرفتاریوں اور مہینہ دو مہینہ سے لے کر دو دو سال تک کی بلکہ اس سے بھی زیادہ میعاد کی سزاؤں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ مگر حیرت کا مقام ہے کہ اس سب کے کرتا دھرتا ۔۔۔ گاندھی جی ۔۔۔ سے حکومت نے ذرہ برابر تعرض نہ کیا۔ یہاں تک کہ حکومت نے یہ اعزاز بھی نہ بخشا کہ ان کو اس قسم کا کوئی حکم یا نوٹس دیتی جس سے ان کی نقل و حرکت یا آزادی تقریر پر کسی طرح کی پابندی عائد ہوتی۔ گاندھی جی بُری طرح حیران تھے۔ ان پر بے حد ندامت خفت طاری ہو گئی اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کریں۔ کدھر جائیں۔ اپنے پسندیدہ علاقے کے دیہاتوں میں جا کر سادہ دل عوام کو عدم تشدد (ترک مسکرات،

کھدر، اچھوت ادھار کے روحانی اور اخلاقی نصب العین کی تلقین کریں یا شہر بہ شہر طوفانی دورہ کرکے قوم کی سیاسی جدوجہد کی رفتار بڑھانے کی کوشش کریں۔ نمک ستیہ گرہ کے انوکھے مسلک پر ساری قوم کے مُنہ سے لبیک سننے کے شوق میں انھوں نے شروع ہی میں جلدی کرکے ساری قوم کو میدان جنگ میں طلب کرلیا تھا۔ مگر ان کے طبل جنگ کی آواز پر — بلکہ اس کے پہلے ہی — جوں ہی قوم نے فاتحانہ انداز سے آگے بڑھنا شروع کیا حسب معمول گاندھی جی پھر اپنے خیالی شکوک و تردّدات کی بھنور میں پھنس گئے۔ قوم نے ان کی آواز پر جس غیر متوقع جوش و خروش کے ساتھ لبیک کہا تھا اسے دیکھ کر گاندھی جی کے فخر و مسرت کی کوئی حد نہ تھی مگر یہ مسرت بہت ناپائدار اور بے حقیقت ثابت ہوئی کیونکہ ان کے تقدس مآب دوستوں اور مریدوں نے جو ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے ان کے ڈانواڈول دماغ میں ان تاریخی واقعات کی اصل حقیقت کے بارے میں بہت سے شکوک و تردّدات پیدا کردیے۔

کیا یہ لاکھوں رضاکار جو سمندر کی جانب مارچ کر رہے ہیں یا دوسرے مقامات پر خلاف قانون نمک بنا رہے ہیں، سب کے سب واقعی سر سے پاؤں تک ہاتھ سے کتے بُنے سوت کا کھدر پہنے ہوئے ہیں؟ کیا ان میں سے ہر ایک چھوت چھات کے پاپ سے بری ہو چکا ہے اور اچھوتوں اور بھنگیوں کے ساتھ برادریت قائم کرنے کے لیے تیار ہے؟ کیا یہ سارے کے سارے سورما اور ملک کی راہ میں جان دینے والے ترک منشیات و مسکرات کا عہد کر چکے ہیں اور ساری عمر ضبط و اعتدال کی زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہیں؟ سب سے بڑھ کر یہ کہ کیا یہ سب لوگ عدم تشدّد پر مقتضائے مصلحت کے طور پر نہیں بلکہ جزو ایمان سمجھ کر عقیدہ رکھتے ہیں اور پولیس کے حملوں کو — خواہ کتنے ہی سفاکانہ اور وحشیانہ ہوں — اس طرح برداشت کرتے ہیں کہ دل میں ذرّہ برابر نفرت و کبیدگی کے جذبات نہ پیدا ہوں؟ گاندھی جی کے نجی مخبروں نے اُنھیں بتایا کہ اکثر رضاکار جو نہایت خوشی سے اور ضبط و نظم کے ساتھ گرفتاری اور قید و بند برداشت کر لیتے ہیں مذکورہ بالا جرائم میں سے بعض کے یا سب کے مرتکب ہوتے ہیں اور آسانی سے اس کا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔ لہذا گاندھی جی نے نتیجہ یہ نکالا کہ اس تحریک کے سلسلے میں جو کچھ ہو رہا ہے اور جس کے تذکرے دنیا کے اخباروں میں سر ورق پر چھپتے ہیں، جس نے دیگر ممالک کے کروڑوں آدمیوں کی آنکھیں خیرہ کر دی ہیں، اس میں سب ٹھیک ہی ٹھیک نہیں ہے۔

پھر یہ کہ اُنھیں اس غیر مشروط آزادی کا لُطف اُٹھانے کے لیے کیوں چھوڑ دیا گیا ہے — جواب ہر لمحہ جیل کی زندگی سے بھی زیادہ گراں اور روح فرسا معلوم ہو رہا تھا — کہ وہ ہزارہا مردوں اور عورتوں، بچّوں اور بوڑھوں پر بیٹھے نکتہ چینی کیا کریں، اُن لوگوں پر جو پولیس کے روز افزوں مظالم کے باوجود روزانہ نمک بنانے کے لیے اپنے اپنے گھروں سے نکلتے ہیں، جو ہنسی خوشی پولیس کے ہاتھوں پٹتے ہیں، جو اپنے دشمنوں کے پنجہ سے تولہ دو تولہ نمک جیسی حقیر چیز بچانے کے لیے اپنی مٹھیوں کا دبایا جانا اور بازوؤں کا مروڑا جانا برداشت کرتے ہیں، جو عدالتوں میں متبسم چہروں اور مسرور دلوں کے ساتھ اپنے خلاف مقدمہ کی کارروائی دیکھتے ہیں اور اس کے بعد اسی طرح ہنسی خوشی جیل چلے جاتے ہیں۔ گاندھی جی کو ایسے ہیجان خیز اور اثر انگیز واقعات سے سابقہ پڑا۔ جن کی اس ملک کے دور جدید میں مشکل سے نظیر ملے گی۔ اس چیز نے اُنھیں بالکل حواس باختہ کر دیا۔ حکومت کی اس کارروائی پر کہ خود اُنھیں آزاد چھوڑ رکھا گیا ہے اور ان کے خاص مقربین و متبعین کو جیل میں بند کر دیا گیا ہے — گجرات میں دلبھ بھائی پٹیل کو، الہ آباد میں پنڈت جواہر لال نہرو کو، کلکتہ میں مسٹر جے۔ ام سین گپتا کو، بمبئی میں مسٹر نریمان کو — گاندھی جی سخت متحیر و مضطر تھے مگر کیا کرتے ناچار ڈانڈی کے اردگرد نیم مفلوج ہو کر پڑے رہتے رہے۔ پورے چار ہفتے تک — ڈانڈی پہنچنے (۶ر اپریل) کے دن سے ۵ر مئی تک، جب اُنھیں حکومت نے گرفتار کیا ہے — وہ شخص جس نے دُنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے خلاف ایک عام تحریک کا بگل بجایا تھا، تحریک کے چل پڑنے پر جس کی وہ بظاہر قیادت کر رہا تھا ایسا بدحواس ہوا کہ خود گزینی کے سوا اسے کوئی سبیل ہی نظر نہ آئی۔ البتہ ترک مسکرات اور اچھوت ادھار پر خوب تانا پائی کرتا رہا۔ بلکہ یہاں تک کیا کہ آس پاس کے دیہات والوں کی قوت عمل کو اور زیادہ بے سود راہوں پر لگا دیا یعنی یہ کہ تاڑ وغیرہ کے درخت سب کے سب کاٹ دیے

جائیں تاکہ آئندہ لوگوں کو تاڑی پینے کا امکان ہی نہ رہے۔ اب اسے ہم داخلی روحانیت کی معراج کہیں یا یہ سمجھیں کہ واقعات کی شدتِ رفتار سے ان کے سر پر ڈھول بج رہا تھا مگر وہ دیدہ و دانستہ آنکھوں پر پٹی باندھے بیٹھے رہے۔ یا یہ سمجھیں کہ انھوں نے تحریک کے اُٹھتے ہی اس کا سر کچل دیا تاکہ چُپ چاپ بیٹھ کر انتظار کریں اور جب مناسب موقع آجائے تو حکومت برطانیہ سے پھر گفت و شنید کی سلسلہ جنبانی شروع کریں؟

بہرحال اپنے بزرگ رہنما کی رجعت پسندانہ ہرزہ گردیوں سے بے نیاز ہوکر ملک کے جنگجو نوجوان اور مزدور جان پر کھیل کر جنگ کو آخر تک جاری رکھنے کے عزم سے نئی اصطلاحوں اور نئے اداروں کی تشکیل پر آمادہ ہوئے تاکہ حکومت کے خلاف پُرامن جنگ کی رفتار تیز کردیں۔ بمبئی اور کلکتہ ہی دو سب سے قوی الاثر مرکز تھے لہذا یہی اس معاملے میں آگے بھی رہے۔ مسٹر نریمان کی گرفتاری سے صوبائی کانگریس کمیٹی میں جو خلا پیدا ہوا تھا اس کو پُر کرنے کے لیے بمبئی یوتھ لیگ (انجمن نوجوانان بمبئی) آگے بڑھی تھی اور بیشک یہی جماعت تھی جس کے ولولہ آفریں قیادت میں ایک مختصر سی مجلس انتظامیہ مکمل آمرانہ اختیارات کے ساتھ مبئی وار کونسل کے آتشیں نام سے رونما ہوئی اب ستیہ گرہی والنٹیر کور کا نام مبئی نیشنل ملیشا (مبئی کی قومی رضاکار فوج) رکھ دیا گیا۔ انھیں ہیجان آفریں واقعات نے بنگال کے مزدوروں میں بھی ولولہ پیدا کردیا اور انھوں نے بھی ایک بنگال نیشنل ملیشا (بنگال کی قومی رضاکار فوج) بنالی۔ ہر طرف فوجی باجوں اور جنگی ترانوں کا زور ہونے لگا۔

ان نئی جنگی اصطلاحات نئے داؤں گھات اور نئے سورماؤں کی نشان دہی کی۔ مبئی کے کانگرسی کارکنوں کے نئے جوہر کی آزمائش کا موقع اس وقت آیا جب ریوالور سے مسلح تیس پولیس افسروں نے دو سو سپاہیوں سمیت ۱۱ر اپریل کو کانگرس ہاؤس پر چھاپہ مارا۔ وار کونسل نے دو جگہوں پر طاس نمک بنا رکھے تھے۔ ایک چبوترہ پر تھا، ایک صحن میں۔ پولیس نے پہلے چبوترہ والے طاس کو توڑا اس کے بعد جب صحن کی طرف بڑھے تو مسز پیرن کیپٹن (دادا بھائی نوروجی کی پوتی) اور چھ دیگر رضاکار خواتین (جن کا تعلق ابھی حال کی قائم کی ہوئی خواتین کی جنگی تحریکات سے تھا) ان کا راستہ روک کر کھڑی ہوگئیں۔ پچاس رضاکاروں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر طاس کے گرد دوہرا حلقہ بنالیا۔ رضاکاروں اور پولیس کے درمیان دیر تک کشتم کشتا ہوتی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد سپرنٹنڈنٹ پولیس نے رضاکاروں پر ہلّہ بول دینے کا حکم دے دیا۔ یہ لوگ سینہ سپر ہوکر کھڑے ہوگئے۔ اخیر میں پولیس نے رضاکاروں کی ٹانگیں پکڑ پکڑ کر گھسیٹنا شروع کردیا۔ تادیر مقاومت کرنے کے بعد جب ان میں سے بعض رضاکار گر پڑے تو پولیس والوں نے انھیں مارنا شروع کیا۔ اس ہاتھا پائی میں چار رضاکاروں کو سخت چوٹیں آئیں۔ اس کے بعد پولیس نے مسٹر مہر علی، مسٹر عابد علی اور مسٹر صادق کو گرفتار کرلیا۔ جب پولیس والے اپنے ان قیدیوں کو لے کر جانے لگے تو خواتین نے قومی ترانے گاتے ہوئے انھیں رخصت کیا۔

دوسرے ہی دن بنگال نے بھی اپنے جنگجویانہ جذبے کا ثبوت پیش کیا۔ بنگال نیشنل ملیشا نے حکومت کی طرف سے ضبط شدہ کتابوں کے اقتباسات سُنانے اور تقسیم کرنے کے لیے بڑا زبردست جلسہ کیا۔ کلکتہ پولیس نے جس میں بیشتر یورپین تھے، غیر مسلح پُرامن اور غیر متشدد مجمع پر بانس کے گرہ دار ڈنڈوں سے جو اس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد سارے ہندستان میں لاٹھی کے ایک عام نام سے مشہور ہوگئے —— حملہ کیا۔ کم و بیش چالیس طالب علم گرفتار کیے گئے۔

۱۳ر اپریل کو مبئی میں عدیم النظیر منظر دیکھنے میں آیا۔ مبئی وار کونسل نے فرمان جاری کیا کہ اس روز سارے شہر میں قانونِ نمک کے خلاف مظاہرہ کیا جائے۔ تقریباً ایک لاکھ آدمی شام کو چوپاٹی کے ساحل پر جمع تھے۔ "قانون نمک" کا ایک پتلا بنا کر اسے سمندر میں پھینکا جانے والا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ گویا حکومت کی نمک کی اجارہ داری نہیں رہ گئی۔ اس کے علاوہ جو قومی ہفتہ منایا جارہا تھا اس کو بھی لوگ اس پر ختم کرنے والے تھے۔

مدراس نے بھی اسی روز ٹرپلکین بیچ (ساحل) پر مسٹر پرکاشم کی قیادت میں نمک کا قانون توڑا۔ مسٹر پرکاشم گرفتار کرلیے

گئے مگر دو ہی گھنٹے کے بعد رہا بھی ہو گئے۔

اسی دن الہ آباد میں بھی معرکہ ہوا جو سب سے زبردست رہا۔ پنڈت جواہر لال نہرو گرفتار کر لیے گئے اور چھ مہینے کی سزا دی گئی اتنی ہی مدت کے لیے مسٹر سین گپتا بھی سازش اور بغاوت کے جرم میں گرفتار کر لیے گئے اور اتنی ہی سزا انھیں بھی ملی۔ ان دونوں لیڈروں کی گرفتاری پر سارے ہندوستان میں احتجاجاً ہڑتال منائی گئی۔

۲۴ر اپریل کو گرفتاریوں کی سب سے زیادہ بھرمار ہوئی۔

صدر کانگرس کی گرفتاری پر پونا میں ہڑتال ہوئی جس کی وجہ سے لوگوں میں جوش و خروش بے حد بڑھ گیا۔ پانچ سو افراد کے ایک مجمع نے بدیسی ٹوپیاں جلادیں اور ان کی جگہ گاندھی ٹوپی تقسیم کی۔ سہ پہر کے وقت پولیس کے صدر مقام کے باہر مظاہرے ہوئے۔ جب پولیس راستہ صاف کرنے کے لیے نکلی تو ہر طرف سے پتھر برسائے جانے لگے۔ پولیس نے مجمع پر ڈنڈے چلائے۔

اسی روز کلکتہ میں بھی اسی قسم کے واقعات ہوئے۔ بلکہ کلکتہ ایک قدم اور آگے بڑھا رہا۔ دو ٹرام گاڑیاں جلادی گئیں اور ایک گاڑی توڑ کر چکنا چور کر دی گئی۔ وجہ یہ تھی کہ پنڈت نہرو اور مسٹر سین گپتا کی گرفتاری پر ایک زبردست مجمع ہڑتال کراتا پھر رہا تھا۔ فائر بریگیڈ کے آدمی جب آگ بجھانے کے لیے آئے تو مجمع ان پر ٹوٹ پڑا۔ ایک یورپین سارجنٹ نے اپنے ایک رفیق افسر کی مدافعت کرتے ہوئے جسے بعض سکھوں نے زخمی کر دیا تھا گولی چلادی۔ شمالی حصے میں طالب علموں نے ٹرام گاڑیاں روک لیں اور تار کاٹ دیے۔ لاٹھی چارج ہوا۔ سارے شہر کا اچھا خاصا محاصرہ کر لیا گیا۔ فوجی دستے بالکل تیار ہو کر مسلح کاریں لیے کوچہ و بازار میں گشت کرتے نظر آنے لگے۔ تاہم سارا کاروبار اور اسکول کالج بند رہے۔

کراچی کو اس کے شہیدوں کے خون سے ۱۰ر اپریل ہی کو بپتسمہ دیا جا چکا تھا۔ ڈاکٹر چیت رام اور دیگر چھ لیڈروں کے خلاف مقدمہ کی جھوٹی کارروائی پر احتجاج کرتے ہوئے کم و بیش بیس ہزار کے مجمع نے برہم ہو کر کچہری میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ کچہری کی تقریباً تمام دریچیاں توڑ ڈالیں عدالت کے اندر اور باہر ساری فضا میں انقلابی نعرے گونج رہے تھے۔ حاکم عدالت کو مقدمہ ملتوی کرنا پڑا۔ مجمع منتشر کرنے کے لیے پولیس نے گولی چلائی۔

ملک میں ہر طرف یہ ہنگامے اور حکومت کی انتقامی کارروائیوں کو دیکھتے دیکھتے گاندھی جی کا جی پک اُٹھا۔ اور بالآخر زبان کھولنے پر مجبور ہوئے۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ ان کی مقدس مہم کی پاک دامانی پر سرکش عوام نے تشدد کا داغ لگا دیا ہے، کیا وہ ایک عاجلانہ پسپائی نہ شروع کر دیں گے؟ نہیں۔ اُنھوں نے تو ابتدا ہی میں اس کی قسم کھالی تھی، خواہ اسی وجہ سے سہی کہ اگر وہ ایسا کریں تو بھی ان کے متبعین کان نہیں دھریں گے۔ گاندھی جی نے ۱۷ر اپریل کو لکھا، "اگر عدم تشدد کو حکومت کے خلاف بھی صف آزما ہونا پڑے اور عوام کے تشدد کا بھی مقابلہ کرنا پڑے تو بھی اسے اپنا کام ہر حیثیت پر کرنا ہی ہو گا۔ اس سے کوئی مفر نہیں ہے۔" کلکتہ اور کراچی کے بلووں کے متعلق خاص طور پر حوالہ دیتے ہوئے گاندھی جی کو نہایت زوردار الفاظ میں یہ کہتے ہوئے کوئی تکلف نہ ہوا۔ وہ اس کے پہلے بھی یہی کہہ سکتے تھے لیکن انھوں نے نہیں کہا کہ "پبلک جلسے اور جلوسوں پر پابندی عائد کر کے اور با اثر لیڈروں کو گرفتار کر کے جن کے متعلق معلوم ہے کہ تشدد کے حامی نہیں ہیں، گورنمنٹ نے لوگوں کو خود مشتعل کیا ہے۔"

تو کیا اب اس وقت ان کا ایمان تازہ ہو گیا تھا؟ کیا اب ان کا ارادہ تھا کہ ملک کے طول و عرض میں یہ جنگ سنجیدگی کے ساتھ لڑی جائے؟ کیا ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۱ء کی طرح پھر وہ ملک بھر میں دورہ کر کے کلکتہ، لاہور، مدراس وغیرہ میں اپنے نائبین کے خیالات کو تقویت نہ دیں گے۔ ان کی ذہنی رہنمائی نہ کریں گے اور ان کے لیے راہ عمل نہ متعین کریں گے؟ آگے معلوم ہو گا۔

یہی زمانہ تھا ـــــ ابھی گاندھی جی گرفتار نہیں ہوئے تھے ـــــ جب بمبئی کے کانگرسی لیڈروں نے اُن سے پھر اپیل کی کہ ایک مرتبہ بمبئی ضرور آئیں خواہ چند ہی دنوں کے لیے ـــــ اس سے بہتر موقع کیا ہو سکتا تھا۔ گاندھی جی نے خود کہا تھا۔ "جو کچھ آج بمبئی میں ہو رہا ہے

کل دہی ہندوستان بھر میں ہوگا۔ لوگوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ گاندھی جی کی آزادی کے دن اب گنے چُنے رہ گئے ہیں۔ لہٰذا اس مہم کے دوران میں موقع تھا کہ وہ بمبئی جا کر نوجوانوں کو سرگرم عمل بناتے اور ان کی رہبری کرتے جنھوں نے ابتدائی چند ہفتوں ہی میں آگے بڑھ کر اس خلا کو پُر کیا تھا جو لیڈروں کی فوری گرفتاری سے پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ جس گاؤں میں گاندھی جی اپنی حماقت سے خود کو زندہ درگور کیے ہوئے تھے وہاں سے بمبئی کا فاصلہ ایک سو اور کچھ میلوں سے زیادہ نہ تھا۔ لیکن اس دعوت کا جواب انھوں نے جو کچھ دیا وہ نہ تو صاف طور پر ہاں، میں تھا نہ نہیں، میں۔ انھوں نے لکھا کہ میں آ کر خود تحریک کی قیادت کرنے پر تیار ہوں بشرطیکہ مجھ کو یقین ہو جائے کہ اس شہر میں ایک لاکھ چرخے چلنے لگے ہیں۔

اب ظاہر ہے کہ گاندھی جی اس کے تو مجاز نہ تھے کہ چت بھی میری پٹ بھی میری۔ اگر کھدر اور اچھوت وغیرہ کی ساری تفصیلی شرائط کے من و عن پورا ہوئے بغیر نمک ستیہ گرہ شروع کرنا صحیح نہ تھا تو اُنھیں ابتدا ہی میں اس کا اظہار کر دینا چاہیے تھا۔ اس کے برعکس انھوں نے یہ کیا کہ ایک عام دعوت دے دی کہ جو شخص قانون نمک کے ماتحت ماخوذ ہونے کا خطرہ مول لینے کو تیار ہو حسب مرضی جہاں مناسب سمجھے نمک بنا کر قانون شکنی شروع کر دے۔ ایسی صورت میں بمبئی والوں پر جو اس جنگ کو اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق برابر جاری کیے ہوئے تھے انھیں اعتراض کرنے کا کیا حق تھا۔ اگر بمبئی والے صحیح راستے پر چل رہے تھے تو گاندھی جی کو وہاں جا کر آئندہ کے لیے اُنھیں لائحۂ عمل مرتب کر کے دینا چاہیے تھا اور اگر کسی قسم کی غلطی کی تھی تو بھی جا کر اُنھیں صحیح راہ پر لگانا چاہیے تھا۔ لیکن دور سے بیٹھے بیٹھے بمبئی والوں کے ان شاندار کاموں پر وہ رویہ اختیار کرنا کہ سارے کارناموں پر خاک پڑ جائے اور اپنے پُرجوش نائبین کو عین موقع پر اپنے فیضان و مشورے سے محروم کر دینا انتہائی ڈھٹائی اور ابن الوقتی کی حرکت تھی۔

اصل صورت یہ تھی کہ اس تحریک کی روز افزوں قوت اور اس کا بڑھتا ہوا دائرۂ اثر دیکھ کر گاندھی جی کے اوسان خطا ہوئے جا رہے تھے اور وہ اپنے داخلی شکوک و مشکلات کی گہرائیوں میں ڈوبتے جا رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنی کامیابی پر ہنسیں یا تحریک کی ناکامی پر آنسو بہائیں۔ سیاسی اعتبار سے معاملات بہت عمدہ نہج پر چل رہے تھے۔ مگر ان کے ایجاد کردہ روحانی نقطۂ نظر سے البتہ یہ صورت نہ تھی۔ اور اس بنیادی اختلاف نے جس نے اُنھیں ۱۹۱۹ء کی ابتدا ہی سے ان کے روشن دماغ رفقائے کار، نیز عوام سے نمایاں طور پر علیحدہ کر رکھا تھا، جدوجہد کے اس نازک موقع پر اُنھیں تقریباً بالکل ہی بے حس کر دیا تھا۔ عوام کے جوش و خروش کا بڑھتا ہوا سیلاب ان تمام مصنوعی بند دکی توڑ کر جنھیں گاندھی جی نے باندھا تھا، سارے مُلک پر محیط ہوتا جا رہا تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ اس سیلاب کو پہلے سے سوچے سمجھے ہوئے محدود حلقوں تک روکے رہنا قطعاً ناممکن ہے۔ اس کا ردِ عمل جو کچھ گاندھی جی پر ہو سکتا تھا وہ ظاہر ہی تھا۔ مگر اب یہ تحریک اس منزل پر پہنچ گئی تھی جہاں نہ اُسے گاندھی جی کے اشیرباد کی پروا تھی نہ اب وہ ان کا اقتدار و تصرف برداشت کرنے پر آمادہ تھی۔ وہ جتنی ہی زیادہ بلند ہوتی تھی گاندھی جی اتنا ہی زیادہ اور اپنے تقدس مآب خیال آفرینیوں کے جنگل میں گھستے چلے جاتے تھے، اتنا ہی زیادہ زوروں سے اپنے فرسودہ اقوال کا اعادہ کرتے تھے اور نہایت درد انگیز پیرایہ میں خدا سے دُعا کرتے کہ برطانوی جیل کے ذریعے اس سیاسی اُلجھن سے نجات ملے۔

ستّرواں باب

مُجرمانہ ہرزہ کاریاں

گاندھی جی کو اب معلوم ہو چکا تھا کہ ان کی سیاسی آزادی کے دن تھوڑے رہ گئے ہیں۔ زمانہ سرعت سے گزر رہا تھا جیل کے سنگین

دروازے نزدیک تر نظر آنے لگے تھے۔ لہٰذا ہر شخص کو ان سے یہ امید ہونی چاہیے تھی کہ اس تھوڑی سی فرصت میں وہ ایک مرتبہ اور پوری کوشش کریں گے کہ قومی تحریک کو زیادہ جاندار اور انقلابی بنا دیا جائے۔

برخلاف اس کے میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ اُنھوں نے باوجود کچھ نہ کچھ وقت ہونے کے قومی تحریک کو بے حاصلی اور خودکشی کی راہ پر چلانے میں تمام قوت صرف کرکے ہمیشہ کے لیے اپنے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگالیا۔

مثلاً انھوں نے اپریل ۱۹۳۰ء کے شروع ہی میں ہندستان کی خواتین سے التجا کی تھی کہ وہ اپنے کو ترک منشیات اور بدیسی کپڑوں کے مقاطعہ کے کاموں تک محدود رکھیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں مقاطعہ کی تحریک کا نوجوان لڑکیوں نے جو ہندوستان کے خاص خاص شہروں میں مستحکم قسم کے سنگھ اور مجلسیں بنا کر منظم ہو چکی تھیں نہایت جوش و ولولہ کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ عورتوں کا جوش اس سیاسی جذبے کے ماتحت تھا کہ کسی طرح برطانوی حکومت کو نیست و نابود کردیں۔ لیکن گاندھی جی کو تحریک کے صرف اخلاقی اور اقتصادی پہلوؤں سے دلچسپی تھی۔ مگر جب چند ہفتوں کے تجربے سے سربرآوردہ جنگجو خواتین پر یہ ظاہر ہوا کہ نمایاں کامیابی حاصل کرنے کے لیے کسی ایک چیز پر خاص طور سے توجہ دینا ضروری ہے تو یہ حیرتناک صورت پیدا ہوئی کہ اُنھوں نے بمبئی کلکتہ اور دوسری جگہوں کی انگریزی کپڑے کی تجارت پر کھلے بندوں حملہ بولنے کا ارادہ کرلیا۔ حالانکہ مہاتما، مارے کاہلی کے صرف ضلع سورت کے ایک چھوٹے سے علاقے میں چند شراب کی دوکانوں سے پکٹنگ کی نگرانی فرما رہے تھے۔

اخباروں نے حسب ذیل سرخیاں چھاپ کر غیر ارادی طور پر اس فرق کو بہت زیادہ نمایاں کردیا (۷ اپریل):۔ ہر مقام پر ولایتی اور خصوصاً انگریزی کپڑے سگریٹ اور منشیات پر زبردست پکٹنگ کی گئی۔ بمبئی میں دو سو والنٹیروں نے جھوگدے لیے، اُنھیں انگریزی لباس، ہیٹ وغیرہ پہنایا اور ان کو تین گروہوں میں تقسیم کرکے لوگوں سے انگریزی لباس ترک کرنے کی درخواست کرتے ہوئے خاص خاص سڑکوں کا چکر لگایا۔ دہلی کے موٹر تاجروں نے انگریزی کارخانوں کی بنی ہوئی ربڑ کی چیزیں اور پرزوں کا بائیکاٹ کردیا۔ بمبئی کے سوتی کپڑے کے تاجروں نے تہیہ کرلیا کہ ایک سال کے لیے ولایتی کپڑے کا مطالبہ نہ کریں گے۔ سابرمتی آشرم کی رضاکار خواتین نے گاندھی جی کی قیادت میں جلال پور کی شراب کی دوکانوں پر پکٹنگ شروع کردی۔

لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ جس وقت عام مقاطعہ کی تحریک ناقابل انسداد جوش کے ساتھ سیاسی شاہراہوں پر چلائی جارہی تھی اور انگریزی اشیائے تجارت کا روزافزوں تعداد میں مقاطعہ کیا جارہا تھا، اس وقت گاندھی جی جو ولایتی اور ہندستانی منشیات کے مقاطعہ تک ہی اپنی تحریک کو محدود نہیں رکھنا چاہتے تھے ایک عجیب طرز عمل پر غور کرنے لگے جس سے وہ اپنے علاقے کے دیہات کے باشندوں کی شراب پینے کی عادت کو ہمیشہ کے لیے چھڑا سکتے۔ چنانچہ اپنے اس خود عائد کردہ تعطل کے زمانے میں اُنھوں نے ندرت طرازی سے کام لے کر دیہاتیوں پر زور دیا کہ وہ تاڑی کے بیش قیمت جنگلوں کو کاٹ ڈالیں تاکہ اُنھیں تاڑی ملی ہی نہ سکے جو اس علاقے کے لوگوں کیلئے کئی پشتوں سے خاص منشیات میں سے تھی۔ گاندھی جی کچھ عرصے تک تو ضرور اپنی ان مجرمانہ تدابیر میں کامیاب رہے۔ اتفاق سے ایک جوشیلا لڑکا تاڑی کے پیڑ کاٹنے میں مارا گیا۔ گاندھی جی نے لڑکے کی موت کو شہادت کا درجہ دے کر بہت اُچھالا۔ تاڑی کے درختوں کے کاٹنے کا مراق عرصے تک اس علاقے میں پھیلا رہا۔ بہت سے باغوں اور کارخانہ جات کاشت کے مالکوں نے نہایت مخلصانہ طور پر وعدہ کیا کہ وہ اپنے علاقے کے تمام تاڑ کے درخت کٹوا دیں گے پھر بھی لوگوں کی بڑی اکثریت نے اپنی عقل نہیں گنوائی تھی اور انھوں نے مہاتما کا اس سب سے زیادہ احمقانہ اور آپ اپنے پاؤں پر کلھاڑی مارنے والے مسلک پر عمل کرنے سے انکار کردیا۔ اور مہاتما کے بہت سے جوشیلے نئے ایمان لانے والوں تک کو بیحد مایوسی ہوئی کیونکہ انھوں نے دیکھا کہ ان تمام بے شمار تاڑ کے پیڑوں کا کاٹنا جنھیں وہ بجا طور پر ایک بے بہا وراثت سمجھتے تھے قطعاً ناممکن ہے دکیونکہ محض کاٹ دینے سے درخت کے از سرنو اُگ آنے کی گنجائش تو باقی رہتی ہی ہے۔

گاندھی جی اپنی لاحاصل کوششوں میں وقت ضائع کر ہی رہے تھے کہ یکایک کسی چیز نے انھیں بجلی کے کڑکے کی طرح چونکا دیا۔ اندازہ کیجیے کہ انقلابی تشدد کی اس بدحواس کر دینے والی آگ دیکھ کر جس کو وہ فرو کرنے پر تُلے ہوئے، خواہ مخواہ کی نقلی سورمائی دکھا رہے تھے، گاندھی جی کو کتنا صدمہ پہنچا ہوگا۔ چاٹگام کے اسلحہ خانہ پر ۱۷ را اور ۱۸ ر اپریل کو حملہ ہونا ایک ایسا واقعہ تھا جس کو دکیل سرکار تک نے موجودہ زمانے میں ہندوستانی انقلابی پارٹی کا سب سے زیادہ تعجب انگیز اور نتیجہ خیز کام قرار دیا ہے۔ "فری پریس" کے چاٹگام کے نامہ نگار نے ۱۸ ر اپریل کی شب کے حملے کے واقعات کا حسب ذیل خلاصہ شائع کیا :-

"گزشتہ شب ایک زبردست گروہ نے جس کے متعلق خیال ہے کہ نوجوانوں کا ہے بیک وقت کئی حملے کئے جس کی وجہ سے تمام شہر پر دہشت طاری ہوگئی۔ حملہ آوروں نے ٹیلیفون کا سلسلہ منقطع کر دیا، کلکتہ اور ڈھاکہ کے درمیان ٹیلیگراف کے تار کاٹ دیے اور دھوم، اور جیراج گنج کی ریلوے لائنیں اُکھاڑ دیں جس کی وجہ سے ایک مال گاڑی لائن سے اُتر گئی اور سارا راستہ مسدود ہوگیا، دوسرے گروہ نے آسام بنگال ریلوے ہیڈ کوارٹر کے افسر انچارج پر حملہ کر کے فوراً گولی ماردی اور بندوق کے کندوں سے اس کا سر بُھرتہ کر دیا۔ اس کے بعد اس گروہ نے کمروں میں آگ لگادی اور خیال کیا جاتا ہے کہ رائفلیں اور کارتوس اُٹھا لیے گئے۔ ایک دوسرے گروہ نے پولیس رزرو کے سنتریوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ چند بندوقیں اور کچھ کارتوس لوٹ لیے گئے اور اسلحہ خانہ کو آگ لگا کر برباد کر دیا گیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اُنھوں نے بہت سی بندوقوں کو لوہے کے ہتوڑے سے چور چور کر ڈالا۔ اطلاع پانے پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ فوراً موقع واردات کی طرف روانہ ہوئے مگر راستے ہی میں ان کی کار پر حملہ بول دیا گیا..... کئی زخمی ہسپتال میں پڑے ہوئے ہیں..... دوسری صبح مشین گنوں کی لگاتار آوازیں سُنائی دیں...... حملہ آور بچ کر بھاگ نکلے اور اب تک لاپتہ ہیں۔ متعدد اشخاص گرفتار کر لیے گئے ہیں جن میں سے ایک کا چہرہ جلا ہوا ہے اور بہت سی چوٹیں ہیں۔"

چنانچہ ۱۹ ر اپریل کو بنگال آرڈی ننس نافذ کر دیا گیا۔ پے در پے خانہ تلاشیاں اور گرفتاریاں ہونے لگیں۔ کبھی کبھی بلوائیوں اور پولیس کے درمیان جھڑپ ہو جاتی تھی۔

چنانچہ اس وقت اس انقلابی تحریک اور گاندھی جی کی سول نافرمانی کی ارتقا کے مابین مقابلے کی سی صورت ہوگئی —— ایسی کہ گاندھی جی کی ساری سیاسی زندگی میں کبھی نہ ہوئی تھی۔ ۲۹ ر اپریل کو کراچی کے مرد اور عورتیں ہزاروں کی تعداد میں جزیرہ باتھ کی طرف سول نافرمانی کے لیے روانہ ہوئے گو کہ گاندھی جی ہمیشہ اس اقدام کو چند منتخب رضاکاروں پر محدود رکھا کرتے تھے جو خاص طور سے عدم تشدد پر عقیدہ رکھنے اور عادتاً کھدر پہننے کے باعث اس کے اہل سمجھے جاتے تھے۔ دس ہزار من نمک نہایت فاتحانہ طور سے کراچی لایا گیا اور بہت جوش کے ساتھ پولیس کی دہشت کے باوجود سڑکوں پر فروخت کیا گیا۔ عام سول نافرمانی کے اس نئے حربے کو جو کراچی میں بڑی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا چکا تھا، دوسرے شہروں کے جنگجو لیڈروں اور عوام نے جلد ہی اختیار کر لیا۔ نمک کے قدرتی مخزنوں اور سرکاری نمک کے گوداموں پر عوام کا حملہ اس نئی تحریک کی سب سے زیادہ محاربانہ خصوصیت تھی۔ اب کی بار پھر گاندھی جی کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ اس نئے طرز عمل کی داد دیں یا تنقیص کریں۔ نہ خواہش تو ان کی یہی تھی کہ تحریک کو کسی طرح دبا دیں مگر ملک کے اس جوش و خروش کے مقابلے میں اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے میں انھیں اپنی قطعی لاچاری کا احساس ہوا۔ چنانچہ اتنی مدت گزرنے کے بعد بھی یہ حالت تھی کہ ۲۳ ر اپریل کو ہم انھیں شیخ چلی کی طرح اپنے پسندیدہ ٹٹو "ترکِ منشیات" پر سوار ہو کر ادولی کے لوگوں سے اپنے باغوں کے تمام تاڑ کے درختوں کو گرا دینے کی درخواست کرتے ہوئے پاتے ہیں۔

لیکن برخلاف اس کے گورنمنٹ شُترمرغ کی طرح اپنے سر کو ریت میں زیادہ عرصہ تک دبائے پڑی نہیں رہ سکتی تھی۔ کلکتہ اور کراچی کے واقعات نے ان مقامات کو گورنمنٹ کے مطلب کا نہ رکھا تھا اس لئے اس نے شمالی ہند کو حسب معمول لوگوں پر ہیبت طاری کرنے کے لئے منتخب کیا۔

۲۳ اپریل کو صبح تڑکے چند سیاسی لیڈروں کو گرفتار کرکے پشاور کے بازاروں میں سے لیجایا گیا اور تھانے میں بخیر وخوبی پہنچا دیا گیا۔ ان گرفتاریوں نے شہر کے لوگوں کو یقیناً جوش دلایا اور وہ کثیر تعداد میں امن پسند جلوس کے ساتھ شہر میں گشت لگانے لگے۔ شورش کے پورے طور سے دبا دینے کی خواہش سے گورنمنٹ نے مسلح کاریں طلب کیں جنھوں نے بے دردانہ طور سے بازاروں میں سے گزرتے وقت بہت سے آدمیوں کو پیس ڈالا قدرتی طور سے لوگوں کا جوش اور بڑھا اور مظاہرے اور زیادہ ہونے لگے فوراً ہی بغیر کسی خاص وجہ کے فوجوں کو بُلا لیا گیا اور امن پسند مظاہرہ کرنے والے مولی گاجر کی طرح کاٹ کر رکھ دیے گئے۔ شام ہوتے ہوتے لوگوں کے غم وغصّے کے مظاہروں کو دبانے کے لیے مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔

دو دن بعد مسٹر وی جے پٹیل نے آزادی کی تحریک میں ملک والوں کے دوش بدوش کام کرنے کا موقع حاصل کرنے کے لیے لیجسلیٹو اسمبلی کی صدارت اور ممبری سے استعفیٰ دے دیا اور اگرچہ حال ہی میں پشاور میں ملٹری نے جو کچھ دہشت انگیزی کی تھی اس کا مسٹر پٹیل نے اپنے استعفے کے خط میں کوئی صاف تذکرہ نہیں کیا تھا اس میں کوئی شک نہیں کہ اس موضوع پر کوئی فیصلہ کرنے میں جو ان کے دماغ میں سوراج پارٹی کے ممبروں کے مستعفی ہونے کے زمانہ سے ہیجان پیدا کیے ہوئے تھا اس واقعہ کا بہت بڑا حصہ تھا۔

اپنی دُشواریوں اور مشکلات کو جو چھوٹے عہدہ داروں کے ایک گروہ کی شرارت اور کانگرس کے کونسل کے بائیکاٹ کی وجہ ان کی راہ میں پیدا ہو گئی تھی تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کے بعد مسٹر پٹیل نے مندرجہ ذیل الفاظ میں سیاسی جدوجہد میں اپنی پوزیشن کا تذکرہ کیا۔

"میرے ہم وطن اس وقت سر دھڑ کی بازی لگا کر آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں پُر امن ترک موالات اور سول نافرمانی کی تحریک جو انڈین نیشنل کانگرس نے شروع کی زوروں پر ہے۔ میرے سیکڑوں ممتاز ہم وطنوں کو ملک معظم کی جیلوں میں جگہ ملی ہے۔ ہزاروں آدمی اگر ضرورت ہو تو سر کٹانے کے لیے تیار ہیں۔ اور لاکھوں اس اہم تحریک کو پروان چڑھانے کے لیے جیل جانے پر کمربستہ ہیں۔ ملک کی جنگ آزادی کی ایسی منزل پر میری صحیح جگہ میرے ہم وطنوں کے ساتھ ہے جن کے ساتھ دوش بدوش کام کرنے کا میں نے تہیّہ کر لیا ہے نہ کہ اسمبلی کی کرسی صدارت میں۔"

مسٹر پٹیل نے پورے ملک کا ایک فاتحانہ دورہ شروع کر دیا اور فوراً ہی کانگرس نے انھیں پشاور کے مظالم کی تحقیقات پر مامور کر دیا۔

اسی اثنار میں حکام کی دہشت انگیزیوں اور عوام کی جانب سے شدید مقاومت دیکھ کر گاندھی جی مجبور ہو گئے کہ کوئی دلیرانہ اقدام کی تجویز پیش کریں جس سے صاف ظاہر تھا کہ گورنمنٹ کی مسلح فوجوں اور عوام کے غیر مسلح مجمعوں کے درمیان مقابلہ ہو جائے گا۔ ۲۶ اپریل کو گاندھی جی نے بلسر تعلقہ کے ایک جلسہ میں دھرسنا کے سرکاری نمک کے گودام پر جلد ہی حملہ بولنے کے ارادے کا اظہار کیا۔ "انھوں نے حاضرین جلسہ کو دعوت دی کہ وہ کھدّر پہن کر اور شراب نوشی کی عادت ترک کرنے کے بعد ان کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ مزید برآں انھوں نے دھمکی دی کہ اگر انھوں نے ان کو پورا کیے بغیر ان کا ساتھ دیا تو وہ ان کے خلاف ستیہ گرہ شروع کر دیں گے"

تمام ملک نے ان کی اس نئی تجویز کو گاندھی جی کے انقلابی جذبے کی سب سے زیادہ مجاہدانہ پیداوار خیال کرکے بہت تحسین و آفرین کی۔ حقیقت میں گاندھی جی نے پھر ایک آخری کوشش کی کہ عام بغاوت کو جس کے آثار ہر طرف نظر آ رہے تھے تنگ اور محفوظ حدود میں مقید کر دیں۔

چاٹ گام سے وہ یقیناً غافل نہیں تھے۔ اپنے الٹیمیٹم والے خط میں جو اُنھوں نے چند ماہ قبل گورنمنٹ کو دیا تھا انھوں نے اس مصمم ارادہ کا اظہار کیا تھا کہ وہ عوام کے تشدّد سے ضرور جنگ کریں گے۔ انھیں یہ دیکھ کر بہت طیش آیا کہ بنگال کے انقلابی نوجوانوں نے ان تمام خیالی بہشتوں کے نقشوں کو جو سریع گاندھی جی کے قلم کا نتیجہ تھے ٹھکرا دیا تھا اور اپنے طریقے پر جنگ کرنے کا عزم بالجزم کر رکھا تھا۔ گاندھی جی نے نہایت ہوشیاری سے سوچا کہ یہ لوگ یا دوسرے صوبے کے لوگ مزید محاربانہ اصطلاحات اور نئے

جنگی نعروں کے ذریعہ دام میں لائے جا سکتے ہیں۔ جو لوگ سرکاری اسلحہ خانوں پر ایسا بے باکانہ طریقہ پر حملہ کرکے اپنی جان کا خطرہ لینے پر تیار رہتے ہیں وہ سرکاری نمک کے گوداموں پر حملہ کرنے کے لیے جس میں صریحی طور پر زیادہ تحسین و آفرین اور کم خطرے کی گنجائش ہے آمادہ کیے جا سکتے ہیں پھر خواہ وہ انھیں پسند کریں یا نہ کریں، یہ حملے بڑے شہروں مثلاً کراچی اور بمبئی میں نمک کی ستیہ گرہ کی تحریک کے ضمنی نتیجہ کے طور پر سامنے آئے تھے۔ حقیقت میں ہزاروں نے نمک کے گوداموں پر بغیر گاندھی جی کے حکم کا انتظار کیے ہوئے دھاوا بول دیا تھا اور نہایت فاتحانہ انداز میں ہزاروں من نمک لوٹ لے گئے تھے۔ خود اپنے کو اپنی ہی تحریک سے پیچھے رہتا دیکھ کر پوری تحریک کا سالار اعظم اپنے کو شرمندہ اور سرنگوں محسوس کرنے لگا۔ ان کے لیے اب اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ قبل اس کے کہ وہ ان کے ہاتھ سے نکل جائے کم از کم اس کا آخری حصہ اپنے ہاتھ میں رکھیں۔

لیکن اگر انھوں نے اپنے کو تاڑ کاٹنے اور شراب کی دکانوں پر پکٹنگ کرنے کے بے سود خوابوں سے جگا کر نمک کی جاگتی تحریک سے جو سارے ملک میں پھیلی ہوئی تھی منسلک کر لیا تھا تو وہ اس مصمم ارادہ سے کہ تحریک کی آئندہ زندگی پر سخت اور غیر ممکن قیود عائد کریں گے، کسی صورت میں کلکتہ اور بمبئی کی طرح ہر کس و ناکس کو نمک کے گوداموں پر حملہ کرنے کی اجازت نہیں دیں گے، ایسی غیر امتیازی سول نافرمانی نہیں ہونے دیں گے، اس مقدس جنگ میں شرکت کرنے والے ہر رضاکار کی ذاتی قابلیت کا بہت احتیاط سے توازن کرکے تحریک کو انفرادی سول نافرمانی کی حدود میں مقید کر دیں گے حملہ آوروں کے لیے یہ کافی نہیں تھا کہ وہ بغیر مزاحمت یا انتقام کے پولیس کی لاٹھیوں بلکہ فوجیوں کی سنگینوں کے آگے بھی سینہ سپر رہیں بلکہ جو چیز ان کے لیے زیادہ ضروری تھی وہ یہ تھی کہ کھدر پوش ہوں اور منشیات سے اجتناب کریں۔

چنانچہ آپ پھر دیکھیں گے کہ گاندھی جی کس طرح اپنے تقدس مآب اور اخلاقی قیود، ایک ایسی تحریک پر عائد کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو لازماً ایک سیاسی تحریک تھی اور جس نے ہر جگہ ایک ہمہ گیر جوش پیدا کر دیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں ان کی بیجا خیال آرائی نے ایک اور مثال پیش کر دی ہے کہ ان کی خود پسند روحانی داخلیت اور کثیر التعداد عوام کے عمل اور سیاسی نظریہ کے درمیان کتنا تضاد ہے۔

آخر کار گاندھی جی نے سرکاری نمک کے کارخانے پر مجوزہ حملے کا اعلان کرکے اپنی قید کے دن نزدیک تر کر لینے کا ارادہ کر لیا۔ ان کے حساس دل کو ہر روز یہ دیکھ کر بہت صدمہ پہنچتا تھا کہ اس وقت جب کہ انھیں ضلع کے اندرونی حصے میں ہر چیز کرنے دیا جاتا تھا۔ ان کے عام رضاکاروں کو بے رحمی کے ساتھ طرح طرح کی تکلیفیں دی جاتی تھیں پیٹا جاتا تھا۔ زخمی کیا جاتا تھا اور مار بھی ڈالا جاتا تھا۔ بہرحال اب ان کے لیے خاص موقع آ گیا تھا، اُنھوں نے سوچا، کہ حضرت عیسیٰ کی طرح وہ بھی کانٹوں کا تاج پہنیں۔ اُنھوں نے نمک کے کارخانے پر حملہ کرنے کی اسکیم کی اشاعت کرکے حکام کو جو اب تک پس و پیش میں تھے اپنی گرفتاری کے لیے مجبور کر دینے کا ارادہ کر لیا اور ان کی مراد جلد ہی بر آئی۔

۲۷ اپریل کو مدراس میں پولیس نے بڑے بڑے مجمعوں پر لاٹھی چارج کیا، اور پھر گولی چلائی۔ تین آدمی جان سے مارے گئے دس آدمیوں کو جو گولی کی وجہ سے زخمی ہوئے تھے اسپتال لے جایا گیا۔ لاٹھی چارج سے بہت سے آدمیوں کو چوٹیں آئیں اور بہتیرے سنگینوں سے زخمی ہوئے۔ اس دن وائسرائے نے پریس آرڈی ننس جاری کیا تاکہ پریس پر بہتر طریقے سے قابو رکھا جا سکے غالباً اس کے بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ پریس کی زبان بندی کرنے کے لیے فوراً اس آرڈی ننس پر ہر ممکن سختی کے ساتھ عمل درآمد شروع ہو گیا۔

اپریل کے آخری ایام میں کاکا کلیکر اور مسٹر سی راجگوپال اچاریہ کو جو گاندھی جی کے مسلک کے پکے مبلغ تھے سزائے قید ملی۔ گورنمنٹ نے آخر کار گاندھی جی کو ۴ مئی کو گرفتار کر لیا۔ ان کو آدھی رات کے بعد کرادی کیمپ سے ضابطہ ۲۵ ۱۹۲۷ء کے ماتحت گرفتار کرکے پونا جیل لے جایا گیا جہاں سے ایک بار پھر وہ یراودہ جیل میں پہنچا دیے گئے۔

آگے کے واقعات کا جن کا آئندہ باب میں تذکرہ کرنا بہتر ہے مطالعہ کرنے سے قبل مختصر طور پر گاندھی جی کے سیاسی منشور کی سب سے لغو مد کا تذکرہ کرنا ہے جسے اُنھوں نے وائسرائے کے نام کے دوسرے خط کی شکل میں پیش کیا اور جو دوسرے سال کے آغاز یعنی ان

کے جیل سے رہا ہوئے تک ان کے خیالات کا آخری اور اصل ریکارڈ رہا تھا۔

اُنھوں نے خط کو اپنے اس ارادے کے اعلان سے شروع کیا کہ وہ "دھرسنہ کی طرف اپنے ساتھیوں کے ساتھ روانہ ہوں گے اور وہاں پہنچ کر نمک کے کارخانے پر قابض ہونا چاہیں گے۔" اس کے بعد گورنمنٹ کے مظالم کا تذکرہ کیا جو انتہائی درندگانہ طور پر عوام پر کیے گئے تھے۔ "کراچی، پشاور اور مدراس میں خواہ مخواہ اور بغیر کسی اشتعال کے گولی چلائی گئی۔" گاندھی جی نے ایسے الفاظ میں جن سے انتہائی غم و غصّہ کا اظہار ہوتا تھا نمک کے محصول کے دائرۂ اثر اور قومی قرضے کے متعلق سرکاری پروپاگنڈے، "نقاب پوش مارشل لا"، اور حکومت کے عائد کیے ہوئے پریس آرڈی ننس کی سخت مذمت کی۔

نمک کے کارخانے پر اپنے حملے کی اسکیم کو واضح کرتے ہوئے گاندھی جی نے فرمایا "قبل اس کے کہ یہ عہد خونریزی جو ابھی شروع ہی ہوا ہے ملک بھر میں پھیل جائے میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ مجھے ایک دلیرانہ اقدام کرنا چاہیے اور اگر ہو سکے تو آپ کی قہرمانیوں کو زیادہ واضح اور زیادہ شدید الاثر راستہ پر لگا دوں .... میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ میری بزدلی ہوتی اگر میں آپ کو اس کا موقع نہ دوں کہ آپ پورے طور سے اپنے اختیارات استعمال کریں تاکہ وہ لوگ جو طرح طرح کے مصائب اور مالی نقصانات برداشت کر رہے ہیں یہ نہ خیال کرنے لگیں کہ میں نے ہی اُنھیں اس عملی اقدام پر اُبھارا جس کی بدولت حکومت اپنے اصلی رنگ میں ظاہر ہو گئی ہے اور میں نے خود ہی ستیہ گرہ پروگرام کو اتنا مکمل طریقے پر چلانے میں جتنا موجودہ حالات میں ہو سکتا تھا کسی قسم کی کوتاہی کی ہے۔"

اس طرح گاندھی جی نے اعتراف کیا کہ وہ کیونکر زبردستی اس اہم پیشقدمی پر مجبور ہوئے ہیں تاکہ حکومت کے اس غیظ و غضب کا جوان کے خاص متبعین پیہم اذیت و موت کی بارش کر رہا تھا خود بھی کسی نہ کسی حد تک ہدف بنیں۔

اُنھوں نے اس کا بھی اعتراف کیا کہ ان کے نمک کے سرکاری گوداموں پر مجوزہ حملے کا مقصد یہ بھی ہے کہ عوام کی متشددانہ قوتوں کو روکیں جو بعض علاقوں میں کہیں کہیں اُبل پڑی ہیں "اس طریق کار میں جو کچھ خطرات ہیں میں اُن سے واقف ہوں۔ ملک میرے مدعا کو سمجھنے میں غلطی نہ کرے۔ میں یہ کہتا ہوں بلکہ اعادہ کرتا ہوں کہ تشدد پر فتح پانے کا واحد ذریعہ خالص قسم کا عدم تشدد ہی ہے ...... اگر ان تنبیہوں کے باوجود بھی لوگ تشدد پر اُتر آتے ہیں تو میری تمام ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے سوائے اس ذمہ داری کے جو ایک انسان پر دوسرے انسانوں کے متعلق ہوتی ہے۔ مگر ذمہ داری کا سوال تو الگ رہا۔ اگر بڑے بڑے رشیوں کے قول کے مطابق، عدم تشدد میں بھی کچھ قوت ہے تو خواہ میرے یہ وسیع تجربات مجھے کسی طرف کیوں نہ لے جاتے، پھر بھی میں اس اقدام کو ملتوی کرنے کی جرائت نہیں کر سکتا تھا۔"

زرا ان الفاظ پر غور کیجیے "میں اس اقدام کو ملتوی کر دینے کی جرارت نہیں کر سکتا۔" لہٰذا پھر خود گاندھی جی کی تحریر سے ثبوت ملتا ہے کہ یہ تدبیر بجائے اس کے کہ ان کے آزاد سیاسی صوابدید کا نتیجہ ہو، دراصل اس خوف کی پیداوار تھی کہ جیسے کچھ تشدد آمیز ہنگامے پچھلے چند ہفتوں میں ہوئے ہیں اُس سے زیادہ اب رونما نہ ہوں۔ اس موقع پر یاد رکھنا چاہیے کہ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کے ہر دو الٹیمٹم کی زبان قریب قریب ایک ہی ہے —— وجہ ظاہر ہے۔ اس صورت سے گویا اُنھیں جس چیز نے اس عاجلانہ اقدام پر مجبور کیا تھا وہ محض اس کا خوف تھا کہ اس تحریک پر سے —— جس کے وہ اب بھی نام نہاد قائد بنے ہوئے تھے —— سارا اقتدار ہی ہاتھ سے نہ جاتا رہے۔

آخر اس اندھادھند غصہ میں وہ جا کدھر رہے تھے؟ اس پسندیدہ حملے سے وہ کس قیمت پر باز رکھے جا سکتے تھے؟

گاندھی جی نے خط کے آخری حصّہ میں لکھا تھا۔ "میں اس سلسلہ میں کسی مزید اقدام کا چنداں خواہاں نہیں ہوں۔ لہٰذا میں آپ سے گزارش کروں گا کہ اس محصول (نمک) کو منسوخ کر دیجیے جس کی بُرائی خود آپ کے بڑے بڑے نامور ہم وطنوں نے کی ہے اور جسے آپ نے دیکھا ہی ہے کہ ایک ایسے عام احتجاج اور برافروختگی کا باعث ہوا ہے۔ جس نے سول نافرمانی کی صورت اختیار کر لی ہے

کیا یہ حیرتناک نہیں ہے کہ گاندھی جی اپنی اغراض کے لیے غیر جارحانہ بغاوت کا اپنا پیدائشی حق بھی بیچ دینے پر آمادہ تھے! کیا ابھی دو ہی مہینے پہلے اُنھوں نے ہندوستان کی آزادی و مختاری کے مقدس ناموں پر اپنے عدیم النظیر حربے — ستیہ گرہ — کی دہائی نہیں شروع کی تھی۔ اور کیا وہ ان بلندیوں سے حسب معمول اُترتے ہوئے مشہور گیارہ نکات سے جو قومی زندگی کے بہت سے پہلوؤں سے متعلق تھے برابر چمٹے نہیں رہے! گاندھی جی بھی خوب جانتے تھے کہ حرکیات سیاسی کے قوانین خود اُنھیں مجوزہ قسم کی پیشقدمی پر مجبور کردیں گے اگر وہ آزادی کے واقعی خواہاں ہوں گے اور قبل از وقت عاجلانہ پسپائی کا ارادہ نہ رکھتے ہوں گے۔ جو کچھ ان دو مہینوں میں ہوا وہ ایک طرف عوام کی جنگجوئی اور دوسری جانب حکومت کی طرف سے مستبدانہ انسداد کا بے نظیر مظاہرہ تھا۔ اس موقع پر کوئی بھی لیڈر ہوتا اُسے سیاست کے سادہ قوانین اس پر آمادہ کردیتے کہ اپنے مطالبات کو بیش از بیش بڑھاتا جائے۔ مگر اس کے برعکس گاندھی جی رفتہ رفتہ اپنے مطالبات کو برابر گھٹاتے رہے یہاں تک کہ وہ صفر کے برابر رہ گئے اور اس کے بعد اس پر اُتر آئے کہ وائسرائے صاحب فرط کرم سے گیارہ میں سے صرف ایک مطالبہ منظور فرمالیں تو یہ اپنی فوجوں کو "جیش باش" کہہ دیں گے۔

اگرچہ سیاسی محاربت کے معیار سے یہ چالیں انتہائی ذلیل اور نفرت انگیز نظر آئیں گی لیکن حیرت یہ ہے کہ یہ چالیں عین اُسی نقشہ کے مطابق تھیں جس کا مظاہرہ گاندھی جی نے ۱۹۲۰-۲۱-۲۲ء میں کیا تھا۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ پُرامن ترک موالات کی تحریک کے سامنے تین مقاصد تھے — پنجاب کے مظالم کی تلافی، خلافت کے معاملے میں جو زیادتیاں ہوئی ہیں اُن کا ازالہ، اور ہندوستان کے لیے خود مختاری کا حصول — غالباً گاندھی جی کو انگریزی، گجراتی، ہندی کے جتنے الفاظ معلوم تھے اُنھوں نے سب کے سب انھیں تین مہتم بالشان مسائل کی زبردست تبلیغ و اشاعت میں استعمال کر ڈالے۔ مگر ۱۹۲۱ء میں لارڈ ریڈنگ کی حکومت نے ۱۹۳۰ء کی طرح کی شدید الاثر کارروائیاں عمل میں لانے میں قدرے سُستی سے کام لیا تھا۔ لہٰذا گاندھی جی کی لسانی بغیر مزاحمت و تبدیلی کے ۱۹۲۱ء تک برابر جاری رہی۔ مگر جیسے ہی حکومت نے ڈنڈا اُٹھایا اور لیڈروں اور وکیلوں، خواتین اور رضاکاروں کو ہزاروں کی تعداد میں جیل روانہ کرنا شروع کیا، گاندھی جی نے فوراً اسے بدل دی اور ایک نیا راگ الاپنے لگے۔ پنجاب، خلافت اور سوراج گلدستہ طاقِ نسیاں بنا دیے گئے، زار شاہی قوانین کے نفاذ نے گاندھی جی کو اپنے مطالبات کو تین بنیادی حقوق پر محدود کردینے پر مجبور کردیا — آزادیٔ تقریر، آزادیٔ مطابع، آزادیٔ اجتماع۔

تعجب کا مقام نہیں اگر وہی شیطان اس مرتبہ بھی گاندھی جی کے پیچھے پیچھے لگا رہا۔ حکومت کے حملے نے ان کی پُشت مضبوط کرنے کے بجائے انھیں دنارت و خودکشی پر آمادہ کردیا۔ وہ بزرگ مہاتما جسے ہندوستان کے کروڑوں انسان اپنا بہادر رہنما، سمجھ کر عزت کرتے تھے اور جس نے چند ہی مہینہ قبل نہایت خطیبانہ انداز میں آزادیٔ ہند کی تجویز پیش کی تھی اب گھٹنے ٹیک کر وائسرائے سے التجائیں کرنے لگا کہ قانون نمک واپس لے لیں ورنہ اُسے اپنی مہم کی — جس کے بہت ڈھنڈورے پیٹے گئے تھے — دوسری ناگزیر منزل میں قدم رکھنا پڑ جائے گا۔

شاذ و نادر ہی کسی زبردست سیاسی لیڈر نے ...... اپنے ہی قول و فعل کے معیار سے ...... اتنی پستی و ذلت اختیار کی ہو۔

حکومت نے پھر ان کی پُشت پناہی کی اور اُن کی انتہائی سیاسی بدحواسی و سراسیمگی کے وقت اُنھیں جیل میں بند کردیا۔ شاید اُن کے خط کے آخری الفاظ کی سیاہی بھی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ آدھی رات کو پولیس والوں نے اُن کے جھونپڑے کا محاصرہ کرلیا اور اُنھیں گاڑی پر سوار کرا کے ...... بمبئی اور بمبئی سے یرادوا پہنچا دیا۔ گاندھی جی کی مجرمانہ ہرزہ کاریوں کا یہ سین حکومت کی طرف سے پردہ گرا کر ختم کردیا گیا۔

کے عالم میں پڑے ہوئے تھے، گاندھی جی نے غیر ملکی حکومت کے نمائندوں کے لئے اپنی بے پناہ ہمدردی کا اظہار حسب ذیل تجویز میں کیا۔

"یہ جلسہ وائسرائے کی اسپیشل کو بم سے اڑانے کی کوشش والے واقعہ کی سخت مذمت کرتا ہے۔ اور اپنے اس عقیدہ کا اعادہ کرتا ہے کہ اس قسم کے اقدامات نہ صرف کانگرس کے مسلک کے خلاف ہیں۔ بلکہ ان سے قومی مفاد کو سخت نقصان پہونچتا ہے۔ یہ جلسہ وائسرائے اور انکی اہلیہ محترمہ اور انکے دیگر رفقار کو جن میں ملازمین بھی شامل ہیں اس خطرے سے بال بال بچنے پر مبارکباد دیتا ہے"

اس تجویز کے محرک یعنی گاندھی جی کی زبردست شخصیت بھی بہت سے مندوبین کو اس موقع پر پر زور مخالفت سے نہ روک سکی۔ سوامی گووندانند نے کہا۔ کہ عدم تشدد کا مسلک ان لوگوں پر نہیں ٹھونسنا چاہئے جو حصول آزادی کے سلسلہ میں مختلف ذرائع اور حکمت عملی پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر عالم نے اس تجویز کی مذمت کرتے ہوئے اسے غیر اہم نا موزوں اور مضرت رساں قرار دیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اس قسم کی تجویزوں سے حکومت کے ہاتھ مضبوط ہوتے ہیں۔ اور وہ معصوم انسانوں پر اور زیادہ ظلم کرتی ہے مسٹر راجہ نے اس کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ یہ تجویز کانگرس کے ملوکیت دشمن مسلک نظریہ کے منافی ہے۔ کوماگاٹا مارو والے بابا گرودت سنگھ نے کہا کہ اس تجویز کے معنی انگریزوں کو دھوکا دینا اور نوجوانان وطن کو اور زیادہ تشدد آمیز حرکات پر ابھارنا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہ بھی کہا کہ جب تک لارنس اور راوٹرم کے مجسمے ہیں وہ تلوار دکھاتے رہیں گے جس سے انھوں نے ہندوستان کو فتح کیا تھا اُس وقت تک ہندوستان کے نوجوانوں میں بھی تلوار نکالنے کا جذبہ ابھرتا رہے گا۔

ان تمام باتوں کے باوجود اس تجویز تہنیت کی ہلکی سی ترمیم بھی ۷۹۸ اور ۸۱۶ ووٹوں کے فرق سے مسترد ہوگئی۔ تاہم مخالفت میں اتنے کثیر التعداد ووٹوں نے گاندھی جی کے سیاسی اقتدار کو بڑا صدمہ پہنچایا۔ بہرحال ہوا وہی جو گاندھی جی چاہتے تھے۔

اب کانگرس کے ڈرامہ کا اصل اور اہم ایکٹ کا پردہ اٹھا اور مسٹر گاندھی نے پلیٹ فارم پر آکر مکمل آزادی کے سلسلہ میں حسب ذیل "شاندار" تجویز پیش کی:

"یہ جلسہ مجلس عاملہ کے منشور کی، جو درجہ نوآبادیات کے متعلق وائسرائے کے اعلان مورخہ ۳۱ر اکتوبر کے سلسلہ میں شائع ہوا ہے (اور جسپر کانگرس اور دیگر جماعتی رہنماؤں کے دستخط ثبت ہو چکے ہیں تصدیق کرتا ہے۔ اور سوراج تحریک کے تصفیہ کے سلسلہ میں وائسرائے کی کوششوں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتا ہے یہ جلسہ گاندھی ،، پنڈت موتی لال نہرو اور دیگر رہنماؤں کی وائسرائے سے ملاقات کے نتائج پر غور کرنے کے بعد یہ خیال کرتا ہے کہ موجودہ صورت حال میں مجوزہ گول میز کانفرنس میں کانگرس کی شرکت سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ اسی لئے یہ جلسہ گذشتہ سال کے اجلاس منعقدہ کلکتہ کی پاس شدہ تجویز کے پیش نظر یہ اعلان کرتا ہے کہ دستور کانگرس کی دفعہ ۱ میں لفظ "سوراج" کا مفہوم مکمل آزادی ہے اور نیز یہ کہ آج سے نہرو رپورٹ کی پوری اسکیم ختم ہو چکی ہے۔ اور امید کرتا ہے کہ اب تمام اراکین کانگرس اپنی ساری توجہ مکمل آزادی کے لئے وقف کردیں گے۔

حصول آزادی کے لئے ایک مہم کی تنظیم کے سلسلہ میں ابتدائی قدم اٹھانے اور کانگرس پالیسی کو تبدیل شدہ مسلک کے ہم آہنگ بنانے کے لئے یہ جلسہ مرکزی وصوبائی مجالس قانون ساز اور سرکاری کمیٹیوں سے مکمل مقاطعہ کا فیصلہ کرتا ہے اور کانگرسی نیز دوسرے ہموطنوں سے جو قومی تحریک میں شامل ہیں مطالبہ کرتا ہے کہ وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ آئندہ انتخابات میں حصہ نہ لیں اور موجودہ اراکین کانگرس کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ مجالس قانون ساز اور کمیٹیوں سے مستعفی ہو جائیں۔ یہ جلسہ قوم سے پرزور اپیل کرتا ہے کہ کانگرس کے تعمیری پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی پوری کوشش کریں اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی کو یہ اختیار دیتا ہے کہ جب وہ مناسب اور موزوں سمجھے وقت کے تقاضوں اور مصلحتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے سول نافرمانی کی تحریک شروع کرے

جبیں عدم ادائگی محاصل (خواہ مخصوص یا غیر مخصوص علاقوں میں ہو) بھی شامل ہو"۔

اب پھر مسٹر سوباس چندر بوس ہی کو (جو مسٹر نہرو کی تائید اور اعانت سے محروم ہو چکے تھے) گاندھی جی کی اس تجویز کے مقابلہ میں دوسری حسب ذیل تجویز پیش کرنی پڑی۔

"گذشتہ سال کلکتہ کانگرس کی پاس شدہ تجویز کے پیش نظر یہ جلسہ اعلان کرتا ہے کہ کانگرس کے مسلک میں سوراجیہ کے معنی مکمل آزادی کے ہیں جو برطانوی تعلقات سے مکمل علحدگی کے مرادف ہے۔

ہندوستان میں برطانوی شہنشاہیت اور اُس کے ہندوستانی حمایتوں کا خاتمہ کرنے اور مکمل آزادی حاصل کرنے کے لئے یہ جلسہ فیصلہ کرتا ہے کہ ایک طرف تو برطانوی شہنشاہیت کے بالمقابل اور متوازی ایک دوسری حکومت قائم کرنے کے پیش نظر ساری ملک میں آزادی کا زبردست پروپیگنڈا شروع کر دیا جائے۔ اور مزید براں دوسری طرف سول نافرمانی کی تحریک بھی شروع کر دی جائے جس میں عدم ادائگی محاصل اور عام ہڑتالیں شامل ہوں۔

مذکورہ بالا دوہرے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کیلئے یہ جلسہ فرزندان وطن سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ فوراً ملک کے نوجوانوں، مزدوروں، کاشتکاروں، اور دوسرے مظلوم طبقوں کو منظم کرنا شروع کر دیں۔ کانگرس کے نئے مسلک کے مطابق اور اس پروگرام پر پوری توجہ صرف کرنے کے خیال سے یہ جلسہ مرکزی و صوبائی مجالس قانون ساز سرکاری کمیٹیوں و مقامی اداروں سے (جن میں پورٹ ٹرسٹ اور عدالتیں بھی شامل ہیں) مکمل مقاطعہ کا اعلان کرتا ہے اور اراکین کانگرس کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ آئندہ انتخابات میں حصہ نہ لیں۔ اور موجودہ مجالس قانون ساز کمیٹیوں اور انجمنوں کے تمام ممبر اپنی نشستوں سے مستعفی ہو جائیں اور تمام وکلاء اپنا پیشہ وکالت ترک کر دیں"۔

گاندھی جی اور مسٹر بوس کی تجویزوں میں جو گہرا فرق ہے وہ ظاہر ہے مسٹر بوس نے دراصل گاندھی جی اور کانگرس کو چیلنج دیا تھا کہ اگر وہ واقعی مکمل آزادی چاہتے ہیں تو کھل کر سامنے آجائیں اور دنیا کے سامنے حقیقی مقصد واضح کر دیں۔ اس نئے مسلک کی تمام پیچیدگیاں کانگرس کے گذشتہ سال کے بحث و مباحثہ میں بالکل واضح اور صاف ہو چکی تھیں۔ کیا پنڈت جواہر لال نہرو جو مدراس کانگرس (۱۹۲۷ء) میں تجویز آزادی کے بانی و محرک تھے تھوڑے ہی دن بعد جمہوری کانگرس کے سب سے پہلے اجلاس کی صدارت نہیں کر چکے تھے۔ کیا ۱۹۲۸ء میں بائیں بازو کے رہنما مکمل آزادی کو برطانیہ سے مکمل انقطاع کے مرادف نہیں سمجھتے تھے۔ اور درجہ نوآبادیات جیسے رجعت پسندانہ نظریہ کی سخت ترین مخالفت نہیں کرتے رہے تھے۔ یہ مسئلہ اب بالکل صاف ہو چکا تھا۔ گاندھی جی اور اُنکے پیرو اب بخوبی سمجھتے تھے کہ نوجوانان وطن مکمل آزادی سے کیا مراد لیتے ہیں گاندھی جی جب لاہور کانگرس کے پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے تو وہ یہ سمجھ چکے تھے کہ ملک میں سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے طبقہ کی ایک بہت بڑی اکثریت اب یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ ہندوستان کو ایک غیر ملکی حکومت کی زنجیروں سے آزاد کرانا ہے اور متحدہ ہندوستان میں ایک نئی جمہوریت کی بنا رڈالنی ہے۔ ہندوستان کے عوام کے دلوں کی اس آواز کی صحیح ترجمانی مسٹر بوس کر رہے تھے لیکن ایک مرتبہ پھر گاندھی جی نے سارے معاملہ کو الفاظ کے گورکھ دھندے میں اُلجھا کر پس پشت ڈال دیا اور نوجوان رہنماؤں نے انھیں جس چپقلش میں مبتلا کر دیا تھا اس سے نکل گئے۔

تاریخ گاندھی جی پر کلکتہ کانگرس کی کھلی شکست کے مقابلہ میں اُنکے لاہور کانگرس کے رویہ پر زیادہ سخت فیصلہ لکھے گی۔ وہ بلاشبہ ایک سال قبل برطانوی شہنشاہیت کی حمایت میں زیادہ صاف دلی و صاف گوئی سے کام لے رہے تھے کیونکہ اس وقت وہ بالاعلان درجہ نوآبادیات کی تائید کر رہے تھے جس کے معنے ۳۵ کروڑ انسان کو ابداً چار کروڑ غیر ملکیوں کی غلامی میں جکڑے رکھنا تھا۔ اور لطف تو یہ کہ انھیں اس کے اعتراف سے کوئی عار بھی نہیں تھا۔ اس لئے عوام جانتے تھے کہ اس معاملے میں انکی کیا رائے ہے۔ اور ان سے کیا توقع رکھنی چاہیئے۔ لیکن بھگت سنگھ کے مصائب و آلام، جتندر داس کی قربانی، اور اسیران میرٹھ کے قید و بند، اور عام ہڑتالوں کی آگ، جو ملک کے طول و عرض